ٹیلیفون نمبر ۳۵۲۵ رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۱۲

زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ

نقوش

۸۱ ، ۸۲

جون ۱۹۶۰ء

سالانہ قیمت
۲۰ روپے

قیمت فی پرچہ
تین روپے

مدیر
محمد طفیل

ادارۂ فروغ اردو (ایبک روڈ) انارکلی، لاہور

ترتیب

مقالے

نظمیں، غزلیں

افسانے

محمد طفیل پرنٹر، پبلشر، ایڈیٹر نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر ادارۂ فروغِ اردو لاہور سے شائع کیا۔

طلوع

آئیے آج اسی شمارے کی باتیں کریں۔

میری خوش قسمتی کہ اب کے نقوش کا عام شمارہ نکل رہا ہے۔ خاص نمبر نکالنا اور تلوار کی دھار پر چلنا، میرے نزدیک ایک ہی بات ہے۔ ارادہ ہے کہ ابھی دو چار ایسے ہی "غیر خاص قسم" کے عام شمارے نکالوں۔ تاکہ ذرا سستا لوں اور اس قابل ہو سکوں کہ اپنے ادبی گناہوں کا کفارہ پھر کسی اہم نمبر کی صورت میں ادا کر سکوں۔

۱۹۵۵ء کی بات ہے کہ ہمارے ہاں مسودات کے انبار میں، ایک افسانہ "بونے" بھی پڑا تھا۔ اُسے پڑھا تو صادق حسین سے ملاقات ہوئی ــــ وہ افسانہ چھپ گیا۔ چھوٹا سا سیدھا سادا، مگر اچھا افسانہ تھا۔ غالباً یہ ان کا پہلا ہی افسانہ تھا۔ اس وقت مجھے یہ پتہ نہ تھا کہ ایک دن یہ ایسے افسانے لکھیں گے کہ نقوش ان کی اشاعت پر سینہ تان سکے گا۔

ہمارے ہاں یہ دستور ہے کہ جب تک لکھنے والا صورتاً مرنے کے قابل نظر نہ آئے۔ اُسے کوئی پوچھتا ہی نہیں۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اب کے ذرا نقادوں سے پوچھوں کہ آپ صادق حسین کے افسانے پڑھ رہے ہیں یا نہیں؟ اگر نہیں پڑھ رہے تو میری بات سُن لیں۔ یہ نئے افسانہ نگاروں میں تو ممتاز نظر آ رہے ہیں۔ پرانے لکھنے والوں سے ان کے افسانوں کا تقابل، احتراماً مقصود نہیں۔ بہر حال ان کے اکٹھے تین افسانے پیش کیے جا رہے ہیں۔

اپنے ادب کا دامن جبھی وسیع ہوگا جب ہم دنیا کے بڑے ادب میں سے بھی اپنے ہاں کچھ نہ کچھ منتقل کرتے رہیں۔ قرۃ العین حیدر نے ہمیں جاپانی ڈرامے کی ایک خاص صنف سے روشناس کرایا ہے اور شروع میں چند ایک صفحے، بطور تمہید لکھ کر، بڑی معلومات فراہم کر دی ہیں۔ ضرورت ہے سوجھ بوجھ رکھنے والے ادیب (معاف کیجیے گا، ہر ادیب کے حصے میں سوجھ بوجھ نہیں آیا کرتی) برابر اُردو میں ایسی چیزیں منتقل کرتے رہیں۔ ان کا ادب پر احسان ہوگا۔

پکّے کافر اور منفرد ادیب، جناب نیاز فتحپوری ۹ مئی ۱۹۶۰ء کو لکھنؤ سے لاہور پہنچے۔ ادارۂ نقوش میں، لاہور کے اشخاص نے ان کا استقبال کیا۔ خوب خوب باتیں ہوئیں۔ مزے مزے کی چوٹیں ہوئیں۔ اب میں کیسے اُن قہقہوں میں آپ کو شریک کروں؟ اور کیسے بتاؤں کہ زبان و ادب کے کیسے کیسے اَدق مسئلے منٹوں میں پانی ہوئے۔ بہرحال چند تصویریں اس محفل کی یادگار ہیں۔ جو تصویری مضمون کی صورت میں پیش کی جا رہی ہیں۔

آج سے پندرہ بیس برس پہلے راجہ مہدی علی خاں کی نظمیں پڑھنے کو ملتی تھیں۔ پھر نہ ملیں۔ چنانچہ میں نے راجہ مہدی علی خاں کے نام کے ساتھ مرحوم کا لفظ بھی لگا رکھا تھا۔ مگر پچھلے دنوں ان کے تین خط آئے۔ پھر ایک زندہ قسم کی نظم بھی ملی۔ اب میں کیسے یقین کروں کہ راجہ مہدی علی خاں مر چکے تھے۔

محمد طفیل



ادارۂ نقوش میں

نیاز فتحپوری

کے ساتھ

ایک شام

جس میں ممتاز ادیبوں، صحافیوں اور ماہرین تعلیم نے شرکت کی













دیوانِ غالب اُردو کا ایک اور نادر مخطوطہ

از: امتیاز علی عرشی

اس امر میں بھی مرزا غالب دوسرے اردو شعراء سے ممتاز ہیں کہ ان کے دیوانِ اردو کے جتنے نسخے ان کی زندگی کے لکھے ہوئے ملتے ہیں کسی اور کے دیوان کے اتنے نہیں ملتے۔

میں نے "نسخۂ عرشی" کی ترتیب و تصحیح میں ۹ قلمی اور ۵ مطبوعہ نسخوں سے کام لیا تھا۔ خیال تھا کہ اب مزید مخطوطے نہیں ملیں گے لیکن ابھی کئی مہینے پہلے کراچی میں ۱۸۴۵ء کے ایک قلمی نسخے کی نشان دہی کی گئی تھی کہ اس کے فوراً بعد ایک مخطوطہ بدایوں میں بھی نکل آیا۔ آئندہ سطروں سے معلوم ہوگا کہ یہ نسخہ کس قدر قیمت کا ہے۔

مجھے یہ بتا دوں کہ اس مرقع کے مالک جناب احمد الدین نظامی صاحب مالک نظامی پریس بدایوں ہیں۔ موصوف صاحبزادے ہیں جناب مولانا نظام الدین حسین نظامی مرحوم کے جنہوں نے دیوانِ غالب سادہ و باشرح کے متعدد ایڈیشن شائع فرما کر ملک پر بہت بڑا احسان کیا تھا۔ سب سے پہلے آپ ہی نے غالب کے اردو دیوان کے فارسی دیباچے کی تاریخ ایک نام پوری نسخے کی مدد سے متعین کی تھی نیز نامی پریس کانپور کے بعد حسنِ طباعت کا جو اعلیٰ معیار آپ نے قائم کیا تھا وہ آج بھی قابلِ داد و ستائش ہے۔ خدا مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے اور احمد صاحب اور ان کے بچوں کو مرحوم کی اقتدا کا حوصلہ عطا فرمائے۔

دیوانِ غالب کا یہ نسخہ جسے میں آئندہ نسخۂ بدایوں کے نام سے پکاروں گا ۸ × ½۵ انچ ناپ کا ہے۔ روشنائی کالی، عنوان اور جدول شنگرفی اور باریک لاجوردی ہے۔ کاغذ بانس کا دیسی بنا ہوا ہے۔ ہر ورق میں سکاب بھی ہے اور ورق داغی بھی۔ خط شکستہ آمیز نستعلیق ہے۔ معمولی کرم خوردگی بھی پائی جاتی ہے۔ جلد پرانی مگر عام حالت اچھی ہے۔

سرِ ورق پر مہر ہے جس پر "محمد ذوالفقار الدین ۱۲۵۲ھ" کندہ ہے۔ ورق ۱ (الف) پر قصیدۂ فارسی در مدح شہزادہ سلیم شروع ہوا ہے اور ورق ۲ ب پر ختم ہوا ہے۔ قصیدے کے ۵۵ شعر ہیں اور مطلع حسبِ ذیل ہے ؎

دریں زمانہ کہ کلک رصد نگار نجیم
ہزار و دو صد و پنجاہ راند در تقویم!

یہ قصیدہ کلیاتِ غالب فارسی کے تمام مخطوطوں اور مطبوعہ ایڈیشنوں میں موجود ہے لیکن نسخۂ بانکی پور (نوشتہ ۱۲۵۴ھ / ۱۸۳۸ء)، نسخۂ مطبوعہ ۱۲۶۱ھ (۱۸۴۵ء) نسخۂ رامپور (لوہارو سیکشن، مکتوبہ ۱۲۶۴ھ / ۱۸۴۸ء) میں اس کا عنوان ہے "در مدح عرش آرام گاہ محمد اکبر شاہ

"بادشاہ طالب شاہ"۔ ہو سکتا ہے کہ نسخۂ بدایوں کا عنوان خود غالب کا مجوزہ ہو اور اس لیے کہ جس شاہ سے پہلے شاہزادے کی مدح کی گئی ہے ---

ورق ۳ الف پر فارسی کا ایک خط ہے جس کا عنوان ہے "سواد نامہ کہ بہ نواب اکبر علی خاں نوشتہ شد"۔ یہ خط پنج آہنگ میں بھی چھپ چکا ہے اور وہاں اس کا عنوان ہے "نامہ بجانب نامی نواب سید علی اکبر خاں متولی امام باڑہ ہوگلی بندر" (آغاز آہنگ پنجم)

ورق ۴ الف پر ایک فارسی نظم ہے جو انھوں نے بلی کی ستائش و صفت میں لکھی تھی۔ اس کا پہلا بیت ہے ––

دارم بہ جہاں گربۂ پاکیزہ نہادے
کز بال پریزاد بود موج رم او

قطعہ کی ۱۰ اشعار کا ہے اور اس عنوان سے نقل کیا گیا ہے "بدست نوازش بہ پشت گربۂ مسکین فرود آورد و بدیں داغ ناکام جاندارش باز داشتی"۔ یہ قطعہ نسخۂ رام پور ۱۲۹۴ھ میں اسی عنوان کے ساتھ اور دوسرے نسخوں میں بے عنوان موجود ہے۔ تعداد اشعار سب میں نسخۂ بدایوں کے مطابق ہے۔

ورق ۵ الف سے (جس پر نیلا ایک کا ہندسہ ڈالا گیا ہے) لکیر دار سرح کے نیچے دیوان کا آغاز ہوتا ہے۔ اوپر کے حاشیے میں باریک سے اندر "۱۹۵ ورق، جزو اول دیوان ہندی مرزا اسد اللہ خاں غالب" لکھا ہے اور اس نوٹ کے نیچے مذکورہ بالا مہر ثبت ہے۔ دیباچہ دیوان جسے ورق ماقبل کے مطابق ۲ الف کے حاشیے پر بھی نقل کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل دیوان کو نقل کرنے کے بعد اسے لکھا گیا تھا۔

اشعار کا آغاز بجائے "بسم اللہ" کے "ہو اللہ" سے ہوا ہے اور مضامین کی ترتیب مطابق ذیل ہے:-

ردیف الالف (بدون عنوان)	ورق ۵ الف
" الباء الموحدہ	" ۱۳ ب
" التاء والمثناۃ الفوقانیہ	" ۱۴ الف
" الجیم المعجمۃ التازیہ	" ۱۵ الف
جیم فارسی	" ۱۵ الف
ردیف الدال المہملہ	" ۱۵ ب
" الراء المہملہ	" ۱۶ الف
" الراء المعجمہ	" ۱۸ الف
" السین المہملہ	" ۱۹ الف
" السین المعجمہ	" ۱۹ ب
" العین المہملہ	" ۱۹ ب
" الفاء	" ۲۰ الف

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ہے آرمیدگی میں نکوہش بجا مجھے
صبحِ وطن ہے خندۂ دنداں نما مجھے

[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

ردیف الکاف التازیہ	ورق ۲۰ الف
کاف فارسی	” ۲۱ الف
ردیف اللام	” ۲۱ الف
” المیم	” ۲۱ ب
” النون	” ۲۲ الف
باب الواؤ	” ۲۸ الف
ردیف الہاء	” ۲۹ ب
” الیاء	” ۲۹ ب

اس کے بعد ورق ۵۱ ب کالم اپر لکھا ہے "تمام شد دیوان ریختہ" کالم ۲ سے قصائد شروع ہوتے ہیں۔ پہلا قصیدہ ہے "ساز یک ذرہ نہیں فیضِ چمن سے بیکار" اس کا عنوان ہے "منتخب قصیدہ منقبت حضرت مرتضیٰ علی علیہ السلام"۔ ورق ۵۳ الف کالم ۲ سے دوسرا قصیدہ بعنوان "انتخاب قصیدہ منقبت حضرت مرتضیٰ علی علیہ السلام" شروع ہو کر ۵۴ ب پر ختم ہوا ہے۔

ورق ۵۴ ب تا ۵۵ ب پر "قطعہ در تہنیت چکنی ڈلی کہ دوستی برکف دست نہادہ از مہربانی دادہ بود"۔ نسخۂ رام پور قدیم میں بھی یہی عنوان ملتا ہے۔

ورق ۵۵ ب سے ۵۶ الف تک رباعیاں ہیں۔ ان کی تعداد ۸ ہے۔ ۵۶ ب سادہ ہے۔ ۵۷ الف سادہ ہے ۵۸ ب سے ۵۹ ب کی سطر ۲ تک نواب ضیاء الدین احمد خان بہادر نیر درخشاں شاگرد غالب کی مشہور فارسی تقریظ یا دیباچہ ہے۔

آخر میں ۸ ورق پر حکیم مومن خاں مرحوم کا ساقی نامہ ہے جس کا پہلا شعر ہے ـ

کھولیو ساقی! منہ کو سبو کے
پیتے ہیں کب سے گھونٹ لہو کے

تعداد اشعار

اس نسخے کے اشعار کی تعداد بتفصیلِ ذیل ہے:۔

غزلیات:

الف	۲۲۶	ر	۲۹
ب	۱۲	ز	۲۰
ت	۱۹	س	۷
ج	۴	ش	۲
چ	۹	ع	۸
د	۹	ف	۲

ک	۱۵	و	۲۹
گ	۲	ہ	۳
ل	۹	ی	۴۲۵
م	۸		
ن	۱۲۳	میزان کل	۹۰۸

قصائد	۶۰
قطعات	۱۳
رباعیات	۱۶
میزان	۱۰۶۷

اشعار کی یہ تعداد متن تک محدود ہے۔ کچھ شعر نسخے کے حاشیوں پر بھی لکھے ہوئے ملتے ہیں۔ ان کی تعداد یہ ہے :

غزلیات ردیف	الف	۴
″ ″	ن	۴
″ ″	و	۹
″ ″	ی	۹
قصائد		۱
قطعات		۲
رباعیات		۴

میزان ۳۳ + ۱۰۶۷ = ۱۱۰۰

اس صورت میں متن و حواشی دونوں کے اشعار کی تعداد ۱۱۰۰ ہو جاتی ہے۔

جیسا کہ میں نے دیوانِ غالب (نسخۂ عرشی) کے دیباچے صـ۳۳ میں بیان کیا ہے رام پور کے سب سے پرانے مخطوطہ دیوان میں اشعار کی تعداد ۱۰۶۷ ہے اس میں ردیف الباء کا یہ شعر موجود نہیں ہے ۔

شرح ہنگامۂ ہستی ہے زہے موسم گل
رہبر قطرہ بہ دریا ہے خوشا موج شراب

چونکہ یہ شعر نسخۂ حمیدیہ کے حاشیے اور نسخۂ شیرانی کے متن دونوں میں ملتا ہے جو نسخۂ رام پور سے پرانے ہیں اس لیے اس شعر کو کاتب کے سہو سے محذوف ماننا جائے گا اور اس صورت میں نسخۂ رامپور کے اشعار کی کل تعداد ۱۰۶۸ ہوگی۔

بھی چونکہ [illegible] اس سے یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ [illegible] ہے جس میں [illegible] ایک شعر کا اضافہ [illegible] ہے —

ہم [illegible] دیوار و در کو دیکھتے ہیں
کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں

[illegible] نہیں لکھی ہے اور غلطی سے [illegible] حاشیے میں اس کا اضافہ کیا ہے۔ اگر یہ شعر متن میں ہو تو نسخۂ بدایوں کا تعداد اشعار ۱۲۰ ہو جاتی۔ اور اس اضافے سے کل شعر [illegible] ہو جاتے۔

زمانۂ ترتیب

اس نسخے میں نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر نیر کی لکھی ہوئی فارسی تقریظ بھی پائی جاتی ہے۔ تقریظ کا سال تالیف ۱۲۴۸ھ [illegible] ۱۲۴۸ھ سے شروع ہو کر ۱۲۴۹ھ کے سال ہی پر ختم ہوتا ہے۔ متن میں ایسی کوئی نظم موجود نہیں جو اس سال کے بعد کہی گئی ہو لہٰذا یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ یہ اسی سال کا مرتبہ نسخہ ہے۔

کیا یہی اصل نسخہ ہے جو نیر کی تقریظ کے ساتھ پہلی بار لکھا گیا تھا؟ اس کا جواب میری دانست میں نفی میں ہے کیونکہ اس میں اس قسم کی املا کی غلطیاں ہیں جو نیر کبھی برداشت نہیں کر سکتے تھے لیکن یہ اسی کی نقل ہے اور نقل بھی میری دانست میں مرزا صاحب کے کسی دوست نے کرائی تھی جن کے بارے میں انھوں نے اپنے اردو خطوں میں جگہ جگہ لکھا ہے کہ وہ میرا کلام جمع کرتے رہتے تھے یعنی حسین مرزا۔ میرے خیال کی بنیاد اس مہر پر ہے جو اس نسخے میں ثبت ہے اور جس میں "محمد زماں [illegible] ۱۲۵۲ھ" کندہ ہے کیونکہ [illegible] حسین مرزا کا بیٹا تھا۔ اس کی تائید حواشی کے مندرجات سے بھی ہوتی ہے کیونکہ نئے نئے شعر جو حاشیوں پر لکھتا رہا ہے لگتا ہے مرزا صاحب کے کلام کو جمع کرنے کا شوقین ہوگا۔

مذکورہ بالا امور کے تسلیم کر لینے کے بعد نسخوں کی تاریخی ترتیب میں نسخۂ رام پور قدیم کے بعد آتا ہے کیونکہ نسخۂ رام پور میں نہ نیر کی تقریظ ہے اور نہ اس میں وہ [illegible] اشعار ہیں جو نسخۂ بدایوں کی خصوصیات کے تحت آ رہے ہیں۔

خصوصیات

اس نسخے میں کچھ خصوصیات ایسی ہیں:

۱۔ املا میں پرانے رسم الخط کے مطابق [illegible] طریقہ بتا گیا ہے چنانچہ "رکھا" کو "رکہا" [illegible] لکھا گیا ہے۔ [illegible] ہے۔

۲۔ اس میں دو شعر تمام دوسرے نسخوں سے [illegible] ہیں اور وہ یہ ہیں —

[illegible] کہ ہم [illegible] کیسا [illegible] تھے
[illegible] اس شعر میں انداز [illegible] تھے

اس کا یہ حال کہ کوئی نہ ادا سنج ملا!
آپ لکھتے تھے ہم اور آپ اٹھا رکھتے تھے

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

بعد کے نسخوں میں غالب نے صرف مقطع برقرار رکھا اور پہلے دونوں شعر حذف کر دیے۔
جہاں تک شعروں کی خوبی کا تعلق ہے اپنے انداز بیان و طرز فکر دونوں کے لحاظ سے، رکھنے کے قابل تھے لیکن پھر بھی انھیں کاٹ دینے کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ معلوم نہیں ہوتی کہ ان کی موجودگی مقطع کے مضمون کو محدود کر دیتی ہے اور صرف مقطع ہو تو شکایت کی تعیین نہ ہونے کے باعث آفاقی و ہمہ گیر رہتا ہے۔

۳۔ اس نسخے میں ۲۳ شعر حاشیوں پر مندرج ہیں جو بظاہر اس کی علامت ہے کہ یہ ترتیب نسخہ کے بعد لکھے گئے تھے۔ اس امر واقعی سے جہاں یہ بات مستفاد ہوتی ہے کہ نسخہ کا تعلق غالب کے کسی دوست یا عزیز سے تھا وہاں یہ بھی پتہ چل جاتا ہے کہ وہ اشعار تاریخی اعتبار سے کس زمانے سے علاقہ رکھتے ہیں۔ اشعار یہ ہیں:-

یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں	۲ شعر
واں اس کو ہول دل ہے تو یاں میں ہوں شرمسار	۲ "
دی سادگی سے جان پڑوں کوہکن کے پاؤں	۹ "
تا ہم کو شکایت کی بھی باقی نہ رہے جا	۲ "
ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے	۳ "
لازم آتا ہوں کہ گر تو بزم میں جانے دے مجھے	۴ "
گئے وہ دن کہ نادانستہ غیروں کی وفاداری	۲ "
بھیجی ہے جو مجھ کو شاہ جم جاہ نے دال	۲ "
ہیں شہ میں صفات ذوالجلالی باہم	۲ "

ان اشعار میں سے پہلے ۶ شعر رام پور کے قدیم نسخے کے متن میں موجود ہیں۔ چونکہ وہ نسخہ از روئے تاریخ زیر نظر نسخے سے پہلا ہے اس لیے میری دانست میں یہ کاتب نسخہ کا سہو تھا جس کی حاشیے میں تصحیح کر دی گئی ہے۔
اس سلسلے میں یہ بات رہ گئی کہ رام پور کے نسخہ قدیم کی طرح قطعیت کا یہ مطلع :-

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

اس نسخے کے متن میں بھی نہیں ہے بلکہ یہاں حاشیے پر لکھا ہوا تھا ہے جس سے یقین ہو جاتا ہے کہ یہ مطلع ۱۲۴۳ھ / ۱۸۲۸ء اور ۱۸۲۶ء کے درمیان کسی وقت لکھا گیا تھا۔

آخر میں غالب کی مذکورہ بالا رباعی کی تاریخ کتابت کے متعلق بھی کچھ عرض کر دوں۔ اس رباعی کا پہلا مصرع ہے:

[illegible] شب عید و دوالی باہم

اس مصرع سے معلوم ہوتا ہے کہ جس سال یہ رباعی کہی گئی تھی، ہندو مسلم تہوار جمع ہو گئے تھے۔ یہ بات مسلم ہے کہ دوالی ہمیشہ کاتک کی آخری کسی تاریخ کو ہوتی ہے جب کہ چاند چھپ جاتا ہے اور شب عید عام طور پر رمضان کی ۲۹ تاریخ کو تسلیم کی جاتی ہے۔ اس امر کے پیش نظر علم ہیئت کی مقررہ تاریخوں پر غور کیا جائے تو تسلیم ہوتا ہے کہ ہندو مسلم تہواروں کا یہ اجتماع ۲۹ رمضان ۱۲۵۸ھ مطابق ۲ کاتک ۱۸۹۹ بکرمی مطابق ۱۲ نومبر ۱۸۴۲ء کو ہوا تھا۔ لہٰذا یہ رباعی ۱۲ نومبر ۱۸۴۲ء کو یا اس سے ایک دو دن پہلے کہی گئی ہوگی۔

اس نتیجے سے ایک دوسرا نتیجہ بھی نکلتا ہے اور وہ یہ کہ دیوان کا پہلا ایڈیشن اپنے سرورق کے اعتبار سے شہر شعبان ۱۲۵۷ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۸۴۱ء کو چھپا ہوا تھا لیکن اس ایڈیشن میں مذکورۂ بالا رباعی بھی داخل ہے لہٰذا بجائے ماہ اکتوبر کے ۱۲ نومبر کے بعد اس کا چھپنا تمام ہونا چاہیے اور اس صورت میں سرورق کی تاریخ کو آغازِ کتابتِ نسخہ کی تاریخ قرار دینا چاہیے۔ اس آخری خیال کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ سرورق چھپا ہوا نمبر صفحہ کے ساتھ نہیں چھپا ہے۔ اگر صفحہ اصل کی کتابت کے بعد لکھا گیا ہوتا تو اپنا جداگانہ نمبر صفحہ بھی رکھتا ہوتا جیسا کہ عموماً ہوا کرتا ہے۔

ان اسباب و وجوہ کی بنا پر یہ نسخہ غالب پر کام کرنے والوں کے لیے دلچسپ بھی ہے اور اہم بھی۔

اُردو مرثیہ

محمد طاہر فاروقی

دوسرے اصنافِ سخن کی طرح مرثیہ بھی اُردو میں فارسی سے آیا۔ فارسی ادبیات میں مرثیہ واقعاتِ کربلا کے علاوہ دوسرے سانحاتِ غم کے لیے بھی استعمال کیا جاتا تھا مگر مرثیہ کا یہ مفہوم کہ وہ حادثہ کربلا کے واقعات و سوانح کے لیے مخصوص ہو، فارسی ہی میں متعین ہو چکا تھا۔ اُردو نے فارسی سے مرثیہ لیا تو اس مفہوم و موضوع کی تخصیص کو بھی برقرار رکھا۔

اُردو مرثیہ کو معراجِ فن پر پہنچے ہوئے ڈیڑھ سو سال سے زیادہ عرصہ نہیں گزرا لیکن بحیثیت صنفِ نظم کے اس کی عمر چار سو سال سے متجاوز ہے۔ جس طرح دیگر اصنافِ نظم نے شمال سے قبل دکن میں نشو و نما پائی اور ارتقا حاصل کیا تھا اسی طرح اُردو مرثیہ بھی دکن میں اس وقت مروج و مقبول تھا جب شمال میں کسی نے اس کی طرف التفات بھی نہ کیا تھا۔ تقریباً ڈھائی سو سال تک مرثیہ صرف دکن میں اپنی فنی ترقی کے ابتدائی مدارج طے کرتا رہا اور اس بات کو دو سو سال سے بھی کم مدت گزری ہے کہ شمالی علاقوں میں مرثیہ گوئی کی طرف توجہ کی گئی۔

اس برِعظیم میں مغلیہ سلطنت کے آغاز سے قبل دکن میں کئی خود مختار سلطنتیں قائم تھیں جو علوم و فنون کی تربیت اور سرپرستی کے معاملے میں ایک دوسرے سے بڑھ جانا چاہتی تھیں۔ ان کے درباروں اور سلطنتوں میں دکنی اُردو ملکی اور سرکاری زبان کی حیثیت سے مروج تھی۔ اس لیے ان بادشاہوں کے زیرِ سایہ فارسی سے زیادہ دکنی کو فروغ حاصل ہوا۔ دکن کی ان حکومتوں میں سے عادل شاہی اور قطب شاہی دو ریاستیں مستقل شیعہ مذہب رکھتی تھیں اور یہاں شیعیت کو سرکاری مذہب کی حیثیت حاصل تھی چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ بیجاپور اور گولکنڈہ میں امام باڑے بھی موجود تھے اور وہاں مرثیہ خوانی بھی ہوتی تھی۔

> سلطان عبداللہ قطب شاہ کے زمانے میں جشنِ میلاد مبارک کی تقریبوں کے ساتھ ساتھ محرم کی تعزیہ داری بھی ہوتی تھی۔ تمام ممالکِ محروسہ میں پہلی سے عاشورہ تک نوبت نقارہ موقوف رہتے۔ گوشت اور پان کی دکانیں بند ہو جاتیں۔ تمام مسلمان اور ہندو ماتم میں شریک ہوتے تھے۔
>
> گولکنڈہ میں دو شاہی عاشور خانے تھے۔ یہاں مرثیہ خوان اور مداحِ شہدا ہر شب کو جمع ہوتے اور اُردو میں مراثی اور مناقب پڑھتے تھے۔ چھٹی تاریخ کو عاشور خانے کے باہر کے علم اٹھائے جاتے تھے۔ ان کے ساتھ مجاورانِ ائمہ اطہار ہاتھوں میں مشعل لیے ہوتے اور ذاکر و مداح مرثیہ خوانی اور مدح کے اشعار پڑھتے ہوتے ساتھ ہوتے۔ دسویں تاریخ کو خود سلطان عبداللہ سیاہ لباس میں برہنہ پا علموں کے ساتھ ہوتا تھا۔ مرثیہ خوان آگے آگے مرثیے پڑھتے جاتے تھے۔

بیجاپور کے شاہی ماتم خانے میں نوحوں کا سب کچھ اہتمام ہوتا تھا۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ سرپرستی و ترقی کے تمام اسباب کی موجودگی میں اُردو مرثیہ گوئی کو رواج اور قبولِ عام حاصل ہونا لازمی تھا چنانچہ ایسے شعرا کی خاصی طویل فہرست نظر آتی ہے جو صرف نوحہ گوئی کرتے تھے اور ان کے علاوہ دوسرے شعرا بھی تھے جو مرثیہ گوئی کو ثوابِ دارین حاصل کرتے تھے۔

دکنی دور کے مرثیوں میں کہیں کہیں واقعہ نگاری و منظر کشی کی مثالیں بھی مل جاتی ہیں لیکن مجموعی طور پر اس زمانے کے مرثیے ادبی اور فنی محاسن سے عاری ہیں۔ ان کا اصل مقصد صرف یہ ہوتا تھا کہ جنابِ امامؑ اور آپ کے رفقا کی یاد تازہ کی جائے اور ان کے غم والم کو پیدا کیا جائے۔ فنی تکمیل کا معاملہ لکھنوی اساتذہ کے لیے اٹھا رکھا تھا۔ پندرھویں صدی عیسوی کے آخر سے اٹھارویں صدی کے وسط تک کافی طویل مدت ہے۔ اس ڈھائی سو سال کے عرصہ میں اُردو مرثیہ دکن میں پھلتا پھولتا رہا اور بہت سے خوش گو مرثیہ خواں پیدا ہوئے۔ اشرف، وجہی، نوری، ہاشمی، ذوقی، نیم، احمد، رضی، قادر، امامی، قائم، اشرف، برہان اور ہاشم علی اس عہد کے کامیاب اور مقبول مرثیہ گو گزرے ہیں۔

اس طویل دور میں مرثیے کی کوئی ایک ہیئت مقرر نہ تھی۔ غزل، مثنوی، قطعہ، مربع، مخمس، مختلف شکلوں میں مرثیے ملتے ہیں مگر عجیب بات یہ ہے کہ مسدس کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی۔ ان شعراء کے مرثیوں کے کُل مجموعے موجود نہیں ہیں لیکن مختلف تذکروں اور بیاضوں سے ان کے کلام کی کم و بیش مثالیں دستیاب ہو جاتی ہیں لیکن زمانے کی اس ستم ظریفی کو کیا کہا جائے کہ ان میں سے بعض شعرا کے جو نمونے ہیں وہ ان کی اس شہرت و مقبولیت کے شایاں نہیں سمجھے جاسکتے جو انھیں اپنے زمانے میں حاصل تھی۔

ان مرثیوں کی زبان جیسا کہ توقع کی جاسکتی ہے قدیم دکنی اُردو ہے پھر ان میں کوئی بڑی ادبی اور فنی خوبی بھی نہیں پائی جاتی اس لیے آج ان کو سننے سنانے میں کوئی خاص مزا نہیں البتہ تاریخی تسلسل برقرار رکھنے کے لیے بعض ایسے حصے چُننے ہی میں سہولت محسوس کی جاسکتی ہے۔

دکن میں مرزا تخلص کے دو مرثیہ گو تھے ایک بیجاپور میں دوسرے گولکنڈہ میں۔ گولکنڈے کے مرزا نے بہت مرثیے لکھے تھے جو مختلف بیاضوں سے دستیاب ہوئے ہیں۔ زبان وہی دکنی ہے مگر سوز و گداز سے بھرے ہوئے اور پُر اثر ہیں۔ ایک مثال دیکھیے ؎

الوداع اے الوداع شاہِ شہیداں الوداع
الوداع ابنِ علیؑ رزم و جنگ کے سلطاں الوداع
شاہ دو عالم ہوئے مظلوم حیراں الوداع
یو چلے دنیائے فانی سوں سو ہزاراں الوداع
یو شفق میں سب گگن پر صبح و شام اس درد سوں
خوں بھرا وہیں لہو سے دامن گریباں الوداع

ہاشمی کو بیجاپور کے نامی گرامی مرثیہ گویوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کا ایک مرثیہ سُنیے جس کی زبان سادہ اور آسان ہے ؎

دل بند مصطفےٰؐ کا تابوت لے چلے ہیں
فرزند مرتضیٰؑ کا تابوت لے چلے ہیں
سلطانِ دو جہاں کا سردارِ اولیا کا
مظلوم کربلا کا تابوت لے چلے ہیں

حضرت حسین حسن کا سا شاہ زمن کا
حضرت نبی منگا کر تابوت لے چلے ہیں
حضرت کے تھے نواسے حیدر کے تھے خلف
ہوئے شہید پیاسے تابوت لے چلے ہیں

بکسی کے علاوہ دو اور تین مرثیہ گو سب سے زیادہ ممتاز ہیں۔ ذوقی، اشرف اور نعیم احمد۔ ذوقی ایک کہنہ مشق شاعر تھے۔ مختلف اصناف سخن پر مشق کی ہے۔ مثنوی اور مرثیہ میں کمال رکھتے تھے۔ ان کے مرثیہ کا نمونہ یہ ہے ۔

اے شمع بزم مرتضیٰ گھر آج آتے کیوں نہیں
تاریک ہے ماتم سرا جہاں جلوہ دکھاتے کیوں نہیں
وہ جابجا دو رخ دلہن آتے ہیں بادل کے نمن
جوں برق تیغ صف شکن اب جگمگاتے کیوں نہیں
وہ شمع بزم مصطفیٰ باد اجل سوں گل ہوا
سب سوز دل سوں تن جلا یاراں گلاتے کیوں نہیں
چھوڑو سنگل دنیا سگل سوں تک ملک خاص و عام
ماتم کے آتش میں مدام تن کو جلاتے کیوں نہیں
سنتے ہو تم اے مومناں شہ کی شہادت کا بیاں -
سب خاک و خوں کے درمیاں تن کو رلاتے کیوں نہیں

اشرف بھی اسی زمانے کا شاعر اور مرثیہ گو ہے۔ اس کے کلام کا نمونہ سنئے ۔

بانو کہتیں اصغر نہیں اب میں جھولاؤں کس کے تئیں
سونا ہوا ہے پالنا اب میں ہلاؤں کس کے تئیں
نہلا کے میں کپڑے پہنا اس کوں بناتی گل نمن
وہ پھول سوکھا نیر بن اب میں بناؤں کس کے تئیں
سوتا تھا وہ جب نیند بھر پینے الطاق دو در کوں
بیدم ہے دیکھو آج وہ اب میں جگاؤں کس کے تئیں
جب مسکراتا وہ بچہ میں شاد ہوتی دل سے
بے جان پڑا ہے گود میں اب میں ہنساؤں کس کے تئیں
جب شہ کو تکلیں دیکھتی سے جاکے بیٹی گود میں !
سونا کفن وہ اوڑھ کر اب میں بلاؤں کس کے تئیں

تیسرا موجب سلام سے مگر زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ اس کا تخلص بھی یہی تھا صرف مرثیے کہتا تھا ایک نمونہ [illegible] نظم ہے تو بہت ہی مسدس نہیں ہے ۔

حیف گلشن ہے شگفتہ تن تیرا — جسم مجروح ہے سب چمن تیرا
تو کہاں ہے اور کہاں ہے تن تیرا — کیوں نہ میرا جلا ہے سینہ تیرا
نہیں ملتا بزندگی کے تئیں پانی
سخت طفلوں کے سر پہ حیرانی
حیف اصغر نے [illegible] — جگ سوں چلا گیا تو تنہا
تیر کھا کے حلق [illegible] — وا مصیبت بیاں ہے تن تیرا
اے نور دلبر حسین کے اصغر
آج رونا نہیں نور ہمت کر

مغلوں کے زمانے میں دکن فتح ہوا تو شمال و جنوب میں پھر تعلقات آمد و رفت جاری ہو گئے چنانچہ دکنی مرثیے بھی دلی پہنچنے لگے اور یہاں کی مجلسوں میں پڑھے جانے لگے۔ پرانے تذکروں سے صاف طور پر ایسی شہادتیں ملتی ہیں۔

اس زمانے کے ایک مشہور شاعر حافظ رضی الدین رضی کے مرثیے کا نمونہ دیکھئے ۔

غم سوں ہے چور اور میرا دل — دکھ سوں ہے ناتواں میرا دل
گلشن غم میں ہے شہیداں کے — لالۂ داغ دار میرا دل
نت شہیداں کے غم سوں سینے — شق ہے جوں [illegible] میرا دل
غم کی بجلی پڑی ہے جب سے — تب سوں ہے شعلہ زار میرا دل
نیم بسمل نمن تڑپتا ہے — ہے [illegible] کا شکار میرا دل
گرد غم سوں امام کے اے رضی
کیوں نہ ہو پُر غبار میرا دل

آزاد تخلص کے دو مرثیہ گو گزرے ہیں ایک بیجاپور کے دوسرے حیدرآباد کے۔ حیدرآبادی آزاد کا زمانہ بعد کا ہے۔ یہ صرف مرثیے کہتے تھے۔ سادگی، جذبات اور تسلسل خیال کے لحاظ سے ان کے مرثیوں کو امتیاز حاصل ہے۔ نمونہ دیکھئے ۔

ہوا شہرت محرم میں ماہ غم سے شاہ عالی کا
کہ ہے فرزند پیارا وہ دونوں عالم کے والی کا
چھپا ہے دین کا چاند [illegible] سر سوں جگ پہ
فلک پر [illegible] تارے نے [illegible] کالی کا
ستارے سب یہ [illegible] سب [illegible]
حسین کے ہوش کر [illegible] کا

نہیں پر اشک شبنم سوں کھلیں آہ کے گل ہو
دیکھو غم کے گلشن میں لطافت غم کے مال کا

امامی برہان پوری اس زمانے کا ایک اور مشہور اور مقبول مرثیہ گو ہے جو شوق سے مرثیے کہتا تھا۔ بیاضوں میں دکنی اسے ندیا پایا جاتا ہے۔ اس کے ایک مرثیہ کا جو مرثیہ ہے کچھ حصہ سنئے ۔

محشر میں جب محمد شاہ دو زمن اٹھیں گے
سب انبیائے مرسل پر غم حزن اٹھیں گے
حیدر علی لوہو سوں آلودہ تن اٹھیں گے
بیٹے لہو کے بھکاں ہے بے حسن اٹھیں گے

آلودہ خاک و خوں میں دونوں ہی مصطفیٰ لے
لوہو سوں تر بتر سب دستار مرتضیٰ لے
ٹکڑے حسنؑ کے دل کے جامہ حسینؑ کا لے
تربت سے فاطمہؑ جب مے لہو بہا اٹھیں گے

دریائے غم میں ہرگز کیا نہیں غواصی
ہر چند تو امامی عالم منی ہے عاصی
امید تو توی ہے پائے گا توں خلاصی
کرنے کے تیں شفاعت جب پنجتن اٹھیں گے

ہاشم علی برہان پوری اس دور کا بلند پایہ شاعر اور مرثیہ گو تھا۔ اس نے مربع، مخمس، قطعہ، غزل سب شکلوں میں مرثیے لکھے ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کے مرثیے سننے کے لیے خواب میں تشریف لایا کرتے تھے۔ اس کے ایک مربع کی مثال ملاحظہ فرمائیے ۔

آج پر خوں کفن ترا اصغر ۔ آج شو کھا چمن ترا اصغر
لال ہے گلبدن ترا اصغر حیف بے بالپن ترا اصغر
کیوں ہوئے نشاں کہ پال آزاد ناد کیوں گئے پیر ہوئے کچار یار
تجھ کوں ستے کبھو نہ گئی بار حیف بے بالپن ترا اصغر
الٹھ گئے کو بہ بھر لاڈوں میں نیند آئی تجھے لاڈوں میں
چل تما پالنا جھولاؤں میں حیف بے بالپن ترا اصغر

اس طویل دکنی دور میں فنی حیثیت سے مرثیہ نے ترقی نہیں کی لیکن شک نہیں کہ متاخرین کے لیے سب راہیں اسی وقت ہموار کر دی گئی تھیں۔ مرثیہ کو علاقوں کے مقامی رنگ دینا لکھنوی دور کی خصوصیت ہے لیکن اس کے اثرات اس دکنی دور میں ملتے ہیں ۔

جذبات، واقعات اور معاملات سب متنوع ہیں کیونکہ یہ مختصر ہیں لیکن ان کے ابتدائی خط و خال دکنی مرثیوں میں مل جاتے ہیں۔ کسی صنف کے ابتدائی زمانے میں تکمیل کا احساس تلاش کرنا ہی بے سود ہے۔ یہی بات پورے دکنی مرثیوں پر صادق ہے لیکن اس زمانے کا حسن ہرگز نہیں جھٹلایا جا سکتا کہ مرثیہ اسی عہد میں پیدا ہوا اور پروان چڑھا۔

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اٹھارویں صدی عیسوی کے شروع سے دکنی مرثیے شمالی علاقوں میں پہنچنا شروع ہو گئے تھے اور یہاں کئی جنس اس سے متاثر ہونے لگی تھیں۔ اسی زمانے میں فضلی نے روضۃ الشہدا کا اردو میں دہ مجلس کے نام سے ترجمہ کیا۔ اسی میں انھوں نے ایک مسلسل نظم لکھی ہے جس میں حضرت قاسم کی بیوہ دلہن ان کی شہادت پر بین کرتی ہیں، چند شعر سنئے ۔

یہ کیا بُرا پھیرا تھا مرا دستِ ستمگر	وہ بیاہ کر سرائی نہ میں اور موت سرائی
ماتھے کے لگنے چھتر کا سہرا سے بدتر	تو مرگ بے اور میرے تئیں موت نہ آئی
اے میرے جگر تیری ہی تیرے بنا اب	کس گھر میں شمار کرے گی یہ جدائی
اے میرے بنے ساس کو میں منہ کیا دکھاؤں	دل میں کسکے کی کیسی بہ بیاہ کے نائی

اٹھارویں صدی کے شروع میں شمالی ہند میں بھی مرثیہ اپنی اسی ابتدائی شکل میں نظر آتا ہے جس میں کوئی ادبی اور فنی خوبی نہیں۔ صرف بیان اور بین ہے۔ اس کا مقصد ابھی محض رونا اور رلانا ہے۔ اسی لیے ادبیت اور فنکاری نظر نہیں آتی لیکن یہ بات توجہ کے قابل ہے کہ اس کے بعد تھوڑی سی مدت میں مرثیہ غیر معمولی سرعت کے ساتھ ترقی کرتا ہے اور اس رتبہ پر پہنچ جاتا ہے جہاں نقاد یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ مرثیہ گوئی کے میدان میں دنیا کی کوئی زبان اُردو کے مقابلے میں نہیں لائی جا سکتی۔

فضلی کی دہ مجلس کا زمانہ ۱۱۴۳ھ کے لگ بھگ ہے۔ سوداؔ اور میرؔ اس وقت پیدا ہو چکے تھے۔ انھوں نے مرثیے بعد کو کہے ہوں گے لیکن اسی زمانے میں چند اور مرثیہ گو مشہور ہو چکے تھے۔ ان کے مرثیے آج ناپید ہیں بلکہ شاید یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ دوسروں کے مرثیوں میں خلط ملط ہو کر ہماری نظروں سے اوجھل ہو چکے ہیں لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسی زمانے میں دہلی اور مضافات میں شعرا نے دیگر اصناف سخن کے ساتھ مرثیہ کی طرف بھی توجہ کرنی شروع کر دی تھی۔

میرؔ اور سوداؔ کے ناموں کے ساتھ مرثیہ گو حضرات میں یہ نام نمایاں بتائے جاتے ہیں۔ یکسیؔ، گداؔ، حزیںؔ، امانیؔ، مصرفیؔ، سکندرؔ، غمگینؔ۔ ان سب میں سوداؔ اور سکندر خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ اس لیے کہ ان استادوں نے شہادت کے مختلف پہلوؤں کو جمع کر کے ایک ہی مرثیہ میں نظم کیا اور ان میں ربط و تسلسل قائم کیا۔ نیز یہ کہ انھوں نے علاوہ دیگر اصناف نظم کے مسدس میں بھی مرثیے لکھے۔ سکندر کے مرثیے نہیں ملتے۔ ایک مسدس ان کی جانب منسوب ہے اور وہ دکن میں قبولیت کے ساتھ پڑھا جا رہا ہے۔

میر تقی میرؔ کا مرثیہ ان کے شایانِ شان نظر نہیں آتا۔ بہرحال نمونہ یہ ہے، سنئے ۔

وطن پر محبوں کے حالت عجب ہے	مصیبت ہے ماتم ہے غم ہے تعب ہے
غرض کیا کہوں کس روش کا غضب ہے	حسین علی کی شہادت کی شب ہے
محبوں نے دل سے خوشی سب تجی ہے	ہر اک گھر میں ماتم کی مجلس رچی ہے
عجب طرح کی وائے ویلا مچی ہے	کہ روزِ قیامت کی گویا یہ شب ہے

مرزا سودا کو مرثیے کی ادبی حیثیت کی سمت پوری توجہ تھی۔ ان کے کلیات میں انہیں مرثیے پائے جاتے ہیں۔ دیباچہ میں مرثیوں کی بابت لکھتے ہیں:-

"…… لیکن مشکل تر یہ دقائق طریق مرثیہ کا معلوم کیا کہ مضمون واحد کو ہزار رنگ میں ربط معنی سے دیا۔ چنانچہ اس کلام میں محتشم سا کسو نے ہنر قبول نہیں پایا…… پس لازم ہے کہ مرتبہ مدِ نظر رکھ کر مرثیہ کہے نہ کہ برائے گریہ عوام اپنے تئیں ماخوذ کرے۔"

سودا جیسے جامع کمالات، استادِ فن دوسرا پیدا نہ ہوا مگر مرثیہ کو وہ بلندی عطا نہ کر سکے جس کی طرف انھوں نے توجہ دلائی ہے۔ زبان البتہ دکنی دور کے مقابلے میں صاف ہو گئی ہے۔ یہ دور میر و مرزا کا عام احسان ہے اس میں صرف مرثیہ کی کوئی خصوصیت نہیں۔ بہرحال سودا کے مرثیے کا نمونہ یہ ہے۔

کریں نہ اہلِ جہاں کس طرح سے شیون و شین
سروں کو اپنے نہ پیٹیں سو کیوں وہ کر کے بین
ہوا ہے آج کے دن قتل کربلا میں حسینؑ
یہ تعزیہ ہے رموزِ خدا کے محرم کا

ہزار طرح کے دریا رواں تھے دنیا میں
جو کوئی تھا سو وہ سیراب تھا ہر اک جا میں
کئی غریب جو تھے کربلا کے صحرا میں
نصیب ان کو نہ قطرہ ہوا کسی یم کا

یہ ظلم کس کی زباں کو ہے کہنے کا یارا
نبیؐ کا قتل کیا ظالموں نے گھر سارا
جوان میں طفل تھا شش ماہہ اس کو بھی مارا
کیا نہ عمر نے کچھ فرق زائد و کم کا

اب تک جو مرثیہ کا ارتقا تھا اس میں سودا کے دعوے کے بعد بھی ادبیت اور فنی حیثیت کم سے کم نظر آتی ہے البتہ میر و سودا کے فوراً بعد مرثیہ ایک مستقل اور اہم صنفِ سخن بن جاتا ہے اور ایسے شعراء کی ایک جماعت پیدا ہو جاتی ہے جنھوں نے مرثیہ کو ترقی دے کر عظمت اور اہمیت بخش دی۔

ان شعراء میں میاں دلگیر، مرزا فصیح، میر خلیق اور میر ضمیر کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ دلگیر اور فصیح حج کے لیے گئے تو وہیں کے ہو رہے۔ خلیق و ضمیر نے اپنی کوششیں یہاں جاری رکھیں اور اس لیے ان ساتھیوں سے زیادہ نام پایا ورنہ مرثیہ میں تسلسلِ بیان کے ساتھ اس کی پوری ہیئت کو متعین کرنے اور لازم بنانے میں یہ چاروں شریک ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس معاملے میں فصیح کو دلگیر پر، خلیق کو ان دونوں پر اور ضمیر کو باقی رفقاء پر برتری حاصل ہے۔ مجموعی طور پر ہم یقیناً ان چاروں استادوں کے احسان مند ہیں کہ انھوں نے مرثیہ گوئی کو

ایک مستقل فن بنا کے اردو ادب کو مالا مال کر دیا۔

میاں دلگیر کا ایک بند بطور نمونہ کے سنئے۔ امام حسینؑ سفر کی تیاری فرما رہے ہیں۔ بی بی صغریٰ ساتھ چلنے کے لیے اصرار کرتی ہیں۔ آپ ان کو سمجھا رہے ہیں ؎

دشمنِ جاں ترے بابا کا زمانہ ہے تمام
طعنہ زن صاف ترے عم پہ کہیں گے یہ کلام
متحمل ہوئی غربت کی نہ یہ بنتِ امام
باپ کے جاتے ہی بس ترک کیا آب و طعام
واری نے طور سے ہرگز نہیں دکھ ہو سکتی!
بیٹی صابر کی ہے اور صبر نہیں کر سکتی!

حاجی مرزا جعفر علی فصیح کے مرثیے کئی جلدوں میں مرتب ہوئے تھے۔ ایک مرثیہ کے ابتدائی بند سنئے ؎

ہے فصیح آلِ پیمبر کے ثنا خوانوں میں — کیا چمکتا ہے کلام اس کا سخن دانوں میں
دخل کرتا ہے اثر دار سخن کانوں میں — جیسے بجلی کی چمک آتی ہے دالانوں میں
نالۂ غم زدہ سوتوں کو جگا دیتا ہے
جان میں گرمِ سخن آگ لگا دیتا ہے

اس کی تصنیف جو پڑھتے ہیں مجالس میں ملا — روندتا چرخ کو ہے غلغلۂ شیون و شین
گرچہ مدت سے ثنا خواں ہے مقیمِ حرمین — روح کو اس کی ہے پر شہِ شبیر سے چین
چشمِ تر نہرِ حسینیہ سے دل حائر ہے
کربلا سینہ ہے اور جانِ حزیں زائر ہے

کبھی اشکوں سے لبِ تر ہے زمینِ عرفات — کبھی ہے آنسوؤں سے سبز زمینِ برسات
حرمِ اللہ میں ہے اشک فشاں دن رات — ذبح کے وقت سنا ئیں ہے بجلد یہ بات
تشنہ لب ذبح ہوئے دن میں عزا دارِ حرم
کٹ گئے تیغِ مخالف سے نہالانِ حرم

حضرت حرؓ اور ان کے تینوں رفیق (بھائی، بیٹا، غلام) اہلِ بیتؑ سے اجازت لے کر ان کی دعاؤں کے سائے میں میدان میں آتے ہیں۔ وہ منظر اور حضرت حرؓ کی شہادت کی تفصیل مرزا فصیح سے سنئے (دبیر جیسا بھی مرثیہ کی تفصیلات اس درجہ پر نہیں آئی ہیں کہ گھوڑا، تلوار اور رزم وغیرہ پر بند کے بند لکھ دیے جاتے)

سنتا ہوا صدائے دعا اپنے کان سے — حر آیا قتل گہ میں شہادت کی شان سے
آئی تھی مرحبا کی صدا آسمان سے — میداں میں پہنچی تیغ دو بارہ میان سے

برش سے برقِ چشمِ عدو خیرہ ہو گئی
بادل سا دل گھر آیا ہوا تیرہ ہو گئی

گھستیں جو ان کے سینے میں برچھیاں آ کر | سوفار چومتے تھے سب مشتاق جان کر
جب نیزہ باز مارتے تھے نیزے تان کر | کہتے تھے ہم کو بار خدا امتحان کر

گلزار ہو دیں جسم کھلیں زخم پھول سے!
شرمندگی نہ ہو ہمیں آلِ رسولؐ سے

جب ہر طرف سے پڑنے لگے آہنی عمود | گھوڑوں سے کود خاک پہ بیٹھے شہِ ودود
چاروں طرف سے تیغ چلانے لگے حسود | وہ جاں نثار شکر کے کرنے لگے سجود

ناگاہ دریچے کھل گئے باغِ نعیم کے
آنے لگے بہشت سے جھونکے نسیم کے

رضواں نے لا کے خلعتِ رحمت پہنا دیا | آ کر ملک نے جامِ شہادت پلا دیا
حوروں نے سر شہید کا بیڑا کھلا دیا | زہراؑ نے اپنی چشم سے دریا بہا دیا

رومال اپنا لال کیا حشر کے خون سے
آتی تھی بوئے عطر بہادر کے خون سے

میر ضمیر نے مرثیہ کی ہیئت کو متعین کیا اور اس کے فنی حدود مقرر کیے۔ اب تک مرثیہ کی شکل بہت سادہ ہوتی تھی۔ غزل کے انداز پر سلام ہوتا تھا۔ پھر واقعاتِ شہادت کا مختصر بیان تسلسلِ بیان پیدا کرنے کی کوشش ہونے لگی تھی لیکن مرثیہ کا سب سے مقدم سمجھا گیا تھا۔ ضمیر و خلیق اور خاص طور پر ضمیر نے اس کی ماہیت بالکل بدل دی۔ ترتیب کے ساتھ پہلے چہرہ باندھا۔ پھر رخصت، سراپا، آمد، رجز، گھوڑے، اسلحہ اور دوسری چیزوں کی تعریفیں، بیانِ شہادت اور سب سے آخر میں دعا۔ مناظر کی تصویر کشی بھی جا بجا درمیان میں آ جاتی تھی لیکن خلیق نے رزمیہ مرثیے نہیں لکھے۔ رزمیہ مرثیے میر ضمیر کی ایجاد ہیں۔

میر خلیق کے مرثیوں کی بابت مولانا شبلی لکھتے ہیں کہ:

"میر نواب صاحب نامی . . . . نے ایک مجموعہ چھاپا تھا جس میں میر خلیق، مونس اور انیس کے چند مرثیے جمع کیے تھے۔ اس میں میر خلیق کے متعدد مرثیے ہیں لیکن اکثر وہ ہیں جو آج میر انیس کے نام سے مشہور ہیں، اور جو میر انیس کے چھپے ہوئے مرثیوں میں شامل ہیں۔ بعض ایسے ہیں جو مطبوعہ مرثیوں میں شامل نہیں لیکن زبان اور طرزِ ادا سے قیاس ہوتا ہے کہ میر انیس ہی کے نتائجِ فکر ہیں اور اگر وہ واقعی میر خلیق کا کلام ہے تو بیٹے کو باپ پر ترجیح کی کوئی وجہ نہیں۔"

لیکن یہ سب قیاسات ہیں۔ میر خلیق کے مرثیے سامنے نہ ہونے ہوتے اس رائے پر یقین نہیں کیا جا سکتا البتہ میر ضمیر کی اہمیت

اور بالآخر سلسلہ اس شعر سے ختم ہوتا ہے۔

میر ضمیر اپنے ایک مرثیہ میں وہ واقعہ بیان کرتے ہیں جب حضرت مسلم کوفہ میں اکیلے رہ گئے تھے اور چاروں طرف سے نرغے نے گھیرا ڈال رکھا ہے آپ باہر نکلتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ۔

دیکھی اک برق چمکتی ہوئی تلواروں سے
شہر کے کوچے تھے معمور ستمگاروں سے

حضرت مسلم تن بہ تقدیر آمادۂ جنگ ہو جاتے ہیں۔ میر ضمیر کم لفظوں میں کتنے بڑے واقعے کی تفصیل کامیابی کے ساتھ بیان کر جاتے ہیں۔

قید کر لینے کی مسلم کے بہت کی تدبیر　　　شیر اللہ کے جیسے کہیں ہوتے ہیں اسیر
جب کئی جسم مبارک پہ لگے نیزہ و تیر　　　یا سمیعؑ ابن علیؑ کہہ کے نکالی شمشیر
پھر تو جس سمت جھکے اور جدھر وار کیا
قد آدم سے سوا لاشوں کا انبار کیا

میر خلیق امام عالی مقام کے مدینے سے کوچ فرمانے کا حال ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں ۔

گھر سے جب بہر سفر سیدِ عالم نکلے　　　سر جھکائے ہوئے با دیدۂ پر نم نکلے
خویش و فرزند کمر باندھ کے باہم نکلے　　　رو کے فرمایا کہ اس شہر سے اب ہم نکلے
رات سے گریۂ زہراؑ کی صدا آتی ہے
دیکھیں قسمت ہمیں کس دشت میں لیجاتی ہے

یہ بیاں کر کے چلے اس سے شہِ کون و مکاں　　　بیکسی چہرے پہ چھائی تھی تو آنسو تھے رواں
لوگ سرپیٹ کے اس دم یہ پکارے یکساں　　　پیچھے تابوت کے جس طرح سے ہو شور و فغاں
غل تھا اے سیدِ ذی جاہ خدا کو سونپا
اے مدینے کے شہنشاہ خدا کو سونپا

ذات شبیر کی تھی اک رحمت رب باری　　　کون اب دکھ میں غریبوں کی کرے گا یاری
فیض کس گھر سے مدینے میں رہے گا جاری　　　پائیں گے کس کی دعاؤں سے شفا آزاری
شہر سے سایۂ الطاف خدا جاتا ہے
مشکلیں باقی ہیں اور عقدہ کشا جاتا ہے

محمد حسین آزاد لکھتے ہیں :۔

"انہیں یکساں میں دونوں استادوں کی رفتار الگ الگ تھی کیونکہ میر ضمیر استعداد علمی اور زور طبع کے بازو سے بلند پروازیاں کرتے تھے اور پرے اڑتے تھے۔ میر خلیق مرثیت کے کوچے سے آشنا تھے جہاں تک جاسکتے تھے وہیں تک جاتے تھے اور اپنے زور طبع کی جولانی دکھاتے تھے اور ہمیشہ محاورے اور لطف زبان کو رعایت و صفائی کے ساتھ ترتیب دے کر مطلب حاصل کرتے تھے۔"

میر ضمیر نے مرثیہ کو تشبیہات و استعارات، روایات و حکایات، مناظرِ قدرت اور رزمیہ بیانات سے مالا مال کیا اور اسے ایک دو آتشہ بنا دیا اور طول دے کر ستر ستر بندوں کے مرثیے لکھے۔ اب تک مرثیہ سوز کے لہجے میں پڑھا جاتا تھا۔ میر ضمیر نے سب سے پہلے تحت اللفظ میں مرثیہ پڑھنا شروع کیا۔ اس کے بعد سب اسی ڈگر پر چلنے لگے اور یہی پسندیدہ طریقہ قرار پایا۔

خلیق و ضمیر نے مرثیہ کو جس اوجِ کمال پر پہنچا دیا تھا اور اسے جیسا مکمل فن بنا دیا تھا بظاہر اس میں ترقی کی کوئی گنجائش نظر نہ آتی تھی۔ یہ انیس و دبیر کی قابلیت ہے کہ انھوں نے مرثیہ کی طرف توجہ کی تو اس زمین کو آسمان بنا دیا اور اپنے بزرگوں کے فن کو اتنا بلند کر دیا کہ ان کے مرثیے زینتِ طاقِ نسیاں بن گئے۔

رزمیہ (EPIC) یونان میں ہر اس نظم کو کہتے تھے جس میں موضوع کے ساتھ الفاظ پر، بیان کے ساتھ زبان پر اور خیال کے ساتھ طرزِ ادا پر زور دیا جاتا ہے۔ ہومر کی ایلیڈ (ELLIOD) اور اوڈیسی (ODDESSY) ورجل کی اینیڈ (AENEAD) فردوسی کا شاہنامہ، والمیکی کی راماین اور ویاس کی مہابھارت دنیا کی بہترین رزمیہ تصنیفات شمار کی گئی ہیں۔ اردو کا مرثیہ بھی ایک رزمیہ ہے اور بلاشبہ ان شہپاروں کی صف میں جگہ پانے کا مستحق ہے۔

رزمیہ کی سب سے بڑی خصوصیتیں دو ہیں۔ موضوع کی عظمت اور اسلوب کا شکوہ۔ اور مرثیے میں یہ دونوں باتیں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں۔ موضوع کی عظمت کے لیے کسی لمبی چوڑی دلیل کی ضرورت نہیں۔ امام حسینؑ اور ان کے رفقا کی شہادت جیسا اہم اور پُر عظمت واقعہ سب پر ظاہر ہے۔ در اصل اردو مرثیہ اس عظیم سانحے کی بازآفرینی ہے۔ رزمیہ ایک امت کے افکار، جذبات اور ولولوں کی ترجمانی کرتا ہے اور ایک پورے عہد کے خیالات اس میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ اردو مرثیہ میں اسلامی اخلاق و کردار کی عظمت ہے، ایثار و قربانی ہے، حق کے لیے سرفروشی کا جذبہ ہے، صداقت کے لیے سب کچھ قربان کر دینے کی تڑپ ہے، چھوٹوں پر شفقت اور بزرگوں کا احترام ہے، دوستوں سے محبت اور دشمنوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی مثالیں ہیں۔ غرض اردو مرثیہ اسلام کی بلند قدروں کا حامل ہے اور اس کے کردار ان قدروں کے جیتے جاگتے مرقعے ہیں۔

رزمیہ کے لیے جس تخیل کی بلندی اور پاکیزہ وجدان کی ضرورت بتائی گئی ہے وہ ہمارے مرثیہ نگاروں میں موجود ہے بلکہ اکثر دوسرے رزمیہ نگاروں سے بہتر ہے اس لیے کہ ان دونوں اوصاف کے ساتھ ان میں ایک خاص قسم کا جوش اور عقیدت مندانہ خلوص بھی پایا جاتا ہے جس نے مرثیے کے کرداروں میں زندگی کو اور زیادہ تابناک بنا دیا ہے اور اس کو ابدیت اور ان قدروں کو آفاقیت عطا کی ہے۔ اردو مرثیے کی فضا ایک وسیع اور غیر محدود فضا ہے۔ مرثیہ نگار اس میں اپنے تخیل کی بلند پروازی دکھاتا ہے اور اس نقطے پر پہنچ جاتا ہے جہاں دوسروں کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ تخیل کی یہ بلند پروازی EPIC کی خاص چیز ہے۔ اس سے رزمیہ میں عظمت و شان اور شوکت و شکوہ پیدا ہوتا ہے اور یہ صنعت مرثیہ میں بدرجۂ کمال پائی جاتی ہے۔

مرثیے پر دو بڑے اعتراض ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ محض رونا رلانا سکھاتا ہے، دوسرے یہ کہ اس میں تاریخی واقعات کو بڑی حد تک بدل دیا گیا ہے بلکہ بہت سے واقعات اپنی طرف سے تراش کے شامل کر دیے گئے ہیں۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ مرثیہ مجلسوں کے لیے لکھا جاتا ہے اس کی حیثیت کسی تاریخی کتاب کی نہیں ہے اس لیے مرثیہ گو اور مرثیہ خواں کے مقصد کے لیے رنگ آمیزی اور مبالغہ از بس مفید اور ضروری ہوتا ہے۔ پھر اس پر اس زاویے سے بھی نظر ڈالنی چاہیے کہ مرثیہ ایک طرف رلاتا ہے تو دوسری طرف جھنجھوڑتا بھی ہے۔

مرثیہ فقط تاثر نہیں بلکہ سرے سے ہی مستقل شعور کو بیدار کرتا ہے۔ رُلانا مرثیے کا ابتدائی درجہ ہے۔ یہ اس کا مقصدِ اعلیٰ نہیں بلکہ اس کی آخری منزل ہے بلند جذبات کو بیدار کرنا اور اعلیٰ اخلاق کو ابھارنا۔ اسی طرح رزم و پیکار، معرکہ آرائی مرثیے کی انتہا نہیں بلکہ اس کی ابتدا ہے۔ اخلاق کو استوار کرنا، مزاحمت اور مقاومت کا جذبہ پیدا کرنا اور کردار کو بلندیوں تک پہنچانا۔ اگر انیس کے مرثیے کو غور سے دیکھا، پڑھا جائے تو وہ ان مقاصد اور بلند مقاصد کو پورے حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیتا ہے۔

سچ یہ ہے کہ انیس و دبیر کے مراثی میں سے عمدہ ترتیب کے ساتھ اگر واقعاتِ کربلا امام کے قبل و مابعد کے حالات کو ایک مسلسل مدوّن کتاب کی شکل میں لیا جائے تو کوئی سبب نہیں کہ ان کو دنیا کی رزمیہ کتابوں میں بہت آگے جگہ نہ ملے۔ اس وقت یہ دعویٰ صرف اس لیے مہمل نظر آتا ہے کہ مرثیے میں رزمیہ کی تمام خصوصیات منتشر صورت میں پھیلی ہوئی ہیں اور کسی ایک مرثیے کو پڑھتے وقت ہمارے سامنے یک لخت نہیں آتیں۔

انیس کے مراثی اُردو ادب اور رزمیہ شاعری کا شاہکار ہیں۔ مناظرِ قدرت کے بیان، انسانی جذبات کی مصوری اور مردم شناسی میں ان کو حیرت ناک قدرت حاصل ہے۔ فنی مہارت، بلند تخیل، مضمون آفرینی اور تفصیلی ژرف نگاہی کی اس سے بہتر مثالیں تلاش کرنی مشکل ہیں۔ میدانِ جنگ اور معاملاتِ رزم کی ایسی مکمل نقشہ کشی ہے کہ پوری تصویر نظر کے سامنے آجاتی ہے۔ انیس کے ہاں مبالغہ بھی ہے اور تکلف و تصنع بھی لیکن ان کی شاعرانہ خوبیوں نے ان سب پر ایسا پردہ ڈالا ہے کہ یہ چیزیں عیب کی جگہ حسن بن گئی ہیں۔ ایک اور بات بھی ہے۔ انیس نے اتنے کثیر اور ایسے طویل مرثیے لکھے اور اتنے مختلف مطالب و مضامین بیان کیے کہ ان سے زبان کا دائرہ غیر معمولی طور پر وسیع ہو گیا۔ شاعرانہ حسنِ بیان اور طرزِ ادا کے بے انتہا راستے کھل گئے اور اس معاملے میں یقیناً مرثیے نے غزل اور مثنوی سے کچھ کم خدمت انجام نہیں دی۔ اسی طرح محاورات اور الفاظ نے انیس کے ہاتھوں نئی زندگی اور تابناک روپ پایا۔ سادہ، عام فہم اور سلیس زبان استعمال کر کے انیس نے فطری شاعری کا ایک بلند معیار قائم کیا۔

شبلی نے انیس کے کلام میں جو خوبیاں تلاش کی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے۔ ان کا کلام فصیح و بلیغ ہے۔ روزمرہ بڑی خوبی سے استعمال کیا ہے۔ انتخابِ الفاظ مضمون و موضوع کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ تکرار اور ردیف و قافیہ میں بھی موقع اور محل کے لحاظ سے موزونیت قائم رکھتے ہیں۔ جزئیات نگاری میں استادانہ مہارت، جذباتِ انسانی کے بیان کا خاص سلیقہ، منظر نگاری اور مظاہرِ قدرت کے بیان میں فن کاری کا کمال، واقعہ نگاری میں مہارت اور تشبیہات و استعارات میں جدت و ندرت ہے۔ نیز مبالغہ کی ناپسندیدہ شکلوں سے انھوں نے احتراز کیا ہے یا حسنِ بیان سے ان کو قابلِ قبول بنا دیا ہے۔

چند مثالیں دیکھیے۔ میر انیس صبح کا منظر پیش کرتے ہیں ؎

طے کر چکا جو منزلِ شب کاروانِ صبح — ہونے لگا افق سے ہویدا نشانِ صبح
گردوں سے کوچ کرنے لگا اخترانِ صبح — ہر سو ہوئی بلند صدائے اذانِ صبح
پنہاں نظر سے روئے شبِ تار ہو گیا
عالم تمام مطلعِ انوار ہو گیا
خورشید نے جو رخ سے اٹھائی نقابِ شب — در کھل گیا سحر کا ہوا بند بابِ شب

انجم کی فوج ٹوٹ کے سکۂ حسابِ شب   مہرِ کشتۂ صبح سے نکلا آفتابِ شب
گردوں پہ رنگِ چہرۂ مہتاب فق ہوا
سلطانِ شرق و غرب کا نظم و نسق ہوا

یوں گلشنِ فلک سے ستارے ہوئے رواں   چن لے چمن سے پھول کوئی جیسے باغباں
آئی بہار میں گلِ مہتاب پر خزاں   مرجھا کے گر گئے ثمر و نخلِ کہکشاں
دکھلائے طور بادِ سحر نے سموم کے
پژمردہ ہو کے رہ گئے غنچے نجوم کے

حضرت امام حسینؑ کی جماعت صبح عاشورہ میں مصروفِ نماز ہے کہ مخالفوں کی طرف سے دستِ ستم بڑھتا ہے۔ میر انیس کی زبانی سنئے ۔

گردوں پہ جب ریاضِ سحر کا ورق کھلا   یعنی کتابِ ذکرِ خدا کا سبق کھلا
بزمِ جہاں میں دفترِ نظم و نسق کھلا   ظلمت نہاں ہوئی درِ باغِ شفق کھلا
پہنچا فلک پہ ماہ کہ حکمِ انقلاب کا
صبح ہوا سے پھول کھلا آفتاب کا

ہونے لگے چراغِ نجوم آسماں پہ گل   ترنا بجنے لگی سپہ سعد میں بجا شگل
بپا حسینیوں میں ہوا یاں اذاں کا غل   پڑھنے لگے نماز شہنشاہِ جزو و کل
قدسی ہوئے نثار جماعت کی شان پر
نعرے نمازیوں کے گئے آسمان پر

سجدوں میں یاں جھکے تھے ابھی عابدوں کے سر   فوجِ ستم میں ہو گئیں صف بندیاں ادھر
دو چار تیر آ کے گرے جب قریب تر   حضرت پہ آ کے بولا کہ عباسِ نامور
کی عرض سرکشی پہ یہ سب فوجِ شام ہے
فرمایا آپ نے یہ اجل کا پیام ہے

حضرت عباسؑ میدانِ جنگ میں تلوار چلا رہے ہیں۔ انیسؔ کی زبان سے تلوار کی کاٹ کا بیان سنئے ۔

نکلی ادھر غلاف سے وہ برقِ شعلہ ریز   چمکی مثالِ ذوالفقار جس کی زباں تیز
بھڑکے شرر بھڑکنے لگی آتشِ ستیز   گھبرا کے اہلِ بغض نے چاہا گریز
آیا خدا کا قہر ہر اک روسیاہ پر
بجلی چمک کے ہو گئی سارے سپاہ پر

جب وار چل گیا سپرِ آہنیں کٹی   دستانہ کٹ کے ہاتھ کٹا آستیں کٹی

مقتل کشا، دو نیم ہوا ہر جبیں کٹی — سینے کو لے کے ہاتھ جو اتری زمیں کٹی
پھنگ تھا فرس تو رہا پا سوار تھا
اللہ رے صفا کہ تیغ نے جانا نہ پار تھا

آئی جدھر ادھر میں سپاہ بکھری ہوئی — حالی صفوں میں اور صدا ابستری ہوئی
بے جان تھا جس پہ سایۂ شمشیر ہو گئی — پھرتی تھی ساتھ ساتھ اجل دوڑتی ہوئی
آنکھ اس کی قہر تھی کوئی کیونکر ہٹا نہ جائے
چھپتی تھی برق بھی کہ ہوا اس کی لگ نہ جائے

جس کے گلے سے مل کے چلی کر کے رہ گیا — بسمل بھی تیغ تیز کا دم بھر کے رہ گیا
آگے بڑھا کوئی تو کوئی ڈر کے رہ گیا — پیچھے ہٹا کوئی منہ پہ نظر کر کے رہ گیا
وہ پتلیاں بھی بہر تماشا تنی رہیں
سر کٹ گئے مگر یہ نگہ آنکھیں کھلی رہیں

حضرت امام حسین علیہ السلام کی سواری کی شان اور گھوڑے کی آن بان ملاحظہ کیجیے ۔

مولا چڑھے فرس پہ محمد کی شان سے — ترکش لگایا بر میں تو کس آن بان سے
نکلا یہ جن و انس و ملک کی زباں سے — اترا ہے پھر زمیں پہ براق آسماں سے
رہوار چلبلا خرام میں کبک دری کا ہے
گھوڑا کشش میں دل کا ہے چہرہ پری کا ہے

غصے میں انکھڑیوں کے اُبلنے کو دیکھیے — جوبن پہ جھوم جھوم کے چلنے کو دیکھیے
سانچے میں جوڑ بند کے ڈھلنے کو دیکھیے — تھم کر کنوتیوں کے بدلنے کو دیکھیے
گرمی میں ڈالیں ہاتھ پہ بجلی کو شوق ہے
بالا دری میں اس کو ہما پر بھی فوق ہے

تھم کر ہوا چلی فرس خوش قدم بڑھا — جوں جوں وہ سوئے دشت بڑھا اور دم بڑھا
گھوڑوں کی ایک اُڑ نے باگیں علم بڑھا — رایت بڑھا کہ سرو ریاض ارم بڑھا
پھولوں کو لے کے بادِ بہاری پہنچ گئی
بستان کربلا میں سواری پہنچ گئی

مرزا دبیر کے مراثی ضخامت میں انیس سے زیادہ ہیں لیکن نقادوں نے ان کا رتبہ انیس کے بعد رکھا ہے۔ یہ عجیب لطیفے کی بات ہے کہ ان کے اپنے زمانے میں دبیر کو انیس پر ترجیح دی جاتی تھی مگر انیس کی قدر و حرمت بھی کچھ کم نہ تھی۔ انیسیوں اور دبیریوں نے دونوں کو باہم ٹکرایا اور مقابلے اور مناظرے کا طوفان برپا کر دیا ـــ لیکن یہ دونوں کبھی اس طرح ایک دوسرے سے ملنے نہیں آئے اور ایک دوسرے کے

رتبے کو پہنچتے ہے۔

مرزا دبیر کے کلام میں بھی یہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو انیس کے کلام میں بیان کی گئیں۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ دبیر کا منتخب کلام انیس کے عام کلام سے ٹکر لے سکتا ہے ورنہ ان کے ہاں تکلف و تصنع اور لفظی صنعت گری کی بہتات ہے۔ اضافات اور بندشوں کی شان و شکوہ تخیل کی بلندی اور مضمون آفرینی ان کے ہاں انیس سے زیادہ ہے۔ یہ لکھنؤ کا خاص رنگ اور خاص مزاج تھا اسی لیے کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اس زمانہ میں دبیر کو انیس سے زیادہ مقبولیت حاصل تھی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پُر تکلف مجلسوں میں خواص کے حلقوں میں بہ مقابلہ انیس کے مرزا دبیر زیادہ شریک ہوا کرتے تھے اس سبب اس زمانے کا لکھنؤ ان سے زیادہ عقیدت رکھتا تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ مرزا دبیر شاعرانہ مزاج رکھتے تھے اور فن پر بھی ان کو عبور تھا اس لیے ان کے ایسے مرثیے اور مرثیوں میں ایسے مضامین بھی ہیں جہاں مذکورہ بالا صفات اعتدال سے کام میں لائی گئی ہیں اور زبان و بیان، سلاست و روانی، روزمرہ و محاورہ کا لحاظ کیا گیا ہے اور یہی مقامات اور حصے ایسے ہیں کہ ان کو انیس کے کلام میں ملا دیجئے تو امتیاز کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ پس انیس کو دبیر پر تفوق صرف اس اعتبار سے حاصل ہے کہ ان کے ہاں ایسے مقامات بہت زیادہ ہیں اور دبیر کے ہاں کم۔

شبلی کا یہ قول کہ "فصاحت ان کے (دبیر کے) کلام کو چھو نہیں گئی ہے۔ بندش میں تعقید اور اغلاق، تشبیہات و استعارات اکثر دور از کار، بلاغت نام کو نہیں۔ کسی چیز یا کسی حالت کی تصویر کھینچنے سے وہ بالکل عاجز ہیں۔ خیال بندی و مضمون آفرینی البتہ ہے" سراسر نادرست ہے۔ موازنۂ انیس و دبیر کے جواب میں سید نظیر الحسن نے المیزان لکھی اور تفصیل سے ایک ایک اعتراض کا جواب دیا اور دبیر کے کلام سے ایسی مثالیں پیش کیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ دبیر کے مرثیوں میں بھی وہ تمام محاسن پائے جاتے ہیں جو شبلی نے صرف انیس کی خصوصیات بتائے ہیں۔

یہ لطیفہ ادبی تاریخ میں یادگار ہے جس سے شبلی کی انصاف پسندی کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ جب ان کو "المیزان" بھیجی گئی ۱
تو انہوں نے مصنف کو ایک طویل خط لکھا جس میں لکھتے ہیں:۔

> "ضعف کی وجہ سے روزمرہ کے ضروری مشاغل کے سوا کسی کام کا نہیں رہا۔ تاہم آپ کی کتاب کی دلچسپی نے میرا کافی وقت لیا۔ آپ نے نہایت متانت اور سنجیدگی سے کتاب کا جواب لکھا ہے جو اس زمانے میں نہایت غنیمت ہے۔ آج مجھ کو موازنہ کی قدر ہوئی۔ کیونکہ اس بہانے سے اردو میں ایک اچھی کتاب کا اضافہ ہوا اور ایک باکمال (دبیر) کے جوہر اچھی طرح کھلے۔ آپ کی عنایت کا مشکور اور طرز تحریر کا مداح ہوں۔"

انیس و دبیر کا جامع فرق چند الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ انیس کا مقصد اثر آفرینی ہوتا ہے اور دبیر کا مضمون آفرینی۔ انیس کے ہاں نازک خیالی ہے اور دبیر کے ہاں بلند آہنگی۔ انیس اپنا زور بیان جذبات پر صرف کرتے ہیں اور دبیر نکتہ آفرینی پر۔ انیس زبان و محاورے کی طرف متوجہ ہیں اور دبیر شوکت الفاظ اور علمی نکات پر ہمیشہ نظر رکھتے ہیں۔ ایک نقاد نے خوب کہا ہے کہ "دبیر اپنا کمال منوانے کی کوشش کرتے ہیں اور انیس کے سامنے ہم خود جھک جاتے ہیں۔" مگر یہ بات کبھی نہیں بھولنی چاہیے کہ یہ موازنہ مجموعی حیثیت سے ہے ورنہ دبیر کا کتنا کلام ہے کہ انیس کے مرثیوں میں شامل کر دیا جائے تو ہرگز امتیاز نہیں کیا جا سکتا۔

مرزا دبیر کے کلام کا نمونہ دیکھئے صبح کا بیان کس طرح کرتے ہیں ؎

گلگونۂ شفق جو ملا حورِ صبح نے ۔ مہندی شب کی لگا لی عروسِ صبح نے
کی رونمائی روشنیٔ طورِ صبح نے ۔ مشاطۂ سحر نے کیا جلوۂ صبح نے
بیلے کو شب کے عشق کی دولت جو لُٹ گئی
افشاں جبیں سے انجمِ رخشاں کی چھٹ گئی

پیدا ہوا سفیدۂ طلعت نشانِ صبح ۔ سلطانِ صبح نے کیا قصدِ اذانِ صبح
باندھا عمامہ صبح کا پہنا کلاہ مسیح ۔ چرخِ چہارمی پہ گیا خطبہ خوانِ صبح
زرد سب کے منہ سے قبلہ اسیر ہو گئے
سرگرمِ سجدۂ عیسیٰ خورشید ہو گئے

پرچم کشا ہوا علمِ زر فشانِ مہر ۔ لی روز نے پناہ بزیرِ نشانِ مہر
آیا عروج پہ شہِ اقلیمِ آسمانِ مہر ۔ اور لشکرِ شعاع نے تانی سنانِ مہر
نیزہ کرن کا دیدۂ گردوں میں ڈال کر
مغرب میں پھینکی رات کی پتلی نکال کر

مرزا دبیر کی زبانی حضرت عباسؑ کے سراپا کے چند بند سُنئے۔ فرماتے ہیں ؎

گو خلعتِ تحسین مجھے حاصل ہے سراپا ۔ پر وصف سراپا کا تو مشکل ہے سراپا
ہر عضوِ تن اک قدرتِ کامل ہے سراپا ۔ بے روح ہے سرتابقدم دل ہے سراپا
کیا ملتا ہے گر کوئی جھگڑتا ہے کسی سے
مضمون بھی اپنا نہیں لڑتا ہے کسی سے

آئینہ کہا رخ کو تو کچھ بھی نہ ثنا کی ۔ صنعت وہ سکندر کی یہ صنعت ہے خدا کی
واں خاک نے صیقل، یہاں قدرت نے جلا کی ۔ طالع نے کس آئینہ کو یہ جلا عطا کی
ہر آئینے میں چہرۂ انساں نظر آیا
اس رخ میں جمالِ شہِ مرداں نظر آیا

بے شک جبیں ہے نگہ اہلِ یقیں میں ۔ بس ایک یہ خورشید ہے افلاک و زمیں میں
جلوہ ہے عجب ابروؤں کا قربِ جبیں میں ۔ دو مچھلیاں ہیں چشمۂ خورشیدِ مبیں میں
مردم کو اشارہ ہے یہ ابرو کا جبیں پر
ہیں دو مہِ نو جلوہ نما چرخِ بریں پر

گر آنکھ کو نرگس کہوں ہے یہ حماقت　　　نرگس میں نہ پلکیں ہیں نہ پتلی نہ بصارت
چہرے سے ہویدا ہو عید کی ہے جلوہ نما شان تیرا　　　وہ حیدر کا فرزند ہے یہ حیدر کی شباہت
ابرو کی یہ خوزیبی، نہ جنبش ہے نہ ضو ہے
اک شب مہ نو ہے یہ ہر شب مہ نو ہے

حضرت حُر میدان جنگ میں آتے ہیں اور اپنی تلوار کے جوہر دکھاتے ہیں یہ مرزا دبیر کی زبان سے سنئے۔

اللہ رے شناور شمشیر آب دار　　　دکھلا دیئے صفائی کے سب ہاتھ ایک بار
دریائے حرب ضرب سے کے گرداب کا ہار　　　جوہر کا ایک بال بھی ڈوبا نہ زینہار
اک موج بڑھ کر بھی یہ صف دیکھ کر پھرا
ہاتھ اک طرف نہ تیغ کا ناخن بھی تر ہوا

غواص تھی یہ تیغ کہ دریا تھی یہ حسام　　　دریا بھی وہ کہ جس کا سمندر ہے ایک جام
مرغابیوں کی طرح سے سارا ہوا فوج شام　　　دریائے آب تیغ میں تھے غوطہ زن تمام
یوں غرق آب تیغ ستمگر صف ہوتے تھے
جد و پدر کا نام بھی بالکل ڈبوتے تھے

ڈر ڈر کے آب تیغ سے سب گھاٹ گھر گئے　　　غصے سے ہو کے ہیں یہ جبیں کچھ اُٹھ گئے
دو حصوں کا ایک پل بنا اور سر اتر گئے　　　اک وار میں غنیم کے پار اُن کے سر گئے
حیرت سے جاں فنا ہوئی قالب کھڑا رہا
کشتی تو غرق ہو گئی لنگر پڑا رہا

شمشیر حُر کے رعب سے بسمل ستے تھے شقیا　　　گر پیدلوں کی سمت کو رخ تیغ نے کیا
سر کاٹ کر زمیں پہ کاندھے سے گرا لیا　　　واں سے اُچھل کے سواروں کا اُٹھ کے دھر لیا
حیرت ہے کٹ کے بھی نہ گرا سر زمین پہ
تن گر پڑا زمیں پہ سر بیٹھا زین پہ

انیس و دبیر کے زمانے میں نیز ان کے بعد کئی دوسرے باکمال مرثیہ گو گزرے ہیں لیکن قدرتی بات تھی کہ انیس و دبیر کے کمال اور شہرت کے سامنے ان میں سے کسی کو فروغ حاصل نہ ہو سکتا تھا۔ میر خلیق کے تین لڑکے تھے۔ انیس، مونس اور انس۔ انس بھی مرثیہ کہتے تھے لیکن ان کے مرثیوں کو کوئی خصوصی حیثیت حاصل نہ ہوئی البتہ میر مونس مرثیہ گوئی میں ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔ انھوں نے اپنے مرثیوں میں مشکل زمینیں اختیار کی ہیں لیکن زبان کی شستگی اور سلاست و روانی میں کوئی فرق نہیں آنے پایا۔ ان کو سلام گوئی میں بے مثال مانا گیا ہے۔ مونس کے مراثی تین ضخیم جلدوں میں مرتب ہو چکے ہیں۔ میر مونس کے ایک مرثیے سے میدان کربلا میں صبح کا منظر دیکھیے۔

آمد وہ آفتاب کی اور وہ سحر کا نور　　　کافور ہو گیا تھا فلک پہ قمر کا نور

بالا تھا نخل طور سے ہر اک شجر کا قد — پیدا تھا ہر چمن کی مہک دشت و صحرا میں
غنچوں کے منہ دھوئے تھے شبنم نے تھے دھوئے
گویا گلوں نے عطر میں کپڑے بسائے تھے

بستان کربلا کی وہ بڑھ باس وہ بہار — ہر غنچہ خوش فضا کا چٹکنا وہ بار بار
کو کو وہ قمریوں کی وہ طاؤس کی پکار — نالے وہ بلبلوں کے وہ ہونا وہ آبشار
کرتے تھے وجد جب وہ ہوا کربلا میں
بن میں غزال مست تھے ضیغم کچھار میں

ایک مرثیہ کی تمہید ملاحظہ کیجئے ۔

اے چشم تر برس کے خجل کر سحاب کو — سر سبز کر حدیقۂ کشت ثواب کو
رو ان کی پیاس پر کہ ترستے رہے آب کو — غم ہو گا آج کس سے رسالت مآب کو
جاں کاہ واقعہ ہے امامِ انام کا
کرتا ہوں ذکر قتل شہِ تشنہ کام کا

جب دوپہر میں قتل ہوا سب خدا کی فوج — کوثر پہ تشنہ کام گئی مصطفیٰ کی فوج
باقی رہی مصیبت و رنج و بلا کی فوج — تنہا علی کا لال تھا اور اشقیا کی فوج
بے جاں تھے اقربا شہِ گردوں جناب کے
اختر پڑے تھے خاک پہ گرد آفتاب کے

جنابِ امام سوار ہوتے ہیں ۔

روح الامیں نے شان سے جب تھام لی رکاب — مرکب پہ جلوہ گر ہوا زہرا کا آفتاب
وہ کر و فر وہ دبدبہ وہ سطوت جناب — گویا چڑھے تھے غزوۂ خیبر پہ بوتراب
نصرت ادھر قریں تو ادھر ساتھ ساتھ تھی
تھامے ہوئے رکاب ظفر ساتھ ساتھ تھی

اسپِ حسین حسن میں رشکِ براق تھا — پریوں کو جس کے دیکھنے کا اشتیاق تھا
شہباز سے بھی تیز پری میں وہ طاق تھا — رکنا زمیں پہ ایک قدم اس کو شاق تھا
حیراں تھے جانور بھی یہ عالم تھا آن کا
کٹتا تھا ہر طرارے میں قصہ زماں کا

سراپائے امام عالی مقام ملاحظہ ہو ۔

تھے لحن میں حسین شبیہ شہِ امم — [illegible]

ابرو وہی خمیدہ و پیچیدہ و بہم | مُنھ چاند سا وہی، وہی شوکت وہی حشم
ایسا حسیں جہاں میں نہ انساں نہ جن ہوا
گھر سے اندھیری رات کو نکلے تو دن ہوا

حق بیں ہے چشمِ پاک شہنشاہِ خوش نہاد | نورِ بصر ہے جس کی سیاہی کا خانہ زاد
قربان تیری چشم کے اے قبلۂ مراد | عینِ عطا یہ ہے کہ ہر اک کی ہے پہ صاد
تیری ہی رحمتوں سے یہ سب نور و سرور ہیں
وہ بھی تو دیکھیں دیدۂ دل جن کے کور ہیں

خورشید نور ہے رُخِ شاہِ فلک وقار | حُسن و جمالِ مصطفویؐ جس سے آشکار
مہتاب کیا مقابلہ کرتا ہے بار بار | روشن ہے وہ سیاہ، یہ کامل وہ داغدار
کیونکر دکھاؤں عارضِ انور جناب کا
افسوس منہ اِدھر کو نہیں آفتاب کا

جنابِ امامؑ کی تلوار کی کاٹ مونس کی زبان سے سُنیئے ؎

آئی جدھر کو سیف زباں میں نکال کے | ٹوٹے جنوب پر تو بھاگے شمال کے
پامال تھے پرے سپہ بد خصال کے | جلوے دکھا رہی تھی پری اپنی چال کے
جس پر گری وہ خاک سیہ وقتِ جنگ تھا
اس شعلہ رُو کے سایہ میں بجلی کا ڈھنگ تھا

بڑھتے ہی صف سے پاؤں سرِ پہلواں کٹا | روکی کہ ڈھال کٹ گئی گرز و کماں کٹا
خنجر کہیں کھنچا تو بسانِ زباں کٹا | بیرق کٹی، قلم ہوا نیزہ، نشاں کٹا
دو ہو گیا وہ جنگ پہ جو شخص تُل گیا
اک اک پہ کاٹ تیغِ دو پیکر کا کھل گیا

تھرّاتے تھے منہ اس کا ستمگار دیکھ کر | بھنوں کے دم نکل گئے تھے دھار دیکھ کر
چہرہ بگاڑ دیتی تھی جب وار دیکھ کر | سر کاٹتی تھی لاکھ میں سردار دیکھ کر
مخفی نگاہ سے کہیں اہلِ ستم نہ تھے
جوہر بھی اس کے دیدۂ بینا سے کم نہ تھے

تیغِ دو سر نے معرکہ جیتا لڑائی میں | دم بھر لگی نہ دیر صفوں کی صفائی میں
ضربت کی دھوم ہو گئی ساری خدائی میں | خشکی میں زلزلہ تھا تلاطم ترائی میں
اعدا کے بھاگ جانے کی راہیں جو بند تھیں
ہر سو اماں اماں کی صدائیں بلند تھیں

مرثیہ کا مضمون جذبہ و عقیدت کا طلبگار ہے۔ سانحۂ کربلا اور شہادت کے واقعات سے ہر مسلمان کو کامل وابستگی اور عاطفانہ عقیدت ہوتی ہے۔ پھر دربار اودھ نے ماحول ایسا بنا دیا تھا کہ مرثیہ گو حضرات کی زیادہ سے زیادہ قدر کی جاتی تھی اس لیے انیسویں صدی میں لکھنؤ مرثیہ گوئی کا مرکز بن گیا ——— انیس و دبیر کے خاندان اور شاگردوں نے اپنے زور بیان سے اچھے اچھے گل کھلائے اور مرثیے کے وسیع دامن کو اور زیادہ وسیع کیا۔

انیس و دبیر کے حلقوں کے علاوہ لکھنؤ میں دو اور ممتاز خاندان تھے جنہوں نے مرثیہ نگاری میں بڑا نام پایا تھا۔ عشق کا خاندان جس کی میر انیس کے گھرانے سے رشتہ داری بھی ہو گئی تھی۔ ان لوگوں نے انیس و دبیر کی زندگی ہی میں مرثیہ گوئی شروع کر دی تھی۔ دوسرے لکھنؤ کے مجتہدین کا خاندان جن میں بعض حضرات شعر و شاعری کا ذوق رکھتے اور اچھے مرثیے لکھتے تھے۔ ان حضرات میں [illegible] شفتہ وغیرہ باکمال مرثیہ گو گزرے ہیں۔

خاندان عشق میں سید مرزا تعشق سب سے ممتاز مرثیہ گو تھے۔ گو میر انیس سے عمر اور رتبہ میں بہت چھوٹے تھے مگر انیس ان کے ذوق سلیم کے اس حد تک معترف تھے کہ مجلس میں پڑھنے سے پہلے اپنا مرثیہ اکثر تعشق کو سنا دیا کرتے تھے۔ تعشق کو غزل سے بڑا لگاؤ تھا جس کا اثر ان کے مرثیوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ اس خاندان میں عشق و تعشق کے بعد رشید، عمید اور مودب وغیرہ اچھے مرثیہ گو گزرے ہیں۔ خاندان دبیر میں سب سے زیادہ مشہور اور ممتاز مرثیہ گو مرزا دبیر کے لڑکے مرزا اوج تھے۔ ان کے کلام میں دبیر اور انیس دونوں کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ خاندان دبیر کے شاگردوں میں شاد عظیم آبادی، صفیر بلگرامی اور افضل حسین ثابت سب سے نمایاں مرثیہ گو ہوئے ہیں۔

مرزا اوج کے کلام کا نمونہ ملاحظہ کیجیے۔ میدان کربلا میں رات کے بھیانک وقت کی تصویر کھینچتے ہیں ؎

ظلمت کی ہوئی جب زلف کشا پردۂ شب تھا   بخت سیہ روز چھپا پردۂ شب میں
سرکی جو رخ مہر سے ردا پردۂ شب میں   روپوش ہوا چہرہ نما پردۂ شب تھا

چہروں سے نقابوں کو ہٹانے لگے انجم
گردوں پہ صفیں اپنی جمانے لگے انجم

گھاٹوں پہ وہ کم ظرفوں کا آ آ کے اُترنا   اور پیاس سے وہ عترت شبیرؑ کا مرنا
وہ ہونکنا شیروں کا وہ اطفال کا ڈرنا   وہ رات کا وقت اور وہ غضب شورش قرنا

سہمے ہوئے جو گودیوں میں سوتے تھے بچے
اس غلغلے سے چونک کے غش ہوتے تھے بچے

حضرت عباسؓ نے نہر فرات سے مشک بھر لی ہے مگر یزیدی فوج مانع ہوتی ہے۔ گھمسان کا رن پڑتا ہے۔ حضرت عباسؓ کی شجاعت کا یہ منظر مرزا کے الفاظ میں سنیئے ؎

ساحل پہ مثل سبزۂ خود رو صفیں جمیں   آگے بڑھے وغا کو سراپا سیاہ کیں
پھر اب تو شیر علمدار شاہ دیں   سینوں میں دل الٹ گئے الٹی جو آستیں

خورشیدِ ماہِ نو ہوا مستورِ زین پہ
رایت سے مشکِ کوں کے ٹکڑے ہوئے زمین پہ

جس نے نظر کی مشک کی جانب اٹھا کے سر — گردن ادھر قلم ہوئی تارِ نفس ادھر
پیدل کوئی سوار بڑھا اس طرف اگر — دستے بہا بہا کے گرا خود سے کر ٹھوک کر
ممکن نہ تھا ہوا کا گزر ہو حصار میں
ضیغم شکار کھیل رہا تھا کچھار میں

جس سمت برقِ تیغ چمکتی ابھری چلی — شعلے کی تھی زباں کہ لپکتی ہوئی چلی
سایے سے اس کے دھوپ سرکتی ہوئی چلی — پیچھے قضا چلی پہ جھجکتی ہوئی چلی!
سب کو ہٹ سے شجاع کے ملتا ادھر ادھر
ہاتھوں سمیت گرتے تھے بھالے ادھر ادھر

آخر حضرت عباسؓ شہید ہو جاتے ہیں۔ جناب امامؑ، حضرت علی اکبرؓ کے ساتھ لاشۂ عباسؓ پر پہنچتے ہیں۔ یہ حالت مرزا اوجؔ سے سنیئے۔

اس وقت ان کے سینے میں آکر رکا جو دم — گھبرا کے سر کیا قدمِ شاہِ دیں پہ خم
پیاسا چلا جہاں سے بہشتی سوئے ارم — ہچکی جو آئی کانپ گئے سر سے تا قدم
کملا کے رنگ پھول سے منہ کا بدل گیا
آنکھیں سوئے امام رہیں دم نکل گیا

اک آہ سرد بھر کے اٹھے سیدِ زمانؑ — روتے ہوئے خیام کو حضرتؑ ہوئے رواں
مشک و علم اٹھا کے چلے اکبرؓ جواں — ہر ہر قدم پہ گرتے تھے سرورِ بیاں ہاں
ابتر تھا حالِ زارِ امامِ غیور کا
گردن جھکائے ساتھ تھا گھوڑا شہید کا

خاندانِ انیسؔ میں کئی ایسے باکمال مرثیہ گو گزرے ہیں جنھوں نے اپنے بزرگوں کی نیک نامی میں اضافہ کیا۔ مونسؔ اور انسؔ کے بعد میر انیسؔ کے بیٹے نفیسؔ، ان کے بھتیجے وحیدؔ، نفیسؔ کے بیٹے عروجؔ، نفیسؔ کے نواسے عارفؔ اور انیسؔ کے نواسے پیارے صاحب رشیدؔ سب صفِ اوّل کے مرثیہ گو تھے۔

انیسؔ کی وفات کے وقت نفیسؔ کی عمر تقریباً پچاس سال کی تھی۔ تمام فن اپنے والد سے حاصل کر کے استاد بن چکے تھے اس قدر کمال دکھایا کہ انیسؔ کے کلام سے اپنا کلام ملا دیا۔ صرف اتنا فرق نظر آتا ہے کہ علمیت کا ذوق رکھنے کے سبب سے زور و جوش کے موقع پر کلام کو پُرشکوہ بنا دیتے ہیں۔ نفیسؔ نے مرثیہ میں ساقی نامہ کا بھی اضافہ کیا تھا۔ کچھ مثالیں دیکھئے۔ صبح کا منظر پیش کرتے ہیں۔

بیاضِ صبح کا جب چہرۂ رخ پر ظہور ہوا — جو زورِ تیرگیِ شب کا تھا وہ دور ہوا

روئے سحر سے خجل حسنِ روئے عید تھا — مجید کون و مکاں آسماں کا نور تھا
میلے خالقِ لیل و نہار اٹھنے لگے
پئے نماز جماعت گزار اٹھنے لگے
دکھا رہی تھی ادھر خوبیاں سحر کی ضیا — کہ جس کی شرم سے گھٹتی جاتی تھی قمر کی ضیا
وہ آب بحر کی شعاع اور وہ دشت و در کی ضیا — ہر ایک چمن کا وہ جلوہ وہ ہر شجر کی ضیا
گلوں سے مل کے جو باہر نسیم آتی تھی
مشامِ جاں کو بسانے شمیم آتی تھی

تلوار کی تعریف میں فرماتے ہیں —

یہ تیغ وہ ہے سیلِ فنا کہتے ہیں جس کو — یہ برق وہ ہے قہرِ خدا کہتے ہیں جس کو
باڑھ اس کی وہ آفت ہے بلا کہتے ہیں جس کو — منہ اس کا وہ منہ ہے کہ قضا کہتے ہیں جس کو
جاتی نہیں بے جاں لیے جب آتی ہے سر پہ
ثابت نہیں ہوتا کہ یہ کب آتی ہے سر پہ

سید ہادی وحید انس کے بیٹے اور مونس کے بھتیجے تھے۔ مرثیوں میں علمیت کا اظہار اور اصطلاحات کو کام میں لانا انیس کے بعد بہت بڑھ گیا تھا۔ وحید اس رنگ کے استاد تھے اور بڑے کمال کے ساتھ علمی رنگ کو نباہ جاتے تھے۔ نفیس کے بعد ان کو مرثیہ گوئی میں کامل سمجھا گیا ہے۔

پیارے صاحب رشید کو اس قدیم باکمالوں کے سلسلے کی آخری کڑی بتایا جاتا ہے۔ ان کے مرثیے نہایت شاندار ہیں۔ زبان کی صفائی، روزمرہ، محاورہ بندی، سلاست اور روانی ان کو ورثہ میں ملی تھی جس کا انھوں نے پورا پورا حق ادا کیا ہے۔ انھوں نے ساقی نامہ اور بہاریہ دونوں کا اپنے مرثیوں میں خاص التزام کیا۔ اس سے مرثیت میں جتنی کمی آئی ادبیت نے اس کی تلافی کر دی۔ کچھ مثالیں دیکھیے۔ پہلے ساقی نامہ کا ایک بند سنیے —

کدھر ہے اے مرے ساقی شرابِ کوثر دے — ترکے نہ ہاتھ پیالے پلا برابر دے
نہ جس کا نشہ گھٹے حشر تک وہ ساغر دے — نہ دے سبو و خم و جام دل ملا بھر دے
ترنگ نشے کی ہے رنگ اب بگڑتا ہے
کہ دیں پناہ سے اک دیں فروش لڑتا ہے

صبح عاشورہ کا منظر پیش کرتے ہیں —

صبح عاشورہ کی رخصت کا جو سامان ہوا — مستعدِ مرگ پہ اک رات کا مہمان ہوا
آسماں کا محل آباد تھا ویران ہوا — کہ ستاروں کا جو مجمع تھا پریشان ہوا
تھی جو دو چار گھڑی خلق میں مہماں شبنم
روتی تھی منہ پہ دھرے رات کا داماں شبنم

حضرت جعفرؓ اور حضرت زینبؑ کے صاحبزادے عون اور محمد ابھی کم عمر ہیں لیکن جوشِ شہادت ان کو بیتاب کر دیتا ہے۔ زینبؑ کی سفارش پر جناب امامؑ سے اجازت ملتی ہے۔ ان صاحبزادوں کی جنگ کا حال رشید کی زبان سے سنئے۔

اذن پا کر ہوئے خنداں گل و ریحانِ علیؑ   ہٹ کے گھوڑوں پہ چڑھے شیرِ نیستانِ علیؑ
دلبرِ فاطمہؑ و دل بندِ نبیؐ، جانِ علیؑ   وہ بہ جعفرِ طیار کا اور دوشِ علیؑ
رن سے تا چرخ صدائے دف و قرنا پہنچی
دفعتاً فوج میں آنے کی خبر جا پہنچی

باگیں اٹھتے ہی روانہ ہوئے گھوڑے اک بار   ہر کماں زہ ہوئی تیروں کی ہوئی اک بوچھار
نقشِ پا بجھ گئے لیکن ہوئے پیدا ہموار   نیزے لے لے کے جھپٹے فوجِ ستمگر کے سوار
گل کھلا کر مگر ان کی سواری نہ رکی
کلیاں شاخیں نزہتِ بادِ بہاری نہ رکی

جب کئے وار تو سب فوجِ ستمگار چلی   ساتھ ہی ان کے بھی شمشیرِ شرربار چلی
کٹ گئے سر صفِ لشکر طرفِ نار چلی   صفِ آخر میں ہوا شور کہ تلوار چلی
ضرب وہ تھی کہ جگرداروں کے دل توڑ دیے
وہ جواں بچوں نے وہ لاکھوں کے منہ موڑ دیے

آگیا حشر جو لشکر پہ وہ جرّار چلے   نیچے کر کے علم فوج کے اس پار چلے
کہہ کے یہ جان و دلِ حیدرِ کرّار چلے   حشر تک نام رہے آج وہ تلوار چلے
فوجیں ہٹ جاتی ہیں جب گرمِ وغا ہوتے ہیں
مرنے والوں کے ارادے ہی جدا ہوتے ہیں

سب نشاں اور پہ سالار نے گھوڑے باندھے   پرچم اک ایک علمدار نے گھوڑے باندھے
ڈورے تلوار کے کفار نے گھوڑے باندھے   پیچھے افواجِ ستمگار نے گھوڑے باندھے
بیم و امید میں سب فوج چلی جاتی ہے
کبھی بھاگو کبھی ٹھہرو کی صدا آتی ہے

سید علی عارف میر نفیس کے نواسے تھے اور نانا کے آغوش ہی میں انھوں نے پرورش پائی تھی چنانچہ ان کے مرثیوں میں نفیس کی زبان اور طرزِ ادا کا پورا اثر پایا جاتا ہے۔ وہ اپنے بزرگوں کے قائم کردہ قصر کے آخری ستون تھے جن کے بعد کوئی بڑا باکمال مرثیہ گو پیدا نہ ہوا۔ عارف کے ساقی نامہ کا ایک بند سنئے۔

ساقیا! ہاں، مئے جرأت کا پلا دے ساغر   بھر کے اک بادۂ تسنیم سے لا دے ساغر
واسطہ ساقیِ کوثر کا اٹھا دے ساغر   خود ہی بڑھ کر مرے ہونٹوں سے لگا دے ساغر

جوشِ جرأت سے سیرِ ملکِ قلم کرتا ہوں
جنگِ حیدر کے نواسے کی رقم کرتا ہوں

صبح کی منظر کشی کرتے ہیں ؎

رن میں جب آمدِ صبحِ شبِ عاشور ہوئی — تیرگی شرم سے ظلمات میں مستور ہوئی
صبح کے فیض سے جنگل کی زمیں نور ہوئی — خلعتِ نور ملا، لیلیٰ شب حور ہوئی
وہ سماں اور وہ نورِ سحری کا جلوہ
نظر آنے لگا ہر شے میں پری کا جلوہ
کچھ فلک پر جونہی پلٹے گئے آثارِ سحر — آمدِ خسروِ خاور کی ہوئی گرم خبر
تھا جو معلوم کہ درپیش ہے دن بھر کا سفر — باندھ لی شمس نے بھی نورِ سحر کی چادر
عکسِ اشجار سے پیدا تھی عجب جلوہ گری
نظر آتا تھا ہر اک رنگ عقیقِ جگری

مرثیے کا مضمون جذبہ و عقیدت کا طلبگار تھا اس لیے سب اہلِ دل اور صاحبانِ عقیدت مرثیے لکھتے اور پُر زور بیان رکھتے تھے۔ شیعہ چھوڑ سُنّی گھرانوں میں بھی مدتوں یہ رسم قائم رہی کہ موزوں طبیعت لوگ سال بھر میں زیادہ نہیں تو ایک آدھ مرثیہ ضرور لکھتے تھے، اس لیے ایسے سب ناموں کی فہرست مرتب کرنا بھی ناممکن ہے۔ شاد عظیم آبادی، بیان یزدانی میرٹھی، آغا شاعر دہلوی اچھے مرثیہ گو تھے۔ اس آخری زمانہ میں نجم آفندی نے مرثیے کی روایت کو آگے بڑھایا اور اچھے مرثیے لکھے۔ جوش ملیح آبادی نے اپنے مرثیوں کو نئے قومی اور اصلاحی انداز میں پیش کر کے ایک نئی راہ قائم کی۔ اسی طرح قائم رضا نسیم امروہوی نے مرثیے میں ایک مفید جدت پیدا کی یعنی انھوں نے مرثیے کو قومی رنگ میں لکھا اور شہدائے کربلا کے اخلاقِ حسنہ اور کربلا کے سانحات کو آفاقی رنگ میں پیش کر کے مکارمِ اخلاق کے عملی اور تعمیلی پہلوؤں پر زور دیا۔

اُردو میں مرثیے کے عام مفہوم کے مطابق اس کا مقصد مراثیِ کربلا سے ہوتا ہے لیکن اپنے اصل اور وسیع مفہوم کے لحاظ سے مرثیہ عام ہے۔ چنانچہ ان معنوں میں بھی اُردو میں مرثیوں کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے۔ بہر حال اس موقع پر ملحوظ رکھنا چاہئے کہ تعزیت کی نظمیں اور قطعے یا قطعاتِ تاریخ مرثیے کے ذیل میں نہیں آتے۔ مرثیے کے دو اہم اجزا یعنی رنج و غم کا اظہار اور مرنے والوں کے اخلاق و کردار کا تذکرہ جب تک حسن و خوبی کے ساتھ نہ بیان کیا جائے، اسے مرثیے کے ذیل میں جگہ نہیں دی جانی چاہئے۔ اُردو کے ایسے مرثیوں میں سب سے پہلے غالب کی مسلسل غزل مرثیۂ عارف کا ذکر کرنا ضروری ہے جس میں انھوں نے اپنے مخصوص شگفتہ اور مؤثر انداز میں عارف کا مرثیہ لکھا ہے مگر اپنے اختصار اور غزل کے اسلوب کے باعث اس میں رثائی عنصر اس قدر نہیں جتنی ادبیت ہے۔ اسی طرح اس زمانے کی دوسری ممتاز چیز مرثیۂ مومن ہے جس میں ادبیت کم اور رثائیت زیادہ ہے اور اسی لیے وہ غالب کی شگفتگی کے برعکس زیادہ مؤثر ہے۔ اس قسم کے مرثیوں میں حالی کے دو مرثیے غالب اور حکیم محمود خاں پر اب بھی اُردو میں انفرادی اور امتیازی درجہ رکھتے ہیں۔ غالب کا مرثیہ ان کی شخصیت اور ان کے مرتبے کی جیسی صحیح تصویر پیش کرتا ہے، ایسی مؤثر حکاسی ایک طویل مضمون میں بھی آسان نہیں۔ مرثیۂ محمود خاں کی یہ خصوصیت یادگار ہے

مرثیہ بھی ہے اور شہر آشوب بھی۔ اس میں اس دور کی دہلی کے علم و فن اور ادب کے عروج و زوال کی مکمل مرقع کشی کی گئی ہے اس لیے پڑھنے والے پر دہلی اور حکیم محمود خاں کی عظمت کے نقوش قائم ہو جاتے ہیں۔ اسی زمانے کی ایک دوسری یادگار رجب علی شبلی کی وہ نظم ہے جو انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی کی وفات پر لکھی تھی۔ فطری جذبات اور کمال تاثر کے لحاظ سے یہ مختصر نظم خاص تعریف کی مستحق ہے۔ حالی کا مرثیہ غالب جو ترکیب بند میں لکھا گیا ہے اس قدر مقبول ہوا کہ مولانا احسن مارہروی نے داغ کا اور آرزو رام پوری نے مولانا محمد علی مرحوم کا مرثیہ اسی اسلوب پر لکھا۔ یہ دونوں مرثیے حالی کے اتباع میں لکھے گئے مگر ادبی حسن اور سچے جذبات سے معمور ہونے کے باعث اثر آفرینی میں مرثیہ غالب کا نقش ثانی نظر آتے ہیں۔

گزشتہ صدی کے بالکل آخر میں سرسید کی رحلت پر بے شمار نظمیں کہی گئیں اور ان میں سے بعض اپنی رثائی حیثیت میں یقیناً قابل لحاظ ہیں۔ موجودہ دور میں علامہ اقبال اور قائد اعظم کی رحلت پر بے شمار نظمیں اور قطعے لکھے گئے۔ فنی کسوٹی پر پرکھئے تو ان میں سے صرف بعض کو مرثیے کی اس صف میں جگہ دی جا سکے گی جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔ جس طرح مراثی حادثات کربلا میں موجودہ دور کے شعرا کوئی یادگار کارنامہ پیش نہ کر سکے اسی طرح کوئی دوسری رثائی نظم ابھی سامنے نہیں آئی جسے فنی اور ادبی اعتبار سے خاص مرتبے کا مستحق قرار دیا جا سکے۔ حفیظ جالندھری کی نظم "ٹوٹی ہوئی کشتی کا ملاح" شاہنامۂ اسلام میں شامل ہو جانے کے بعد اس کا ایک جزو بن گئی ہے۔ لیکن ابتدا میں اس کا موضوع مولانا محمد علی مرحوم کا سانحۂ وفات تھا اور اس لحاظ سے دیکھئے تو اس نظم کو رثائی شاعری میں ایسی منفرد حیثیت حاصل ہوتی ہے جس کی نظیر ملنی ناممکن ہے۔

I

آتش کی غزل گوئی

ڈاکٹر وحید قریشی

اودھ کی سرزمین آتش کا گہوارہ تھی۔ یہاں سے گلی کوچے دلی کے برباد شدہ ایوانوں کی مٹی سے تعمیر ہوئے تھے۔ دلی کے خوش حال فیض آباد کی گلیوں کی زینت بنتے رہے۔ یہ سلسلہ دو جنبش ایک ربع صدی کو حاوی ہے۔ پھر لکھنؤ کا نصیبہ جاگا اور عظمت رفتہ کے نقیب یہاں آ کر بسنے۔ برصغیر میں آتش کے اجداد کا پہلا وطن دلی تھا۔ پھر یہ لوگ فیض آباد آ بسے جہاں شجاع الدولہ کے زمانے میں امن و امان کی ایک حد تک قائم ہو چکی تھی۔ ابدالی کے حملوں نے دلی کا سہاگ لوٹ لیا تھا۔ مرہٹوں کی یورشیں بھی کچھ کم خطرناک نہ تھیں۔ دلی کی اقتصادی حالت بہت مخدوش ہو چکی تھی۔ ان حالات نے وہاں بسنے والوں کو دوسرے علاقوں میں جانے پر مجبور کر دیا۔ بعض خاندان روہیل کھنڈ پھیل گئے جہاں بعض با امن موجود تھے۔ بعض نے اودھ کا رخ کیا اور سرسبز ہوئے کچھ قناعت پر تکیہ کیے دلی میں ڈٹے رہے۔ آتش کا خاندان اودھ آیا اور فیض آباد میں فروکش ہوا۔ آتش یہیں پیدا ہوئے اور پروان چڑھے۔ ابھی ان کا بچپن ہو گا کہ آصف الدولہ نے دار الحکومت لکھنؤ بنا لیا۔ فیض آباد کی بیشتر رونق لکھنؤ اٹھ آئی۔ شعراء و ادباء کا رخ بھی ادھر ہی کو ہو گیا۔

ادبی لحاظ سے فیض آباد کی شعری تحریک کا بنیادی رشتہ دلی کے دبستانِ شعر سے ملتا ہے۔ دہلوی شعراء کی آمد خاص کر سودا کے فیض آباد آ جانے سے دہلوی شعراء کی تازہ گوئی کے زیر اثر اودھ کی شاعری پھلی پھولی۔ یہ صحیح ہے کہ سودا سے قبل میر ضیاء وغیرہ کی وجہ سے سنگلاخ زمینوں اور رعایتِ لفظی کا کچھ چرچا ضرور تھا لیکن یہ رجحان اہمیت اختیار نہ کر سکا۔ زبان میں بھی دہلوی محاورے اور روزمرہ کا رس تھا۔ پھر رفتہ رفتہ مقامی اثرات نے سر اٹھایا۔ ایہام گوئی کے خلاف رد عمل جو دلی میں شروع ہوا تھا اور جس کے لیے فارسی ادب نے نمونے مہیا کیے تھے اودھ میں بھی برسر کار رہا۔ تازہ گوئی ایک سیدھے سادے تغزل کی تحریک تھی جس کے اولین نمونے پاک و ہند میں اکبری دور سے ملتے ہیں۔ فارسی شاعری کی یہ جاندار اور اصلی روایت میر و سودا کے دور میں اردو میں آئی۔ یہ دہلوی شاعری ایک ایسے دور کی پیداوار ہے جب سوسائٹی زوال پذیر ہو چکی تھی۔ ہر طرف بے اطمینانی اور افراتفری کا دور دورہ تھا۔ ہماری شاعری کے موضوعات اس اثر سے نہ بچ سکے۔ زندگی کی ناپائیداری کا احساس، اپنے ذاتی غم کا اظہار اور دردمندی، چاہے تصوف کا مسلک ہو چاہے عشق و عاشقی کا شعار ہو، ہر جگہ یہ غم و الم کی لہر نمایاں ہے۔ ایسے میں دنیوی شان و شوکت اور درباری رکھ رکھاؤ کی طرف توجہ بھی کبھی کبھار ہی جا سکتا ہے۔ میر و سودا کے ساتھ یہ تصورات اودھ پہنچے۔ اودھ کی ریاست اقتصادی طور پر دلی کے مقابلے میں امن کی بہتر ضامن تھی۔ درباری رنگ رلیاں دربار سے نکل کر دار الحکومت کی عام معاشرتی زندگی میں داخل ہو گئیں۔ تصوف اور دنیاداری کے رجحانات باہم دست و گریباں ہوئے۔ اپنی ذات کے علاوہ گرد و پیش کی طرف دیکھنے کی بھی توفیق پیدا ہوئی۔ سودا کی زندگی ہی میں مصحفی

اور ان کے ساتھیوں کا مسلک کامیاب ہو گیا۔ میر تقی میر کے آنکھیں بند کرنے سے قبل ہی اودھ ایک نئی تحریک سے روشناس ہو گئی جہاں اردو شاعری کا رُخ خارجیت کی طرف ہو گیا۔ میر سوز کا چرچا اور بول چال کا انداز دلوں میں گھر کر گیا۔ جعفر علی حسرت کی ساحلیت بندی بھی نمودار ہوئی۔ اب اس شاعری کا دور دورہ تھا جسے مصحفی تیغ اور رب سے کل شاعری کہتے تھے۔ ولی کا فارسی پرچا ہو چکا تھا، لکھنؤ کا نئی جذبات کی عامیانہ سطح سے بھی گریز نہیں کیا تھا۔ جب شاعروں کا ماحول بدلا تو اسے لکھنؤ کی فضا بہت ہی راس آئی۔ خود میر تقی میر اور مصحفی کی آمد سے بھی متاثر ہوا۔ چنانچہ آصف الدولہ کے عہدِ حکومت کے آخری دنوں میں دو شعری تحریکیں ساتھ ساتھ چلنے لگی ہیں۔ مصحفی اور ان کے شاگردوں کی داخلیت پسندی اور تازگی ایک طرف اور انشا، جرات اور ان کے ساتھیوں کی خارجیت پسند "انگیا کرتی" والی شاعری دوسری طرف۔ لیکن یہ تحریکیں بند ڈبوں میں نہیں چل رہی تھیں بلکہ ایک دوسری کو متاثر کر رہی ہیں۔ خود مصحفی بھی خارجی رجحانات سے کنارہ کش نہ رہ سکے۔ ان کا ذاتی رنگ تو شاید دونوں قسم کے رجحانات کے میل سے پیدا ہوا ہے۔ مصحفی کے شاگرد بھی اگرچہ حسرت سے بیان واشگاف کو شاعری کے لیے لازمی جانتے تھے لیکن ان کے یہ محبوب بھی گوشت پوست کے انسان ہی تھے اس لیے ان کے بیان میں حواسِ خمسہ کا عمل دخل ضروری تھا۔ حواسِ خمسہ نے انشا، رنگین، جرات اور اس گروہ کے دوسرے شعرا کو معاملہ بندی کی وساطت سے باہر کی دنیا سے مربوط کر دیا تھا۔ مصحفی اور ان کے ساتھیوں کا راستہ بھی اکثر اسی شاہراہ کو کاٹ کر گزر جاتا ہے۔

انشا اور رنگین کی نئی پود زبان کی حقیقت سے بھی بے خبر نہ تھی۔ دلی کی بولی کو اگر لکھنؤ میں زندہ رہنا تھا تو عام بول چال کے اثرات سے الگ نہ رہ سکتی تھی۔ چنانچہ مقامی اثرات سے زبان کی شکل بدلنی شروع کر دی۔ تذکیر و تانیث اور محاورے روزمرے میں دلی و لکھنؤ کا فرق پیدا ہو گیا۔ خارجی رجحانات نے زبان کو سنوارنے کا احساس دلایا اور اس کے استعمال میں صنعت گری اور رعایتِ لفظی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ شاعری بڑی سرعت سے داخلی خصائص کی بجائے خارجی صورت تراشی کی طرف آ رہی تھی۔ کسی بہتر آدرش کی غیر موجودگی میں یہی سہارا کیا کم تھا۔ جب یہ شعرا اوجِ عمر کو پہنچے ایک نئی نسل سامنے آئی جس میں انیس و دبیر اور آتش و ناسخ تھے۔ لکھنؤ اور دلی کا فرق اس دور میں گہرا ہو گیا۔ ناسخ کی شاعری عام لکھنوی مزاج کی آئینہ دار ہے۔ خارجی رجحانات زیادہ واضح ہو گئے۔ شعرا ردِ عمل کی بجائے محبوب کی ذات اور اس کے سراپا میں زیادہ دلچسپی رکھتے تھے۔ اچھا شعر اپنے مفہوم اور جذبات و احساسات کی وجہ سے نہیں بلکہ کسی محاورے کو کھپانے، کسی ترکیب کو سلیقے سے باندھنے، بندش کی چستی اور نکتہ آفرینی کی وجہ سے اچھا شعر کہلاتا تھا۔ لفظی صنعت گری اور رعایت کا بول بالا تھا۔ کسی اعلیٰ آدرش کی غیر موجودگی میں ایسی ظاہرداریاں ہی مطمحِ نظر ہو سکتی تھیں۔ شعر ذوقِ ادب کی تربیت نہیں بلکہ زبان سکھانے اور سند لینے کے کام آنے لگے۔ زبان کو مانجھنے اور سنوارنے کا یہ اثر لکھنؤ سے دلی کی طرف بھی آیا۔ شاہ نصیر اور ذوق کا معنوی رشتہ اس دبستانِ فکر کے ساتھ ملتا ہے۔ اظہار کا وسیلہ ہونے کی بجائے مقصد ہو جانے سے زبان کو فائدہ ہوا لیکن اردو شاعری کو اس سے بڑا نقصان پہنچا۔

صنعت گری پچھلے دور کی اس فضا کا منطقی نتیجہ تھی جس میں یہ رجحانات پنپ رہے تھے۔ فرمانروایانِ اودھ کا دربار ظاہری رکھ رکھاؤ اور اوپر سے ٹھاٹھ رکھتا تھا۔ شجاع الدولہ کے زمانے کی دولت کا وہ عالم نہ تھا۔ برطانوی استعمار نے اودھ کی سلطنت پر کئی تالے ڈال دیے تھے۔ وہ شہری زندگی جس نے طوائف کی گود میں پرورش پائی تھی اور وہ رسم و رنگ جس کے لیے لکھنؤ کا فن کار آج تک اسیر سمجھا جاتا ہے، بظاہر قائم تھی لیکن اس کی تہ میں وہ سکون و اطمینان کی گنگا نہیں بہتی تھی جو شاہانِ اودھ کے ابتدائی دربار کا خاصا تھی۔ ہر آدمی مصنوعی زندگی اور اس کے گھٹے لوازم نباہ رہا تھا لیکن غم و الم کی پرچھائیاں بھی آس پاس منڈلا رہی تھیں۔ اس سے محبوب کے سراپا کی دلآویزی کچھ نکھر آئی لیکن کھل کھیلنے کا رجحان بڑھ گیا۔

آتش کی طرح ان کے ساتھی اسی حد تک ہی ہیں رہ سکتے تھے۔ اس فن کی ذہنیت نے خود فروشی دولت کے ماتحت ہونے کا احساس دلایا۔ تجربہ ہوا کہ شعر کے اصول، جان اثر و سے لیکن خود سب کچھ بیت اللہ کا درس دیتے تھے اپنے پیغام کی گرمی سے بھی واقف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں وہ خلوص نہیں جو شعر کو گہرائی اور معنویت عطا کرتا ہے۔ سبب شاید یہ بھی ہے کہ یہ لوگ شعر کے خارجی حسن کی طرف زیادہ توجہ کرتے ہیں اور جذبے کے اظہار نے سنوارنے اور بنانے کی طرف سے غافل ہو گئے تھے۔ بہر حال ان کی شاعری کی تہ میں رعایت کے باوجود تعیش کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ یہ چیز بظاہر رونق سے کی طرف سے جانے والی تھی لیکن کھوکھلی نوعیت ہو سکتی تھی چنانچہ غم و حرماں کو ایسے استحقاق کرتے رہتے ہیں جو خارجی پیکر تراشی کے سہارے ہی گنجائش نکالتے تھے۔ اپنا غم اپنا نہ رہے۔ دوسرے لفظوں میں جب اس کی طلب بھی شکل و صورت اتنی بدل جائے کہ اپنے غم سے اس کا کوئی گہرا رشتہ نہ رہے تو بات بن سکتی تھی۔ اس احساس نے شخصیت کے حجاب میں تسکین پائی۔ یہ تصورات نوابی عہد میں پیدا ہو رہے تھے۔ اب مرثیہ نگاری کے پیرائے نے غم کے اظہار کی دنیا بدل دی جو اپنا ذاتی غم نہ تھا جہاں ذاتی غم نے ایک نیا روپ اختیار کیا ہے۔ انیس و دبیر کی مرثیہ نگاری محض ثواب حاصل کرنے کے لیے نہیں غم کے اظہار کا ذریعہ بھی ہے۔ اس گریہ شیون کی ڈرامائیت نے لکھنؤ کی پرتصنع زندگی سے رشتہ کاٹ دیا۔ اس زمانے میں اگر زندگی بسر کرنا ایک آرٹ تھا تو مرثیہ نگاری بھی آرٹ بن کر سامنے آ سکتی تھی۔ غزل کی شاعری میں سلام نے فروغ پایا لیکن عشقیہ غزلوں میں یہ گنجائش نہ ہو سکتی تھی۔ وہاں احساس مرگ سے بر طرف کرنے کو دکھن کا روپ دھار لیا۔ زندگی کا تصنع بھی اطمینان اور حزن کو نہ دبا سکا۔ لکھنوی غزل کا بڑا حصہ اس ماتمی فضا میں سانس لینے لگا جس میں آتش رہتے بستے تھے۔

آتش مصحفی کے شاگرد اور انھیں کے مدرسہ فکر کے پجاری تھے۔ اس تعلق کی بنا پر آتش کی شاعری تازہ گوئی کے دور سے جا ملتی ہے بلکہ بہت پیچھے جا کر تخیل گوئی کے دور سے بھی رشتہ جوڑ لیتی ہے۔ یہ اس کی شاعری کا ایک رخ ہے۔ دوسری طرف وہ معاملہ بندی کی ابتدائی صورتوں سے بھی واقف ہے۔ مصحفی کی شاعری بھی انھیں متبائن نظریات سے بنی ہے۔ آتش بھی ایسے ہی تغزل اور شعریت کے ترانے ہیں ان کی شاعری بھی جسمانی اور حسی SENSOUS ہے لیکن مصحفی اور آتش میں مزاج کا فرق بھی ہے۔ مصحفی بصارت پر زیادہ بھروسہ کرتے ہیں آتش کی قوت شامہ زیادہ تیز ہے۔ حواس خمسہ کا یہ رجحان اس دور کا عام رجحان ہے۔ شاعروں کے سامنے زندگی کا کوئی عظیم مقصد نہ تھا۔ جس کر نظر ہستی کی ظاہری چمک دمک پر ہی پڑ سکتی تھی۔ حیات عمل اور حرکت سے محروم تھی، کوئی لائحہ عمل بھی سامنے نہ تھا۔ سیاسی حالات اور اقتصادی حالات نے حیات انسانی کو اسی چوکھٹ پر لا ڈالا تھا۔ جب نصب العین جامد ہو جائے اور مستقبل کا کوئی خواب بھی قوم کو بیدار نہ کر سکے تو افراد کی زندگیوں کا بے مقصد ہو جانا لازمی ہے۔ ایسے میں جو آورش قومی زندگی میں پیدا ہو سکتا ہے وہ جسمانی لذت پرستی کے سوا اور کیا ہوگا۔ لکھنوی تمدن کا یہی آخری سہارا تھا۔ دولت کی فراوانی دکھائی دے رہی تھی، خوشحالی بھی تھی لیکن اندر ہی اندر زوال اپنا کام کر رہا تھا۔ خوشحالی کا فریب نظر قومی بقا کا ضامن نہ ہو سکتا تھا۔ جمود و تعطل نے عیش و عشرت کا در کھول دیا۔ زندگی نہ ماضی کے کسی ضابطے پر غور کر سکتی تھی نہ مستقبل کو دیکھ سکتی تھی۔ زوال کا احساس بھی تھا جو سوچنے سے روکتا تھا اور آگے نہ بڑھنے دیتا تھا۔ ایسے میں توجہ حال پر ہی ہو سکتی تھی اور حال کی دلچسپیوں میں لکھنؤ کی عام تمدنی فضا کی چکاچوند بہت تھی۔ دولت تھی لیکن اس کا صحیح مصرف سامنے نہ تھا۔ شاہان اودھ کی زندہ دلی — امرائے دولت کی عیش پسندی بفیض آباد۔ لکھنؤ کی طوائفوں کا رکھ رکھاؤ مصنوعی زندگی کا آئینہ دار ہی نہیں دولت کے نکاس کا ایک طریقہ بھی ہے۔ دولت جذبات کی آسودگی کے کام آئی۔ ایسے میں انسان ذہن کی بجائے حواس پر ہی بھروسا کر سکتا تھا۔ لکھنؤ کے شاعر حواس خمسہ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ میر حسن پانچوں حواس سے کام لیتے ہیں، مصحفی قوت لامسہ، باصرہ اور سامعہ تک محدود ہیں۔ آتش باصرہ اور شامہ کے

زبان مشتاق ہیں ؎

آیا تھا بلبلوں کی تدبیر میں گلوں سے
ہنس ہنس کے مار ڈالا صیاد کو چمن میں

شب مہ میں جو دریا کے کنارے جا کے روتا ہوں
گزر جاتی ہے کشتی مار کر ٹھوکر سر پل سے

بصارت سے زیادہ سماعت اور سماعت سے زیادہ شامہ نے آتش کی غزل میں جلوہ دکھایا ہے ؎

وہ روز ہے یہ لطفِ عیش و نشاطِ دنیا
بوئے شب جو دی مہمان سب کے پیرہن میں

میلے کپڑے یار کے سونگھے تھے میں نے ایک دن
نکہتِ گل پر گمانِ بوئے پیراہن رہا

دماغ میں جانِ تازہ آتی ہے سونگھے سے اے آتش
عجب خوشبو ہے اس گل پیرہن کے ہاتھ کی اروں میں

نکہتِ گل سے مجھے یار کی بو آتی ہے!
خار سے یاد مجھے اس کے بچھڑنے کی خو آتی ہے

مری طرف سے صبا کہیو میرے یوسف سے
نکل چلی ہے بہت پیرہن سے بو تیری

یاد کر اس گل کو آتش کُلِ شبنم رو دیا
پیرہن کوئی اگر خوشبو نظر آیا مجھے

بو کا لفظ آتش کے ہاں عموماً پیرہن سے متعلق ہے اگرچہ کبھی کبھی اس کا تعلق قبر کے تصور سے بھی گٹھا ہوا ملتا ہے ؎

اپنے خوں کی بو نہیں آتی ہے یاں کی خاک سے
زندگی میں کوئے قاتل سے سفر کیوں کر کریں

یہ رجحان ان کے ہاں غالباً روایتی شاعری کی وساطت ہی سے آیا ہے۔ ان کی بعض محبوب تراکیب جو جذبات کے لیے مہمیز کا کام دیتی ہیں یہ ہیں 'یوسف' 'پیراہنِ یوسف' 'بوئے پیراہنِ یوسف' 'گل' 'پری' 'صبح' 'شام' یہ بار بار ان کی شاعری میں آتے ہیں ان کی مدد سے آتش کے جذبات اظہار کی صورت پاتے ہیں لیکن انھیں آتش نے شاعری کی عام روایت سے لیا ہے۔ اوپر کے اشعار کی تہ میں 'بوئے پیراہنِ یوسف' ہی کی تلمیح ہے لیکن اشعار کی لذت میں بھی کلام نہیں۔ شاعر کے تخیلی تجربے نے اسے شاعری بنا دیا ہے۔

آتش کے ہاں دوسرا اساسی روایتی تصور قبر کا تذکرہ ہے لکھنؤ کی ماتمی شاعری میں اس موضوع کی کمی نہیں لیکن اسے تقلیداً قبول کرنا دوسری بات ہے اور اپنی شخصی زندگی کا محور بنا کر پیش کرنا دوسری بات ہے۔ آتش کی شاعری میں یہ بات رسم کی پاسداری نہیں ہے بلکہ اس میں آتش کی ذات کو بھی بڑا دخل ہے۔ آتش زندگی کی رنگا رنگی کو دیکھتے ہیں، اس سے متاثر ہوتے ہیں، اس کے بارے میں رجائی نقطۂ نظر بھی پیدا کر لیتے ہیں لیکن حیاتِ گزراں کی ناپائیداری کا احساس بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ حسن کے عارضی ہونے کا بھی انھیں احساس ہے ؎

کیا بیاں عالم زوالِ حسنِ خوباں کا کروں
روشنی جاتی رہی سر و چراغاں رہ گیا

اس رجحان نصیبی میں آتش قلندرانہ روپ بھی دھارتے ہیں اور زندگی کے بارے میں تشکک (SCEPTIC) بھی ہو جاتے ہیں۔ قدیم عاشقانہ تصورات کو وہ پسند کرتے ہیں لیکن انھیں وقتی اور عارضی بھی جانتے ہیں۔ وہ مذہب و اخلاق کی طرف جھکتے ہیں اور کبھی کبھی واعظ کا لہجہ بھی بنا لیتے ہیں۔ کبھی اسے بھی خیر باد کہہ کر قلندری کا درس دینے لگتے ہیں۔ اخلاقی اور دینی رجحانات کا رُخ دنیا کی بے ثباتی کی طرف بھی پھر جاتا ہے سبب شاید یہ ہے

کہ آتش بھی اقدارِ حیات کے دلدادہ ہیں انھیں برقرار رکھنا چاہتے ہیں لیکن انھیں اس کا بھی یقین سا ہے کہ یہ اقدار اب مٹنے والی ہیں اور نئے حالات میں قائم نہیں رہ سکتیں۔ یہ IDEAL جب ذرا مشتعل ہوتے ہیں تو کبھی شک کا اظہار کرتے ہیں کبھی خود فراموشی قلندری جھلکا اور جذبات کی پرستش کام آتی ہے۔ دماغ کی بجائے دل کی واردات جگہ لے لیتی ہیں۔ ایسے میں آتش جوش بھی ہوتے ہیں غم سے ... ہوتے ہیں، موت کی خواہش بھی کرتے ہیں، اور ایک گونہ بے نیازی کی وجہ سے بعض اوقات شیر کی کھال کو قاقم و سنجاب کہتے ہیں۔

جور و جفائے یار سے رنج و محن نہ ہو | دل پر ہجوم غم ہو جبیں پر شکن نہ ہو
شادی نہیں قبول مجھے غم قبول ہے | بیمار خوشی سے تنگ مرا پیرہن نہ ہو

مفلسی میں بھی احساس مفلسی کے ساتھ ساتھ ایک آن بان ہے۔ ایسے میں یہ نرا غشی ہے ایک فخری رکھ رکھاؤ ...

فرشتے سنتے ہیں آوازہ رو بیاش کا شہرہ | کبھی ہمارا جو وہاں اہتمام ہوتا ہے

ساقیانِ ماہ پیکر پر کیا کرتا ہوں حکم | میکدے میں جام مستی ہے سلیمانی مجھے

چند پریاں بھی کروں شیشۂ سلیماں تسخیر | یہ قلمرو بھی ہے زیرِ نگیں تھوڑی سی

مجھ صوفی کے جو نعرے سے حال اس کو گیا | مطرب نے ٹکڑے ٹکڑے مرے سازِ جنوں کیا

اک الف سے غم کے سجدے میں ہوا آتش ضمیر | چار ابرو کو صفا کر کے قلندر ہو گیا

یہ قلندرانہ وضع آتش کا خاص انداز ہے جس کے گل بوٹے ان کے کلام میں جا بجا ملتے ہیں۔ اس کا سبب وہی ماتمی فضا اور اطمینان کا فقدان ہے۔ نشے کی ترنگ آتش کو خوشی کی طرف لے جاتی ہے۔ بعض شعر تو ان کے ہاں ایسے بھی مل گئے جن میں غم والم کا شائبہ تک نہیں۔ ایسے میں وہ زندگی اور اس کی لذتوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ محبوب کے پیکر اور شراب کے لطف میں وہ اس طرح ڈوب جاتے ہیں کہ غم کا ہلکا سا احساس بھی باقی نہیں رہتا۔ فارسی شاعروں میں یہ صفت غالباً صرف حافظ شیرازی کو حاصل ہے کہ ان کے ہاں ایسے اشعار کی کمی نہیں جن میں لذتیں اتنی خوشگوار نظر آتی ہیں کہ انسان ان کی ناپائداری کے خیال کو ذہن میں نہیں لا سکتا۔ ماتمی فضا میں اس طرح کی الگ تھلگ صفت کی وجہ یہ ہے کہ حافظ جس دور میں ہوئے وہ بھی ظاہری شان و شوکت کا دور تھا لیکن منگولوں کے حملوں کے اقتصادی اثرات نے اس نظامِ فکر کی کمزوری کو بھی ظاہر کر دیا تھا۔ اس سے بعض ذہنوں میں غم و خوشی کے تصورات الگ الگ لہروں کی صورت میں ترقی پانے لگے۔ آتش بھی اسی طرح کے اقتصادی طور پر پراگندہ دور میں ہوئے ہیں۔ ایسے میں جب زندگی غم ہی غم اور ماتم ہی ماتم ہو تو مسجد میں صفِ ماتم بچھا لینا کافی ہوتا ہے۔ غم کو ہر وقت سرِ بازار رسوا کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ بازار کی رونق تو بحال رہنی چاہیے۔

ساقی نہ قطع سلسلۂ دورِ جام ہو | مطرب نہ تار توڑے اب آوازِ چنگ کا
یوسف کو دیکھنے کا ہے آنکھوں کو اشتیاق | بندِ نقاب کو سرِ بازار توڑیے

کوچۂ یار میں چلیے تو غزل خواں چلیے   بلبلِ مست کی صورت سے غزل خواں چلیے
آتی تھی کس کے سنبلِ عنبر شمیم سے   گلزار ہو رہے ہیں مشامِ نسیم سے
زمزمۂ گل کی ہوا نے کیے ساقی بے کار   بطِ مے اٹھ کے لبِ مست کو چھو آتی ہے
اک جام میں کھلتا ہے طلسمات جہاں کا   مستی میں کسے مرتبۂ جم نہیں ہوتا
دل میں خیالِ حسنِ محبوب روز و شب ہے   اترا ہوا ہے یوسفِ جاں سرائے تن میں
فصلِ گل میں گوشے گوشے کیفیتِ مے خانہ آج   دولتِ ساقی سے مالا مال ہے پیمانہ آج
بحرِ غم سے پار اتارے گی ہمیں کشتی مے   بادباں ابر اور ساقی ناخدا ہو جائے گا
شمعِ مینا سے ہو ساقی شہر بھر میں روشنی   لالے نے روشن کیا کوہ و بیاباں میں چراغ
آتش نہیں عکسِ چشمِ یار کا عالم نہ پوچھ   دیکھے اے آتش کنول پھولے ہوئے تالاب میں

رات کو میں نے مجھے یار نے سونے نہ دیا   رات بھر طالعِ بیدار نے سونے نہ دیا
خاک پر سنگِ درِ یار نے سونے نہ دیا   دھوپ میں سایۂ دیوار نے سونے نہ دیا
شام سے وصل کی شب آنکھ نہ جھپکی تا صبح   شادیٔ دولتِ بیدار نے سونے نہ دیا

شبِ وصل تھی چاندنی کا سماں تھا   بغل میں صنم تھا خدا مہرباں تھا
مبارک شبِ قدر سے بھی وہ شب تھی   سحر تک مہ و مشتری کا قراں تھا
وہ شب تھی کہ تھی روشنی جس میں دن کی   زمیں پر سے اک نور تا آسماں تھا
عروسی کی شب کی حلاوت تھی حاصل   فرح ناک تھی روح، دل شادماں تھا

دخترِ رز مری مونس ہے ہمدم ہے   میں جہانگیر ہوں یہ نور جہاں بیگم ہے

آتش کی بعض غزلوں میں، احساسِ انبساط دو چار شعروں کے بعد اپنا رُخ غم و حرماں کی طرف موڑ لیتا ہے۔ آخری زمانے کی غزلوں میں یہ غم و الم پہلے دیوان کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ بعض غزلیں ایسی بھی ہیں جو سرتاپا ماتمی ہیں۔ ملال کی یہ کیفیت دنیا کے آنی و فانی ہونے کے احساس کی وجہ سے ہے ؎

تختِ طاؤس کہاں بن کے غبار اُڑ جاؤ   باد کے گھوڑے کی آتش ہے سواری تیار
صبح نزدیک ہے بیدار ہو دل اے غافل   زہرہ و مشتری و ماہ و سُہا جاتے ہیں
کہوں کیا ہوئی عمر کیوں کر بسر   میں جاگا کیا بخت سویا کیا
کوئی زمانے سے جاتا ہے کوئی آتا ہے   کسی کا کوچ کسی کا مقام ہوتا ہے

دلِ بے تاب کو فریاد و فغاں کرنے دو
چپکے خاموشی کو تقریرِ بیاں کرنے دو

سامنے آ ہی گیا لشکرِ درد و ملال
اب تو سینہ سپری پلکوں کو شاں کرنے دو

آخرِ کار تو خاک ہے مسکن سب کا
اہلِ دولت کو بلند آج مکاں کرنے دو

آج تک آہ کے کوڑوں سے بدن نیلا ہے
آسماں کو مجھے رسوائے جہاں کرنے دو

پھوٹ بہنے دو انھیں یار کے آگے آتشؔ
دل کا احوال بھی آنکھوں کو بیاں کرنے دو

دن کو بیداری میں زندوں سے نہیں پاتا فراغ
رات بھر مردے نظر آتے ہیں مجھ کو خواب میں

کارواں یاروں کا پہنچا منزلِ مقصود میں
میں بگولے کی طرح سے خاک اڑاتا رہ گیا

جب کسی لیلیٰ شمائل کا سنا کانوں سے ذکر
بیدِ مجنوں کی طرح تنہا تھرتھرا کر رہ گیا

نہ پوچھ حال مرا چوبِ خشک صحرا ہوں
لگا کے آگ مجھے کارواں روانہ ہوا

خدا دراز کرے عمر چرخِ نیلی کی
یہ بیکسوں کے مزاروں پہ شامیانہ ہوا

یہ رنج و ملال آتش کو کوچۂ واعظ میں بھی لے گیا ہے۔ اخلاقی درس و تدریس ان کے ہاں بھی بہت ہے ؎

خیالِ تن پرستی چھوڑ فکرِ حق پرستی کر
نشاں رہتا نہیں ہے نام رہ جاتا ہے انساں کا

برہمن کو باتوں کی حسرت رہی
خدا نے بتوں کو نہ گویا کیا

جو قناعت کے مزے سے آشنا ہو جائے گا
بھیک کا کاسہ بھی دستِ دعا ہو جائے گا

گنہ کسی نے کیا تھرتھرایا دل اپنا
عرق عرق ہوئے ہم جس کو انفعال ہوا

یہ دینی رجحان آتش کو دنیا کی بے ثباتی کی طرف لے جاتا ہے۔ وہ اپنی قلندرانہ زندگی کے سبب اس سے ہم کنار ہونا چاہتے ہیں۔
اس طرح گور کا مضمون انھیں بہت پسند ہو جاتا ہے ؎

یقینِ مرگ جو عشقِ بتاں میں تھا آتشؔ
ہر اک صنم مری آنکھوں میں سنگِ مدفن تھا

دل چھٹ کے جاں سے گرد کی نذر ہی ہو گیا
کیسا رفیق ساتھ سے مشکل میں رہ گیا

کہنہ ہو کر نئی قبریں نہیں اس میں بنتیں   یہ خرابہ وہی عبرت کا مکاں ہے کہ جو تھا

شمع ڈھلتی ہے مری گور سے آج اے آتش   مر کے کل گور کے ساتھی ہیں میں جل جاؤں گا

موت کا خیال اور قبر کی خواہش آتش کے ہاں ایک پُرخلوص جذبہ ہے لیکن کبھی کبھی ان کی مشکل پسند طبیعت یہاں بھی ڈول جاتی ہے ۔

نام سنتا ہوں جو میں گور کی اندھیاری کا
دل دھڑکتا ہے جدائی کی شبِ تار نہ ہو

تاہم گور عموماً اس کے لیے تسکینِ دل کا سامان ہے۔ یہ موضوع اس کے ہاں روایتی سہی رسمی نہیں ہے۔ یہ غم کا علاج اور زندگی کا بدل بھی ہے جس میں خوف اور ڈر نہیں بلکہ اس میں مسرت کا دلفریب تصور ہے جس سے موت اور شبِ عروسی میں گہری مماثلت دریافت ہوتی ہے مرگ و عروسی آتش کے ہاں ہم معنی لفظ ہیں ۔

میں جو نوشہ ہوں تو وہ بن جائے گی آغوشِ عروس   گور سے آئے گی شہنا کی صدا میرے بعد
زندگی تک ہیں قیامت کے یہ سارے جھگڑے   مجھ کو کیا غم ہے اگر حشر ہوا میرے بعد

کفن خلعت ہے میں دولھا جنازہ تختِ شاہی   براتی نوحہ گر ہمراہ ہیں شہنا نوازی کو

موت جلب لذت کا باب کھول دیتی ہے اور آتش اپنی اکثر غزلوں میں اس کے گن گانے لگتے ہیں۔ رجائی لہجے کے ساتھ ساتھ المیہ انداز بھی اہم ہو جاتا ہے لیکن یہ غم ناک فضا اپنے اثر میں رجائی لہجے سے زیادہ دیرپا ہے۔ اگرچہ اکثر رجائی اشعار میں بیرونی سطح پہ الم کا ہلکا سا اثر بھی نہیں تاہم لکھنویت کے دوسرے مظاہر کی طرح یہ کھوکھلی اور سطحی ہے۔ اس کا اثر دور رس اور نئے نئے مفاہیم سے روشناس کرانے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اس کے مقابلے میں آتش کا المیہ کلام زور اثر اور لذت میں اسے عظیم شعراء کے زمرے میں لے جاتا ہے۔ یہاں آتش کا غم ایک کسک اور درد رکھتا ہے۔ یہ درد دیرپا بھی ہے اور اس کے اظہار میں نئی نئی وسعتیں اور خلوص کے نئے نئے ثبوت ملتے ہیں۔ آتش کی یہ حزنیہ شاعری بڑی جان رکھتی ہے اور غور و فکر کے اعتبار سے اس کا سلسلہ دبستانِ مصحفی سے لے کر دبستانِ میر تک پھیلا ہوا ہے۔ وہی گہرائی، وہی ضبط، وہی سنجیدگی اور انسانی نفسیات سے واقفیت آتش کے کلام میں بھی ہے جو معاملہ بندی کے شاعروں کے کلام کے ایک بڑے حصے کو تازہ گو شعراء کے کلام سے ملا دیتا ہے ۔

آئینہ سینۂ صاحب نظراں ہے کہ جو تھا   چہرۂ شاہدِ مقصود عیاں ہے کہ جو تھا
روز کرتے ہیں شبِ ہجر کو بیداری میں   اپنی آنکھوں میں سبک خوابِ گراں ہے کہ جو تھا
اثرِ منزلِ مقصود نہیں دنیا میں   راہ میں قافلۂ ریگِ رواں ہے کہ جو تھا

چاندنی میں جب تجھے یاد اے مہ تاباں کیا   رات بھر اختر شماری نے مجھے حیراں کیا

مرغانِ باغ آتشِ گل نے جلا دیے　　صیاد اُڑ کے دل کے چمن سے اُڑا گیا

خوں ہوتا ہے جگر ذوقِ خلش کر کے یار　　دل دکھاتا ہے مشقِ تپش آغاز اپنا

آہ و نالے سے سوا چرچا خموشی کا ہوا　　پاسِ رسوائی نے ہم کو اور رسوا کر دیا

حالِ مجنوں تو نہیں ہم نے مگر دیکھا کچھ　　سایہ ساں آگے ہے کیوں چہرۂ لیلیٰ اترا

کارواں یاروں کا پہنچا منزلِ مقصود میں　　میں بگولے کی طرح سے خاک اُڑا کر رہ گیا

موت مانگوں تو رہے آرزوئے خواب مجھے　　ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے
فرقتِ یار میں کرتی ہے قیامت برپا　　روزِ محشر سے نہیں کم شبِ مہتاب مجھے

یہ آرزو تھی تجھے گل کے روبرو کرتے　　ہم اور بلبلِ بے تاب گفتگو کرتے
پیام بر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا　　زبانِ غیر سے کیا شرحِ آرزو کرتے
وہ جانِ جاں نہیں آتا تو موت ہی آتی　　دل و جگر کو کہاں تک بھلا لہو کرتے
نہ پوچھ عالمِ برگشتہ طالعی آتش　　برستی آگ جو باراں کی آرزو کرتے

راحتِ مرگ کو نہ پوچھ آتش　　نہ رہی قدرِ زندگانی کی

فراقِ یار میں دل پر نہیں معلوم کیا گزری　　جو اشک آنکھوں میں آتا ہے سو بے تابانہ آتا ہے

دوستوں سے اس قدر صدمے اٹھائے جان پر　　دل سے دشمن کی عداوت کا گلہ جاتا رہا

دل پہ چوٹ اس رخِ رنگیں کے نظارے سے لگی　　پھول سے صدمہ پہنچتا ہے مجھے پتھر کا

خوشا وہ دل کہ ہو جس دل میں آرزو تیری　　خوشا دماغ جسے تازہ رکھے بو تیری

شب فراق میں اک دم نہیں قرار آیا — خدا گواہ ہے شاہد ہے آہ و زاری
دماغ اپنا بھی اے گل بدن معطر ہے — صبا ہی کے نہیں حصے میں آئی بو تیری

شب فراق میں اے عندلیب دم صبح — چراغ خانہ قمر ہے اور سحر تجلی
سمجھ کے آتش رنگ گل اپنے سینہ کو — فقیر بیٹھتے ہیں راہ کو بہ کو تیری

آتش کو خود بھی احساس ہے کہ ان کا عاشقانہ کلام ہی ان کے لیے سرمایۂ افتخار ہے ـــ

یوں مدعی حسد سے نہ دے داد تو نہ دے
آتش غزل یہ تو نے کہی عاشقانہ کیا

اور عاشقانہ غزل گوئی کی ہمارے ہاں ایک ہی تو اہم روایت تھی ہجر و فراق اور درد و الم والی غزل گوئی جس میں ہر چہرہ عشق و عاشقی کی فضا سے تقویت پاتا ہے۔ اس غزل گوئی کی عام جذباتی فضا مخصوص الفاظ و اصطلاحات سے برگ و بار حاصل کرتی ہے۔ آتش کی غزل گوئی کی یہی معراج ہے جو اس دور کی عام شعری فضا سے مختلف اور گذشتہ شعری تجربات کے زیادہ قریب ہے۔

سرسید کے خطوط

سرسید احمد خاں برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کے عظیم محسن ہیں۔ ان کی ذات قدیم و جدید کے درمیان ایک سب سے اہم کڑی کی حیثیت رکھتی ہے۔ انھوں نے مسلمانانِ ہند کو ایک نئی تنظیم، جدید سیاست، ایک ترقی پذیر نظریۂ تعلیم، ایک حقیقت پسندانہ زاویۂ نظر اور جیتا جاگتا ادب دیا۔ ان کے خطوط ان کی جدوجہد کا عکس ہیں۔ جن کے جمع و ترتیب کا کام مدت سے جاری ہے۔ مولانا حالی نے ان خطوط سے حیاتِ جاوید کی تالیف میں مدد لی۔ سر راس مسعود نے اشاعت کی ابتدا کی۔ شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی نے ان میں بہت سا اضافہ کر کے مجلس ترقی ادب لاہور کی طرف سے مکاتیبِ سرسید کے نام سے بہت بڑا مجموعہ شائع کیا۔ رہی سہی کسر ڈاکٹر مختار الدین آرزو انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ کی فرمائش پر پوری کر رہے ہیں۔ مگر ابھی کئی ذخیرے ایسے ہیں جن تک کسی کی رسائی نہیں ہوئی — یہ خطوط شمس العلماء مولوی سید ممتاز علی مرحوم کے نام ہیں جو سید امتیاز علی تاج کے شکریہ کے ساتھ شائع کیے جاتے ہیں:

(۱)

محبی شفیقی!

آپ کا عنایت نامہ پہنچا۔ مجھے نہایت افسوس ہے کہ میرا خط آپ تک نہیں پہنچا۔ میں نے ایک مفصل خط آپ کو لکھا ہے۔ جو خیالات آپ کے دل میں گزرے ہیں وہ سب غلط ہیں۔ میں اپنے دوستوں کا جاں نثار و خاک پا ہوں۔ قصور کیسا؟ معافی کیسی؟ آزردگی کیسی؟ ایسے خیالات کبھی میری طرف و ہما بھی نہ فرمائیے۔ مولوی سمیع اللہ خاں مع اپنے صاحبزادے کے اپریل میں ولایت جائیں گے۔ نہایت خوشی ہو کہ آپ بھی ساتھ جاویں۔ مگر قبل از روانگی اپنے تئیں انڈین سول سروس میں منتخب کرالو۔ یہ بات کچھ مشکل نہیں ہے جس طرح پر ہو، تم مجھ سے ملو۔ میں شروع دسمبر میں کلکتہ چلا جاؤں گا۔ اخیر دسمبر کی تعطیل میں تم بھی کلکتے چلے آؤ۔ میرے پاس رہو۔ سب طرح آسائش ہو، میرے دل کو راحت ہوگی۔ طمانیت سے سب باتیں حاصل ہوں گی۔ مسودہ درخواست مرتب ہو جائے گا۔ اور سب تدبیریں بتا دوں گا۔ کلکتہ آنا کچھ مشکل نہیں ہے۔ سیر بھی کرو گے۔ ملاقات بھی ہوگی۔ دل خوش ہوگا۔ کیا امر تم کو کلکتہ آنے کا مانع ہے۔ میں تم کو اپنا عزیز سمجھتا ہوں۔ جو بات ہو مجھ کو لکھو۔ اگر کلکتہ

تمنے میں کسی امر کی ضرورت ہو مجھے لکھو۔ میں اس کا انجام کروں گا۔ تمہاری عمر اس وقت ایسی ہے کہ انگریزی سول سروس کی ابھی تدبیر ہو سکتی ہے۔
چند روز بعد تدبیر ہاتھ سے جاتی رہے گی۔ والسلام

خاکسار سید احمد
علی گڑھ ۱۶ نومبر ۱۸۷۵ء

(۲)

محب دلنواز من!

آپ کا عنایت نامہ مع مضمون کے پہنچا جس کے پڑھنے سے میری دلنوازی ہوئی۔ میرے دل کو تقویت ہوئی۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے۔ میں نے ایک جلسے میں کہا تھا کہ میری یہ آرزو ہے کہ ہماری قوم لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پر یقین رکھے۔ اور ترقی پاوے۔ اور اگر یہ یقین جاتا رہا تو وہ ہماری قوم نہیں رہی۔ پھر اگر وہ آسمان کے تارے ہو جائیں۔ تو ہم کو کیا۔ ایک محض حماقت کی سمجھ ہے جو یہ خیال کرتے ہیں کہ میں کوئی علاحدہ فرقہ قائم کرنا ہوں یہ تو میرے مقصد کے خلاف ہے جو فرقے اسلام سے باہر جانا چاہتے ہیں۔ ان کو ٹھہرا رکھنا چاہتا ہوں۔

آپ کا مضمون جو کہ خاص میری نسبت تھا ہر چند چاہا کہ اس کے چھاپنے کا قصد نہ کروں مگر ایسا دل میں بیٹھ گیا اور اس کی سچائی کا ایسا دل پر اثر ہوا کہ چھاپنے پر مجبور ہوا۔ شاید آپ نے میرے دل کو تراش کر یہ مضمون لکھا ہے جس میں میری دلی کیفیت ہے۔ انشاءاللہ اس شنبہ کے بعد جو شنبہ ہوگا۔ اس دن کے اخبار میں چھپے گا۔ تفسیر اور تصانیف احمدیہ اس قدر تاخیر سے نہیں چھپیں گی جیسا کہ آپ حساب لگاتے ہیں۔ اتفاقات سے کمپوزیٹر بیمار ہو گئے اور چلے گئے۔ ایک مصحح مر گیا۔

یہ شہر نہایت چھوٹا ہے۔ الٰہ آباد سے کمپوزیٹر طلب ہوئے ہیں مجھے امید ہے کہ تفسیر و جملہ کتب دو برس کے عرصے میں اگر زندگی ہے تو چھپ جاویں گی۔ تفسیر کا بہت بڑا کام ہے۔ اور اس کی مشکلات ظاہری کا حل کرنا اور واقعی اور اصلی بات کا بتانا ذرا مشکل پڑ جاتا ہے بہرحال خدا کی مدد چاہیے۔

فیضِ روح القدس ار باز مدد فرماید
دیگراں ہم بکنند آنچہ مسیحا می کرد

تصویر اپنی خدمت اقدس میں بھیجتا ہوں۔ کلکتہ جا کر دوسری بھیجوں گا۔

خاکسار سید احمد
علی گڑھ ۲۹ نومبر ۱۸۷۵ء

(۳)

محبی و مشفقی!

چوتھی مئی کا عنایت نامہ میرے پاس ہے جس کا جواب لکھتا ہوں۔ پندرھویں مئی کو یہاں سے روانہ ہوں گا اور بعد عاشورہ جاؤں گا۔

بوقت مراجعت ضرور آپ سے ملاقات ہوگی۔ انجمن اسلامیہ جو ہوئی ہے جو آپ نے گفتگو کی۔ اس کا میں شکرگزار ہوں مگر حال یہ ہے کہ میں ایک واعظ مذہب بننا نہیں چاہتا۔ نہ ایسے جلسوں میں جو مذہبی نام سے ہوں۔ شریک ہونا یا اس میں کچھ دینا پسند کرتا ہوں۔ صرف یہ خیال ہوتا ہے کہ اپنے احباب کے سامنے اپنے خیالات ظاہر کروں تاکہ ان کو اس پر غور کرنے کا اور جو نقص اس میں ہو۔ اس کی اصلاح کا موقع ملے۔ اور مجھ کو بھی فائدہ پہنچے۔ پس اس کام کے لیے کوئی عام مجلس کی ضرورت نہیں ہے۔ بہرحال موسم سرما میں جو ہوگا وہ ہوگا۔ اس وقت اس کی گفتگو بے فائدہ ہے۔ تہذیب الاخلاق چھپنا شروع ہوگیا۔ چار ورق چھپ چکے ہیں۔ بقیہ اوراق چھپ جائیں تو بخدمت احباب روانہ ہوگا۔ ایک مضمون میرا ہے۔ ایک مولوی مشتاق حسین کا اور ایک منشی ذکاء اللہ صاحب کا۔ منشی ذکاء اللہ صاحب نے نیچر پر سلسلہ وار آرٹیکل لکھنے شروع کئے ہیں اور اس کے متعدد نمبر ہوں گے۔ والسلام

خاکسار سید احمد

علی گڑھ ۱۳ مئی ۱۸۷۹ء

---

(۴)

مشفقی و محبی!

آپ کا عنایت نامہ و نوٹ بیس روپیہ بابت خریداری تہذیب الاخلاق پہنچا۔ ممنون عنایت کیا۔ اصل یہ ہے کہ میں نے تہذیب الاخلاق صرف آپ کے شوق کے سبب سے مکرر جاری کر دیا ہے۔ اس بات کی کچھ پرواہ نہیں ہے کہ بقدر خرچ خریدار ہوں گے یا نہیں۔ میرا روپیہ ایسی لغو باتوں میں تمام عمر ضائع ہوتا رہا ہے۔ آپ میرے نقصان کا کچھ خیال نہ کریں۔ محمد برکت علی خاں صاحب تو دوست قدیم ہیں مگر اور کسی غیر شخص سے اصرار کرنا یا لجاجت اس کی خریداری پر کرنا کچھ ضرور نہیں ہے۔ حقیقت میں تہذیب الاخلاق بند ہونا نامناسب تھا۔ گویا تحریر مضامین اور خیالات سب بند ہو گئے تھے۔ اس کے سبب بُرا یا بھلا تحریر کا لگا لگا رہے گا۔ بعض بعض مضمون قابل پڑھنے کے تحریر ہوئے ہیں۔ بعضے صرف معمولی ہیں۔ بہرحال ایک امر جاری رہنے سے امید ہے کہ کوئی عمدہ مضمون بھی آجائے گا۔ مولوی چراغ علی۔ منشی ذکاء اللہ صاحب۔ مولوی الطاف حسین حالی۔ منشی مشتاق حسین نے مضامین بھیجنے کا وعدہ کیا ہے اور ایک اور صاحب ہیں۔ جو مولوی مستعد ہیں اور تمام خیالات تہذیب الاخلاق و نیچر کے ان کے دل میں بھر گئے ہیں اور تمام پچھلی تعلیم کو بھلا دیا ہے۔ وہ بھی وعدہ تحریر مضامین کرتے ہیں۔ مگر تمام ظاہر کرتے ہوئے کانپتے ہیں۔ بہرحال اس کا جاری رہنا بہتر ہے۔ والسلام

خاکسار

سید احمد ۔ شملہ پارک ہوٹل ۱۲ جون ۱۸۷۹ء

---

(۵)

محبی و شفیقی!

آپ کا عنایت نامہ پہنچا۔ مضمون مرسلہ چھپنے کو بھیج دیا۔ تصانیف احمدیہ چھپ رہی ہے۔ مگر تہذیب الاخلاق کے چھپنے سے کام

زیادہ ہو گیا ہے۔ اسی سبب اور نیز اس سبب سے کہ اس کے پروف میرے پاس شملہ پر آتے ہیں۔ تاخیر سے چھپتی ہے۔ شملہ پر میں نے کام تفسیر کا بہت کیا ہے۔ سورہ بقر کی کل تفسیر قریب ختم ہونے کے ہے۔ نہایت مشکل مشکل مقام جو ظاہرا معلوم ہوتے تھے۔ نہایت صفائی اور خوبی سے حل ہوئے ہیں اور مجھے یقین کامل ہے کہ وہی مطلب قرآن کا ہے۔ جو میں نے بیان کیا۔ میں آپ کی عنایت و محبت کا ہمیشہ شکر گزار ہوں۔ مجھ کو آپ سے ایک خاص محبت اس خیال پر رکھتا ہوں کہ مجھ کو آپ سے قومی فائدے پہنچنے کی توقع ہے۔ خدا آپ کو زندہ رکھے۔ اور بڑھاپا کرے اور میرا جو خیال آپ کی نسبت ہے اس کو پورا کرے۔ آپ کے والد ماجد آپ کے ان خیالات کی نسبت کیا کہتے ہیں۔ پسند کرتے ہیں یا یہ سمجھتے ہیں کہ میرا نوجوان بیٹا بگڑ گیا۔ بروقت مراجعت شملہ کسی مقام پر اب ضرور ملاقات ہونی چاہئے۔ پنجاب میں جو قانون مال گزاری اور قانون لگان جاری ہے۔ وہ غالباً اردو زبان میں لوگوں نے چھاپے ہوں گے۔ ایک ایک کاپی اگر ان کی دستیاب ہو تو مرحمت فرمایئے۔ والسلام

خاکسار

سید احمد شملہ — ۱۲ جولائی ۱۸۷۹ء

---

(۶)

محبی و مشفقی!

ایک خط ملفوف ہے اس کو پڑھ کر اور دوسرے لفافے میں رکھ کر کاتب خط کے نام روانہ فرما دیجئے۔ آپ کی تحریر سفیر ہند میں پڑھ کر نہایت خوش ہوا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام پہلو اور باریکیاں ان مسائل کی بخوبی آپ کے پیش نظر ہیں۔ اور ہر ایک کو کماحقہ غور کیا ہے۔ مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی کا دماغ اس قسم کے مضامین سمجھنے کے مناسب نہیں ہے۔ ان پر کیا موقوف ہے۔ ہمارے علما کی قوت دماغی ان ہی معمولی کتابوں کے پڑھنے میں صرف ہو جاتی ہے۔ پھر طاقت مطالب دیگر پر غور کی باقی نہیں رہتی۔ رسالہ اشاعۃ السنۃ میں آپ نے دیکھا ہو گا کہ "فطرت" کے لفظ پر کیسی لغو اور غیر مناسب تقریر لکھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مطلق وہ نہیں سمجھتے۔ والسلام

دو رسالے نسبت مزارعان پنجاب پہنچے۔ جن کا نہایت دلی شکریہ قبول ہو۔ فقط

خاکسار

سید احمد۔ ۲۰ جولائی ۱۸۷۹ء شملہ پارک ہوٹل

---

(۷)

محبی و مکرمی!

عنایت نامہ پہنچا۔ نماز فی حد ذاتہ نہایت مناسب فطرت انسانی کی ہے۔ ارکان معینہ اس فطرت کے محافظ ہیں اور اس لیے بمنزلہ اس کے جزو کے ہیں۔ باقی رہا تعین ارکان بہ ہیئت موجودہ۔ اس کی نسبت جو شبہ کیا جائے وہی شبہ بعینہٖ اس ہیئت پر بھی وارد ہو گا۔ جو اور طرح پر قرار دی جائے۔ اس لیے یہ شبہ از قبیل شبہ عامۃ الورود ہو گا جو مقبول نہیں ہو سکتا۔ ہاں اس میں شبہ نہیں ہے کہ ہیئت موجودہ کی خوبی اور عمدگی کا ثبوت چاہئے۔ جو علانیہ ظاہر ہے۔

آپ کا مضمون جو بدنظرۂ مادوں نے تہذیب الاخلاق کے ساتھ چھاپا تھا پڑھ لیا ہے مگر تعجب ہے کہ تہذیب الاخلاق والا پرچہ بھی جناب تک نہیں آیا۔ معلوم نہیں کیا آفت پڑی ہے۔ والسلام

خاکسار آپ کا نیازمند

سید احمد شملہ پارک ہوٹل ۲۰ جولائی ۱۸۷۹ء

---

(۸)

مکرمی عزیزی!

تمہارا مضمون تہذیب الاخلاق کی نسبت متعدد دوستوں نے پڑھا۔ اس وقت میں پڑھ رہا ہوں۔ جو بات میرے دل میں آئی آپ کو لکھتا ہوں۔

شکر ہے خدا کا ہماری قوم میں تم سا نوجوان لائق پیدا ہوا۔ خدا تم کو زندہ سلامت رکھے۔ مضمون کی عمدگی، اس کا طرز بیان، اس کی ترتیب، اس کے شستہ الفاظ بے انتہا تعریف کے لائق ہیں۔ جو بات خدا نے ہم کو داڑھی سفید ہو جانے کے بعد دی وہ خدا نے تم کو اس عمر میں دے دی کہ شاید ابھی پوری داڑھی بھی نہ نکلی ہو گی ؎

بالائے سرش ز ہوشمندی   تابد ستارۂ بلندی

خدا تم کو زندہ رکھے اور جیسی مجھ کو امید تمہاری ذات سے قوم کی بھلائی کی ہے، خدا اس کو پورا کرے۔ انگریزی علوم علی الخصوص لٹریچر کی تحصیل میں زیادہ محنت کرو۔ معلوم نہیں کہ تمہاری شادی ہو گئی ہے یا نہیں۔ مگر نہ ہوئی ہو تو جلدی مت کرنا۔ یہ ایسا پھندا ہے کہ انسان کو مشکلات میں پھنسا دیتا ہے۔ والسلام

آپ کا دلی ترقی خواہ

خاکسار سید احمد، شملہ پارک ہوٹل، ۱۲ اگست ۱۸۷۹ء

---

(۹)

مکرمی و محبی!

آپ کا عنایت نامہ پہنچا۔ اگرچہ مجھ کو آپ کے تشریف لانے سے نہایت خوشی ہے۔ مگر با ایں ہمہ چار روز کا سفر کرنا جو آپ کو تکلیف دے گا، اس کا افسوس ہے۔ بہرحال ملاقات ہونے کے بعد سب کچھ مبدل بخوشی ہو جائے گی۔ آتے وقت علی گڑھ مت ٹھہرنا۔ جب یہاں آؤ گے تو مولوی خواجہ محمد یوسف صاحب بھی یہاں ہوں گے۔ ان سے ملاقات ہو جائے گی۔ اور بروقت مراجعت شاید ساتھ بھی ہو گا۔ اور مدرستہ العلوم کی بھی علی گڑھ میں خوب سیر ہو گی اور مراجعت کے وقت تک مدرسہ کھل بھی جاوے گا۔ اگر راستہ میں سے اپنے پہنچنے کا ٹھیک وقت بذریعہ تار برقی بتا دو گے تو میں آدمی و سواری سٹیشن پر بھیج دوں گا۔ شاید کچھ غلطی ہو جائے۔ اس لیے لکھتا ہوں کہ میرے محلے کا نام تو آپ کو معلوم ہے۔ مگر گاڑی والے یہ نام کم سمجھتے ہیں۔ اس محلے کو بلحاظ تعلق "باغی چھتہ" کہتے ہیں۔ پس اگر شاید میرا

آدمی ہنسے تو تمہیں گاڑی یہاں سے گھوڑے برابر لے آئے گا۔ اسٹیشن پر کثرت سے گاڑیاں کرائے کی حاضر و موجود رہتی ہیں۔ یہ سب باتیں احتیاطاً لکھ دی ہیں۔ والسلام

خاکسار

سید احمد کلکتہ ۱۵ دسمبر ۱۸۶۹ء

---

(۱۰)

عزیزی مجتبیٰ!

تمہارے تین خط پہنچے۔ پہلا خط جو شکریہ کا تھا اس کی کچھ ضرورت نہ تھی۔ مجھ کو تم سے دلی محبت ہے اور ہر طرح ترقی کا خواہاں ہوں پچھلے دو خطوں کو پڑھ کر افسوس ہوا۔ ولایت جا کر تعلیم حاصل کر کے ہندوستان میں وجہ معاش حاصل کرنے کے جو بغیر ولایت جانے حاصل نہیں ہو سکتی۔ صرف تین کام ہیں۔ بیرسٹری۔ انجنیری۔ ڈاکٹری۔ اول کام تم بھی ناپسند کرتے ہو۔ اور میں بھی چنداں پسند نہیں کر سکتا۔ صرف بیرسٹری کے بعد دو امر کی ضرور امید ہے۔ ایک یہ کہ بذریعہ بیرسٹری گو وہ کیسی ہی کم ہو۔ تین چار سو روپیہ مہینہ ضرور ملے گا۔ اور اس سے زیادہ ترقی ہو جانی تقدیری بات ہے۔ دوسری یہ کہ بعد واپسی ہندوستان کوئی ابتدائی عہدہ عدالت کا ضرور مل سکے گا اور اسی سلسلہ میں جلد ترقی کرنے کا موقع ملے گا۔ اور ہندوستان کے امتحانوں سے نجات ملے گی۔ بارسٹری میں اس سے زیادہ توقع نہیں ہے۔ انجنیری میں داخل ہونے کو ان وجوہات سے جو آپ نے لکھی ہیں۔ بلاشبہ نہایت مشکل اور نہایت دقت ہے۔ ڈاکٹری میں بھی وہ وقت پیش آوے گی۔ علاوہ ڈاکٹری اس لیے زیادہ نامناسب ہے کہ ہندوستانیوں کو سول سرجن کا عہدہ ملنا انگریز اور لیڈیاں پسند نہیں کرتیں، اور اس لیے ہندوستانی فوجی ڈاکٹری پر چھینک دیئے جاتے ہیں۔ پس درحقیقت تمہارے لیے کوئی ایسا موقع نہیں ہے۔ کہ بعد واپسی ولایت سے ایسا عہدہ پا سکو۔ جو یہاں کی تعلیم سے حاصل نہ ہو سکتا ہو۔ پس آپ کا ولایت جانا دو امر کی توقع پر ہو سکتا ہے۔ اول بارسٹری کے لیے جس سے ان فوائد کے سوا جو اوپر مذکور ہوئے اور کسی بات کی توقع نہیں۔ شاید یہ ہو کہ عدالت کے ابتدائی عہدے ملنے میں ولایت کی تعلیم کے سبب کچھ آسانی ہو۔ دوسرے بغرض عمدہ تعلیم حاصل کرنے کے اس میں کچھ شک نہیں۔ کہ انگریزی میں عمدہ تعلیم ہندوستان میں حاصل ہونی ناممکن ہے۔ اور ولایت میں جو عمدہ انگریزی تعلیم حاصل ہو جاوے گی۔ وہ لازوال دولت ہے اور ولایت سے واپس آنے کے بعد اسی تعلیم کے ذریعے سے چار پانچ سو روپیہ ماہواری ہر صورت سے کما سکتے ہو۔

تمام حالات پر غور کرنے کے بعد میری رائے یہ ہے کہ اگر تم چار برس کے لیے بھی ولایت جا سکتے ہو تو جاؤ۔ فی الفور جاتے ہی کسی یونیورسٹی میں داخل ہو جاؤ۔ اور لٹریچر کی شاخ اختیار کرو۔ برس روز تک کسی چیز کا بجز محنت کے ترقی تعلیم پر خیال مت کرو۔ برس روز کے بعد "لنکن ان" میں بارسٹری کے لیے داخل ہو جاؤ۔ تعلیم بدستور یونیورسٹی میں جاری رکھو۔ اور صرف لکچر کے زمانے میں "لنکن ان" میں لکچر سن جایا کرو۔ دو برس بعد امتحان دینا ہو گا۔ چند روز پہلے امتحان کے لیے اپنے تئیں تیار کر لو۔ اور اگر "لنکن ان" میں یہ قاعدہ اب بھی ہو کہ جو شخص تین برس تک لکچر سنے۔ اس کو امتحان کی ضرورت نہیں ہے۔ تو امتحان کا خیال بھی مت کرو۔ تین برس برابر لکچر سنتے جاؤ۔ اور یونیورسٹی کی تعلیم میں اس قدر محنت کرو کہ بی۔ اے کی ڈگری حاصل کر لاؤ۔ یہ وہ دولت ایسی ہو گی جس سے مسلمانوں کو تمہاری ذات پر فخر ہو گا اور

ہمیشہ کو تمہاری ذاتی اور دلی خوشی کا باعث ہوگا۔ اور اگر یہ امور تمہاری دانست میں اور تمہارے والد ماجد کی دانست میں کافی معاوضہ ولایت جانے کا اور چار برس تک صعوبات سفر اختیار کرنے کا اور سب زائد روپیہ خرچ ہونے کا نہ ہو۔ تو ارادہ موقوف کرو۔ بہ تقدیر یہاں تعلیم میں کوشش کرو۔ تم کو انگریزی لٹریچر میں ترقی کی بہت حاجت ہے اور اس پر بہت زیادہ کوشش درکار ہوگی۔ والسلام

خاکسار تمہارا خیر طلب

سید احمد۔ کلکتہ ۔ ۱۶ فروری ۱۸۸۰ء

---

(۱۱)

مخدومی و مشفقی!

آپ کے دو عنایت نامے پہنچے۔ آپ کی عنایت کا شکر گزار ہوا۔ میں بخیریت ہوں اور اپنے کام میں دن رات مشغول ہوں۔ نسبت آرٹیکل کے جو آپ نے لکھا ہے۔ اس کا ترجمہ انگریزی میں ہونا نہایت دقت کی بات ہے۔ شاید وہ انجام نہیں ہو سکے گا۔ کوئی ایسا لکھنے والا یہاں نہیں ہے۔ جو اس کو اسی خوبی سے انگریزی میں لکھ دے۔

درحقیقت جو لوگ یونیورسٹی پنجاب کے طرفدار ہیں وہ اس سے ناخوش ہوئے ہوں گے اور کچھ شبہ نہیں ہے۔ کہ تمام پنجاب کے اخبار اس کی تردید کریں گے۔ وہ آرٹیکل خاص پنجاب کی یونیورسٹی پر نہیں ہے۔ بلکہ گورنمنٹ کی پالیسی پر ہے۔ ان میں جن کتابوں کے نام ہیں۔ اس کا یہ منشا نہیں ہے کہ وہ پنجاب یونیورسٹی میں پڑھائی جاتی ہیں۔ بلکہ علوم مشرقی کے ذکر میں ان کا نام آیا ہے۔ اگر کسی کو اس قدر بھی سمجھ نہ ہو۔ تو اس کی بھی زیادہ تشریح کا کوئی مضمون چھاپنا محض بے فائدہ ہے۔ یہ میں جانتا ہوں کہ وہاں ان کتابوں کا ترجمہ پڑھایا جاتا ہے۔ جو انگریزی سکیم میں ہیں۔ ان کی نسبت میں نے لکھ دیا ہے کہ پرانی تدبیر ہے۔ جو ناقص قرار پاکر چھوڑ دی گئی۔ معہذا ترجموں سے ترقی اعلیٰ درجے کی ناممکن ہے۔ پس میرے نزدیک اس مضمون کے لکھنے پر زیادہ تر صرف اوقات محض فضول ہے۔ پنجاب یونیورسٹی کالج ضرور یونیورسٹی ہو جائے گا۔ لارڈ رپن کی ایسی ہی پالیسی ہے۔ بلکہ اکثر حکام کی۔ افسوس یہ ہے کہ خود ہندوستانی اپنا بھلا برا نہیں سمجھتے۔ اب ہم اس قابل ہوں تو کچھ مشکل نہیں ہے۔ گورنمنٹ کی کچھ بھی پالیسی ہو ہم کو وہ کرنا چاہیے جو ہمارے لیے فی الواقع مفید ہے۔ والسلام

خاکسار ، سید احمد

علی گڑھ ۔ ۸ دسمبر ۱۸۸۰ء

---

(۱۲)

مخدومی و مشفقی!

عنایت فرمائے من۔ دو قطعہ عنایت نامہ معہ دو قطعہ کرنسی نوٹ ایک پچاس روپیے کا بابت چندہ اور دوسرا بیس روپیے کا بابت تفسیر پہنچا۔ آپ کی عنایت و محبت کا شکر گزار ہوں۔ تفسیر سورہ آل عمران کی ختم ہو گئی ہے۔ عنقریب تقسیم ہوگی۔ اس کی تفسیر

میں بھی چند مشکل مقامات سے قطع نظر کر کے جو تحقیق و علم کے موافق حل کیا ہے حضرت مسیح کی ولادت کی نسبت میرے دل میں کچھ شبہ نہیں ہے۔ تا ہم خیال کی تعلیم کے سبب مدرستہ العلوم میں جماعت کا قائم ہونا محض غلط ہے۔ والسلام

آپ کا محب قلبی
سید احمد علی گڑھ۔ ۴ مارچ سنہ ۱۸۸۱ء

---

(۱۳)

محبی و مشفقی!

آپ کے دو عنایت نامے پہنچے۔ آپ کی عنایت و یاد آوری کا شکر کرتا ہوں۔ تفسیر زرد کاغذی معدود باقی ہے۔ ایک جلد حسب طلب روانہ کی ہے۔ میں فضل الٰہی سے بخیریت ہوں۔ گرمی کے موسم میں حسب معمول میری طبیعت کسی قدر علیل ہو جاتی ہے۔ ویسے ہی اس گرمی میں بھی ہوئی ہے۔ مگر کوئی خاص علامت نہیں ہے۔ معمولی بات ہے۔ آپ کے ملنے کو نہایت دل چاہتا ہے۔ اگر تعطیل میں چند روز یہاں چلے آؤ۔ تو آپ کی محبت و عنایت کے اور میری دلی نیاز کے بالکل مناسب ہو۔ آپ نے لکھا تھا کہ حضرت عیسیٰ کے خلق طیر کی نسبت کوئی اور بات آپ کے خیال میں آئی ہے۔ جس کے دریافت کرنے کا میں بہت مشتاق ہوں۔ پس جو تقریریں اس کی نسبت آپ کے خیال میں ہوں ان سب کو لکھ کر میرے پاس بھیج دیجئے۔ والسلام

آپ کا نیاز مند
سید احمد۔ علی گڑھ۔ ۲ مئی سنہ ۱۸۸۱ء

---

(۱۴)

محبی و مشفقی!

آپ کا عنایت نامہ مورخہ ۱۸ مئی پہنچا۔ آپ کی صحت و تندرستی سے دل خوش ہوا۔ تعطیل میں جو آپ نے قصد تشریف آوری کیا ہے۔ اس سے نہایت مسرت ہوئی ہے۔ جس قدر خوشی مجھ کو آپ کے ملنے سے ہو گی۔ بیان نہیں ہو سکتی۔

منی آرڈر پہنچ گیا ہے۔ شرح قانون شہادت و خطبات آج روانہ خدمت ہوئی ہیں۔

حاجی محمد اسمٰعیل خاں صاحب رئیس دتاولی ضلع علی گڑھ کو جو میرے حال پر نہایت عنایت فرماتے ہیں یہ خیال پیدا ہوا ہے کہ منجملہ مکانات مدرستہ العلوم کے ایک مکان اس چندہ سے میری ناچیز کوششوں کی یادگار کے نام سے بنایا جائے۔ میں تو ایسی بات کو اپنی نسبت پسند نہیں کرتا۔ مگر میں خاموش رہا۔ اس نیت سے کہ اگر مدرستہ العلوم کا کوئی مکان اس بہانے سے بن جائے تو ازیں چہ بہتر۔ آپ نے اور جناب مخدومی محمد برکت علی خاں صاحب نے جو اس پر توجہ کی اس کا میں بھی شکر گزار ہوں۔ اصل یہ ہے کہ مدرستہ العلوم کو غیر متوقع ترقی ہو گئی ہے۔ اس وقت دو سو سے زیادہ مسلمان پڑھتے ہیں اور قریب پونے دو سو کے بورڈر ہیں۔ اگر یہ مدرسہ نہ ہوا ہوتا تو ان میں سے ایک کے پڑھنے کی بھی توقع نہ تھی۔ اس ترقی کے سبب حاجات مدرستہ العلوم بھی زیادہ ہو گئی ہیں اور زیادہ تر تائید کا محتاج ہو گیا ہے۔

پس یہ امر کہ حاجی محمد اسمٰعیل خاں صاحب نے پیش کیا ہے۔ گو وہ حق بجانب نہ ہو اور نہ کوئی ذمہ ہی ایسی کوشش ہے جس کا صلہ ایسا دیا جائے۔ مگر اس سے مدرستہ العلوم کی حاجتوں کو بہت تائید ملے گی۔ پس اس کو بھی بطور تائیدات مدرستہ العلوم تصور کر کے کوشش کرنی زیبا ہے۔ صرف نام کو اس میں بطور حرف غلط کے سمجھنا چاہئے۔

مولوی محمد حسین صاحب کچھ ہی کہتے اور لکھتے ہوں ہمارا اور ہمیشہ دوستوں کا طریقہ ان کے ساتھ اخلاق اور ادب کا رہنا چاہئے وہ ذی علم اور فاضل ادیب ہیں۔ اور کوئی ایسی بات جس سے ان کے دل کو رنج پہنچے نہ ہونی چاہئے۔ ہمارا مشرب محبت ہے۔ ہمارے دل میں رنج کو جگہ ہی ہونی نہ چاہئے۔ تحریرات میں وہ بد تہذیبی کرتے ہیں۔ اس سے ہمارا کیا نقصان ہے۔ بلکہ اگر افسوس ہے تو یہ ہے کہ وہ اپنے اخلاق کو بٹہ لگاتے ہیں۔ نسبت خلق جیسے جو آپ نے تحریر کیا۔ اس کا شکر کرتا ہوں۔ مگر وہ چھپا ہوا نہیں ہے۔ میں ابھی تک اس قابل نہیں ہوں کہ اس کا فیصلہ لکھ سکوں۔ شاید چند روز بعد ہو جاؤں۔ مگر نہایت مشکل ہے۔ اب تک قرآن مجید کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا۔ ان دونوں مقاموں پر جہاں وہ ذکر ہے ایسی آیات واقع ہیں کہ ان کا ربط دینا نہایت مشکل ہے مگر خدا اس کے حل میں مدد دے گا۔

بھائی حضرت جناب خان بہادر محمد برکت علی خاں صاحب میرا سلام نیاز پہنچا دیجئے گا۔

مخدومی محمد حیات خاں صاحب کے مقدمے کا نہایت رنج و افسوس ہے۔ دیکھئے انجام کیا ہوتا ہے خدا فضل کرے۔ والسلام

خاکسار

سید احمد۔ علی گڑھ۔ ۲۰ مئی ۱۸۹۰ء

---

(۱۵)

مجی و مشفقی!

عنایت نامہ پہنچا۔ اور حالات مندرجہ سے اطلاع ہوئی۔ آپ کی ملاقات کو دل چاہتا تھا۔ اس تعطیل میں نہ آنا بہتر ہو۔ موسم اچھا نہیں ہے۔ تعطیل دسمبر میں ضرور تشریف لائیے گا۔ ملنے، بیٹھنے، باتیں کرنے، سیر کرنے سب کے لیے اچھا موسم ہوگا۔ کیا عجب ہے کہ اس زمانے میں کوئی جلسہ کمیٹی بھی ہو۔

ہم ہندوستانیوں کی تمام مجلسیں بے جان ہیں۔ یا تو ان میں کچھ کام نہیں ہوتا۔ یا کسی یورپین افسر کے ہاتھ فروخت ہو جاتی ہیں اور اس کے مقاصد یا رائے کی تکمیل کی بھی آلہ بن جاتی ہیں۔ یہ قوت ہم میں نہیں ہے۔ کہ ہم اپنا کام اپنی رائے اور اپنی قوت سے چلا دیں۔ ہم سے اور مسٹر کیمپسن صاحب ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن سے نہایت ناموافقت تھی۔ ملاقات اور صاحب سلامت بھی نہ ہوتی۔ ہمارے تمام کاموں کے وہ برخلاف تھے۔ سبب صرف یہ تھا کہ ان کی خواہش تھی کہ سینٹی فک سوسائٹی اور مدرستہ العلوم ان کے قبضے میں ہو اور ہم صرف ان کے ہاتھ میں بطور ایک آلہ کے ہوں۔ ہم نے نہایت استقلال سے کسی بات میں دخل دینے نہیں دیا۔ اور خود آپ اور اپنی رائے سے اور اپنے مقاصد کے لحاظ سے کام چلایا۔ اور میں اپنے دوستوں کو کئی دفعہ بطور وصیت کے کہہ چکا ہوں کہ میرے بعد مدرستہ العلوم کا جو کچھ حال ہو سو ہو مگر ایسا نہ کرنا کہ قوم کے ہاتھ سے نکل کر اور لوگوں کے قبضے میں چلا جائے۔ بُری طرح یا بھلی طرح ہماری قوم ہی اس کی چلانے والی ہو۔ لوگ عام فائدے کے کاموں میں حکام کے سامنے بھی اپنا رسوخ چاہتے ہیں مگر حقیقت میں اپنی عزت کھو بیٹھتے ہیں۔ ہم اس ضلع کے

حکام کو نہایت ادب کرتے ہیں تمام جلسوں میں انہی کو افسر بناتے ہیں۔ انعام انہی کے ہاتھ سے تقسیم کرواتے ہیں۔ مگر جائے کلام ہے ان کو ایک نقطہ برابر بھی مداخلت نہ ہوئی۔ وہاں کے حالات نہایت افسوس کے قابل ہیں۔ مگر "خود کردہ را درماں نیست" جس کام سے قوم کا فائدہ منصور تھا اپنے ہاتھوں اس قوم کے لیے زہر بنا لیا۔ ہمارا کالج بفضل الٰہی بے نہایت ترقی پر ہے۔ مکانات کی نہایت قلت ہوگئی۔ اس لیے داخلہ روک دیا گیا، ورنہ اس وقت چار سو سے زیادہ طالب علم ہوتے۔ والسلام

خاکسار

سید احمد۔ علی گڑھ — ۸ ر اگست ۱۸۹۵ء

---

(۱۶)

محبی و مکرمی!

آپ کا عنایت نامہ مورخہ ۱۱ ر دسمبر پہنچا۔ آپ کی علالت کا حال سن کر سکتہ کی حالت میں رہ گیا۔ خدا کا ہزار ہزار شکر مرض موذی سے نجات اور صحت ہوئے بخار سے صحت گزاری کا حال اسی خط میں مذکور تھا۔ اور جو صدمہ کہ میرے دل پر ہوا تھا وہ بہت جلد رفع ہوگیا۔ الحمد للہ علیٰ ذالک۔ ضعف جو باقی ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ بہت جلد رفع ہو جاوے گا۔ مگر پرہیز و احتیاط سے تغافل کرنا نہ چاہیے۔ مجھ کو کئی دفعہ خیال آیا کہ کیوں آپ کا عرصہ سے عنایت نامہ نہیں آیا۔ مگر سہل خیالات پر وہ خیال رفع ہوتا رہا۔ یہ نہ معلوم تھا کہ اس کا ایسا بڑا و سخت سبب ہے جس سے آیندہ ہمیشہ خدا تعالیٰ آپ کو محفوظ رکھے۔ ان اطراف میں بھی بخار کی کثرت رہی۔ میں بھی اس عارضے میں مبتلا ہوگیا تھا۔ اب بفضل الٰہی صحت ہے۔ آپ سے ملاقات کو دل چاہتا ہے۔ شروع مارچ مدرسہ میں جدید عمارات مدرسہ کے کھولے جانے کا جلسہ ہوگا۔ نہایت خوشی ہوگی۔ اگر آپ بھی اس جلسے میں شریک ہو سکیں۔ سوسیٹی کا چھاپہ خانہ ایک ابتر حالت میں ہے۔ سورۂ مائدہ کی تفسیر چھپ رہی ہے۔ جس قدر تاخیر ہوتی ہے۔ چھاپہ خانہ کے سبب سے ہوتی ہے۔ خلق طیر۔ احیاء اموات وغیرہ سب کی تفسیر اس میں ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ بہت جلد اس کو اور خدا نے چاہا تو تمام قرآن کی تفسیر ملاحظہ فرماؤ گے۔ آپ پر بھی فرمائش ہے کہ اپنی صحت مزاج سے جلد جلد مطلع فرماتے رہیں۔ والسلام

خاکسار دعاگوئے شما

سید احمد۔ علی گڑھ — ۱۴ ر دسمبر ۱۸۸۱ء

---

(۱۷)

محبی و مشفقی!

آپ کا عنایت نامہ مورخہ ...... مقام لاہور میرے پاس پہنچا۔ آپ کی صحت و تندرستی سے نہایت خوشی ہوئی۔ خدا تعالیٰ آپ کو صحیح و تندرست رکھے۔ امید ہے کہ روز بروز صحت و تندرستی و قوت زیادہ ہوتی جائے گی۔ آب و ہوا کا تبدیل کرنا نہایت مناسب

جلد اول سیرت اور معاملات شوہر کے دیکھنے سے دل کو فرحت ہوئی ہوگی۔ معلوم نہیں کہ اخیر روئداد کمیٹی یادگار منشی مشتاق حسین صاحب نے آپ کے پاس بھیجی یا نہیں۔ غالباً نہ بھیجی ہوگی۔ اس لیے اس کی ایک کاپی میں بھیجتا ہوں۔ اس کو پڑھ کر آپ خوش ہوں گے۔ اگر عمارت مجوزہ بن جاوے تو کالج کو نہایت مفید ہوگی۔ اور بہت سی مشکلات رفع ہو جاویں گی۔ تفسیر آہستہ آہستہ چھپتی ہے۔ ابھی سورۂ بقر والسارق والسارقہ فاقطعوا ایدیہما کی تفسیر میں مشکل پیش آئی ہے۔ اس کے حل کی بھی بعض ضروری کتابیں دیکھنی ہیں۔ کونسل میں اگرچہ کام ہے۔ مگر میں تفسیر کے لکھنے یا اس کے متعلق کتابوں کے دیکھنے سے کبھی غفلت نہیں کرتا۔ والسلام

خاکسار آپ کا ترقی خواہ

سید احمد

۲۳ جنوری ۱۸۸۱ء کلکتہ — ۲۵ تھیٹر روڈ

---

(۱۸)

محبی و مشفقی مولوی سید ممتاز علی صاحب۔ کل کی ڈاک میں میرے پاس رسالہ محاکمہ ولادت مسیح پہنچا۔ اسی وقت میں نے اس کو پڑھنا شروع کیا۔ اور رات کو ختم ہوا۔ اس کے پڑھنے سے اس وجہ سے خوشی نہیں ہوئی کہ میری رائے کی اس میں تائید کی گئی ہے۔ بلکہ اس وجہ سے خوشی ہوئی کہ نہایت عمدگی و ترتیب و صفائی سے لکھا گیا ہے۔ اس سے بہتر نہیں لکھا جا سکتا کچھ مجھ سے لکھنا رہ گیا تھا۔ وہ اس میں پورا کر دیا گیا ہے۔ ابن مریم مشہور ہونے کا سبب نہایت عمدہ بالکل صحیح مطابق واقعہ تحریر ہوا ہے۔ مجھ کو یہ خیال نہ تھا کہ یوسف کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس کے سوا اور بھی بعض عمدہ و جدید باتیں ہیں۔ اگر میری تفسیر کا دوسرا ایڈیشن ہو تو آپ کے رسالے میں سے چند باتیں اس میں اضافہ ہونی ضرور ہوں گی۔ ایک آدھ جگہ جناب مولوی محمد حسین صاحب کی نسبت سخت لفظ ہیں۔ اگر وہ بھی نہ ہوتے تو نہایت بہتر ہوتا۔ امید ہے کہ آپ بخیر و عافیت ہیں۔ والسلام

خاکسار

سید احمد — ۱۸ اپریل ۱۸۸۲ء

---

(۱۹)

محبی و شفیق عالم۔ آپ کا عنایت نامہ مقام پٹیالہ سے پہنچا۔ آپ کی عنایت اور آپ نے جو سید محمود کے تقرر پر مبارکباد دی ہے۔ اس کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میرا ارادہ خود جانے کا ہے اور صرف چار پانچ روز وہاں رہوں گا۔ پنجاب یونیورسٹی بل پر جب سلکٹ کمیٹی کی رپورٹ پیش ہوگی۔ اس زمانے میں جاؤں گا۔ ابھی معلوم نہیں کہ کب پیش ہوگی۔ مگر مجھے امید ہے کہ تاریخ پیشی سے ایک ہفتہ قبل مجھ کو اطلاع مل جاوے گی۔ جس وقت تاریخ روانگی مقرر ہوگی میں آپ کو اطلاع دوں گا۔

جلد دوم تفسیر لغایت آخر سورۂ مائدہ طیار ہو گئی چھپ گئی۔ اس کو مرتب کرتا ہے۔ بہت جلد تقسیم ہوگی۔

خاکسار

سید احمد — علی گڑھ

۲۰ جون ۱۸۸۲ء

---

(۲۰)

محبی مکرمی مشفقی - آپ کا عنایت نامہ پہنچا۔ آپ کی صحت و تندرستی سے اس قدر خوشی ہوئی ہے جس کو میرا دل جانتا ہے۔ خدا تعالیٰ تم کو ہمیشہ تندرست و صحیح مطالب پر کامیاب رکھے۔ آمین۔

بقیہ اوراق جلد اول تصانیف چند روز ہوئے کہ روانہ کئے ہیں۔ یاد نہیں کہ کس پتے پر۔ اگر نہ پہنچے ہوں تو مطلع فرمائیے کہ دوبارہ بھیج دوں۔

تفسیر جلد دوم کاغذ زرد و اوراق جلد سوم تا نمبر ۹۔ آج روانہ کئے جاتے ہیں۔ ماجنہ پر بحث جو مجھ کو لکھنی تھی۔ اسی سورۂ انعام میں یا معشر الجن کی تفسیر میں لکھ دی ہے۔ وہ بحث چھپ رہی ہے۔ پروف میں نے دیکھ لیا ہے۔ عنقریب چھپ جاوے گی۔ اگر زیادہ شوق ہو تو اس بحث کا مسودہ بھیج دوں۔ حشر کی بحث آئندہ ہوگی۔

میرا ارادہ ہے ماہ دسمبر میں پنجاب آنے کا۔ مقصد صرف خلیفہ محمد حسن صاحب سے پٹیالہ میں ملنے کا اور گورداسپور میں سردار محمد حیات خاں سے ملنے کا اور لاہور میں آپ سے اور محمد برکت علی خاں صاحب سے ملنے کا ہے۔ غالباً ہمارے دوست محمد اسمٰعیل خاں صاحب بھی ساتھ ہوں گے۔ سید محمود آج علی گڑھ پہنچیں گے۔ جب وہ یہاں سے اپنے علاقہ ڈسٹرکٹ جج رائے بریلی پر چلے جائیں گے اور کالج کے طالب علموں کی یونیورسٹی کے امتحان کے لیے الہ آباد اور کلکتہ کی روانگی کا بندوبست ہو جاوے گا۔ اس وقت میں کوئی تاریخ روانگی مقرر کروں گا۔ اور آپ کو اطلاع دوں گا۔ میں تو مناسب نہیں سمجھتا کہ میرے وہاں آنے کی بابت کچھ زیادہ چرچا کیا جائے۔ میں مثل ایک معمولی آدمی کے تفریح طبع اور دوستوں سے ملنے کیلئے آتا ہوں۔ اس کی دھوم دھام کیا۔ ہاں اگر کالج کے لیے کچھ چندہ مل سکے تو جو دھوم دھام چاہو کرو۔ مگر اس کی توقع نہایت کم ہے۔ پھر دھوم دھام سے کیا فائدہ۔ آئندہ جو تمہاری خوشی ہو۔ والسلام

خاکسار

سید احمد علی گڑھ - ۲۱ نومبر ۱۸۸۳ء

(۲۱)

محبی و مکرمی مولوی سید ممتاز علی صاحب - آپ کا عنایت نامہ پہنچا۔ میں نے اوراق تفسیر وغیرہ اس لیے نہیں روانہ کئے تھے۔ کہ شبہ تھا کہ اس وقت آپ کہاں ہیں۔ آج روانہ کئے ہیں۔

مولوی اقبال علی صاحب نے سفر نامہ پنجاب مرتب کر کے بھیج دیا ہے جو چھپ رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس میں سردار دیال سنگھ بہادر کا حال اضافہ کروں۔ آپ ان کے خاندان کا مختصر حال مع ان کے زمانہ سفر ولایت وغیرہ امور کے جو قابل اندراج ہوں۔ تحریر فرما کر ارسال فرمائیں۔ اور جس امر کی تحقیق کی ضرورت ہو۔ سردار صاحب سے مل کر دریافت کر لیں۔ انھوں نے مدرسۃ العلوم پر بہت احسان کئے ہیں۔ دوسرے یہ کہ مرزا ارشد صاحب نے جو اشعار و نظم کے یونیورسٹی ہال کے جلسے میں پڑھے تھے۔ وہ بھی ان سے لے کر بھیج دیجئے۔ اپنی خیر و عافیت سے ہمیشہ مطلع فرماتے رہئے۔

والسلام

خاکسار

سید احمد - علی گڑھ

۲ر اپریل ۱۸۸۳ء

آج کی شاعری

ایک تعارف

ڈاکٹر محمد حسن

پچھلے نو دس برس میں ہماری شاعری میں ایک نیا لب و لہجہ نمایاں ہوا ہے۔ بٹوارے کے بعد ترقی پسندی کے اثرات مدھم ہونے لگے۔ اسی زمانے میں آزاد نظم کا زوال اور غزل کی تجدید کا چلن ہوا۔ نکھرے جلال و جمال سے زیادہ انداز سخن کی تکنیک اور لہجے کی نرمی پر توجہ دی جانے لگی۔ شاعری میں پیچیدگی اور رمزیت کی رو بڑھی۔ واضح اور روشن راستوں کی جگہ نیم واضح، نیم روشن دھندلکوں نے لے لی جہاں بھٹکتے سائے، زخمی بچے اور پُراسرار اجنبی قدم بہ قدم پر راستہ کاٹتے ہیں۔ یہاں تنہائیوں کا راج ہے اور اگر سنتے ہیں اگر کوئی رفیق ہے تو یا تنہائی یا خاموشی رہ رہ کر یا دور سے آتی ہوئی کسی انجن کی سیٹی کی آواز۔

مگر اس تبدیلی پر استفہامیہ قائم کیجیے، کب اور کیسے اس کی ابتدا ہوئی تو یہ بات واضح ہوگی کہ ادب میں زمانے اور اقدار رفتہ رفتہ تبدیل ہوتی ہیں۔ پچھلے نو دس برس میں ہمارے اساتذہ کی آواز بھی سنائی دیتی رہی، ان میں وہی مسائل، وہی انداز، وہی شاعرانہ مزاج جھلکتا رہا جس سے وہ جانے پہچانے جاتے تھے۔ پچھلے نو دس برس میں جگر مرادآبادی نے نہایت لطیف غزلیں کہی ہیں یہی نہیں "ساقی سے خطاب" جیسی ایک سے زیادہ نظمیں بھی کہی ہیں جنہیں جگر کا کارنامہ کہا جا سکتا ہے۔ جوش ملیح آبادی کی غزلوں اور رباعیوں کی آن بان میں بھی فرق نہیں آیا۔ بعد کے آنے والوں میں راشد نے "ایران میں اجنبی" شائع کی اور یہ مجموعہ حقیقتاً "ماورا" پر ایک اضافہ ہے۔ فراق کے مجموعے بھی شائع ہوئے "الگ الگ" غزلیں بھی چھپیں اور ان میں فراق کا رنگ سخن اپنے پورے نکھار کے ساتھ سامنے آیا۔ فیض اس عہد کے جادوگر بن کر آئے اور شاعری کی قلمرو میں ان کا سکہ مدت تک چلتا رہا۔ فیض کا اثر نئی نسل نے زیادہ تر ان کی غزلوں کی بنا پر قبول کیا۔ فیض نے مغرب آشنا ذہن اور عہد جدید کے لطیف ارتعاشات کو یک جا کر کے نیا تغزل پیدا کیا۔ اس نئے تغزل میں احساس کی تازگی، اجتماعی شعور کا داخلی روپ اور انداز بیان میں فارسی دروبست اور TRANSFERRED EPITHET کا اور دوسرے مغربی اسالیب کا امتزاج ہے۔

ان کے علاوہ پچھلے دور کے جانے پہچانے شعرا میں سے جنہوں نے اپنی ادبی سرگرمیاں جاری رکھیں اور قابل ذکر نظمیں اور غزلیں لکھیں ان میں اثر لکھنوی، جمیل مظہری، آنند نرائن ملا، احمد ندیم قاسمی، اختر انصاری، حفیظ ہوشیارپوری، شور علیگ، شاد عارفی، روش صدیقی، ساغر نظامی، مجید امجد، مختار صدیقی، سردار جعفری، مخدوم محی الدین، اختر الایمان، جعفر طاہر، جذبی، علی جواد زیدی، ساحر لدھیانوی، جاں نثار اختر، کیفی اعظمی، عدم، وامق جونپوری، قتیل شفائی، مجروح سلطانپوری، پرویز شاہدی، ظہیر کاشمیری، تاباں، مسعود اختر جمال، سلام مچھلی شہری، نشور واحدی،

سلیمان اریب، سید قیصر کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ ان فن کاروں کی کئی کامیاب نظمیں اب بھی کانوں میں گونجتی ہیں لیکن یہاں اس دور کی شاعری کا ذکر اس مقصد سے کرنا مقصود ہے جو نئے فن کاروں نے تخلیق کیا۔ یہ فن کار وہی ہیں جن کے نام ان دس سالوں میں جانے پہچانے گئے۔

ان نئے فن کاروں کے نام لینے یا ان کے شاعرانہ کردار کا تعین کرنے سے پیشتر یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ نئی نسل نے روایت کی اپنے طور پر تراش خراش کی ہے۔ کئی اساتذہ کے دیوان دوبارہ طاقِ نسیاں سے نکالے گئے ہیں اور ان کی شخصیت اور کلام کو نئی معنویت بخشی گئی ہے۔ اپنے دور کے جانے پہچانے شاعروں میں بھی نئے سرے سے اس نے اپنے محبوب فن کاروں کا انتخاب کیا اور ان کے کلام کو نئی ترتیب اور نئی اہمیت سے سنوارا۔

قدمائی 'تجدید' کے سلسلے میں میر کا نام لیا جا سکتا ہے حالانکہ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ میر کا اثر نئی نسل پر اس قدر براہِ راست نہیں ہے جس قدر خیال کیا جاتا ہے۔ ہمارے نوجوان شعرا میر تک مختلف ذرائع سے پہنچے ہیں اور عام طور پر جسے میر کا اثر سمجھا جاتا ہے وہ میر تک پہنچانے والے واسطے یا رابطے کا اثر ہوتا ہے۔ مثلاً میر کی تقلید کا راستہ بہت کچھ اختر الایمان کے ذریعے سے آتا لگتا ہے اور اسے تسامح سے اختر الایمان کی جگہ میر سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ قدما کے سلسلے میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ پرانی بحروں اور قدیم زمینوں میں طبع آزمائی کا بھی چلن ہوا مگر یہ جوش و خروش زیادہ دن تک باقی نہیں رہا اور اس میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔

عہد جدید کے شعرا میں فیض اور فراق نئی نسل کے محبوب شعرا کہے جا سکتے ہیں اور ان دونوں کا اثر نمایاں طور پر نئی شاعری پر ہے۔ فیض سے انداز بیان کی سجاوٹ اور فراق سے لہجے کی کھنک اور سپردگی لیکن فیض اور فراق اس سے پہلے بھی پڑھے اور پسند کیے جاتے تھے مگر جن عناصر کو نئی نسل نے منتخب کیا وہ نئے تھے۔ اس کے علاوہ جمیل مظہری، شور علیگ، شاد عارفی، حفیظ ہوشیار پوری، مجید امجد اور بعض دوسرے شاعروں کو بھی نئی نسل نے اہمیت بخشی لیکن میرے نزدیک نئی شاعری خاموش انداز میں جن دو اسالیب سے سب سے زیادہ متاثر ہوئی ہے وہ اختر الایمان اور سلام مچھلی شہری کے اسالیب ہیں۔ اختر الایمان کی خود کلامی کا انداز، سپردگی اور رفتگی، داخلیت کا گہرا دھیما لب و لہجہ، کھائی ہوئی اور زمانے کے حوادث میں گھرتی ہوئی انفرادیت کا بانکپن ـــــ یہ سب کچھ کسی نہ کسی حد تک نئی نسل نے اختر الایمان سے سیکھا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اختر الایمان نے بڑی ذہانت اور چابکدستی کے ساتھ اپنی شاعری اور شخصیت کو مخصوص لب و لہجے کے باوجود یاس پرست یا داخلیت زدہ نہیں ہونے دیا وہ کلیۃً اعتزال میں کبھی قید نہیں رہا ہے اور اس کی دنیا کبھی صرف رینگتے سایے اور رنج اسرار پرچھائیوں میں کھو کر نہیں رہ گئی ـــ!

اختر الایمان نے اس دور میں کئی کامیاب نظمیں لکھیں جن میں "ترک وفا" "قافلہ" "آگہی" "میرا نام" "آخری ملاقات" "ایک لڑکا" "ایک نظم" اور اس کے علاوہ وہ مختصر نظم "اعتماد" یہ سب نظمیں قابل ذکر ہیں۔ ان نظموں میں تنہائی اور انفرادیت ہے یہ ایک ایسے انسان کی ہیں جو ہجوم یا اس سے بڑے کسی صنعتی شہر کی شاہراہ پر ایک کنارے کھڑا سوچ رہا ہے کہ اس ساری افراتفری میں انسان کی انسانیت اور اس کا نشاطِ روح کہاں گم ہو گیا ہے۔ نئی شاعری نے اختر الایمان سے تنہائی اور انفرادیت قبول کی ہے مگر اس کی سوچ بچار کی وسعتیں پوری طرح نہیں لی ہیں ـــ

سلام مچھلی شہری کی کامیاب ترین نظمیں اس دور سے پہلے کی ہیں۔ سلام نے مکالموں، خطوں اور بکھرے ہوئے تاثر پاروں کی شکل میں اپنی نظموں میں بہت سے نئے تجربے کیے ہیں۔ ڈرامائی تاثر پاروں کی تکنیک، گرد و پیش کے واقعات کو نظم کرنے اور ان کی مدد سے خیال

تک پہنچنے کا انداز افسانوی طرز کو اختیار کر کے ان کی خارجیت سے نظم کے فنیاتی تاثر کو برآمد کرنے کی کوشش، محبوب سے براہِ راست تخاطب اور بے تکلفانہ بے باکانہ انداز سے گفتگو، یہ سب کوششیں اور تجربے اس عہد کے نئے شعری رجحانات تھے۔ اسی طرح ان نظموں میں صنعتی بُت تراشی، رقص اور مغربی تہذیب کی بے باک چاہتوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش بھی ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ ان تجربوں کا نئے شاعروں پر گہرا اثر پڑا ہے۔

پس منظر کے اس مختصر سے جائزے کے بعد نئے شعری مزاج کا تعین کرنا مقصود ہے۔ اس کا اندازہ کرنے کے لیے پہلے اس دور کے ۱۰۰ اہم شعراء کی مشہور اور محبوب نظموں کے عنوان قابلِ توجہ ہیں۔ یہ عنوانات جان بوجھ کر منتخب نہیں کیے گئے ہیں، ان کی فہرست اردو رسالوں کے فائلوں سے بنائی گئی ہے اور یہ فہرست عنوان کی بنا پر نہیں بلکہ نظموں کی ادبی اہمیت کے پیشِ نظر ترتیب دی گئی ہے۔

پُل صراط۔ رقصِ ناتمام۔ شہر بدر۔ زخمی دستک۔ آخرِ شب۔ ایک رات۔ دوسری محبت۔ اجنبی۔ خوں ناب۔ میرا خون میری زندگی۔ نیا ہیروشیما۔ بزدل۔ آسیب۔ بہروپ۔ دریچہ۔ ایک دن۔ عزا۔ غم کدے میں اجنبی۔ نوحہ۔ نقشِ ماہ۔ سوچنے کی بات۔ مطلعِ حیات۔ گہرے دھندلکے کی بات۔ صبا کا ایک جھونکا۔ یہ باتیں جھوٹی باتیں ہیں۔ ذرے کی موت۔ جسم جنم کی پیاس۔ گنہگار فرشتے۔ سمندر اور انسان۔ پرتو۔ جب شعلے بجھ گئے۔ دوسرا قدم۔ سہاگ رات۔ خلوت کا چراغ۔ خراب آباد۔ سورج مکھی کا پھول۔ پہلے چاند کی رات۔ سوداگر۔ چاندنی کے شہر میں۔ حیات و موت۔ رسم و رواج۔ نئی تنہائی کے نام۔ درد کے تپتے غم کے بہانے۔ پیچھے ہٹیے۔ خلاؤں سے اترو۔

ان کا مقابلہ ۱۹۴۹ء کے 'شاہراہ' کی شعری تخلیقات کے عنوانوں سے کیجئے: "موتیوں کے پانی میں" "زنجیر" "شبنم" "سنگِ سرخ" "اے دوست ابھی آرام نہ کر" "فرد بیدہ نقادو" "سرگزشت" "سلاخوں کے پیچھے" "پہرہ" "جرس کارواں" "غزل اس نے چھیڑی" — "نیا پرچم" "سہارے" "دوسری دیوارِ چین" "روشنی تیز کرو" "ذرہ و قطرہ" "عظمت" "آزادی سے پہلے آزادی کے بعد" "مشعل" وغیرہ۔

اس موازنے سے اندازہ ہوگا کہ ہماری شاعری کا مزاج زیادہ نرم، زیادہ مبہم اور پُراسرار ہو گیا ہے۔ اسے رنگینی اور دھندلکے سے زیادہ قربت حاصل ہو گئی ہے اور اس کے راستے نیم تاریک نیم روشن ہیں جن پر گزرنے والے کم ہیں۔ تنہائی اور افسردگی چھائی ہوئی ہے اور کبھی کبھی بے نام اور ان دیکھے اجنبیوں کی پرچھائیاں یہاں لہرا جاتی ہیں جو کبھی رنگین ہوتی ہیں کبھی بھیانک۔

نئے شاعر اور مزاج کی نمائندگی ابنِ انشا اور ناصر کاظمی کرتے ہیں۔ کچھ دور آگے آنے کے بعد شاذ تمکنت کا نام بھی آتا ہے۔ ظفر کاظمی نے غزل کی "تجدید" کی۔ ناصر کی غزلیں سپردگی، ربودگی، داخلیت، کھوئے کھوئے سے انداز، خود فراموشی اور نیم خوابی کے عالم کی عکاسی ہیں۔ یہ لہجہ کا لب و لہجہ کلاسیکی غزل سے نکھر کر اور بدل ہو گیا ہے مگر ناصر کی غزلوں کی خصوصیت تنہائی اور خود فراموشی کے احساس ہی سے پیدا ہوئی ہے۔ یہ خود فراموشی محض نجی اور ذاتی نہیں ہے بلکہ اس احساس نے قدرتی مناظر، آسمان کے چاند، زمین کے اونچے اونچے پیڑوں اور آباد شہروں کو بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا ہے۔ یہ عالمِ تنہائی، درد کی ایک باریک سی چھوٹ اور رنگین چاندنی —— یہی ناصر کی دنیا ہے۔ ناصر اپنی دنیا کا قیدی نہیں اس کا فرمانروا بھی ہے مگر ایک ایسا فرمانروا جو مطلق العنان ہے نہ مکمل طور پر خود مختار بلکہ اس کی آواز اس کی دنیا کی ایک ایک چیز ایک ایک پھول سے چھن کر آتی ہے۔ اس کی آرزوئیں بڑی چھوٹی سی ہیں۔ دوستوں کی محفلیں، قہقہے، دیا بدنگ سو بیں راتیں، ہم سفروں کے ساتھ گزارے لمحات، خلوص اور پیار کے رد و بدل —— مگر غور کیجئے تو اجتماعی زندگی کو سنوارنے کے منصوبے، انسان کو چاند تک لے جانے اور ستاروں پر کمند ڈالنے کے حوصلے سبھی انہی چند چھوٹے چھوٹے خوابوں کی تعبیریں ہیں کہ انسان، ہر ملک ہر زمانے کا انسان خوش رہنا چاہتا ہے ہنسنا کھیلنا چاہتا ہے۔

ناصر کی دنیا چھوٹی ہے۔ ذات میں کائنات کی سی پہنائی پیدا کرنا آسان ہے بھی نہیں۔ یہ اقبال جیسے دو چار گنے چنے فنکاروں ہی کا حصّہ ہے اور ادب کی قلمرو میں ہر شاعر سے دیرقامت ہونے کا تقاضا کرنا بھی مناسب نہیں لیکن ناصر کے ہاں صرف تشبیہہ و استعارہ کی تازگی اور SENSE IMAGES تاثراتی تصویروں کا نیا پن ہی نہیں ہے خلوص کی مہک اور تجربے کی روشنی بھی ہے۔ یہ محض تقلید نہیں ہے تخلیق بھی ہے گو اس کا دائرہ محدود ہے اور اس کی دنیا برگِ گل کی طرح مختصر ہے چند اشعار سے اس کا اندازہ ہوگا ؎

چھپ جاتی ہیں آئینہ دکھا کر تری یادیں   سونے نہیں دیتیں مجھے شب بھر تری یادیں

بن چلی تو گل و برگ دف بجانے لگے   اُداس خوشبو میں بھورے اٹھیں نقابوں میں

شام سے سوچ رہا ہوں ناصر   چاند کس شہر میں اُترا ہوگا

دف بجائیں گے برگ و شجر صف بہ صف   خشک مٹی سے پھوٹے گا قُم صبر کر صبر کر

زندگی اس کے تصور میں کٹی   دور رہ کر بھی وہی کام آیا

ان اشعار میں اندازِ بیان کا نیا کس بل ہے مگر ان میں تنہائی اور تابناک داخلیت کا احساس ہوتا ہے۔ ناصر کی شاعری کی فضا گھٹی گھٹی اور تنگ نہیں ہے۔ یہاں نیچی چھتوں اور دم گھونٹ دینے والے در و دیوار نہیں ہیں ہاں ایک رنگا رنگی ہے جو افق تا افق چھائی ہوئی ہے۔ ابنِ انشا نے اس رنگا رنگی کی سرحدیں اور آگے تک روشن کی ہیں۔ میرے نزدیک ابنِ انشا بنیادی طور پر نظم گو شاعر ہیں ان کے ہاں تسلسل اور ربط، فضا کا احساس، تشکیل و تعمیر کا شعور ملتا ہے۔ ابنِ انشا ایک خاص انداز سے اپنے دور کے بعض اہم حقائق کو داخلی انداز اور اپنے نیم رومانی بلکہ بقول خود ان کے "الف لیلوی" اور "نیم نوحینی" روپ میں ڈھال لینے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ "چاند نگر" ۵۵ء میں چھپی اور اس کے چھپتے ہی ادبی دنیا چونک اٹھی۔ ایک نیا، خوشگوار، تازہ لب و لہجہ "چاند نگر" میں سنائی دیا، شعری زبان کو ایک نئی سمت DIMENSION ایک نئی شخصیت ملی جس کا اندازہ "پچھلے پہر کے سناٹے میں" کے ایک بند سے ہوگا :-

ماضی کی ڈیوڑھی کی چلمن
کھلے دریچے کی جالی سے
چھن چھن آئیں
روپ کی جوت صفا کی لالی گل کی یادیں
سوندھی خوشبو ٹھنڈی بوندیں
گل کے باسی آنسو جن سے
فردا کی بالیں کا فردا بھیگ رہا ہے

دو اور متفرق اشعار دیکھئے ؎

اُداس رات کے آنگن میں رات کی رانی
مہک رہی ہے دلِ بے قرار، بات نہ مان

بستی قریے گھوم چکے اب دشت کو چلیں، بن کو چلیں
شام ہوئی آوارہ خیالو! آؤ اب اپنے وطن کو چلیں

" افتاد " اور " بغداد کی ایک رات " اس سلسلے میں پیش کی جا سکتی ہیں۔ ۱۹۵۵ء میں " چاند نگر " پر ریویو کرتے ہوئے میں نے ابنِ انشا کی شاعری کے دو میلانات کا تجزیہ کیا تھا۔ ایک چاند راتوں میں بھٹکتا پھرنے والا نوجوان ہے جس کا پتہ شہر کے سناٹے والوں سے پوچھا جاتا ہے اور جس میں رومانی عنصر غالب ہے اس میں بھی مزاجاً بانکپن ہے۔ یہ سرمستی اور سرشاری بھی گل نیا کھلاتی ہے۔ یہ مناظر آنکھوں کے سامنے ملتی ہے جیسے اچانک خیال کا پردہ کھینچ کر کوئی وسیع میدانوں اور شاداب نخلستانوں کو ہمارے سامنے لا رکھتا ہے جہاں قافلے گرمِ سفر ہیں، جہاں حدی کی آواز ہے، زنگِ کارواں کی صدا ہے اور قبائلی زندگی کی ساری معصومیت اپنے اولین شباب کے الھڑپن میں مخمور ہے لیکن ابنِ انشا کا اصلی روپ " افتاد " اور " بغداد کی ایک رات " کے مصنف کا ہے جو اپنی داخلیت اور تیکھے انداز بیان کے دامن میں تاریخ اور عصرِ حاضر کی فضا میں کھینچ کر ان کے سر پر شعری حقیقت کا تاج رکھ دیتا ہے۔ وہ پلک جھپکائے اور تیوری پر بل ڈالے بغیر عہدِ نو کے مسائل اپنی ذات میں سمو لینے کی قدرت رکھتا ہے۔ ابنِ انشا غالباً نئے شاعروں میں اکیلا شاعر ہے جو اپنی داخلیت کو وسعت دے کر اس میں ذات و کائنات کو سمونے کا عمل کامیابی سے انجام دے سکا ہے جس کے اندازِ بیان کی لطافت اور شعریت فکر سے ٹکرا کر پاش پاش نہیں ہوتی۔

اسی لیے ابنِ انشا کو میں نے مستقبل کا شاعر کہا تھا جس کی آواز میں وہ کس بل موجود ہے جو عموماً بڑی شخصیتوں میں ہوا کرتا ہے مگر ۱۹۵۵ء کے بعد ابنِ انشا کی اکثر نظموں میں ان کا پہلا روپ زیادہ ابھرتا رہا ہے اور دوسرے انداز کی نظمیں اور غزلیں بہت کم ہیں یا نہ ہونے کے برابر ہیں۔ " صبا کا ایک جھونکا " " ایک اور ہزیمت " " یہ باتیں جھوٹی باتیں ہیں " " انشا کو مزاج مبارک کرو دونوں " " یہ سب کی سب کامیاب اور دوامی دل کھینچنے والی نظمیں ہیں مگر ابنِ انشا کی کمند ستاروں ہی پر کیوں پڑے خورشید پر کیوں نہ پڑے " انداز بیان کی اس تازگی اور احساس کی اس پہنائی کے بعد ابنِ انشا سے اس سے زیادہ بلند تقاضے کیے جائیں تو کچھ عجب نہیں۔

شاذ تمکنت کا فن ان دونوں سے قدرے جداگانہ ہے۔ شاذ نے نئے طرز کے الفاظ VOCABULARY اور ملی گداختگی اور قدرت سے ہم آہنگی لی ہے۔ اختر الایمان کی تنہائی اور خود کلامی سے اپنے خلوت کے چراغ کو روشن کیا ہے اور اس میں اپنی شخصیت کا کس بل شامل کیا ہے۔ " آب و گل " اور " رقصِ ناتمام " میں اختر الایمان کا اثر نمایاں ہے۔ اسی طرح " آخرِ شب " میں سلام کا اثر نمایاں ہے۔ اس کے باوجود شاذ کا اپنا لب و لہجہ بننے لگا ہے۔ اس لب و لہجے میں شخصیت کا گداز اور شعریت LYRIASM دونوں موجود ہیں۔ شاذ اُداسی اور افسردگی، سپردگی اور خود فراموشی کے شاعر ہیں مگر یہ خود فراموشی گریز کا نتیجہ نہیں بلکہ احساس کی شدت اور تجربے کی گہرائی کا نتیجہ ہے۔ شاذ کی نظموں میں تازگی اور شگفتگی ہے مثلاً " اے بادِ خزاں کے زرد جھونکو " یا " رت جگا " یا " پاکیٔ داماں کی حکایت " جیسی نظمیں گو مضمون کے اعتبار سے پامال ہیں مگر احساس کی ندرت اور اندازِ بیان کے اچھوتے پن نے ان میں جان ڈال دی ہے۔ یہ بند ملاحظہ کیجئے :-

اے بادِ خزاں کے نرم جھونکو
جب زلف سکھی میں سنسناؤ
افشاں کے ملیں گے تم کو جگنو
وہ مانگ کہ ہے شفق کا قیصہ
راس مانگ کے دیپ سے یہ کہنا
تم پِی کی خفائی راگنی ہو
میں صبح کا تارا بن گیا ہوں
آنکھوں میں تمہاری دید کی پیاس
کس درد سے لے کر ڈوبتا ہوں

"آخرِ شب" کا ایک تاثر ــــ

بچھتے ملبے پہ سناٹے کے قدموں کے نشاں
بھیگی راتوں میں چپ چاپ ابھر دیتے تھے
پاس ہی سوئے ہوئے کتبوں کے کاواک حروف
اپنے کھوئے ہوئے نقاش کو دیتے ہیں صدا
چاندنی خستہ و درماندہ کھڑی ہے خاموش

گو شاذ تمکنت کے ہاں ابھی ناہمواری اور کچے پن کا احساس ہوتا ہے مگر اندازِ بیان کی تازگی اور ندرت کی بنا پر ان سے امید قائم کرنا غلط نہ ہوگا۔

شاذ تمکنت کے ساتھ ہی باقر مہدی، خلیل الرحمٰن اعظمی، وحید اختر، سوہن تحسین اور حمایت علی شاعر کے نام بھی آتے ہیں۔ خلیل الرحمٰن اعظمی اور جمیل الدین عالی پر (جو زیادہ تر دوہے لکھتے ہیں مگر جب غزل لکھتے ہیں تو اس میں بھی بانکپن اور شعریت کا التزام رکھتے ہیں) داخلیت کا گہرا اثر ہے۔ اعظمی نے اس زمانے میں "نیا جنم"، "سہاگ رات"، "خراب آباد"، "واپسی"، "خلوت کا چراغ" اور "سورج مکھی کا پھول" کئی نظمیں لکھیں ان کے علاوہ ان کی غزلوں میں بھی ہندی روزمرہ کا سوندھا پن، تنہائی، خود کلامی، افسردگی اور خود فراموشی ملتی ہے۔ افسردگی کا یہ احساس خلیل اعظمی نے رچا بسا کر پیش کیا ہے اس میں پچھلی رات کا پُراسرار سناٹا، گلیوں کی اُداسی اور گھر کے آنگن کی خاموش آرزومندی کی فضا ملتی ہے۔ خلیل کی غزلیں نظموں کے مقابلے میں زیادہ کامیاب ہیں مگر ان میں احساس کی تازگی اور اظہارِ بیان کی لطافت موجود ہے۔ لہجے کی یہ کسک اور رنگینی تمام خلیل کے فضا کی شعریت تشبیہوں کی ندرت اور احساس کی تازگی کے اعتبار سے خلیل کی غزلیں اور نظمیں ایک نئے آہنگ کی غماز ہیں ان میں خلیل کی شخصیت کا سوز اور AUTOBIOGRAPHICAL لب و لہجہ ملتا ہے: "آدمیوں کے میلے میں" اس اعتبار سے سب سے نمائندہ نظم ہے۔

باقر مہدی کی شاعری کا لب و لہجہ بہت نمایاں طور پر سوانحی AUTOBIOGRAPHICAL ہے اور اس لیے اس میں تقلید اور روایت پرستی کا انداز کم ہے اور حقیقی تجربے اور خلوص کا عنصر زیادہ ہے مگر اس تشنگیٔ سرگزشت سے آگے بڑھ کر باقر کی ان نظموں پر بھی نظر کرنی

چاہیے جن میں فکری آہنگ نمایاں ہے "شعور" میں یہ کوشش واضح طور پر ملتی ہے۔ باقرؔ کی شاعری نقلی جوہر MAKE BELIEVE سے خالی اور اپنے اوپر افسردگی طاری کرنے کی کوشش ہے۔ باقرؔ کا عشق اور اس کے مسائل بھی ارضی اور حقیقی ہیں۔ ان کی شاعری میں سپردگی کی جگہ پر مقاومت اور تشبیہ کی جگہ پر براہ راست تاثر اور تجربے پر اعتماد کا انداز ملتا ہے۔ کسی فیوژن یا آرائش کے بغیر جذبے کا بے کم و کاست بیان باقرؔ کی خصوصیت ہے۔

اس منزل پر اس کی صراحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ نئے شاعروں میں تین واضح میلانات نظر آتے ہیں۔ ایک میلان وہ ہے جس کے ضمن میں ناصر کاظمی، شاذ تمکنت، خلیل الرحمٰن اعظمی کا تذکرہ کیا گیا۔ اس پر داخلیت کا گہرا اثر ہے۔ سپردگی اور بے رنگی بھی نمایاں ہے اور ان کا دائرہ مضافات کے ارد گرد رہتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ دوسرا میلان وہ ہے جس نے نیا اسلوب اور DICTION تراش لیا ہے گو اس ڈکشن میں عصری مسائل سموئے ہیں اور اپنی شاعری کو آفاقی وسعتیں دینے کی کوشش کی ہے۔ اس میں ابن انشا اور بعض دوسرے شعراء کا ذکر ہو سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ لوگ بھی ہیں جن کا ڈکشن DICTION لب و لہجہ تو اس قدر چونکا دینے والا نہیں ہے مگر مختلف انداز سے وہ عصری مسائل اور فکری آہنگ کو شاعری میں جگہ دیتے رہے ہیں۔ ان میں احمد ریاض مرحوم، باقر مہدی، معصوم رضا راہیؔ، حمایت علی شاعر، شفیق فاطمہ شعریٰ، فارغ بخاری، محسن سروش، عبدالرؤف عروجؔ، مصطفےٰ زیدی، شہاب جعفری اور عمیق حنفی کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ تیسرا میلان غزل کے روایتی مزاج کی نئی رعایت کے ساتھ تجدید کا ہے جس کی رہنمائی شان الحق حقی، زہرہ نگاہ اور بعض دوسرے شعراء نے کی۔

پہلے میلان کے سلسلے میں عزیز قیسی کا ذکر بھی ضروری ہے جس کی نظموں میں مٹھاس، رنگینی اور سرمستی کا احساس ملتا ہے ان کی نظموں میں سنگھار اور آراستگی موجود ہے۔ "پورے چاند کی رات" اس طرح شروع ہوتی ہے:-

حنا بدست کسی خام سر سنگھار کیے | حسین ہاتھوں میں مہتاب کا چراغ لیے
بدن چرائے خود اپنی حیا کے بوجھ سے خم | بچائے اپنے ہی شانوں سے گیسوئے برہم
چھلکتی چھاؤں میں ٹھنڈک لیے ہواؤں کی | نگاہِ ناز میں تاثیر سو دعاؤں کی
اتر رہی ہے شبِ ماہ نرم زینوں سے | قدم بچا کے ستاروں کے آبگینوں سے

عزیز قیسی بھی ان شاعروں میں شامل ہیں جن کی شاعری میں گو لب و لہجہ اور صفات کی آواز گونجتی ہے مگر ان کے استعاروں اور تشبیہوں میں اپنا ایک منفرد حسن ہے۔ "وہ نہیں بچھڑتا" غالباً اس لحاظ سے ان کی نمائندہ نظم کہی جا سکتی ہے۔

دوسرے میلان کے سلسلے میں ابن انشا اور باقرؔ کے علاوہ احمد ریاض، عمیق حنفی، راہیؔ، شفیق فاطمہ شعریٰ، وحید اختر، حمایت علی شاعر، عبدالرؤف عروجؔ، فارغ بخاری، محسن سروش، شہاب جعفری اور بعض دوسرے شعراء کا نام آتا ہے ان میں احمد ریاض، راہیؔ اور حمایت علی شاعر ایک واضح نقطۂ نظر رکھتے ہیں ان کی شاعری میں شکست، اضمحلال اور مایوسی کی جگہ یقین کی روشنی ملتی ہے یہ اور بات ہے کہ ہر جگہ یہ روشنی اسی قدر تابناک شاعری میں نہیں ڈھل سکی ہے۔ احمد ریاض ان میں سب سے زیادہ کامیاب تھے۔ احمد ریاض نے فکر کی پختگی کو احساس کی شادابی کی شکل دے دی تھی اور خلوص کی آنچ میں تپا کر اور الفاظ پر قدرت حاصل کر کے اپنے عقیدے کو فن کے درجے تک لے آئے تھے۔ ان کی نظمیں "راستے منزلیں" اور "خلاؤں سے آگے" اور ان کی کئی اور غزلیں ان کی شاعری کے کس بل کا ثبوت ہیں۔

راہیؔ کے کلام میں یقین اور عقیدے کے باوجود اس دور میں بھی لب و لہجہ اور اپنی ذات سے قربت کا احساس پیدا ہوتا ہے اور

دوسرے شاعروں کی طرح AUTOBIOGRAPHICAL سا انداز پیدا ہوا ہے۔ ساحر نے جوش، زمین اور زندگی سے پیار اور تخیل کی پالنی کے ذریعے اپنی شاعری میں تابندگی قائم رکھی ہے جس کا شاید سب سے اچھا نمونہ "یقین کا چراغ" میں ملتا ہے۔ اس قدر روشن اور رواں نظمیں اس دور میں خاصی کمیاب ہیں۔

پیالہ زہر میں بھی امرت بھرا ہے وارث کی چشم نم نے — چناب کی لہروں پہ جلایا ہے پیار کا اک چراغ ہم نے
کیا ہے جاوید بیتے کو ہماری ہی جنبش قلم نے — ہمیں سے نغموں کا رس مانگا سسی کی مثل کے تیرہ بم نے

یہ وحشتِ آہوانِ صحرا کئی فسانے سُنا رہی ہے !
صبا ابھی نجد کے بیاباں سے کتنے پیغام لا رہی ہے

ہمیں نے ہر موڑ پہ بتایا کہ رات کے اس طرف سحر ہے — ہمیں بتاتے رہے آج بھی یہ اصل کہاں زندگی کدھر ہے
تمہارے زنداں بھی کیا کریں گے صبا ہماری پیامبر ہے — تمہاری شمشیر تیز ہوگی ہماری آواز تیز تر ہے

ہزار کچلے گئے ہیں لیکن شاب سبزہ لٹک رہے ہیں
خزاں کے دل میں بہار کے کنکر کی طرح ہم کھٹک رہے ہیں

حمایت علی شاعر نے اس دور میں کئی کامیاب نظمیں لکھیں۔ ان میں جوش کم اور دردمندی اور تفکر زیادہ نمایاں ہے۔ "گوریا سے بنگال تک" طویل نظم یقیناً ان کا کارنامہ ہے، ان میں زندگی کا خارجی روپ زیادہ ہے اور ذاتی عنصر کم۔ حمایت علی شاعر نے اپنے احساس و ادراک کو محدود نہیں کیا ہے اور شخصی تاثر پر قناعت نہ کر کے بین الاقوامی سیاسیات کے پس منظر میں اپنے تخلیقی نقش و نگار بنائے ہیں لیکن حمایت علی شاعر اس سیاسی اور خارجی شعور کو مہذب کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں اور ان کا لب و لہجہ خطیبانہ ہونے سے بچ گیا ہے۔

اس میلان کے باقی نمائندوں میں ایک لحاظ سے سب سے اہم نام مصطفےٰ زیدی کا ہے اور دوسرے لحاظ سے شفیق فاطمہ شعریٰ کا۔ مصطفےٰ زیدی تیغ کے نام سے ہمارے جانے پہچانے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں زیادہ توازن اور ٹھہراؤ پیدا ہو گیا ہے، ان کے مصرعے زیادہ سجل اور ڈھلے ہوئے ہونے لگے ہیں اور ان کے احساس کے دائرے وسیع تر ہوئے ہیں۔ مصطفےٰ زیدی نقیب یا مبلغ نہیں ہیں لیکن اپنے بیانیہ انداز میں بھی وہ سوچ کے چند پہلو چھوڑ جاتے ہیں جو ذہنوں کے لیے نقشِ قدم کا کام دیتے ہیں۔

شفیق فاطمہ شعریٰ کا نام ابھی چند سال ہی سے سامنے آیا ہے مگر نئے لکھنے والوں میں فکر کے نئے پہلو پیش کرنے اور انداز بیان میں مختلف تجربے کرنے میں وہ بہت سے شعراء سے آگے ہیں۔ شفیق فاطمہ شعریٰ عام طور پر آزاد نظم نہیں لکھتیں مگر ان کی پابند نظموں میں روایتی پابندیاں بہت کم ملتی ہیں۔ جو چیز شعریٰ کی شاعری کو جاندار بناتی ہے وہ ان کی ندرت احساس ہے۔ وہ جہان سے سرسری نہیں گزرتیں بلکہ معمولی سے معمولی منظر میں حقائق کی کوئی رمز دیکھ لیتی ہیں۔ شعریٰ کے لیے زندگی نہ سیاہ ورق ہے نہ رنگین بھالی راہوں پر آسان سفر ہے بلکہ تجربوں، سوالوں اور احساسات سے لبریز ایک ایسی یاترا ہے جس کا ہر قدم نیرنگیوں سے لبریز ہے۔ شعریٰ کا تفکر خیال انگیز ہے، وہ فارمولے اور آسان حل لے کر نہیں آئی ہیں صرف احساسات کی شدت اور ادراک کی بصیرت کے ساتھ ان تجربوں سے حقائق کی جھلکیوں تک پہنچنے کا سلیقہ لے کر آئی ہیں اور یہ بڑی بات ہے کہ یہ سلیقہ شاعرانہ ہے۔ "ایلورا" اور "ایک ایسی صبح" میں یہ استفہامیے بڑی فن کاری کے ساتھ قائم کیے گئے ہیں۔ "بازار" ایک لطیف طنز ہے اس کے دو بند ملاحظہ کیجئے:۔

دشت میں حسن ہے جنگلے بھی ہری ہری ہے
اور بستی میں وہ سناٹا کہ سانس کا دم گھٹتا ہے
رہ گزاروں پہ ہیں جلتی ہوئی لاشوں کے ہجوم
زندگانی کی سزا ضعف ہے بے بصری ہے
تمیں بارود کی بو سے فضا ہے مسموم
انتہا ظلم کی چنگیزی و تیموری ہے
عشق ہے تاب و تواں سے محروم
اور جوانی کا صلہ یاس ہے مجبوری ہے
فکر پر قید ہے
حرفِ حق کہنے میں رسوائی کا اندیشہ ہے
آبرو صید ہے
زندگانی کی فغاں تیز و شرر پیشہ ہے
ہر طرف ظالم و مظلوم ہی ہیں حاکم و محکوم ہی ہیں
کس سے پوچھیں کہ ہے انسان کہاں
کس سے پوچھیں کہ ہے کیوں آج بھی زندان کہاں

اس سے آگے کا آخری بند ہے :-

میرے شیشے میں بھی خونیں آنسو
حوصلوں آرزوؤں اور امنگوں کا لہو
اپنی محفل کو بتاتے ہوئے شرم آتی ہے
یہ ندامت مجھے آبادی سے
دور ویرانوں میں لے آتی ہے
جہاں غاروں میں درندے چلتے ہیں
جہاں فطرت کے لکڑ زاروں میں نغماتِ حسیں ڈھلتے ہیں

"جب بھی سحر آئی" کا ایک بند دیکھئے :-

جب بھی سحر آئی یہاں
بادۂ گل گوں کا نشہ
ابر کے پیکر میں رچا

چشمۂ مسیحی میں بہا
موج کے ساغر میں ڈھلا
آتشِ گلزار بنا، غنچۂ احمر میں بچا

(شہریؔ)

عمیق حنفی خیال اور عقیدے کے اعتبار سے واضح نظریات کے آدمی ہیں مگر ان کی شاعری کا بانکپن ان کی شاعری کی ہندوستانیت میں مضمر ہے انھوں نے ہندی کے رواں الفاظ اور ہندو صنمیات کی اصطلاحوں اور تلمیحوں سے اُردو شاعری کو نیا لب و لہجہ بخشا ہے۔ عمیق کی شخصیت پھیلنا اور وسیع تر ہونا چاہتی ہے۔ ان کا احساس رچا بسا ہوا ہے اور تازہ بستیوں اور نئی بلندیوں کی کھوج میں رہتا ہے۔ عمیق کی شاعری میں ذات سے زیادہ کائنات کا آہنگ سنائی دیتا ہے۔

"آج کل" دہلی میں، گذشتہ دنوں کے شمارے میں عمیق حنفی کی ایک غزل شائع ہوئی ہے، اس پر جو نوٹ مصنف نے دیا ہے وہ قابلِ توجہ ہے:-

"غزل شاعری کے علاوہ موسیقی کی صنف بھی قرار دی جاتی ہے زیرِ نظر غزل میں جوگیا کی کیفیات اور تغزل میں خالص ہندوستانی فضا پیدا کرنے کی ایک کوشش کی گئی ہے۔ ہندی شاعری میں گیت دو طرح کے ہوتے ہیں — (۱) خالص ادبی، اور (۲) غنائیہ یعنی جنھیں گایا جا سکے۔ اگر غزل کی ایسی ہی دو قسمیں کر دی جائیں تو یہ زیرِ نظر غزل قسمِ دوم میں شمار ہوگی:"

یاد آتے ہی تن من میں ہوک اٹھتی ہے پیا — جیسے سارنگی پہ کوئی چھیڑتا ہو جوگیا
اب سنا آنگن میں کوئی شکوہ ہے نہ جھگڑا برہن! — اے گھنی زلفوں کی ٹھنڈی چھاؤں تو نے کیا کیا
پھول رُت میں اپنے جیوں کے گریباں چاک ہیں — پھول کا دامن سیا بھی تو کسی نے کیا سیا
بیل منڈوے سے لپٹ جاتی ہے جس انداز سے — یوں کسی کی یاد نے دل کو مرے لپٹا لیا

چھیڑ دے کوئی کہانی، گیت گا، چپ توڑ دے
ٹکڑے ٹکڑے ہو نہ جائے درد سے اُبلا جیا

عمیق حنفی

وحید اختر کی شاعری بھی اضمحلال اور شکست خوردگی سے دامن بچانے میں کامیاب ہوتی ہے مگر ان کے ہاں ذاتی اور رنجی لب و لہجہ نمایاں ہے۔ وحید اختر کے ہاں جرأتِ فکر ہے اور ان کی نظمیں عام طور پر فکر کا کوئی زاویہ چھوڑ جاتی ہیں۔ وحید اختر فکر کے اس استفہامیہ میں اپنی تنہائی اور انفرادیت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ ان کے ہاں پہلے میلان کے شاعروں کی طرح بیان کی آراستگی اور سجاوٹ نہیں ہے مگر براہِ راست بات کہنے کا تیکھا انداز اور شخصیت کا جیتا جاگتا اظہار ملتا ہے۔ "حیاتِ وقت" "شب تاب" "وہم و داع" "اپنی تنہائی کے نام" اور غالباً ان میں سب سے زیادہ "واپسی" ان کے فن کی نمائندگی کرتی ہے۔

وحید اختر کی "واپسی" کے دو شعر —

پھیلا گیا زیست کی گلی سے بھی سیاہ
جینا ہے تو ماتم کر تو دم بھینے نہ پائیں
دامن نہ چھٹتا تھا وقت کا اک آن
زلفیں بکھرے گل کو نہ اٹھائیں گی بہاریں

خاطر بخاری، منیبن سہوکش اور عبدالرؤف عروج کی تخلیقات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان شعراء کے قدم داخلیت اور دروں بینی کے اس طوفان میں بھی مضبوطی کے ساتھ جمے ہیں۔ خاطر بخاری کی نظم "سناٹے" حسین تر روش کی آہٹ ہے۔ عبدالرؤف عروج کی مجبوریاں اور بصیرتیں — تفکر کی بھی لہریں بسے ہوئے ہیں۔ شہاب جعفری نے اس دور میں کئی اچھی نظمیں لکھیں۔ شہاب کی انفرادیت علامتوں SYMBOLISM اور خودکلامی کی طرف راغب ہوئی مگر اس خودکلامی میں شکست خوردگی کا احساس نہیں ہے بلکہ یہ احساس پوشیدہ ہے کہ اس عمل میں سرگرم اور تشنج اور کاروباری پن سے اٹھل دنیا نے ہر انسان کو دو حصوں میں بانٹ دیا ہے اور اس کے نشاطیہ پہلو کو اس کے انسانی روپ کو مفلوج کر دیا ہے۔ "فرصت چند نفس" کے یہ تین مصرعے خاصے اہم ہیں ——

"کہ اس جہاں میں جینے دن ہے
ہمیشہ سورج ہی اپنے سر پہ کھڑا ہوا ہے
یہ کائنات اک شکستہ گاڑی ہے ایک پہیئے پہ چل رہی ہے"

اس کے علاوہ "زندگی کی پرت"، "گونگا فرشتہ" اور "جسم جنم کی پیاس" میں بھی شاعر کی روح کا تجسس اور اس کی شاعری کے بنیادی تفکر کا سراغ ملتا ہے۔

تیسرے میلان کی نمائندگی خالص غزل گو شعراء کرتے ہیں ان میں غالباً جس قدر نمایاں طور پر شان الحق حقی اور بعد کو زہرہ نگاہ کو اس مدت میں شہرت حاصل ہوئی ہے اتنی دوسروں کو نہیں ہوئی۔ شان الحق حقی روایت پرست نہیں لیکن ان کے لب و لہجے میں روایت کی گونج ہے۔ زہرہ نگاہ نے غزل میں تاب متانت اور یاس میں آس کی شان سے غزل میں ایک نیا مزاج پیدا کیا ہے۔ ان میں فکر کی گہرائی کی تلاش بیکار ہے مگر غزل کے مزاج سے مطابقت اور اس کے اسالیب و آداب کو نباہنا انھوں نے ضرور سیکھا ہے۔ شان الحق حقی اور زہرہ نگاہ کی غزلیں کیا غزلیں ہیں ان میں نئے احساس کی گونج بھی ہے اور پرانے آداب کی جھنکار بھی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ غزل کی تجدید کے تذکرے کے باوجود اور بہت سی غزلیں لکھے جانے کے باوجود اردو غزل کی روایت میں اس دور نے کچھ بہت قابل لحاظ اضافہ نہیں کیا ہے۔

اس خاکے کو سامنے رکھا جائے تو نئے شعری مزاج کی چند خصوصیات نمایاں ہونے لگتی ہیں جن میں غالباً سب سے زیادہ اہم رجحان ذات کی طرف واپسی کا ہے جو کچھ شعرا کے ہاں داخلیت اور دروں بینی کی شکل میں ظاہر ہوا اور کچھ کے ہاں نجی لب و لہجے کی شکل میں —— AUTOBIOGRAPHICAL لب و لہجہ کی کھنک قدرے عام ہوئی، فرد اور انفرادیت کے چرچے ہونے لگے۔ دراصل ذات اور دروں بینی کا احساس فی نفسہٖ معیوب نہیں ہاں یہ دو دھاری تلوار ضرور ہے جو بے ہنر کے ہاتھ میں خطرناک اور ہنرمند کے ہاتھ کی آرائش بن جاتی ہے۔ یوں غور کیجئے تو ذات ہی خلاصۂ کائنات بھی ہو سکتی ہے کیونکہ ہر فرد کی خوشی اس کا سکون اور نشاط بھی سارے اجتماعی منصوبوں کا آدرش ہے لیکن

ہر عظیم خیال، فلسفہ اور مشاہدہ شاعر کو ذاتی جذبے میں ڈھال کر اور نجی بنا کر ہی پیش کرنا ہوتا ہے تاکہ اس میں تجربے کی روشنی اور خلوص کی آنچ پیدا ہو سکے مگر بیرونی چیزوں کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ شاعر کائنات کی پہنائی دوسروں کے لیے چھوڑ دے اور خود اپنی ذات کے ایک گوشے میں معتکف ہو جائے۔ نئی شاعری کی اڑان عام طور پر محدود رہی ہے مگر اس کی پروازیں خونِ جگر شامل رہا ہے اور ان کے تجربے زیادہ خلوص اور حقیقی ہیں۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ عظیم مسائل اور بڑے CANVAS کی جگہ چھوٹی چھوٹی روزمرہ کی چیزیں موضوعِ شعر بننے لگیں۔ روزمرہ زندگی کے حسن پر نظر پڑنے لگی۔ صنوبر کے سایے کے بعد سے فنٹ کے "کچھ فرشتے" تک ہمارے دانشوروں کا رجحان تھوڑے بہت تعمیم اور رجعت کی طرف رہا ہے مگر پچھلے نو دس برس میں NORMALCY گھریلو زندگی کی چاہت، گھر کے آنگن کی سوندھی مٹی سے پیار گھر کی دیواروں کی رفاقت کا احساس بڑھا ہے اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ہمارے احساس کا دامن سمٹا ہے گو وہ سمٹ کر اور زیادہ مضبوط ہو کے ساتھ ہمارے ہاتھ آگیا ہے مگر کائنات کے طوفان، ہماری تہذیبی زندگی کی طغیانیاں، ہمارے بڑا عظم کی کروٹیں، ہمارے اندر بدلتی ہوئی کیفیتیں اور تعمیرِ کائنات کے عظیم زلزلے ہم کو کم متاثر کر پاتے ہیں کیونکہ ہم اپنے گھر کی نمی نمی خوشبوؤں اور دکھوں کے چراغ کی روشنی میں بہت کچھ گم کیے ہوئے ہیں۔

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اس قدرے NORMAL میلانِ طبع کے ساتھ ساتھ فطرت اور منظر کشی کا ایک نیا زاویہ پیدا ہوا۔ فطرت کی تصویریں جس قدر پیار اور جس جذباتی لگاؤ سے کھینچی گئی ہیں اتنی اس سے پہلے بہت کم ملیں گی۔ فطرت یہاں کالی داس و ورڈزورتھ کی قدرت نہیں ہے بلکہ وہ گویا انسان کے ان نہاں خانوں کی تلافی کرتی ہے جو صنعتی نظام اور دنیا کے سنگین حقائق سے پیدا ہونے والی ناآسودگیوں نے بنائے ہیں۔ وہ انسان جو کبھی چھتوں کے نیچے دم گھونٹ دینے والی فضا میں رہتا ہے، کھلے افق، پھیلے آسمان، سرو کے پیڑ، بور پہلی، اور سرِ شاخِ صنوبر اٹکے ہوئے چاند کا ذکر کرتا ہے اور آزادی اور کشادہ دلی سے سانس لیتا ہے۔

اس کے علاوہ عام طور پر نرمی، سپردگی اور ربودگی کی آوازیں اس دور میں زیادہ مقبول ہوئیں ان میں ہر آواز پرخلوص اور تصنع سے آزاد نہیں تھی بعض نے غم کو اپنے اوپر طاری کیا، بعض اس ماتمی لے کو اپنانے میں لگ گئے جو عزیز لکھنوی کے لکھنؤ میں اصل سمجھی جانے لگی تھی مگر یہ بات غلط نہیں ہے کہ اس دور میں لہجے کی نرمی اور فناوگی، خود فراموشی اور فسردگی کے عناصر واضح طور پر ملتے ہیں میں یادوں کی خوشبوؤں سے مہکتے ہوئے گلزار ہیں۔ ان جانے اور گمنام دکھ درد کے چہرے ہیں۔ ایسے راستے ہیں جہاں ہر وقت کا وقت رہتا ہے اور جہاں بہتے ہوئے دریا کے ٹھہرنے کے وقت بھی دلِ شاعر نہیں ٹھہرتا۔ تشکیک کبھی کبھی بیزاری اور کلبیت کی راہوں پر آنکلتی ہے مگر جو گداز اس دکھ سے پیدا ہوا ہے وہ اندازِ بیان میں گھلاوٹ، مٹھاس، ندرت اور رمی لانے میں کامیاب ہے اندازِ بیان کے اعتبار سے اچھی خاصی تعداد میں نئے الفاظ، تشبیہیں، تاثر پارے اور استعارے زبان میں داخل ہوئے ہیں اور نشاط کے ارتعاش نے مختلف طریقے پر شاعری کی دنیا کو زیادہ شاداب اور وسیع کیا ہے۔

ان خصوصیات کی روشنی میں ایک سوال بار بار سامنے آتا ہے کیا ہماری شاعری نو رومانیت NEO-ROMANTICISM کے دور سے گذر رہی ہے؟ صنوبر کے سایوں سے نکلنے کے بعد اور ترقی پسندی کے ابتدائی چند سال میں بھی اردو شاعری پر اسی کا غلبہ رہا ہے اور ہمارے اکثر شاعر جذباتیت اور رومانیت ہی کے جوش سے انقلاب اور حقیقت نگاری کی راہ تک پہنچے ہیں!

پھر وجد سے ملا ہوا ایک خلا کا احساس SENSE OF NOTHINGNESS ہر شے میں اس شدت سے بڑی ماورائی حقیقت کا عکس دیکھ کر تخیل اور جذبے کی فراوانی اور جوش ۔ رومانیت سے لگاؤ اور شخصی اور نجی احساس پر زور وغیرہ رومانیت کے چند بنیادی نکات کہے جا سکتے ہیں ظاہر ہے کہ رومانیت کا رنگ شاعر بہ شاعر اور عہد بہ عہد بدلتا رہا ہے اور بنیادی اقدار کے علاوہ جزوی اقدار میں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ ایسی صورت میں کیا ہماری شاعری کے اس نئے آہنگ کو رومانی کہنا حقیقت سے بہت بعید بات ہوگی؟

اس جائزے سے نئی شاعری کا جو تصور ذہن کے سامنے آتا ہے وہ شکست خوردہ یا منظم ترک شاعری کا نہیں ہے۔ اس شاعری میں کوئی واضح سمت نہیں ہے بلکہ مختلف میلانات ہیں، خیال کی نئی نئی کونپلیں پھوٹ رہی ہیں، احساس کے نئے نئے ارتعاش جاگے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ بات مبارک ہے کہ ہمارے شاعروں نے اپنے حواس و ادراک پر اعتبار کرنا سیکھا ہے، مانگے کی روشنی سے چراغ روشن کرنے کی عادت بہت کچھ چھوڑی ہے اور جس طرح بچہ پہلی بار چلنے پر لڑکھڑاتا ہے، اپنے اوپر اعتماد کرتے ہوئے جھجکتا ہے، آگے بڑھتے اور آگے بڑھ کر ستاروں پر کمندیں ڈالنے کی بات نہیں سوچ سکتا اسی طرح ہماری شاعری بھی کچھ لڑکھڑاتی جھجکتی دکھائی دیتی ہے۔ اس میں عظیم مسائل کی گونج نہیں ہے وہ ایک ایسے دور میں جو غالب اور اقبال کے دور سے کئی لحاظ سے عظمت آفریں اور پیچیدہ دور ہے غالب اور اقبال کی فکر کا بھی ساتھ نہیں دے سکی ہے۔ اس میں تشکیک بھی پیدا ہوئی اور فرار بھی مگر یہ اپنے اوپر اعتمادی کا نتیجہ بھی اس لیے اس سے مایوس ہونے کی وجہ نہیں اسے مبارک اور نیک فال سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اس سے امید بندھتی ہے کہ جو یقین اور اعتماد تشکیک اور خود اعتمادی اور اپنے غور و فکر کے نتیجے کے طور پر آئے گا اس میں زیادہ توانائی بھی ہوگی اور زیادہ استقامت بھی۔ ہاں داخلیت پرستی اور مریضانہ دروں بینی کے خطرات سے آگاہ کرنا اور نئی شاعری کو جز رسی میں گرفتار ہونے سے بچانا ہماری تنقید نگاری کے فرائض میں ہے۔

اب جائزہ میں دوسرے گیت، قطعات، رباعیات، ڈرامائی شاعری، کینٹو وغیرہ لاتعداد شعری اسالیب شامل نہیں اور یہ بحث نظم اور غزل ہی تک محدود رکھی گئی ہے اور اس میں بوجوہ مختلف فن کاروں کے رجحانات سے تفصیلی بحث نہیں کی جا سکی مگر اس سے اندازہ ضرور ہوگا کہ نئی شاعری کی اقدار کے تعین اور میلانات کی وضاحت کی ضرورت ہے۔ اس میں بھی بہت سی نئی سمتیں نئے نئے رجحان پیدا ہو رہے ہیں اس نے بھی مشاطہ بن کر عروسِ سخن کو سنوارا ہے اور اس اضافے کو ہمدردی اور دلچسپی کے ساتھ سمجھنے اور اس کی قدر و قیمت متعین کرنے کی تاریخی اہمیت ہے۔ آئندہ کسی مضمون میں نئی شاعری کے ان میلانات پر زیادہ تفصیلی بحث کروں گا مگر اس مضمون کے خاتمے کے لیے غالب کا یہ شعر غالباً مناسب ہے ؎

تو اے کہ محوِ سخن گسترانِ پیشینی — مباش منکرِ غالب کہ در زمانۂ تست

———

فارسی شاعری اور کشمیر

محمد عبداللہ قریشی

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ کسی ملک کی طبعی حالت وہاں کے لوگوں پر، اُن کے اخلاق و عادات پر اور ان کی صنعت و حرفت پر اثر کیے بغیر نہیں رہتی۔ کشمیر اس کی زندہ مثال ہے۔ قدرت نے اپنی فیاضی سے اس خطے کو دولتِ حسن سے اس قدر مالا مال کیا ہے۔ کہ وہ جائز طور پر گلزارِ دنیا کہلاتا، "عرشِ خدا" اور "باغِ دلکشا" کے ناموں سے پکارا جاتا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ "جنتِ ارضی" اور "فردوسِ بریں" کے خطابات سے مخاطب ہوتا ہے۔ ایسی سرزمین فنونِ لطیفہ اور بالخصوص شاعری کے لیے کیوں موزوں نہ ہو گی! اناج کے سرسبز و شاداب کھیت، پھلوں سے لدے ہوئے درخت، چاولوں کی خوشبودار فصلیں، مختلف قسم کے خوش رنگ و خوش آواز پرندے، سوئٹزرلینڈ اور ناروے کے سے گھنے جنگل، ٹھنڈے اور میٹھے پانی کے قدرتی چشمے اور پہاڑی ندی نالے ایسی چیزیں نہیں جو شاعر کے جذبات میں تلاطم برپا نہ کر سکیں۔ سی۔ بی۔ ہربرٹ اسی حسین و جمیل وادی سے متاثر ہو کر کہتا ہے کہ "ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے برف سے ڈھکے ہوئے ہمالیہ پہاڑ کے حواشی میں ایک خوبصورت تصویر جڑ دی گئی ہے۔"

مسز جی۔ سی۔ بروس لکھتی ہیں کہ "کشمیر کی ہوا میں سانس لینا گویا شعرستان میں رہنا ہے۔" اور اس میں شک بھی نہیں کہ کشمیر دنیا کی بہترین غزل کا ایک شاداب ترین شعر ہے۔ یہ برف سے ڈھکے ہوئے اونچے اونچے زمردیں پہاڑ اس شعر کا مضمون، یہ محبت کا سکون بخشنے والی آنکھوں کی طرح ہر وقت منور رہنے والے سرد و شیریں پانی کے بہتے ہوئے ندی نالے اس شعر کی روانی، یہ گرتی ہوئی آبشاروں کی ترنم ریزی اور خوش الحان پرندوں کی نغمہ سرائی اس شعر کی موسیقی اور یہ مختلف قسم کے ثمرور و سایہ دار درخت اور رنگ پرور رنگ افروز پھول اس شعر کے حسین ترین استعارے ہیں۔ ہر شے جذبات کو ابھارنے کا تہیہ کیے اپنے فردوسی خوانِ کرم بچھائے دعوتِ کیف و سرور دے رہی ہے۔

یہ خواب کی دنیا ہے جہاں تخیّل کی سرحدیں بے پناہ ہو جاتی ہیں۔ یہ دن کے وقت خیال بندی طلسم ہے اور رات کے وقت سحرکاری خیال۔ اس کی فضا یکسر مصوّرِ حسن اور تمام تر لبریزِ محبت ہے۔ اس لیے جو شخص حسین ماحول سے متاثر ہو سکتا ہے، لطیف ہوا سے محبت کی آواز سننے کی اہلیت رکھتا ہے، معرفتِ کردگار کے دفترِ بے پایاں کو الٹ پلٹ کر دیکھ سکتا، بصیرت کی آنکھ سے گل پوش وادیوں کی رنگ آمیزی، مناظرِ جمیل کی شادابی و دلفریبی، شگفتہ کلیوں کی نزہت افزائی اور پھولوں کے بوجھ سے جھکی ہوئی شاخوں کی نکہت بیزیوں کا مشاہدہ کر سکتا ہے اور وہ یہاں رہ کر اچھے سے اچھے شعر کہہ سکتا ہے۔ کیونکہ فطرت کے بے گنتی روپ۔ انسان اور سماج کے بے شمار سوانگ

ایسے ہیں کہ ان سب کی تصویر کھینچی ممکن ہو۔ ان کو تخیل پیکر دیا جا سکتا ہے۔

"یہ ضروری نہیں کہ تخیلی پیکر کسی انسان کا کیرکٹر یا انسان کی مصوّرانہ تصویر ہی ہو۔ صبح شام سورج کی روشنی کے رنگ کی قوسِ قزح کی لطافت، پہاڑوں کے اتار چڑھاؤ، ابھار اور ڈھلاؤ، جھیلوں کا سانس لینا، سمندر کی موجوں کا پہاڑوں کی طرح ابھرنا، بادل کی طرح پھیلنا، ندیوں کا سانپ کی طرح لہرانا، تالابوں اور چشموں کا آنکھیں پھاڑ کے ستاروں کو تکنا، زمین کا نشیب و فراز، درختوں کے جھنڈ، گھاس کا لہلہانا، موسموں کی بہاریں۔ غرض فطرت کا ہر منظر ... ، سماج کا مد و جزر، انسانی تعلقات کی پیچیدگیاں، اقتصادی بلندیاں اور پستیاں، سیاسی سکون اور تلاطم، صداقت پر قربانیاں، گندم نما جو فروشیاں، نفس کی کیفیتیں، جذبات کا جوار بھاٹا، خواہشاتِ نفسانی کا حیرت ناک کھیل، غرض فطرتِ انسانی کا انفرادی اور اجتماعی ہر رنگ شاعر کی مصوّری کے لیے ایک زبردست موضوع ہے۔"[1]

یوں تو کشمیر میں قدرت نے ہر چیز کو شاعری کا جامہ پہنا رکھا ہے۔ لیکن کھیتوں کی نلائی اور کٹائی کا منظر بھی اس قدر رقت پیدا اور کیف انگیز ہوتا ہے کہ اگر آپ جون کے اوائل میں اس جنتِ ارضی کی سیر کریں اور علی الصباح کسی کھیت کی طرف نکل جائیں تو آپ کو ایک عجیب و غریب تماشا نظر آنے گا۔ بیس بیس تیس تیس آدمیوں کی ٹولیاں کھیتوں میں گھاس پھوس سے پاک صاف کرتی نظر آئیں گی۔ اس وقت ان کی حالت بدست بکار و دل بیار کے مصداق ہوگی۔ وہ کام کے ساتھ ساتھ نہایت میٹھے سروں میں کچھ گیت گا رہے ہوں گے۔ صبح کا سہانا وقت، آفتاب کے طلوع کا دلکش منظر اور اس پر ان کی مدھ بھری میٹھی دھنیں دلوں پر ایک خاص اثر کریں گی اور ایسا محسوس ہوگا جیسے نغمہ زمین سے اُبل کر سننے والوں کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ اس وقت عام انسان پر محویت کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ اور شاعر تو دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر علائقِ دنیا سے کچھ ایسا کنارہ کش ہو جاتا ہے کہ محسوس کرنے لگتا ہے، میں ایک ایسی سرزمین میں پہنچ گیا ہوں جہاں کا ذرہ ذرہ اپنی آغوشِ محبت وا کیے زبانِ بے زبانی سے کہہ رہا ہے ؎

دگر از غمِ دنیا دلِ تو گشت ملول
نزدِ من آ کہ ترا بار وفا دارمنم

علاوہ ازیں ہری ہری گھاس پر شبنم کے موتی، نسیمِ سحر کے ہلکے ہلکے جھونکے، گرتی ہوئی آبشاروں کی ترنم ریزی اور بادِ باراں کی سنسناہٹ بھی شاعر کے دماغ میں پند و موعظت کے طوفان پیدا کیے بغیر نہیں رہتی۔ وہ انھیں اپنے رنگ میں رنگ کر دنیا کے سامنے پیش کرتا اور خود ان پر وجد کرتا ہے۔

اس لحاظ سے یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ کشمیر ایک زبردست علمی اور ادبی مرکز ہونے میں کسی سے پیچھے رہا ہو۔ مگر افسوس کہ کشمیری شاعری کی آج تک خاطر خواہ قدر نہیں کی گئی۔ اور بہت کم آدمی ایسے ملتے ہیں جنھیں اس بات کا علم ہے کہ کشمیر نے اس صنف کی بھی کمال کی خدمت کی ہے۔ کشمیر کی صنعت و حرفت نے ملک کے طول و عرض میں کافی شہرت حاصل کی مگر اس کی تہ میں زیادہ تر وہاں کے تاجروں اور غیر ملکی سیاحوں کی ہمت اور قدر دانی کار فرما نظر آتی ہے۔ شاعری چونکہ ان مخطوطات میں پوشیدہ تھی جنھیں آج تک روشنی کا منہ دیکھنا بھی نصیب نہ ہوا، اس لیے وہ پردۂ اخفا ہی میں رہی۔ اور یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کشمیر نے شاعری اور بالخصوص فارسی شاعری

---

[1] سوپلے بول بہ تصرّف

کی خاطر کیا کچھ کیا اور فارسی زبان کی نشو و نما و ترقی میں کشمیریوں کا کتنا حصہ ہے؟

آج ایران اپنے فردوسی، حافظ، رومی اور نظامی پر بہت ناز کر رہا ہے۔ گر کشمیر بھی شائق، غنی، کامل، صرفی پر فخر کرنے میں اس سے کچھ کم حق بجانب نہیں۔ عبدالوہاب شائق نے شاہنامے کی طرز پر کشمیر کی ایک منظوم تاریخ تصنیف کی جو ساٹھ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ غنی کا دیوان کشمیر کی حدود سے نکل کر ہندوستان اور ایران تک پہنچا اور استادانِ فن سے اپنے کمالات کا اعتراف کراتا رہا اور باوجود اس کے کہ فارسی شاعری میں صدہا انقلابات آئے، غنی کی زبان کو انقلاب کی ہوا سے کوئی گزند نہ پہنچا اور آج سالہا سال گزر جانے کے بعد بھی اس کے کلام پر انگلی نہیں رکھی جا سکتی۔ مرزا اکمل الدین بیگ کامل کی مثنوی بحر العرفان صوفیانہ خیالات کے لحاظ سے عدیم النظیر چیز خیال کی جاتی ہے۔ ملا یعقوب صرفی، ملا بہاؤ الدین متو، ملا اشرف، داری، جلیل اور ملا عبداللہ حمید کا شمیری شاہ آبادی کے مجموعے ابھی تک طباعت کے زیور سے آراستہ نہیں ہوئے مگر وہ بھی لاجواب چیزیں ہیں۔

یوں تو حکومت اسلامیہ کے ساتھ ہی فارسی زبان کشمیر میں پہنچ گئی تھی مگر اس کی ترقی کا اصل دور سلطان قطب الدین[1]، سلطان سکندر[2] اور سلطان زین العابدین عرف بڈشاہ[3] کے عہد میں شروع ہوا۔ اس سے پیشتر حکومت کا کاروبار سنسکرت زبان میں چلتا تھا، بڈشاہ نے دارالترجمہ اور دارالتصنیف کے شعبے قائم کر کے ملک کے بہترین باکمالوں کو اپنے ہاں جمع کیا اور پھر ان پر انعام و اکرام کی بارشیں کر کر کے اپنی قدردانی اور معارف پروری کا ثبوت دیا۔ چنانچہ سید محمد منطقی اویسی، ملک الشعراء ملا احمد کاشمیری، ملا ندیمی، ملا فصیحی، ملا طیبی، ملا جمیل، ملا محمد شاعر، ملا احمد رومی، ملا نور الدین، ملا علی شیرازی، ملا نادری، مولانا حسین غزنوی وغیرہم اس دور کی چند قابل قدر ہستیاں ہیں۔ ان سب نے مل کر فارسی کی جڑیں زمین میں گاڑ دیں۔

بڈشاہی دربار کے ملک الشعراء ملا احمد کی قوتِ استدلال، لطافتِ طبع، قادر الکلامی اور بدیہہ گوئی کا تمام مورخین نے اعتراف کیا ہے۔ دربار شاہی کے علمی مباحثوں میں جو ادبا اور شعرا حصہ لیتے تھے۔ ملا احمد ان سب کا سرتاج تھا۔ تاریخ وقائع کشمیر اور ترجمہ مہابھارت اس کی یادگاریں۔ وفات کے بعد مزار الشعرا میں دفن ہوا۔

ایک دن بزم آراستہ تھی۔ سلطان زین العابدین بڈشاہ تخت پر جلوہ افروز تھا۔ ملا احمد دستار کا شملہ پیشانی پر شاخ وار لٹکا کر جھومتے جھامتے بلند ہانپتے کانپتے دربار میں آئے۔ بادشاہ نے مسکرا کر فی البدیہہ یہ شعر پڑھا ؎

شاخ پیشانیٔ ملا احمد کشمیر بہ بیں
گر نہ دیدستی تو در آفاق انسان شاخوار

بادشاہ مذاق صحیح اور طبع سلیم رکھتا تھا۔ اس کے درباری مصاحب اور شعرا بھی اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے اور ملا احمد تو ملک الشعرا ہی تھا۔ فوراً بول اٹھا ؎

شاخ پیشانی خدیوا گر گ وارے داشتم ۔۔۔ تا نیایم در میان مادہ گاواں در شمار

---

[1] عہد حکومت ۱۳۶۹ء لغایت ۱۳۹۳ء
[2] عہد حکومت ۱۳۹۴ء لغایت ۱۴۱۷ء
[3] عہد حکومت ۱۴۲۳ء لغایت ۱۴۷۴ء

جامعہ کی بجلی ملک الشعرا کے ذہین رسالہ پتہ دے رہی ہے[1]

ایک دن ملا احمد تتہ جو سلطان کی خدمت میں حاضر تھا ایک فقیر ہاتھ میں کاسۂ گدائی لیے چکول بے آیا اور حمایت ہے ساکی کے ساتھ اسے بادشاہ کے سامنے رکھ دیا۔ بادشاہ کو اس کی یہ حرکت ناگوار گزری۔ طیش میں آکر فرمایا یہ کچکول تم کو کس نے دیا ہے؟ وہ تو خاموش رہا۔ ملا احمد اشاہ فی البدیہہ بولا ؎

اے آنکہ ترا تاجوری داد سری داد

در دست گدا کوزۂ در یوزہ گری داد

اس شعر کا سننا تھا کہ بادشاہ کا غصہ فرد ہو گیا[2]

سید محمد امین اویسی منطقی نے بادشاہ کے گھر میں پرورش پائی۔ لیکن جب بادشاہ نے آپ کی فراست و کیاست دیکھ کر بعض امور مملکت آپ کے سپرد کرنا چاہے تو آپ نے مندرجہ ذیل شعر کے علاوہ ایک طویل ترجیع بند میں دنیا سے کنارہ کشی کا اظہار کر دیا ؎

زما سوائے تو آنکہ فارغ البال اند

بہ عالمے نہ فروشند ذوق تنہائی

علم و فضل کے باوجود آپ کو انکساری و فروتنی پر فخر تھا۔ فرماتے ہیں ؎

گناہ ما ز عدم گر نیامدے بہ وجود

وجود عفو تو در عالم عدم مے بود

لیکن ۹۰۰ھ میں اشرار کی ایک جماعت نے آپ کو شہید کر دیا۔ جاں کنی کی حالت میں آپ نے فرمایا ؎

من فارغم ز مصلحت اہل روزگار — مے دان یقین کہ کشتن من بود بے گناہ

اکنوں بیا و شعر بخواں بر مزار من — تا روئے ظالمان ستمگر شود تباہ

صورت قبرم ز بعد مرگ دیدار خوشتر است

نامرادے ہمچو من با خاک یکساں خوشتر است

ملک الشعرا ملا نادری بھی اس عہد کی ایک نادر شخصیت تھے۔ تاریخ اور دیوان کے علاوہ کچھ اور کتابیں بھی لکھیں۔ مگر اب اس شعر کے سوا ان کی کوئی یادگار باقی نہیں ؎

برقع نور است بر رخسار آتش ناک تو

یا ز تاب عارضت آتش فتادہ در نقاب

---

[1] تاریخ بڈشاہی مصنفہ منشی محمد الدین فوق صفحہ ۳۹۳ [2] تاریخ بڈشاہی صفحہ ۳۹۴

بادشاہ نے کشمیری پنڈتوں کو بھی ترغیب دی کہ وہ فارسی زبان سیکھ کر حکومت کے عہدے سنبھالیں۔ اس گروہ میں جس نے سب سے پہلے فارسی زبان کی طرف توجہ کی وہ سپرو کہلایا۔ سپرو کشمیر میں اس شخص کو کہتے ہیں جس نے سب کچھ پڑھ لیا یا پڑھنے میں سبقت کی۔ علامہ اقبال کا خاندان سپرو پنڈتوں ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ کشمیری بالطبع وسیع النظر اور ذہین ہوتے ہیں۔ نئے ماحول کے مطابق ڈھل جانے کی صلاحیت ان میں مبالغہ کے ساتھ پائی جاتی ہے۔ فارسی سے مانوس ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وسط ایشیا کی ذہانت رفتہ رفتہ کشمیریوں میں سرایت کر گئی اسلامی تمدن کی پذیرائی فراخ حوصلگی کے ساتھ ہونے لگی۔ کشمیری پنڈت کثیر تعداد میں فارسی اور عربی کے عالم ہوئے اور ان کو فارسی ہمیشہ ایک گہرا لگاؤ رہا۔ یہ اسی فارسی دانی کا اثر تھا کہ وہ کشمیر کے کشمیری سلاطین، چک بادشاہوں، مغل اور افغان حاکموں، سکھ اور ڈوگرہ راج میں حکومت کے بڑے بڑے عہدوں پر ہمیشہ فائز رہے۔ مجلسی زندگی میں بھی ان کا وقار بلند رہا اور وہ فارسی کو اپنی زبان سمجھ کر اس میں دلی جذبات و خیالات کا اظہار کرتے رہے۔

چک شاہی حکومت اگرچہ بہت تھوڑا عرصہ کشمیر میں قائم رہی مگر اس دور میں بھی فارسی شاعری کی ترقی نہ رکی۔ چنانچہ میر علی اور حسین شاہ چک کے زمانے میں، مہری سلطان علی شاہ چک کے عہد میں اور محمد امین مستغنی یوسف شاہ چک کے دور میں نہایت اور عالی دماغ اور خوش بیان شاعر ہوئے ہیں جن کا نمونہ کلام حسب ذیل ہے —

گل بدستم چہ نہی در کف من خار خوش است
ایں گلِ تازہ براں گوشۂ دستار خوش است

سبو سبو دہ و خم خم دلِ لوند مرا
قدح چہ آب زند آتشِ بلند مرا (میر علی)

ہرگز دلم بغیرِ تو مائل نمی شود — در دیدہ نقشِ روئے تو زائل نمی شود
از دوریت چہ باک کہ از بُعدِ ظاہری — اصلا میان ما و تو حائل نمی شود
دستم بریدہ باد چہ کار آیدم بگو
در گردنِ بتاں چو حمائل نمی شود (نامی)

مرتضیٰ بادشۂ مسند عالی نبی است — آفتابیست کہ برجِ شرفش دوشِ نبی است (مہری)

برہمن گردِ تو گردم رہِ کفرم بنما
کہ ز ایمانِ خودم شرم ہمے می آید (مستغنی)

دوشینہ بچشم دل نہاں از مردم
دیدم شبِ ہشت بلکہ کشمیر دوم
خاکی زعبیر و مشک آگندہ فیہ
آبی ز صفا وجود خود یافتہ گم
(مستغنی)

من خندہ نیم بہ طبع عاشق ناساز
یا گریہ کہ بر روئے روم چون غماز
یا نالہ کہ سر بگوشش بیگانہ نہم
من دردِ دلم خلوتی محرمِ راز
(مستغنی)

یوسف شاہ چک خود بھی فارسی اور کشمیری دونوں زبانوں کا اچھا شاعر تھا۔ یہ شعر اسی کے طبع زاد ہیں ؎

دلی پُر دردِ من جاناں بسانِ غنچہ پُر خون است
چہ بے رحمی نہ پرسیدی کہ احوالِ دلت چون است

کاسۂ سر شد قدح از گردشِ دوران مرا
دارد این زیر خراب آباد سرگرداں مرا

ایک دفعہ وہ سیر کے لیے پرگنہ پھاگ میں گیا جسے وادیٔ وانگت کہتے ہیں۔ وہاں ایک سبزہ زار میں دو چشمے پاس ہی پاس بہتے تھے۔ ایک کا نام تارسر اور دوسرے کا مارسر تھا۔ منظر نہایت دلکش اور روح پرور تھا۔ مگر وہ جو کہا کرتے ہیں کہ اکیلا ہنستا بھلا نہ روتا۔ اس نے یوسف شاہ پر الٹا ہی اثر کیا۔ اپنی ملکہ حبہ خاتون کی یاد اس کے دل میں چٹکیاں لینے لگی۔ اس کی جدائی کے خیال نے دماغ کو گدگدیا اور یہ شعر بے اختیار اس کی زبان سے نکل گیا ؎

بریادِ دو زلفِ بتِ کشمیر نژادے
شد تارسر و مارسر از گریۂ چشم

یعنی بتِ کشمیر کی زلفوں کی یاد میں میری آنکھیں اتنا روئیں کہ تارسر اور مارسر دو چشمے جاری ہو گئے۔

کشمیر کا بادشاہ حسین شاہ چک بھی قادر الکلام شاعر تھا۔ اس کے یہ شعر اب تک زبانِ زدِ خاص و عام ہیں ؎

حمایل کردہ تیغ و بستہ خنجر یار می آید — دلا بر خیز! کاری کن کہ جاں در کار می آید
آں ترک آل پوش سوارِ سمند شد — یاراں حذر کنید کہ آتش بلند شد

اس عہد میں فارسی شاعری نے کافی وسعت اور ہر دلعزیزی حاصل کی۔ یہاں تک کہ تیموریوں کے ذوقِ سخن پروری، فیاضی اور قدردانی کی بدولت یہ معراجِ کمال تک پہنچ گئی اور گھر گھر پھیل گئی۔ ہر طرف شعر و شاعری کے چرچے رہنے لگے، موزونیٔ طبع ایک عام چیز بن گئی اور شعر گوئی ضروریاتِ مدنیت میں شامل ہو گئی۔ صرفیؔ۔ فانیؔ۔ مظہریؔ۔ مخفیؔ۔ اوجیؔ۔ فطرتیؔ۔ ذہنیؔ۔ میرالٰہیؔ۔ ملا محمد صالح ندیمؔ۔ ملا ظفراؔ۔ گویاؔ۔ جویاؔ یکتاؔ۔ نجیؔ۔ توفیقؔ۔ ملا محمد زمان نافعؔ۔ ملا فردیؔ۔ حاجی محمد اسلم سالمؔ اور ان جیسے دیگر باکمال شعرا کی جماعت کشمیر اس عہد کی مشہور یادگار رہے۔ انھوں نے اپنی سخن سنجیوں سے کشمیر کا نام شہرت کے ساتویں آسمان پر پہنچا دیا اور فارسی شاعری کا آفتاب نصف النہار پر چمکنے لگا۔

اس وقت درباری اور ملکی زبان فارسی تھی اور چونکہ یہ زبان انسانی جذبات کی ترجمانی، قلبی واردات کی ادائگی اور صوفیانہ خیالات کی وجد آفریں کیفیتوں کے بیان کے لیے نہایت موزوں ہے۔ اس لیے کشمیری شعرا نے بھی اپنے خیالات و تاثرات کے اظہار کے لیے اسی کو منتخب کیا۔ اور اس میں وہ وہ جولانیاں دکھائیں کہ اہل زبان بھی دنگ رہ گئے۔ کشمیر فارسی شاعری کا نہایت زبردست مرکز بن گیا اور یہ معلوم ہونے لگا جیسے فارسی شاعری نے جنم ہی اسی جگہ لیا ہے۔

علوم و فنون کی قدردانی اور باکمالوں کی سرپرستی کے اعتبار سے تیموریوں کی سلطنت کا زمانہ ہندوستان کا دورِ زریں زمانہ تھا۔ ہندوستان کا شہنشاہ اکبر اور ایران کا شاہ عباس صفوی ہم عصر تھے۔ اور اگرچہ شاہ عباس صفوی بھی فنونِ لطیفہ کی سرپرستی کے لحاظ سے سلاطین ایران میں اپنا نظیر نہیں رکھتا۔ پھر بھی اس کے عہد میں ایرانی باکمالوں کا تانتا ہندوستان میں بندھا رہا۔ یہاں پہنچ کر جن اربابِ فن کی رسائی شاہی دربار تک ہو جاتی تھی وہ تو یہ سمجھتے تھے کہ رفعتِ شعری سے ثریا تک پہنچ گئے ہیں۔ لیکن جو خان خاناں کی نظر میں بچ جاتے تھے وہ بھی یہ خیال کرتے تھے کہ ان کی مشتِ خاک اکسیر بن گئی ہے۔ یہاں فیضیؔ اور ان کی جماعت موجود تھی۔ مشاعرے ہوتے تھے۔ مقابلے پر قصائد لکھے جاتے تھے۔ چونکہ مسابقہ کی کوشش ہر وقت جاری رہتی تھی۔ اس لیے کوئی لمحہ مشقِ سخن کے بغیر نہ گزرتا تھا یہی چیز تھی جس نے شعر کو سحرِ حلال بلکہ اعجاز بنا دیا۔ چنانچہ "عرفیؔ۔ نظیریؔ۔ طالب آملیؔ۔ کلیمؔ۔ قدسیؔ اور غزالیؔ کے کلام میں جو لطافت، نزاکتِ ادا، باریک خیالی اور رنگین آرائی پائی جاتی ہے، وہ شفائیؔ اور محتشمؔ کاشی میں نہیں ہے۔ جو ایران ہی میں رہے۔ حالانکہ یہ دونوں اُسی زمانے کے شاعر اور شعرائے ایران کے سرتاج اور دربارِ شاہی کے انتخاب تھے[۱]"

ایرانی طبعاً حسنِ فطرت اور مناظرِ قدرت کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ ایران اور خطۂ کشمیر کی آب و ہوا میں ایک خاص مماثلت بھی ہے۔ اس لیے یہ ممکن نہ تھا کہ جو ایرانی ہندوستان آتا وہ کشمیر جنت نظیر نہ دیکھتا۔ یوں بھی سلاطینِ ہند اور ان کے اُمرا موسمِ گرما کشمیر ہی میں گزارتے تھے۔ اس طرح ایرانی شعرا بھی ان کے ساتھ کشمیر پہنچ جاتے تھے۔ کچھ تو اکبر و جہانگیر کے ذوقِ سخن پروری نے کشمیر کو اس رنگ میں رنگ دیا اور کچھ ایرانیوں نے اسے شعر گوئی کا مرکز بنا دیا۔ بلکہ بعض تو مر کر بھی یہیں دفن ہوئے۔ چنانچہ سری نگر میں ڈل کے کنارے ایک اونچے ٹیلے پر بعض مقامی شعرا کے پہلو بہ پہلو حاجی محمد جان قدسیؔ مشہدی، ملا ظفرا مشہدی، میر فتح اللہ شیرازی، میرزا محمد قلی سلیم طہرانی، حکیم ابو طالب کلیمؔ ہمدانی، شیدا فتحپوری، عنایت خاں آشنا، میرزا ابو القاسم وغیرہ آسودۂ خواب ہیں اور ان کی آخری آرامگاہ کو مزار الشعرا کہتے ہیں۔

۱؎ شعر العجم جلد ۳ صفحہ ۱۸۳-۱۸۴

اکبر نے کشمیر فتح کرنے کے بعد تین دفعہ اس حسین و جمیل وادی کا دورہ کیا، دشوار گزار راستے سے ایسے مرغزار دیکھے فضا افزا نظارے دیکھے اور لوگوں کے حالات سے واقف ہو کر ان کی تالیف قلوب کی۔ ابوالفضل نے اپنے سحر طراز قلم سے ان سفروں کا دلچسپ حال بیان کیا ہے۔ ۹۹۷ھ[1] (۱۵۸۹ء) کے پہلے سفر کشمیر میں شہزادہ سلیم، شہزادہ مراد، شیخ فرید بخشی، زین خاں کوکہ، خان خاناں، حکیم ابوالفتح گیلانی، میر فتح اللہ شیرازی، ابوالفضل، فیضی اور بہت سے دیگر امراء و شعراء جلو میں تھے۔ فیضی کا مشہور قصیدۂ کشمیر اسی سفر کی یادگار ہے۔ جس طرح ابوالفضل نے نثر میں سماں باندھا ہے اسی طرح فیضی نے نظم میں جادو بیانی کی ہے۔ کشمیر کی شان میں اس کے یہ شعر بہت مشہور ہیں ؂

ہزار قافلۂ شوق می کشد شبگیر
کہ بار عیش گشاید بہ عرصۂ کشمیر

درو بجائے گیاہ زعفران ہمی روید
کہ آب و خاک طرب زچنیں بود تاثیر

زمین او چو دل بے غماں طرب خیز است
سپہر کردہ مگر خاک او بسبزہ خمیر

قصیدۂ کشمیر سے پتہ چلتا ہے کہ اکبر کے اس سفر میں عرفیؔ بھی ہم رکاب تھا۔ ایک قطعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اکبر نے کسی موقعہ پر ایک گھوڑا انعام دیا۔ لیکن عرفیؔ کو پسند نہ آیا اور اس نے شکر کا اظہار کرنے کی بجائے الٹا گھوڑے کی ہجو کی جو یہ ہے[2]

شاہنشہا حقیقتِ اسپے کہ دادۂ — بشنو ز لطف تا برسانم بعرض من
ہستم بر او سوار و لیکن پیادہ ام — گاہے بطول بیزوم اکنوں رہ چمن

اس کے باوجود عرفیؔ کشمیر کی تعریف میں یہ شعر کہے بغیر نہ رہ سکا ؂

ہر سوختہ جانے کہ بہ کشمیر در آید
گر مرغ کباب است کہ با بال و پر آید

امیر فتح اللہ شیرازی نے کشمیر پہنچ کر عجائبات و حالات کشمیر پر ایک رسالہ لکھا جو بادشاہ کے حکم سے اکبر نامہ میں شامل کر لیا گیا۔ مگر وہ خود تپ محرقہ میں مبتلا ہو گیا۔ علاج کیا گیا لیکن یہ پھول کشمیر میں ہمیشہ کے لیے مرجھا کر وہیں خاک میں مل گیا۔ فیضیؔ نے اس کا مرثیہ لکھا جس کے دو شعر یہ ہیں ؂

واحسرتا کہ رفت فلاطون در زمیں — واحسرتا کہ مرد ارسطوئے کارواں
ہرگز نہ مردہ اند و نمیرند اہل دل — حیف است نام مرگ بریں قوم ترجماں

---

[1] خطۂ کشمیر

[2] شعر العجم جلد سوم صفحہ ۲۳

اکبر ہی کے زمانے میں ملا عینی نے مرو ناجاتی کے اس شعر ؎

حریفان بادہ ہا خوردند و رفتند
تہی خم خانہ ہا کردند و رفتند

کے جواب میں یہ غیر فانی شعر کہا ؎

ہنوز آں ابر رحمت دُر فشاں است	مے و میخانہ با مہر و نشان است

ملا ذہنی اور ادجی بھی ان ایام میں کشمیر کے دو بلند پایہ شاعر تھے۔ ان کی شاعری زیادہ تر غزل کے میدان تک محدود ہے۔ فطرتی بھی اکبر کے زمانے میں ہوا ہے۔ وہ ملا ذہنی کا شاگرد اور ملا ندیمی اور ملا نصیبی کا ہم عصر تھا۔ ایک دفعہ مندرجہ ذیل اشعار کے صلے میں شہنشاہ نے اسے بارہ ہزار روپیہ انعام عطا کیا [1]

قسمت نگر کہ درخور ہر جوہری عطاست
آئینہ با سکندر و با اکبر آفتاب
او کرد گر معائنہ خود ز آئینہ
ایں می کند مشاہدۂ حق در آفتاب

ابو الفضل آئین اکبری[2] میں مظہری کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے کہ وہ اوائل عمر ہی سے شعر کہتا تھا۔ اسے سیر و سیاحت کا شوق تھا۔ اس نے ایران، خراسان اور ہندوستان کی سیر کی۔ محتشم کاشی اور وحشی یزدی سے استفادہ کیا۔ اور اکبر کے ملازمین کی سلک میں منسلک ہوا جس نے سنہ ۱۰۰۱ھ / ۱۵۹۲ء میں اسے کشمیر کا میر بحر مقرر کر دیا۔ مظہری نے چھ ہزار اشعار کہے اور سنہ ۱۰۱۸ھ (۱۶۰۹ء) میں بمقام سری نگر انتقال کیا۔ اس کا نمونہ کلام حسب ذیل ہے ؎

چہ حالت است ندانم جمال سلمیٰ را	کہ بیش دیدنش افزوں کند تمنیٰ را
بہ بست دیدۂ مجنوں نخویش و بیگانہ	چہ آشنا نگہے بود چشم لیلیٰ را

اقبال حسن کار ترا بیش بودہ است
وہ نہ صلاح کار ندانستۂ کہ چیست

ہر کس کہ بہ چشم ما سبک شد	بر خاطر آسماں گراں است

اکبر تیسری اور آخری مرتبہ سنہ ۱۰۰۵ھ میں کشمیر گیا۔ اسی سال اس نے ہری پربت پر قلعہ ناگر نگر کی تعمیر کا حکم دے کر قحط زدہ

---

[1] خزانۂ عامرہ مطبعہ نولکشور کانپور سنہ ۱۸۷۱ء صفحہ ۲۶۷
[2] آئین اکبری جلد اول صفحہ ۵۸۴

کشمیریوں کو فاقہ کشی سے بچایا۔ خزاں کے دن تھے۔ لیکن بادشاہ نے اس موسم میں بھی سری نگر کے باغوں میں سیب شفتالو اور چنار کی فصل ملاحظہ کی اور خزاں کی رنگ آمیزیوں پر بہار کا عالم دیکھ کر فرمایا ؎

ذوق فغا نیا فتہ در دل ز درنشسہ

رنگیں تر از بہار بود جلوہ خزاں

جہانگیر شہزادگی کے عالم میں باپ کے ساتھ کشمیر ہو آیا تھا۔ اسے یہ خطہ بہت پسند تھا۔ اس لیے بادشاہ بننے کے بعد ہر سفر ۔۔۔ نے کشمیر کا اکثر لطف اٹھایا۔ ایک سفر کا حال اس نے بہت تفصیل کے ساتھ اپنی تزک میں لکھا ہے۔ یہ سفر اس نے اپنے جلوس کے چودھویں نوروزی جشن کے بعد جو ۱۴ ربیع الاول ۱۰۲۸ھ (۱۶۱۹ء) کو منعقد ہوا شروع کیا۔ ۲۰۶ کوس کا فاصلہ ۱۰۸ دن میں طے کیا۔ چھ ماہ کشمیر میں گزارے۔ ۱۵ ربیع الاول ۱۰۲۹ھ (۱۶۲۰ء) کو پندرھواں جشن نوروز دریائے کشن گنگا کے کنارے اور سولہواں جشن ۲۷ ربیع الآخر ۱۰۳۰ھ (۱۶۲۱ء) کو واپس آگرہ پہنچ کر منعقد کیا۔

اسی سفر میں اس نے طالب آملی کو ملک الشعراء کے خطاب سے ممتاز کیا۔ طالب آملی اکبر کے عہد میں ماژندران سے ہندوستان آیا اور لاہور، آگرہ دہلی پھرتا پھراتا کشمیر پہنچا۔ اس خطہ کی خوبی اور آب و ہوا کی لطافت دامنگیر ہوئی اور ۱۰۳۶ھ (۱۶۲۶ء) میں وہ پڑا۔ ۱۰۳۶ھ میں یہ بلبل بُستان سخن ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔ کشمیر کے متعلق اس کے یہ شعر بہت مشہور ہیں ؎

فیض بیاد بخشد آب و ہوائے کشمیر ۔۔۔ از خشت خم نہادند گویا بنائے کشمیر

چوں خاک خشت بازاں ہر لحظہ در مشامم ۔۔۔ بوئے محبت آید از کوچہ ہائے کشمیر

کشمیری ستانم از حق بجائے جنت

اما نمی ستانم جنت بجائے کشمیر

ایک دفعہ کشمیر میں تھا کہ عید الضحیٰ آ گئی۔ دربار عید وہیں منعقد ہوا۔ شعراء نے قصیدے پڑھے اور انعام حاصل کئے۔ یہ دیکھ کر ایک کشمیری شاعر کے منہ میں پانی بھر آیا۔ وہ بھی ایک قصیدہ لکھ کر بادشاہ کے حضور حاضر ہوا۔ بادشاہ نے قصیدہ پڑھنے کی اجازت دی۔ مطلع کا پہلا مصرعہ یہ تھا ؏

اے تاج دولت بر سرت از ابتدا تا انتہا

یہی مصرعہ پڑھنے پایا تھا کہ جہانگیر نے آگے پڑھنے سے روک دیا۔ اور پوچھا۔ کیا تم عروض جانتے ہو؟ اس نے جواب دیا۔ نہیں جہانگیر کے چہرہ پر غیظ و غضب کے جو آثار مصرعہ سننے سے نمودار ہوئے تھے وہ غائب ہو گئے۔ فرمایا کہ اگر اس مصرعہ کی تقطیع کی جائے تو وہ یوں ہو گی :—

تا انتہا	از ابتدا	لت بر سرت	اے تاج دو
مستفعلن	مستفعلن	مستفعلن	مستفعلن

لت بر سرت میں بدفالی ہے۔ شاعر کے لیے لازم ہے کہ وہ اس قسم کے تمام قباحتوں سے آگاہ ہو۔ اگر تم عروض سے واقف ہوتے تو میں اس کو بے ادبی پر محمول کر کے تمہیں سزا دیتا۔

اس تحلیہ کے بعد اسے انعام دے کر رخصت کیا۔

جہانگیر خود بھی موزوں طبع تھا۔ بعض اوقات بے ساختہ کوئی معمولی فقرہ بولتا تو وہ بھی موزوں ہوتا۔ اس نے اپنی تزک میں کشمیر کا جہاں کہیں ذکر کیا ہے نثر میں شاعری کی ہے۔ اس نے ابو طالب کلیم کو ملک الشعرا کا خطاب دیا۔ ایک دن شکارگاہ میں بادشاہ کے چیتے نے ایک کالا ہرن شکار کیا۔ بادشاہ کی زبان سے بے اختیار یہ مصرعہ نکلا ؎

چیتۂ بادشاہ زد کالا

کلیم پاس کھڑا تھا اس نے فوراً کہا ؎

گشت صحرا ہمہ پر از لالہ

جہانگیر نے اسی وقت پانچ ہزار روپیہ انعام دیا۔ ان قدردانیوں کی شہرت سن کر ایران و توران سے کئی موزوں طبع عہدہ دار اور شاعر ہندوستان آگئے۔

جہانگیر کا انتقال بھی ۱۶۲۷ء میں کشمیر سے واپس آتے ہوئے راستے میں راجوری کے مقام پر ہوا۔ بستر مرگ پر اس کی آخری خواہش یہ تھی کہ میں کشمیر چاہتا ہوں، صرف کشمیر۔ بقول شاعر ؎

از شاہ جہانگیر دم نزع چو پرسند
با حسرت دل گفت کہ کشمیر دگر ہیچ

شاہجہان نے شہزادگی کے عالم میں باپ کے ساتھ کئی مرتبہ لیکن بادشاہ ہو کر چار مرتبہ کشمیر کی سیاحت کی۔ پہلی بار ۱۰۴۳ھ (۱۶۳۴ء) میں اور چوتھی بار ۱۰۶۱ھ (۱۶۵۱ء) میں۔ آخری سیر میں بادشاہ نے دارا شکوہ کے پیر ملا شاہ بدخشانی کی زیارت بھی کی۔ ملا شاہ نے بادشاہ کی آمد پر ایک نظم پڑھی جس کا پہلا شعر یہ ہے ؎

امروز شاہ شاہان مہماں شد است مارا
جبرئیل با ملائک درباں شد است مارا

ملا شاہ کی کلیات برٹش میوزیم میں موجود ہے۔

ایک بار ابو طالب کلیم بادشاہ کے ہمراہ گیا وہ کشمیر کی رنگینی اور آب و ہوا کی دلآویزی کا اس قدر شیفتہ ہوا کہ بادشاہ سے درخواست کی مجھ کو یہیں رہنے کی اجازت دی جائے۔ میں یہاں بیٹھ کر اطمینان سے فتوحات شاہی نظم کروں گا۔ یہ درخواست منظور ہوئی۔ ۱۰۴۴ھ میں جب بادشاہ سیر کشمیر کیا تو کلیم نے قصیدۂ تہنیت پیش کیا اور خلعت اور دو سو اشرفیاں انعام پائیں۔

کلیم کی بہترین غزل وہ ہے جو اس نے اپنے محسن و مربی ظفر خاں احسن کی یاد میں کہی جب وہ اپنی نظامت کا دوسرا دور (۱۰۵۳ھ سے ۱۰۵۶ھ تک) ختم کر کے کشمیر سے رخصت ہوا۔ اس مرصع غزل کے چند شعر یہ ہیں ؎

شکوۂ درد ترا کے پیش درماں می کنم	تشنہ می میریم و شکر آب حیواں می کنم
بے تو تاریک است کشمیر اے چراغ دیدہا	ماسیہ روزیم در شب سیر بستاں می کنم
در کمین عیش از بس دیدۂ بد دیدہ ایم	بادہ را از چشم ساغر نیز پنہاں می کنم

گل اگر در سینۂ کشمیری آید چہ سود / ما کہ گل از اشک خونیں زرد بیابان می کنیم
ما چراغ دیدہ نگذاریم پیش سیل اشک / ایمنی بی شکرۂ کشتی بطوفان می کنیم
با ظفر خاں بود این کیفیت و طرح غزل / باز دیگر زلف معنی را پریشاں می کنیم
تا تو رفتی دل بفکر خویشتن افتادہ است / سر چو می بازد آنکہ فکر ساماں می کنیم
بادۂ کشمیر از بزم تو صاحب نشہ بود / بے تو ما خاطر نشاں مے پرستاں می کنیم

داغ می ماند کلیم از نالہ زار از دست رفت
ہر چہ دشوار است ما بر خویش آساں می کنیم

اگر ہمیں یہ معلوم نہ ہو کہ کلیم نے ظفر خاں احسن سے بارہ برس پہلے وفات پائی تو اس غزل پر مرثیہ کا گمان ہونے لگے۔ خیالات کا تسلسل، انداز بیان کی روانی جذبات کی شدت و فراوانی اور سوز و گداز، غرض مرثیہ کے تمام عناصر اس غزل میں موجود ہیں۔[1]

کلیم کشمیر کی تعریف میں کہتا ہے ؎

نسیم خلد گدائے بہار کشمیر است / شگفتگی گل خار و دیار کشمیر است
اگرچہ مایۂ دلبستگی است قامت سرو / عنان ہوش بدست چنار کشمیر است
بدیدہ خاصیت توتیا دہد سیلش / بہ چشم آنچہ نیاید غبار کشمیر است
پیام عالم بالا کہ گوش تشنۂ اوست / ترانہ ایست کہ با آبشار کشمیر است

گذشتن از لب ساقی گلعذار کلیم
خنک چو تو بہ زمے در بہار کشمیر است

کلیم ۱۰۶۱ھ میں کشمیر ہی میں فوت ہوا۔[2] غنی نے تاریخ وفات کہی ہے۔

طور معنی بود روشن از کلیم

ملا طغرا مشہدی نظم و نثر دونوں میں استاد کامل تھا۔ وہ ہندوستان میں آکر سب سے پہلے شاہزادہ مراد بن شاہجہان کی بارگاہ میں حاضر ہوا۔ اس کی شہرت میرزا ابوالقاسم تک پہنچی جو کشمیر میں منصب دیوانی پر ممتاز تھا تو اس نے طغرا کو اپنے پاس بلالیا۔ طغرا نے کشمیر پر ایک مختصر منظوم رسالہ لکھا جس میں کشمیر اور راستے کی دلفریبی کا ذکر کرتے ہوئے داد سخنوری دی اور کشمیر کے باغات، اقسام میوہ و گل اور ہر جزو و کل کے ذکر میں انشا پردازی کا کمال دکھایا۔ کشمیر کی تعریف میں اس کی یہ رباعی بہت مشہور ہے ؎

کشمیر بود نفس غزال عالم نور / بر طالب فیض دیدنش ہست ضرور
گوئی کہ دریں باغ چمن ساز قضا / آوردہ نہاں شعلہ از خرمن طور

رسائل طغرا مدت تک ہماری درسی کتب میں شامل رہے ہیں۔ اس کی کلیات ساقی نامہ، غزلیات، قصائد، قطعات، فرد، چھوٹی مثنویاں،

---

[1] نصرت "کشمیر نمبر" ۲۸ فروری ۱۹۶۰ء ص ۳۴

[2] شعر العجم جلد سوم ص ۱۶۵

ترجیع بند، ترکیب بند اور مخمسات پر مشتمل ہے۔

حاجی محمد جان قدسی مشہدی ۱۰۴۲ھ میں حج سے واپسی پر شاہ جہان کے دربار میں پہنچا۔ بادشاہ نے ایک قصیدے کے صلے میں خلعت اور دو ہزار روپے عطا کئے۔ دو سال بعد نوروز کی تقریب پر قصیدہ پڑھا اور اپنے وزن کے برابر پانچ ہزار پانچ سو روپے انعام پائے۔ ایک اور قصیدے پر اس کا منہ سات مرتبہ جواہرات سے بھرا گیا۔ قدسی نے قصیدے اور غزل دونوں میں نام پیدا کیا۔ لیکن اس کا سب سے بڑا کارنامہ ایک مثنوی ہے جس میں اس نے شاہ جہاں کے سفرِ کشمیر کا حال بیان کیا ہے۔ وہ کشمیر کے متعلق کہتا ہے ؎

خوشا کشمیر و خاک پاک کشمیر — کہ سر بر زد بہشت از خاک کشمیر

چو کشمیر آبروئے ہفت کشور — نگاہ از دیدن او تازہ و تر

بود اہل جناں را سیرگاہے — بہ کشمیر از جناں کردند راہے

ایک مرتبہ قدسی کشمیر کی کسی مجلس میں غزل سنا رہا تھا۔ جب وہ اس شعر پر پہنچا ؎

ساقی بہ صبوحی قدحے پیشتر از صبح

برخیز کہ تا صبح شدن تاب ندارم

تو ایک کشمیری طالب علم نے پہلے مصرع کو یوں دہرایا ؎

ساقی بہ صبوحی "نفسے" پیشتر از صبح

قدسی نے نہ صرف اس اصلاح کو قبول کیا بلکہ معترض کے ذوق کی داد بھی دی۔

قدسی کی خواہش تھی کہ کشمیر میں چپہ بھر زمین ملے تو وہ وہیں رہ پڑے ؎

دریں گلشن کہ ہم گل ہست ہم خار

مرا ہم جائے دہ یک آشیاں وار

خدا نے اس کی آرزو پوری کی اور کشمیر کی گلپوش وادی نے ۱۰۵۶ھ میں ہمیشہ کے لیے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ خواجہ عزیز الدین عزیز لکھنوی نے مثنوی گلگشت کشمیر میں اس شعر کی یوں تضمین کی ہے ؎

چو قدسی نغمہ سنج ایں چمن شد — چنیں بر درگہ حق نغمہ زن شد

"دریں گلشن کہ ہم گل ہست ہم خار — مرا ہم جائے دہ یک آشیاں وار"

رسیدہ بر ہدف تیر دعائش

بہ زیر گلبنی دادند جائش

۱۰۵۵ھ (۱۶۴۵ء) میں جب شاہجہان تیسری مرتبہ کشمیر گیا تو اس نے اپنے جلوس کا انیسواں جشن وہیں منایا۔ نامور شاعروں نے قصیدے پڑھے اور انعام حاصل کیا۔ ایک کشمیری شاعر (غالباً ملا محمد صالح ندیم) نے ایک نہایت پُر معنی اور لاجواب قصیدہ سنایا جس میں صرف تعریف ہی نہیں بلکہ رعایا کے دکھڑوں کا بھی ذکر تھا۔ بادشاہ نے سن کر رعایا کو بہت سی رعائتیں دیں۔ اس قصیدے کے چند

شعر یہ ہیں ؎

چیست آں کس بستن و آویختن فرمودہ شاہ
شاہ کیخسرو سریر و خسرو خاقاں کلاہ

سر دوادہ انس پژمردہ و از وارادین پیمانہ
اہل کشمیر بند در دیہاں عدالت داد خواہ

آں ستم کیشے کہ کاہی را عوض بگرفتہ کوہ
آں جفا جوئے کہ کوہے را بجاں نادادہ کاہ

بجز ایں قوم از قوم خاطر بر غوا ند حسرہ
حال ایں جمع بہ شکنج نامہ دریا بد نگاہ

آں یکے بدخاک و خوں غلطیدہ چوں زخم رسید
واں دگر در پیچ و تاب افتادہ چوں از تیغ آہ

و ریچہ نارد کہ باد در وسند سنگ و رخت
از زمیں مشکل کہ بیروں سر کشد برگ گیاہ

دست بردی شد چناں بر پا کہ نرگس بہ باغ
می کند ہر سو نظر سیمرو زرد و بیرون نگاہ

زعفراں گویند خنداں سازد اندہ بناک
آمدہ از زعفراں در گریہ جمع بے گناہ

زیر دست آزار بیستا ہر کہ در کشمیر شد
نے بہ بنیاد پور و بیخ آں شد نہ دررہ بد فراہ

بیشتر از ایں مسجد بنائے شد بجائے بتکدہ
ایں زماں بت خانہ برپا شد بجائے خانقاہ

عدل را فرما کہ ایں قوم از بلا گردد خلاص
داور ابہر کو کہ ایں جمع از اماں یابد بہ جاہ

یہیں ظفر خاں صوبہ دار کشمیر نے اپنی تصنیف سے ایک مثنوی بصفت منزل بادشاہ کی نذر کی جس میں کشمیر کے باغات و عمارات اور خود کشمیر کی صفت و ثنا تھی۔ بادشاہ اس کے مطالعہ سے نہایت محظوظ ہوا۔

محمد قلی سلیم شاہ جہان کے دور حکومت میں ہندوستان پہنچا اور اختصاص خاں الکرات کا ندیم مقرر ہوا۔ جب خند مرخان کو سلطان کا لقب ملا تو سلیم بھی اس کے ہمراہ کشمیر آیا اور یہیں فوت ہوا۔ سلیم نے غزل، قصیدہ اور مثنوی میں مشق بہم پہنچائی۔ اس کی زبان صاف اور بیان شیریں ہے۔ اس کی کلیات میں مثنوی کشمیر اور مثنوی قضا و قدر اس کے کمال فن کی شاہد ہیں۔

ملا محسن فانی نہایت جید عالم فلسفی اور بلند پایہ منشی تھے۔ شعر بھی خوب کہتے تھے۔ غنی کے استاد تھے۔ مگر دنیا شاعری سے بڑھ کر ان کی علمی فضیلت کی قائل ہے۔ کتاب دبستان المذاہب انہیں کی تصنیف ہے۔

میر الٰہی سادات ہمدان سے تھا۔ وہ ظفر خاں احسن کے ساتھ کشمیر آیا اور یہیں ۱۰۶۰ھ میں فوت ہوا۔ اس کا یہ شعر بہت مشہور ہے ؎

یا الٰہی ز الٰہی تو چہ پرسی در حشر
آنچہ او کرد تو دیدی و چہ گفتن دارد

"ظفر خاں کو جب کشمیر کی صوبہ داری کا خلعت بخشا گیا تو شاہجہان نے فرمایا کہ اس سے رعایا کو خوش رکھنے کی ضمانت لی جائے۔ میر الٰہی نے عرض کیا ؎

خدا ضامن رسول و چار یارش

بادشاہ بہت خوش ہوا۔ ظفر خاں نے کہا کہ اگر میر الٰہی کو میرے ہمراہ کشمیر روانہ کر دیا جائے تو بڑی عنایت ہو۔ بادشاہ نے اجازت دی۔ میر الٰہی خان مذکور کی رفاقت میں مرتے دم تک کشمیر میں رہا۔ اس نے نوشہرہ کے جنوب میں الٰہی باغ (۱۰۴۹ھ) لگوایا جس کی تعریف ظفر خاں احسن نے اپنی مثنوی میں اس طرح کی ہے ؎

زدل چوں جانب صحرا الٰہی شدے ۔۔۔ نمو را گلستانیست خود روئے
زمینی سربسر صحرا شگفتہ ۔۔۔ بفرش سبزہ گل ستارہ خفتہ
ہزاراں گلشنش از ہر کنارست ۔۔۔ کہ مرغ دست آموزش بہارست
یکے از باغہا باغ الٰہی است ۔۔۔ کہ بنواں نازکش چہرہ کاہی است
دراں گلشن یکے کہنہ چنارست
زنخل طور گوئی یادگارست

میر الٰہی کا نمونہ کلام حسب ذیل ہے ؎

اے رحمت تو سرخط درج عذار ما ۔۔۔ دیباچۂ زصنع تو دیوان ذات ما
از پرتو کرم چو شوی معصیت گداز ۔۔۔ شنفے عرق شود ہمگی سیئات ما
تاآں زماں کہ ہمرہ معرب کند طلوع
بے شام فتنہ باد الٰہی حیات ما

کشمیر میں فارسی شاعری کو زیادہ فروغ ظفر خاں احسن کی صوبہ داری کے زمانے میں ہوا جو جہانگیر کے آخری ایام سلطنت سے شاہجہاں کی فرمانروائی کے وسطی عہد تک پھیلا ہوا ہے۔ ظفر خاں کا اصل نام احسن اللہ عرف احسن تھا۔ ۱۰۴۲ھ میں اپنے باپ خواجہ ابوالحسن کی وفات کے بعد کشمیر کا حاکم مقرر ہوا۔ اس نے تبت فتح کیا اور ۱۰۸۳ھ میں وفات پائی۔ ظفر خاں احسن نہایت سلجھا ہوا مذاق رکھتا تھا۔ تاریخ شعر کا یہ اہم ترین واقعہ ہے کہ ایران کا مشہور شاعر مرزا صائب اصفہانی جس نے سلاطین کی دعوت پر خاک ایران سے باہر قدم نکالنا منظور نہ کیا، ظفر خاں کی داد و دہش، اشعار آبدار اور اس کے حسن صورت و سیرت سے مسحور ہو کر سالہا سال اس کے پاس کشمیر میں پڑا رہا۔ ظفر خاں نے بھی دریا دلی سے اس کی قدردانی کی یہاں تک کہ سلاطین و ملوک کی یاد اس کے دل سے محو ہو گئی۔ مرزا صائب نے ظفر خاں کی مدح میں بہت سے شعر کہے جن میں سے تین یہ ہیں ؎

خانِ تو کہ تو زر برند بخزاں
خانۂ دیگراں بیک خانیست

من و دل چہ فریاد و افغاں کنیم ۔۔۔ ظفر خاں ظفر خاں ظفر خاں کنیم

خان خاناں ما بہ بزم و رزم صائب دیدہ ام
در سخاوت در شجاعت چوں ظفر خاں تو نیست

ظفرخاں احسن کا علمی مرتبہ بہت بڑا تھا کہ کلیم اور صائب ایسے بلند پایہ ایرانی شاعر اسے استاد مانتے اور اس کی سخن گری کا اعتراف کرتے تھے۔ احسن کبھی کبھی صائب کے کلام میں اصلاح بھی دیا کرتا تھا اور صائب اس اصلاح کو بہ تشکر قبول کر لیتا تھا۔ صائب نے اپنے دیوان کی ترتیب بھی احسن کے مشورے اور منشا سے کی چنانچہ ایک قصیدے میں اس کا اعتراف کرتا ہوا کہتا ہے ؎

کلاہ گوشہ بخورشید و ماہ می شکنم
بہ این غرور کہ [illegible]
ز نوبہار سخایش چو قطرہ ریزہ شوم
قسم خورد بسہ گلہ [illegible]
بلند بخت سخا [illegible]
کہ در نسیم [illegible] تربیت گلشنم
حقوق تربیت [illegible] در ترقی باد
زبان کجاست کہ در حضرتت فرو خوانم
تو پایۂ سخن مرا بدست می دادی
تو تیغ مدح شدی بحرف دیوانم
توجان ز دخل بجا مصرع مرا دادی
تو در فصاحت دادی خطاب سحبانم
ز دقت تو معنی شدم چنان باریک
کہ می توان بدل مور کرد پنہانم
چو زلف سنبل ابیات می پریشان بود
نداشت طرۂ شیرازہ رشتۂ دیوانم
تو جمع ساختی اوراق بادہ بردۂ من
دگرنہ خار نمی ماند از گلستانم

ظفرخاں نے بھی جابجا صائب کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ اس کا ایک شعر ہے ؎

طرز یاراں پیش احسن بعد ازیں مقبول نیست
تازہ گوئی ہائے او از فیض طبع صائب است

ایک دن ظفرخاں کی مجلس میں ایران کی خاص مصطلحات کا ذکر ہو رہا تھا۔ ایک شخص نے کہا کہ اہل ایران کے بعض محاورات ایسے ہیں جن سے ہندوستانی قطعاً ناواقف ہیں۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ان کے کلام میں محاورات نہیں ملتے۔ اس ضمن میں چند محاورات مثلاً پیش کئے۔ ان میں ایک محاورہ "دیار فروشی" بھی تھا۔ صائب نے کہا کہ ہندوستان کے اکثر شعرا اس کے معنی بھی نہیں جانتے۔ ظفرخاں نے کہا

بیا شمار شعرا میں نہیں بلکہ امرا میں ہے۔ جب میں اس کے معنی اور محل استعمال سے واقف ہوں تو کوئی وجہ نہیں کہ شعرا اس سے بہرہ [illegible]
اپنے اس بیان کے ثبوت میں ظفر خاں نے اپنا یہ شعر پڑھا ؎

بہر کجا کہ روم وصف دوستاں گویم
بر لسانے "یار فروشی" دکاں نمی باید

ظفر خاں نے آج کل کے آٹوگراف کے نمونہ پر ایک عجیب و غریب مرقع تیار کیا تھا جس میں شاعر اپنا منتخب کلام اپنے ہاتھ سے درج کرتا تھا اور اس کے دوسری طرف شاعر کی تصویر ہوتی تھی۔ (مآثر الامرا جلد دوم صفحہ ۷۶۵)

علم دوستی اور سخاوت میں عبدالرحیم خاں خاناں کے بعد دوسرا کوئی امیر ظفر خاں احسن سے بڑھ کر پیدا نہیں ہوا۔ اس کا اپنا دیوان نہایت مختصر ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار سے اس کے مذاقِ سخن کا پتہ چلتا ہے ؎

دلم بہ کوئے تو امیدوار می آید
نگاہ دار کہ روزے بکار می آید

در گوشۂ میخانہ ہمیں گفت و شنید است ———— یاراں برسانید دماغے شب عید است

شادم بہ دل شکستگی خود کہ پیش من
قدر دلِ شکستہ چو زلفِ شکستہ است

گوشۂ چشمے اگر ساقی بمایم ارد بجاست ———— عمرہا در گوشۂ میخانہ خدمت کردہ ام

کلیاتِ احسن کا بہترین نسخہ جو مصنف کے لیے کشمیر میں تیار ہوا تھا بانکی پور کے کتب خانے میں موجود ہے۔

ظفر خاں کی بیوی بزرگ خانم تھی جو ملکہ ممتاز محل کی بڑی بہن ملکہ بانو کی لڑکی تھی۔ ظفر خاں کا لڑکا میرزا محمد طاہر الملقب بہ عنایت خاں آشنا اسی کے بطن سے تھا۔ وہ بھی باپ کی طرح شاعری اور شعراء کا مربی تھا اور نہایت سلجھا ہوا مذاق رکھتا تھا۔ اس نے شعر و شاعری کے چرچوں ہی میں آنکھ کھولی اور یہ فن اسے ترکہ میں ملا۔ ایک دفعہ عالمگیر نے اسے سرمد کے طور طریقے ملاحظہ کرنے پر مامور کیا۔ آشنا اس کی حرکات و سکنات کو سمجھنے سے قاصر رہا۔ اس نے یہ شعر بادشاہ کی خدمت میں روانہ کر دیا ؎

بر سرمد برہنہ کرامات تہمت است
کشفے کہ ظاہر است از و کشف عورت است

اس کے یہ شعر بہت مشہور ہیں ؎

بنشیں بہ گوشۂ اگر آزردۂ ز خلق ———— پائے شکستۂ تو بجائے نرفتہ است
سامانِ دل ز قطع تعلق شود زیاد ———— گل بیشتر دہد چو کنی شاخ را قلم

دولت بوقت تیرہ گہر بخت کج ست

جارو ب وقت شام پریشانی آورد

اس کا دیوان جو قصائد، غزلیات اور مثنویات پر مشتمل ہے، چند سال ہوئے کتب خانوں میں ملتا ہے۔

نظیری، طالب آملی، عرفی شیرازی، نوعی خبوشانی، غزالی مشہدی، کلیم ہمدانی، صائب اصفہانی اور غنی کاشمیری مدت تک کشمیر میں ہمدم اور ہم قلم رہے۔ ان کے باہم مشاعروں میں خیال بندی اور مضمون آفرینی نے ایک نئی شکل اختیار کی جسے عرفیہ شاعری کہتے ہیں۔ شاعری میں ایک روش جسے ہم سبک ہندی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اس میں بعض شاعروں نے تخیل کے زور سے ایسی پیچیدہ باتیں کہنی شروع کر دی تھیں کہ شاعری چیستان بن کر رہ گئی تھی۔ متعدد مضامین بھی خال خال پائے جاتے تھے چنانچہ میر خسرو کا ایک پورا قصیدہ اسی صنعت میں ہے۔ لیکن کلیم، صائب اور غنی کی ہم عصری نے اس طرز کو عروج تک پہنچا دیا اور گویا ایک خاص فن کا درجہ عطا کر دیا۔

مثالیہ شاعری میں شاعر پہلے ایک دعویٰ کرتا ہے جو بظاہر صحیح ہوتا ہے پھر اس کے ثبوت میں کوئی مثال یا دلیل لاتا ہے۔ بعض جگہ دعویٰ اور دلیل دونوں خیالی ہوتے ہیں، وہاں شاعرانہ تخیل زیادہ پایا جاتا ہے۔ یہ طرز بہت مقبول ہوئی اور اس دور کے آخر تک قائم رہی۔ مثال کے طور پر ابوطالب کلیم ایک جگہ دعویٰ اور دلیل یوں لاتا ہے ؎

مرا مسوز که [illegible] ت زکبر با افتد

چوں خس تمام شود شعلہ ہم زپا افتد

(یعنی مجھ کو نہ جلاؤ ورنہ تمہارا غرور خاک میں مل جائے گا۔ خس جب جل چکتا ہے تو شعلہ بھی بجھ جاتا ہے)

دوسری جگہ کہتا ہے ؎

مدعی گر طرف ما نشود عرفۂ اوست   زشت آں بہ کہ بہ آئینہ برابر نشود

مطلب یہ کہ دشمن اگر ہمارا مقابلہ نہ کرے تو اس میں اسی کا فائدہ ہے۔ بدصورت کے حق میں یہی بہتر ہے کہ آئینہ کے سامنے نہ آئے۔

غنی کشمیری ایک لاش سطح آب پر تیرتی دیکھتا ہے۔ اس کا خیال آفریں دماغ اس سے ایک مضمون اخذ کرتا ہے۔ چنانچہ وہ پہلے مصرعہ میں تو یہ دعویٰ کرتا ہے ؎

خرقِ عادت کے بکار آید دل افسردہ را

یعنی خرقِ عادت چیزیں دکھانے سے کوئی شخص اپنا سکہ اہل دل پر نہیں بٹھا سکتا۔ اس کے لیے خود صاحب دل ہونا ضروری ہے۔

دوسرے مصرعہ میں وہ اس کی دلیل یہ پیش کرتا ہے کہ ؎

گر رود بر آب نتواں معتقد شد مردہ را

یعنی مردہ جسم پانی کی سطح پر تیرتا ہے مگر یہ اس کا کوئی اعجاز نہیں اس پر کون ایمان لا سکتا ہے؟

میر حسین دوست سنبھلی تذکرۂ حسینی میں لکھتے ہیں کہ:-

"جب صائب غنی کی ملاقات کے لیے کشمیر آیا تو غنی کا کلام ایک لاکھ اشعار سے زیادہ تھا۔ غنی نے اس کا انتخاب صائب کی خدمت میں پیش کیا جب صائب

نے یہ شعر پڑھا ؎

حسن سبزے بخط سبز مرا کرد اسیر
دام ہمرنگ زمیں بود گرفتار شدم

تو بے اختیار بول اٹھا۔ کاش ایں ہمہ کہ در تمام عمر خود گفتہ ام بہ ایں کشمیری می دادم

وایں یک بیت او بہ من حوالہ می کرد۔"

مرزا صائب نے غنی کے دو سو شعر انتخاب کرکے ایک بیاض مرتب کی جو خان آرزو کے زمانے تک موجود تھی۔

تذکرۂ حسینی میں مذکور ہے کہ ایک روز مرزا صائب کہیں سیر کو گیا ہوا تھا۔ اس کی بیاض غنی کے پاس پڑی تھی۔ ایک عقیدت مند غنی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ بیاض اٹھا کر دیکھنے لگا۔ ایک جگہ شعر کا پہلا مصرع چاقو سے چھیلا ہوا تھا اور دوسرا مصرع اس طرح تھا۔

کہ از لباس تو بوئے کباب می آید

اس نے غنی سے پوچھا کہ اس کا دوسرا مصرع کیا ہونا چاہیے۔ غنی نے بے تامل فرمایا ؎

کدام سوختہ جاں دست زد بہ دامانت
کہ از لباس تو بوئے کباب می آید

اس شخص نے یہ مصرع بیاض میں لکھ دیا۔ جب مرزا صائب واپس آیا اور مصرع دیکھ کر اصل حال سے واقف ہوا تو اس نے کہا "کاش بجائے دیوان یک مصرع نگاشتے و تصنیفش ملا غنی کردے۔"

غنی اگرچہ کشمیر ہی میں پیدا ہوا تھا مگر اس کے دیوان پر اہل زبان کا دھوکا ہوتا ہے۔ اس کا کلام زبان کی خوبی، بندش کی چستی، محاورات کے درست استعمال اور سلیس شستہ پن کی وجہ سے اپنے تمام ہم عصروں سے ممتاز ہے۔ اس کی غزلیں ہموار، متین اور ہر قسم کے سوقیانہ خیالات اور مبتذل مضامین سے پاک ہیں۔ اس کا فلک پیما تخیل اتنی بلندیوں پہ پہنچا ہے کہ عام شعرا اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ صائب[1] اس کی ایک غزل پہ غزل لکھتا اور اس کا نام مقطع میں اس طرح لاتا ہے ؎

ایں جواب آں غزل صائب کہ می گوید غنی
یاد ایامیکہ دیگ شوق ما سر جوش داشت

مگر یہ غزل غنی کے اپنے مطبوعہ دیوان میں شامل نہیں۔

غنی کے خواجہ تاش حاجی محمد اسلم سالم جو ملا محسن فانی کے شاگرد تھے، عنفوان شباب میں کشمیر سے نکل کر ہندوستان آئے اور عالمگیر کے بیٹے شاہزادہ اعظم شاہ کے وابستگان دولت میں شریک ہوئے۔ شہزادہ اعظم شاہ فوت ہو گیا تو سالم نے شاہ عالم کی ملازمت اختیار کر لی جس نے انھیں کشمیر کا وقائع نگار مقرر کر دیا۔ ان کی کلیات غزلیات، رباعیات، مخمسات، قصائد اور مثنویوں پر مشتمل ہے۔

سالم فطرت سے ذوقِ سلیم اور پُر اضطراب دل لے کر آئے تھے اور ایسے شعر کہتے تھے جو دلوں کو بے قرار و بیتاب کر دیتے تھے۔ ان کے کلام میں دقت پسندی، سوز و گداز اور درد و اثر کے ساتھ وہ چیز بھی پائی جاتی ہے جسے درس عبرت اور پیغام

---

[1] صائب نے ۱۰۸۰ھ میں بمقام اصفہان انتقال کیا۔ "صائب وفات یافت" مادۂ تاریخ ہے۔

[illegible] فرماتے ہیں ؎

در شباب و شیب چشم دل ز غفلت وا نشد   گردش ایام گویی جنبش گہوارہ بود

یعنی جوانی گئی، بڑھاپا آیا، پھر بھی دل کی آنکھ غفلت کی نیند سے بیدار نہ ہوئی۔ یوں سمجھیے جیسے گردش ایام گہوارے کی جنبش تھی جو ہمیں پھر سلا رہی تھی۔

اجل دیوانہ شیر و عمر مست جلوہ، می ترسم
صدائے پشنۂ رہرو شیر ما از خواب بردارد

اس شعر میں سالم موت کو ایک دیوانہ شیر اور انسانی زندگی کو مست جلوہ قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مجھے ڈر ہے کہیں رہرو کے پاؤں کی آواز شیر کو خواب سے بیدار نہ کر دے اور سارا بنا بنایا کھیل درہم برہم ہو جائے۔

کشمیر پھولوں کا گھر ہے اور کشمیری عام طور پر پھولوں کے متوالے ہوتے ہیں۔ چونکہ سالم کا خمیر بھی کشمیر کی آب و گل سے اٹھایا گیا ہے اس لیے وہ پھولوں کے سایہ سے بھی محبت کرتے ہیں ؎

دلم بہ سایۂ گل می کشد چو گل سالم
سرشتہ اند بہ آب و ہوائے کشمیرم

غنی کے ہم عصروں میں ایک شاعر محمد اعجاز تھا۔ جس کے شعر کی شہرت ایک طرف گجرات اور دکن اور دوسری طرف شیراز اور اصفہان تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کا یہ مطلع بہت مشہور ہے ؎

کشیدہ ام ز جنوں ساغرے کہ ہوش نماند
دگر معاملہ با پیر مے فروش نماند

اعجاز کے بچپن کا زمانہ تھا۔ ایک دن اسے اپنے والد کے ہمراہ ظفر خاں احسن کی مجلس میں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں مرزا صائب نے ایک غزل پڑھی جس کے ایک شعر کا دوسرا مصرع یہ تھا ؎

جیبے بہ عیب خود نزند میدان نمی رسد

اعجاز نے بے ساختہ کہا کہ "یک بار دیگرے می خواند"۔ مرزا صائب جب اپنے شعر کے اس سقم سے آگاہ ہوئے تو آپ نے اعجاز کو گلے لگایا۔ اعجاز کے دو شعر نمونۃً پیش کئے جاتے ہیں ؎

در پریشاں حالی آخر کار من صورت گرفت
بسکہ مو آمد بہ کلکم خامۂ تصویر شد

در نامۂ زمانہ بجز حرف جنگ نیست   گویا کہ از سیاہیِ لشکر نوشتہ اند

اسی زمانے میں مرزا حسن محمد بیگ رفیع قزوینی ایک خوش گو اور صاحب دیوان شاعر تھا۔ وہ نذر محمد خاں والئے توران کی

ملازمت چھوڑ کر شاہجہاں کے عہد میں ہندوستان آیا اور کشمیر کی دیوانی پر فائز ہوا۔ بادشاہ اس کے کمال پر فریفتہ تھا اور اسے اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا۔ مگر وہ بار بار رخصت لے کر کشمیر چلا جاتا تھا۔ اسی آمد و شد میں عمر گزر گئی۔ چنانچہ اپنے ایک شعر میں اس طرف اشارہ کرتا ہوا کہتا ہے ؎

یک زماں فاصلۂ نیست سفر ہائے مرا
رفتن و آمدن من بہ نفس می ماند

ایک اور شعر اس کا نہایت لاجواب ہے ؎

عمر گر خوش گزرد زندگی خضر کم است | ور بناخوش گزرد نیم نفس بسیار است

ایک ہم عصر کشمیری شاعر نے اس پر اعتراض کیا کہ "ناخوش" نہیں "ناخوشی" ہونا چاہیے۔ چونکہ ناخوشی کے لفظ کے لیے مصرع میں گنجائش نہ تھی۔ اس لیے رفیع نے "بناخوش" کی بجائے "بہ تلخی" کر دیا۔ اس سے وزن تو درست ہو گیا لیکن شعر کا رتبہ گھٹ گیا۔

اورنگ زیب نے اپنے چھٹے سال جلوس (۱۰۷۴ھ) میں کشمیر کی سیاحت کی۔ عید کا جشن بھی وہیں منایا لیکن کچھ راستے کی تکلیف انسانوں اور جانوروں کا تلف اور کچھ اپنے وزیر اعظم فاضل خاں کے انتقال کی خبر سن کر اس کا غنچۂ دل چمنستان کشمیر میں نا شگفتہ ہی رہا اور اس نے آئندہ کشمیر جانا ترک کر دیا۔

اسلام خاں جس کا اصل نام ضیاء الدین تھا، اس زمانے میں کشمیر کا صوبہ دار تھا۔ وہ بڑا متقی، علماء و فضلا کا قدرداں اور خوش گو شاعر تھا۔ یہ شعر اس کے فکر کا نتیجہ ہیں ؎

بے تو شانہ تا بزلف شبگوں می زند | مردم چشمم زگریہ غوطہ در خوں می زند
وحشتے پیدا کن اے صحرا کہ از بیم جنونش | لشکر آہ از دل من خیمہ بیروں می زند

۱۰۸۶ھ میں فاضل خاں کشمیر کی نظامت سے مستعفی ہوا اور ابراہیم خاں تیسری بار اس کی جگہ صوبہ دار مقرر ہو کر کشمیر گیا۔ دونوں کی ملاقات ہوئی سو یہ تک گفتگو ہوتی رہی۔ رخصت کے وقت خواجہ علی اکبر وقائع نگار موجود تھا۔ اس نے فی البدیہہ یہ کہا ؎

عید رمضاں آمد و ماہِ رمضاں رفت
صد شکر کہ ایں آمد و صد حیف کہ آں رفت

ویسے عالمگیر کے عہد میں چونکہ شعرا کی قدردانی اس وسیع پیمانہ پر نہ ہوئی جس پیمانہ پر جہانگیر و شاہجہان کے عہد میں ہوتی تھی۔ اس لیے بہت کم شاعروں کے نام ملتے ہیں۔ پھر بھی ایک ہندی نژاد بزرگ سید محمد زمان راسخ کو کافی شہرت حاصل تھی جو اس عہد میں کشمیر کے شعراء کے سرخیل تھے۔ ہندوستان کے ممتاز ترین شاعر محمد افضل سرخوش باوجود اپنے علو مرتبت کے ہمیشہ راسخ کو اپنا استاد کہتے تھے۔ ان کے چند شعر نمونہ کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں ؎

ز گلگشت چمن بیروں چو آں سرو خراماں شد | کشاد بال بلبل باغ را چاک گریباں شد
خرابی ہائے عاشق بر فروزد رنگ رخسارش | بہ بد نامی نام آتشش ما بادہ داماں شد

جہانِ دیگرم پروانہ ما باید گزیں عالم
چو چشم خفتہ بگذشتم بہ بال آرمید تنہا

یاد چشم سرمہ آلودش زخویشم می برد
می کند طرز رم آہو زخود پنہاں مرا

احمد شاہ ابدالی کے عہد میں ۱۷۵۴ء سے ۱۷۶۲ء تک راجہ سکھ جیون مل کشمیر کا حاکم تھا۔ ابتدا میں وہ بہت بے تعصب، علم دوست اور سخن شناس کا قدردان تھا۔ ہر ہفتہ مشاعرہ کرتا اور خود اس میں شریک ہوتا۔ اس نے محمد علی خاں متین، عبدالوہاب شائق، ملا [illegible]، محمد جان بیگ سامی، ملا محمد توفیق، رحمت اللہ توحید اور حسن راجہ کو اپنے عہد اور گذشتہ زمانوں کی ایک مکمل تاریخ کشمیر منظوم کرنے کے لیے بیش قرار تنخواہیں دے دیں۔ تاریخ کشمیر کے سات حصے کر کے ہر شاعر کو ایک ایک حصہ تقسیم کر دیا اور ایک ایک شعر کے لیے ایک ایک روپیہ انعام کا وعدہ کیا۔ شائق نے سولہ ہزار، ملا توفیق نے دو ہزار، سامی نے ایک ہزار بیت ابھی لکھے تھے کہ راجہ سکھ جیون کا آفتاب اقبال گہنا گیا اور یہ بے نظیر تاریخ نامکمل رہ گئی۔ اس نے سرکشی اختیار کی۔ نورالدین بامزئی کو گوشمالی کے لیے بھیجا گیا۔ اس نے راجہ کو گرفتار کر کے اس کی آنکھیں نکال دیں۔ راجہ خود بھی موزوں طبع تھا۔ اس نے نورالدین بامزئی کے حملہ آور ہونے سے پہلے ایک غزل کہی تھی جو اس واقعہ کی پیشین گوئی ثابت ہوئی ؎

چشم از وضع جہاں پوشیدہ بہ — سربسر احوال آں نادیدہ بہ
سر کہ چوں من داشت جا بر فرق گل — عاقبت در خاک و خوں غلطیدہ بہ
چند روزے خود نمائی کردہ ام — زیں چمن گلہائے عبرت چیدہ بہ
گردی چیرش وبد زہرت عوض — زیں سہ بار جہاں تر سیدہ بہ

باز اگر چشم جہاں بینم دہند
چوں گدایاں در بدر گردیدہ بہ

بینائی جاتی رہنے کے بعد دنیا اس کی نظروں میں بالکل اندھیر ہو گئی اور اس نے اپنے دلی جذبات کا اظہار اس طرح کیا ؎

ہر چند گفتم نفس دنی را — باید نہ کردن نا کردنی را
ایں نفس سرکش نشنید از من — تا دید آخر نا دیدنی را

نورالدین نے راجہ کو بادشاہ کے پاس بھجوا دیا۔ لیکن اس نے بھی اس کے حال پر کوئی التفات نہ کی بلکہ اس کو ہاتھی کے پاؤں میں کچلوا دیا۔ اس کے انجام کے متعلق کسی نے یہ تاریخ کہی ؎

دو ہزار و یک صد و ہفت و دو برنج
سکھ جیون شد تباہ با مال و گنج

راجہ سکھ جیون مل کے معاصر شعرا میں ملا محمد توفیق حدو کا درجہ بہت بلند ہے۔ اس نے دیوان کے علاوہ شیبی، مراثی اور بحر طویل وغیرہ اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ ان اشعار سے اس کے رنگ سخن کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ؎

می سزد فتنۂ دوراں شدنت اے کافر
کہ ترا پشتِ پائی است چہ کاکل بر سر

می شود صد عقدہ گر یک عقدہ افتد در دلم
دانۂ دہقان گردوں را زمین تستم

جبین و چشم و دو ابروئے تو اے گل اندام　　شاخ بادام و دو بادام و دو برگ بادام

کشمیر کے متاخرین میں خواجہ حمید اللہ (وفات ۱۲۴۴ھ/۱۸۲۸ء) اور مرزا مہدی مجرم (وفات ۱۲۷۳ھ/۱۸۵۶ء) خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ اول الذکر اپنے چائے نامہ کی وجہ سے مشہور ہے جو اس نے ظہوری کے ساقی نامہ کے جواب میں تصنیف کیا تھا۔ چند شعر یہ ہیں ؎

ظہوری گر چائے نادیدہ بود　　ازیں وصف در رنج پیچیدہ بود
بدہ ساقیا چائے تاخیر نیست　　بدہ تلخ گر شکر و شیر نیست
اگر جسم ازیں خم شدی جرعہ کش　　غزالی شدے نبض مشار تش
بہ بینی کہ چوں دیگ بق بق زند
تو گوئی کہ منصور انا الحق زند

مہدی مجرم کا نمونہ کلام ان اشعار میں ملاحظہ فرمائیں ؎

خدا سازد ہوا خواہ جاں آں جفا ساز ستمگر را　　ادا و ناز چشم نیم باز غمزہ پرور را
بہ گلشن چوں روم در خاطرم آید سراپایش　　نمی بینم گل و نسرین و شمشاد و صنوبر را

الٰہی ساز روشن از کرم شمع زبانم را
بہ انوار قبولیت منور کن بیانم را
بکار شعر مویم شد سفید اے خاک بر رویم
ازیں گل پاک کن سرچشمۂ طبع روانم را

بیا مجرم از کردہ بیزار شو　　ز حد رفت خواب تو بیدار شو

درد کہ می آید از یار خبر چیزے　　گفت است بگوش او اغیار مگر چیزے
دل گوشہ گرفت اما غم آمد و برجا نشست　　او نیز برد جاں را چوں نیست دگر چیزے
چوں نالہ زباں خیزد ہنگام سحر ہر شب　　ہر گہ کہ نمی بینم زاں مرغ سحر چیزے
خواہم کہ نویسم می توصیف جمال او　　چیزے بسر شک تر از خون جگر چیزے

زاہد ملامت مکن بہ تسلیم و زر بے بودہ
ہرگز نشد حاصل از عقل سلیم چیزے

ایک دن بہ رنگ ترجمانی راجا کاک کشمیر کا ناصر علم دوست تھا جو خود بھی شعر کہتا اور فرخ تخلص کرتا تھا۔ کشمیر میں اس کا دیوان موجود ہے جس میں اس قسم کے شعر پائے جاتے ہیں ۔

بر داشتی ز چہرۂ گلگوں نقاب را ۔۔۔ بے پردہ ساختی بجمال آفتاب را
در تیغ حیات نقش بہ تب مست تو شد ۔۔۔ گشتے کشا بہ حیرت و بنگر تب را

مجلس سجی ہوئی تھی۔ لوگ چبوترہ پر بیٹھے تھے۔ مرزا محرم نوبنے گا رہے تھے۔ راجا کاک نے دیکھا تو کہا مرزا جی آپ پیچھے کیوں بیٹھے ہیں، اوپر آ بیٹھیے۔ مرزا نے برجستہ کہا ۔

مجلس شد ز اہل دل در وجود
ذرہ بر آفتاب و شمس بالا بود

سب نے تحسین و آفرین کے پھول نچھاور کیے۔

جس زمانے میں ادبیات ایران کا آخری تاجدار مرزا حبیب اللہ قاآنی شیرازی (متوفی ۱۲۷۰ھ ۱۸۵۴ء) ایران میں اپنا سکہ جما کر یہ دعویٰ کر رہا تھا کہ ۔

چو من کس از وصال نیابد کسی ۔۔۔ صد سال اگر بکاوی ایران را

انہی دنوں کشمیر میں ایک ایسا فارسی گو شاعر پیدا ہوا جس کی برجستہ گوئی اور فنی قابلیت کو مفتی سعد الدین آزردہ، مرزا غالب، مومن اور صہبائی جیسے نامور شعرا نے بھی مانا۔ یہ خواجہ حسن شعری (المتوفی ۱۲۹۹ھ) تھا۔ خود بھی کہتا ہے ۔

نکتہ پرداز اگر ہست فقیر است امروز
پیش ازیں عہد شنیدم کہ فقیر ہم بودہ است

کشمیر اس کا وطن تھا جس کی بہار کو وہ رشک صد جنت اور خزاں کو رشک صد بہار سمجھتا تھا۔ چنانچہ کہتا ہے ۔

بستہ رنگین بہار کشمیر است ۔۔۔ سوزن لعل و خار کشمیر است
در دماغ جہان نسیم بہار ۔۔۔ از گل مست لالہ زار کشمیر است
رنگ معجز طراز خامۂ صنع ۔۔۔ حرف نقش و نگار کشمیر است
از سواد و بیاض دیدۂ حور ۔۔۔ رنگ نیل و نہار کشمیر است
غم صد سالہ را ز دل بردن ۔۔۔ بیکے جلوہ کار کشمیر است
شاہد حسن را خط مشکیں ۔۔۔ یکے از سبزہ زار کشمیر است
صید عشرت کہ از جہاں رم کرد ۔۔۔ بہ نسیمے شکار کشمیر است

آبِ افسردہ بنائے عالم حسن مایۂ برگ و بار کشمیر است
فکرِ جنت بدل نمی گذرد درجہاں تا دیار کشمیر است

وصفش ای بس کہ میرزا شعریؔ
بلبل نوبہار کشمیر است

ایک دفعہ شعریؔ، امرتسر میں مقیم تھا۔ سردار دیال سنگھ مجیٹھئے کہ شعرا کے قدردان اور خود بھی ذوقِ سخن سے مالا مال تھے۔ اپنے مکان پر ایک بزم مشاعرہ منعقد کی۔ امرتسر کے نازک خیال شاعر مرزا محمد اکبر خاورؔ نے ایک معرکہ خیز غزل پڑھی جس کے مطلع نے ایک کیف پیدا کر دیا ہے

خداوندا مسوزاں از کرم رندِ شرابی را
مروّت نیست در آتش فگندن مرغ آبی را

(اے خدا اپنی کرم نوازی سے کام لے کر رند شرابی کو آتش دوزخ میں نہ جلا۔ پانی میں رہنے والے پرندے کو آگ میں پھینک دینا مروّت کے خلاف ہے)

شعریؔ نے اس پر دو غزلہ پڑھا۔ پہلی غزل تو خاورؔ کے مطلع کا صاف جواب تھی۔ چند شعر یہ ہیں —

بدوزخ چوں سزا ندہد خدا رند شرابی را کہ ہر کس می کند بریاں بآتش مرغ آبی را
مروّت نیست گفتن با خدا شرطِ ادب نبود خطا لازم بود اندیشہائے ناصوابی را

جوابِ اہلِ معنی راہ بندد بر سوالِ اوّل
کہ غایت نیست اظہار سخن حاضر جوابی را

(خدا تعالیٰ رند شرابی کو دوزخ میں ڈال کر سزا کیوں نہ دے جبکہ ہر شخص مرغ آبی کو آگ میں ڈال کر بریاں کرتا ہے۔ خدا سے یہ کہنا کہ یہ مروّت نہیں، ادب کے خلاف ہے۔ جو خیالات نادرست ہوں۔ ان پر سزا لازم آتی ہے)

اپنے دعوے کے مطابق شعریؔ نے اپنی زندگی میں پچاس ہزار سے زیادہ شعر کہے مگر اس کا بہت سا کلام سفر و سیاحت میں ضائع ہو گیا۔ جو کچھ بچا وہ مراۃ الخیال کے نام سے چھپ چکا ہے۔ یہ سوا پانچسو صفحوں کی کتاب غزلوں، رباعیوں، قصیدوں، مثنویوں، قصوں اور تاریخی قطعوں پر مشتمل ہے۔ قصہ چہار درویش بھی نظم کیا ہے جو ساڑھے گیارہ سو شعروں میں پھیلا ہوا ہے۔ مثنوی لعل و گوہر بھی لکھی تھی جو زندگی ہی میں چوری ہو گئی۔

یہ سخت فروگذاشت ہوگی اگر یہاں کشمیری پنڈتوں کی ان سرگرمیوں کا ذکر نہ کیا جائے جو انھوں نے وادی کے اندر اور باہر رہ کر فارسی زبان اور ادب کے سلسلے میں دکھائیں۔ کیونکہ وہ بڑے فخر کے ساتھ پنڈت نرائن کول عاجزؔ[1]، چندر بھان برہمنؔ، لچھمی رام سرورؔ، نرائن داس ضمیرؔ، بھوانی داس کاچرو نکوؔ، راج کول عرض بیگی دیرتیؔ، شنکر جیو آخون گرامیؔ، تابہ رام ترکیؔ اور دوسرے قابل ذکر فرزندوں کا نام پیش کر سکتے ہیں جن کا حال تذکرہ بہار گلشن کشمیر میں موجود ہے۔

---

[1] نرائن کول عاجزؔ نے ۱۱۲۲ھ میں عارف خاں حاکم کشمیر کی فرمائش پر تاریخ کشمیر لکھی جس میں واقعات کو دلچسپ کہانی کے رنگ میں بیان کیا گیا ہے۔

خواجہ پنڈت چندر بھان برہمن علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی کا شاگرد تھا۔ اس نے شاہجہان اور اورنگ زیب کے عہد میں ناموری حاصل کی۔ شاہجہان نے اسے اپنا وقائع نویس مقرر کیا۔ اس کے علاوہ یہ خدمت بھی اس کے سپرد ہوئی کہ وہ بادشاہ کے سیر و سفر کا روزنامچہ مرتب کرے۔ اسے ایک ہاتھی دیا گیا تھا جس پر سوار ہو کر وہ شاہجہان کے جلوس میں نکلتا تھا۔ ۹ اپریل ۱۶۵۶ء کو اسے رائے کے خطاب سے نوازا گیا۔ اس کے بعد وہ دارا شکوہ کے ملازمین میں شامل ہوا اور آخر اورنگ زیب کے پاس آ گیا۔ اس کی تخت نشینی (۱۰۶۹ھ) کے کچھ سال بعد فوت ہوا۔

دیوان کے علاوہ منشآت برہمن اور کتاب چہار چمن اس کی یادگار ہیں۔ برہمن کا کلام صوفیانہ ہے۔ اس کے بعض اشعار صائب نے اپنی بیاض میں نقل کئے تھے۔ یہ اس کے کمال کا اعتراف ہے۔ ڈاکٹر اقبال حسین نے ثابت کیا ہے کہ چندر بھان نے ولی دکنی سے پہلے شمالی ہندوستان میں اردو غزل لکھی۔[۱] فارسی مثنوی کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

شہ ماہ نماز سجدے ساخت — کہ فرقش بدین طرح نوازند
ز رفعت آسمان یک پایۂ او — مہ و خورشید زیر سایۂ او
رو تش قبلۂ اہل یقین است — تو گوئی مسجد اقصیٰ جبیں است
فضایش سجدہ گاہ خاص و عام است — بہ ما مسجد بیت الحرام است

فلک گردد بہ گرد آستانش
بود خیل ملائک پاسبانش

آزاد خاں حاکم کشمیر کے عہد میں پنڈت آفتاب بھان توتا ایک خوش فکر شاعر تھا۔ اس کا نمونۂ کلام یہ ہے ؎

مدعائے ہر دو عالم یافتم — جان جان و ذات آدم یافتم
جان جاں را دیدہ ام در جان خود — من ہمہ دریا و دریں غم یافتم
در مکان خلد ہم آرام نیست — لامکاں را صحنے بے غم یافتم
جان جان خویشتن در خویشتن — از دل و جان ناگزشتم یافتم

بحر وحدت را درون خود ذکا
کوزۂ تن تا شکستم یافتم

پنڈت ست رام بقا یا بقا کھنہ کدل سرینگر کے رہنے والے تھے۔ ساٹھ سال کی عمر پا کر شیخ امام الدین حاکم کشمیر کے عہد میں فوت ہوئے۔ وہ کس خوبصورتی سے اپنے خیالات و جذبات کا اظہار کرتے تھے۔ اس کا اندازہ ان دو شعروں سے لگائیے ؎

قسم بجان تو بیمارم و نخواہم زیست
طبیب آمد و نبض مرا گرفت و گذاشت

تا پردہ بر فشاد ازاں رو بہ یک طرف — یک سو پرید رنگ ز گل بو بہ یک طرف

۱؎ اسلامک کلچر حیدرآباد دکن بابت اپریل ۱۹۴۵ء صفحہ ۱۱۱

پنڈت بھی رام بہ قدر افسر نواب شجاع الدولہ کے آخری عہد میں تھا۔ آصف الدولہ کے ابتدائی عہد میں کشمیر سے نکل کر سرپرائے اودھ میں آئے اور سعادت علی خاں کے عہد حکومت میں فوت ہوئے۔ کچھ عرصہ دہلی میں بھی چلے گئے تھے۔ صاحب دیوان تھے جس میں تین سو غزلیں، دو ایک ترجیع بند، ایک مثنوی اور ایک قصیدہ ہے۔ قصیدہ اور مثنوی حبیب اللہ خاں کی شان میں ہیں۔ غزلوں میں عاشقانہ اور رندانہ مضامین زیادہ ہیں۔ عرفانی مضامین اور بلیغ ترکیبوں سے عام طور پر پرہیز کیا ہے چونکہ عمر کا بڑا حصہ مصیبت میں گزرا، اس لیے کلام میں ایک قسم کا درد بھی ہے۔ ایک غزل کے چند اشعار یہ ہیں ؎

بہ چشم مردم بینا حق است ہر دلیل ما   بحث از غلاف کہنہ چہ تیغ اصیل ما
ناصح خوش گوش فرامش و درپیست   رہ در حریم خلوت من نیست وکیل ما

مفروش جلوہ زاہد خشک از ارم برو
عاشق بچشم تر نخورد سلسبیل ما

پنڈت دیا رام کاچرو خوشدل عطا محمد خاں حاکم کشمیر کے عہد میں ہوئے ہیں۔ ۸۰ برس کی عمر میں وفات پائی۔ رعناواڑی سرینگر میں رہتے تھے۔ ان کے اشعار سے خود قائل کریں کہ ان کا درجہ فارسی شاعری میں کیا ہے ؎

می چکد وقت خزاں نالہ کند فصل بہار   شورش بلبل شوریدہ نوا عشق است
غنچہ را گل شدہ ہر خار دگر بست سر بند   وانشد غنچۂ دل بود ز پیوند عشق است

———

آنکہ از خاطر من گرد کدورت می شست   از سر لطف و نوازش عرق روئے تو بود
آنکہ از جوہر خود طعنہ ہمی زد بر تیغ   آیت فتح و ظفر آں خم ابروئے تو بود

———

آمد بہار و واشد گل می وزد نسیم
وقت است اے صبا کہ تماشا کند کسے

———

دستے چمن در باغ لطف ناز خندہ ام   یک دست تو تا لازم و دگر دست تو جام

———

پنڈت تابہ نام ترکی نے مہاراجہ رنجیت سنگھ اور محمد عظیم خاں حاکم کشمیر کی جنگ کے حال میں جنگ نامہ لکھ کر شہرت حاصل کی۔ وہ بھی رعناواڑی سرینگر کا رہنے والا تھا۔ ۷۱ برس کی عمر پاکر مہاراجہ گلاب سنگھ کے عہد میں فوت ہوا۔ اس کے جنگ نامہ کا خاتمہ اس مناجات پر ہوتا ہے ؎

خدایا دلم را بہ زاری بسوز   نہ شد گرم ہنگامہ سوزشے
زمہر تو بر سینہ داغے نہ سوخت   دلم را بہ بالین چراغے نہ سوخت

ز عشقِ زینب به گمرہی زینبے | به شمعِ [illegible] کردہ سوزِ حیرانیے
به گلزارِ حرم بہارے نماند | به [illegible] زفغانِ ما [illegible] نماند
ہمہ خرمیِ عمر بر باد رفت | مرا [illegible] از یاد رفت
عقوبت [illegible] الغیاث [illegible] است | مرا [illegible] زمانہ [illegible] است
خدایا توئی خلق را چارہ ساز | ندارد [illegible]
به درگاہِ تو نا امیدی کجاست | کرامت [illegible] کجاست
کرم [illegible] | به بخشائے احوال [illegible]

زمخانۂ عشق درد آشنا
[illegible]

پنڈت بھوانی داس کاچرو، ٹیکو اور پنڈت راج کول حرص بیگی دیوی کی مشہور شاعر ہوئے ہیں جنھوں نے فارسی ادب میں اپنی یادگاریں چھوڑی ہیں۔ ان میں ایک افغانوں کی حکومت میں [illegible] دور [illegible] سکھوں کے عہد میں [illegible] درباری [illegible] شاعروں میں شامل ہوتے رہتے ہیں۔ اس کی بحرِ طویل یادگار ہے۔ نمونہ کے دو شعر یہ ہیں:

ہر پارہ دل بسینہ جداگانہ سوختیم
جستیم [illegible] صد جواہر [illegible] یک خانہ سوختیم
نے آشنائے ماندہ کسے نے ز یار [illegible]
زیں باغ [illegible] بیگانہ سوختیم

ویری کی محبتوں میں ایران کے سیاح کشمیر میں فرحت محسوس کرتے رہے ہیں۔

کشمیر کی فارسی شاعری جذباتِ لطیفہ کی منہ بولتی تصویر ہے۔ فارسی کشمیر کے نرم و شیریں نغموں اور ایرانیوں کا حسنِ بیان کشمیر کی وادیوں میں آ کر دو آتشہ بن گیا۔ فارسی کو [illegible] اور [illegible] نے کہا ہے لیکن [illegible] بھی ہے کہ وہ [illegible] حوالے [illegible] وصل جاتی ہے۔ کشمیر میں بھی ایسا ہی ہوا۔ یہاں کے شعرا نے ایرانی شعر کی سی بولیاں بولنی شروع کر دیں اور چونکہ [illegible] مناظر نے ان کے ذہن پر نہایت گہرا اثر کر رکھا تھا اس لیے ان کے تاثرات میں حقیقت، اصلیت اور سادگی بھی پیدا ہو گئی۔

موسمِ بہار میں ہر چیز نئی زندگی پاتی ہے۔ بید مجنوں کا درخت خزاں کی وحشت بردست بالکل ٹنڈ منڈ ہو جاتا ہے۔ لیکن بہار شروع ہوتے ہی اس میں تازہ کونپلیں پھوٹتی ہیں جو جذبہ ہی دلوں میں خنجر نما بتوں کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ غنی نے انھیں دیکھا ہے اور یہ مضمون پیدا کرتا ہے:

بمجنوں شکست بید کہ در موسمِ بہار
خونش بجوش آمد و خنجر بجوز کشد

غنی ایک خوبصورت پھول دیکھتا ہے۔ اس کا بلند پرواز تخیل سے ہی دلآویز ہوئے سماں اس کے سامنے آتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ پھول کی رعنائی ہے جو اسے زمین سے اوپر اٹھا رہی ہے مگر قدرت کا زبردست ہاتھ اسے قید و بند میں ڈال رہا ہے تاکہ اس کی بلند پروازی رک جائے۔ غنی اس منظر کو کتنے دلکش الفاظ میں پیش کرتا ہے ؎

ز شوخی بس که در پرواز هست عطر قفس گل را
چو بلبل می توان کردن ز شاخ در قفس گل را

بعض نقاد کشمیر کی فارسی شاعری میں حافظ اور نظیری کے سے جذبات عالیہ کی جھلک نہیں پاتے۔ مگر ابھی غنی کے سوا کشمیر کے بہت سے دیگر شعرا کا کلام طبع ہی نہیں ہوا۔ لہٰذا یہ رائے قبل از وقت ہے۔ ناقد کو اپنی رائے دینے میں بے باک تو ہونا چاہیے مگر اسے کوئی ایسی بات نہیں کہنی چاہیے جس کا وجود نہ ہو۔ یہ درست ہے کہ بقول غنی کاشمیری ؎

شعر اگر اعجاز باشد بے بلند و پست نیست
در ید بیضا همه انگشتها یکدست نیست

مگر کشمیر کی فارسی شاعری میں ایسا کلام موجود ہے جو سننے والوں کو مسحور و مسرور کرنے کی قوت رکھتا ہے۔ جو تنقید کے معیار پر پورا اترتا ہے۔ جس میں خلوص اور تاثیر ہے اور جس میں کہنے والا اپنے دل کی بات دوسروں تک پہنچانے میں ہر طرح کامیاب رہا ہے۔ کشمیری شاعری ان جمالات کا ایک زبردست مرقع ہے جو شاعر اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور دل سے محسوس کرتے ہیں۔ وہ ایرانی لباس میں کشمیر کے دلفریب حسن کو کچھ ایسے انداز میں پیش کرتے ہیں کہ دیکھنے والے جی تھام کر رہ جاتے ہیں۔

علاوہ ازیں علم الاخلاق کی تعلیم، فلسفیانہ نکتوں کا حل، تاریخی روایات، حکما و بزرگوں کے جوہر، مذہبی مسائل کی تفسیر، حسن و عشق کی داستانیں، ہجر و وصال کے قصے، تمثیل نگاری اور منظر آرائی بھی کشمیری شاعری کی جان ہیں۔ حقیقت میں کشمیر ہی وہ موزوں مقام ہے جہاں بیٹھ کر زندگی اور موت کے فلسفے پر بہترین طریقے سے غور کیا جا سکتا ہے جہاں رہ کر انسان مرتاض بننا سیکھتا اور پوری توجہ کے ساتھ عبادت الٰہی میں مستغرق رہ سکتا ہے۔ غنی زاہد ظاہر پرست کو دیکھتا ہے۔ اس کی ظاہری ٹیپ ٹاپ پر ایک غائر نظر ڈالتا ہے تو اسے قوت تخیل کی بدولت زاہد کی ہر حرکت تو محراب نظر آتی ہے۔ خاص کر اس کا عمامہ اس کی شاعری کے لیے نیا مضمون پیش کرتا ہے اور وہ کہتا ہے ؎

تا شود قبرش زیارت گاه ارباب وفا   خویش را زاهد بزیر گنبد دستار کشت

ایک کشمیری اور غیر کشمیری شاعر میں سب سے بڑا فرق یہی ہے کہ کشمیری شاعر تمام کیفیتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر ان کی ترجمانی کرتا ہے۔ برخلاف اس کے غیر کشمیری شاعر سنی سنائی باتوں پر یقین کر کے خیالی داستانیں گھڑ لیتا ہے۔ لیکن ؎

شنیده کے بود مانند دیده

مثال کے طور پر کشمیر چنار اور سرو کا گھر ہے۔ خزاں کے موسم میں چنار کے پتے بالکل سرخ ہو کر اس طرح دکھائی دیتے ہیں جیسے آگ کے انگارے دہک رہے ہوں۔ سرو کے درخت کو انسان کے قد سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ بلبل کا گھونسلہ پیالے سے مشابہت رکھتا ہے۔ غنی ان تمام چیزوں سے ایک اچھوتا مضمون اخذ کرتا ہے ؎

تا کند دریوزهٔ آتش به گلشن از چنار   کاسه بر کف هست سرو از آشیان بلبلان

یعنی سرو کے درخت پر بلبل کا گھونسلہ گویا بینک کا بیلنس ہے جو ضرورت کے وقت مانگنے کے لئے دبا کر رکھا ہے۔

دنیا کا عام قاعدہ ہے کہ زبردست زیردست کو ستاتا ہے لیکن ظلم و ستم کے باوجود جو سکون خاطر دراصل ان قلب مزدور کو نصیب ہوتا ہے اس سے زبردست کا دل ہمیشہ خالی رہتا ہے۔ غنی یہی چیز دیکھ کر کہتا ہے ؎

زبردست اضطراب و زیردست آسودگی دارد

دو شاہد بر کلام من دو سنگ آسیا باشد

یعنی زبردست ہمیشہ مضطرب اور کمزور ہمیشہ مطمئن رہتا ہے۔ میرے اس دعوے پر چکی کے دونوں پاٹ گواہ ہیں۔

یہ ضروری نہیں کہ کشمیری شعراء کے تمام نظریے اور استدلال منطقیانہ ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان کی بعض تمثیلات محض شاعرانہ اور خیالی ہوں جنہیں اصلیت سے کوئی واسطہ نہ ہو مگر اس کے باوجود وہ اپنے اندر اتنی کشش ضرور رکھتی ہیں کہ سننے والا مسحور ہو کر رہ جاتا ہے اور دیر تک مزے لیتا رہتا ہے۔

غرض زبان کی شستگی و شیرینی، طرز بیان میں جدت و دلنشینی، ترجمانی جذبات کی نزاکت، نفسیاتی خیالات کی ہمہ گیری و بلندی، نئے نئے مضامین کی تلاش میں موزونی، استعارات و تشبیہات کی برجستگی و ندرت اور اس قسم کے تمام دیگر محاسن جو کسی فارغ البال اور خوشحال ملک کی شاعری سے تعلق رکھتے ہیں کشمیر کی فارسی شاعری میں بدرجہ اتم موجود ہیں اور غنی، ساطع، محسن فانی اور مرزا انجم کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔

ایک زمانہ تھا کہ دنیا ان شعراء کی عظمت و فضیلت کو تسلیم کرتی اور شاہان وقت ان پر انعام و اکرام کا مینہ برسا کر اپنی معارف پروری اور جوہر شناسی کا ثبوت دیتے تھے۔ مگر افسوس کہ وہ زمانہ خواب و خیال ہو گیا۔ آج ان کی علمی یادگاروں کو پوچھنے والا کوئی نہیں۔ ستم ان کے گرانمایہ ادبی شاہکار لوگوں کی بے توجہی اور سرد مہری کا شکار ہو کر کیڑے مکوڑوں کی غذا بن رہے ہیں اور وہ دن دور نہیں جب یہ گوہر ہائے شب چراغ ہمیشہ کے لیے ہماری نظروں سے اوجھل ہو جائیں گے اور کوئی ان کا سراغ تک نہ لگا سکے گا۔ کاش کشمیر کے علم دوست حضرات اب بھی اپنے جواہرات کی قدر کریں، اپنے بزرگوں کی نادر و نایاب کتابوں کو جہاں بھی ہوں گوشہ گمنامی سے نکال کر ان کی طباعت و اشاعت کا اہتمام کریں اور انہیں تباہ و برباد ہونے سے بچا کر خود بھی فائدہ اٹھائیں اور آئندہ نسلوں کو بھی استفادہ کا موقع دیں ؎

بیکار پڑا ہے ترا سامان تجلی

اے وادیٔ ایمن کوئی موسیٰ نہیں اٹھتا

لوگوں کا عام بگڑا ہوا مذاق دیکھ کر اس تحریک کو پیش کرتے ہوئے ڈر تو لگتا ہے مگر خیال ہے کہ شاید کوئی ایسا صاحب نظر جوہری پیدا ہو جائے جو ان منتشر مگر قیمتی اور شاندار موتیوں کو جن سے دوسری قومیں دولت سرمدی حاصل کرتی ہیں اور انہیں محفوظ رکھنا اپنے لیے سرمایہ حیات سمجھتی ہیں، خاک سے اٹھا کر لڑیوں میں پروئے اور اپنے طرۂ افتخار کی زینت بنائے۔

تاریخ گوئی کے متنازعہ مسائل

(مخمس تسلیم کی روشنی میں)

کسریٰ منہاس

منشی ابو حسین تسلیم سہسوانی شیخ علی بخش بیمار کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ حضرت بیمار روہی بزرگ ہیں جن کو نواب محمد سعید خاں والی رامپور نے ہندوستان خیال کو اردو نظم کا جامہ پہنانے پر مامور کیا تھا اور انھوں نے اس کے کچھ حصوں کا ترجمہ بھی کیا تھا کئی دیوان انھوں نے یادگار چھوڑے۔ فن اور متعلقات فن سے باخبر تھے۔ حضرت تسلیم نے اسی فاضل ادیب سے فن تاریخ میں صدری اکتساب علم فن کیا اور اپنی محنت اور مشق سے اساتذۂ وقت میں شمار ہونے لگے۔

تسلیم کے شعری سرمایہ میں مثنوی سعدین - نگارشہ پریس لکھنؤ سے طبع ہو چکی ہے۔ ان کی غزلوں کا دیوان ہنوز غیر مطبوعہ ہے البتہ فن تاریخ گوئی کے متعلق ان کی دو کتابیں "مخمس تسلیم" اور "عدد انساب تاریخ" نیر اعظم پریس مراد آباد سے شائع ہو چکی ہیں۔ ان دونوں کتابوں کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ تسلیم تحقیق و جستجو کے دلدادہ تھے۔ فارسی عربی کی قدیم شعری روایات سے انھیں پوری واقفیت حاصل تھی۔ ان کی شخصیت جامع کمالات تھی۔ نظم ہو یا نثر دونوں میں ان کا قلم رکتا ہوا نہیں دیکھا گیا۔ علم و ادب کے تقریباً ہر شعبہ سے باخبر تھے لیکن تاریخ گوئی کا خاص ملکہ ان میں ودیعت تھا اور اسی خاص جوہر کی وجہ سے دنیائے ادب میں ان کا نام آج تک زندہ ہے اور ہر دور کا مورخ ان کے اس کارنامے کو عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔

"مخمس تسلیم" ان کی گہری واقفیت اور زندگی بھر کی ادبی ریاضت کا ثمر ہے جس میں انھوں نے تاریخ گوئی کے کلی قواعد سے بحث کی ہے۔ اس فن کے تمام مختلف فیہ مسائل کو علمی و عملی دونوں نقطۂ نگاہ سے دیکھا ہے۔ علمی بحث کے ساتھ ساتھ اساتذۂ متقدمین کے نظائر بھی پیش نظر رکھے ہیں جس سے کتاب کی افادیت بہت بڑھ گئی ہے۔

تسلیم نے مخمس تسلیم (۱۳۰۰) ہجری میں ختم کی چنانچہ مخمس کے صفحہ چھ پر فرماتے ہیں "بچوں آغاز کتاب لباس خاتمہ پوشید مخمس تسلیم ۱۳۰۰ھ" مخمس تسلیم اس کا تاریخی نام ہے۔ یہ کتاب ۱۳۱۴ھ میں شائع ہوئی۔ حضرت جلال نے سال اشاعت تحریر فرمایا ہے

جلال از سال طبع وے خبر دار
کتاب بے بدل بے مثل و نادر (۱۳۱۴ھ)

مخمس سے پہلے تاریخ گوئی کے موضوع پر دو کتابیں چھپ چکی تھیں۔ پہلی کتاب بعنوان تاریخ جو سید محمد علی تمنا مرادآبادی کی تصنیف تھی

یہ کتاب ۱۲۹۲ھ میں طبع ہوئی۔ دوسری کتاب "افادۂ تاریخ" جس کے مؤلف ملک کے باکمال استاد میر ضامن علی جلال لکھنوی تھے۔ یہ کتاب ۱۳۰۱ھ میں طبع ہوئی۔ مصنف جلال کے افادۂ تاریخ کو کافی شہرت حاصل ہے کیونکہ تاریخ گوئی کا کوئی پہلو اور کوئی مسئلہ بالاستیعاب نہیں ہوا تھا اس لیے جتنی بھی رہنمائی دونوں کے سبب یہی ملجا و ماویٰ تھا۔ حیا بان تاریخ میں تو تاریخ گوئی کے قواعد کے علاوہ حضرت جلال نے اپنی بھی بعض اچھی تاریخوں سے ملک کو روشناس کرایا ہے۔ ان کے تلاش کیے ہوئے شواہد سے بڑا علم ہوتا ہے اور رسالہ بھی علم کا مخزن ہے ماخوذ ہے انہوں نے اصل واقعہ کے مضمون کے مطابق بولے یا الفاظ کی جستجو بھی فرمائی ہے اس لیے ان کی یہ کاوش بہ عجیب معلوم ہوتی ہے اور اس کی حسن سے ان کے مذاق صحیح کی آئینہ داری بھی ہوتی ہے۔ یہ کتاب ۱۰۴ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس کتاب میں ہمزہ کے اعداد کے متعلق جو مسلک اختیار کیا گیا ہے اس پر آگے چل کر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مختصر یہ کہ ان دونوں کتابوں کے بعد طبع ہوئی اس لیے حضرت تسلیم نے ان تمام مختلف فیہ مسائل سے بحث کی ہے جو ان کتابوں میں ان کے زیر غور رہتے۔

قواعد تاریخ گوئی میں مختلف فیہ مسائل کی بحث بڑی اہم ہے کیونکہ یہ ایک بنیادی بحث ہے اس لیے محض میں حضرت تسلیم نے اس کا مدلل اور دلکش انداز میں اپنے نقطۂ نظر کی ترجمانی کی ہے۔ تاریخ گوئی کے ان کٹھن راستوں پر ایک قابل اعتماد راہ نما کی طرح قیادت فرمائی ہے۔ فنی پہلوؤں کو بڑی جانکدستی سے اجاگر کیا ہے۔ اپنے موقف کی توضیح ہی نہیں بلکہ فیصلہ کن نتائج سے روشناس بھی کرایا ہے جس سے ان کی ریاضت محنت اور ادبی شغف کا اندازہ ہوتا ہے۔ حضرت نے اپنی کتاب میں ذیل کے پیچیدہ و مختلف فیہ مسائل پر اظہار خیال کیا ہے۔

(۱) الف ممدودہ

"الف ممدودہ در جمیع لغات و قواعد فارسی در بیان حروف تہجی فصل الف ممدودہ و الف مقصورہ موجود۔ ذکر ہمزہ نیست۔ بعض کاملان عیار الف ممدودہ را دو الف قرار دادہ اند و دو عدد گرفتہ اند و نیز مذہب اہل لغت ہمین است۔ بر تقدیر الف ممدودہ بخوانیم دو را نباشد چون الف آمدن و آموختن و آمیختن ہرگاہ یائے زائدہ و نون نفی و میم نہی قبل صیغہائی مضارع و امر و نہی در آید تحریک از دو یا بدل شود و ساکن بحال خویش ماند چنانکہ بیاید و نیاید و بیاموخت ہمچنین در دیگر مشتقات اصل این۔ آمد۔ آورد۔ آموخت۔ آمیخت بود۔ کوکب کاشانی و محقق اصفہانی بر آن مستند یک ہمزۂ کہ حکم دو الف دارد در اول کلمات مے آید۔ چنانچہ آہنگ و آفتاب و آباد و آزاد و آقا و آستر۔"

(محض تسلیم صفحہ ۳۴-۳۵)

اس بحث کے دوران میں اکثر اساتذہ کی کہی ہوئی تاریخوں سے استناد کیا ہے۔

بہر تاریخ قرآن کرد رقم کلک کلیم
مہدیؑ شید بسہ منزل بلقیس آمد (۱۰۴۳ھ)

شیخ نظام الدین مصنف مجمع الصنائع نے اپنے والد محمد صالح کا تاریخی مصرع قصیدہ تاریخی میں "مثنوی آرام جان" سے لیا ہے جس سے ایک ہزار چھپن سال پیدا ہوتے ہیں۔ الف ممدودہ کے دو عدد لیے ہیں ؎

بجد و جہد رام آرام جاں یافت (۱۰۵۶ھ)

ملک الشعرا قدسی کہ اکابر شعرائے بزرگ سے تھا۔ مثنوی نرگس داں بمقام صفت لفظ "آل احمد" کو دو الف سے لکھا ہے۔

زباں بگفتا و بارانِ آبِ گوہر — بشویم تا برم نامِ پیمبر
محمد رحمۃ للعالمین است — شفیعِ جرمِ بدکاراں ہمیں است
محمد با اہلِ زماں نو ہماں است — محمد گوئی از روزِ اماں است
عدو شاہد برد ... ب بو فساں — ز جز حُبِّ محمد نیست ایماں
نبی ... یعنی محمد — بحقِ واجبِ مصطفیٰ آلِ احمد
۹۲ ۹۲ ۸۵ ۸۵

ہر دو تاریخوں میں آمد کو (آامد) آرام کو (اارام) آل کو (اال) دو الف سے کتابت کیا ہے اور الف ممدودہ کے دو الف محسوب ہوتے ہیں۔

حضرت تسلیم نے چند ایسی مثالیں بھی پیش کی ہیں جن میں الف ممدودہ کا ایک عدد لیا ہے ۔ ع

تاریخ آں مقارنہ کردم سوال گفت
ماہ عجب رسید بپابوسِ آفتاب
۹۵۲
(ملا محتشم)

یہاں آفتاب میں الف ممدودہ کا ایک عدد لیا گیا ہے۔

ع — زہے زر شاہ جہاں بادشاہ ملک آرای
پدید آمد زر شاہ از صد عیاں (سنجر طہرانی)

اس شعر کے متعلق تسلیم فرماتے ہیں:۔

"عدد آرای و آر یک یک گرفتہ من ہم ہا پنہ قاعدہ مروجہ سر نہادہ ام" (ملخص صفحہ ۴۷)

حضرت تسلیم کے نزدیک الف ممدودہ کے دو عدد لینا تاریخ گوئی کے قواعد کے عین مطابق ہے جنھوں نے الف ممدودہ کا ایک عدد لیا ہے حضرت تسلیم نے انھیں نہایت سخت الفاظ سے مخاطب کیا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"الف ممدودہ دو الف است۔ اندریں صورت گرفتن دو عدد می باید۔ اما چہ تواں کرد کہ بمقابلہ گروہی صد ہزار کاذب قول یک صادق باور نمی شود۔ ہمہ یک یک گرفتہ اند۔ حق ایں است کہ عامہ خلائق کہ نا آشنا ست قواعد و فن تاریخ بودند۔ امتیاز الف ممدودہ و مقصورہ را وسعت ندادند۔ دو راہ پاکوفتہ اہینانہ رفتند بلکہ خوشش بر گردن خود گرفتند" (ملخص ۴۷)

صاحبِ غرائب الجمل فرماتے ہیں:۔

"صاحبِ ملخص تسلیم کا اصرار ہے کہ الف ممدودہ کے عدد دو ہی محسوب ہوں اور مرزا محمد جعفر اوج نے بھی اپنی تالیف "ارمغان" میں اسی کے ساتھ اتفاق فرمایا ہے" (غرائب صفحہ ۸۴)

دوسری جگہ پھر فرماتے ہیں:۔

"صاحبِ ملخص تسلیم نے اپنی رائے کے خلاف عمل کرنے والے استادوں کو بہت برا بھلا کہا ہے اور سخت سست

اعلانات میں ان کو یاد کیا ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی فرمایا ہے کہ ہماری تاریخوں میں الف ممدودہ کے دو عدد محسوب ہو سکیں گے۔

(خواتیم الجمل صفحہ ۸۵)

مندرجہ تسلیم کے مذکورہ اقتباسات اور علامہ مرحوم جنگ آقا صاحب خواتیم الجمل کی رائے کی روشنی میں حضرت تسلیم کا مشرب صاف ہے وہ الف ممدودہ کے دو عدد لینے کے حق میں ہیں اور جن مؤرخین نے الف ممدودہ کا ایک عدد لیا ہے وہ ان کے نزدیک قابلِ گرفت ہیں۔

الف ممدودہ کتابت میں ایک الف سے مکتوب ہوتا ہے اس لیے اس کا ایک ہی عدد دینا چاہیے۔ حضرت جلال لکھنوی کا بھی یہی مسلک ہے۔ حضرت امیر مینائی لکھنوی مرحوم نے بھی امیر اللغات میں ایسے الف کا ایک ہی عدد لینے کی تلقین کی ہے۔ مد ہمزہ اور الف ہمزہ کی آواز ظاہر کرنے کی علامتیں ہیں۔ حروف ابجد جو تعداد میں اٹھائیس ہیں ان میں ان کا شمار نہیں اس لیے ثقہ مؤرخین نے ان کا کبھی کوئی عدد نہیں لیا۔

تاریخ گوئی میں مکتوبی حروف کے عدد لیے جاتے ہیں۔ اگرچہ وہ غیر ملفوظی کیوں نہ ہوں مثلاً خوش میں واؤ معدولہ غیر ملفوظ ہے۔ لیکن مورخ اس کے چھ عدد لیں گے۔ مفرح میں رے مشدد ہے۔ وہ دو مرتبہ بولی جاتی ہے لیکن عدد ایک ہی رے کے شمار میں آئیں گے۔ اب اور آب ہم عدد ہیں۔ اگر مد کا ایک عدد لینا درست ہے تو حرکاتِ ثلاثہ اور جزم نے آخر کیا قصور کیا ہے کہ ان کو غیر محسوب چھوڑ دیا جائے۔ جمہور مورخین کا اس پر اتفاق ہے کہ الف ممدودہ کا ایک ہی عدد لینا چاہیے۔ اکثر ثقات فنِ تاریخ متفق ہیں اور الف ممدودہ کے دو عدد لینے کا رواج اب نہیں رہا۔

(۲) تائے مدورہ

تاریخ گوئی میں مختلف فیہ مسائل میں دوسرا اہم مسئلہ تائے مدورہ کے اعداد کی بحث کا ہے۔ تائے مدورہ کے عدد اساتذہ نے کبھی چار سو لیے ہیں اور کبھی پانچ۔ اس بحث میں حضرت تسلیم نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے اظہارِ خیال کیا ہے جس کے اہم حصے ہم ذیل میں فارسی سے ترجمہ کر کے پیش کرتے ہیں:۔

"تائے فوقانی عربی میں آٹھ صورتوں میں آتی ہے جن میں سے دو کے متعلق تحریر ہے۔ ایک تائے تانیث جو اواخر اسما میں آتی ہے خواہ منصرف ہو یا غیر منصرف اور بحالتِ وقف ہا پڑھی جاتی ہے جیسے ضاربۃٌ۔ مضروبۃٌ۔ روضۃٌ۔ روحۃٌ۔ فاسقۃٌ۔ مستورۃٌ۔ دوم تائے وحدت جیسے تمرۃٌ (ایک چھوارا) حمامۃٌ (ایک کبوتر)۔

"تائے مصدری بعض مصادر کے آخر میں آتی ہے جیسے رحمت۔ نعمت۔ عشرت۔ قناعت (از ہفت قلزم) صاحب غیاث لکھتے ہیں۔ "تائے مصدریہ ضاربۃٌ مضروبۃٌ۔ رحمۃٌ۔ قناعت و غفلت۔ واضح ہو کہ عربی میں رسم الخط تائے فوقانی کی تین قسمیں ہیں۔ اول تائے دراز جو جمع میں بعد الف کے آتی ہے جیسے کائنات۔ آیات۔ صفات۔ کرامات اور بعض اسماء میں بھی دراز ہوتی ہے جیسے تائے تبت اور دست بہ فتح سین مہملہ بمعنی دشت۔ جرأت کہ آخر افعالِ عربی میں آتی ہے وہ بھی دراز ہوتی ہے جیسے ضربت۔ قالت۔ کتبت۔ فعلت۔ دوم تائے مدورہ مفردہ وہ پانچ حروف کے بعد آتی ہے۔ دال مہملہ۔ ذال معجمہ۔ رائے مہملہ۔ زائے معجمہ۔ واؤ۔ جیسے اعادۃٌ۔ اعاذۃٌ۔ ادارۃٌ۔ اجازۃٌ۔ اخوۃٌ۔ سوم تائے دامن دار جیسے اباحۃ۔ اعانۃ۔ اجابۃ۔ ان احادیث میں بھی تائے دامن دار ہے۔ لیس الخبر کالمعاینۃ۔ الحرب خدعۃ۔ المسلم مرآۃ المسلم۔ اتقوا النار ولو بشق تمرۃ۔ ان من الشعر لحکمۃ وان من البیان لسحرا۔ السفر قطعۃ من العذاب۔ صاحب ہفت قلزم فرماتے ہیں کہ تائے دولت۔ سعادت۔ رفعت۔ شوکت۔ حشمت۔ شجاعت۔ عترت کو فارسی میں دراز لکھتے ہیں اور صلوٰۃ و زکوٰۃ کی تا کو مدور لکھ کر دکھاتے

ملسے بدل جاتی ہے جیسے صلوات وصلوٰۃ ۔ رحمت ورحمۃ۔ جنت وجنۃ۔ دولت ودولۃ۔
مرزا قطب الدین مائل کی تاریخ محمد عاکف سے "جنتہ مثواہ" (۱۱۰۸) سے نکالی ہے ۔ موصوف نے اسے تذکرہ صبح گلشن میں لکھا ہے۔ غلام علی آزاد بلگرامی نے تذکرہ خزانۂ عامرہ میں اس تاریخ پر اعتراض کیا ہے کہ مورخ نے تائے جنتہ کو ہاء کے عربی والی شکل میں لکھا ہے اور بجائے پانچ عدد کے چار سو عدد محسوب کیے ہیں۔ شیر خان مصنف تذکرہ مراۃ الخیال نے تائے مراۃ کو عدد رکھا ہے اور چار سو عدد محسوب کیے ہیں ؎

این مجموعہ ارے کہ مراۃ الخیالش خواندہ اند | دارد از حسن معانی یک جہاں حسن کمال
صورت تاریخ انجامش تواں سہل چو دید | گر تامل پردہ بردارد ز مراۃ الخیال

(۱۱۰۲)

"مراۃ الخیال کے ۱۳۱۳ عدد ہوتے ہیں۔ پردہ کے ۲۱۱ عدد نکالنے سے سال مطلوبہ (۱۱۰۲) حاصل کیا ہے۔
فائق نے مسجد نواب آصف الدولہ کی تاریخ کہی ؎

فائق دوگانہ کرد بمحراب او ادا
تاریخ گفت خضر کہ "قد قامت الصلوٰۃ"

۱۲۰۲

خواجہ معین الدین چشتیؒ کی تاریخ وفات ؎

سال نقل معین دین ز فلک
"زبدۃ الصالحین" بگفت ملک

۶۳۳ (ناظم تبریزی)

مولانا عبدالباسط امیٹھوی کی ایک تاریخ ہے ؎

گفت از خداش با احباب
اسکن انت زوجک الجنۃ

(۱۱۰۸)

آلِ محمد مارہروی نے تاریخ مسجد فتح معمور خان میں تائے عدد کے چار سو عدد لیے ہیں ؎

تاریخہ سلت من العقل فی السحر
من الف سمعت فقد قامت الصلوٰۃ

۱۲۸۳

اس تاریخ کا مادہ وہی ہے جو فائق نے تلاش کیا۔ حرف من تاریخ زیادہ کر دیا اور واؤ کے درمیان الف غلط ہے۔"
حضرت تسلیم نے مولانا امام بخش صہبائیؒ کا ایک طویل خط بھی اس بحث کے ضمن میں نقل فرمایا ہے۔ چونکہ خط بہت طویل ہے یہاں پر اصل خط کی عبارت کو نظر انداز کرتا ہوں البتہ اس خط کے مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اگر تائے اسلوب عربی میں ہے تو اس کے چار سو عدد لیے

جائیں گے اور اگر مطلوب فارسی میں ہے تو اس کے پانچ عدد شمار میں آئیں گے۔

مولانا صہبائی کے ذکر و قول فیصل پر حضرت جلال تحریر فرماتے ہیں:-

"مولانا صہبائی نے تائے مدورہ کے چار سیکڑے اور پانچ اعداد کے جھگڑے میں ایک محاکمہ فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ مدورہ موقوف کے تو پانچ عدد لیے جائیں اور موصولہ کے چار سیکڑے۔ مثلاً ربۃ الحجبۃ کی ت کے تو پانچ اعداد لیے جائیں اور کعبۃ اللہ کی ت کے چار سیکڑے۔ مولف [illegible] (اجمل) لکھتا ہے کہ واہ واہ سبحان اللہ کیا خوب فیصلہ کیا ہے جس نے قاعدۂ تاریخ ہی کو برہم کر دیا یعنی صورت تو ثابت رکھ کر پھر دخل ہی تاریخ میں ضرور! محض تلفظ پر کہ جس کا اعتبار تلفظ تاریخ میں نہیں ہے، دارومدار رکھا گیا یعنی ربۃ الحجبۃ میں جو در حالت وقف "تے" غیر ملفوظ ہوتی ہے اس کے پانچ لیے جائیں اور کعبۃ اللہ میں در حالت وصل جو تے ملفوظ ہوتی ہے اس کے چار سو۔ اس فیصلے کو ان کے معتقدین ہی تسلیم فرمائیں تو فرمائیں ورنہ سراسیمہ گمان ہے کہ قاعدۂ تاریخ ہی مشتبہ ہوتا ہے۔"

(افادۂ تاریخ صفحہ ۲۵-۲۶)

حیدرآباد دکن میں فوقی مرحوم لکھنوی اور ستی منصور دکنی میں تائے لفظ صلوٰۃ کے اعداد پر ایک طویل بحث ہوئی تھی۔ فوقی مرحوم کے نزدیک تائے مدورہ صلوٰۃ کے پانچ عدد اور ستی منصور کے نزدیک تائے مدورہ صلوٰۃ کے چار سو عدد درست تھے۔ استاد اہل جگ سے استصواب ہوا۔ مولوی حبیب اللہ ذکا اس بحث کا فیصلہ یوں فرماتے ہیں ؎

سن بریشم - سن بریشم - سن بریں　　خان معنی آنچہ گوید بجاست
در حضور حق قرآں گفتن ز کا　　آخر لفظ صلوٰۃ البتہ تاست

مختلف اساتذہ نے تائے مدورہ کی بحث میں اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ تسلیم صہبائی کے ہم نوا ہیں۔ جلال امیر و تسلیم کے ہم مشرب ہیں۔ مولانا ستی لکھنوی سے میں نے تائے مدورہ کے اعداد کے متعلق استفسار کیا تھا جو بحران کا خط مل ہے اور ساتھ ہی اس بحث پر ایک آخری تحقیق ہے لہٰذا اسے میں ذیل میں بجنسہٖ نقل کرتا ہوں:-

"ابجد لغایت ضظغ اٹھائیس حروف زبان عربی میں ہیں جو حروف تہجی کہلاتے ہیں۔ ان میں اکثر ہم شکل ہیں جن کو حروف مشتبہ کہتے ہیں۔ ان کی آواز کا فرق نقطوں سے معلوم ہوتا ہے۔ ان کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک منقوط دار اور دوسرے بے نقط۔ منقوط دار میں بھی بعض حرفوں کے اوپر اور بعض کے نیچے نقطے دیے جاتے ہیں اور اس کے بعد بھی امتیاز نقطوں کی تعداد ہوتی ہے اور یہ تعداد تین نقطوں سے نہیں بڑھتی۔ ان اٹھائیس حرفوں کی بحساب ابجد ایک سے لے کر ہزار تک تعداد مقرر ہے اور فن تاریخ گوئی میں انہی حرفوں کے اعداد جوڑے جاتے ہیں چنانچہ تائے قرشت (جس کو تائے مثناۃ فوقانیہ یعنی اوپر کے دو نقطوں والی تے بھی کہتے ہیں) اس کے عدد چار سو اور ہائے ہوز جو حرف بے نقطہ ہے عربی رسم الخط میں کئی طرح سے لکھی جاتی ہے اس کے پانچ عدد مقرر ہیں۔ عربی رسم الخط میں تائے مثناۃ فوقانیہ یعنی تائے قرشت کو کبھی مدور (ۃ) کبھی نقطوں سے یا تہ ہائے مختفی کی شکل میں لکھتے ہیں جیسے قطرۃ۔ روضۃ۔ حاجۃ۔ ایسی حالت میں (ت) اور (ہ) ہم شکل ہو جاتی ہیں۔ صرف اوپر کے نقطوں سے دونوں کی آواز میں فرق پیدا

ہوتا ہے اور اسی اعتبار سے اس کے عدد قرار پاگئے ہیں لشانۃ، مدعیا اور افزائشانہ میں تائے مدوّرہ جب بشکلِ ہائے مختفی بغیر نقطوں کے لکھی جائے اس وقت یہ سمجھا جائے گا کہ یہ "ت" ہی نہیں ہے بلکہ ہائے ہوز تبدیل ہو گئی ہے یعنی اپنا چولا بدل کر ہائے ہوز کا چولا اختیار کر لیا ہے اور اس حالت میں اس کے اعداد وہی ہوں گے جو ہائے ہوز کے ہیں۔ ہائے ہوز لفظ کے آخر میں فقط واو اور متحرک ہو کر "ت" کی آواز دے رہی ہے اس کے عدد بھی وہی ہوں گے جو "ت" کے ہیں یعنی چار سو کیونکہ حروفِ متشابہ میں آوازوں اور اعداد کا فرق نقطوں ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ اندریں صورت مراۃ الغیب میں تائے مدورہ کے پانچ عدد شمار کیے جائیں، مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ "ت" نے جب تک "تے" ہے خواہ وہ کسی شکل میں ہو اس کے عدد چار سو بحسابِ جمل لیے جائیں گے۔ آپ نے جو تین صورتیں اپنے خط میں لکھی ہیں ان میں سے تیسری صورت سے مجھے اتفاق نہیں یعنی گول "ۃ" کے عدد حالتِ وقف میں پانچ اور بحالتِ حرکت خواہ اس کی کتابت بہ شکلِ ہائے ہوز ہی ہو چار سو لیے جائیں گے اس لیے ذائقۃ الموت میں قاف کے بعد جو "ۃ" ہے اس کے چار سو عدد لیے گئے۔ وہ صحیح ہے مگر کُل نفس میں چونکہ لام ایک ہی ہے اس کے تیس ہی لیے جائیں گے۔ حرفِ مشدد کے دوہرے عدد لینا قطعاً خلافِ قاعدہ ہے اور اسی طرح اس ہمزہ کے جو لباس یا آئیں ہے، یا کے عدد چھوڑ دینا بھی درست نہیں۔ بہر حال تاریخ غلط ہے۔ علامتِ تشدید ایک ہی حرف کے سکون و حرکت کی علامت ہے۔"

حضرت تسلیم کی اس طویل بحث سے عیاں ہوتا ہے کہ تائے مدورہ جب حالتِ وقف میں ہو تو اس کے پانچ عدد شمار ہوں گے اور غیر وقف کی صورت میں تائے مبسوط کی طرح چار سو عدد محسوب ہوں گے اور جن اساتذہ سلف نے ان کے مسلک کے خلاف عمل کیا ہے تسلیم کے نزدیک غیر مستند ہیں حالانکہ ان کا علمی و ادبی پایہ تسلیم سے بدرجہا بلند ہے۔

(۳) ہمزہ اور یائے تحتانی

تاریخ گوئی کے متنازعہ مسائل میں ہمزہ اور یائے تحتانی کے اعداد کی بحث بھی بڑی جھگڑے والی ہے۔ ہمزہ بہ شکل (ء) حروفِ ابجد میں سے کوئی حرف نہیں۔ تاریخ میں مکتوبی حروف کے عدد لیے جاتے ہیں۔ ملفوظی کا شمار نہیں ہوتا۔ ہمزہ مندرجہ ذیل صورتوں میں لکھا جاتا ہے:

<u>۱۔ اگر ہمزہ لفظ کے شروع میں آئے</u>

ہمزہ شروع الفاظ میں الف کی صورت میں لکھا جائے گا جیسے اُسامہ۔ اِکرم۔

اسی طرح اگر ہمزہ لفظ کے پہلے حرف کے ساتھ ملا ہوا ہو گا تب بھی الف کی صورت میں لکھا جائے گا جیسے باجل اور لافضل البتہ لئلا اور لئن میں کثرتِ استعمال کی وجہ سے ایسا نہیں ہے۔

<u>۲۔ اگر ہمزہ لفظ کے درمیان آئے</u>

درمیان آنے والا ہمزہ اگر ساکن ہو تو اپنے سے پہلے حرف کی حرکت کے مطابق لکھا جائے گا مثلاً بأس۔ بؤس۔ بئس۔

اگر ہمزہ متوسط متحرک ہو تو اپنی حرکت کے مطابق لکھا جائے گا خواہ اس کا ماقبل ساکن ہو یا متحرک جیسے لؤم اور رؤف سئال مسائل۔ مسألہ۔

البتہ اگر ہمزہ متوسط متحرک سے ماقبل ایسا حرف ہو جس پر ضمہ (پیش) یا کسرہ (زیر) ہو تو اپنے ماقبل حرف کی حرکت کے مطابق لکھا جائے گا مثلاً سُؤال۔ سُئال۔ مُؤمِن۔

اگر ہمزہ الف اور یا کے درمیان واقع ہو تو جائز ہے کہ اسے خاص ہمزہ کی صورت میں یا ی کی شکل میں لکھا جائے۔ بقاءِی اور بقائی۔ سادی یا سائی۔

اگر ہمزہ اور ی کے علاوہ دوسرے حروف ضائر کے درمیان آئے تو اگر وہ مکسورہ یا مضموم ہوگا تو اپنی حرکت کے مطابق لکھا جائے گا اور اگر مفتوح ہوگا تو خاص ہمزہ کی صورت میں لکھا جائے گا جیسے بقاؤُہٗ۔ بقائِہٖ بقاءَہٗ۔

۳۔ اگر ہمزہ آخر میں آئے

اگر ہمزہ آخر میں آئے اور اس کا ماقبل ساکن ہو تو علامت قطع کی صورت میں لکھا جائے گا جیسے جزءٌ۔ شیءٌ۔

اگر ماقبل متحرک ہو تو اپنے پہلے حرف کی حرکت کے مطابق لکھا جائے گا جیسے خَبُؤَ۔ مَلَأَ۔ ظَمِئَ۔

اگر لفظ کا آخری حرف ہمزہ ہو اور اس کے ساتھ تائے تانیث ملی ہوئی ہو تو اگر ہمزہ سے ماقبل حرف صحیح ساکن ہو (یعنی الف واؤ یا میں سے نہ ہو) تو الف کی صورت میں لکھا جائے گا جیسے نشأۃ اور اگر ماقبل حرف صحیح متحرک ہے تو اس حرف کی حرکت کے مطابق لکھا جائے گا جیسے فِئَۃٌ اور لُؤلُؤۃ۔

اگر ہمزہ سے قبل یٓ ہو تو ہمزہ یٓ کی صورت میں لکھا جائے گا جیسے خطیئۃٌ۔ بریئۃٌ۔ لیکن اگر ماقبل الف یا واو ہو تو ہمزہ کی اصل صورت ہی میں لکھا جائے گا جیسے نباءۃ۔ صلاءۃٌ اور مروءۃٌ اور سوءۃٌ۔

مختصر میں ہمزہ اور یائے تحتانی پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے جس کے پڑھنے سے حضرت تسکین کی تحقیق، محنت اور دیدہ ریزی کا اندازہ ہوتا ہے ساری کتاب میں یہ باب نظر و تلاش کے اعتبار سے ایک عظیم کارنامہ ہے۔ اس موضوع پر چند اہم نکات اور ان پر ان کے محاکمے کو ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

۱۔ ہمزہ بہ شکل (ء) حروف ابجد میں سے کوئی حرف نہیں۔ یہ آواز الف متحرک کی علامت ہے جب واؤ یا (ی) یا (ہائے مختفی) پر واقع ہوتا ہے تو اس حرف میں الف متحرک کی آواز پیدا کر دیتا ہے۔ فن کتابت میں ہمزہ کی اصلی رسم الخط کے طور پر سر عینی کی شکل میں واقع ہوتی ہے۔

۲۔ ۱ احیاءِ سخن چو کرد یحییٰ جان دار (۱۰۶۴)

اس مصرع تاریخ میں احیا کے الف کے بعد جو ہمزہ واقع ہوا ہے مورخ نے اس کا کوئی عدد نہیں لیا لیکن ان کو احیاءِ سخن کی ترکیب (احیائے سخن) یائے مجہول سے لکھنا چاہیئے تھی کیونکہ اگر اس تاریخ کو فارسی کے قواعد کے مطابق لکھا جاتا تو دس عدد سال مطلوبہ سے زیادہ ہو جاتے تھے اس لیے عربی طرز کتابت اختیار کی گئی جو سہو ہے اور قابل تقلید نہیں۔

۲ حرف مدرا ساخت مدغم پیر عقل آگاہ گفت

نحو جائز کرد اِیں جا التقاءِ ساکنیں ۱۰۹۸ + ۱ = ۱۰۹۹

یہاں بھی فارسی رسم الخط سے چشم پوشی کی گئی ہے اور تاریخ درست نہیں۔

"ہمزہ کہ بعد الف مے آید عوض یائے تحتانی مے شمارند۔ قاعدہ عربی در فارسی جاری کردن خود را عاری کردہ است۔ بلی حق پسند چہ گونہ خواہد پذیرفت" (مطلع صفحہ ۵۱)

چنانچہ باقر گیلانی کی تاریخ ہے ؎

ل جا شدہ در الامان المتقین (۱۰۶۸)

مکرم جہان سید المرسلین (۱۰۶۸)

۳- یرشعاعی یشاء (۱۱۲۴)

ہمزہ بعد الف کوئی چیز نہیں اور اسی قاعدے کے تحت جزو اشعار کو بھی سمجھنا چاہیئے۔ "یرشعاعی یشاء" میں ہمزہ کا ایک عدد محسوب ہوا ہے۔ اس کے متعلق علامہ مقدر بگرامی قواعد العروض میں فرماتے ہیں کہ یہ مادۂ تاریخی ہے اور ہمزہ کو بضرورت علامہ واصلی نے اعداد میں شمار کر لیا اگرچہ خالی از سقم نہیں:

حضرت احسن مارہروی نے بھی طوفانِ نوح کی تاریخ اشاعت میں ہمزہ کا ایک عدد لیا ہے ؎

کشتی مطبع رواں ہے مبدء طوفانِ نوح (۱۳۴۰)

اسی طرح احسن نے حضرت داغ کے خطوط کا نام تاریخی "انشائے داغ" (۱۳۵۸) رکھا ہے۔ یہاں بھی ہمزہ کا ایک عدد لیا ہے۔ یہ دونوں تاریخیں غلط ہیں اور قابلِ سند نہیں البتہ "مبدء طوفان" کو اگر احسن نے "مبدأ طوفان" الف کے ساتھ ثابت کیا ہے تو ایک عدد کے شمار کی ایک توجیہ ہو سکتی ہے "انشائے داغ" کے لیے قواعد تاریخ گوئی میں ایک عدد لینے کی کوئی گنجائش نہیں۔

۴- ہمزہ کبھی واؤ پر مکتوب ہوتا ہے مثلاً آؤ - جاؤ - کیکاؤس - رؤف - لکھنؤ وغیرہ۔ ایسا ہمزہ غیر محسوب ہوتا ہے۔

مصحفی	سودا کجا وآں سخن دلفریب واہ	(۱۱۹۵)
رشک	ولا شعر گوئی الٰہی لکھنؤ سے	(۱۲۵۴)
صفی	قرباں ماں کے پاؤں کے نیچے بہشت ہے	(۱۳۵۸)
نوح	ہاتف غیب نے کہا آؤ جلال امیر داغ	(۱۳۲۷)
سرور	گفتہ ام شیخ حق علاؤ الدین	(۷۲۰)

ام التواریخ از حسین علی فرحت جو ہم عدد الفاظ کی ایک عمدہ ڈکشنری ہے۔ اس میں (آؤ) کے (۱۷) عدد محسوب کیے گئے ہیں "آؤ" کے ہمزے کو ایک تحتانی کے برابر شمار کرنے کی یہ مثال قابلِ سند نہیں۔ اسی طرح ایسے ہمزے کا ایک عدد لینا بھی درست نہیں اور یہ خیال کہ ہمزہ جب یائے معروف پر واقع ہوتا ہے تو اس کے اعداد میں ایک تحتانی ہو کر محسوب ہوتا ہے اس لیے جب بھی ہمزہ واؤ پر واقع ہو تو اس کے بھی عدد لینا چاہیئے۔ قواعد تاریخ گوئی کے خلاف ہے۔ واؤ کا ہمزہ غیر محسوب ہوتا ہے۔ اس کے کبھی عدد نہ لینا چاہیئے۔ یہی ثقاتِ فنِ تاریخ کا آخری فیصلہ ہے۔

۵- یائے مختفی کا ہمزہ ہمیشہ غیر محسوب ہوتا ہے۔ یہ ہمزہ کبھی حالتِ اضافت میں آتا ہے مثلاً کشتۂ یاس - بستۂ الفت۔ کبھی بجائے یکہ مثلاً نشستۂ ساختۂ۔ کبھی خطاب کی صورت میں آتا ہے - آمدۂ - رفتۂ - ایسا ہمزہ شمار سے باہر ہے مثلاً

جلیل — کہ ایں ہر چشمۂ آبِ حیات است — (۱۳۳۸)
شوق — ہست ایں چشمۂ آبِ حیات — (۱۳۴۰)
نفیس — خاتم سینہ ہے — (۱۲۹۵)

۶۔ یائے معروف اور ہمزہ

صاحب ... تاریخ نے یائے معروف کو ہمزہ کا بدل نہیں لیا

شوق — اب ... سفر ... — (۱۲۰۹)
یائے قاضی کو قضا آئی — (۱۰۶۹)

ان دونوں مصرعوں میں مصفائی - ہوائی - آئی میں ہمزہ یائے تحتانی کی شکل میں لایا ہے لیکن جناب ... نے اسے غیر محسوب رکھا ہے یہ ہمزہ یائے شمعلہ ہے جیسے کہ اسی دوری وجہ سے ... پیدا کرنے کی غرض سے ... دوسری ... جو ... شکل میں ہے، یائے معروف ساکن ہے ... دونوں کے عدد محسوب ہونا چاہیے جیسے کمائی - بائی - ہوائی - بھلائی - ... - مٹھائی - کربائی - ہرجائی وغیرہ ... کے بیس عدد محسوب کرنا چاہیے - ایک تو شمار کرنا اور دوسری کو ... درست نہیں ... نئی اور گئی میں بھی اس کے عدد محسوب ہوں گے - گئی کے ۴۰ اور نئی کے ۷۰ عدد ہمیشہ محسوب کرنا چاہیے - گئی کے ۳۰ اور نئی کے ۶۰ عدد شمار کرنا درست نہیں۔

یائے تحتانی جیسے آئی ... صیغہ کی علامت ہے یا کسی لفظ کا جزو ہو مثلاً آئندہ، دائم یا مصادر باب تفعل سے ہو جیسے ... توڑ میں ۲ ... یا نسبتی جیسے صبائی - صوائی - یا خطابی جیسے گھروئی - ... یا مصدری جیسے گدائی - دانائی وغیرہ - ان صورتوں میں ئی کے بیس ۲۰ عدد لیے جائیں گے کیونکہ تلفظ اور کتابت دونوں میں اس کا اظہار ہے اور اسی طرح یائے تحتانی صاحب - قائل - سائل - حائل - سائل - حائل - فائز - کائنات - نقائص - لطائف - دائرہ - مائدہ - فوائد - رائج - عجائب - غرائب وغیرہ میں اس کے دس عدد شمار کیے جائیں گے -

تسلیم نے ایک جگہ اسمٰعیل حسین منیر لکھنوی کی تاریخ پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں بعض مؤرخ صنعت سے تاریخ کہتے ہیں جیسے منیر نے لفظ "آئی" کو الگ الگ بنایا ہے ؎

تاریخ اس عطیہ کی میں نے کہی منیر
انگشتر زمرد پاکیزہ آئی آج — (۱۲۸۲)

یہاں "آئی" کے گیارہ عدد لیے ہیں۔

ع — پچھی کمال شکرہ شہانہ سے آئی — (۱۲۸۲)

یہاں "آئی" کے ۳۱ عدد شمار میں آئے ہیں۔

پہلی تاریخ میں "آئی" بر وزن "فاع" ہے اور دوسرے مصرع میں "آئی" بر وزن "فعلن" ہے شاید اس وجہ سے گیارہ اور اکتیس عدد محسوب ہوئے ہیں کیونکہ اساتذہ میں یہ رواج چلا آرہا ہے اور اسی کو مطلقاً قاعدہ بنا لیا گیا - اگرچہ قواعد اس کی اجازت نہیں دیتے - تسلیم سہسوانی نے اگرچہ "ئی" کے بیس عدد لینے کا حکم فرمایا ہے لیکن عدد والا تاریخ میں انھوں نے بھی اس پر عمل نہیں کیا ہے مثلاً

آج آتی تک کے ۱۵ یا ز آتی تک کے ۱۲ عدد لیے ہیں اور اپنے بنائے ہوئے تاریخ گوئی کے اصولوں کی خلاف ورزی کی ہے کیونکہ یہ کتاب ان کی وفات کے بعد شائع کی گئی ہے اس لیے تحریف کاتب یا مصحح کو اس میں دخل معلوم ہوتا ہے۔ اگر یہ کتاب ان کی زندگی میں طبع ہوتی تو ضرور اس قسم کے تسامح سے پاک ہوتی۔

۷۔ یائے مجہول ہمزہ دار

اہلِ ایران جن اسما یا امر کے آخر الف ہوا اس میں ایک یائے مجہول بڑھا دیتے ہیں مثلاً سرا سے سرائے، کشا سے کشائے۔ سرا سرائیدن مصدر سے اور کشا کشیدن مصدر سے امر کے صیغے ہیں۔ ان پر یائے زائدہ کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح پا سے پائے ور گدا سے گدائے۔ یہاں اسمائے پا اور گدا پر یائے زائدہ ہے۔

جن عربی الفاظ کے آخر ہمزہ ہوتا ہے اسے حذف کر دیتے ہیں جیسے سودا، صہبا وغیرہ بر نت کے صیغے ہیں ان کو بغیر ہمزہ لکھتے اور بولتے ہیں اور جب یائے زائدہ اس پر بڑھاتے ہیں تو ہمزہ کو حذف کر دیتے ہیں مثلاً صہبا سے صہبائے، شعراء سے شعرائے، ادا سے ادائے وغیرہ۔ پھر اگر ایسی یائے زائدہ پر یائے وحدت یا تنکیر وغیرہ لانا ہوتی ہے تو یائے زائدہ کو بصورت ہمزہ اور یائے ثانی کو بصورت یائے مجہول لکھتے ہیں جیسے "تماشائے دارم" "جنگ آزمائے" وغیرہ۔

مذکورہ مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ فارسی زبان کے قواعد میں یائے مجہول بلا اشباع و بہ اشباع دونوں طرح سے آتی ہے۔ لیکن دونوں صورتوں میں یائے مذکور پر رسم الخط میں شوشہ بحالتِ اشباع نہیں لگایا جاتا بلکہ یائے مجہول اشباعی و غیر اشباعی ایک ہی طرح سے لکھی جاتی ہے۔ اشباعی حالت میں فقط اسے کھینچ کر پڑھتے ہیں۔ یائے مجہول بلا اشباع و بہ اشباع کو ذیل کی مثالوں سے سمجھئے۔ یہ دونوں اردو بخش منیر شکوہ آبادی کی ہیں ؎

۱ منبر از بہر تاریخش نوشتم
زیارت گاہ و نقشِ پائے مسعود (۱۲۸۷)

یہاں پائے میں یائے مجہول بغیر اشباع کے ہے اور بروزن فاع ہے۔ اس کے دس عدد لیے گئے ہیں

۲ نسخۂ دانش فزائے دل عجیب (۱۲۷۷)

یہاں فزائے میں یائے مجہول اشباع سے ہے اور "فزائے" "فعولن" کے وزن پر ہے۔ اس کے بھی دس ہی عدد محسوب ہوئے ہیں۔ فن جمل میں یائے مجہول بلا اشباع اور بہ اشباع دونوں کے عدد یکساں ہوتے ہیں۔

منشی محمد حیات بخش فرحت سیدی مرحوم کی ایک تاریخ ہے ع

رفت از سرائے فانی بعالم بقا (۱۳۴۶)

یہاں بھی "سرائے" کی یائے مجہول کے دس عدد لیے گئے ہیں۔

لیکن اردو میں یائے مجہول ہمزہ دار کے اعداد میں اختلاف ہے مثلاً پائے بروزن فعلن ہو تو اس کے ۲۲ عدد لینا چاہییں اور اگر بروزن فاع ہو تو ۱۳۔

مثلاً استاذی حضرت جلیل مرحوم کی ایک تاریخ ہے ؎

گھڑی تو الجھی ہونے کے لیے پہنشنہ سے پاشے   (١٩١٢)

پاشے بروزن فعلن ہے اور اس کے ٢٢ عدد لیے گئے ہیں اور یائے مجہول کو شوشے سے لکھا گیا ہے۔

حضرت فصیح الملک حضور کی ایک تاریخ ہے ؎

ہے دعا بھی داغ کی قادر کریم   قصر عالی پائے جنت میں مقیم   (١٣١٨)

یہاں پائے بروزن فاع ہے اور اس کے ١١ عدد محسوب کیے گئے ہیں اور یائے مجہول شوشے سے نہیں لکھی گئی۔
ہے۔ کیے۔ گئے۔ نئے وغیرہ میں دو ی محسوب ہوں گی۔ گھٹے، اٹھے۔ بیٹھے۔ دیجیے۔ لیجیے۔ پڑھیے وغیرہ میں بھی دو ی کے عدد لیے جائیں گے۔ آئیے۔ فرمائیے میں کیونکہ تین تحتانیاں ہیں اس لیے تین یا کے تیس عدد شمار میں آئیں گے مثلاً

واقف شاگرد اسیر لکھنوی	کے	قطرہ بھی تو جناب دبیروں کو بھیجئے	(١٣٥٥)
صفی لکھنوی	کے	قبر ہے آؤ اس جگہ پر فاتحہ پڑھ دیجیے	(١٣٥٢)
داغ دہلوی	کے	ہنگنڈ سے آ گئے اب حضور	(١٣٠٧)
صفی	کے	سب شاعر کرو کا اعزاز آئیے	(١٢٦٠)

آئیے میں تینوں تحتانیاں مکتوب ہیں اس لیے تینوں کے عدد محسوب ہوں گے۔

تسلیم کے نزدیک یہ امر مسلم ہے کہ آئے۔ پائے۔ روئے کی یائے مجہول کے بیس عدد محسوب کرنا چاہئیں۔ ور حضرت عقیل ایسی یائے مجہول کے دس عدد شمار کرنے کے حق میں ہیں۔ مورخ ایسے تھے کہ دونوں طرح سے دس اور بیس عدد لیتے آئے ہیں اور دونوں اپنے اپنے مذہب کے جواز میں پختہ دلائل رکھتے ہیں۔ یہ ایک علیحدہ بحث ہے جس کی اس مقالے میں گنجائش نہیں۔

جگر مرادآبادی

ملک رام

جس زمانے میں ہندوستان کا گرمائی دارالحکومت شملے جایا کرتا تھا، وہاں کی بزمِ ادب ہر سال اپنے بڑے پیمانے پر ایک مشاعرے کا انتظام کیا کرتی تھی۔ اس بزم کے کرتا دھرتا بیشتر سرکاری ملازم تھے۔ یوں معلوم ہوتا کہ جب ان حضرات کے دماغ دفتری مسلوں کی خشکی اور یبوست سے ماؤف اور بیمار ہو جاتے تھے تو یہ اُسے شعر و سخن کی رنگینی سے تازگی بخشنے کی کوشش کرتے تھے۔ ماشاءاللہ خود بزم کے اراکین میں شاعروں کی کمی نہیں تھی، لیکن مشاعرے کو موقر اور وقیع بنانے کے لیے ہر سال باہر سے بھی دو چار نامی اور مشہور اساتذہ کو دعوت دی جاتی تھی۔

اتفاق سے ۱۹۳۶ء کے مشاعرے کے موقع پر میں شملے میں تھا۔ مشاعرہ ستمبر کے آخری اتوار کے دن ہوا تھا۔ اس سے پہلے دن سہ پہر کے وقت میں اور جلیل قدوائی اور بدر الدین صاحب لوئر بازار کی طرف جا رہے تھے کہ راستے میں چوڑا میدان میں ایک صاحب رکشا پر آتے ہوئے مل گئے۔ ہمیں دیکھ کر انھوں نے رکشا کھڑی کر لی اور بڑھ کے جلیل صاحب سے بڑے تپاک سے بغل گیر ہوئے۔ جلیل نے میرا تعارف کرایا۔ معلوم ہوا کہ آپ جگر مرادآبادی ہیں اور خصوصی دعوت پر مشاعرے میں شرکت کے لیے تشریف لائے ہیں۔ شکل صورت کے ساتھ محمد ایاما کی بنائی ہوئی جو تصویر[1] چھپی ہے، بالکل ویسی

---

[1] یہ تصویر ایاما مرحوم کا شاہکار ہے، بلکہ بہت حد تک ان کی عام شہرت اسی کی رہینِ منت ہے۔ اس سے متعلق ایک لطیفہ یاد آ گیا۔

ہمارے ایک دوست تھے، حمید عزیز فاتی۔ انھیں بھی تصویر کشی سے بہت دلچسپی تھی۔ انھوں نے ایاما کی اس تصویر کی نقل تیار کی اور ایسی عمدہ کہ باید و شاید۔ اس پر انھوں نے خود جگر سے ان کا ایک قلمی شعر لکھوایا اور دستخط لیے۔ جب میں نے یہ تصویر ان کے ہاں دیکھی، تو میری نیت خراب ہو گئی۔ اب مجھے ٹھیک سے یاد نہیں کہ انھوں نے میرا شوق دیکھ کے خود ہی اسے میرے حوالے کر دیا یا میں نے ہی کچھ حیلہ بہانہ کر کے یہ ان سے ہتھیا لی، بہرحال تصویر میرے قبضے میں آ گئی۔ ۱۹۳۹ء میں اپنے کتب خانے کے ساتھ میں اسے اپنے عزیز دوست ملک احمد حسن مرحوم (ایڈیٹر دورِ جدید) کے پاس چھوڑ آیا۔ لطیفہ یہ ہوا کہ جب احمد حسن نے اسے دیکھا تو پوچھا: کیوں بھائی، واقعی یہ جگر صاحب کی ٹھیک شبیہ ہے؟ میں نے کہا: واہ صاحب، یہ آپ نے کیا کہا! اصل تو یہ تصویر ہے، جگر صاحب تو اسے دیکھ کر بنائے گئے ہیں، یعنی یہ اصل ہے اور جگر صاحب نقل۔ پس یہ سوال تو یوں ہونا چاہیے کہ کیا جگر اس تصویر کے مطابق ہیں یا نہیں، لیکن آپ یہ نہیں پوچھ سکتے کہ یہ تصویر جگر کی ہے یا نہیں۔ اس پر ایک قہقہہ پڑا۔

افسوس کہ میرے قیمتی کتب خانے کے ساتھ یہ تصویر بھی لاہور کے ۱۹۵۳ء کے فسادات کی نذر ہو گئی۔ م۔ ر۔

[illegible]

ہلکا سا تھا: لیکن چونکہ اس میں بعض خطوط تھے، اس لیے اس سے اصلیت پوشیدہ طور پر واضح نہیں ہوتی۔ میانہ قد؛ خاصہ سانولا رنگ؛ چہرے پر چیچک کے چھوٹے چھوٹے داغ؛ آنکھیں، اس میں سرخی کی جھلک؛ ہونٹوں پر پان کا لاکھا جما ہوا؛ ترشی ہوئی کھچڑی داڑھی جس میں چاول کم اور دال زیادہ تھی؛ سر پر لمبے لمبے بے ترتیب بال، جو ٹوپی سے باہر نکلے ہوئے تھے؛ گلے میں سیاہ رنگ کی شیروانی اور نیچے چوڑی دار چست پاجامہ؛ سر پر سنجی رنگ کی بالوں والی اونچی ترکی ٹوپی اور پاؤں میں سیاہ رنگ کا پمپ پہنے تھے۔ طبیعت میں حد درجہ بے چینی اور وحشت۔ حالانکہ صرف چند منٹ کے لیے ملے لیکن اس دوران میں بھی انھوں نے جو باتیں کیں، کچھ عجیب اکھڑی اکھڑی سی۔ یوں معلوم ہوتا تھا، گویا اپنے سائے سے بھی بدک رہے ہوں۔ یہ تھے جگر صاحب!

اگلے دن مشاعرہ گاہ میں پہنچے۔ خدا بخشے شفیق کو، ان کی خوش انتظامی کے صدقے یہ دس کی جگہ گیارہ بجے شروع ہوا تھا۔ تاجور صاحب ہی سے پہلے کی ملاقات تھی۔ حسرت موہانی اور روش صدیقی سے پہلی ملاقات یہیں ہوئی۔ حسرت سے میرا تعارف تاجور مرحوم اور جلیل نے کرایا؛ اور دونوں نے مبالغے سے کام لیا۔ سائل صاحب دہلی سے تشریف لائے تھے۔ مجھے ان کی خدمت میں بھی پہلے سے نیاز حاصل تھا۔ انھوں نے بعض پرانی غزلیں سنائی تھیں۔ زبان کے پہلو سے واقعی ان کا جواب نہیں تھا۔ احسان دانش نے اپنی نظم "مزدور کی عید" سنائی تھی۔ حسب معمول انھوں نے بلند اور پاٹ دار آواز میں ترنم سے پڑھی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ اس کے بعض مقامات ایسے درد ناک تھے کہ بے اختیار میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ حسرت نے لفافے میں سے چار غزلیں نکالیں۔ ہر ایک میں غالباً چھ چھ سات سات شعر تھے اور سب تازہ کلام۔ یہ کاغذ کے چند پرزوں پر لکھی تھیں۔ مشاعرہ ختم ہونے پر یہ کاغذ انھوں نے مجھے دے دیے۔ ان کے پڑھنے کا انداز کچھ عجیب سا تھا۔ ناک میں تو وہ بولتے ہی تھے، اس پر ستم یہ ہوا کہ گلے میں کسی خرابی کی وجہ سے آواز اتنی نیچی تھی کہ شاید پاس بیٹھے ہوئے کسی شخص کے پلے کچھ پڑا ہو۔ اور پھر انھوں نے شعر کاہے کو پڑھے، گویا اس کاٹ کے رکھ دی؛ نظم اور نثر میں کوئی امتیاز ہی نہیں رہا۔ کوئی اور ہوتا، تو مجمع ہوٹ کر جاتا اور بد تمیز ہلڑ سے زبردستی بٹھا دیتے۔ لیکن ان کی بزرگی اور شاعرانہ عظمت کے سامنے کسی کو دم مارنے کی جرات نہ ہوئی۔ سب ادب کے مارے خاموش بیٹھے رہے۔ ان کے پڑھنے کے وقت ایک لطیفہ بھی ہوا۔

پہلی ہی غزل تھی۔ انھوں نے مطلع پڑھا۔ اگلی صف میں بیٹھے ہوئے ایک بزرگ نے داد دی اور اسے پھر پڑھنے کی فرمائش کی۔ حسرت نے مطلع دوبارہ پڑھ دیا۔ جوں ہی مطلع پڑھا؛ انھوں نے پھر داد دی اور مکرر پڑھنے کی درخواست کی۔ اب کے حسرت نے تاک کر عینک کی پرانی ہوئی عینک کے اوپر سے ایک نظر ان کی طرف دیکھا اور شعر پھر پڑھ دیا۔ تیسرے شعر پر ان کے برابر بیٹھے ہوئے صاحب کی جو شامت آئی، انھوں نے یک بارگی "واہ" کہہ کے ہاتھ اٹھایا اور پھر "ارشاد ہو" کا نعرہ لگایا۔ اب حسرت کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا تھا۔ انھوں نے دیکھا بھی نہیں اور "کوئی ضرورت نہیں" کہہ کے اگلا شعر پڑھ دیا۔ اس کے بعد کسی کو مکرر کہنے کی جرات نہیں ہوئی۔

جگر صاحب نے بعض پرانی غزلوں کے علاوہ ایک غیر مکمل تازہ غزل کے چند شعر سنائے تھے، جس کا یہ بے پناہ مطلع آج تک میرے حافظے میں محفوظ ہے ؎

آکر تجھ بن اس طرح، اے دوست! گھبراتا ہوں میں
جیسے ہر شے میں، کسی شے کی کمی پاتا ہوں میں

یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے جگر کو پڑھتے سنا۔ انھوں نے بڑے والہانہ انداز میں ترنم سے کلام سنایا۔ (اب بھی وہی انداز ہے، لیکن

عمر کے ساتھ اتنا موثر نہیں رہا)۔ یہ حقیقت ہے کہ مجلس میں سماں بندھ گیا۔ میں نے اپنی عمر میں دو ہی ایسے شاعر دیکھے، جنھیں سن کے ورڈز ورتھ کے الفاظ میں "شدت اور تقدس مآب" اور "پُرجوش" وارفتگی یا مدہوشی تک کے وجد آگیا۔ ایک حفیظ جالندھری اور دوسرے جگر مراد آبادی۔

(۲)

میں ۱۹۳۶ء کے جاڑوں میں دلی آگیا۔ یہاں میں نے ایک مختصر سا مکان قرول باغ میں، اجمل خاں روڈ پر لے لیا۔ جن لوگوں نے آج سے ربع صدی پہلے کا قرول باغ نہیں دیکھا اور ان کی نظر میں صرف اس کی موجودہ چہل پہل اور گہما گہمی ہے، وہ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ اُس زمانے میں یہاں کیا خاک اڑتی تھی۔ بلا مبالغہ، اجمل خاں روڈ، غالب کی "سرحد ادراک" معلوم ہوتی تھی۔ اس سڑک پر بھی بس گنتی کے چند مکان تھے! اس کے ایک سرے پر جامعہ ملیہ کے دفتر اور اس کے عملے کے سکونتی مکان تھے اور دوسرے سرے پر طبیہ کالج کی عمارت۔ کوئی فرلانگ بھر کی دوری پر گندہ نالہ تھا، جو یوں سمجھئے کہ تہذیب و تمدن کی آخری سرحد تھی۔ اس کے اُس پار خانہ بدوش رہگزروں اور بازیگروں کے پھوس کے چھپّر اور جھونپڑیاں تھیں۔ بعد یہ واقع ہے کہ لوگ اِکّا دُکّا، رات کی تاریکی تو دور کنار، سورج کی روشنی میں بھی اس علاقے میں جاتے ہوئے ڈرتے تھے۔ یہاں دن دہاڑے مسافر لُٹ جاتے، بلکہ بعض اوقات قتل تک کے حادثات ہو جاتے تھے۔

تو خیر، چونکہ میں کسی ایسی ہی جگہ کی تلاش میں تھا "جہاں کوئی نہ ہو": اس لیے میں نے سوچا کہ اس سے بہتر اور کونسا مقام ہوگا؟ اور مکان اسی اجمل خاں روڈ پر لے لیا۔

میں یہاں روزانہ صبح کے وقت ایک صاحب کو تیز تیز مکتبہ جامعہ کی طرف جاتے دیکھتا، گندمی رنگ، متوسط قد، دوہرا جسم، گول آفتابی چہرہ، بڑی بڑی شربتی آنکھیں، اونچی چوڑی پیشانی، بھروان سیاہ ڈاڑھی اور مونچھیں، نیچے علی گڑھ فیشن کا پاجامہ، گلے میں شیروانی اور سر پر گاندھی ٹوپی۔ وہ جب بھی ملے، منہ میں گلوری اور بغل میں پاندان دبائے ہوئے۔ کئی مرتبہ جی میں آئی کہ آدمی دلچسپ معلوم ہوتے ہیں، ان سے راہ و رسم پیدا کرنا چاہیئے۔ یوں بھی پڑوس کا معاملہ ہے۔ آخر بالکل الگ تھلگ ۔ وکے تو زندگی کے دن کٹنے سے رہے۔ لیکن وہی میری فطری کم آمیزی ہمیشہ مانع آئی۔ جراٗت نہ پڑی کہ بڑھ کے خود اپنا تعارف کرا دوں۔ آخر، خدا معلوم کیسے، خود انھیں خیال آیا۔ ایک دن آمنے سامنے آتے ہوئے ہماری مڈبھیڑ ہو گئی۔ رُک گئے، علیک سلیک ہوئی: پوچھا: آپ یہاں نئے آئے ہیں، کوئی تکلیف تو نہیں۔ معلوم ہوا ان کا نام ہے محمود علی خاں۔ یہ وہی محمود علی خاں (جامعی) ہیں، جنھوں نے ہمارے ہاں سو شعروں کی جدّت یا بدعت شروع کی۔ میرؔ کے سو شعر، غالبؔ کے سو شعر، مومنؔ کے سو شعر —— غرض اس طرح انھوں نے نئے پرانے شاعروں کے کوئی دس پندرہ کتابچے شائع کیے تھے۔ اس کے بعد یار لوگ اسے لے اُڑے۔ جس نے دیکھا کہ پورا دیوان چھپنا مشکل ہے۔ کون اسے چھاپے گا اور کون پڑھے گا۔ اس نے اپنا تعارف کرانے کے لیے یہ کم خرچ بالانشیں نسخہ استعمال کیا اور اپنے سو شعر چھپوا کے دوستوں میں تقسیم کر دیئے، تاکہ سند رہیں۔ یوں چھپنے کی ہوس بھی پوری ہو گئی اور سستے بھی چھوٹے۔ چنانچہ بازؔ کے سو شعر، گلہری کے سو شعر۔ اور جانے کس کس کے سو شعر چھپ چکے ہیں۔ لیکن محمود صاحب نے اس کے علاوہ متعدد انگریزی کتابوں کے ترجمے بھی کیے۔ چونکہ انھیں انگریزی اور اردو دونوں پر پوری قدرت حاصل ہے اور آدمی بے حد محنتی ہیں، اس لیے وہ ترجمے میں بھی ہمیشہ کامیاب رہے۔

غرض، اس کے بعد ان سے تعلقات بہت گہرے اور مخلصانہ ہو گئے۔

ایک دن شام کے وقت ان کا آدمی آیا کہ "خانصاحب" بلاتے ہیں۔ میں پہنچا، تو دیکھا کہ جگر صاحب تشریف فرما ہیں۔ محمود صاحب

کو معلوم نہیں جیسا کہ میں اوپر کے صفحے میں عرض کر چکا ہوں، جگر صاحب اور محمود صاحب کے بہت پرانے محرم تھے، بلکہ یہ ماننا پڑتا ہے کہ اگر محمود اور جلیل قدوائی نہ ہوتے، تو غالباً ان کا کلام کبھی شائع ہی نہیں ہو سکتا تھا اور اگر ہوتا بھی، تو کم از کم اس کی یہ ضخامت نہ ہوتی۔ جگر جس طرح کے لاابالی اور بے پروا شخص ہیں، وہ کسی سے مخفی نہیں۔ انھوں نے کبھی باقاعدگی سے اپنا کلام ایک جگہ جمع نہیں کیا۔ وہ تو خوش قسمتی سے ان دونوں صاحبوں نے شروع سے اس کی حفاظت کا اہتمام کیا، ورنہ خدا معلوم کس قدر ضائع ہو گیا ہوتا۔ چنانچہ جیسا کہ شعلۂ طور کے دیباچے میں جگر نے اعتراف کیا ہے، انھی دونوں کی بیاضوں سے یہ دیوان مرتب ہوا تھا۔

(۳)

جگر صاحب یہاں کوئی دس بارہ دن رہے اور اس کے بعد اگلے برس کے دوران میں بھی جب میرا قیام قرول باغ ہی میں تھا، اکثر یہاں آتے رہے۔ ان ایام میں مجھے انھیں اچھی طرح قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور رفتہ رفتہ ہمارے آپس کے تعلقات بہت دوستانہ اور بے تکلفانہ ہو گئے۔

وہ اس زمانے میں پیتے تھے اور بے حساب، اور ستم بالائے ستم یہ کہ اس کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا۔ جوش بھی پیتے تھے، لیکن ان کا یہ اصول ہے جس سے انھوں نے کبھی انحراف نہیں کیا کہ وہ دن میں ہرگز نہیں پئیں گے، صرف مغرب کے وقت، وہ بھی دو تین جام۔ مگر کبھی خاص خاص احباب کا مجمع ہوا، تو ایک آدھ زیادہ سہی۔ اختر شیرانی اور مجاز نے بھی کبھی کسی پابندی کی پروا نہیں کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں قبل از وقت چل بسے۔ جگر کا بھی یہی حال تھا۔ ایک تو جب مل گئی اور دوسرے جتنی چاہی پی لی۔ پھر اس کا بھی خیال نہیں کہ کس قسم کی ہے ——— اچھی یا بری، بس شراب ہو۔ وہ تو خدا نے اپنے فضل و کرم سے انھیں توبہ کی توفیق دے دی کہ انھوں نے اسے ترک کر دیا، ورنہ جو حشر ان کا ہوتا، ظاہر ہے۔ اور اب جو ان کی صحت اتنی خراب رہتی ہے، تو اس کی اصل وجہ بھی یہی اوائل عمر کی نامراد شراب نوشی اور دوسری بد احتیاطیاں ہیں۔

ایک دن سر شام پینے بیٹھے اور تھوڑی تھوڑی مقدار میں نصف بوتل کے قریب پی گئے۔ آدھی رات کے بعد کہنے لگے: چلو، جوش کے ہاں چلیں (جو بھی قرول باغ میں تھوڑی ہی دور رہتے تھے)۔ ہم نے بہت کہا کہ وہ سو چکے ہوں گے، اب اس وقت اتنی رات گئے انھیں دق کرنا ٹھیک نہیں ہو گا، لیکن انھوں نے کسی کی ایک نہ سنی، بلکہ ہمارے منع کرنے پر بگڑ گئے۔ آخر سب نے عافیت اسی میں دیکھی کہ جس طرح یہ کہتے ہیں اسی طرح کیا جائے۔ چنانچہ آگے آگے جگر اور انھیں سہارا دیے کو محمود صاحب اور ان کے پیچھے پیچھے ہم چھ سات آدمی، جلوس کی شکل میں روانہ ہوئے۔ سردیوں کی ڈھلتی رات اور اس زمانے کا قرول باغ، آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کیسا ہُو کا عالم ہو گا۔ وہ تو خیر گزری کہ کوئی پولیس کا سپاہی راستے میں نہیں مل گیا، ورنہ وہ یقیناً یہی خیال کرتا کہ یہ مشٹنڈے شراب پی کر کہیں کوئی واردات کرنے جا رہے ہیں یا کم از کم آوارہ گرد مزدور ہیں اور ہمیں جوش کے مکان کی جگہ تھانے پہنچا دیتا۔ اب ایک لطیفہ ہوا۔ جگر صاحب چند قدم چلیں اور سڑک کے بیچوں بیچ کھڑے ہو کر تقریر کرنا شروع کر دیں۔ اس پر کتوں اور سؤروں نے (جن کی اس زمانے میں یہاں بڑی کثرت تھی) اِدھر اُدھر سے نکل کر بھونکنا اور چیخنا اور بھاگنا شروع کر دیا۔ اس پر ہم سب بلطائف الحیل انھیں آگے چلنے کی ترغیب دیتے۔ قصہ کوتاہ، خدا خدا کر کے وہ تین چار سو گز کا فاصلہ کوئی آدھ پون گھنٹے میں طے ہوا اور ہم لوگ چندے جوش صاحب کے مکان کے بیرونی برآمدے میں داخل ہوئے۔ یہاں پہنچتے ہی جگر نے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے بھرّائی ہوئی سی آواز آئی: "کون؟" انھوں نے جواب دیا: "جگر"۔ "کون؟"۔ "ارے، ایک مرتبہ جو کہا ہے، جگر! دروازہ کھولو۔" "جگر بھائی، ہم سو رہے ہیں، صبح کے وقت آنا۔" "سو رہے ہیں"! آئے بڑے سونے والے۔ "ارے ہم، ہم یہاں سردی میں باہر کھڑے

ہی اور تم سوئے پڑے ہو۔ جلد دروازہ کھولو۔ یہ محمود بھی ہمارے ساتھ ہے۔" اس پر جوش غریب لڑ ھاؤ کر اٹھے اور انھوں نے دروازہ کھولا۔ انھوں نے اگلے دن مجھ سے کہا کہ میں دروازہ یوں نہ کھولتا، میں تو کرسی کھسکنے والا تھا۔ لیکن جب جگر نے محمود کا نام لیا، تو میں نے خیال کیا کہ ضرور کوئی حادثہ پیش آگیا ہے، ورنہ محمود یوں رات کے اس وقت قطعاً نہ آتے۔ یہ اس لیے کہ محمود صاحب پیتے نہیں اور جوش صاحب کو معلوم تھا کہ وہ سنجیدہ آدمی ہیں۔

دروازے کا کھلنا تھا کہ جگر صاحب لپک کے کمرے میں داخل ہوئے اور اوپر کی گرم چادر پھینک، شراب سے لحاف میں گھس گئے، جیسے وہ گھر سے اسی کی تلاش میں یہاں تک آئے ہوں۔ اور کہنے لگے: "محمود، اب کافی دیر ہو چکی ہے۔ میں یہیں سوؤں گا۔ آپ حضرات تشریف لے جائیے۔ میں صبح کے وقت ناشتے کے بعد آجاؤں گا۔" جوش بیچارے حیران، پریشان کہ یہ بلا بے درماں کہاں سے نازل ہو گئی۔ وہ کہتے ہی رہے کہ "نہیں جگر صاحب! آپ جائیے محمود صاحب کے ساتھ۔" لیکن توبہ ہے! یہ مس سے مس نہیں ہوئے۔ ادھر ہم ہنسی کے مارے پیٹ میں بل پڑ رہے تھے۔ آخر ہم نے دونوں دوستوں کو آپس میں راز و نیاز کرنے کے لیے شب بخیر کہا اور واپس چلے آئے۔

لیکن یہ کبھی نہیں ہوا کہ جگر نشے کی حالت میں بالکل حواس کھو بیٹھے ہوں۔ بہکی بہکی باتیں وہ ضرور کرنے لگتے تھے۔ ابھی ایک موضوع پر گفتگو کر رہے ہیں کہ یک لخت اس سے گریز کر کے کسی دوسرے مضمون پر بات چیت کرنے لگیں گے، حالانکہ دونوں میں آپس میں قطعاً کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ سننے والا ہکا بکا ان کے منہ کی طرف دیکھ رہا ہے کہ یا الٰہی! یہ کیا؟ ابھی دو منٹ پہلے تو یہ غزل کی حمایت میں دلائل بیان کر رہے تھے اور اب عینک کے تالوں کی پہچان اور ان کی مختلف قسموں پر تقریر فرمانے لگے ہیں: لیکن ان کی بلا سے بات اصل میں یہ ہے کہ ان کا دماغ بیک وقت مختلف موضوعات کی جولان گاہ بنا رہتا ہے۔ اب اس دنگل میں کسی خاص وقت جس موضوع کا غلبہ ہو گیا، زبان پر اس کی بات آگئی۔ لیکن وہ ذہنی کشمکش بدستور جاری رہتی ہے۔ پھر اگر پہلے موضوع کی بات چیت کے دوران میں، اس دوسرے مضمون کا پلّا بھاری ہو گیا: تو پہلا چیت ہو جائے گا اور یہ بے اختیار اسے چھوڑ کر دوسرے سے متعلق باتیں کرنے لگیں گے۔ سامع کو اس سے حیرت ہو، تو ہوا کرے؛ ان کے لیے یہ بالکل قدرتی اور معمولی اسلوبِ گفتگو ہے۔ اور یہ بات سرخوشی کے عالم ہی سے مخصوص نہیں تھی، وہ ہوش کے وقت بھی کچھ ایسے ہی تھے۔

بہرحال واہی تباہی بکنا یا گالی دینا کبھی ان کا شعار نہیں رہا۔ بات یہ ہے کہ حقیقت میں ان کا مزاج دینی تھا اور اصغر گونڈوی مرحوم سے انھیں خاص عقیدت رہی ہے، بلکہ یہ اُن کے ہم زلف بھی تھے۔ اصغر جس پایے کے انسان تھے، ان کا ہر ایک ملنے والا اس کا معترف ہے۔ اصغر کی طرح جگر بھی حضرت شاہ عبدالغنیؒ سے بیعت تھے۔ یہی سبب ہے کہ لاکھ بے عملی بلکہ بد عملی کے باوجود اساسی طور پر ان کی روح کبھی ان آلائشوں سے ملوث نہیں ہونے پائی۔ انھوں نے فسق و فجور میں کبھی لذت محسوس نہیں کی۔ جو کچھ سرزد ہوا، اضطراری طور پر۔ وہ ہوش کی حالت میں ہمیشہ پشیمان ہوتے اور ندامت محسوس کرتے اور اس سے باز رہنے کے منصوبے باندھتے؛ لیکن چونکہ کثرتِ شراب نوشی سے قوتِ ارادی حد درجہ کمزور ہو چکی تھی، اس لیے اس عزم میں کامیاب نہ ہو پاتے۔ اس میں بہت حد تک قصور ان لوگوں کا بھی ہے، جو ان کے ارد گرد ہوا کرتے تھے۔ یہ اصحاب اپنے آپ کو ان کا بڑا دوست اور خیر خواہ کہتے تھے، لیکن تھے وہ دراصل ان کے دشمن۔ جگر صاحب کہیں گئے ہیں، تو یہ حواری خود صاحبِ خانہ سے فرمائش کر کے بوتل منگوا لیں گے اور جام بھر کے جگر کے آگے رکھ دیں گے۔ اب یہ بیچارے کیا کریں! اگر کسی شخص کی اصلاح منظور ہو، تو سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ اسے آزمائش میں نہ ڈالا جائے، تاکہ بتدریج اس کی قوتِ ارادی خود کر آئے اور

ضعیف اتنا ضرور ہو جائے کہ وہ خود اپنی عقل کا استعمال کر سکے۔ لیکن اگر آپ قدم قدم پر اس کا خیال رکھیں، اس کے چاروں طرف اس کی حفاظت کے سامان مہیا کر دیں اور پھر اس سے کہیں کہ ہم چاہتے ہیں کہ آپ اس بڑی علت سے نجات حاصل کریں، تو یہ خیال خام ہے ؎

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردہ ای
باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

مگر اس غریب میں ان کمزوریوں سے دامن جھٹک کر الگ ہو جانے کی قوت ہوتی، تو وہ اس حال کو پہنچتے ہی کیوں!

ان کی قوتِ ارادی کے فقدان پر ایک واقعہ یاد آگیا۔ جس طرح وہ اپنے آپ کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے، اسی طرح کسی کی دل شکنی بھی ان سے محال ہے۔ سرویز کا زمانہ تھا۔ ایک دن خاصی رات گئے ان کی ڈاڑھ میں سخت درد ہونے لگا۔ اس وقت جو کچھ ہو سکتا تھا، گھریلو علاج کیا گیا، لیکن اس سے کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ ساری رات انھوں نے بہت بے چینی سے کاٹی۔ اگلی صبح ان کی خوشامت آئی۔ تو مختصر سا ناشتہ کر کے یہ اینگلو طبیہ کالج چلے گئے کہ وہاں کسی حکیم صاحب سے دکھا کے دوائی لے آئیں۔ وہاں جو پہنچے، تو لڑکوں نے پہچان لیا۔ اب کیا تھا، وہ انھیں گھیر گھار کے کالج کے ہال میں لے گئے اور دو گھنٹے تک ان سے کلام سنتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علاج تو خیر کیا ہوتا، جب یہ وہاں سے لوٹے ہیں، تو ان کی مظلوم صورت دیکھنے کے قابل تھی۔ نہ صرف دانت کا درد بدستور موجود تھا، بلکہ اس پر درد سر کا اضافہ ہو چکا تھا۔ گئے تھے روزے چھڑانے، نماز گلے پڑی۔ میں نے پوچھا کہ آخر آپ نے یہ کیوں کیا، انکار کر دیا ہوتا۔ تو روتی صورت بنا کے کہنے لگے: بھائی، میں کیا کرتا، وہ طالب علم اتنی محبت سے اصرار کر رہے تھے، کہ مجھ میں انکار کی ہمت نہ رہی۔

بات سے بات یاد آتی ہے۔

جگر صاحب کے ساتھ ہمیشہ کوئی نہ کوئی شخص رہا ہے۔ سفر ہو یا حضر، انھیں کسی ہر وقت کے آدمی کی ضرورت ہوتی، جو ان کے روزمرہ کے معاملات کی نگرانی کر سکے، ان کی ضروریات کا خیال رکھے، روپے پیسے کا حساب رکھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے مزاج میں سکون اور اطمینان نہیں۔ بات جلد بھول جاتے ہیں۔ انتظامی صلاحیت شروع میں شاید کچھ رہی ہو، اب وہ بھی نہیں۔ اس لیے اگر دیکھ بھال کے لیے کوئی نہ کوئی آدمی ان کے ساتھ نہ رہے، تو خدا جانے کیا ہو جائے۔ اب اگر یہ آدمی مخلص اور ہمدرد اور بے غرض دوست ہوا، تو اس سے انھیں بے حد آرام ملتا ہے، اور کوئی نقصان بھی نہیں ہوتا۔ لیکن بعض اوقات آدمی کے انتخاب میں غلطی بھی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح کا حادثہ چند برس ادھر پیش آیا۔ یہ صاحب مستعد تو بہت تھے، لیکن سلتے چور۔ آج یہ چیز غائب کر دی، کل وہ۔ جگر کے دوستوں نے انھیں بہت متنبہ کیا کہ یہ آدمی اعتماد کے قابل نہیں، لیکن انھوں نے کسی کی بات پر کان نہ دھرا۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ اور تو اور، جگر صاحب کو بھی ان کی کارگزاریوں کا یقین آگیا۔ کوئی اور ہوتا، تو اس کے بعد انھیں ایک لمحہ بھی اپنے ساتھ رکھنا گوارا نہ کرتا۔ لیکن اس کے باوجود کہ انھیں معلوم ہو گیا تھا کہ وہ کس قماش کے بزرگ ہیں، یہ ان سے معذرت کرنے کا حوصلہ نہ کر سکے۔ ایک دن یہ غسل خانے جانے والے تھے۔ چاہتے تھے کہ کلائی کی گھڑی اتار کر باہر بیٹھنے کے کمرے میں رکھ جائیں۔ لیکن یہاں وہ ذات شریف موجود تھے۔ انھیں پورا یقین تھا کہ گھڑی ان کی غیر حاضری میں غائب ہو جائے گی۔ اب یہ تذبذب میں کہ کریں تو کیا۔ گھڑی کو غسل خانے میں اندر لے جا نہیں سکتے اور باہر چھوڑ جانے میں جو خطرہ ہے، وہ سامنے موجود ہے۔ آخر جب مزید انتظار ناممکن ہو گیا، تو جھنجھلا کے گھڑی ان صاحب کے ہاتھ میں دے کر کہا: اچھا، تو یہی آپ لیجیے۔ اور خود غسل خانے میں داخل ہو گئے۔

سمجھتا ہوں، اگر پیٹ پالنے کی مجبوری نہ ہوتی یا بعض دوسری ذمہ داریاں ان کے سر پر نہ ہوتیں، تو یہ کبھی کوئی کام نہ کرتے۔ ان کی طبیعت کا خمیر جن اجزا سے اٹھایا گیا ہے، ان میں کاہلی اور سستی کچھ ضرورت سے زیادہ مقدار میں پڑ گئی ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ جہاں تک شعر کا تعلق ہے وہ واقعی روح القدس کے شاگرد ہیں۔ لیکن جہاں دنیا کا معاملہ ہے، بالکل کودن ہیں۔ وہ ہفتوں اور مہینوں کبھی تنکا اٹھا کے نہیں توڑیں گے۔ اس پر ایک بات یاد آگئی۔

(۴)

۱۹۳۲ء میں جگر صاحب بھوپال گئے۔ محمود صاحب ان دنوں وہیں ملازم تھے۔ یہ گرمی اور برسات کے کوئی چھ مہینوں کے پاس ٹھہرے۔ شہر کے اکثر صاحب ذوق حضرات روزانہ شام کو اپنے اپنے کام کاج سے فارغ ہو کر محمود صاحب کے مکان پر جمع ہوتے اور جگر صاحب کی صحبت کا لطف اٹھاتے۔ ادبی گپ اور لطیفہ بازی ہوتی شعر و شاعری کا دور چلتا اور بالعموم یہ پر لطف اجتماع رات کے نو بجے سے لے کر صبح کے دو دو تین تین بجے تک رہتے۔ اب ظاہر ہے کہ یہ دو ایک دن کی بات تو تھی نہیں۔ روزانہ پانچ پانچ چھ چھ گھنٹے تک تمام آداب و تکلفات کے ساتھ ایک جگہ بیٹھے رہنا ہفت خواں سے کم نہیں تھا، بالخصوص جب کہ ان میں بعض احباب اچھے خاصے سن رسیدہ تھے۔ کسی بے فکرے کو سوجھی کہ ایک ایسی انجمن بنائی جائے، جس میں ادب آداب کے سب قیود اٹھا دیے جائیں تاکہ سب احباب آزادی اور بے تکلفی سے اپنا وقت گزار سکیں۔ سب نے اس تجویز پر صاد کیا۔

انجمن کا بنیادی اصول یہ قرار پایا کہ آج کل دنیا میں جتنی بے چینی ہے اس کی علت غائی سرعت رفتار ہے۔ مثال کے طور پر دیکھئے کہ پرانے زمانے میں لوگ بالعموم پیدل جاتے آتے تھے، تو سب طرف امن و امان کا دور دورہ تھا۔ شروع میں سواری کا رواج صرف معذوروں اور بیماروں کے لیے تھا۔ اس کے بعد ان چیزوں کا غلط استعمال ہونے لگا اور اب تو نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ ان غریبوں کو تو کوئی پوچھتا تک نہیں اور ہر طرح سے چاق چوبند اور ہٹے کٹے لوگ گاڑیوں اور موٹروں اور ہوائی جہازوں میں اڑے پھرتے ہیں۔ اس برق رفتاری نے دنیا میں جنگ و جدال اور ہلاکت و تباہی آسان کر دی ہے، کیونکہ جب تک یہ سریع سامانِ نقل و حرکت معرض وجود میں نہیں آئے تھے، جنگ شاذ و نادر ہی ہوتی تھی : اور اگر کار قضا کہیں ہو بھی گئی، تو اس کی تباہ کاری کا میدان بہت محدود رہتا تھا۔ چونکہ فوج، سامان جنگ، اسلحہ، رسد وغیرہ کی نقل و حمل میں بڑی دشواریاں تھیں، اس لیے اگر ملکوں میں آپس میں کوئی اختلاف پیدا بھی ہو جاتا، تو وہ ان مشکلات کے پیش نظر حتی الوسع بات بڑھانے سے اجتناب کرتے اور ایک دوسرے سے مصالحانہ گفتگو کر کے فیصلہ کر لیتے تھے۔ جنگ صرف اس وقت ہوتی، جب اور کوئی چارہ کار نہیں رہتا تھا۔ پھر چونکہ مسافت طے کرنے میں لامحالہ کافی وقت لگتا تھا، اس لیے حملہ آور فوج کے منزل مقصود تک پہنچتے پہنچتے دوسرا ملک بھی کم و بیش تیار ہو جاتا۔ یوں فریقین کی طاقت یکساں ہو جانے سے کسی ملک کو خاص نقصان نہ رہتا اور صلح صفائی پر خاتمہ ہو جاتا۔

" لیکن اب کیا ہے ! فاصلے کی کوئی حقیقت ہی نہیں رہی۔ صبح کا ناشتہ دلی میں کرو، تو ہوائی جہاز میں بیٹھ کے دوپہر کا کھانا تہران میں کھاؤ۔ اسی طرح لڑائی بھی آسان ہو گئی ہے سا بھی الٹی میٹم دیا اور گھنٹہ آدھ گھنٹہ بعد غنیم کے ملک پر گولہ باری شروع کر دی۔ اس سے بڑی تباہی آتی ہے۔ شہر اور بستیاں پل بھر میں ویران ہو جاتی ہیں۔ بے گناہ اور ناکردہ کار لوگ گوناگوں مصیبتوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یہ سارا عذاب ہم پر اسی سرعتِ رفتار کی بدولت نازل ہوا ہے۔ جب تک دنیا کاہلی جیسی نعمتِ خداوندی کی قدر کرتی رہی، سب کی زندگی عیش و عشرت اور آرام و آسائش سے معمور تھی۔ جب لوگوں نے کفرانِ نعمت کیا، تو بے چینی اور پریشانی کا شکار ہو گئے۔ اب بنی نوعِ انسان کو کاہل

سے ملانے کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ اسے کاہلی جیسی نعمتِ الٰہی کی طرف واپس لایا جائے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے لازم ہے کہ وہ سکون اور کاہلی کی تبلیغ کریں تاکہ مخلوقِ خدا سرعتِ رفتار کے ہاتھوں لائی ہوئی مصیبت سے نجات پا سکے۔

جب اس اصول پر سب کا اتفاق ہو گیا، تو چند "امن پسند باشندگانِ بھوپال" نے یہ اقدام کیا کہ ایک انجمن "الکہلا" (مفرد کے وزن پر کاہل کی جمع کہلا) کی بنیاد رکھی اور باقی دنیا کے امن پسندوں کو دعوت دی کہ وہ بھی ہر جگہ اسی طرح کی انجمنیں قائم کر کے اس مقصدِ عالی کے حصول میں تعاون کریں۔ بھوپال کی صدر انجمن کا دفتر (دار الکہلا) محمود صاحب کے سکونتی مکان کا ایک کمرہ قرار پایا، جہاں جگر مقیم تھے۔ فرش پر بھوپال کی خاص مورتی تھی اور اس پر ایک دبیز گدہ ڈال دیا گیا تھا جس پر سفید براق چاندنی بچھی رہتی تھی۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ انجمن میں داخلہ آسان تھا اور ہمہ شما سب اس کے رکن ہو گئے تھے۔ بلکہ اگر کوئی شخص رکنیت کی درخواست کرتا تو انجمن کے عظیم الشان مقاصد پر ایمان اور ان کے مطابق عمل کرنے کی خواہش اور قابلیت معلوم کرنے کے لیے، اس کی کاہلی کا امتحان لیا جاتا۔ اگر وہ اس امتحان میں پورا اترتا، تو اسے باقاعدہ رکن قبول کر لیا جاتا۔ داخلے کی فیس ایک تکیہ تھی۔ جس دن کوئی شخص رکن منتخب ہو جاتا، وہ گھر سے ایک تکیہ لے آتا اور اسے "دار الکہلا" میں ڈال دیتا۔

انجمن کے صرف چار عہدیدار تھے۔ جناب جگر، صدر، یعنی "صدر الکہلا" تھے۔ نائب صدر جناب حسرت لکھنوی تھے، جنھیں "نائب الکہلا" کہتے تھے۔ ان حضرات کو صدر اور نائب صدر اس لیے نہیں چنا گیا تھا کہ یہ بہت اچھے شاعر تھے بلکہ انھوں نے اپنی غیر معمولی "کاہلانہ صلاحیتوں" سے ثابت کر دیا کہ وہ واقعی اس اعزاز کے بجا طور پر مستحق ہیں اور اس عہدے کی اہم ذمہ داریوں کو سر انجام دینے کے پوری طرح قابل ہیں۔ تیسرا عہدہ "ناظم الکہلا" کا تھا۔ اس پر محمود صاحب کا تقرر ہوا تھا۔ ان کے ذمے یہ کام تھا کہ "دار الکہلا" میں ہر طرح کا انتظام کریں، اجلاس کے لیے مطلوبہ اشیا مہیا کریں، روزانہ کارروائی کا پروگرام بنائیں وغیرہ۔ چوتھے "نقیب الکہلا" کہلاتے، جنھیں آپ سارجنٹ ایٹ آرمز (SEARGENT AT ARMS) کہہ سکتے ہیں۔ اس عہدے پر جناب عزم بنارسی فائز تھے۔ ان کا فرض تھا کہ صدر انجمن کے مختلف احکام بلند آواز سے حاضرین تک پہنچایا کریں۔ چونکہ یہ بڑے لمبے تڑنگے اور بلند آواز تھے، اس لیے یہ عہدۂ جلیلہ ان کے سپرد کیا گیا تھا۔ ان عہدہ داروں کے علاوہ اکیس ارکان تھے، جن میں بھوپال کے بعض مشہور اور معزز اصحاب وقت شامل تھے۔ مثلاً میاں محمد صدیق صاحب نائب مہتمم تاریخ، سید علی اکبر صاحب سپرنٹنڈنٹ محکمہ صحت عامہ و تعلیمات، جناب احسان اللہ خاں شاکی سپرنٹنڈنٹ مجلس واضع قوانین، استاد ذکی بھوپالی، فکرتی بھوپالی، سرخوش بھوپالی، باسط بھوپالی، شعری بھوپالی وغیرہ۔ ایک ادبیات۔ ہر ایک رکن کو اس کی کسی ذاتی خصوصیت کی بنا پر خاص خطاب سے سرفراز کیا گیا تھا اور اجلاس میں وہ اسی نام سے مخاطب کیے جاتے تھے۔ مثلاً جناب مہدی صاحب اپنی بزرگی اور مشفقانہ رویے کی وجہ سے "ام الکہلا" کہلاتے تھے۔ فکرتی صاحب کی چونکہ چھوٹی سی مٹر ملیاں توند تھی، اس لیے انھیں "تربہ الکہلا" کا خطاب دیا گیا۔ سید علی اکبر چونکہ دراز قد تھے، اس لیے "طویل الکہلا" کہلاتے۔ ایک صاحب کا ناک نقشا خوبصورت اور رنگ بھی سانولا سلونا تھا، یہ "ملیح الکہلا" تھے؛ اور ان کے مقابلے میں ایک دوسرے صاحب اپنے سفید شلجمی رنگ کی وجہ سے "صبیح الکہلا"۔ ایک صاحب چائے میں شکر بہت پیتے تھے بلکہ ماؤ نگلے، تو دوسروں کی آنکھ بچا کر ایک آدھ چمچہ یوں ہی منہ میں ڈال لیتے تھے۔ اس لیے انھیں "قند الکہلا" کا خطاب عطا ہوا۔ پھر چونکہ پورا خطاب زبان سے ادا کرنا بھی کاہلی کے خلاف سمجھا گیا، اس لیے تخفیف کر کے یہ حضرات محض "صدرل"، "قندل" وغیرہ ہو کے رہ گئے۔

انھی کے اجلاس شام سے نو بجے سے صبح کے تین بجے تک ہوتے تھے۔ "اجلاس" اس حالت کا نام تھا کہ وہ لیٹے ہوئے تکیے پر سر رکھے لیٹے ہوتے ہیں۔ کاہلی کے معنی خوابِ غفلت کے نہیں تھے۔ اس لیے اجلاس کے دوران میں سونا ممنوع تھا۔ مگر اجلاس میں جو چاہے لیٹ سکتا تھا یا پھر کمر ٹکا کر بیٹھ سکتا تھا۔ بیٹھنا سخت ترین جرم سمجھا جاتا تھا کیونکہ یہ فعل کاہلی کے سراسر منافی تھا۔ اگر کوئی صاحب اس جرم کے مرتکب ہوتے، تو انھیں یہ سزا دی جاتی کہ وہ تمام دوسرے اراکین کی خدمت بجا لائیں مثلاً پانی پلانا، پان کھلانا، اگالدان اٹھا کے دینا، پنکھا جھلنا وغیرہ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب کوئی "کاہل" اجلاس کے دوران میں "صدر الکاہلا" میں تشریف لاتے، تو چونکہ بیٹھنا ممنوع تھا اس لیے وہ کھڑے کھڑے جسم کو کستے اور دھڑ سے اپنے تکیے پر گر پڑتے۔

روزانہ کاہلی کے عجیب و غریب واقعات پیش آتے تھے۔ ایک دن "صدر الکاہلا" بیٹھے حقہ پی رہے تھے کسی "کاہل" کا ہاتھ لگا تو چلم ان کے اوپر الٹ گئی۔ لیکن مجال ہے جو انھوں نے کسی تشویش یا بدحواسی کا اظہار کیا ہو۔ بس ایک کروٹ لی، انگارے ان کی چھاتی پر سے نیچے گر گئے اور وہ اسی طرح اطمینان سے لیٹے رہے۔ لیکن جب "صدر" نے دیکھا کہ اس طرح فرش میں آگ لگ جانے کا خطرہ ہے، تو انھوں نے اجلاس ملتوی کر دیا۔ اس پر لوگ اٹھ دوڑے اور انگارے اٹھا کے بجھا دیے گئے۔

اجلاس میں وہ سب کچھ ہو سکتا تھا جو تفریح کی ذیل میں آتا، بشرطیکہ اس سے کاہلی کو ٹھیس لگنے کا اندیشہ نہ ہوتا۔ اور شعر و شاعری تو روزانہ ہوتی تھی۔ چونکہ لیٹے لیٹے شعر پڑھنا اور داد دینا مشکل تھا، اس لیے جب شعر کی ترنگ اٹھتی، تو کوئی رکن یہ تجویز پیش کر دیتا کہ اب تھوڑی دیر کے لیے شعر و شاعری کا دور ہو جائے، تو "صدر" اجلاس ملتوی کر دیتے، جس کے معنی یہ تھے کہ اب لوگ اٹھ کے بیٹھ سکتے ہیں۔ ماشاء اللہ سب اراکین سخن ور یا کم از کم سخن سنج تو تھے ہی، ایک دوسرے سے مقابلے کے جوش میں طبیعت پر خوب زور دے دے کر شعر کہتے۔ ہر ایک شخص روزانہ اپنا تازہ کلام پیش کرتا۔ یہ فضا جگر صاحب کی شاعرانہ صلاحیتوں کے چمکانے بلکہ ابھارنے میں بھی بہت مفید ثابت ہوئی۔ ان کی بعض مشہور اور بلند پایہ غزلیں اسی "صدر الکاہلا" کے دور میں کہی گئی تھیں۔ مثلاً حسب ذیل غزلیں اسی زمانے کی یادگار ہیں:۔

۱۔ جو اب بھی نہ تکلیف فرمایئے گا
۲۔ نظر ملا کے، مرے پاس آ کے لوٹ لیا
۳۔ ہجومِ تجلی سے معمور ہو کر
۴۔ عشق میں لاجواب ہیں ہم لوگ
۵۔ حسنِ معنی کی قسم، جلوۂ صورت کی قسم!
۶۔ دل حریفِ حال و بے حال نہیں
۷۔ رسمِ عاشقی کا صلہ چاہتا ہوں
۸۔ محبت میں یہ کیا ستم دیکھتے ہیں!
۹۔ جب تک شبابِ عشق مکمل شباب ہے
۱۰۔ سنتا ہوں کہ ہر حال میں وہ دل کے قریں ہے
۱۱۔ تڑپ کر دل انھیں تڑپا رہا ہے

۲۔ دل کو جب دل سے راہ ہوتی ہے،

وغیرہ

حیدرآباد میں برسات کے موسم میں بارش بہت شدید ہوتی ہے۔ یہاں کا سالانہ اوسط غالباً (۳۰) انچ ہے۔ لیکن اس زمانے میں بھی جب موسلادھار بارش گھنٹوں رہتی اور گھر سے باہر پاؤں رکھنا محال ہوتا، سب کے سب "کاہل" وقت کی پوری پابندی سے بلا ناغہ وہاں کھانا کھانے پہنچ جاتے۔ ادھر نو بجنے لگے تو سب ہوئے کہ ہر ایک پانی میں ڈوبا چلا آرہا ہے۔ اب یہ "ناظم" کا فرض تھا کہ ان کے گیلے کپڑے اتروا کر ان کی جگہ خشک کپڑے مہیا کرے۔

یوں بھی مہینے تک ہر رات تین تین بجے تک کی غیر حاضری سے ان لوگوں کے گھروں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ جو اصحاب متاہل تھے، ان میں سے بعض کی بیویوں نے تو یہ باور کرنے سے انکار کر دیا کہ جگر کوئی شاعر ہے، جس کے پاس یہ حضرات جا کے بیٹھتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہو نہ ہو، یہ کوئی طوائف ہے، جس کے کوٹھے پر جا کے یہ لوگ روزانہ رنگ رلیاں کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ متعدد احباب کو جگر کو ساتھ لے جا کے ان کی طلعتِ زیبا اپنی بیویوں کو دکھانا پڑی، تاکہ ان کا اطمینان ہو جائے۔

شہر کے لوگ جگر کو دعوتوں میں بلاتے تھے۔ اس سے نہ صرف انہی کا وقت ضائع ہوتا، بلکہ ان کی غیر حاضری سے انجمن کی معمولی سرگرمیوں میں بھی بہت کمی بلکہ بے لطفی ہو جاتی تھی۔ کاہلوں کو یہ کسی عنوان منظور نہیں تھا۔ اس لیے غور و خوض کے بعد اس کا سدِباب یوں کیا گیا کہ انجمن نے یہ قرار داد منظور کی کہ چونکہ دعوتوں سے عام طور پر کاہلی کے جذبے کو نقصان پہنچتا ہے، جس کی قربانی کسی صورت روا نہیں کی جا سکتی، اس لیے یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ آئندہ اگر کوئی صاحب "صدر سل" کو چائے یا کھانے کی دعوت دیں، تو ان کے ساتھ بقیہ سب اراکین کو بھی مدعو کریں۔ یہی نہیں، بلکہ رات کے کھانے کی صورت میں، اس دن رات کا اجلاس "بھی نو سے تین بجے تک میزبان صاحب ہی کے مکان پر منعقد ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ نہ صرف ان اصحاب کے اکل و شرب کا انتظام کریں بلکہ ان کے بیٹھنے اور رات بسر کرنے کے لیے اپنے مکان کا ایک کمرہ بھی خالی کر دیں۔ بے شک، اس پابندی سے دعوتوں میں بہت کمی ہو گئی، لیکن پھر بھی کبھی کبھی کوئی منچلا یہ تمام شرائط قبول کر کے دعوت کر ہی دیتا تھا۔

جب رات کے تین بجے اجلاس ختم ہوتا، تو اس سے پہلے بے دودھ کی چائے کا دور چلتا، جو پیالیوں کی بجائے فنجانوں میں پی جاتی تھی۔

اس انجمن کا ایک گروپ فوٹو بھی لیا گیا تھا، جو یقیناً اب بھی اکثر "کاہلوں" کے پاس موجود ہوگا۔

اس انجمن کو درہم برہم ہوئے ایک زمانہ ہو گیا، جو نیک مقاصد سامنے رکھ کے یہ بنائی گئی تھی، افسوس، وہ تو پورے نہ ہوئے۔ دنیا کی اور بے شمار جدوجہد تحریکیں بھی ناکام رہی ہیں اور سچ پوچھیے تو اس دنیا نے ازل سے نیکوں کی قدر کہاں کی ہے۔ اس لیے محض اس ایک انجمن کا ماتم بے کار ہے۔ لیکن میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر آج بھی کوئی اس طرح کی انجمن یا جماعت قائم ہو جس کا طرۂ امتیاز "کاہلی" قرار پائے، تو اسے جگر صاحب سے زیادہ فعال صدر میسر نہیں آسکتا۔ سچ ہے، یہ خدا کی دین ہے۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست

(۵)

جگرؔ کا تعلق ایک علمی خاندان سے ہے۔ بزرگوں کا وطن دراصل دلی تھا۔ ان کے مورثِ اعلیٰ مولوی محمد سمیع شاہجہان کے استاد سمجھے جاتے تھے، کسی بات پر عتابِ شاہی نازل ہوا اور وہ ترکِ وطن کر کے مرادآباد میں آ مقیم ہوئے۔ جگرؔ کو شاعری گویا ورثے میں ملی۔ جدِ امجد حافظ محمد نور شاعر تھے۔ نورؔ تخلص تھا۔ والد مرحوم مولوی بزرگ علی بھی شاعر تھے۔ نظرؔ تخلص کرتے اور ناسخؔ کے شاگرد رشید وزیرؔ لکھنوی سے مشورہ کرتے تھے۔ خود جگرؔ نے ابتدا میں چندے منشی حیات بخش رساؔ کو کلام دکھایا، لیکن پھر داغؔ سے رجوع کیا، جو رساؔ کے بھی استاد تھے۔ داغؔ کی وفات (۱۹۰۵ء) کے بعد کچھ دن منشی امیر اللہ تسلیمؔ سے بھی اصلاح لی۔

جگرؔ کی ایک خصوصیت قابلِ تعریف ہے۔ انھوں نے غزل کے سوائے کچھ نہیں کہا؛ بلکہ عین ممکن ہے کہ اگر وہ کچھ اور کہتے، تو اس میں اس حد تک کامیاب بھی نہ ہوتے۔ چونکہ ان کی افتادِ طبع تھی ہی غزل کے مناسبِ حال، اس لیے ان کا کسی اور صنفِ سخن پر توجہ کرنا گویا اپنی صلاحیتوں کے غلط استعمال کے مرادف ہوتا۔ ان کا اپنے آپ کو غزل سے مخصوص کر لینا ان کے لیے بھی اچھا رہا اور غزل کے لیے بھی۔ اس میں شک نہیں کہ اردو میں غزل اتنی ہی پرانی ہے، جتنی خود یہ زبان۔ بظاہر اب اس میں کوئی جدت اور تازگی ممکن نہیں، کیونکہ کونسا وہ مضمون یا موضوع ہے، جسے متقدمین بیان نہ کر گئے ہوں۔ پس اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ جگرؔ کا کلام بھی وہی پرانے رنگ کی چیز ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس سے انکار ممکن نہیں کہ ان کا اسلوب اور لب و لہجہ اور کس بل خاص ان کی اپنی چیز ہے۔ اور چونکہ زمانے کا مذاق بدل گیا ہے۔ خود غزل کی ہیئت زبان اور اس کے موضوع بلکہ مقصد تک سے متعلق نئے نئے تجربے ہونے لگے ہیں، اس لیے اب یہ توقع کرنا کہ پھر کوئی جگرؔ کا سا غزل گو شاعر پیدا ہو گا، امیدِ موہوم سے زیادہ نہیں۔

ان کے کلام میں دو مختلف رنگوں کا امتزاج ہے۔ جرأتؔ اور داغؔ کی مادیت بھی ہے اور مومنؔ کی معنویت بھی۔ جگرؔ کا مزاج ان تینوں سے ملتا جلتا ہے۔ جرأتؔ اور داغؔ نے عشقِ جسمانی کی جو تصویریں اپنے کلام میں پیش کی ہیں، وہ کسی سے مخفی نہیں، ان کے ہاں کوئی پیچیدگی نہیں۔ وہی روزمرہ کی باتیں ہیں، جو آئے دن ہم میں سے ہر ایک کے تجربے میں آتی رہتی ہیں۔ جگرؔ نے ان دونوں پر یقیناً ترقی کی ہے، ایسی کہ بسا اوقات پڑھنے والے کا ذہن شعر کی مادیت کا پوری طرح احاطہ بھی نہیں کر پاتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے کلام میں ان دونوں کی سی صاف عریانی نہیں، بلکہ وہ اکثر اپنا مدعا ایسا پردے اور ہرک سے بیان کر جاتے ہیں کہ انسان پر اس کی عارضی ہیجانیت اور پیش پا افتادگی تک گراں نہیں گزرتی اور وہ اس پر خاص توجہ دیئے بغیر آگے گزر جاتا ہے۔

مومنؔ کے ہاں حسن و عشق کی تصویریں زیادہ گہرے رنگ میں ہیں اور ان سے لطف اندوز ہونا ہر کسی کے اختیار میں نہیں۔ ان کے کلام سے پوری طرح لذت یاب ہونے کے لیے لازم ہے کہ نہ صرف قاری کے ذہن کی تربیت ایک خاص فکری ماحول میں ہوئی ہو، بلکہ اس نے "فسق و فجور" کا کچھ نظری یا عملی تجربہ بھی کیا ہو۔ مومنؔ نے زمانۂ ہجر و وصال کی مختلف وارداتوں اور لاگ اور لگاوٹ کی گوناگوں کیفیتوں کا جو نفسیاتی نقشہ پیش کیا ہے، اس کا جواب نہیں۔ لیکن چونکہ ان کے ہاں ایک خاص طرح کا لفظی اشکال ہے اور اس کا تعلق فی الاصل بیشتر ان کے لہجے سے ہے، جس سے بات پوری سمجھ میں نہیں آتی، اس لیے وہ ان مضامین کے ادا کرنے میں پوری طرح کامیاب رہے ہیں، جو مومنؔ کا طرۂ امتیاز ہیں۔ نہ صرف یہی، بلکہ ان کے ہاں لفظی اشکال نام کو نہیں، اس لیے ان کی بات فوراً ہر ایک کی سمجھ میں بھی

آجاتی ہے۔

شراب کے مضامین جنھیں خمریات کا نام دیا گیا ہے جیسے کہ ان کے کلام میں بیان ہوئے ہیں، آپ کو دوسروں میں بہت کم کہیں دکھائی دیں گے۔ ریاض خیرآبادی کی خمریات مشہور ہیں۔ لوگ داغ کی بھی اس باب میں تعریف کرتے ہیں۔ معاملہ ایمان کی بات یہ ہے کہ ریاض اور حفیظ دونوں کے ہاں صرف درجہ کیفیت ہے۔ میں ان دونوں کی قادر الکلامی کا انکار نہیں کر رہا ہوں۔ دونوں استاد ہیں۔ دونوں زبان کی رنگینی اور شوخی میں قابل جواب نہیں۔ لیکن ریاض کی خمریات ہے ہے۔ فقرہ چست کر دینا یا پھبتی کہہ لینا اور بات ہے اور سرخوشی کے عالم میں اپنے اندرونی احساسات اور دلی تاثرات کا بیان الگ چیز ہے۔ وہ کیفیت اور سرور جو صرف ایک سچا میکش ہی محسوس کر سکتا ہے، نہ ریاض کے بس کی بات ہے، نہ داغ کی۔ اگر کبھی ایک قطرہ بھی ان دونوں کے حلق سے نیچے نہیں گیا، اس پہلو سے جو مزہ جگر اور جوش کے کلام میں ہے، وہ آپ کو اور کہیں نہیں ملے گا۔ غالب بھی شاذ و نادر جب کبھی اس طرح کے مضامین کہتا ہے تو ڈوب کر۔ اور اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ وہ بھی سنی سنائی باتیں نہیں لکھتا، بلکہ ذاتی واردات بیان کرتا ہے۔

بے شک یہ ضروری نہیں کہ انسان جو لذت محسوس کرے، اسے ہمیشہ بیان کر لینے پر بھی قادر ہو۔ کچھ لطیف جذبات اور احساسات ایسے ہوتے ہیں کہ زبان ان کے کامل اظہار سے قاصر رہ جاتی ہے۔ چنانچہ آپ کو عجز بیان کی مثالیں شراب پینے والوں کے ہاں بھی مل جائیں گی۔ لیکن یہ کبھی نہیں ہوگا کہ انسان نے کسی کیفیت کا مزے سے کبھی تجربہ کیا ہی نہ ہو اور وہ اسے کما حقہ بیان کر سکے۔

میں نے بارہا جگر کو شعر کہتے بلکہ پوری پوری غزل کہتے دیکھا ہے۔ آپ نے وہ داغ کا شعر کہنے کا لطیفہ تو ضرور سنا ہوگا، جگر کو کبھی اس طرح کا تجربہ نہیں ہوا۔ احباب کا مجمع ہے، مجلس جمی ہوئی ہے، لطیفے اور ہنسی مذاق کی گفتگو ہے، فقرے بازی اور گپ شپ ہو رہی ہے کہ کسی نے کہا: "جگر صاحب، اس مصرع پر مصرع یا اس شعر پر شعر تو کہیے۔" اگر ان کی طبیعت کسی وجہ سے بالکل ہی غیر حاضر نہیں، تو انھیں گرہ لگانے یا شعر کہنے میں کوئی تکلف نہیں ہوگا اور اگر مجمع واقعی معقول لوگوں کا ہوا، تو وہ غزل بھی پوری کریں گے۔

انھیں دوست مشورہ تک قبول کر لینے میں بھی عذر نہیں ہوتا۔ مثلاً ان کا ایک شعر ہے ؎

"عرض غم نہ کر، اے دل!" دیکھ، ہم نہ کہتے تھے
رہ گئے وہ اُونہہ کر کے، سن لیا جواب اُن کا!

پہلے مصرع ثانی میں "ہونہہ کہہ کر" تھا۔ ایک دن وہ یہ غزل سنا رہے تھے، تو میں نے ان سے کہا کہ اس کی جگہ "اونہہ کر کے" بنا دیجیے۔ کہنے لگے: "وجہ؟" میں نے جواب دیا کہ "اونہہ" کوئی مستقل کلمہ نہیں، جس کے لیے "کہنا" کہا جائے، بلکہ یہ ایک آواز ہے، اس کے لیے "کرنا" ہی مناسب ہے۔ میرا خیال ہے کہ انھوں نے اس کے بعد جوش سے بھی اس کا ذکر کیا تھا۔ جوش نے میری تائید کی، اس پر انھوں نے "اونہہ کر کے" بنا دیا۔

اسی طرح ایک اور موقع پر (شعر مجھے اس وقت یاد نہیں) میرے کہنے پر انھوں نے "اچھلنا" کی جگہ "ابھرنا" بنا دیا۔ اس جزو گوئی سے خودستائی مقصود نہیں، بلکہ مدعا یہ ہے کہ باوجود صف اول کے غزل گو اور شاعر ہونے کے ان میں وہ غلط پندار نہیں، جو ہمارے بعض "اساتذہ" کا نمایاں شعار ہے۔

(۶)

میں ۱۹۴۸ء کے اوائل میں دلی سے اور اگلے برس ملک ہی سے باہر چلا گیا اور ایک لمبے عرصے تک باہر رہا۔ اس زمانے میں جگر سے میرے تعلقات بالکل منقطع ہو گئے (یوں بھی وہ خط و کتابت کے زیادہ عادی نہیں)۔ البتہ سنتا رہا کہ اب بفضلہ انھوں نے شراب سے توبہ کر لی ہے، حج بھی کر آئے ہیں، اور بہت محتاط زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ۱۹۵۲ء کے آغاز میں اچانک مجھے کراچی جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں چند اور احباب کے محمود صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔ کہنے لگے: جگر آج کل یہیں کراچی میں ہیں۔ میں نے کہا: چلو، ان سے ملیں۔ شام کا وقت تھا کہ ہم دونوں ان کی قیام گاہ پر پہنچے۔ زینے پر چڑھتے ہوئے میں نے محمود صاحب سے کہا کہ آپ میرا نام نہ بتائیے گا، دیکھیں، پہچانتے ہیں یا نہیں۔ اوپر پہنچے، تو دیکھا کہ جگر صاحب کرسی پر براجمان ہیں اور ارد گرد حسب معمول آٹھ دس آدمی کرسیوں اور مونڈھوں اور تخت پر بیٹھے ہیں۔ بجلی کی روشنی اچھی خاصی تیز تھی۔ محمود صاحب سے علیک سلیک ہوئی۔ میں خاموش کھڑا رہا۔ سر کو کوئی (۲۰) درجے زمین جانب جھکا کر چند ساعت آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ پیشانی کے بل کہہ رہے تھے کہ حافظے کے منفی اور مثبت تار تیزی سے جڑ رہے ہیں۔ بارے، دیر نہیں لگی۔ "ارے، ملک رام ہیں!" کہہ کے کھڑے ہو گئے۔ تپاک سے معانقہ کیا اور پوچھا: "بھائی، بہت دن کے بعد ملے۔ کہو، کیسے ہو؟" میں نے کہا، صاحب، داد دیتا ہوں آپ کے حافظے کی کہ چودہ پندرہ برس کے بعد یوں آسانی سے پہچان لیا، حالانکہ وہ عالم اور تھا اور اب اور ہے۔" کہنے لگے: "اس میں کسی حد تک آپ بھی معاون ثابت ہوئے۔ آخر انسان کی شخصیت اتنی جاندار تو ہو اور وہ اتنا پائیدار اثر تو چھوڑ جائے کہ دوسرا شخص چاہے بھی، تو اسے بھلا نہ سکے۔" چونکہ میں جانتا ہوں کہ جگر تملق کے روادار نہیں اور لوگوں کی بے جا مدح ان کا شعار نہیں، اس لیے ان کی اس بات سے مجھے خوشی محسوس ہوئی۔

جگر کی شخصیت بڑی پیاری اور دل آویز ہے۔ دل کے صاف، زبان کے کھرے، وہ کسی کے بُرے میں نہیں۔ میں نے کبھی کسی کی غیبت ان کی زبان سے نہیں سنی۔ صرف یہی نہیں، وہ دوسرے کے صریح نقص کی جگہ بھی اس کی خوبیوں کا بیان کریں گے۔ بلکہ کبھی کبھی وہ دوسرے کے نقص کی ایسی توجیہہ کرتے ہیں کہ وہ نقص ظاہر میں کم دکھائی دینے لگتا ہے مثلاً ہمارے ایک شاعر دوست عقیدے کے لحاظ سے دہریے ہیں۔ وہ پوری بے باکی سے جا و بیجا اپنے اس عقیدے کی تبلیغ کرتے رہتے ہیں اور انھوں نے نظم و نثر میں بھی اس موضوع پر بہت کچھ لکھا ہے۔ ایک مرتبہ جگر سے اُن سے متعلق گفتگو ہونے لگی۔ میں نے کہا: کاش ، ان کی زندگی کا کم از کم یہ پہلو ہی درست ہوتا۔ کہنے لگے: بھائی، دلوں کے بھید جاننے والا تو خدا ہے، لیکن جس تحدی اور شدت سے وہ اپنے الحاد کا اظہار کرتے ہیں، اس سے مجھے شبہ ہوتا ہے کہ ان کے دل میں چور ہے اور وہ واقعی ایسے نہیں۔ تم جانتے ہو بعض طبیعتیں کسی کے سامنے بھی سر جھکانے میں عار محسوس کرتی ہیں۔ کسے باشد، ان کے نزدیک کسی کی اطاعت قبول کرنا ہتک کے ہم معنی ہے۔ وہ جدی پٹھان ہیں، اور ان کے باپ دادا کی سرکشی اور شورہ پشتی کے واقعات تم مجھ سے زیادہ جانتے ہو۔ پس وہ خدا کی تسلیم کرنے میں بھی اپنی توہین سمجھتے ہیں، حالانکہ دل سے وہ ملحد نہیں۔

اس بات کو جانے دیجیے کہ ان کی تاویل درست ہے یا نہیں —— بلکہ اصلیت یہ ہے کہ غلط ہے، کیونکہ میں یقینی سے جانتا ہوں کہ ان کا استدلال مضبوط نہیں اور وہ صاحب بھی واقعی ملحد ہیں اور اس کے اعلان میں فخر کرتے ہیں —— لیکن ان کے اس قول سے خود جگر کی سیرت اور کردار کا جو رخ ہمارے سامنے آتا ہے، وہ کتنا دلکش ہے۔

[illegible] ہے [illegible] زندگی میں [illegible] سے
[illegible] ([illegible]) ، [illegible] کی [illegible] صفات کو [illegible] زندگی [illegible]
[illegible] خوبیوں [illegible] تو [illegible]
[illegible] ذات [illegible] خوبیوں کے [illegible] کوئی حیثیت نہیں [illegible] تو
[illegible] ہو سکتا ہے [illegible] ہے کہ کوئی شخص
[illegible] اتنا ہی زیادہ [illegible] سے محبت کرے گا ۔

میرا حال کے بہت خوش ہوئے تم سے پیارے !
اس خرابے میں ، مری جان ! تم کہاں ہو

———

صوفی تبسم

وفا سناتی ہے دل کے قصّے کبھی زباں سے کبھی نظر سے
جو بات لب تک نہ آ سکی تھی نظر نے آخر کہی نظر سے

یہ کس نے پھر سازِ دل پہ میرے نئی امنگوں کے راگ چھیڑے
یہ کس نے پھر ایک بار دیکھا مجھے محبت بھری نظر سے

جو کچھ ترے دل کی ہو تمنا، وہی مرے دل کی آرزو ہے
جہاں کی ہر شے کو دیکھتی ہیں مری نگاہیں مری نظر سے

تری محبت نے مجھ کو ہر بار اک نئی زندگی عطا کی
کہ دل نے ہر بار تجھ کو دیکھا، نئی تمنا نئی نظر سے

نہ جانے کتنی جدائیوں کے اٹھائے صدمے دلِ حزیں نے
نہ جانے کتنی قیامتیں تھیں گزر گئیں جو مری نظر سے

صوفی تبسم

یہ صحنِ چمن یہ آشیانے
تعمیرِ قفس کے ہیں بہانے

اک بات نظر نے کی نظر سے
اس بات کے بن گئے فسانے

جھکتا ہی نہیں کہیں سرِ شوق
سنسان پڑے ہیں آستانے

تھی رسمِ وفا کبھی جہاں میں
اس بات کو آج کون مانے

پل بھر کے لیے جدا ہوئے ہم
پل بھر میں گذر گئے زمانے

اشکوں میں چمک کہاں سے آئے
داغوں کے شرر ہوئے پرانے

احمد ندیم قاسمی

نارسائی کی قسم، اتنا سمجھ میں آیا
حسن جب ہاتھ نہ آیا تو خدا کہلایا

سب حجاباتِ نظر دل کے نہ دیکھنے تک تھے
درد چمکا تو اندھیرا بھی نہ رہنے پایا

پیار آجاتا ہے اب تو شبِ تنہائی پر
تیرا غم، میری محبت کو کہاں لے آیا

میں تری بزم سے اُٹھ کر بھی تری بزم میں ہوں
میں نے جب خود کو گنوایا تو تجھے اپنایا

رات کا شکر کرو اے دوست کہ دن ڈھلتے ہی
تیرے پیکر سے اُچٹ آئے گا تیرا سایا

ابر کے چاک سے جب رات ستارے جھانکے
اے مرے بھولنے والے تو بہت یاد آیا

اشک آنکھوں میں جب آئے تو چمک اٹھیں صدیاں
یوں کہ جس دور کو دیکھا اُسے گریاں پایا

جب بھی دیکھوں کوئی شہ پارۂ فن، سوچتا ہوں
کتنے لوگوں نے مرا قصۂ غم دہرایا

اس توقع پہ، کہ شاید کبھی انساں سنبھلے
ہر نئے ظلم نے جینے پہ مجھے اُکسایا

خشک شاخوں پہ نوکے یہ نگینے کیا ہیں؟
زندگی ہے اگر اک پیڑ کی ڈھلتی چھایا

اب ہے محتاج بس اک حرفِ تسلی کا، ندیم
میں نے جس دل کے لیے ایک جہاں ٹھکرایا

فضل کریم فضلی

زندگی میں خوشی بھی ہے غم بھی — زندگی زخم بھی ہے مرہم بھی
پھول بھی زندگی ہے شبنم بھی — جشن بھی ہو رہا ہے ماتم بھی
سازگار آگیا ہمیں غم بھی — ہیں عجب چیز واقعی ہم بھی
مجھ کو بخشی اسی نے تشنہ لبی — وہ کہ ہے مے بھی جام بھی جم بھی
نام تیرا کہ اک طلسم بھی ہے — ہے یہی نام اسم اعظم بھی
ذکر اتنا ترا کیا ہم نے — قابلِ ذکر ہو گئے ہم بھی
جب تمھی تم تھے یا ہمیں ہم تھے — ہم پہ گزرے ہیں ایسے عالم بھی
ہے وہ قامت دلیل خود اس کی — اک قیامت ہے قدِ آدم بھی
سنتے ہیں ہم سے دور بھی وہ نہیں — چل کے دیکھیں تو دو قدم ہم بھی
مستقل برہمی بجا، لیکن — لوگ مل بیٹھتے ہیں باہم بھی
بات ہی اور ہے خوشی کی، مگر — دولتِ لازوال ہے غم بھی
قحط اتنا ہے باکمالوں کا — سمجھے جاتے ہیں مغتنم ہم بھی

کیا مزا بزمِ غیر کا فضلی
ہم نے مانا ہوئے مکرم بھی

قطعات

اختر انصاری

یہ جہاں

زندگانی لبِ انفاس پہ اک نالہ ہے
ستمِ دہر نے گوندھا جسے وہ مالا ہے
ہم کو تسلیم ترا آبلۂ دل اختر
یہ جہاں خود بھی تو اک ٹیس بھرا چھالا ہے

یہی کیا کم ہے

وجہِ ناز اپنی الم خوردہ ہنسی کیا کم ہے
مایۂ فخر یہ غم دیدہ خوشی کیا کم ہے
تیری بدخوئی و بیہودہ سری کے باوصف
جی لیے اتنے دن اے چرخ! یہی کیا کم ہے!

لمحۂ آسودہ

صبحِ نوروز مری عید نہیں ہو سکتی
حورِ جنت مری اُمید نہیں ہو سکتی
میرے اک لمحۂ آسودہ کی قیمت اختر
عشرتِ ہستیٔ جاوید نہیں ہو سکتی

تضییعِ جمال

زندگی فرد کی شہ پارۂ فن ہے اُس کا
کون ہے ہم میں جو صانع نہیں فنکار نہیں
لیکن افسوس یہ ہے، روحِ جمالِ ہستی
پھر بھی شرمندۂ گل کاریٔ اظہار نہیں

جنسِ نایاب

عمر بھر جینے کی تہمت بھی اُٹھے گی یارب
اور پھر حشر کی زحمت بھی اُٹھے گی یارب
لیکن اپنا یہ جنوں، ہائے یہ جنسِ نایاب
کبھی اس جنس کی قیمت بھی اُٹھے گی یارب

میری طرح

قتیل شفائی

اے مرے دشمنِ جاں
میں تجھے اور تو کچھ کہہ نہیں سکتا لیکن
کاش تقدیر کبھی تجھ کو دکھائے وہ دن
جب مہذّب سی طوائف کوئی
اپنے پیشے کی مذمت کر کے
تجھ سے اظہارِ محبت کر کے
تیرے اعصاب پہ نشّے کی طرح چھا جائے
اور تجھے
اُس کی محبّت کا یقیں آجائے
اے مرے دشمنِ جاں

عدم

بس، پردۂ آبِ انگور کیا ہے — نہ معلوم ساقی کو منظور کیا ہے

نگاہوں کا دھوکا کہ دل کا شرارا — ذرا دیکھنا یہ سرِ طور کیا ہے

نہیں فاصلے کی کوئی جب حقیقت — یہ نزدیک کیا چیز ہے۔ دُور کیا ہے

ہر اک شے نے مٹنا ہے جب لامحالہ — تو پھر زخم کیا شے ہے۔ ناسور کیا ہے

پیالہ ہے جب خود بھی اک ظرفِ فرضی — تو پھر مے کے چندن سے مخمور کیا ہے

نظامِ دو عالم ہے جب اتفاقی — تو پھر قاعدہ کیا ہے۔ دستور کیا ہے

میں یہ سوچتے سوچتے تھک گیا ہوں — یہ مختار کیا ہے، یہ مجبور کیا ہے

مرا دل بھی گم ہے بڑی مدتوں سے — تری زلف میں چشمِ بد دور کیا ہے

نہ دیکھا ہو جس نے تری کاکلوں کو — اُسے کیا خبر عالمِ نور کیا ہے

مرے دل کا چھوٹا سا ناقص پیالہ — اگر یہ تہی ہے۔ تو بھرپور کیا ہے

بتوں کا کرم بھی نہیں کم عدم پر
خدا کے کرم کا تو مذکور کیا ہے

شعلۂ آواز

جگن ناتھ آزاد

میلوں کی مسافت سے جو آئی تری آواز — اللہ رے آواز کا شوقِ پرِ پرواز
شاید یہ مرے دردِ محبت کا ہے اعجاز

حیرت میں ہوں یہ سانس کی اک لے تھی کہ جو ساز — ممکن ہو تو حیرت پہ مری کھول دے یہ راز
تو دور کہ نزدیک تھی اے جلوہ گہِ ناز

کانوں میں ابھی گونج رہی ہے وہی آواز — معصومیتِ قلب و نظر کی جو ہے غماز
کیا فکر کا اسلوب تھا کیا بات کا انداز

لہجہ بھی وہی بات کا اندازِ بیاں بھی — الفاظ میں پنہاں تھا وہی کیفِ رواں بھی
آزاد! نہیں بھی تو وہی تھی وہی ہاں بھی

میزانِ مجتمع میں سے تول گئی ہے — اس طرح مرے دل کی گرہ کھول گئی ہے
گفتار کہ احساس میں رس گھول گئی ہے

کہسار سے گزری چمنستان سے گزری — گلزار، بیابان، خیابان سے گزری
ہر راہ میں اک ناز سے اک آن سے گزری

اس طرح سے پھر منزلِ مقصود تک آئی — خود صاحبِ آواز کی تصویر دکھائی
اللہ رے یہ میرے مقدر کی رسائی

آواز تھی یا طور کے شعلے کی لپک تھی — یا دل کے بیابان میں یادوں کی مہک تھی
ظلمات میں اک لمحے کو بجلی کی چمک تھی

اے دیکھنے والو! یہ ذرا راز تو دیکھو — اک نطقِ دلآویز کا اعجاز تو دیکھو
"شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو"

میکش اکبرآبادی [1]

مرے چمن میں گلوں کی ہنسی بھی کام آئی
مگر نسیم کی آشفتگی بھی کام آئی

مہک رہا ہے ترا حسن بے رخی اس میں
ہمارے دل کی فسردہ کلی بھی کام آئی

وہ حسن دیکھ لیا تجھ میں جو نہ تھا تجھ میں
مری نگاہ کی ناآگہی بھی کام آئی

بسا دیے مری بے منزلی نے ویرانے
جنابِ خضر مری گمرہی بھی کام آئی

جنوں سہی یہ مرا ترکِ آرزو لیکن
مرے جنوں میں تری بے رخی بھی کام آئی

رہِ غلط پہ قدم رکھ کے لوٹ آیا ہوں
کبھی کبھی مری کم ہمتی بھی کام آئی

وہاں ملے وہ جہاں کا مجھے گماں بھی نہ تھا
مرا جنوں مری آوارگی بھی کام آئی

مری طلب سے زیادہ ملا مجھے میکشؔ
دمِ سوال مری خامشی بھی کام آئی

شاد عارفی

اُن کے ذرّے کہ جنھیں فرصتِ نظارہ ہے
صحنِ گلشن کے عوض ہم کو قفس پیارا ہے

انقلابوں نے جنھیں خاک پہ دے مارا ہے
اُن شگوفوں کی "فغاں" نکہتِ آوارہ ہے

کچھ قیاسات کچھ حالات ہوا کرتے ہیں
آپ کو "آج" مبارک ہمیں "کل" پیارا ہے

آپ کو "مالکِ مختار" جو سمجھیں اُن سے
یہ نہ کہیے کہ وطن آپ کا گہوارا ہے

اُن کو ذرّوں سے بہرحال نپٹنا ہوگا
کہکشاں جن کی نظر میں "دلِ صدپارہ" ہے

ترکِ سنگِ درِ محبوب کی باتیں نہ کرو
آج تک ہم نے کوئی قول نہیں ہارا ہے

"التفاتِ غلط انداز" نے چلتے چلتے
تیر تاکا ہے کہیں اور کہیں مارا ہے

آشیانوں کی تباہی سے بہ قطعِ نظر
جو بھی گلشن کو سنوارے وہ چمن آرا ہے

آج ہر خار کی حالت ہے اُس انسان کی طرح
دیکھ کر جس کو کہیں لوگ کہ "بےچارہ ہے"

تیرے گیسو کے مہکتے ہوئے سائے کی قسم
"جامِ گلنار" دہکتا ہوا انگارہ ہے

وہ مرے طنز سے مانوس نہ ہوں گے اے شادؔ
"آئنہ" ہر حبشی کے لیے ناکارہ ہے

۱؎ اب میں یہ بغیر قافیہ اضافت کے بعد درست سمجھتا ہوں۔ آپ نہ سمجھیں۔

غلام ربانی تاباںؔ

عشق میں بیگانۂ جذب و اثر ہو جائے
کم سے کم اپنی نظر میں معتبر ہو جائے

توڑ دیجے بندشِ صحن و روشِ مثلِ صبا
شوق کہتا ہے سراپا بال و پر ہو جائے

جادۂ غم میں کسی کا نقشِ پا بن جائے
اس قدر مٹئے چراغِ رہگزر ہو جائے

عقل والوں کی ہنسی کا اس سے بہتر کیا جواب
دربدر ہو جائے آوارہ تر ہو جائے

ہائے دل مانگے ہے پھر عہدِ تغافل کے مزے
پھر بھلا دیجے ہمیں پھر بے خبر ہو جائے

حضرتِ تاباںؔ تماشے کی ہوس کے باوجود
محفلِ خوباں میں محتاطِ نظر ہو جائے

شبِ آہنگ

منظور حسین شور

یہ ثریا، یہ کہکشان و نجوم
یہ مہ و سال کا سکوتِ دراز

چاک ہے جبرئیل کا دامن
یا دریچہ ہے قصرِ ماہ کا باز

آسماں پہ ہے گردِ انجم و ماہ
یا بھٹکتی ہے وقت کی آواز

ابنِ آدم کی روح کا ہے سکوں
یا خلا میں ہے ابر کی پرواز

دوشِ فطرت پہ ہے جزیرۂ ماہ
یا سلگتا ہے خیمۂ شب باز

بامِ گردوں پہ چاند کی ہے کمند
یا مرے فکرِ شعر کا انداز

انجم و کہکشاں کے دامن پر
ہے شبِ غم نگاہ سجدہ طراز

عکس مہتاب میں ہے یوں جیسے
پڑھ رہا ہو امامِ شہر نماز

کس کو معلوم بحر و بر کا سکوت
کتنے طوفانوں کا ہے محرمِ راز

لوٹ کر آ رہے ہیں پھر دن رات
خامشی چھیڑتی ہے وقت کا ساز

چاند کے فقرہ پوش سائے میں
کوئی راہی ہے یوں نوا پرداز

جیسے رستے میں لے کے میرا نام
مٹے صدا دور سے کوئی دمساز

آج اے دوست میرے اشکوں میں
کاش ڈھل جائے تیرے غم کا گداز

میرا نالہ بھی تیری رسوائی
میرا نغمہ بھی درد کا غماز

دل دھڑکتا ہے رات یوں جیسے
آئینہ توڑتا ہو آئینہ ساز

کس نداند کجا است ایں مطرب
"کہ سخت نزدیک می رسد آواز"

عبدالمجید حیرت

وہ جسے دیدہ وری کہتے ہیں
ہم اُسے بے بصری کہتے ہیں

نام اس کا ہے اگر باخبری
پھر کسے بے خبری کہتے ہیں

یہ اگر لطف و کرم ہے تو کسے
جور و بیدادگری کہتے ہیں

کیا اِسی کارِ نظر بندی کو
حسن کی جلوہ گری کہتے ہیں

گل کے اوراق پہ کانٹوں کا گماں
کیا اسے خوش نظری کہتے ہیں

بہرِ بیمار دوا ہے، نہ دعا
کیا اسے چارہ گری کہتے ہیں

کم کسی کو یہ خبر ہے کہ کسے
رنج بے بال و پری کہتے ہیں

یاس و حرماں کو بہ الفاظِ دگر
آہ کی بے اثری کہتے ہیں

نام ہے وہ بھی جگرداری کا
ہم جسے بے جگری کہتے ہیں

آپ خود بھی تو گل اندا موں کو
حور کہتے ہیں، پری کہتے ہیں

فصلِ گل ہی تو ہے وہ، ہم جس کو
موسمِ جامہ دری کہتے ہیں

عشق میں عین ہنرمندی ہے
سب جسے بے ہنری کہتے ہیں

مفت کی دردسری کو ہم بھی،
مفت کی دردسری کہتے ہیں

آپ سے ہم سے بنی ہے، نہ بنے
آپ خشکی کو تری کہتے ہیں

کیا کوئی بات کبھی اہلِ جنوں
از رہِ ناموری کہتے ہیں

ہم پہ یہ بھی ہے اک الزام کہ ہم
داستاں دردبھری کہتے ہیں

کوئی خوش ہو کہ خفا ہو حیرت
ہم تو ہر بات کھری کہتے ہیں

رفعت سلطان

سوئے منزل نہ جو رواں ہوں گے — صورتِ گردِ کارواں ہوں گے
لب اگر محوِ فغاں ہوں گے — داغِ دل اور بھی عیاں ہوں گے
دو گھڑی ہنس کے بات کر ہم سے — پھر خدا جانے ہم کہاں ہوں گے
گلستاں میں بہار آنے دے — ڈالی ڈالی پہ آشیاں ہوں گے
آہ وہ فاصلے جو قرب پہ بھی — میرے اور اُن کے درمیاں ہوں گے
حسن جب تک نہ جلوہ گر ہوگا — دونوں عالم دھواں دھواں ہوں گے
چھڑ گیا پھر ترے شباب کا ذکر — دل کے ارمان پھر جواں ہوں گے
آپ کہتے ہیں تو یقیں ہے مجھے — آپ بھی میرے قدرداں ہوں گے
ہم نہ ہوں گے مگر ہمارے بعد — اشک اس آنکھ سے رواں ہوں گے

وجہِ بربادیٔ دل رفعت
آپ جیسے ہی قدرداں ہوں گے

راز یزدانی

سوچیے ہم سے تغافل بھی بجا ہے کہ نہیں
کہ یہی مقصدِ اربابِ وفا ہے کہ نہیں

زیست میں لمحۂ اندوہ جفا ہے کہ نہیں
اے محبت کوئی تیری بھی خطا ہے کہ نہیں

پست کر دیتے ہیں موجوں کو ابھرنے والے
ڈوبنا خود نہ ابھرنے کی سزا ہے کہ نہیں

چھاؤں میں پھولوں کی آنکھیں تو جھپی جاتی ہیں،
کون دیکھے یہ چمن جاگ چکا ہے کہ نہیں

ہاں مرے عشق نے سوچے تھے بڑے ہنگامے
تو نے چھپ چھپ کے سہارا بھی دیا ہے کہ نہیں

کیا غلط عشق کو ہے جرمِ وفا کا اقرار
حسن پر زحمتِ بیداد و جفا ہے کہ نہیں

تجھ کو بیداریٔ گلشن کی قسم ہے کہ بہار
ذہنِ انساں بھی کہیں جاگ رہا ہے کہ نہیں

سب ہیں شاہد کے بھلانے کا بہانہ کر کے
میں نے ہر وقت ترا نام لیا ہے کہ نہیں

کس کو جینے سے ہے فرصت جو یہ سوچے کہ مجھے
کوئی کام اور بھی جینے کے سوا ہے کہ نہیں

شکریہ آپ کے احسانِ جفا کا لیکن
یہ کرم فتنۂ آغازِ جفا ہے کہ نہیں

ہے ابھی فیصلہ باقی کہ دلوں پر اب تک
آپ سے کوئی ستم ہو بھی سکا ہے کہ نہیں

راز پھولوں پہ بہاروں کا کرم ہے لیکن
یوں بھی کلیوں کا جگر چاک ہوا ہے کہ نہیں

جمیل ملک

جو دیکھیے تو ہمیں زندگی نے کیا نہ دیا
بس ایک خاطرِ تنہا کو آسرا نہ دیا

یہ رختِ جاں کہ ازل سے اٹھائے پھرتے ہو
اگر گراں ہے تو کیوں راہ میں لٹا نہ دیا

ہر ایک بولتی صورت کو غور سے دیکھا
مگر کسی نے ترے شہر کا پتا نہ دیا

جہانِ شوق میں ہم سر بلند ہو جاتے
غضب کیا کہ ہمیں بزم سے اٹھا نہ دیا

نگاہِ حسن کے ترکش سے کتنے تیر چلے!
کوئی بھی زخم مگر زخمِ عشق سا نہ دیا

ہنسی ہنسی میں ستم گر نے جان بھی لے لی
صلہ وفا کا دیا یوں کہ خوں بہا نہ دیا

کوثر نیازی

کیا غم ہے جو شمعیں بجھنے لگیں، کیا غم ہے جو تارے ڈوب گئے
فرقت کی اندھیری راتوں میں پلکوں پہ چراغاں ہوتا ہے

اک پھول چمن میں بلبل سے یہ رازِ محبت کہتا تھا
شبنم کے ترشح سے ٹھنڈا اک سینۂ سوزاں ہوتا ہے

اے اہلِ جنوں! مژدہ ہو تمہیں، اُمید تمہاری بر آئی
پھر فصلِ بہاراں آتی ہے۔ پھر وا درِ زنداں ہوتا ہے

اللہ رے یہ ناوک فگنی، الزام بھی جس کا دے نہ سکیں
جو تیر نظر آتا ہے ادھر، پیوستِ رگِ جاں ہوتا ہے

بارش کے برستے قطروں میں بجلی کے چمکنے کا منظر
روتا ہوں تصور میں لیکن اک چہرۂ خنداں ہوتا ہے

موجوں میں تلاطم ہو نہ اگر مطلوب کنارہ ہو کیوں کر
ساحل کے پرستارو ساحل پر دردۂ طوفاں ہوتا ہے

ہر لمحہ، بجومِ رنج و الم ہم مشکل سہی کر لیتے ہیں
جب سازِ دل و جاں پر کوئی چپکے سے غزل خواں ہوتا ہے

شفقت کاظمی

ہر گھڑی کرب مسلسل میں کٹی جاتی ہے
زندگی اپنے گناہوں کی سزا پاتی ہے

یاد آؤں کہ نہ آؤں میری قسمت لیکن
اُن سے اُمیدِ ملاقات چلی جاتی ہے

یوں مرے بعد بھی دنیا پہ اُداسی طاری
جیسے دنیا میرے حالات کا غم کھاتی ہے

جب بھی آتا ہے تصور تیرے افسانوں کا
ایک فریاد مرے منہ سے نکل جاتی ہے

خوش رہو دشتِ تمنا کی ہواؤ کہ مجھے
تم سے بچھڑے ہوئے یاروں کی مہک آتی ہے

زندگی میں کئی ایسے بھی ملے تھے ساتھی
روح اب جن کے تصور سے بھی گھبراتی ہے

غور کرتا ہوں جو شفقت کبھی تنہائی میں
اپنے حالات پہ تا دیر ہنسی آتی ہے

کس راہ پہ ہیں رواں دواں ہم
جائیں گے خبر نہیں کہاں ہم

اک بار فریب کھا گئے تھے
اب تک ہیں کسی سے بدگماں ہم

یوں تیری نگاہ سے گرے ہیں
گویا تھے متاعِ رائگاں ہم

رستوں کی خبر نہ منزلوں کی
کیا جانئے آ گئے کہاں ہم

دل میں تھیں کچھ ایسی حسرتیں بھی
تجھ سے جو نہ کر سکے بیاں ہم

گذری ہے قفس میں عمر لیکن
بھولے نہیں یادِ آشیاں ہم

ہر حال خوشی اُنہی کی چاہی
کرتے رہے پاسِ دوستاں ہم

پیش آئے نجانے کیا سفر میں
گھر سے تو چلے ہیں شادماں ہم

اک منزلِ بے نشاں کی دُھن میں
شفقت نہ پھرے کہاں کہاں ہم

بشیر بدر

رات اک خواب ہم نے دیکھا ہے
پھول کی پنکھڑی کو چوما ہے

دل کی بستی بھی شہر دلی ہے
جو بھی گزرا ہے اس نے لوٹا ہے

روشنی روپ بدلا کرتی ہے
چھپ گیا چاند درد چمکا ہے

کیا ہنسوں اک ذرا سی آہٹ پر
درد خوابیدہ جاگ پڑتا ہے

خندۂ گل فریب ہے گل کا
رات بھر چپکے چپکے رویا ہے

ہم تو کچھ دیر ہنس بھی لیتے ہیں
دل ہمیشہ اداس رہتا ہے

وہ سرِ طور ہو کہ صبحِ ازل
میں نے پہلے بھی تم کو دیکھا ہے

اب بجز تری یاد کے اے دوست
اس خرابہ میں کون آتا ہے

پیسہ ہاتھوں کی میل ہے بابا
زندگی چار دن کا میلہ ہے

کوئی مطلب ضرور ہو گا میاں
یوں کوئی کب کسی سے ملتا ہے

گیسو کھولے ہے رات کی رانی
ہر نفس چاندنی کا مہکا ہے

چاندنی کیوں بہت اداس نہ ہو
چاند کا چہرہ اترا اترا ہے

تم اگر مل بھی جاؤ تو بھی ہمیں
حشر تک انتظار کرنا ہے

اپنی بس ایک ہی تمنا تھی
پوچھتے وہ کہ کیا تمنا ہے

ایک شب کے گناہگار رکھو
صبح تک ہم کو لوٹ جانا ہے

کتنی گمبھیر ہو گئی ہے رات
بدرؔ دیکھو کہ تارا ٹوٹا ہے

خراب آباد

وارث کرمانی

میں نے با دیدۂ تر
ایک دن اُس گلِ رعنا سے کہا
جب یہ ثابت ہے کہ اس نرگسِ شہلا کے سوا
کوئی زمزم کوئی تسنیم نہیں
جب یہ ظاہر ہے کہ اس عارضِ رنگیں کے سوا
اس خرابے میں کوئی چیز نہیں وجہِ سکوں
ایک بازارِ قیامت ہے جہاں
سر چھپانے کو زمیں ہے نہ زماں
سینے بڑھتے ہوئے ادراک کے صحراؤں میں
رینگتی پھرتی ہے کیڑوں کی طرح نسلِ بشر
کوئی منزل ہے نہ منزل کا نشاں

جب یہ عالم ہے تو اے جانِ جہاں
کیوں نہ دنیا کو تہِ گیسوئے پرخم کر دوں
اور اس حسن کی رنگین بہاروں میں رہوں
یہ جو پیشانیٔ سیمیں پہ ہے نازک سی شکن
یہ شکن نظمِ دو عالم تہ و بالا کر دے
ان نگاہوں کے اشاروں پہ بصد عجز و نیاز
فاتحِ سلطنتِ روم و فرنگ
دل و جاں پیشکشِ وعدۂ فردا کر دے

اس حسیں جنبشِ لب پر بخدا شیخِ زماں
چاک کرتا ہوا دستارِ فضیلت اپنے
اور عرق سے ورق مینا کر دے
آہ یہ شوخیٔ رفتار یہ اک قامتِ ناز
قبر سے رقص کناں حافظِ شیراز اُٹھے
نذرِ قدموں پہ سمرقند و بخارا کر دے
دیکھ اسے پیکرِ ناز
کب سے بے خواب امیدوں کی برات
خیمہ زن ہے لب و عارض کے قریب

ہرزہ ہے مصلحتِ دانش و دیں
جھوٹ ہے زہد و عبادت کا طلسم
پاکیٔ دامن و تقدیس جبیں کچھ بھی نہیں
علم و آگاہی و ایمان و وفا کچھ بھی نہیں
خیر و شر کچھ بھی نہیں سہو و خطا کچھ بھی نہیں
اس زمانے میں کوئی شے بخدا کچھ بھی نہیں
اب تو اذنِ نگہِ ناز ملے
شوق کو رخصتِ پرواز ملے
یہ گراں باریٔ آداب ہٹے

عشقِ ستم پیشہ

زبیر رضوی

وہ اک کلی
جو ابھی بہاروں کی پالکی میں دلہن بنی مسکرا رہی تھی
خیال کی وادیوں میں خوابوں کے ہاتھ تھامے ٹہل رہی تھی
سہیلیوں کا سشرِیز بچپن کوئی کہانی سُنا رہا تھا
دراز پلکوں کی چلمنوں میں حیا کھڑی مسکرا رہی تھی

وہ اک کلی
کہ کھُلا نہ بندِ قبا کی تنگی کا حال جس پر
سرِ گلستاں گلوں کی شادابیاں کھڑی تھیں سوال بن کر
وہ ایک شیشہ کہ جس میں اُترا کوئی نہ عکسِ نگار اب تک
وہ ایک نغمہ ملا نہ جس کو کسی مغنی کا پیار اب تک

سنا ہے اک شب
وفا کی بستی کا ایک بدنام شاہزادہ
حریمِ گلشن میں آگیا تھا
سحر ہوئی تو چمن میں ہر سُو
کلی کی رسوائیوں کے چرچے
کلی کے بندِ قبا کے ٹکڑے
پڑے ہوئے جا بجا ملے تھے.....

محورِ بہارِ کائنات

ادیب سہیل

وہ شب کہ جس میں چاند بے نقاب تھا
شعاعِ حسن پہ عجیب عالمِ شباب تھا
لپٹ رہی تھی شاخِ گل سے سرخوشی میں چاندنی
تمہارے ہونٹ پر مچل رہی تھی گیت کی کلی
ہمارے پردۂ ستار کی صدا تھی مد بھری
نہ جانے تا بہ کے رہی یہ نغمگی، یہ زندگی، یہ دلبری —
رُکا طلسمِ نغمگی کا سلسلہ !
تمہارا پھول سا بدن کھلا ہوا تھا شوق میں ہماری شاخِ دست پر
نفس نفس رچی ہوئی تھی نشۂ خود سپردگی
تمہارا ہات میرے ہات میں یوں پڑا ہوا
کہ آ گیا تھا محورِ بہارِ کائنات آج آپ ہی گرفت میں

یہ شب کہ جس میں چاند ہے نہ پھول ہے
تمام منظرِ حسیں پہ تیرگی کی دھول ہے
نہ جانے کس نگر میں جا چھپی ہے دل کی چاندنی
ستارِ غیر ہو گئی ہے جیسے اپنی سرخوشی
نہ تان کی ہے روشنی نہ نغمگی کے پھول ہیں
اُگے ہوئے قدم قدم پہ درد کے ببول ہیں
اُجاڑ شاخِ دست ہے
ہے سوزشِ نہاں سے اب سماں سماں، دھواں دھواں
وہ ہات جس کی اب مجھے تلاش ہے
بسی ہوئی خیال میں ہنوز جس کی باس ہے
نہ دور ہے نہ پاس ہے
مگر حصول کی ابھی تو دل کو اپنے آس ہے
وہی وہی جو محورِ بہارِ کائنات ہے

دو ہمسائیاں

راجہ مہدی علی خاں

شکیلہ
تمہارے بچے، ہماری بلی کی دُم پکڑتے ہیں، ان کو روکو
تمہارے مرغے ہماری چھت پر اذان دیتے ہیں، ان کو ٹوکو

عقیلہ
تمہارا بکرا ہمارے آنگن میں آگھسا تھا، ہلا کے داڑھی
دو ہتڑوں سے اسے بھگایا، وہ جا رہا تھا اُٹھا کے سلفی

شکیلہ
تمہاری بچی ہماری نانی کو "پوپلی" کہہ کے بھاگ جائے
تمہارا بچہ ہمارے نانا کو "خنڈہ" کہہ کہہ کے منہ چڑائے

حقیلہ
تمہارا کُتا، کچن میں گھُس کے ہمارا سب دودھ پی گیا ہے
جوانی پیٹے کو کیسا کھوں میں ابھی ابھی کھا کے گھی گیا ہے

شکیلہ
میں جانتی ہوں کہ میرے کتے کو اس پہ تو نے بھی کیا سزا دی
زباں سنبھال اپنی۔ ورنہ جھانپڑ میں تجھ کو دوں گی حرامزادی۔

عقیلہ
حرامزادی تو وہ تھی جس داشتہ نے تجھ کو جنم دیا تھا
کلال زادی تھی، مال زادی تھی، جس نے رشتہ تیرا لیا تھا

شکیلہ
تیرا حسین باپ تیری اماں کو ناگپور سے بھگا کے لایا
گیا جو پکڑا تو میرا سسرا ہی کل مٹھنے کو چھڑا کے لایا

عقیلہ: تمہارا شوہر! وہی جو بیٹھ کر کسی زمانے میں جھانکتا تھا
ہماری اماں کو روز چھپ چھپ کے اپنی کھڑکی سے جھانکتا تھا

شکیلہ: تمہارا شوہر بھی چھپ کے کھڑکی سے روز بندی کو جھانکتا ہے
وہ روز کھڑکی کے پاس ہی کیوں پڑی قمیصوں میں ٹانکتا ہے؟
لکھے تھے کل ہی مجھے جو اس نے، وہ عشقیہ خط ہیں پورے گیارہ
دکھاؤں گی سب کو آج یہ خط۔ پڑھے گا ان کو محلہ سارا

عقیلہ: اری بہن.... آپا.... کیا یہ سچ ہے؟ .... مری خطائیں معاف کردو
بہن بہن سے لڑی تو کیا ہے۔ جو دل میں ہے میل صاف کردو
میں کتنی باتیں سُنا رہی تھی۔ زبان خاموش تھی تمہاری
قسم خدا کی، بتاؤں کیسے؟ ہو تم مجھے جان و دل سے پیاری
تم اپنے گھر میں مجھے بُلانا۔ میں چھپ کے دیکھوں گی سب نظارہ
جو وہ اشارے کریں گے تم کو۔ ہوا کروں گی میں عشق سارا!
ابھی میں آتی ہوں، میری پیاری رومال میں باندھ لوں مٹھائی
ذرا مجھے بھی وہ خط پڑھانا کہ جن میں الفت گئی جتائی

تمہارا کتا اِدھر جو آئے نہ روکنا معصوم جانور ہے
وہاں جو کھائے، یہاں بھی کھائے کہ یہ بھی آخر اسی کا گھر ہے
تمہارا بکرا ہمیں ہنساتا ہے گھر میں آ کے۔ ہلا کے داڑھی
میں پیار سے روک دوں گی اُس کو اگر وہ میری اٹھائے ساڑھی

سپنوں کے دیس میں

ڈاکٹر اختر اورینوی

میں ایک کہانی لکھنے لگا ہوں۔ کہانی اس لیے کہہ رہا ہوں کہ کہانی لکھنے سے اپنے آپ اور اپنے ماحول کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ یکایک مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دھندلکے صاف ہو رہے ہیں، لکیریں ابھر رہی ہیں، ہیولے صورتیں اختیار کر رہے ہیں اور صورتیں جہت در جہت بدلتی ہوئی کیفیتوں اور معنوں میں تبدیل ہو رہی ہیں۔ یہ رقص و نیرنگ ہوتا رہتا ہے، یہاں تک کہ کیف و معنی کو محسوس کرنے اور سمجھنے والی حالت بھی مدھم ہوتے ہوتے ختم ہو جاتی ہے۔ شاید کہانی کا یہی نقطۂ انجام ہوتا ہے۔ لیکن کہانی پھر بھی لمبی معلوم ہوتی ہے۔ حلقۂ دامِ خیال کی ان گنت آنکھیں خواب عدم سے بیدار ہونے لگتی ہیں اور تماشائے عالم کرتی رہتی ہیں۔ عدم خواب تھا یا یہ زندگی خواب ہے، کون جانے!

سوتا سنسار۔ جاگتا پاک پروردگار۔ زمان و مکان کی حدوں سے آزاد خلا میں ایک بسیط و عظیم دماغ نے اپنی یکساں بیداری میں تنوع پیدا کرنے کے لیے ایک عجیب و غریب خواب دیکھا۔ خلا، جو لامحدود روشنی سے پُر تھا، اتھاہ اندھیرے سے بھر گیا۔ ہر سو خواب چھا گیا، خواب جو لامحدود کو محدود دائرے میں لاتا ہے۔ خواب جو دریائے رواں کو کوزہ میں بند کر دیتا ہے۔ خواب جو ازل و ابد کو ایک لمحے میں تبدیل کرنے پر قادر ہے۔

عالم خواب میں سکون مطلق تھا۔ رفتہ رفتہ سکون میں تناؤ پیدا ہوا، ایسی کیفیت تھی۔ جیسے سکون ذہن پر تنا ہوا ہو۔ بے جھول، سپاٹ، بے شکن۔ تکمیلِ سکون اپنی انتہا پر پہنچ کر دھسل کی مچھلی کی طرح تناؤ کی شدت سے پھٹ سا گیا۔ خلا میں لہریں پیدا ہوئیں۔ لامکاں ان خوابناک لہروں سے بھر گیا۔ لامتناہی لہریں، پیچیدہ لہریں۔ متصادم لہریں، اندھیرے میں بجلیاں سی کوندنے لگیں۔ عظیم خواب کے دھندلکے میں کائناتیں رقص کرنے لگیں۔ بسیط خواب ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ کچھ روشن اور نیم روشن دائرے بنے۔ عظیم و لامحدود دماغ کی خوابناک فضا میں کچھ دائرے شعلہ بداماں ہو کر بھڑکے اور خفا ہو گئے۔ کچھ کجلا گئے اور عالم عالم میں روشنیوں کے ساتھ ہی جگمگی کجلاہٹیں بھی پھیل گئیں۔

اب اوٹ پٹانگ سپنے کی کہانی کون کہے۔ سپنے تو سپنے ہی ہیں، سانچ کا اور نہ چھور۔ اس دنیا میں انوکھی ہوتی ہے۔ سپنے میں کبھی ایسا لگتا ہے کہ یہ سپنا ہے اور عام طور پر تو ایسا ہی ہوتا ہے کہ سپنا سچ مچ کی دنیا معلوم ہوتا ہے۔ میں سپنے کے ایک سنسار کی کہانی کہتا ہوں۔ یعنی ایک سنسار جو بیکراں سپنے میں ایک حقیر نقطے سے بھی حقیر تر ہے۔ مگر ہندو اور برہما کی حقیقت کوئی نہیں پا سکا۔ نارائن کے سپنے کے ایک نقطہ پر کیا گزری۔ سنئے:

سپنے کا ایک نقطہ ابھرنے لگا۔ ابھر کر پھیل گیا۔ بالائی جانب سے ایک مہین پردہ سا لہراتا ہوا آگیا۔ پھر یہ وہ ساکن ہو گیا۔ اس پر

کا کھیل ہو رہا تھا۔ مادّے سے خلیے، مرغیے، قسمیں، بیضوی، متعدد خلیوں پر مشتمل تھیں، گونا گوں قاشیں بہت ہی مشابہ تھیں
قاشیں تھیں، مخلوق ایک دوسرے میں منعکس ہو رہی تھی۔ ہوتے ہوتے یہ اجسام شکلوں اور صورتوں میں منقوش ہو گئیں۔ پہلے ایسا ہوا
کچھ عرصہ ہوا کہ یہ ایک نقش ترغیب میں جنبش پیدا ہوئی، سمتیں اب اجسام آنکھیں جھپکاتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہوتے ہوتے وہ واقعات
ہونے لگے۔ پھر نئے نئے طرح طرح کی حرکتیں کرنے لگے۔ پہلے تو ایسا ہوا کہ تتلیوں کو حرکت کی خود سے ہوتی ہوئی معلوم ہوئی۔ جیسا
تتلیوں کی آنکھوں میں گہری چمک سی پیدا ہوئی۔ پھر وہ پر سمیٹ کر ایک دوسرے کی آنکھوں سے شیشے میں جھانک کر دیکھنے لگے۔ اندر کی دنیا
عجیب و غریب تھی، پیچیدہ و پیاز کی مانند تھی، اتھاہ تھی۔ خارجی دنیا کو دیکھ کر تتلیوں کا سر چکرا گیا اور وہ بے خودی میں ناچنے لگے۔ ناچتے ناچتے
بے دم ہو کر ٹوٹ گئے۔ سب نئے اور سیدھے گر پڑے اور زمین پر گر گئے۔ پھر وہ اٹھ بیٹھنے کی کوشش کرنے لگے۔ کچھ اٹھ بیٹھے، کچھ
اٹھ کھڑے ہوئے اور چلنے پھرنے لگے۔ بعض ایسا لگا کہ وہ بالکل بے ساختہ ہو گئے ہیں۔ ان کے اندر ایک گھبراہٹ پیدا ہوئی۔ اس گھبراہٹ سے
انھیں یہ محسوس ہوا کہ وہ ایک بیچ جاگتے وجود ہیں۔ گھبراہٹ کے ساتھ آزادی کا احساس بھی تھا۔ تتلیوں کی دنیا میں انقلاب، اذیت اور لذت سے
بھر گئی۔ اس خلفشار اور کشمکش سے ایک اور حیرت کی کیفیت پیدا ہونے لگی۔ خواب کے پیچھے سے چھپنے لگے۔ عجیب تجربہ تھا۔ اذیت بھی مگر لذت بھی۔ کچھ
تتلے اس درد اور بوجھ سے بچ گئے۔ سوچنے کا بوجھ، فکر کا درد۔ یہ تتلے بڑے معصوم اور مسرور نظر آنے لگے۔ تتلیاں رفتہ رفتہ ان کی صورتیں مسخ ہونے
لگیں اور بے شکل سے تتلے دوسری قسموں اور شکلوں کے ان گنت پتلوں میں جا شامل ہوئے۔ کارنت تتلے ابھرنے لگے، بڑھنے لگے، پھیلنے لگے۔ مگر
اشک و آہ کی وادی میں تبسم و خندہ کی گھنٹیاں بجاتے ہوئے، سورج کی مشعل سے کھیلتے ہوئے، راستے ہی پھیلتے ہوئے، یہ تتلے آزادانہ آگے
بڑھنے لگے۔ پُرخطر منزلیں آئیں، ان کی ٹولیاں بچھڑ گئیں اور جماعتیں بن گئیں۔ تتلیوں کا کارواں گرتا پڑتا آگے بڑھتا رہا۔ کبھی یہ جتھے ٹوٹتے معلوم ہوتے
اور کبھی ہر تتلا یکسر آزاد و خود کار محسوس ہوتا۔ اس سفر میں ایک ایک تتلے کے اندر کیفیات، واردات، محسوسات اور تخیلات کی تہ بہ تہ شکنیں پیدا
ہوئیں۔ بے نام تجربے۔ نام تو بہت بعد میں رکھے گئے۔ تتلیوں کی حرکت و سکون، اعمال و افعال دائرۂ تعینات کے اندر آنے لگے۔ ایک
سنسنی خیز بات یہ ہوئی کہ تتلے جوڑا جوڑا ہو گئے۔ جوڑوں میں ایک مضبوط و تنومند اور دوسرا نازک و لطیف۔ ان جوڑوں میں ایک دوسرے کے
لیے بے پناہ کشش تھی۔ مقناطیسیت، برقیت۔ تتلیوں کے جوڑے ساتھ ساتھ رہنے لگے۔ یہ چمٹتے، الجھتے، ایک دوسرے کو بھینچتے، ایک دوسرے
میں سماتے، چھپیاں ہوتے اور ہم آہنگ حرکتیں کرتے۔ دو طرح کے پتلے تو پہلے ہی تھے۔ ان میں انفصال و انقسام بھی ہوتا ہی رہتا تھا۔ ان کی تعداد بڑھتی ہی
جاتی تھی۔ لیکن ان کے الگ الگ جوڑے نہیں بنتے تھے۔ اور اب جوڑے بن گئے اور ان جوڑوں کے وصال سے اور تتلے پیدا ہونے اور انہی کے ساتھ
رہنے لگے۔ ننھے ننھے تتلے، پیارے پیارے پتلے۔ بدلے ہوئے حالات نے بدلے ہوئے مزاج پیدا کر دیے۔

تتلیوں میں روح تو اسی وقت پھونک دی گئی تھی جب تتلے اٹھ بیٹھے تھے۔ اس لامبے سفر کی لغزش و افتاد، تصادم و تعاون نے تتلیوں کی
روحوں کو اور بالیدہ و پیچیدہ بنا دیا۔ روح کے ہر پیچ میں نت نئے تجربوں کے عکس مرتسم ہوتے جاتے تھے اور ان سے روحوں کی تہ داری بڑھتی جاتی تھی۔
نئے تجربوں کی آزادی نے تتلیوں میں بڑا اپنا پن پیدا کر دیا۔ ہر تتلا ایک فرد بن گیا۔ پہلے وہ محض ایک وجود تھا۔ تتلیوں سے جب جوڑے بنے اور ان جوڑوں
سے جب خاندان پیدا ہوئے تو تتلیوں کی انفرادیت اور بڑھ گئی۔ ان کے وجدان و ذوق کی یک گونہ یکسانیت کے باوجود ان کے احساسات و
جذبات کے محور بدل گئے۔ ان کے ارادوں اور عزائم کی منزلیں بدل گئیں۔ ان کے تخیل اور فکر کی سمتیں رنگ رنگ سامان ہو گئیں۔

———— اور جب منزہ پتلوں کے دماغ بے کراں تجربوں کی بجلی سے بھر گئے تو بولی پیدا ہوئی۔ ایک معجزہ ظاہر ہوا۔ یہ تتلے اب یہ

افراد فرد فرد ہوتے ہوئے بھی خاندانوں، قوموں، جنموں، قبیلوں اور جماعتوں میں منظم ہوتے رہے۔ بولیاں زبانیں بن گئیں۔ پتلوں نے خواہش ہی کیا پہلا لفظ کہ ہر شے کے نام رکھ دیے۔ آپ کے دل جلے ہوئے اور دماغ پرواز کرنے لگے۔ خواب کے پتلے ایک نئے عالم اسرار میں داخل ہو گئے۔ حیرت افزا طلسمی عالم وہ عالم — لب اور زبان رکھنے والے بھی گونگے ہوتے ہیں اور کان والے بھی بہرے۔ ایسے گونگے کہانی نہیں کہتے۔ ایسے کہانی نہیں سنتے۔ مگر پتلے بولنے لگے۔ مفہوم و معنی پیدا ہوئے۔ افکار پیکر الفاظ میں ڈھل گئے۔ پیوند ہوتا تو آپ یہ کہانی نہ سن پاتے۔ الفاظ قوت ہے۔ بیان قوت ہے۔ برہما نے اپنے سپنے کی مالا پہن لی۔ مالا کا ہر موتی ایک شبد تھا۔ موتیوں کے ہار سے کتابیں بن گئیں۔ وہ مالا کی جھنکار سپنوں کا ہوتا ہوا سفر!

خدا کے خواب کا اور نہ چھور۔ وہ خود ازلی اور ابدی۔ اس کے خواب پر بھی ازل و ابد کا پرتو۔ حق و حقیقت ایک ہے۔ خواب و تعبیر بھی ان گنت۔ برہما کے سپنے کے ایک بندو کی کہانی ہے۔ بندو ایک عظیم دائرہ بن گیا۔ دائرہ ایک سنسار۔ دائرہ کے پتلوں نے سنسار کے کونے کونے کے نام رکھ دیے۔ ہر کونے کے ہر نقش کے نام رکھ دیے۔ ذرے ذرے نامدار ہو گئے۔ چھوٹی چھوٹی نامدار ہو گئے۔ خواب کے پتلوں نے اپنی ایک کائنات گھیر لی۔ سورج، چاند اور تاروں سے اسے سجایا۔ شمع بنایا۔ زمانہ کو قدروں میں باندھا۔ پتلوں کا کلدان چاند تاروں کے ساتھ مہر و مہ پا مدار کے ساتھ زمان و مکان میں سفر کرتا ہی گیا۔ بندو ناچتا رہا۔ بندو پر پتلے ناچتے رہے۔ ساری کائنات ناچتی رہی ——— پتلوں نے بندو پر بہتیری کہانیوں کے چتر بنائے۔ پھر ان افسانوں کو جیتا جاگتا بنا دیا۔ پتلوں نے بہت بہروپ بدلے۔ بہت سے سوانگ رچائے۔ بہت سے ناٹک کھیلے۔ ہر پتلے کا اپنا اپنا کام۔ اور کام کے معنی نام رکھے گئے۔ کوئی بھلا کام، کوئی برا کام۔ پتلوں میں اچھے برے کی تمیز ابھری۔ نیک و بد، خوبصورت اور بدصورت کا امتیاز پیدا ہوا۔ محبت و نفرت نے بڑی پیچ دار شکلیں اختیار کیں۔ پتلوں کے وجود میں گتھیاں پڑیں۔ گرہیں ابھریں۔ انفرادیت شخصیت بن گئی۔ پتلوں کے روپ الوپ تو تھے ہی، اب ان کی شخصیتیں انیلی نیلی، نرالی نرالی ہو گئیں۔ اور اب پتلے سوچتے سوچتے سنسار کے سپنے بھی دیکھنے لگے۔ خواب در خواب!

عظیم خواب ان اجزائے خواب یعنی پتلوں کو حقیقت ہی معلوم ہونے لگا۔ خود ان کے دماغ میں ان گنت ننھے ننھے سپنے جنم لینے لگے اور حقیقت کا روپ دھارنے لگے۔ سماجیں بنیں۔ تمدن رچے گئے۔ تہذیبیں سانس لینے لگیں۔ پل پل کی تاریخ بن گئی اور تاریخ پھیلی!

ہمالہ نے برف آلود ٹھنڈے کہرے سے جھانک کر دیکھا۔ سندھو لہرا رہا تھا۔ برہم پترا بل پر بل کھا رہا تھا۔ گنگا، جمنا، نربدا، تاپتی، کرشنا اور کاویری تھرک رہی تھیں، ناچ رہی تھیں۔ وندھیا اور ستپڑا مہک رہے تھے۔ سندر بن گا رہا تھا۔ نیلگری منجیرا بجا رہا تھا۔ اور نیلے سمندروں میں نہائے ہوئے بادل مستی میں اپنے لئے بکھرائے ڈھول بجا رہے تھے۔ اس سنگیت سبھا کو ہمالہ نے اپنا سن سفید سر اور پرشکن پیشانی جھکا کر دیکھا۔ اس نے دیکھا، پورب دکھن کے ٹاپوؤں سے چوڑی ناک، چوڑے جبڑے اور چھوٹے چہرے والے پتلے ایراوتی اور برہم پترا کے ساتھ ناچتے گاتے ہوئے اس کی شرن میں آ گئے۔ ان کا رنگ تانبا جیسا تھا۔ پھر پچھم دیس سے کالے کالے پتلے، ابھرے ناک نقشے والے پتلے رقص کرتے، دھومیں مچاتے آئے اور اس کے دامن سے لے کر نیلگری اور نیلے سمندر تک چھا گئے۔ لوہے جیسے پتلے اور تانبے جیسے پتلے آپس میں ٹکرائے۔ اس ٹکراؤ سے آگ پیدا ہوئی۔ شعلے بلند ہوئے اور ہمالہ کی پیشانی پر پسینا آ گیا۔ پتلے پگھلنے لگے۔ پگھل کر گھل مل گئے، اور پھر مجسم ہو کر ناچنے گانے لگے۔ اپنی سنگیت سے سمے کو راگ کے تاروں میں باندھنے اور تاریخ کے گھروندے بنانے لگے۔ موہنجوداڑو اور ہڑپا جیسے گھروندے بنا ڈالے۔ ہمالہ نے سر اٹھا کر دیکھا۔ پچھم سے اور پتلے آئے۔ گورے گورے پتلے، دھار دار جیسے پتلے۔ تیکھے تیکھے، گٹھیلے گٹھیلے پتلے۔ تیر کمان سنبھالے ہوئے، گھوڑوں پر سوار۔ طوفان کی طرح آئے۔ بادل کی طرح گرجے۔ بجلی کی طرح کوندے۔ کالے، گٹھیلے اور بوڑھے

پہاڑوں پہ اُترتے پڑتے۔ اس کے بعد اُترتے ہی حملہ ہوا۔ چپٹی ناک، چھوٹی آنکھوں اور پتلی جسم والے پیلوں نے بار جنگلوں اور شہروں پر حملہ کر دھاوا کیا۔ ہر طرف سیلاب کیا۔ برہم پترا ہر طرف تھا۔ گورے اور پیلے پیلوں نے کالے پیلوں کو زنجیروں میں جکڑ دیا۔

گورے پیلوں میں ایک بہت ہی جیالا پتلا تھا۔ اس کا نام اِندرا تھا۔ وہ بڑا اپُر تپیا اور مہ نیتاں تھا۔ سیر و شکار میں اُسے بڑا لطف آتا تھا۔ کالے پیلوں کا جیتا جیتا خون بہا کر اُسے سرور حاصل ہوتا۔ آگ کے شعلوں کے سامنے بیٹھ کر تند رفتار گھوڑوں کی قربانی اور تاسے کے چراغ پھڑوں کے ٹکڑے کھینے اور قربانوں کا جھنڈا اندر کو مرغوب تھا۔ خون اور گوشت کی بو سے اس کے نتھنے پھڑکنے لگتے تھے۔ اس نے گورے پیلوں کو بہت بڑے حصے میں حملہ کیا۔ وہ کالے پیلوں اور ان کے گھوڑوں کا شکار کھیلنے نکل کھڑا ہوا۔ وہ کالے پیلوں کو نیست و نابود کر دینا چاہتا تھا۔ وہ بھالا اور ندیوں کی ترائیوں میں کالوں کو اپنے خون آشام تیروں کا نشانہ بناتا رہا اور اس نے اپنی اولاد کو بھی یہ وصیت کی۔ مگر کالے پیلے ان گنت تھے۔ گوروں سے بہت زیادہ۔ صدیاں بیت گئیں۔ مگر گوروں اور کالوں کی جنگ ختم نہ ہوئی۔ آخر میں ایک بڑا گیانی گورا پیدا ہوا۔ اس کے ہاتھ میں نہ تیر تھے، نہ تلوار تھی۔ اس نے قانون بنا کر دو حصوں میں بانٹ دیا۔ اس گیانی کا نام منو تھا۔ اس سے پہلے پانچ اور پانچیں بھی بڑے گیانی گورے تھے۔ لیکن انھوں نے شبدوں کے موتی جیسے تھے۔ ان کی مالا ہوتی تھی۔ شبد بڑے شکتی والے۔ انھیں دونوں گیانیوں نے دیا اور دیا کر ان کی زنجیر میں باندھ دیا۔ مگر منو نے کالے پیلوں کے دل چھید دیئے اور ان کے ذہنوں، خیالوں، ارمانوں اور امنگوں کو قانون کی کڑی زنجیروں میں جکڑ کر رکھ دیا۔ منو کا بان اندر کے تیر سے زیادہ مہلک و جان سوز نکلا۔ کالے پیلے روندے گئے، کچلے گئے، مٹی میں ملتے گئے، جیتے رہے۔ مگر مقابلہ کے میدان سے بھاگ گئے۔ منو کا جادو چل گیا۔ اور کالے پیلے گورے پیلوں کے داس بن کر کراہتے رہے۔ منو نے کہا۔ کالے اسی قابل ہیں۔ پچھلے جنم کے پاپ کا پھل بھوگ رہے ہیں۔ کرموں کا پھل۔ شودر کو سیوا، برہمن کو گیان۔

——— اور دھرتی کانپتی رہی۔ جمنا روتی رہی۔ گنگا آنسو بہاتی رہی۔ پھر پورب کے ایک دور دراز کے منڈے سے ادھر بانسری کی لے ابھری۔ ہمالیہ کو بڑھا اپنے خواب کے اس بھیانک حصہ سے گھبرا اُٹھا۔ اس نے ایک دانے کنہیا کو اتنی شکتی دے دی کہ وہ اپنے نغمہ کی آنچ سے محنت والوں کو گلزار بنا دے اور کالوں کا درجہ گوروں کے برابر کر دے۔ "میرا اُسے لاؤ خواہ تمہارا مخالف کالا ہو یا گورا۔ حق و صداقت کے سوا سب کچھ ہیچ ہے۔" شیام مرلی والے کی لے پر روح کی راہ جائیں ناچیں۔ گوپال کے ساتھ گوپیاں رقص کرتی رہیں، پاپ مٹتا رہا۔ جمنا آنند سے بہتی رہی۔

مگر ہائے رے برہما کا خواب بھگوان ہمیشہ بے چین ہی رہا۔ جب سے پیلوں میں جان آئی۔ برہما کی نیند زیادہ تر کابوس ہی بنی رہی۔ کون جانے اس خواب کا انت کیا ہے، بھید کیا ہے! اور پھر ایسا ہوا کہ اندھیرے نے اجالے کو شکست دے دی۔ ہمالہ نے دیکھا۔ چپ اور گھٹا ٹوپ پاپ ہی پاپ تھا۔ نیکی ضمیروں میں روپوش تھی۔ راون کا راج تھا۔ دس سروں والا، نہایت ہی عقل مند، بہی دانشور، دس گنا بدھی والی بیس ہاتھوں والا طاقتور پہلوان۔ عاقل مگر ظالم، دانا لیکن دنی۔ سیتا بی دکھی تھیں۔ کالے پیلے جنگلوں اور پہاڑوں میں چھپے ہوئے تھے۔ اُن جیسے اور پیلے غلام بنا لیے گئے تھے۔ سیتا کے آنسوؤں نے رگھو بنس کے سپوتوں کو غیرت دلائی۔ رام جہاد کے لیے نکلے۔ برہمن کے خلاف پیکار۔ کالے پیلوں نے ان کی مدد کی۔ کالے پیلے مہابیر تھے۔ ان کے دل اُجلے تھے۔ رام کی نگاہ نے انھیں اور اجلا بنا دیا۔ راون، پاپی برہمن اور اس کا سارا پاپ منڈر آتش کر دیا گیا۔ نیکی ضمیروں کی پناہ گاہ سے نکل آئی۔ اور میدان عمل میں چھا گئی۔ ہمالہ نے سنا ـــــ راجہ رام کی جے! مہابیر کی جے! رام راج کی جے!

——— اور پھر ایک بار اندھکار چھا گیا۔ سپنے کے اندھیرے جا رہے! تا دیر دور تک! اور یہ ہوا کہ لوگوں نے سونے کے بُت بنا کے اور سونے کو ہی دیوتا بنا لیا۔ پتلوں کی روحیں سونے سے مُڑھ دی گئیں۔ پریم کے سوتے سوکھ گئے۔ سونے میں جکڑی ہوئی روحوں کو عیش و عشرت کے دیوتا کے سامنے سجدے کرنے پڑے۔ ہر طرف ظلم تھا، ہر سو لوٹ کھسوٹ، روحیں سونے کی قید میں گھٹتی رہیں اور بدن موٹے ہوتے رہے۔ موٹے پتلوں نے دبلے پتلوں کو کھانا شروع کیا اور خوب موٹے ہوتے گئے۔ اچانک ہمالہ کی ایک وادی میں سونے سے مُڑھی ہوئی ایک روح مضطرب ہو اٹھی۔ دُکھ کی آنچ سے سونا پگھلنے لگا۔ سنہرے خول کی پرتیں گرنے لگیں۔ روح آزاد ہو گئی۔ اُس مہاتما نے طلائی زنجیروں کو کاٹا اور زریں دیواروں کو ڈھا دیا۔ عظیم روح نے خواب کے پردوں کو اٹھا کر ایسے خواب دیکھا جہاں دکھ نہ تھے، بڑھاپا نہ تھا، موت نہ تھی۔ جہاں زندگی کا خواب نہ تھا، عدم کی حقیقت تھی۔ نروان تھا۔ سچتا نند تھا۔

لیکن جب عظیم روح اس سراپا بدھ پتلے کو چھوڑ کر چلی گئی تو لوگوں نے رفتہ رفتہ خواب کی حقیقت کو بھلا دیا اور غفلت کے گھٹا ٹوپ اندھیرے صدیوں چھائے رہے۔ لمحہ کو ابد سمجھا گیا اور اس کج فہمی کے نتیجہ میں ظلم اور خون آشامی ہر طرف پھیل گئی۔ اور ہمالہ نئی صبح کے پرکاش کے انتظار میں کھڑا رہا۔ ساکت، جامد، چشم براہ!

اور یہی خواب کے دھوپ چھاؤں کی ایک اور کہانی سنئے۔ یہ قصہ در قصہ ہے قصوں کے لچھے۔ خواب کی کہانی مربوط نہیں ہوتی۔ خواب منظم نہیں ہوتے۔ خوابناک زندگی میں تنظیم و ربط نہیں۔ تراشیدگی نہیں۔ تعمیری ہم آہنگی نہیں۔ بس موج در موج کہانیاں ہی کہانیاں۔ ازل و ابد کی مرتعش لہریں۔ نشیب و فراز، رات اور دن، زوال و عروج، موت و حیات!

ہمالہ نے اپنے عقب میں جھانک کر دیکھا۔

لق و دق کہستان، صحرا، ریگستان، میدان و سبزہ زار، کاہستان و کشت زار، برفستانوں تک پھیلے ہوئے تھے۔ سین و طاسین کی دنیا، غدار دنیا۔ ہمالہ کو سکتہ سا لگ گیا۔ موت ناک کی سیدھ میں دیکھنا کتنا پُر فریب ہوتا ہے۔ ہمالہ نے سمجھا کہ وہ تو صرف ایک بلند مینار مشاہدہ ہے۔ عالم مشہود چاروں طرف پھیلا ہوا ہے۔ وہ عالم کتنے جاہل تھے۔ جنھوں نے گنگ و جمن سے آگے نہیں دیکھا اور کنوئیں کو سمندر سمجھ لیا۔ برہما کا خواب جہاں گیر ہی نہیں کائنات گیر ہے اور کائنات ہی ان گنت۔ ع

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

ہمالہ نے دیکھا کہ عالم شمالی بھی پتلوں سے بھرا ہوا ہے۔ زرد پتلے اور سرخ و سفید پتلے۔ ڈھال کی طرح چپٹے چہروں والے پتلے اور تلوار کی طرح تراشیدہ اور کٹیلے پتلے۔ اتری دیش میں بھی رستخیز اور لغزش و انتشار کے ہنگامے برپا تھے۔ وہاں بھی شائستہ و ناشائستہ کی جنگیں تھیں۔ وہاں بھی خون بہتے تھے۔ مگر وہاں بھی کوئی ذوالقرنین امن و سلامتی کے لیے مضبوط ظاہری و باطنی سد بناتا تھا۔ ہمالہ نے دیوار چین کو مڑ کر دیکھا اور اُسے اپنی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ ہمالہ نے تاؤ اور کنفیوشس کے نغمے بھی سنے اور اس نے محسوس کیا کہ کرشن کی بانسری ہر جگہ بجتی ہے۔ رام راون سے ہر جگہ لڑتا ہے۔

چین کے پیلے پتلے شہد کی مکھیوں سے زیادہ محنتی اور ذہین نکلے۔ انھوں نے نئی نئی ایجادیں کیں اور تہذیب و تمدن کو کاغذ کی ایجاد سے پر لگا دیے۔

ہمالہ نے دیکھا۔ چینی تہذیب پورب، پچھم، اتر، دکھن تمام پھیل گئی۔ اس سے سورج کا گھر یعنی نپّون یا جاپان بھی اُجالا ہوا اور [illegible]

گوتم بدھ کے سینے میں روشنی ہوئی۔ تپّو اور جنگلوں میں شانتی پھیلنے لگی۔ روشنی کوہ چین پہنچا۔ ایران و توران کے علاوہ ہندوستان نے کلام حکمت چین سے گیان سیکھا گیان اور روشنی! برتھا کے سینوں سے گوتم کی روشنی اس کی خود بینی: نقاب کے اندر اپنا آئینہ داری آپ کرلی! چہرے کے حجاب میں اپنے آپ سے ہی چھپ کر نور فشاں جمال کے پیچھے دیدہ و نگاہ ہیں!

——— اور جینی نے بھی بدھ سے گیان سیکھا۔ چینی کا دل بھی بڑا ہے اور دماغ بھی عظیم۔ چینی نے بودھ کے پرکاش کو اپنے سینہ میں سمیٹ لیا اور اس کے ایک خاقان نے ملک کی سرحدوں سے باہر جھانکا اور دیکھا کہ برتھا کے خواب کی بیناٸی زمان و مکان کی حد بندیوں سے آگے ہے۔ چینیوں کے آگے بھی ایک بڑا دیس ہے، ملا سیں ——— مینوفلم طرب میں سلطنت اکبری کی عظیم تعمیرات۔

ہمالہ دنیا کا بلند ترین مینار مشاہدہ۔ ہمالہ نے چینی اور روما کی شہنشاہیتوں سے پہلے بھی حیرت خانۂ ہستی کو دیکھا تھا۔ اس نے بابل و مصر کی بھی سلطنتوں کا مشاہدہ کیا تھا۔ اس نے دیکھا تھا کہ برتھا کے خواب کے کئی ٹکڑے اتنا چھوٹے اتنا چھوٹے کہ انھوں نے اپنے آپ کو ساری کائنات سمجھ لیا۔ اتنا سرا اٹھایا کہ حباب عجائب و خیال پر نقش فنا ہونے کے باوجود خود کو برتھا ہی کچھ سمجھ بیٹھے۔ خود دو فراعنت برتھا تو سمندر ہے، روشنی ہے، حسن کامل ہے اور عدم کامل کا سیّن۔ وہ خود معیار حسن و محبت ہے۔ لیکن اس کے خواب کے پتلے عجیب و غریب نفسیاتی پیچیدگیوں میں مبتلا وہ ذہنی کھتیاں سلجھاتے، جذباتی عقدے حل کرتے اور احساسات و خواہش کی گرہیں کھولتے رہتے ہیں۔ وہ خود تختۂ خواب بھی اور تعبیر خواب میں مشغول بھی۔ کہانیاں اسی طرح پیدا ہوتی ہیں، علوم و فنون یوں ڈھنگ سے جنم لیتے ہیں۔

ہمالہ نے دیکھا ——— نمرود محض نفس امارہ کی ایک سرکش لہر تھا اور ابراہیم نفس مطمئنہ کا مظہر، برہما کا اوتار۔ ابراہیم نے وجدان و فراست کی وادی میں۔ ابھرنے والے بیتوں کے نفس لوّامہ کو بیدار کرکے انھیں آزادی اور حریت کی راہ دکھانی چاہی۔ ابراہیم بہت ہی پیارا، بہت پیار کرنے والا، نہایت مخلص، بڑا ذہین اور مستقل مزاج تھا۔

ابراہیم کی چار کتابیں۔ وہ سندرتا اور سچائی کا کھوجی تھا۔ اس کے دیس والے چاند تاروں اور سورج کی پوجا کرتے تھے۔ مگر اس کی نظر تاروں سے آگے دیکھتی تھی۔ آئینہ کو نہیں محبوب کو دیکھتی تھی۔ ٹمٹماتے ہوئے تاروں نے اسے اشارے کئے۔ وہ بے حد پیارے اور بچے اور چمکیلے تھے۔ ابراہیم نے محسوس کیا کہ یہ بیتوں کا دل موہ لیں گے۔ مگر اس کی ذہانت نے پایا کہ ان کی روشنی کامل نہیں۔ چاند نے جب اپنی جوت جگائی تو تارے ماند پڑ گئے۔ چاندنی کا جادو چل گیا۔ ابراہیم کے ذہن نے سوچا کہ یہ بھی حسن رہ گزر کا فریب ہے اور حسین فریب چل جاتے ہیں۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ اسی چمکتے ہوئے چاند کے جمال کو لوگ حقیقت منتظر سمجھ بیٹھیں۔ لیکن چاند کی چاندنی بھی ماند پڑ گئی اور اس کی تنک تابی نے مہر درخشاں کا پیام دیا۔ آفتاب نکلا اور باآب و تاب نکلا۔ اس کی جہاں تاب خیرہ کن تھی۔ حرارت و حیات کا منبع سورج! ابراہیم کے فکر نے پرواز کی۔ اسے خیال آیا کہ نارسا ذہن چڑھتے ہوئے سورج کے سامنے سیس نوائیں گے۔ اس نے سوچا کہ شک ہے سورج ڈوبتا بھی ہے اور جو ماند و نابود نہیں، جو مجبور زوال ہے۔ وہ سرچشمۂ قوت و حیات کس طرح ہو سکتا ہے۔ ابراہیم کے ذہن رسا، فکر بلند اور نگاہ دوربین نے نور الانوار کو حجابات نور کے اندر دیکھ لیا اور اس کی روح رب العالمین کے سامنے سجدہ ریز ہو گئی۔

ابراہیم ایک دانشور تھا۔ وہ ذوق سلیم اور مذاق لطیف رکھنے والا بھی تھا۔ اس کی حکیمانہ باتوں میں مزاح و طنز کا عنصر پایا جاتا تھا۔ اس کا گھر صنم سازوں کا خانوادہ تھا۔ اس نے بکری کے دیوتا دیکھے اور ہنس پڑا۔ ایک دن اس نے چند چھوٹے بتوں کو توڑ پھوڑ دیا۔ دیوتا کی موت کا بیں خلفشار رہا۔ دیوتا کو کس نے توڑا؟ ابراہیم خاموش تھا۔ لوگوں نے کہا اسی نے بت شکنی کی ہو گی۔ اسی کے ایسے لچھن ہیں۔ گھر کے بزرگوں نے

ڈانٹ کر پوچھا۔ ابراہیم نے ہنس کر جواب دیا۔ جھوٹے بُت سے پوچھو، اُسی نے بڑے دیوتاؤں کو ختم کر دیا ہوگا! سب لاجواب ہو گئے گونگے اور بے بس۔ دیوتاؤں کی کثرت کتنی مضحکہ خیز چیز ہے!

پہلے ابراہیم کا دماغ جاگا اور پھر اُس کا دل بیدار ہوا۔ اور اس تیسری کتھا میں اس کے ہردے کی جاگ کی کہانی ہے۔

——— اور ابراہیم نے اطمینانِ قلب حاصل کرنا چاہا۔ وہ حیات و موت کے راز جانتا تھا۔ وہ ابدی زندگی کی حقیقت سے واقف تھا۔ لیکن حقائق جب تک واردات نہ بن جائیں بے جان رہتے ہیں۔ ابراہیمؑ کی آتما نے برہما سے پوچھا: "ہے برہما! تو نے سرشٹی کو رچا، تو خالقِ اکبر ہے۔ بتا! موت کے بعد تو کس طرح زندگی کو عطا فرمائے گا؟" برہما نے جواب دیا: "میں پرماتما ہوں۔ آتما اور پرماتما کے درمیان پریم کا سمبندھ ہے۔ پریم کی ڈور میں بندھی ہوئی ساری روحیں میری طرف کھینچی آئیں گی اور مجھ میں حیاتِ تازہ پائیں گی۔" ابراہیم کو حکم ہوا کہ وہ چند پرندے پالے، انہیں کھلائے پلائے، سدھائے اور اُن سے پیار کرے۔ جب پرندے اُس سے ہِل مِل گئے تو حکم ہوا کہ انہیں دور پہاڑوں پر چُننے چُگنے کے لیے چھوڑ آؤ۔ ابراہیم نے ایسا ہی کیا۔ پھر حکم ہوا کہ انہیں پکار کر آواز دو۔ پرندے بیتابانہ اُس کی آواز سن کر دوڑتے ہوئے آئے۔ اور ابراہیم کے دل کی کھڑکیاں کھل گئیں۔ اس کے ہردے میں یہ بات گھر کر گئی کہ اس دنیا میں مردہ روحیں محبت سے ہی نئی زندگی پا سکتی ہیں اور اُس عالم میں بھی یہی محبت کی بجلی انہیں جی اٹھنے کے قابل بنا دے گی۔ عشق حیاتِ عالم ہے۔ محبت مدارِ کائنات ہے۔

اور اب ابراہیم کی چوتھی کتھا شروع ہوتی ہے۔ ابراہیم حنیف کا دل گہوارۂ محبت بن گیا تھا۔ مگر ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں۔ علم بھی آگ ہے اور جہالت بھی آگ۔ محبت بھی آگ ہے اور نفرت بھی آگ۔ علم اور عشق آتشِ روشن ہیں اور جہل و نفرت آتشِ تاریک۔ آگ آگ کو جلا نہیں سکتی۔ مگر روشن آگ تاریک آگ کی ظلمتوں کو دور کر سکتی ہے۔ ابراہیم کے دل میں شعلۂ عشق بھڑک رہا تھا۔ جاہلوں نے اسے اپنی مخالفت اور نفرت کی سیاہ آگ میں جلانا چاہا۔ مگر ابراہیم کو یہ کالی ناگن ڈس نہ سکی۔ آگ ٹھنڈی ہو گئی اور ابراہیم کے لیے سلامتی ہی سلامتی تھی۔ محبت سلامتی ہے! محبت امن ہے! محبت حیات ہے!

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما!

اور مہاکال نے دیکھا: نسلِ ابراہیمی نیل کے ساحل سے لے کر تا بہ فرات پھیل گئی اور پھیلتی ہی چلی گئی۔

آلِ ابراہیم! ——— جیسے سمندر کی لہریں! ———
آلِ ابراہیم! ——— جیسے ریگستان کے ذرّے! ———
آلِ ابراہیم! ——— جیسے آکاش کے تارے! ———

اور مہاکال نے دیکھا: ابراہیم کی مشعل جلتی ہی رہی۔ اندھیرے شکست کھاتے ہی رہے۔ محبت مُردوں کو زندہ کرتی ہی رہی۔ ابراہیم کی محبت یوسف کے حسن میں چمکی اور اس نے مصر کو نظام دیا۔ ابراہیم کا عشق موسیٰ کے یدِ بیضا میں تاباں ہوا اور ساحرانِ اہرام سجدہ ریز ہو گئے۔ ابوالہول سکتے میں آ گیا۔ مصر کے پجاری ابدیت کی تلاش میں اپنی لاشوں کو حنوط شدہ بناتے رہے۔ لیکن اُن کی روحیں اہرام کے طلسمانہ بوجھ تلے سسکتی ہی رہیں۔ موسیٰ نے کہا: حیات اہرامِ مصری میں نہیں، زندگی سحرِ سامری میں نہیں، قربِ الٰہی میں ہے، خلیلِ براہیم میں ہے۔ موسیٰ نے تجلّی کی آگ کو

[illegible]

——— اور پہاڑ نے دیکھا [illegible]

[illegible]

کرتا ہے اور کئی صورت سے کرتا ہے۔

تم اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کا انکار کرو گے! [illegible]

جلوۂ صورت کی کسے تاب ہے [illegible]

——— اور پہاڑ نے دیکھا:

موسیٰ نے قوم بنی اسرائیل کو ظالم فرعون کے پنجہ سے نجات دلائی۔ سمندر خشک ہوا اور موسیٰ کی برادری سلامت نکل گئی۔ مگر فرعون اور اس کے لشکر [illegible] اور موسیٰ نے کہا۔ [illegible] خدا [illegible] اور شیریں [illegible] موسیٰ کے دوسرے خلیفہ یوشع بن نون کو [illegible] ابراہیم کا خدا [illegible] اس کے عہد میں داؤد نے نغمے گائے ———

زمین رب العزت کی ہے اور جو کچھ اس کے اندر ہے انہی کا ہے۔ ساری دنیا اور اس کے تمام باشندے اسی کے ہیں۔ ...... اے پہاڑو کھل جاؤ اور اے ابدی دروازو اونچے ہو جاؤ۔ وہ صاحب جلال و جبروت بادشاہ آ رہا ہے۔ یہ ملک ذوالجلال کون ہے؟ رب العزت قوی و عزیز، جنگ میں غالب رب الافواج!

اور داؤد کے بیٹے سلیمان نے میراث داؤد کو مستحکم بنایا اور یروشلم میں ہیکل تعمیر کیا۔ اس نے [illegible] خدا کو کشف میں دیکھا اور اس کی شان میں نغمۂ نغمات [illegible] کیا ———

میرے محبوب تو سراپا حسن ہے، بے داغ! ایک محفوظ باغ، ایک مستور چشمۂ صافی، ایک مختوم فوارہ!
میرا محبوب سرخ و سفید ہے۔ وہ دس ہزار اصحاب کے درمیان سربلند ہے۔
اس کے لب سراپا شیریں ہیں۔ مختصر یہ کہ سراپا حسن و توصیف یہی میرا محبوب ہے، یہی میرا دوست ہے۔ اے یروشلم کی بیٹیو!

——— اور پھر خطاکاروں اور فاسقوں نے یروشلم کے تقدس کو اپنے گناہ آلود اعمال سے گرد آلود کر دیا۔ ارض موعود، نبیوں کی پاک سرزمین ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ یروشلم کا دودھ خشک ہو گیا۔ یہوداہ کے باغہائے زیتون و انار ویران ہو گئے۔ صیہون کی پہاڑیاں سخت اور چٹیل ہو گئیں۔ اور اسرائیل اغیار کے قدموں تلے روندا گیا۔

یسعیاہ نبی نے کشف میں دیکھا:

بیل بھی اپنے مالک کو پہچانتا ہے اور گدھا بھی اپنے آقا کو جانتا ہے۔ مگر بنی اسرائیل نہیں شناخت کرتے۔ انھوں نے رب العالمین کو بھلا دیا اور اس کے غضب کو بھڑکایا۔ یہوداہ نے اپنی محبوب قوم کو ایک انگوری باغ دیا اور اسے زرخیز بلندی پہ قائم کیا۔ اسے دیواروں سے محفوظ بنایا گیا۔ اس میں اعلیٰ قسم کے انگور کی بیلیں لگائی گئیں اور نفیس انگوری شراب نچوڑنے کی بھٹی تعمیر کی گئی۔ توقع تھی کہ اس باغ میں اعلیٰ درجے کے انگور پھلیں گے۔ لیکن اس میں جنگلی کھٹے انگور لگنے لگے۔ آخرش باغ سے حفاظت کی جھاڑیاں کاٹ دی گئیں اور چار دیواری کی دیواریں ڈھا دی گئیں۔ جانوروں نے بیلیں چیر لیں اور کیاریوں کو روند دیا۔ باغ ویران ہو گیا۔ اس میں خار دار جھاڑیاں اور کانٹے اُگنے لگے۔ یہوداہ نے بادلوں کو حکم دیا کہ اس باغ پر اب نہ برسیں اور جانتے ہو رب الافواج کا انگوری باغ کیا تھا؟ خانوادۂ اسرائیل۔ اور یہوداہ کے لوگ اس کے پودے تھے۔ اور ان پودوں نے ناحق بغاوت کی، قوانین کو توڑا۔ سبت کے دن کا احترام نہ کیا، توبہ کی اور پھر اسے فراموش کر دیا۔ یہاں تک کہ یہوداہ کا جلال ظاہر ہوا اور اس نے بنی اسرائیل کو عاشوریوں کا شکار بنا دیا۔ بے انصاف خاکی پتلوں کا انجام! محتاجوں کو رد کرنے والے، غریبوں کا حق تلف کرنے والے، بیواؤں کو اپنے مظالم کا نشانہ بنانے والے، اور یتیموں کو لوٹنے والے۔ عاشوری، خدا کے غضب کی لاٹھی، اس کی ناراضگی کا ڈنڈا!

فتنۂ عاشور سے بچ کچھ لوگ معاف کر دیے گئے۔ ان کی اصلاح ہو گئی اور ان میں منصف، ذہین، دردمند اور خدا ترس فرمانروا پیدا ہوئے۔ یہوداہ تعریف کا مستحق ہے۔ وہی نغمۂ مسرت ہے، وہی راہ نجات ہے! عاشوری طاقت توڑ دی گئی۔ مگر آل اسرائیل پھر بگڑ گئے۔

اے بابِ یروشلم زاری کر! اے شہر رو! اے فلسطین تو برباد ہو گیا!
کبھی عاشوریوں اور مصریوں میں جنگ ہوئی اور کبھی صلح۔ فلسطین مرکزی حیثیت سے پھلا پھولا اور پھر اپنی خطاؤں کی آگ میں آپ جل گیا۔

ہم اگر نے سنا!

یسعیاہ اور یرمیاہ نے اسرائیل، یہوداہ اور صیہون کو نصیحتیں کیں۔ ان نبیوں نے یروشلم کو ڈرایا، مگر متکبر گردنیں نہیں جھکیں، سخت دل نہیں پگھلے۔ یہوداہ نے کہا:

پس میں اس سرزمین سے تمہیں نکال باہر کروں گا۔ اور بیگانہ علاقوں میں تم غلامانہ زندگی بسر کرو گے۔ بھیڑیے آئیں گے اور تمہیں کھا کے جائیں گے۔ شکاری حملہ آور ہوں گے اور تمہیں نشانہ بنائیں گے۔ تمہیں کہیں پناہ نہیں ملے گی۔

میں نے زمین و آسمان بنائے ہیں۔ میں سارے آدمیوں اور تمام مخلوقات کا خالق ہوں۔ میں اپنی قدرت کاملہ اور وسیع اختیار کے تحت جسے چاہتا ہوں سرزمین کا وارث بناتا ہوں۔ اور اب میں نے ارض فلسطین اور بہت سارے ملک بخت نصر شاہ بابل کو عطا کر دیے۔ بادشاہوں اور قوموں

کہیں کی حفاظت کرنی پڑے گی تاکہ اسرائیل اسیر رکھے جائیں گے اور ان کی غلامی کریں گے۔ ستر سال بعد ان کی حالت بدلے گی اور ان کی مشکلوں کا وقت ختم ہو گا۔

اور ایسا ہی ہوا۔ یہودیوں کا بادشاہ زیر کیا گیا، اپنی تمام قوم کے ساتھ منتشر ہوا۔ اسیر ہوا اور بابل لے جایا گیا۔ جہاں ان کو سخت محنت اور غلامی کی تعلیم کو بھلایا اور چھڑایا۔ اپنے اسیر اور یہود کے کردار کو بے نتائج بندوں کا حق ادا نہ کیا۔ یہوواہ کا غضب بھڑکا اور اب اس نے کہہ دیا اور قصد کر لیا کہ وہ اسرائیل کی قربانیوں کو تباہ و برباد کر دیں۔

بخت نصر نے ایک خواب دیکھا اور اُسے بھول گیا۔ اُس نے ... بیدار ہو کر یاد ... اپنے سامنے کاہنوں، ساحروں، نجومیوں، فلسفیوں، مذہبی پیشواؤں اور عالموں کو بلایا۔ مگر وہ سب اس خواب کو یاد نہ دلا سکیں اور نہ اس کی تعبیر بتا سکیں تو سب کے سب گرفتار کر دو۔ سلطنت بھر میں سنسنی اور خوف پھیل گیا۔ لوگ دانیال کے پاس آئے اور یہ وحشت ناک خبر سنائی۔ دانیال بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور اس نے تعبیر خواب کے لیے وقت مانگا۔ سارے عقلا اپنے بُرے انجام کا اعلان اور اپنی بے بسی کا اظہار کر چکے تھے۔ بادشاہ نے دانیال کو مہلت دے دی۔

دانیال اپنے گھر واپس لوٹا اور اس نے اپنے ساتھیوں کو یہ ماجرا سنایا۔ ان سبھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ خدا کے آگے سجدہ ریز ہو کر دعائیں اور التجائیں کریں گے تاکہ وہ علیم و قدیر اس بھید سے انہیں آشنا کر دے اور ان سب کی جانیں بچ جائیں۔ خداوند اللہ تعالیٰ نے دانیال پر اس راز کو منکشف کر دیا۔ اس نے خدائے بزرگ و برتر کی حمد و توصیف کی اور اس کا شکریہ ادا کیا۔ پھر دانیال بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوا اور اُس نے عرض کی:

"اے شہنشاہ! جس بھید کا پتہ عقلا نہ پا سکے اُس بھید سے خداوند عرش نے مجھے آگاہ کر دیا ہے تاکہ میں عالی جاہ کے حضور خواب اور تعبیر خواب دونوں بیان کروں۔ وہی صاحب عرش و کرسی علام الغیوب ہے۔ وہی اپنے بندوں پر رازہائے سربستہ کا انکشاف فرماتا ہے۔

"اے شہنشاہ! حضور والا نے خواب میں ایک عظیم الجثہ مجسمہ دیکھا۔ وہ تاباں اور مہیب ہیکل حضور کے سامنے ایستادہ نظر آیا۔ اس کا سر خالص سونے کا تھا، سینہ اور بازو چاندی کے تھے، پیٹ اور رانیں پیتل کے، ٹانگیں لوہے کی، دو پاؤں لوہا اور مٹی کے آمیزہ سے بنے تھے۔ حضور عالی اسے دیکھتے رہے تا آنکہ ایک پتھر بغیر کسی ہاتھ کی مدد کے پہاڑوں سے کاٹ کر علیحدہ کیا گیا اور بت کے پاؤں پر دے مارا گیا۔ پاؤں چکنا چور ہو گئے۔ پھر سارا بت ریزہ ریزہ کر دیا گیا اور بھس بنا کر اڑا دیا گیا۔ اور جس پتھر نے مجسمہ کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا وہ بہت بڑا پہاڑ بن گیا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تمام روئے زمین پر وہ پھیل گیا ہے۔

یہ تو جناب والا کا خواب ہوا اور اب میں اس کی تعبیر عرض کرتا ہوں ——

اے بادشاہ! آپ بادشاہوں کے بادشاہ ہیں۔ خدائے عرش نے حضور عالی کو سلطنت عظمیٰ، اقتدار اعلیٰ اور قوت و جبروت کی نعمتیں بخشی ہیں۔ حضور اس شہنشاہیت عظمیٰ کے فرق زریں ہیں۔ حضور عالی کے بعد اور حکومتیں ہوں گی، جن کی شان چاندی کی سی ہے وہ حضور والا کی سلطنت سے فروتر ہوں گی۔ بعد ازاں تیسری حکومت پیتل کی مانند ہو گی۔ چوتھی لوہے کی طرح مضبوط ہو گی۔ وہ دوسروں کو توڑے گی اور جب خود ٹوٹے گی تو اپنا ہاتھ آپ مجروح کرے گی۔ اور پاؤں کا رپانچویں حکومت آئے گی۔ یہ بھی ہمالی ہو گی۔ کچھ کمزور، کچھ مضبوط، منظم و مربوط نہ ہو گی۔ اس دور کے آخر میں غیب کا ہاتھ ایک نئی سلطنت کی بنا ڈالے گا اور اسے مستحکم و طاقتور بنائے گا۔ وہ ساری حکومتوں کا خاتمہ کرنے والی حکومت ہو گی اور زمانہ دراز تک قائم رہے گی۔ خدائے ذوالجلال نے بادشاہ کو مستقبل کی خبر دی ہے۔"

[illegible] کو بتایا ہے کہ سلطنت بابل کا انجام کیا ہوگا۔ یہ ہے خواب کی سچی تعبیر ہے۔"

بادشاہ نے اقرار کیا کہ اس نے یہی خواب دیکھا تھا اور کہا "بے شک تمہارا رب الارباب اور ملک الملوک ہے۔ وہ علم الغیب [illegible] کاشف الحقائق ہے۔"

بخت نصر دانیال پر مہربان تھا۔ اُس نے خدا کے پیارے کی قدر کی تو خدا نے اس پر رحم کیا۔ ایسا ہوا کہ اس سے سلطنت چھن گئی مگر خدا نے قالب نے بخت نصر کو پھر تاج و تخت دلوا دیئے اور دانیال نے ایک اور رویا دیکھی ــــ

دانیال نے دیکھا کہ وہ دریائے اولائی کے کنارے پر ہے۔ سامنے ایک دو سینگوں والا مینڈھا کھڑا ہے۔ سینگ بہت بڑے بڑے ہیں۔ لیکن ایک نسبتاً چھوٹا ہے۔ پہلے چھوٹا سینگ سامنے آتا ہے پھر بڑا سینگ۔ مینڈھا مغرب، شمال اور جنوب کی طرف ٹکریں مارتا ہے کوئی جانور اس کے مقابلے کی تاب نہیں لاتا اور کسی کو اُس سے نجات نہیں ملتی۔ وہ اپنی من مانی کرتا جاتا ہے اور بڑا بنتا جاتا ہے۔ اچانک ایک بکرا مغرب سے نمودار ہو کر روئے زمین پر چھا گیا۔ اُس کی آنکھوں کے بیچ میں ایک بڑا سا سینگ نمایاں تھا۔ بکرا مینڈھے پر غضب ناک ہو کر حملہ آور ہوا۔ اُس نے مینڈھے کے دونوں سینگ توڑ دیئے، اُسے زمین پر دے مارا اور پاؤں سے خوب روندا۔ پس بکرا بہت عظیم الشان بن گیا۔ اور ابھی وہ طاقتور تھا کہ اُس کا سینگ ٹوٹ گیا۔ پھر چار اور سینگ نکل آئے۔ ان میں سے ایک سینگ کے اندر ایک اور چھوٹا سا سینگ پھوٹا اور بہت بڑا ہو گیا۔ یہ جنوب کی جانب، مشرق کی جانب اور "ارضِ نشاط خیز" کی طرف بڑھتا رہا۔ اور رفتہ رفتہ بہت عظیم الشان بن گیا اور آسمان تک جا پہنچا۔ یہاں تک کہ اُس نے چند مخلوقاتِ سماوی اور چند تاروں کو زمین پر گرا لیا اور انہیں پاؤں تلے روندا۔ اس نے اپنی کبریائی کا دعویٰ کیا اور آسمانی بادشاہت کے شہزادے پر حملہ آور ہوا، عبادات کو بند کیا اور مقدس مقامات کو مٹایا۔ اُس کے اندر عالم افراط کی طاقت تھی۔ دانیال کو پھر مکاشفہ ہوا، اُس نے مقدس روحوں کی باتیں سنیں اور اُسے خواب کی تعبیر بتائی گئی۔

اُسے معلوم ہوا کہ آخری زمانہ کے اس فتنۂ عظیم سے مکمل رستگاری دو ہزار تین سو سال کے بعد ہو گی۔ جبرئیل نے بتایا کہ مینڈھے اور اس کے دو سینگوں سے مراد ہے میڈیا اور فارس کے بادشاہ اور بکرے سے مراد ہے یونان کے بادشاہ۔ دونوں آنکھوں کے درمیان والے طاقتور سینگ کا مطلب یہ ہے کہ یونان کا پہلا شہنشاہ عظیم طاقتوں والا ہوگا۔ چار سینگوں کی تعبیر ہے چار سلطنتیں جو یونانی تہذیب کی پروردہ ہوں گی، مگر پہلی شہنشاہیت سے کمزور ہوں گی۔ اور مغربی یونانی تہذیب کے دورِ آخر میں دجل و ظلم کی انتہا ہو گی اور ان میں ایک مہیب بادشاہ پیدا ہوگا۔ اُس کے تاریک عقائد ہوں گے۔ وہ قوت و جبروت کا مالک ہوگا۔ تخریب کا دیوتا بن جائے گا۔ مضبوط اور مذہبی لوگوں سے دشمنی کرے گا۔ اُس کے نظام کی ترقی سے صنعت و حرفت کو بڑا فروغ حاصل ہوگا۔ وہ امن کا نام لے کر لوگوں کو تباہ کرے گا۔ اور روحانی شہزادوں شہزادگان کے خلاف کھڑا ہوگا۔ آخر ش کرامات کے ذریعہ وہ توڑا جائے گا۔

دانیال کو شمال اور جنوب کے مختلف بادشاہوں اور سلطنتوں کے درمیان جنگوں کا ایک سلسلہ کشف کے ذریعہ دکھایا گیا۔ اُسے بتایا گیا کہ یہ سلسلہ آخری زمانہ تک پھیلتا چلا جائے گا۔ تا آنکہ شمال کی سلطنت میں ایک آمرِ مطلق رونما ہوگا۔ وہ ساری پرستیدہ ہستیوں سے اپنے کو بلند و بالا قرار دے گا اور رب الارباب کے خلاف حیرت ناک باتیں کرے گا۔ وہ اپنے آبائی مذہب کا انکار کر دے گا اور کسی ماورائی طاقت کا قائل نہ ہوگا۔ لیکن اپنی مملکت میں وہ طاقت کے دیوتا کی عبادت کرے گا۔ اور بالکل نئے تصورات کی پوجا میں لگ جائے گا۔ قوت و جبروت، چاندی اور سونا اور مادی لذات کو اپنا معبود بنائے گا۔ وہ منفعت کے لیے زمینوں کی تقسیم کرے گا اور بہتیری قوموں پر جابرانہ حکومت کرے گا۔

جس کے بادشاہ مصر کی رزم آرائی ہوگی اور اس جنوب پر وہ طوفان کی طرح چھا جائے گا اور ارض مقدس تک جا پہنچے گا مصر کے خزانوں پر بھی متصرف ہو جائے گا۔ مگر شمال اور مشرق سے اس کے پاس بُری خبریں آئیں گی اور وہ اپنے علاقے کی طرف لوٹنا چاہے گا۔ آخر وہ سمندر کے بیچ میں چلا جائے گا اور سب یار و مددگار اپنے بُرے انجام کو پہنچے گا۔

خواب کے پتے ہی خواب دیکھتے ہیں ہم سارے سچے بزرگ کس کی جو بھی کہے۔ یہ تو بری سچی حقیقت ہے پر وہ حقیقت سمجھتے ہیں۔ سچے ہیں وہی کہ اپنوں کا دیس بھی اس کا۔ سچوں کے سپنے بھی سچے ہی اور تعبیریں بھی اسی کی ——!

ہم نے دیکھا! آخر فی میدیا اور فارس کا بادشاہ خورس باقر ذوالقرنین یعنی دو سینگوں والا مینڈھا بنا اور اس نے مشرق و مغرب میں دینی حکومت قائم کر لی۔ اس کے ہاتھوں بابل کی سلطنت برباد ہوئی اور آل اسرائیل اسیری سے آزاد ہوئے اور یروشلم پھر آباد ہوا۔ فارس کی طاقت کو سکندر یونانی نے پاش پاش کر دیا۔ بکرے نے مینڈھے کو مار گرایا۔ سکندر یونان کے مرکزی سینگ نے دارا کی وہ آنکھ توڑی مگر ایام شباب میں ہی اکھڑ گیا۔

ہم نے دیکھا:

ستر سال کے بعد آل اسرائیل کو بابل کی قید سے رستگاری حاصل ہوئی اور یہوداہ یروشلم میں واپس آیا۔ دختران صیہون نے خوشیاں منائیں اور رقص کناں ہوئیں۔ ذکریا اور یحییٰ نبی کی دعاؤں کے سایہ میں بنی اسرائیل پھر پروان چڑھنے لگے۔ کچھ دنوں بعد یہودیوں نے شریعت کو سب کچھ سمجھ لیا۔ علماء یہود ہی بگڑ گئے۔ وہ صراط مستقیم سے ہٹ گئے اور ان کے ہاتھوں توریت کی مٹی پلید ہوئی۔ آخر میں یہوداہ نے ان کو بھی رسوائے عالم بنا دیا۔ رومی شہنشاہوں نے انھیں گھیر لیا اور ان کی فوجوں نے انھیں پاؤں تلے روندا۔ بنی اسرائیل اپنے گھر میں اسیر ہو گئے غلامی ان کی قسمت میں لکھ دی گئی۔ خدا کی رحمت جوش میں آئی اور آل اسرائیل کی حیات فانی کی شام کے وقت اچانک روشنی ہوئی اور صدق و محبت کا ستارہ طلوع ہوا۔ رومی بادشاہ ہیرود کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ اور اس کے ہوش اڑ گئے۔ یہودیوں کا بادشاہ پیدا ہوا۔ بپتسمہ دینے والے حیٰی نے اعلان عام کیا کہ آسمانی بادشاہت قریب ہے۔ توبہ کرو تاکہ بخشے جاؤ۔ صحرا بہ صحرا اس مرد خدا نے منادی کی اور شہزادہ امن کے لیے راستے صاف کئے۔ عیسیٰ مسیح کا نزول ہوا۔ آسمانوں کے دروازے کھل گئے اور روح سماوی فاختہ کی شکل میں اس پر نازل ہوئی۔ خدا کے اس بیٹے نے یہودیوں کو درس محبت اور دعوت اخلاص دی۔ اس نے فقیہوں اور فریسیوں کو ظاہرداری و مکاری سے روکا اور صدوقیوں اور یہود کو مادہ پرستی اور سنگدلی پر ٹوکا۔ اس نے بتایا کہ انسان روٹی کے سہارے نہیں بلکہ محض خدا کے فضل سے جیتا ہے۔

عیسیٰ نے کہا:

برکت والے ہیں عاجزی کرنے والے کیونکہ وہی زمین کے اصلی وارث ہیں ——————

—————— برکت والے ہیں رحم دل کہ اُن پر ہی رحم کیا جائے گا ——————

برکت نازل ہوئی مخلصوں پر کہ وہی خدا کا دیدار کریں گے ——————

صاحب برکت ہیں اہل صلح کہ وہی خدا کی اولاد کہلائیں گے ——————

برکت والے ہیں وہ جنھیں صداقت کی خاطر ظلم و ستم سہنا پڑے کہ وہی آسمانی بادشاہت میں داخل ہوں گے۔

اے مظلومو! تم زمین کا نمک ہو۔ دیکھو اپنے مزے اور مزاج کو قائم رکھو۔ تم اگر بدمزہ ہوئے تو تمہاری سب نیکی بھلا کون

دور کرے گا۔

تم سارے جہان کی روشنی ہو۔ اپنے نور کو منارۂ روشن کی طرح سربلند و باقی رکھو!
اے لوگو تم کامل ہو جیسے تمہارا آسمانی باپ کامل ہے۔
مگر افسوس یروشلم نے اس کی نہ سنی اور برے درخت نے برا ہی پھل لایا۔
بدبخت یہودیوں نے ہیرے کو پتھر سے توڑا اور امن و محبت کی روح کو سولی پر چڑھایا۔ کون گنہگار تھا۔ رومی گورنر پائلٹ یا لالچی داڑھیوں والے شقی القلب یہودی علماء و فقہا!

ارض و سماء کانپ اٹھے۔ روحِ محبت صلیب پر سے پکاری: ایلی! ایلی! لما سبقتنی؟ اے میرے خدا! اے میرے خدا! تو نے کیوں مجھے چھوڑ دیا؟ طور کی چٹانیں پھٹ پڑیں، ہمالہ کی بلندیاں لرزیں۔

خدا نے اپنے پیارے کو نہیں چھوڑا۔ مگر اُسے آزمائش کا تلخ پیالہ پینا پڑا۔ اس کی نشأۃ ثانیہ ہوئی اور وہ پھر اپنے گیارہ حواریوں سے جھیل گلیلی کے کنارے ملا۔ بعض نے اس نئی حیاتِ نو پر شک کیا۔ عیسیٰ نے انھیں نصیحت کی اور کہا:

ساری قدرت مالک میں ہے۔ اسی نے مجھے زمین و آسمان کی طاقتیں بخشی ہیں۔ سخت دلی اور بے یقینی کی عادتیں ترک کرو اور جاؤ قوموں کو تعلیم دو اور ان کے لیے برکت کے دروازے کھولو۔ بعد ازاں وہ بادلوں میں غائب ہو گیا۔

یہودیوں پر خدا کا غضب بھڑکا اور وہ ذلیل و خوار بنا دیے گئے۔ انگوری باغ کے مالک نے یہ امانت اُن سے چھین لی اور اس باغ کی خدمت دوسرے مالیوں کو دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اسرائیل کا درخت بے ثمر کاٹا گیا۔ فلسطین برباد ہوا اور رومیوں نے بدخصال غلاموں کو سارے عالم میں رسوا ہونے کے لیے بکھیر دیا۔ داؤد کی پیشگوئی کا ایک حصہ پورا ہوا اور وعدۂ آخر تک کے لیے اسرائیل کی سلطنت نابود ہو گئی۔

ہمالہ کی بلند چوٹیوں نے ابن آدم کی بے قرار دعاؤں کی گونج سُنی تھی۔ وہ اپنے آسمانی باپ سے رو رو کر دعائیں کرتا تھا، چشموں کے کنارے، خاموش وادیوں میں، بلند پہاڑوں پر، مقام بہ مقام، گام بہ گام۔ ولی طوماً انھیں دعاؤں کی آوازِ بازگشت سُن کر اپنے آقا کی تلاش میں دیارِ ہند میں آیا۔

آسمانی باپ نے ابن آدم کو برکتوں پر برکتیں دیں اور شرق و غرب میں اس کی امت پر روحانی اور مادی نعمتیں نازل کیں۔ اصحابِ دعوت اور صاحبانِ رقیم بھوکے شیروں کے سامنے ڈالے گئے۔ ریچھوں نے انھیں پھاڑ کھایا، سیافوں نے تالیاں بجانے والے درندہ صفت رومی تماشبینوں کے سامنے ان کا خون بہایا۔ اُن کی تکا بوٹی کی۔ مگر وہ کانٹوں کا تاج پہننے والے مصلوب بندۂ خدا کی سچائی کا اور آسمانی باپ کے وجود کا برملا اقرار و اعلان کرتے رہے۔ وفاداروں نے انعامِ وفا پایا۔

بھگوان کی لیلا عجیب! اس کے بھید نرالے! ایشیا کے ایک شہید نے اپنے خون سے یورپ کی آتما کو سینچا۔ لیکن ہمالہ نے دیکھا کہ عیسیٰ کھا پا تو کے مندر میں بٹھا دیا گیا۔ صلیب کا خون سوکھ گیا اور وہ محض ایک چوب خشک ہو کر رہ گئی۔ پھر چاندی اور سونے کی صلیبیں گھڑی گئیں۔ مگر خون کا بدل کچھ نہیں۔ خون بے بہا ہے۔ خون زندگی ہے۔ خونِ الوہیت کے چہرے کا غازہ ہے۔ ہر شخص کو اپنی صلیب آپ اٹھانی پڑتی ہے۔ اپنا خون آپ بہانا پڑتا ہے۔ روحانیت بھی قربانی چاہتی ہے۔

پولس ولی نے کہا تھا: میں جانتا ہوں میرے چلے جانے کے بعد درندہ بھیڑیے تم میں چیر پھاڑ کھائیں گے اور گلّے پر تباہی آئے گی نیز تمہارے اندر بھی ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو گمراہی کی ساحرانہ باتوں سے شاگردوں کے دل موہ لیں گے اور انھیں اپنا پیرو بنا لیں گے۔ پس ہوشیار رہو!

ہم نے دیکھا، سارے سنسار میں گھور اندھیرا چھا گیا۔ کوہِ ہمالہ طبق در طبق گھپ اندھکار میں لپٹ گیا۔ ایک اتھاہ رات ٹوٹ پڑی۔ ستارے بے نور ہو گئے۔ چاند کالی ٹکیہ کی طرح کالا پڑ گیا۔ سورج طلوع ہوتا تھا مگر روشنی نہ تھی۔ آکاش اور پرتھوی ایک ننھی سی کرن کے لیے بھی ترس رہے تھے۔

ابراہیم کی دعائیں ایک تابانِ صبحِ نو کے لیے تا ابد فضاؤں میں لرزاں تھیں۔ کرشن کی بانسری کے بول نیا اوتار لینے کے لیے اندھیرے میں لرز رہے تھے۔ طور اور ہمالہ اور بہتیری بلند پیشانیاں نئے سورج کی کرنوں کا صندل ملنے کے لیے بے تاب تھیں۔ موسیٰ کی تمنائیں ایک آتشیں شریعت کے فروغ کے لیے دیدہ و دل فرشِ راہ کیے ہوئے تھیں۔ عیسیٰ کے انگوری باغ کا مالک بنی اسرائیل کے بھائیوں کے نخلستانوں میں ظاہر ہونے والا تھا ——— ابنِ آدم ایک طویل سفر پر روانہ ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے ملازمین کے سپرد مکان کی حفاظت کر دی تھی اور ہر شخص کو اس کے کام سے آگاہ کر دیا تھا۔ اس نے چوکیداروں کو حکم دیا تھا کہ نگہبانی کرتے رہیں۔

پس تم سب نگہدار رہو۔ تمہیں کیا معلوم مکان کا مالک کب آ جائے، سرِ شام، یا آدھی رات کو، مرغ کے بانگ دینے کے وقت یا علی الصباح۔ ہوشیار رہو ایسا نہ ہو کہ وہ تمہیں سوتا ہوا غافل پائے۔

لیکن اُس روزِ سعید، اُس مبارک گھڑی کی خبر کسی کو بھی نہ تھی۔ نہ کسی آدم زاد کو اور نہ فرشتوں کو۔ خود ابنِ آدم بھی بے خبر تھا۔ بس ایک آسمانی باپ اس راز سے آگاہ تھا۔

اس نے ارضِ بطحا میں ظہور کیا۔ وہ شعیر سے طلوع ہوا، اور کوہِ فاران پر چمکا۔ دس ہزار قدسی اُس کے جلو میں تھے۔ اور وہ تخت نشین ہوا۔ اس کے داہنے ہاتھ میں ایک کتابِ عظیم تھی۔ سات مہروں سے سربمہر۔ اس کا ہاتھ یدِ بیضائے کلیم سے زیادہ روشن تھا۔ اس میں سات ستارے تابندہ تھے۔ اس کی آواز میں پُرشوکت آبشاروں کا نغمہ تھا۔ اُس کی گفتار تیغِ دودم تھی۔ یہ تیز و بُرّاں دو دھاری تلوار باطل کو پاش پاش کیے دیتی تھی۔ اُس کا چہرہ آفتابِ عالم تاب کی طرح درخشندہ تھا۔ اس سراجِ منیر کی پیشوائی کے لیے سات سنہری شمعیں روشن تھیں۔ شمعوں کے اس جھرمٹ میں ایک مردِ خدا ابنِ آدم کے مماثل کھڑا تھا۔ بُردبار شمیلِ ابنِ آدم نے بڑھ کر اُس پُرجلال صاحبِ تخت و نگیں کے دستِ رحمت سے کتابِ مبین کی نعمت پائی۔ فرشتوں نے کنواریوں کے گیت گائے اور قبیلِ ابنِ آدم کی تحسین کی: اے آسمانی روح تو اس کتابِ عظیم کی حامل برحق ہے اور تجھ سے ہی ساتوں مہریں کھلیں گی۔ اور ایک مقدس نے پکارا: داؤد کی ذرّیت میں ایک مردِ کامل اُٹھے گا جو سات مہروں کے معارف بیان کرے گا۔ پس تم زاری مت کرو اور خوش ہو جاؤ کہ اب لوگ کتابِ عظیم کے معارف سے محروم نہیں رہیں گے۔ اور سراجِ منیر کی روشنی تا قیامت پھیلتی رہے گی۔ اُسے ملکِ لازوال اور شوکتِ بے مثال دی گئی ہے۔

شہنشاہِ یثرب و بطحا آ گیا۔ خواجۂ بدر و حنین کا پرچم فضاؤں میں لہرایا۔ ماہِ عرب و عجم نے طلوع کیا۔ رحمتِ عالم، فخرِ آدم ظاہر ہوا اور اس کا فیض بے کراں جاری و ساری ہو گیا۔ آسمانی بادشاہت کا استحکام و استقلال منتظر آنکھوں نے دیکھا۔

دس کنواریاں دیا جلائے دولہا کے استقبال کے لیے نکلیں۔ اُن میں پانچ عقلمند ثابت ہوئیں اور پانچ بیوقوف۔ جو عقل کی

کوری تھیں انھوں نے تیل ساتھ نہیں رکھا مگر جو ہوشمند تھیں انھوں نے دیئے کے ساتھ اپنی کپیوں میں تیل بھی لے لیا۔ دولہا کے آنے میں دیر ہوئی سب کنواریاں سو رہیں۔ آدھی رات کو شور اُٹھا: دیکھو! دیکھو! دولہا دروازہ تک آ رہا ہے۔ جاؤ، اُس کا سواگت کرو! دسوں کنواریاں جاگ پڑیں اور انھوں نے دیئوں کو تیز کیا۔ بیوقوفوں نے عقلمندوں سے کہا: ہمیں اپنے تیل میں سے تھوڑا دو، ہمارے دیئے بجھ گئے ہیں۔ عقلمندوں نے کہا: نا نا! ایسا نہیں ہو سکتا۔ ہمارا تیل گھٹ جائے تو؟ جاؤ بازار سے خرید لاؤ! وہ اُدھر خریدنے گئیں اور اِدھر دولہا آگیا جن کے دیئے روشن تھے وہ دولہا کے ساتھ شادی کی تقریب میں شاداں و فرحاں شریک ہو گئیں اور دروازہ بند ہو گیا۔ پیچھے آنے والیاں محروم رہ گئیں۔

حسین دولہا تخلیق کا شاہکار تھا۔ خود خلاق اس پر ریجھ گیا۔ فن کار اور فن کا ازلی دائرہ مکمل ہوا۔ دو کمانوں کی قابیں مل گئیں۔ منزل قرب اور عالمِ وصل نزدیک تر ہو کر اَبدی عشق میں تبدیل ہو گیا۔

نوشاہ شہنشاہِ لولاک بنا، امینِ انسانیت۔ مگر بعثت موسیٰ کے کشوف کی رسائی مقامِ محمدؐ کے حاشیہ تک ہوئی تھی۔ بعد انسانِ موسیٰ اور انسانِ کامل میں دورِ فراق شروع ہوا۔ مجمع البحرین پر دونوں علیحدہ ہو گئے۔ مشاہداتِ محمدیہ بہ یم، دیا بہ دریا، جو بہ جو اور تا قیامت اس کی آبرو!

شہنشاہِ لولاک نے انسانیت کے نفسِ امارہ کو فتح کیا، یتیم قوموں کی گرتی ہوئی دیواریں اٹھا دیں اور اپنی امت کو شکستہ کشتی پر ظلماتِ حیات پار کرنے کا سلیقہ سکھایا۔ محمدؐ کا نظامِ اخلاق کامل، نظامِ سیاست کامل، نظامِ اقتصاد کامل۔ اُس کا نظامِ روحانی اعلیٰ و ارفع و اکمل۔ محمدؐ یزداں کا تابندہ ترین شعلہ، یہوواہ کی کامل ترین تجلی، برہما کا سب سے سندر سپنا!

ہمالہ نے دیکھا: پچھم دیش سے ایک سورج نکلا۔ وہ چاند تاروں کے جھرمٹ میں تھا۔ ہمالہ نے ایسا پرکاش کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ایسا پرکاش کبھی نہیں دیکھے گا۔ ہمالہ نے یہ بھی دیکھا کہ سورج کی کرنیں ذرّوں پر پڑتی تھیں اور وہ سلگ کر جگنو، تارے اور چاند بن جاتے تھے۔ اندھیرے کافور ہوتے جاتے تھے۔ ہر طرف جوت جاگ اٹھی تھی۔

ہمالہ نے دیکھا: شرارِ بولہب شعلہ بن کر اٹھا اور بگولہ بن کر سورج کا مقابلہ کرنے بڑھا۔ شیطان نے انسان کو ابوجہل و ابولہب بنایا۔ ان دونوں اہرمن زادوں نے مکہ اور طائف کی گلیوں میں سورج کو خراماں پایا اور بھڑک اٹھے۔ ابنِ آدم کے دشمن بھی جی اٹھے اور گدھوں کی صورت و سیرت کے ساتھ سورج کی طرف منہ اٹھا کر رینگنے اور خرمستیاں دکھلانے لگے۔ آفتابِ خراماں کی راہ میں کانٹوں کے جنگل بکھیرے گئے مگر اس خورشیدِ درخشاں کے لہو سے کچھ تو گلستان بن گئے اور کچھ اس کے آتشِ عریاں سے جھلس کر فنا ہو گئے۔ فرقِ آفتاب پر شوریدہ پشت اونٹوں نے اپنے مکر و قید کی اوجھڑیوں کی کمندیں پھینکیں مگر وہ سب ان کی متکبر گردنوں میں پھانسی کی رسیاں بن گئیں اور نیرِ اعظم کا روئے زیبا تاجِ افتخار سے اور جگمگا اٹھا۔ سورج آکاش پر تھا!

ہمالہ نے دیکھا: فرعون و ہامان کی ممیاں بھی اٹھ بیٹھیں۔ سامری کا سحر بھی جاگا۔ ان سبھوں نے مل کر سورج کو نگلنا چاہا۔ مگر ایک شہابِ ثاقب نے ان سب کو بھسم کر دیا۔

ہمالہ نے دیکھا: نمرود، بخت نصر، ہیروڈ اور نیرو کی روحیں بھی مہرِ روحانیت کے گرد ابرِ سیاہ بن کر منڈلانے لگیں۔ لیکن آخر تارِ عنکبوت کی طرح پارہ پارہ ہو کر بکھر گئیں۔ کنس اور کوروؤں کی آتماؤں نے بھی اوتار لیا اور سارے راکشس اُن کی مدد کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ گھمسان کا رن پڑا۔ جو دھرتی سے لپٹے ہوئے تھے۔ انھوں نے آکاش کے سورج اور تاروں پر تیر پھینکے۔ آکاش

کوروؤں سے بھی ملا دیا۔ پانچال، ساکے اور ساکشے مشرق میں دھنس گئے۔ اب کے پانڈوں نے جیت کر کوروؤں کو بھگا دی تھی۔ پھر سادی پہاڑوں پر جا کر رہا اور اس کے پانڈوں سے مارا گیا۔ ہزار سال تک اندھیرا پاتال میں منہ چھپائے رہا ——— لیکن برہما کے پجاری اندھیرے سے چھوٹ اجالے پر حملہ کیا۔ اندھیرے اور اجالے کی لڑائی ازل سے تا ابد جاری رہے گی اور جب برہما ازل اور ابد سے پرے ہے۔ ازل اور ابد برہما کے ان گنت دنوں میں سے دو دن ہیں۔ یہ اعتقاد برہما کو سمجھنے کی ایک کھیل سی کوشش ہے جیسے کہ بچے حقیقت کے کسی گوشے، کسی زاویے، کسی رخ، کسی پرت کو ہی جان سکتے ہیں اور وہ بھی بے ضابطہ صورت میں۔ پر حقیقت تو صرف برہما کی ہے، اور سب کچھ بے حقیقت، سب کچھ محض خواب و خیال۔

برہما اور ہندو کی کہانی میں سب سے اچھا یہ ہندو کی چوٹی پر بھی اندھیارے نے اثر کیا۔ پہلی فتح کے ہزار سال بعد بھی دوبارہ روشنی پر تاریکی نے حملے کیے۔ پہلا حملہ اوتر پورب دیش سے ہوا اور دوسرا حملہ اوتر پچھم دیش سے۔

ہمارا لکھا تھا :

سبا کے لیے ان کے اپنے ملک میں ایک بڑی نشانی موجود تھی، دو باغوں کی صورت میں تھی، جن میں سے ایک دائیں طرف تھا اور ایک بائیں طرف اور ہم نے ان سے کہہ رکھا تھا کہ اپنے رب کے رزق کو کھاؤ اور اس کا شکر ادا کرو۔ تمہارا شہر ایک خوبصورت شہر ہے اور تمہارا رب بہت بخشنے والا ہے۔ پھر بھی انہوں نے حق سے پیٹھ پھیر لی۔ تب ہم نے ان پر ایسا سیلاب بھیج دیا جو ہر چیز کو تباہ کرتا جاتا تھا، اور ہم نے ان کے اعلیٰ درجے کے باغوں کی جگہ انہیں دو ایسے باغ دے دیئے جن کے پھل بد مزہ تھے اور جن میں جھاؤ پایا جاتا تھا یا کچھ تھوڑی سی بیریاں تھیں۔ یہ سزا ہم نے ان کو ان کی ناشکری کی وجہ سے دی تھی اور ناشکروں کو ہی ہم ایسا بدلہ دیا کرتے ہیں۔

ہمارا گواہ ہے کہ شجر ابراہیم کی دونوں شاخوں کے ساتھ ایک جیسا سلوک ہوا۔ پہلی شاخ کے انجام سے دوسری شاخ نے عبرت نہیں حاصل کی اور اپنے دونوں باغ برباد کر لیے۔

ہمارا گرش بر آواز تھا :

تم یقیناً اس ملک میں دوبار فساد کرو گے اور یقیناً تم بہت بڑی سرکشی اختیار کرو گے اور جب ان دو میں سے پہلے کا وعدہ پورا ہونے کا وقت آیا تو ہم نے اپنے بعض ایسے بندوں کو تم پر مسلط کر دیا جو سخت جنگجو تھے، اور وہ تمہارے گھروں کے اندر جا گھسے اور یہ وعدہ پورا ہو کر رہنے والا تھا۔

اس کے بعد پھر ہم نے تمہیں دشمن پر حملہ کی طاقت عطا کی اور ہم نے مالوں اور بیٹوں کے ذریعہ سے تمہاری مدد کی۔ اور ہم نے جتھے کے لحاظ سے بھی تمہیں زیادہ کر دیا۔

سنو! اگر تم نیکوکار بنو گے تو نیکوکار بن کر اپنی جانوں کو ہی فائدہ پہنچاؤ گے۔ اور اگر تم برے اعمال کرو گے تو بھی اپنی جانوں کے لیے برا کرو گے۔

پھر جب دوسری بار والا وعدہ پورا ہونے کا وقت آ گیا تاکہ دشمن تمہارے معزز لوگوں سے ناپسندیدہ معاملہ کریں اور اسی طرح تمہاری مسجد میں داخل ہوں جس طرح وہ اس میں پہلی بار داخل ہوئے تھے اور جس چیز پر غلبہ پائیں اُسے بالکل تباہ و برباد کر کے رکھ دیں۔

تو یہ بات بھی پوری ہو گئی۔

اب بھی کچھ بعید نہیں کہ تمہارا رب تم پر رحم کر دے۔ اور اگر تم پھر اپنے غلط روّیہ کی طرف پلٹے تو ہم بھی اپنی سزا کی طرف لوٹیں گے۔

ہمارے نے یہ بھی سُنا کہ دو عالم نے پکار کر کہا کہ اے میری امت کے لوگو تم بنی اسرائیل کے قدم بہ قدم چلو گے۔ یقیناً وہ ایک سچے رسول کا کلام تھا۔ اور اس نے غیب کو اُفق مبین میں دیکھا تھا۔ سورج نے کہا تھا کہ ستاروں کو قیصر و کسریٰ کی سلطنتیں ملیں گی اور انھیں سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے۔ پس یہ پیشین گوئیاں پوری ہوئیں۔

برہما کی لیلا! اندھیروں نے اپنی یلغار جاری رکھی۔ اجالے اپنے کو تابناک نہیں رکھ سکے تھے۔ زرد جواہر کی جوت تھی مگر لال کی روشنیاں بجھ گئی تھیں۔ دل ہی کو خون کرنے سے خاک کے ذرے ستارے بنتے ہیں۔ خوارزم و بغداد، قرطبہ و غرناطہ کے روشن محلوں میں اندھیرا تھا۔ دل کے انگارے زرد پڑ گئے تھے اور باغ و ار باغ بے داد تھا۔

ہمارے نے دیکھا شمال مشرق اور شمال مغرب سے اندھیرے کا طوفان اٹھا اور سورج کی دنیاوی سلطنت کو گھن لگ گیا۔ ستارے سوکھے پھولوں کی طرح جھڑ گئے۔ لیکن پھر پرانی ٹہنیوں پر نئے پھول کھلے اور نئی صبح طلوع ہوئی ——— اور ہزار سال بیتنے پر شیطان پورے طور پر آزاد کر دیا گیا۔

ہمارے نے سنا تھا :

——— اور چاند کو خوف لگے گا۔ سورج اور چاند دونوں کو ایک حالت میں جمع کر دیا جائے گا۔ ستارے ماند پڑ جائیں گے۔ اور آسمان میں شگاف ہو جائیں گے۔ اور پہاڑ اڑائے جائیں گے۔ نور آفتاب کو لپیٹ دیا جائے گا۔ وحشی اکٹھے کئے جائیں گے۔ دریاؤں کو ملا دیا جائے گا۔ نفوس جمع کئے جائیں گے۔ کتابیں پھیلا دی جائیں گی۔ آسمان کی کھال اتاری جائے گی۔ جہنم کو بھڑکایا جائے گا اور جنت کو قریب کر دیا جائے گا۔ زمین پھیلا دی جائے گی اور جو کچھ اس میں ہے اُسے نکال پھینکے گی یاجوج و ماجوج کے لیے دروازہ کھول دیا جائے گا اور وہ پہاڑی سلسلوں، سمندری اور ہوائی لہروں کو پھاندتے ہوئے دنیا میں پھیل جائیں گے۔ اور سچا وعدہ قریب آ جائے گا۔ جب اس کے پورا ہونے کا وقت آئے گا تو اس وقت انھیں ایک دوسرے کے خلاف جوش سے حملہ آور ہونے کے لیے چھوڑ دیا جائے گا۔ اور بگل بجایا جائے گا۔ رات اس کی گواہ ہے جب وہ کالی ناگن کی طرح کسمساتی ہوئی گزر جاتی ہے۔ اور صبح تاباں بھی جب وہ پہلے ہولے سانس لینے لگتی ہے۔

ہمارے نے رسول امینؐ کے پیش خدمت عیسیٰؑ، حزقیلؑ اور دانیالؑ کے وعیدوں اور بشارتوں کو بھی سُنا تھا :

——— اور جب تم جنگ کی باتیں سنو گے اور جنگ کی افواہیں تمہیں لرزہ براندام کریں گی۔ اُس وقت تم مت گھبرانا کیونکہ ان امور کا برپا ہونا مقدر ہے۔ قیامت ابھی تم سے دور ہو گی۔ ایک قوم دوسری قوم پر چڑھائی کرے گی اور حکومت دوسری حکومت پر۔ مختلف مقامات پر سخت زلزلے آئیں گے اور قحط پڑیں گے۔ مصائب کی زنجیریں تمہیں جکڑ لیں گی۔ اور یہ درد و غم کا محض آغاز ہو گا۔ سورج تاریک ہو جائے گا اور چاند ماند پڑ جائے گا۔ اور آسمان کے تارے جھڑ جائیں گے۔ اور آسمانی طاقتوں میں حرکت پیدا ہو گی۔ اور تب لوگ ابن آدم کو بدلیوں کے اندر سے پرجلال و جبروت طلوع ہوتا ہوا دیکھیں گے۔

اور ایک حاملہ عورت سورج کی کرنوں کا لباس، چاندنی کے پاپوش اور تاروں کا تاج پہنے رونما ہو گی۔ مگر اس بار آور وجود

کہ ایک مسخ شدہ حائل جانے کے لیے خوفناک طور پر حملہ آور ہوگا۔ یہ ہفت سر، دس سینگوں والا اژدھا صاحب ہفت تاج بھی ہوگا اور جو اپنی طاقتور دُم سے آسمان و دنیا کے ایک تہائی تاروں کو جھاڑ کر زمین پر گرا دے گا۔

لیکن وہ جو قوموں کی رستگاری کے لیے مبعوث ہونے والا ہے، اس حاملہ عورت کے بطن سے پیدا ہوگا اور اژدہے پر حکومت کرے گا۔ وہ خدائے ذوالجلال کے تخت سے پیوستہ ہوگا۔ اور آسمان پر فرشتوں اور شیطانی اژدہے کے درمیان جنگ ہوگی۔ فرشتے اُسے زمین پر دے ماریں گے اور پھر ایک پُرشوکت آواز منادی کرے گی کہ اب خدا کی بادشاہت زمین پر بھی قائم ہو گئی اور نجات کے دروازے کھل گئے۔

------ اور دانیال نے خواب میں دیکھا :

چاروں طرف ہوائیں چلنے لگیں اور وسیع سمندر میں لہریں اٹھنے لگیں۔ اور چار بڑے بڑے عجیب و غریب جانور سمندروں سے نکل کر باہر آئے۔ یہ چاروں مختلف قسم کے تھے۔

پہلا جانور شیر ببر کی طرح تھا، اور اس کے عقابی پر لگے ہوئے تھے۔ یہ ساری دنیا پر چھا گیا۔ لیکن انجام کار اس کے شہپر غیب کی طاقتوں نے توڑ دیئے اور اس کی ہیبت دور ہوئی۔ اس میں آدمیت پیدا ہوئی اور وہ مادیت کو ترک کرکے آسمانی برکتوں کی تلاش میں آدم زاد کی طرح اٹھا۔ آخر حق اُسے قلب مومن عطا ہو۔

اور دیکھا ایک دوسرا جانور رونما ہوا۔ بالکل ریچھ کی طرح کا۔ وہ محض ایک پہلو سے اٹھا۔ اس کے منہ میں تین پسلیاں تھیں۔ وہ انہیں دانتوں سے کڑکڑا رہا تھا۔ اور لوگوں نے اس سے کہا: اُٹھ اور خونخوار بن اور بے حد گوشت چبا ڈال۔

پھر ایک تیسرا جانور چیتے کی طرح جھاڑی سے نکلا۔ اس کی پیٹھ پر چار پر لگے ہوئے تھے۔ اس کے چار سر بھی تھے اور اسے سلطنتِ عظیم بھی بخشی گئی۔

اور آخرالامر ایک چوتھا خوفناک جانور گرجتا ہوا نکلا۔ بڑا مضبوط۔ اس کے لوہے کے بنے ہوئے بڑے بڑے دانت تھے۔ اس نے خوب خوب خونخواری کی۔ وہ مختلف جگہوں میں حملہ آور ہوا اور ضعیفوں کو روندتا رہا۔ اس کے دس سینگ تھے۔ ایک چھوٹا سینگ اور تھا جس میں آنکھیں تھیں۔ آدمیوں جیسی آنکھیں اور ایک منہ تھا جو بڑے بول بولتا تھا۔

اُس وقت آسمانی تخت بھی بچھ چکا تھا اور دنیا پر فرشتوں کا نزول شروع ہو گیا تھا۔ حکم و عدل آ چکا تھا۔ فیصلے کا دن قریب تھا۔ حساب کے دفاتر کھلے ہوئے تھے۔

آخر معجزانہ طور پر وہ عجیب الخلقت جانور قتل کر دیا گیا۔ اس کا بدن ٹکڑے ٹکڑے ہوا اور اُسے آگ میں جھونکا گیا۔ تکبر اور بڑے بول کا نتیجہ!

اور بقیہ جانوروں کا حشر بھی بڑا عبرت ناک ہوا۔ اُن کی سلطنتیں اُن سے چھین گئیں۔ مگر انہیں کچھ اور مہلت ملی۔

اور ایک ابن آدم کا مثیل آسمانی ابرپاروں کے ساتھ نازل ہوا۔ وہ قدیم و قدیر طاقت کے آگے جھکا۔ اُسے ملک لازوال اور طاقت باکمال بخشی گئی۔ مختلف نسلیں، قومیں اور زبانیں اس کی سلطنت میں شامل ہو گئیں۔

دانیال کو بتایا گیا تھا کہ یہ چار جانور چار سلطنتیں ہیں۔ اور آج برہما کے خواب کے پُتلے یہ سوچ رہے ہیں کہ آئندہ ایام میں ہم نے یہ جانور دیکھے ہیں۔ آمریت کے دسوں سینگ ٹوٹ گئے اور آگ میں آہنیں دانت پگھل گئے۔ سمندری شیر ببر کی ہوائی قوت کمزور ہو گئی اور

اب وہ مادیت کی طرف مائل ہے۔ اس دل کا آپریشن ہونا باقی ہے۔ اور اس کی نسل کا چیتا ؛ بے کراں ہوائی طاقت والا صاحب ملک و دولت ؛
اسے ابھی مہلت ملی ہے۔

اور جو خونخوار ریچھ ؛ خون ریزی کے لیے اُسے بھی مہلت دی گئی ہے۔

خونخوار ریچھ اور خون آشام چیتا ، سرو پرواز چیتا دونوں ٹکرائیں گے اور ان کی طاقتیں طبعی قوت و جبروت سے توڑی جائیں گی۔

حزقیل نے خواب و کشوف میں دیکھا تھا کہ یاجوج و ماجوج کی خوفناک جنگوں کا آغاز اُس دور سے ہوگا جب بنی اسرائیل ارض مقدس میں جمع کئے جائیں گے۔

——— اے حزقیل پیشین گوئی کر اور انہیں بتا کہ خداے قدیر تمہاری قبریں کھول دے گا اور تم اُن سے نکل کھڑے ہو گے۔ وہ تمہیں سرزمین اسرائیل میں لائے گا، تمام دیار کفر و ضلالت سے سمیٹ کر تمہارے اپنے ملک میں اکٹھا کرے گا۔ تم اسرائیل کی پہاڑیوں پر چڑھو گے اور تم جانو گے کہ تمہارا یہوواہ کیسا صاحب طاقت و جبروت ہے۔

——— اور تصدیق کرنے والی کتاب مُبین نے بھی یہ عظیم پیش خبری کی کہ اُمت مرحوم کے دوسرے زوال کے دور میں بنی اسرائیل ارض مقدس میں لائے جائیں گے۔

——— پھر جب دوسری بار کا وعدہ آپہنچے گا تو ہم تم کو جمع کرکے وہاں لے آئیں گے۔

——— اور ہم نے دیکھا پیشگوئیاں پوری ہوئیں اور خواب حقیقت بن گئے۔

——— اور حزقیل نے ایک عظیم الشان ندا سنی :

اے ابن آدم ! یاجوج اور سرزمین ماجوج کے خلاف نبوت کر مسہک اور توبال کے امیر قاہر کے خلاف نبوت کر اور کہہ :

——— خداے رب العزت فرماتا ہے : ——— سُن اور دیکھ ! اے یاجوج ! اے مسہک اور توبال کے بڑے حکمران میں تیرا مخالف ہوں۔
اور میں تیرا منہ موڑ دوں گا اور تیرے جبڑوں میں آنکڑے ڈالوں گا۔ اور میں تجھے اور تیری قاہر فوج کو نکال باہر کروں گا۔ تیرے سب بے پناہ اسلحے، آلات حرب و ضرب اور آہنی زرہ بکتر اور دوسرے حفاظتی سامان تیرے کوئی کام نہ آئیں گے۔

ہوشیار رہ ! تیرے ساز و سامان، تیری دوست قومیں، تیرے حلیف جتھے سب برباد کر دیئے جائیں گے۔

مدت دراز کے بعد تو پوچھا جائے گا۔ تو ایک ایسی سرزمین پر حملہ آور ہوگا جو تسلط غیر سے آزاد کی گئی ہوگی اور جہاں مختلف قوموں میں سے جمع کئے ہوئے لوگ آباد ہوں گے۔

تو اسرائیل کی پہاڑیوں پر ٹوٹ پڑے گا۔ تو طوفان کی طرح اٹھے گا۔ تیری حلیف قومیں اور تیری افواج ممالک پر ابر سیاہ کی طرح چھا جائیں گی۔
اور ترشیش و شبا و ددان کے سوداگر تجھ سے پرسش کریں گے کہ کیا تو مال لوٹنے نکلا ہے۔ کیا تو جتھا جمع کرکے شکار کے منصوبے سے باہر آیا ہے۔ وہ شیر بچے تجھ سے سوال کریں گے۔

پس اے آدم زاد ! یاجوج کے خلاف پیشین گوئی کر ! تو اپنے شمالی ملک سے خروج کرے گا اور اپنے جتھے کے ساتھ اسرائیل تک بڑھتا آئے گا۔ تیرا لشکر عظیم و قوی منحوس بادل کی طرح خیمہ زن ہوگا۔ یہ ساری باتیں آخری زمانہ میں رونما ہوں گی۔ اے یاجوج ! یہ ظہور اس لیے ہوگا کہ منظاہر پرست دہریئے بھی مجبور خدائے قادر پر ایمان لائیں۔ اُس وقت اللہ تعالیٰ کا جلال ظاہر ہوگا۔ اور ارض اسرائیل میں سخت زلزلہ آئے گا۔ اُس وقت پانی کی مچھلیاں

جو اسے بڑھ سے نہ روک سکے گا۔ سچ اور مٹی پر رینگنے والی ساری مخلوق اور روئے زمین پر بسنے والے تمام آدمی خدا کے حضور کانپیں گے۔ پہاڑ گر پڑیں گے اور بلند مقامات دھنس جائیں گے، اور سب دیواریں زمین پر آ رہیں گی۔ اور یاجوج کا ہر دست مخالف کیا جائے گا۔ سارے علاقے اس کے خلاف تلوار اٹھائیں گے۔ [illegible] میں جنگل اور [illegible] ہو گی۔

اور میں یاجوج اور اس کے ساتھیوں پر ہونے والی آسمانی آفت نازل کروں گا۔ سخت خونریزی ہو گی۔ موسلا دھار پانی برسایا جائے گا۔ بڑے بڑے اولوں کی مار پڑے گی۔ آگ اور گندھک برسیں گے۔

اسی طرح بہت سی قومیں مجھے پہچانیں گی اور میری تقدیس کریں گی۔

اور ماجوج پر ایک آگ برسے گی اور ان پر بھی جو بے خوف جزیروں میں بستے ہیں۔ اور وہ بھی خدا شناسی پر مجبور ہوں گے۔

دیکھو، وہ دن آ رہا ہے، وہ انقلاب آ رہا اور خدا کی بات پوری ہو گی۔۔۔ ـــــ ـــــ ہمالہ نے سر اٹھایا کانپ گیا۔ اس کی وادیوں میں ایک اور آواز گونجی اور [illegible] کے [illegible] اور ساحل گنگ پر [illegible] ـــــــــــ قیامت نے [illegible] لاہے سے بجر موا آج [illegible] آیا اور ساحل جاگ گیا۔ یہ وہ بشارت ہے جو نبیوں کو ملی تھی۔ اگر چاہوں تو اسی دن خاتمہ!

سپنوں کے دیس میں یاجوج و ماجوج موجیں مارنے لگے۔ [illegible] کے دیوزادوں نے آکاش اور پرتھوی پر قبضہ کر لیا۔ [illegible] کے [illegible] دنیا سے باہر نکل آئے۔ دجل و فریب کا عفریت اپنی مٹھیوں میں دوزخ و جنت لیے دنیا کو نگلنے نکلا۔ اس نے ذرے کو آفتاب سامان بنا دیا۔ [illegible] کو مادہ پر قدرت حاصل ہوئی اور دجال نے خدائی کا دعویٰ کر دیا۔ مگر [illegible] مادیت کی شکست بھی تھی۔ مادہ [illegible] نہیں، ازلی و ابدی نہیں۔ اصل توانائی ماورائے مادہ ہے اور خود [illegible] کے ہاتھوں مادہ اور مادیت کے لات و منات ٹوٹ گئے۔ حضرتوں نے عیسیٰ کو [illegible] کر ایک دوسرے پر حملہ کرنا شروع کر دیا۔ عالم [illegible] بھی تھا اور [illegible] بھی۔ بڑی سخت کشمکش پیدا ہوئی۔ سخت تصادم ہو رہا تھا۔ بھیانک دھماکے ہونے لگے۔ کائنات لرزہ براندام ہو گئی۔ خواب کے بت فنا ہونے لگے۔ سپنوں کا سنسار رنگین ہونے لگا۔ شاید بندہ اور برہما کی کہانی ختم ہو رہی تھی۔ یہ عظیم دماغ کا ایک لمحہ تھا یا ابدیت کی ایک کڑی؟ کون جانے۔ عظیم دماغ خلفشار عالم سے بیدار ہو رہا تھا۔ برہما کی نیند دھماکوں سے اچٹ گئی تھی۔ سپنوں کا سنسار بھاگا یا خواب کی دنیا جاگا! ـــــ کیا عظیم دماغ انگڑائی لے کر جاگ اٹھے گا؟ کیا برہما پھر اپنے سپنوں کا سنسار رچے گا؟

تین، جاپانی کھیل

قرۃ العین حیدر

جاپان کا نوہ ڈرامہ ساری دنیا کے ڈرامیٹک آرٹ سے مختلف اور منفرد حیثیت کا مالک ہے۔ اسے اکثر قدیم یونانی ٹریجڈی سے تشبیہ دی جاتی ہے مگر نوہ اور یونانی ٹریجڈی میں بھی بہت فرق ہے۔ وہ جاپانی جنھوں نے آٹھویں صدی عیسوی میں "چا کی رسم" کی اس لیے بنا ڈالی کہ چپ چاپ بیٹھ کر وہاں کی خاموش آواز کو سنیں اور حضورِ قلب حاصل کریں۔ اس عجیب و غریب آرٹ فارم کے خالق ہیں۔ آرٹ اہلِ جاپان کے نزدیک مجسم زین ہے۔ اور زین بدھ مت کا وہ مدرسہ فکر ہے جس میں دھیان ہی سب کچھ ہے (یہ زین یعنی 'دھیان' کا مذہب ہند قدیم میں ظہور میں آیا۔ چین میں اس کی مزید نشوونما ہوئی اور جاپان میں اسے ایک باضابطہ نظامِ زندگی کا درجہ حاصل ہو گیا۔ زین کے نزدیک جہاں کہیں شعریت ہے۔ خدا کے قرب کا احساس ہے۔ اعلیٰ جذبہ ہے۔ فطرت اور انسان کا اتحاد ہے وہاں زین موجود ہے۔ اس لحاظ سے ساری جاپانی اور چینی مصوری زین ہے۔ یسوع مسیح میں زین موجود تھا۔ اور ایک ہارٹ میں۔ اور باخ کی موسیقی میں اور ہومر اور چاسر اور شیکسپیر اور ورڈزورتھ میں۔ ڈون کی خوٹ کے کردار اور ملٹن کے شیطان میں بھی زین مل جاتا ہے۔ ٹرکتے کے خوف سے جاگتا ہوا چوہا بھی زین ہے۔ چاند کو تکتا ہوا شاعر بھی زین ہے۔ کھانا کھانا پانی پینا ہر شے زین ہے۔ زین کے نزدیک قصائی کی دوکان اور کوڑے کے ڈھیر میں بھی حسن موجود ہے۔ گھوڑے کے زنگ آلود نعل میں بھی بدھ کی فطرت موجود ہے۔ ہر چیز کی قدر و قیمت یکساں ہے کیونکہ ہر چیز کی قدر و قیمت بے حد و حساب ہے۔ اگر آپ یہ بات سمجھ سکتے ہیں تو بھی ٹھیک ہے۔ اگر نہیں سمجھ سکتے تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جاپانی شاعری کی خصوصیت دیکھیے۔ خزاں کا موسم۔ چاندنی۔ پھولوں کا کھلنا۔ جگنو کا پر۔ جھینگر کی آواز۔ کیچڑ میں پڑے ہوئے خربوزے۔ پتے پر رینگتا کیچوا۔ ہر شے میں معنی ہیں۔ ہر شے کی قیمت ہے۔ یہ سب چیزیں ذاتِ مطلق کی مظہر ہونے کی حیثیت سے نہیں بلکہ بذاتِ خود اہم ہیں۔ زین کی روشنی میں ہم فطرت کے متعلق جاپان کے رویے کو زیادہ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔

جھینگر، جو گاتے گاتے

ختم ہو گیا

یہ باشو کی مکمل نظم ہے۔ اس طرح "شیکسپیر پانی میں، ورڈزورتھ مٹی میں، مسز گیرٹ اچار میں، بدھ پھول میں اور باشو مینڈک میں تبدیل ہو جاتا ہے۔" دوئی کی تفریق مٹانا زین ہے۔ اس فلسفے کو HIGELIAN ABSOLUTE بھی کہا جا سکتا ہے۔ کلیت پرستی بھی مسئلہ جبریت بھی۔ یہ جبر بھی ہے اور اختیار بھی۔ زین تصوف اور وحدت الوجود سے جداگانہ ہے۔ صوفی حقیقت کو دیکھنے کے لیے مجاز کو بطور ذریعہ استعمال

کرتے ہیں۔ زین محض وہ دین ہے جو رکتا ہے اس سے آگے کچھ نہیں۔ حقیقت اور حقیقت کی تفریق زین کے نقطۂ نظر سے بالکل بے بنیاد ہے زین نے لفظ کا بھی بہت بڑا فلسفہ پیدا کیا ہے۔ بدھ ازم کے حوالے میں مثلاً جسم، بیت، مکان ہے جس میں آگ لگی ہوئی ہے۔ ہم باتیں کرتے رہتے ہیں اور مکان جلا چلا جاتا ہے۔ اور بالآخر ایک روز جل کر راکھ کا ڈھیر ہو جاتا ہے۔ زین پہاڑوں، درختوں، مکانوں اور انسانوں کی شکست میں سب کچھ تھا۔ جو میں نے بتانا شروع کیا اور رہا۔ مجھ کو کچھ لیا؟ مہاتما بدھ خاموش رہتے لیکن انھوں نے سب کچھ بتا دیا لیکن کسی نے کچھ نہیں سنا۔ لیکن سب کچھ کہہ گیا۔ تشبیہ یا استعارے جب PASSION – INSPIRED ہوں تب ان چیزوں کی یکسانیت کا اظہار کرتے ہیں جنھیں منطقی ذہن نے ایک دوسرے سے جدا کر دیا ہے۔ زین ذہن و روح کی مکمل آزادی ہے۔ تناقض زین فلسفے کی ایک اور خصوصیت ہے۔ زبان دو مختلف معنی بیک وقت بیان کرنے سے قاصر ہے۔ اس لحاظ سے موسیقی میں الفاظ سے زیادہ وسعت ہے کیونکہ دو مختلف نغمے بیک وقت باہمی طور پر شامل ہو جاتے ہیں۔ زین حیاتِ انسانی کے تناقض حل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مختلف معانی اور تشریحات ہیں اگر حقیقت سے دور جا پہنچنے کے۔ جاننے زین کے نزدیک سارے منطق ساری ظاہری استقامت کی فصیلیں ٹوٹ پھوٹ کر برابر ہو جاتی ہیں۔ اور اس طرح ہم اس نقطے تک پہنچ جاتے ہیں جو الفاظ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ تناقض ذہن کی اس آزادی کا علمبردار ہے کہ آپ جس چیز کو جو قیمت چاہے عطا کیجئے یا نہ کیجئے۔ استغنا اور بے نیازی کا یہ عالم ہے کہ زین کو ہدایت دی گئی ہے کہ اگر کہیں راہ میں مہاتما بدھ یا دھرم سے ملاقات ہو تو جھٹ فوراً مار ڈالو۔ اس کے باوجود زین روحانی آمادگی سے یہ محض غیر ترہت بالا تر اور خرافات سے مادرا ہے۔ اگرچہ تو ہمات اور مذہبی زین کے لاؤ سے ہیں کیونکہ فطرت سے قریب تر ہیں۔ اس مذہب کے نزدیک زندگی نہ فانی ہے نہ لازوال۔ زندگی محض زندگی ہے جس طرح بادلوں کی بجلی محض بادلوں کی بجلی ہے۔ مکمل طور پر معصوم، بچوں کی طرح بھولے اور معتقدانہ دل و دماغ کا مالک انسان ہی زین تصور ہے۔ نروان مسئلہ کے کیتھولک صوفیوں کے ذہنی اور روحانی تجربے سے نزدیک تر ہے۔ زین اخلاقی فیصلے بھی صادر نہیں کرتا۔ مذہبی ارتقائی اس اسٹیج پر پہنچ کر خدا اور حیاتِ جاوید دونوں غیر ضروری ہو جاتے ہیں (اسی وجہ سے ایک زین پجاری نے ایک جگہ سوال کیا ہے کہ مہاتما بدھ نے ہاتھ میں کنول کا پھول کیوں اٹھایا۔ کوئی پرانا جوتا کیوں نہیں اٹھا لیا!)

قصہ مختصر، نوہ اسی جاپانی ذہن کی تخلیق ہے جس نے زین کو قبول کیا۔ اس کی داغ بیل بہت پہلے پڑ چکی تھی مگر چودھویں صدی عیسوی میں نوہ ڈرامہ پہلی مرتبہ پروہتوں نے تصنیف کیا۔ اور شروع شروع میں ہم عصر مغربی MYSTERY- اور MIRACLE تمثیلوں کی طرح یہ کھیل بھی مندروں میں اسٹیج کیے جاتے رہے۔ شنتو مندروں کے مذہبی رقص، درباری رزمیہ رقص اور بدھ مندروں سے متبرک پینٹومائم نے مل جل کر اس فن کو آگے بڑھایا۔ اس وقت تک بدھ مت کے مندروں میں ہندو مذہب اور چینی اثرات کی عملداری تھی۔ اس لیے شروع شروع میں نوہ ڈرامہ شنتو حلقوں ہی میں محدود رہا۔ شوگن عہد میں (جس میں فیوڈل وار لارڈز شہنشاہ سے سیاسی اور فوجی طاقت چھین کر ملک کے اصل حکمران بن بیٹھے تھے اور بادشاہ محض برائے نام بادشاہت کرتا تھا) نوہ کو عروج ملا۔ یہ بے حد رومینٹک دور تھا۔ سارا ملک طرح طرح کی دلآویز حکایتوں، دلاوری کے قصوں اور افسانوں سے گونج رہا تھا۔ پندرھویں صدی میں نئی بدھ تہذیب نے جو دھیان اور فطرت کے شاعرانہ ادراک پر مبنی تھی، یعنی زین تھی، شنتو مندروں میں پرورش پانے والے نوہ ڈرامے کو ایک اخلاقی مقصد اور ایک نفسیاتی وسعت بخشی۔ اور اسے "ڈرامہ آف کیریکٹر" بنایا۔ شنتو الوہی رقص، درباری غنائیہ شاعری، دیہاتی لوک گیت، رزمیہ شان و شوکت سبھی چیزیں اس میں شامل ہو گئیں۔"

نوہ کی ساری خوبصورتی اس کے مرتکز ہونے میں ہے۔ ملبوسات، حرکات و سکنات، اشعار، موسیقی، رقص، سب مل جل کر دیکھنے والے پر ایک مجموعی تاثر پیدا کرتی ہیں۔ یہ بھی ایک مشرقی خصوصیت ہے۔ مشرق میں آرٹ فارم کو بقول فینولوزا[1] CONDENSE کر دیا گیا ہے۔ (دیکھئے چینی اور مغل مصوری، جاپانی ہائیکو نظمیں)

نوہ مصنفوں کا خیال ہے کہ جذبات خیال سے وابستہ ہیں تصنیف سے نہیں۔ انسان کی اندرونی تمنا نوہ کا خاص موضوع ہے۔ یہ ڈرامے ہزاروں کی تعداد میں لکھے گئے اور آج تک اسی روایتی انداز سے اسٹیج کئے جاتے ہیں۔ ان کے مصنف بھی اکثر زیادہ تر راہب اور پروہت تھے۔ خالص مشرقی شان سے گمنام مر گئے۔ لیکن ان کی یہ تصانیف پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتنے بڑے صاحب فن تھے۔ رفعت کردار جو شرک بجوشی کی خصوصیت ہے، نوہ تمثیل میں بے حد ماورائی انداز میں پیش کی جاتی ہے۔ بودھی ستوا، دیوتا، اہل عناصر جن، پریاں، جانوروں کی روحیں، ارواح خبیثہ، سمندر اور دریاؤں میں رہنے والے اژدھے، دیوتا، چاندنی اور پھولوں اور درختوں کی روحیں، شراب اور آگ میں رہنے والی آتمائیں، خیال کے مضمحل ہیولے، خواب کی پرچھائیاں ——— یہ سب نوہ کے کردار ہیں۔"

نوہ کے شروع میں چیف ایکٹر اپنا شجرہ نسب سناتا ہے اور عہد رفتہ کے ان شہنشاہوں کی قصیدہ خوانی کرتا ہے جن کے درباروں میں اس کے پرکھوں نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ ہمارے یہاں کے گائیکوں کے گھرانوں کی طرح نوہ ایکٹر بھی خاندانی اداکار ہوتا ہے۔ ایک غیر ملکی کے لیے ان تمثیلوں کی روح میں اترنا خاصا مشکل ہے جس طرح ہمارے راگ راگنیوں کو سمجھنا ہر غیر ملکی کے بس کی بات نہیں۔

نوہ اسٹیج کرنا اور دیکھنا شرافت کا مشغلہ تھا۔ کیونکہ شوگن دربار اس فن کا سرپرست تھا۔ اسی وجہ سے اس کی زبان بھی بے حد پر تکلف اور نفیس ہے۔ شوگن دور میں ان کی گدی نشینی اور شادی بیاہ کے مواقع پر اور بدھ تہواروں کے زمانے میں نوہ چار چار دن تک مسلسل اسٹیج کئے جاتے رہتے۔ پانچویں دن عوام کے لیے اس کے دروازے وا کر دیئے جاتے تھے اور یدو (موجودہ ٹوکیو) کی آٹھ سو آٹھ سڑکوں کے افسر ایک ایک کاغذی قندیل اٹھائے (جس پر اس سڑک کا نام لکھا ہوتا تھا) اپنے محلے والوں کو ساتھ لے کر جلوس کی شکل میں کھیل دیکھنے آتے تھے بلکہ حقیقت پسند نقالی یا زندگی کی عکاسی کرنے والے تھیٹر کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور اسے "عام تھیٹر" کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ علامتی اور رمزیہ اسٹیج اداکار اور آڈینس دونوں کے لیے قابل تکریم تھی۔

نوہ شاستر کے لحاظ سے ایک تمثیل پانچ حصوں میں منقسم ہوتی ہے:

(۱) شوگین ——— یعنی دیوتاؤں کا نوہ

(۲) رزمیہ نوہ ——— کیونکہ دیوتاؤں اور شہنشاہوں نے اپنے تیر و کمان کے ذریعے وطن مقدس کو بچایا اور شیاطین کو زیر کر کے امن قائم کیا۔

(۳) عورتوں کا یا رومانی نوہ ——— کیونکہ امن کے زمانے میں محبت کی جا سکتی ہے۔

(۴) مدحوں کا نوہ ——— جنگ کے بعد امن اور شان و شوکت حاصل ہوتی ہے۔ مگر وہ چند روزہ اور سخت ناقابل اعتبار ہے۔

---

[1] رابرٹ فینولوزا ROBERT FENOLLOSA.

اور یا ثانی ہے۔" اور اسے سمجھنے کو نوہ کے سیٹ پر متانت اور وجدان کو رستہ ہیں۔ اس طرح نے نوہ کو مہذب سے کا مقابلہ ہے بکراں کیا جاتا ہے اور جو اسے سارے کام پر حاصل ہے۔"

(۸) اخلاقی نوہ

(۹) آخری حصے میں مراد اور داکار اس کو پیش کرنے کے بعد دوبارہ دیوتاؤں کی تقدیس بن جاتی ہے۔

اس طرح نوہ ساری زندگی کا احاطہ کر لیتا ہے۔ ان نسانہ میں نمبر ۳ یعنی روحوں کا نوہ صیاتے کے ساتھ عجیب انگیز ہے (میں نے ان ہی میں سے ایک کا ترجمہ کیا ہے)

نوہ اداکاری کے قواعد بے حد کٹھن ہیں۔ جن سے ذرا سا انحراف بھی ممکن نہیں۔ اس اداکار کے لیے زندگی کی نقالی کے بجائے زندگی کو اندر سے محسوس کرنے کی ضرورت ہے۔ نوہ کہا جاتا ہے کہ اصل نوہ کا اصل لازم ہے۔ ماسک اس فن کی خصوصیت ہے اور بذات خود اعلیٰ ترین فن ہے۔ ایک ہی اداکار ماسک کو زندگی بخش دیتا ہے۔ بوڑھے اور عورتیں ماسک پہنتی ہیں۔ بھوت کا رول ہمیشہ مرد ادا کرتا ہے۔ نوہ کے ماسک پر بریخٹ نے یہ غیر معمولی اشعار لکھے ہیں:

میرے سامنے دیوار پر ایک بدصورت شخص
کا سنہرا ماسک آویزاں ہے
اس کی کنپٹیوں کی ابھری رگیں دیکھ کر مجھے
خیال آیا۔ بد ہونا خود اپنے لیے
کتنی بڑی اذیت ہے۔
بدی کے پیچھے انسان کو کتنی جان مارنی پڑتی ہے۔

اسٹیج پر صرف ایک پائن کے درخت کی تصویر ہوتی ہے۔ پائن زندگی کے ناقابل تغیر ہونے کی علامت ہے۔ چونکہ ہمیشہ سرسبز رہتا ہے۔ باقی اسٹیج بالکل خالی ہوتا ہے۔ دونوں طرف برآمدے اور سامنے ایک پل ہوتا ہے۔ پردے نہیں ہوتے (نوہ اسٹیج کا تذکرہ میں "ستمبر کا چاند" میں بھی کر چکی ہوں) کھیل عموماً کسی کردار کے سفر پر جانے سے شروع ہوتا ہے۔ پل پر سے گزرتے ہوئے وہ اناؤنس کرتا ہے کہ کہاں جا رہا ہے اور کیوں جا رہا ہے۔ اکثر کردار اپنی علامتی حرکات و سکنات کا مطلب بھی بیان کرتے جاتے ہیں۔ نوہ کے آخری الفاظ اکثر ہوا میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ عموماً رقص پر کھیل کا اختتام ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے پڑھتے وقت لگتا ہے ان تمثیلوں کا خاتمہ بھی بے ربط سا معلوم ہوگا۔

نوہ کی وحدت جذبات میں ہے۔ ہم اسے UNITY OF IMAGES وحدت تخیل کہہ سکتے ہیں۔ نوہ خالص روح کی تمثیل ہے۔ اس لیے دوسرے آرٹ فارمز سے بلند تر ہے۔ ایک نوہ اداکار کو بڑا فنکار بننے کے لیے ایک پاکباز اور اعلیٰ درجے کا انسان بھی بننا پڑتا ہے۔ اسٹیج پر نوہ دیکھنے کی کیفیت ایسی ہے گویا موسیقی سنی جا رہی ہو۔

مغرب میں تجدید رومانیت اور CELTIC REVIVAL کے ساتھ ساتھ مشرق کو بھی دوبارہ تلاش کیا گیا۔ پچھلی صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع کا زمانہ تھا۔ جاپانی مصوری اور شاعری نے امپریشنزم اور امیجسٹ تحریکوں کو متاثر کیا۔ ٹیگور اور ویدانت نے مغربی ادیبوں کو اپنی طرف

کھینچا۔ اس زمانے کی علامتی شاعری اور ڈرامے میں بالخصوص ییٹس کے یہاں ہم کو اس کی پرچھائیاں بہت واضح نظر آتی ہیں۔ ییٹس معاملہ پرست انقلابی تھے جو بالخصوص آئرلینڈ کی دکھی روح کی نئی علامتوں کے ذریعے ترجمانی کرنے میں مصروف تھے۔ اسی زمانے میں امریکی امیجسٹ شاعر ایذرا پاؤنڈ نے نوہ ڈرامہ دریافت کیا۔ ییٹس کے لیے نوہ ڈرامے میں وہ سب کچھ تھا جس کی انھیں اور ڈن کے ایسے تجربوں والوں کو تلاش تھی کہ ماڈلوں کی جگہ اس تمثیل میں ماسک نے سنبھال لی تھی۔ ییٹس نے خواب اور حقیقت کو ماسک میں متحد کیا۔ اور کئی ڈرامے نوہ تکنیک میں لکھے جو DANCER PLAYS کہلائے۔ ییٹس کی تمنا تھی کہ ڈرامے کو شعر کا درجہ بھی حاصل ہو سکے۔ اپنی ایک تمثیل AT THE HAWK'S WELL کے متعلق انھوں نے لکھا:۔

"میرا یہ ڈرامہ ایک جاپانی رقاص کی وجہ سے ممکن ہوا جسے میں نے ایک اسٹوڈیو میں ایک ڈرائنگ روم میں اور ایک بہت چھوٹی سی اسٹیج پر ناچتے دیکھا ہے۔ ڈرائنگ روم اور اسٹیج کی روشنی میں جیتے تھے اس کی وہ المیہ تصویر دیکھی ہے جس نے میرے تخیل کو مسحور کر رکھا ہے۔ اس جگہ پر کوئی مصنوعی لائٹنگ نہ تھی۔ پہلے پل میں وہ ہم سے دور ہوتا چلا گیا اور ایک نئی اسرار بھری دنیا میں کھو گیا۔ اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ ہر آرٹ کی عظمت کو اس کی وحدی یا تجربے میں دیکھا پایا جا سکتا ہے۔ سارا تخیلی آرٹ ایک فاصلے پر رہتا ہے اور جب اس فاصلے کا تعین کر لیا جائے تو ایک دخل انداز ہونے والی دنیا سے اسے بچا کر رکھنا بھی اشد ضروری ہے۔ شعر، RITUAL، موسیقی، رقص، ملبوسات، چہرے کے تاثرات، اسٹیج کی آرائش، سب چیزیں ایسی ہوں جو اس دروازے کو بند رکھنے میں کامیاب رہیں۔ ہمارے تخیل سے عاری آرٹ ہماری روزمرہ کی دنیا کی ہو بہو نقل ہمارے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ لیکن جن فنون لطیفہ سے مجھے دلچسپی ہے۔ وہ اجسام، تشبیہوں، شکلوں، علامتوں کو ہماری دنیا اور ہم سے جدا کر دیتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ہمیں اس قابل بناتے ہیں کہ ہم ذہن کی ان گہرائیوں میں چند لمحے گزار لیں جو اپنی لطافت اور گہرائی کی وجہ سے اب تک ہماری پہنچ سے باہر تھے ——"

ایذرا پاؤنڈ نے ان گنت نوہ تمثیلیں ترجمہ کی ہیں۔ گو ترجمہ در ترجمہ سے بات نہیں بنتی لیکن میں ان ہی میں سے تین تمثیلیں یہاں پیش کر رہی ہوں۔



نوہ ڈرامے کی [illegible] کے درخت کی تصویر کے نیچے ہوتی [illegible]
[illegible]



نوہ ڈرامے د را لهنس
چہرے کا ماسک او. .رخ نقلی بال روائتی ہیں

(۱)

کاکت سُوباتا ـــ سوسن کے پھولوں کی مدح

پروہت
کورس

پروہت: میں ایک پروہت، دیس دیس گھومنے والا۔ میں میاکو بھی گیا۔ وہیں میں نے سارے مندر اور محلے دو محلے بھی دیکھے۔ اب میں پورب کی اور جاتا ہوں۔ ہر رات میرے لیے نیا کچھ نا لاتی ہے۔ اور میرے دل میں پرانا دکھ ہے۔ میں مکاوا آیا ہوں کہ سوسن کی بہار کا نظارہ کروں۔ اب سبزہ میرے سامنے ہے۔ پھولوں کو نزدیک سے دیکھنے کی خاطر میں آگے بڑھتا ہوں۔ وقت تو نہیں ٹھہرتا۔ بار گزر جاتی ہے۔ جیٹھ مہینہ بھی آن پہنچے گا۔ نئی ٹہنیوں والے درخت اور بے نیاز گھاس اپنا سمے نہیں بھولتی۔ ان کو پروا نہیں۔ لیکن وہ فصل گل میں اپنے رنگ بکھیرنا یاد رکھتے ہیں۔

کاکت سُوباتا: اس ویران دلدل میں تم کیا کرتے ہو بھائی؟

پروہت: میں ایک سیلانی پروہت، اپنے سفر پر جا رہا ہوں ـــ یہ کون جگہ ہے؟

کاکت سوباتا: یاٹسو ہاشی مکاوا ـ "آٹھ پل"۔ سوسن کا باغ۔ دنیا کے بہترین پھول تمہارے سامنے کھلے ہیں۔ اگر تم میں جذبہ ہے تم ان کے گہرے رنگ پہچان پاؤ گے

پروہت: یہ پرانی داستان والی کاکت سوباتا کے سوسن نہیں؟ ان کا قصہ کس نے لکھا تھا؟ تمہیں معلوم ہے؟

کاکت سوباتا: "اِسے مونوگاتاری" میں مرقوم ہے۔ "آٹھ پُلے" کے پاس کمودو کے پانیوں کی جھیل میں سوسن کھل کر اپنی پنکھڑیاں بکھیر گئے" اور نری ہیرا نے لکھا "یہ پھول اپنا درباری لباس ملک چین سے لائے تھے" دور دراز اور زما سے نری ہیرا یہاں آیا تھا۔ یہاں اور اُتر کے آخری کھونٹ تلک وہ مارا مارا پھرا۔

کورس: کنارے کے قریب جل گہرا ہے۔ وہ جس نے خود کو مجھ سے باندھ دیا تھا ان گنت بار میرے اور اس جھیل کے پاس آیا۔

کاکت سوباتا: میں بولوں ـــ؟

پروہت: کہو۔

کاکت سوباتا : میں غریب ہوتی ہوں۔ پر کیا تم میرے جھونپڑے میں رات گزارو گے ؟

پروہت : یقیناً ـــ

(اب روح اس علاقے کی ایک سادہ سی نوجوان لڑکی کے روپ میں ظاہر ہوتی ہے اور ستون کے پاس سے ہٹ کر تبدیلِ لباس کی غرض سے اسٹیج کے دوسرے سرے پر چلی جاتی ہے۔ اب وہ اپنی اصلی حالت میں یعنی گوسے زمانوں کی اس شاندار خاتون کی حیثیت سے واپس آتی ہے جسے نری ہیرانے چاہا۔ وہ سنہرے اور اُودے بیل بوٹوں والی باریک زربفت کے اوپری لبادے کے نیچے تیز نارنجی، سبز اور طلائی کام کی پوشاک میں ملبوس ہے۔ اور ایک شب رنگ ٹوپی سر پر اوڑھ رکھی ہے)

کاکت سوباتا : (اپنی خواصوں سے) یہ ٹوپی ـــ نگارخانۂ چین کی اطلس کا یہ لبادہ ـــ

پروہت : یا مظہر العجائب ـ اس خستہ حال جھونپڑی ـ اس سنسان کنج میں ایسی عالی مرتبت بی بی ـــ سوکی یونائی کے عہد کی ٹوپی اوڑھے۔

کاکت سوباتا : یہ لباس چین سے منگوایا گیا تھا۔ وہاں کے لوگ جیسوں نے اسے آج تک یاد رکھا ہے ـ یہ تو جاپان کے قدیم شہنشاہ سیوا تنو[1] کی مہارانی کی پوشاک ہے۔ وہ جسے نری ہیرانے چاہا ـ یہ ٹوپی اس کے ناچ کے لئے تھی ـ میں گویا دن میں ملبوس ہوں پروہت جی۔

پروہت : اس پوشاک کو الگ رکھ دو ـ بی بی، تم کون ہو ؟

مہارانی : میں یادوں کا رنگ ہوں ـ اور نری ہیرا خدائے موسیقی کا اوتار تھا ـ اس کے الفاظ، اس کے سروں میں سحر تھا ـ پودے گھاس، کلیاں، پتے، اس سے دعا مانگتے تھے کہ وہ انھیں شبنم عطا کرے۔

پروہت : ایسی دنیا میں جہاں ہر چیز برباد ہو جاتی ہے، ایسی دعا کیا ضرور تھی ! ذہن سے عاری پودوں کی خاطر میں بودھی ستوا کے قانون کا پرچار کرتا ہوں۔

مہارانی : یہ رقص بدھ کے حضور میں ہماری عبادت تھی۔

پروہت : (موسیقی کی آواز سنتا ہے) یہ یقیناً آتاؤں کی سنگیت ہے۔

مہارانی : اس نے آدمی کا روپ دھارا ـ

پروہت : اپنے جگمگاتے شہر سے باہر جا کر وہ دور دور نکل گیا ـ

مہارانی : خلق کو ـــ

پروہت : اپنی دیا سے بچاتا رہا ـ

کورس : دور ـــ اور دور ـــ کتنی دور ـــ میں ناچ کے کپڑے پہنتی ہوں۔

---

[1] نویں صدی عیسوی

مہارانی : فہرِ ذاتی کالباس۔
اس کہانی کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا۔ کسی نے ذکر کرنے والے کو دیکھا۔ نہ کسی نے اسے پہچانا۔
اگلے وقتوں میں ایک نوجوان ناٹک کی عزت افزائی کے لیے گیا۔

کورس : ہمارا خیال ہے وہ سیوا اتنو کا دور تھا۔ تسنسن وکے ذہان کے ان الفاظ کے ذریعے — "ہماری سنہ تہذیب میں جمہد پاؤں رکھ چکا ہوا ہے —" اسے فلسفت حطاکر کے کا رو ڈگانے تھر ، کام میں بیاسیت پاگیا۔

مہارانی : جو غیر معمولی عزت افزائی کی بات تھی۔

کورس : شاہی محل میں ناٹک بہت کم کھیلا جاتا تھا۔ (بھی ہر سہ ناٹک کھیلا گیا)، دنیا کی شان و شوکت چند روزہ ہے — پھول کھلا، مرجھا گیا۔
چنانچہ وہ بھی قسمت کے زمانے ، وہ آتا جاتا ہے۔ بادل کی طرح آوارہ ۔ برسوں بعد بیتے کی لہروں کو دیکھ کر اسے اس عارضی ہستی و عظمت کی یاد آتی ، موجیں لوٹ کر آتی ہیں ۔ پر زمانہ نہیں لوٹتا ۔ ری تیرا ۔ نری تیرا ، میری شان و شوکت کبھی واپس نہ آئے گی ۔ پیاڑ کے دامن میں کھڑے ہو کر وہ جوالا مکھی کا دھواں اوپر اٹھتا دیکھا کیا۔

مہارانی : آسامانی چوٹی سے دھواں اب بھی اٹھ رہا ہے ۔ نری تیرا ۔ نری تیرا ۔
میری شان و شوکت کبھی واپس نہ آئے گی ۔

کورس : وہ ست رہے ہیں کچھ سنا رہا ، اور پھر کھاتا آن بسا جہاں جھیل کنارے سوسن کھلے ہیں ، ہر کو کاتر کی کی حکایت میں اس کے سمٹے نقطے طولانی ہیں ۔ تیلی تھو کھوں کے نیچے ندی بہتی رہتی ہے ۔ جگنو چاروں طرف اپنی روشنی جیسے اشارہ کرتے ہیں ۔ خوبصورت عورتوں کی روحیں آسمان پر جا رہی ہیں ۔ یہاں پاتال میں خزاں کی ہوائیں چلتی ہیں اور جنگلی بطخیں چیختی ہیں —— کاری —— کاری —— میں جو آوارہ گردوں کا ہمراہی ہوں ادھر ادھر بھٹکنے لوگوں کو بتلانا چاہتا ہوں ۔ چاہے وہ مجھے بتائیں یا نہ جانیں ۔ ندی جو اندھیرے کی سمت نہیں جاتی ۔

کورس : (نری تیرا کا گیت گاتے ہوئے)
چاند وہ چاند نہیں ۔ بہار پچھلے زمانوں کی بہار نہیں ۔ میرا جسم میرا جسم نہیں ۔ خالی ایک بوڑھا ڈھانچہ ہے ۔ نری تیرا — نری تیرا
میری شان و شوکت واپس نہ آئے گی ۔

کورس : (دوبارہ) — جاننا چاہئے کہ نری تیرا نے یہ نظمیں سیوا اتنو کی ملکہ کے لیے کہی تھیں ۔ جسم کا رینہ رینہ الگ ہو جاتا ہے ۔ اس شبیہ سائے اور روشنی میں تقسیم ہو جاتی ہے ۔
اور اب میں اپنا پرانا جگمگ جگمگ کرتا لبادہ پہن کر رقص شروع کرتی ہوں ۔
(ناچ جس کی وہ تشریح کرتی جاتی ہے)
پھولوں پر سے پگھلتی برف ۔ اڑتی تتلی ۔

کورس : بید مجنوں کے کنج میں کوئل ۔ ہوا میں اڑتے سونے کے ڈھیلے ۔

روح : کاکت سو بانا کی سوسن پھر سے بوئی جا رہی ہے ۔

کورس : اسے جگمگانے رنگ لوٹ آتے ہیں۔

روح : اسی طرح ہر کہانی شروع ہوتی ہے۔

کورس : سب رنگ کیا ہیں کاکت سوباما آیا ہے ؟

(ریشمی اور زعفرانی چرخوں میں میوس کورس شروع رنگوں والی رقاصہ کو چاروں طرف سے چھپ لیتا ہے) رخصت ہو کون چلاتا ہے ؟

(روح فضا میں غائب ہونا شروع ہوتی ہے)

کاکت سوباتا : یہ رقص متی کے جوہر کا عشق چھلکا ہے۔

کورس : آستینیں اس کی یوتو کی برف کی مانند سپید ہیں۔ جو اپریل جھینٹے میں پنکھڑیاں گراتا ہے۔ دن نکلا۔ دور ادھوں پیدا دل و اگرد تیا ہے اور اپنے خیالوں کے دریتے مرجھا جاتا ہے۔ روح کا پھول بدھ میں تحلیل ہو گیا۔

---

(۲)

داکی ——— پروہت

شتے ——— ہیرو کی روح

سوُرے ——— لڑکی کی روح (دونوں عرصہ ہوا مر چکے ہیں اور مرنے کے بعد بھی مل نہیں پاتے۔ ہیرو نے لڑکی کی بے اعتنائی کے غم میں جان دے دی تھی۔ اس کے مرنے کے بعد لڑکی نے جفا سے توبہ کی۔ اور اب اس کی روح پشیمان ہے)

کورس۔

داکی : کوہ فشو یو کا نام سبھی کو اچھا لگتا ہے۔ دوسرے خانہ بدوش بھکشوؤں کی مانند میں بھی اس راستے پر عازم سفر ہوتا ہوں۔ میں ابتک پورب دیس نہیں گیا۔ پر اب تو یہ ٹھانی ہے کہ دنیا کے چھور تک جاؤں گا۔ اور کا ہے نہیں! میری کوئی منزل نہیں۔ دوسروں کا جھنڈا میں نہیں اٹھاتا۔ میں تو بادل کی مانند آزاد ہوں۔ اب مات کا پرچم میرے سامنے لہراتا ہے۔ نجانے سمندر کس طرف ہے۔ یا وہ قصبہ کیفو جو سنا ہے سمندر کے کنارے آباد ہے۔

شتے اور سورے : ان گنت بار یہ رنگین شالکھا یہاں لائی گئی ہے۔ اس پہ لکھے ہوئے ٹوٹے ان پہاڑوں پر بکنے والی

آنکھوں کی حسرت کے عشق و نثار کے بے دلفریب ہیں۔

شے سٹے : ہاں سے ، ہم تو تھک کر ٹوٹ گئے ہیں۔ ظالم کس کی طرح بیری جان اس طرح کھا رہی ہے جس طرح کے مانند جو لکڑی سے کیڑے پر چھپی ہے۔ جھینگر کی طرح جو سمندر کی لہروں میں گم ہو جاتا ہے ، تھک کر رہ گئے ہیں۔ ہم کو معلوم ہے ، جو ہمارے لئے کی جگہ ہے۔ ہمارے آنسو کم لئے ہیں۔ نہ سوتے ہیں ، ہمارے خاطر سے چین نہیں ؛ سوتے ہیں اس کا خیال کرنا جیسے قسمت کا خیال نہیں — یہ دن طرح کا خراب ہے ؛ ہمارے دلوں میں بہت کچھ ہے۔ اور ہمارے جسم کم ہو چلے۔ آنسوؤں کی ندی کا پانی بہتا جا رہا ہے۔

کورس : کیفیت کا کرشمہ اس طرح مرکب ہے۔ اور پہاڑوں دریا کا پانی جو اس سے دو نوں کناروں پر وہ دونوں الگ الگ کھڑے ہیں۔ جو کپڑا دلہن کے کنا تھا بے رنگ ہو گیا۔ ایک ہزار ایک سو دن بیت گئے انتظار میں گذر گئیں۔

واکی : دونوں ہی نہیں ہیں ، ناکارہ روحوں سے مخاطب ہے) اس جھیڑ میں دونوں دوسے سے آگئے۔ عجیب لوگ ہیں دونوں۔ دیکھنے میں میاں بیوی معلوم ہوتے ہیں۔ لڑکی کے ہاتھ میں پرانے سے ٹب دبا رکھا ہے۔ لڑکے نے بڑی خوبصورت منقش چھڑی سنبھال رکھی ہے۔ اور کھی سی چیزیں ہیں ——

سوسے : یہ کپڑا جو ستر لوگ کہلاتا ہے۔ دراصل ہی ترنگے کی چوڑائی سے بنا ہے۔

شے سٹے : یہ محض ایک معمولی سی رنگین لکڑی ہے۔ مگر یہ مقام انہی دونوں چیزوں کے لیے مشہور ہے۔ تم ہم سے خرید کے دیکھیں ،

واکی : میں جانتا ہوں۔ اس علاقے کا کپڑا اور سنہرے روغن کا سامان بہت مشہور ہے۔ معلوم ان کی اتنی شہرت کس وجہ سے ہے؟

سوسے : تم نے آج تک ان کی کہانی نہ سنی ؟ تعجب!

شے سٹے : لوگوں کو اپنے بکھیڑوں سے ہی فرصت نہیں ان سے یہ توقع کیوں رکھی ہوں کہ وہ تمہاری راہم کہانی بھی جانیں۔

دونوں : تم سنیاس لے چکے ہو اس لیے عین ممکن ہے کہ تم کو ان دونوں چیزوں کی اہمیت کا علم نہ ہو جن پہ محبت کے منتر منقش ہیں۔

واکی : یہ بھی ٹھیک کہتے ہو۔

شے سٹے : تین سال کے عرصے میں لڑکی کے گھر کے سامنے ایک ہزار رنگین ڈالیوں کا انبار لگ گیا۔ ان کے متعلق تمہارے زمانے میں گیت بھی بنے ہیں۔

سوسے : ایک ہزار ——

واحسرتا —— واحسرتا ——

کورس : اب شاخ گل پیش کرنے کی رسم بھلا دی گئی۔ یہ کہانی ایسی ہے کہ سنکر دیوتا بھی چلو بھر پانی میں ڈوب مریں۔ ہم گھر لوٹتے ہیں۔ شام کا سورج ڈوب چکا۔

شے سٹے : اس علاقے کی رسم ہے کہ خواستگار درختوں کی ڈالیوں کو رنگوں سے سجا کر اپنی مطلوبہ حسیناؤں کی چوکھٹ کے سامنے رکھ آتے ہیں۔

سوورسے : اور وائی جس کو پسند کرتی ہے اس کی لائی ہوئی شاخ گل اٹھا لیتی ہے۔ ایک دفعہ ایک نوجوان تین سال تک برسات اپنا علاج وضع لے کر آیا۔ اور پہاڑ کے دامن میں ایک ہزار جھڑیاں پڑی تھیں۔ اس نوجوان کا واقعہ مجھے معلوم ہے اسے ان لکڑیوں سمیت ایک کھوہ میں دفن کر دیا گیا۔

وائی : مجھے اس کھوہ کا راستہ دکھاؤ گے؟

شے سٹے : میں تمہیں اس کھوہ کا راستہ دکھلاؤں گا۔

کورس : ہم کیتو کی اونچی اونچی گھاس سامنے سے ہٹا کر دن بھر شام ڈھلے تک چلتے رہے اور کھوہ کے نزدیک اب تک نہیں پہنچے۔ او پہاڑی پر گھاس کاٹنے والے بھائی۔ ذری بات سننا۔

کورس : (خود ہی گھسیارے کی طرف سے جواب دیتا ہے) پگڈنڈی پر کہرہ بکھرا ہوا ہے۔ مگر تم پوچھو گے کہ قبر کہاں ہے۔ اب اس کا جواب تمہیں کون دے؟ اچھا مت بتاؤ۔ مت بتاؤ۔ چلو آگے چلیں۔

شے سٹے : خزاں کا موسم سرد ہے۔ اور رات آتی ہے۔

کورس : اور آندھی۔ درختوں کے پتے گر رہے ہیں۔ بارش کی پھوار برس برس جاتی ہے۔ خزاں کے شبنم آلود پتوں میں ہمارے پاؤں اٹک اٹک گئے۔ ابدی سایہ تنہا ہے۔ پہاڑ کی پرچھائیں اکیلی کھڑی ہے۔ پائن کے درختوں پر عشق پیچاں میں چھپا ہوا الو بولے چلا جا رہا ہے۔ بنفشہ اور گل داؤدی میں گھری ہوئی کھوہ میں لومڑی براجتی ہے۔ دونوں اندر چلے گئے۔

(شے سٹے اور سوورسے گویا کھوہ میں داخل ہوتے ہیں)

دُوسرا حصّہ

(وائی گویا سونے کی کوشش کر رہا ہے)

وائی : (بے چینی سے) نیند نہیں آتی۔ اکتوبر کی ہوائیں۔ صنوبر کے درخت۔ رات میں بودھی ستوا کی عبادت کروں گا۔

(گویا پوجا شروع کرتا ہے)

سوورسے : پروہت جی! اب ہم، جو زندگی اور زندگی کے بعد بھی جدا رہے، ملیں گے خود رو گھاس پر، ان پودوں کے اوپر جن میں میں رہتی ہوں، میں خواب کا پل بناؤں گی۔ پروہت جی۔ مجھے زبردستی نہ جگانا۔ میں نے دیکھا ہے کہ قانون مکمل ہے۔

شے سٹے : (گویا نظروں سے اوجھل ہے) آپ کی عبادت بہت خوب تھی مہاراج۔ جو دو لوگ تک گئی اور پرانے بندھن باندھے اب میں پہلی بار رنگ میں ظاہر ہوتا ہوں۔

کورس : تین سال گذر گئے۔ کہانی پرانی ہوگئی۔

شے سٹے : خواب کے اندر خواب دیکھنے کے لیے ہم واپس آئے ہیں۔

کورس: دیکھو دیکھو وہ سوزوکی کی شاعری کے بیچ ایک خلا کے پیچھے وہ غور دور ہوئے۔

ہلے سے: جنوری کی تہہ میں شاہزادوں اور عوام کے درمیان کوئی تعصب نہیں کی جاتی۔ یہ بڑی بدقسمتی!

واکی: تعجب! یہاں کمرہ وائن کے شعلے نہیں چمکتا، نئی جیسے سی سے فرکا رو تو کمرہ اندر رکھا گیا جا رہا ہے جو جادو کی جھنبیاں اٹھائی جاتی ہیں۔ یہ وہ سامان آرائش تو کسی پرانے عہد کا حال پڑھتا ہے۔ یہ عجیب ذہب نفوذ ہے۔ کیا طلسم!

شوہے: ہمارے دل تو آرزو رب نے اور جب اسے اب جیسے تم جو اسامیہ موجود ہیں ہم سے بند معلوم ہو ملیا ہے رہا گیا ہے اور حقیقت کیا ہے جو وجود ہے اور مشتاقانہ دلوں کے لطف میں رہتے ہیں۔

شی تے: پچھلے زمانے میں زری تیر ہنے کا تھا اور وقت سوں کے ساتھ وہی غائب ہو گئی کہ مسافر ہو تو نہریں ملد ڈر کر مایا کمنی ہے در حقیقت تھی۔

واکی: یہ خواب ہی سہی، یا معجزہ ہو لے۔ مگر اس سے پہلے کہ رات بھی گزر جانے میں عہد رفتہ کی ایک جھلک دیکھنا چاہتا ہوں۔

شی تے: دیکھو جس طرح پھول کا سایہ گھاس پر نظر آتا ہے اور جیا ہو کے سماتے روشنی کے بیچ تمہارے پاس صرف چاند ہے۔

سورے: رزائی کمرہ میں چلی گئی۔ اور اب کرکٹ کا کر خود ان کے جنوں کا ایسا ہلکا کیڑا بن رہی ہے۔

شی تے: خواستگار زمانہ محل کا کردروازے پر دستک دیتا ہے۔

سورے: ہلے اے۔

شی تے: کرگے کی آوازئے سوار

سورے: اور کوئی آواز۔

شی تے: جواب میں نہ سنائی دی تھی۔

سورے: اور ٹڈوں اور سبز جھینگروں اور موسم خزاں کی گرتی پتیوں کی ایسی خوبصورت صدا۔

شی تے: جو ہمیں ہر رات سنائی دیتی ہے۔

سورے: کری

شی تے: ہتاری

سورے: چو——

شی تے: چو——

کورس: (جھینگروں کی آواز کی نقل کرتے ہوئے)

کری ہتاری —— چو —— چو —— ——

کری ہتاری —— چو —— چو ——

کھیت کی نئی گھاس سے جھینگر اپنے پھٹے پرانے کپڑے رفو کر رہا ہے۔ شو —— چو —— رای شو —— کرگے کی آواز ——

چو——

کورس : دیا گرد، کسنو میں گھاس کا کپڑا بنا جاتا ہے۔ کیکو جو جزیرے کا آخری سرا ہے۔ دنیا کا بے مثال شہر کیکو ——

شے سٹے : یہ بڑی پرانی رسم ہے۔ مگر پروہت جی بھی تو ماضی کی سیر کرنا چاہتے ہیں۔

کورس : پروہت تو ہمارا آج خود بھی کہہ گئے۔ کہ اگر ہم "سو تو نو" (بُن ڈالیں) ایک ہزار ایک سو راتوں تک جادو جگائیں تب بھی ہمارا کوئی فن بر نہ آسکے گا، نہ مدھم پڑسکے گی۔ نہ ختم ہوگی۔

شے سٹے : آج ہمارا بروگ کینوں میں لگایا جاتا ہے۔

کورس : شاید ہم بہت ہی کچھ تسکین حاصل کر سکے۔ ہمارا پچھتاوا خواب کی صورت ہی یوں یوں ظاہر ہو، وہ تماشا بنے جا رہا ہے۔ حالانکہ اب لڑکی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ وہ تو کمرہ میں بیٹھی جھینگر کی طرح کپڑا بنتی ہے۔ صاف ہو گئی۔

اس کے دل میں محبت ہے۔ میں یہاں پڑا ہوں۔ ایک ہم ہے جسے کوئی نہیں جانتا۔ کائی میں مدفون لکڑی کی مانند — یہی مناسب تھا کہ میں بھول جاتا۔ مگر ہمارا قصہ تو ساری دنیا میں پھیل گیا۔

شے سٹے : بتاؤ مجھے کس طرح معلوم ہو سکتا تھا کہ میری تحریروں کا پلندہ اس کے کرگھے کے نیچے پڑا ہوگا؟

کورس : سال کا آخری حصہ خزاں نے سرخ کر دیا۔ ہزار راتیں آنکھوں میں کٹ گئیں۔ میرے آنسوؤں سے بھیگ بھیگ کر میں اور میری آستینیں معدوم ہو چکیں۔ کیا میں اب بھی اندر نہیں آسکتا؟ ہم سب گزر جائیں گے۔ تم اور میری آستینیں اور میرے آنسو۔ اور تم کو یہ بھی پتہ نہ چلا کہ تین برس کب نکل گئے۔

کورس : کیا میں بالآخر دلہن کا کمرہ دیکھ پاؤں گا جسے کسی نے آج تک نہ دیکھا؟

شے سٹے : آخر کار سہاگ کی گھڑی آئی۔

کورس : ناچ میں رقصاں آستینیں برف کے گالوں کی طرح درخشاں ہیں۔

شے سٹے : ناچو

کورس : ناچو اور راگ چھیڑو۔ یہ ناچ نشی کی گی کے لیے ہے۔

شے سٹے : یہ ناچ شام کے ناگکوں اور کپڑا بننے والیوں کے لیے۔

کورس : ناچ کا عکس شراب کے پیالوں میں لرزاں ہے۔

کورس : (دوبارہ) آری —— آگئی —— صبح ہو گئی، چلو —— چلو —— اس سے پہلے کہ روشنی پھیل جائے۔ (وائی سے) ہماری تم سے درخواست ہے:۔
جگانا نہیں پروہت۔ ہم سب مرجھا جائیں گے۔ تم ابھی جگو گے۔ تم سرحدوں پر پھرتے ہو۔ کسی شے کو تمہارا انتظار نہیں۔
یہ سب ختم ہو جائے گا۔ یہاں پر، اس ویرانے کے گھرے میں، اس سنسان گھروں کے علاوہ اور کچھ نہیں۔
آج کی ہوا صنوبروں میں سرسرا رہی ہے۔ سناٹا ہے۔ کوئی روشنی نہیں۔ کوئی زندگی نہیں۔

ہیرو .... ایک نوجوان زمیندار

لڑکی .... اس کی بیوی

یوگیری ...... مہری

لڑکی کی ادما

زمیندار : میں کپڑے بیچنے والا ہوں۔ آشیکاگا کا رہنے والا ہوں۔ کم عمر اور معمولی آدمی ہوں۔ مقدمے بازیوں کے چکر میں ہونے سے وہ سلطنت میں مقیم ہوں۔ چند روز کے لیے آیا تھا۔ پر تین پورے تین سال ہو گئے۔ اب مجھے گھر کی فکر ستا رہی ہے۔ یہیں پڑی مہری کو گاؤں بھیجتا ہوں۔ مہری ——! یوگیری! میں بہت پریشان ہوں۔ تم گاؤں چلی جاؤ اور میرے گھر والوں کو مطلع کر دو کہ میں اس سال کے آخر تک لوٹ آؤں گا۔

یوگیری : بہت اچھا —— (روانہ ہوتی ہے) پل پل بھیگی بھیگی دن گھٹتا جا رہا ہے۔ اپنی سفری پوشاک میں ملبوس میں سورج کے ساتھ ساتھ راستہ طے کر رہی ہوں۔ مجھے معلوم نہیں سرائے کہاں ہیں۔ مجھے معلوم نہیں راہ میں کتنے خواب آتے ہیں۔ مجھے معلوم نہیں۔ رات کے تکیے پر کتنی نیند جمع ہوتی ہے۔ آخر کار میں گاؤں پہنچ گئی۔ اب میں آہستہ سے پکارتی ہوں۔ کوئی ہے —— ؟ اندر خبر کر دو کہ یوگیری دوار پر کھڑی ہے۔ شہر سے آئی ہے۔

لڑکی : الم ——! الم ——! گھونسلے اداس ہیں۔ بچلیاں گئیں۔ محبت شعار بطخیں افسردہ۔ وہ جو ایک دوسرے سے بندھے ہوں۔ ایک دوسرے کی دنیا میں رہتے ہوئے بھی زیادہ دکھی ہوتے ہیں۔ اے ہری گھاس! جب بارش تجھ پر برسے تو تم آنسو بہانا نہ بھولنا۔ میرے آنسو تو خاموشی کی برکھا ہیں۔ اے دل —— اے دل ——

مہری : گاؤں والو —— سن لو —— کہ یوگیری آن پہنچی۔

لڑکی : یوگیری ——؟ مجھے تو مہری کی ضرورت نہیں۔ اندر آجاؤ۔ یوگیری۔ تم ایسی مہمان طرح کیوں آئی ہو۔ آؤ —— جم جم آؤ۔ یوگیری۔ مجھے بڑی شکایت ہے۔ تم اتنی بدل گئیں۔ نہ خط نہ پتر۔ کبھی ہواؤں کے ذریعے ہی کوئی پیغام بھیج دیا ہوتا؟

مہری : میں تو آنا چاہتی تھی پر سرکار نے اجازت نہ دی۔ تین سال انھوں نے مجھے اس دقیانوسی شہر میں قید رکھا۔

لڑکی : شہر تم کو نہ بھایا؟ میں تو وہاں کی بہار کے شگوفوں کو اکثر یاد کرتی تھی۔ اس کے بعد میرا دل غم کے بادل میں چھپ گیا۔

کورس : خزاں کے اختتام پر، ایک دیہاتی مکان میں، جہاں گھاس اس طرح مرجھا رہی ہے جیسے انسانوں کی آنکھوں سے روشنی زائل ہوتی ہے، اسی طرح محبت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ کل کے بیتے وہ کہ کیا سہارا ڈھونڈے؟ تین سال —— خزاں کا خواب۔ یہاں تک کہ ان خوابوں کے الم نے اس کے دل میں خزاں کی صدائے بازگشت جگا دی۔ دن گزر گئے۔ اگر دنیا میں جھوٹ کا وجود نہ ہوتا تو کوئی مردوں کے قول کا بھروسہ بھی کر لیتا۔ مرد پر اعتبار کیا۔ ! مورکھ لڑکی —— ! مورکھ لڑکی —— !

لڑکی : یہ عجیب سی چیز کیا ہے جس کی شکل آواز کے روپ میں مجھ تک پہنچ رہی ہے!

مہری : گاؤں کا کوئی جولاہا ہوگا جو کھڈی پر تان کو تیار ریشم پیٹتا ہے۔

لڑکی : اسے بس — میں تو پرانی کہاوت کی طرح گھس پٹ چکی ہوں۔ جب بچی کا سیلانی شوق بوڑھی بچوں کو فراموش کر کے عکسوں کے دیس میں گھومتا پھرتا تھا تو وہ بے چاری شفاف ٹھنڈی راتوں کو اپنی اونچی برجی پر چڑھ کر ریشم کا تختہ پیٹا کرتی تھی یہاں تک کہ اس کی سرسراہٹ کی آواز پر سینکڑوں کوس دور بھی وہ سوتے میں کروٹ بدل لیتا تھا۔ میں نے بھی اپنے چوبی تختے پر رنگ برنگے نقش و نگار والے ریشم پھیلائے ہوا کے پرندے جھٹ پٹے کی امٹ تنہائیوں میں سے لے کر آئے تاکہ میرے جی کو چین ملے۔

مہری : یہ تو غریبوں کا کام ہے۔ جو جولاہوں کو بھی تھکا دیتا ہے۔ آپ کی ایسی اونچے گھرانے کی بٹیا نے دل کے سکھ کی تجویز میں یہ کٹھن محنت بھی کی۔ لائیے مجھے دیجئے۔ یہ کام میرے ہاتھوں کے لیے زیادہ موزوں ہے۔

لڑکی : پیٹو — اور زور سے پیٹو — تاکہ ہمارے دل کا سارا بخار نکل جائے۔

مہری : یہ کپڑا کافی کھردرا ہے۔

کورس : صنوبر کے درختوں کی مدھم آواز مجھے رات کو باتیں کرواتی ہے۔ کتنی سردی ہے۔

لڑکی : خزاں آگئی۔ اور نہ تمہاری ہرجائی ہوا کوئی خبر لے کر آئی نہ کسی نے کوئی پیغام سنایا۔

کورس : تھکن۔ اور رات۔

لڑکی : دور دراز کے گاؤں —

کورس شاید چاند بھی اندھیرا پڑے اس کے پاس یہ پوچھنے نہیں آئے گا — یہ کس کی رات کی دنیا ہے!

لڑکی : اے خوشگوار موسم! کہہ کہ وقت بھی خزاں رسیدہ ہے۔ شام ڈھلی جاتی ہے۔

کورس : بارسنگھے کی آواز سے اس کے دل کو دکھ ہوتا ہے۔ ہمیں شاخ کا سرا دکھائی نہیں دیتا۔ آخری پتہ بغیر کسی کو راہ کے گر گیا۔ سائے ہیبت زدہ ہیں۔ چاند اور گھاس بھیگے سے چپکے خاموش ہیں۔

لڑکی : میری زندگی روح شبنم آلود پردے کی طرح معلق ہے۔

کورس : اظہار الم کے لیے کیسی واسطہ ہے یہ! محزوں لمحے۔ کپڑے کا چوکھٹا محل کی چھت پر کھڑا ہے۔ اور شمال کی ہوا اس کا ریشم چاڑیم چاڑ رہی ہے۔

لڑکی : جولاہے ریشم کو کبھی دھیرے دھیرے پیٹتے ہیں کبھی زور زور سے کیا گاؤں میں بہت سارے جولاہے رہتے ہیں۔

یوگیری : چاند کی ندی مغرب کی سمت بہہ رہی ہے۔

کورس : آوارہ گرد ستوؤ! اتر کے صوبے میں کہیں پڑا سوتا ہے۔ اور یہاں پورب کے آسمانوں پر چکھوا چل رہی ہے۔ اے ہوا! یہ بےچاری جو ریشم پیٹ رہی ہے اس کی آواز بھی اپنے ساتھ لے جا۔

کورس : (بازگرد) ہوا — باڑ کے کنارے لگے ہوئے صنوبروں سے خبردار رہنا کہیں ان کی سرسراہٹ اس آواز میں حل نہ ہو جائے۔

[illegible] مگر وہ تاروں کی صف [illegible] : جو تم سے پیچھے پیچھے سفر کرتے ہیں [illegible] دیکھا [illegible] دیتا کے پاس جاؤ۔
[illegible] بیری [illegible] خوب دیکھتا ہے۔

لڑکی : [illegible] ٹوٹ گیا تو وقت سے [illegible] کہ بیٹے پاس [illegible] کیا اللہ اگر [illegible] ہے تو ابھی کافی وقت باقی ہے [illegible]
صاحب [illegible] جاتے ہیں۔ محبت تو گڑیوں کے محل کی طرح [illegible] ہے۔ بے چارے کے پیچھے [illegible] نہیں آتی۔

کورس : دیہاتی گاؤں کی محبت ہوا محل کی مانند ناپائیدار ہوتی ہے۔ آسمان کو ندی کی لہروں نے جا سے وقت کو قینچی کی طرح کاٹ ڈالا
کانچ کے پیچھے پر کتنے جگمگاتے ہیں اور تیز دھار سے [illegible] زندگی [illegible] بھیگ چکی ہے مگر وہ آگیا تو کیا ہو گاؤں کی
آستینوں کو کوئی نقصان پہنچے گا؟

لڑکی : جاڑوں کا ساتواں دن ہے۔ راتیں لمبی ہونے والی ہیں یہ میں اس کو ان دس ہزار آوازوں کی یاد [illegible] کی جا [illegible] ختم۔
ہوا کی مہک۔ کہرہ۔ [illegible] دل پر ہیبت طاری ہوتی ہے۔ ریشم پیٹنے کی صدا۔ رات کے طوفان۔ جھگڑوں میں بلند ہونے والی چیخ۔
جھینگروں کی اذیت۔ شبنم گرنے کا احساس۔ سرگوشی کی آہیں —— ہیرا —— ہیرا ——

مہری : اب میں کیا کروں؟ شہر سے ایک آدمی خبر لایا ہے کہ مالک اس سال نہ آسکیں گے۔ لگتا ہے شاید ——

کورس : دن جو سوچتا ہے کہ اب نہ سوچے گا پھیڑتا ہے۔ باہر جھینگروں کی آواز ڈوب گئی۔ پھول ہوا میں کھلا پڑا ہے۔ دیکھنے والے
دیوانگی کی طرف بڑھ گئے۔ پھول کا دل زندگی کی وحشی ہوا میں اڑتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کا سارا ذرہ بکھر گیا۔

(لڑکی مر جاتی ہے۔ اس کا شوہر داخل ہوتا ہے)

زمیندار : اس کے غم و غصے نے ہماری تین سالہ جدائی کو ابدی فراق میں تبدیل کر دیا۔

کورس : آٹھ ہزار برچھائیوں نے ہمیں بتلایا ہے کہ قتل سے پہلے پشیمان کوئی نہیں ہوتا۔

الم —— اگر ہم تانت پر بات کرتے ہیں۔

الم —— اگر یہ محض سارنگی اور رکا بچے کے ہم زبان ہیں۔

لڑکی کی روح : اوہ —— قسمت جو آخر کار بجھ گئی اور تیز دھاراؤں والی ندی میں جا گری۔ آبچے کے بوروں کی روشنی غائب ہو گئی۔
جو دنیا میں آمد بہار کی اطلاع دیا کرتی تھی۔

کورس : راستے کے اجالے کے لیے اس نے مشعل جلائی۔

روح : جس کی روشنی میں وہ کبھی نہ ڈوبنے والے چاند کے تلے خزاں کے موسموں کا نظارہ کرے گی۔ اور اس کے باوجود خواہشوں کا
شکار کون نہیں بنا؟ خیال کی آگ اور اس کے دھوئیں کے مرغولوں میں پست تمناؤں کے انبار میں دب جانا بہت آسان
تھا۔ اے دل۔ تو رنگ برنگے دھاگوں میں الجھ گیا تھا۔ "دکھ" اور "قیمت" (ان دھاگوں) کے نام ہیں۔ اور اس کی خانے
کے دارو غہ اور رسایت سو کے کوڑوں کی کوئی گنتی نہیں۔ اے دل —— تو نے انتہائے کرب کے عالم میں پچھتاوے کے
ریشم کو چنا۔

کورس : موہ مایا اور قسمت! اس کے آنسو ریشم کے تختے پر گرتے ہیں۔ آنسو شعلے میں تبدیل ہو گئے۔ اور دھوئیں نے اس کی چیخوں کو

گھونٹ دیا۔ وہ ہم تک نہیں پہنچ سکتی۔ نہ ریشم پیڑ کی آواز، نہ صنوبروں کی سرسراہٹ۔ محض اس المناک سزا کی آواز آتی ہے۔ وہی ساری ہے! نیند کی رفتار کی طرح آہستہ، وقت کے راہوار کی طرح تیز۔ تبدیلی اور گزر جانے کے چکر دستوں کے لیے ہم چکر سے نجات حاصل نہیں کر سکتے۔ نہ کرتم کے فیصلوں سے۔ گو ہم زندگی اور موت میں آوارہ گردی کرتے رہتے ہیں یہ جو جاگ کر ایک ایسی دنیا میں پہنچی جہاں نہ سواد ہے نہ ماضی۔

روح : کانسوگماس بھی اپنی پتیاں ٹیڑھی کر کے پاتال سے اپنی نفرت کا اظہار کر رہی ہے۔

کورس : اے اشتیاق مجسم! تو نے اس شخص کو دونوں لوکوں میں عزیز رکھا تھا۔ اور امید نے ایک ہزار نسلوں تک پھیلا نہ چھوڑا۔ یہ سب بیکار تھا۔ صنوبروں سے ڈھکی کوہ ماتسویاما کی چٹانیں وقت کے اختتام پر کھڑی ہیں۔ تمہارے الفاظ بے کار ہیں۔ اری — اری — مرد کا دل بس یہی ہے۔

روح : کبھی! تم کو تو میرا کوئی اونگھتا ہوا خیال بھی نہ آیا۔ تمہارا کوئی خواب مجھ تک نہیں پہنچا۔ شرم — اے شرم —!

کورس : وہ "پھول کے دھرم" کا جاپ کر رہی ہے۔ اور اس کی آتما بودھی ستوا میں داخل ہوتی ہے۔ راستہ روشن ہو گیا۔ اس کے مستقل ریشم پیڑ نے پھول کو وا کر دیا۔ اور وہ نروان سے بودھی ستوا میں شامل ہو گئی۔

لوکی

(انشائیہ)

کرشن چندر

سبزیوں میں مجھے بھنڈی بہت پسند ہے۔ نہ جانے کس بدذوق نے اس کا نام بھنڈی رکھ دیا ہے۔ حالانکہ اس کا نام سبزا بدیہوتا چاہئے۔ انگریزی میں اسے خاتون کی انگلی کہتے ہیں تو بہت اچھا کہتے ہیں۔ گو خاتون مشرق کی انگلیاں بھنڈی سے زیادہ نازک اور حسین ہوتی ہیں۔ مگر انگریز عورت کی مناسبت سے یہ نام بہت ہی عمدہ ہے۔ جن لوگوں کو انگریز عورت کی مضبوط انگلیوں کا تجربہ ہو چکا ہے وہ لوگ بھنڈی کو ہمیشہ عورت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اور اگر خاتون مشرق اور مغرب کی انگلیوں میں کوئی فرق ہے تو ہمیں اس پر چنداں تعجب نہ کرنا چاہئے۔ مثل مشہور ہے۔ پانچوں بھنڈیاں برابر نہیں ہوتیں۔

مجھے کریلے بھی پسند ہیں۔ چاہے وہ کڑاہی میں پڑے ہوں۔ یا نیم پر چڑھے ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ میں نے آج تک کسی کریلے کو نیم پر چڑھتے نہیں دیکھا۔ مگر بزرگوں سے سنا ضرور ہے۔ بزرگوں سے تو یہ بھی سنا ہے کہ کسی زمانے میں ٹیڑھی کھیر بھی کھائی جاتی تھی۔ مگر اس زمانے کے لوگوں کے دانت بہت مضبوط ہوا کرتے تھے۔ آج کل بناسپتی کا زمانہ ہے۔ دندان ساز ٹیڑھی کھیر کھانے کا مشورہ نہیں دیتے۔ اور نیم چڑھے کریلے کہیں ملتے نہیں! البتہ ایسے کریلے ضرور ملتے ہیں جنہیں کھا کر نیم پر چڑھنے کا خیال آتا ہے:

مجھے سرسوں کا ساگ بھی پسند ہے۔ کھیتوں کی کھلی فضا میں جب نوجوان لڑکیاں سرسوں کا ساگ توڑ کر اپنے دامن میں بھرتی ہیں۔ تو سرسوں کا ساگ بہت ہی بھلا معلوم ہوتا ہے۔ یہی حال پالک کے ساگ کا ہے۔ یہی حال باتھو کے ساگ کا ہے۔ یہی حال چنے کے ساگ کا ہے۔ یہی حال برواکے ساگ کا ہے۔ ممکن ہے آپ نے بروا کا ساگ نہ کھایا ہو۔ (میں نے بھی نہیں کھایا) لیکن وہ مثل تو ضرور سنی ہوگی۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات! بس اسی سے اندازہ کر لیجئے۔ کتنا عمدہ ساگ ہوگا!

اور پھر ترئی! جسے پنجاب میں توری کہتے ہیں۔ اور یوپی میں ترئی کہتے ہیں۔ حالانکہ کسی زمانے میں اودھ میں بھی اسے توری ہی کہتے تھے۔ آج کل بربنائے مخاصمت نہیں کہتے ہیں۔ مگر اس زمانے میں ضرور کہتے تھے۔ جس زمانے کا یہ گیت ہے "کانہا۔ آئی توری

گاجر:

[illegible] معلوم ہوتا ہے کہ [illegible] بنگال میں [illegible] تھی [illegible] معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں [illegible] ہو گی جس [illegible] نے [illegible] کے گلوں [illegible] سے کہ [illegible] کے گلستوں میں [illegible] کے لیے [illegible] ہیں۔ جیسے اس زمانے کی [illegible] وہ مشہور ایک گیت آج بھی دلّی کے دروازے ہونے پر گایا جاتا ہے۔ ہائی مورا [illegible] ...... صرف یہ گیت اس [illegible] کا ہی ثبوت ہے کہ ہندوستان پر حملہ آور ہونے والے قبیلہ لوگ [illegible] رہنے والے تھے۔

میرا یہ خیال ہے۔ کبھی اسی موضوع پر ایک تھیسس لکھوں گا۔ مگر مجھے گمان ہے : اس برصغیر میں پہلے ہی سبزیوں اور [illegible] کی اس قدر کمی ہے کہ اب لوگوں کی اشتہا یا ذہنیت پر مزید بوجھ ڈالنا کسی طرح جائز نہیں معلوم ہوتا!

سبزیوں میں ایک سبزی بینگن بھی ہے۔ بینگن دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک تو جھاڑی کا بینگن ہوتا ہے، دوسرا تھالی کا بینگن ہوتا ہے مگر بھرتا دونوں کا بنتا ہے اور بڑے مزے کا ہوتا ہے۔ بشرطیکہ آپ تھالی میں نہ ہوں۔ مجھے گرمیوں میں بینگن کا بھرتہ اور بھنڈی کا [illegible] دونوں بے حد پسند ہیں۔ [illegible] کا بھرتہ کھایا نہیں جا سکتا۔ مگر مصیبت کے وقت چبایا تو جا سکتا ہے۔ اور چبانا جو ہے وہ گویا کھانے سے پہلے کی ایک منزل ہے کچھ زیادہ فرق نہیں ہے!

[illegible] کی پھلی ہے [illegible] کی پھلی ہے [illegible] ہیں جنہیں یار لوگ فرانس بین کہتے ہیں۔ الغرض وہ تمام سبزیاں بھی جو سبز رنگ رکھنے کی وجہ سے سبزیاں کہلاتی ہیں۔ پھر وہ سبزیاں بھی ہیں جو سبز رنگ نہ ہونے پر بھی سبزیاں کہلاتی ہیں۔ جیسے کدو۔ چقندر۔ [illegible] مولی شلجم گاجر [illegible]۔ یہ سب اشیائے خوردنی، کچھ لوگوں کے لیے اشیائے خوردنی اور بہت سے لوگوں کے لیے اشیائے [illegible] سبزی کے نام سے پکاری جاتی ہیں۔ یہ سب مجھے پسند ہیں۔ سوائے ایک لوکی کے .....!!

میں جب تک اپنے ماں باپ کے گھر میں رہا۔ میں نے لوکی کھائی۔ جب میں کالج کے ہوسٹل میں داخل ہوا جب بھی میں نے لوکی کھائی۔ اور جب کہ میں ایک کرایہ دار مہمان کی حیثیت سے صوفی کے بورڈنگ ہاؤس میں رہتا ہوں۔ برابر لوکی کھا رہا ہوں۔ [illegible] اس سے آپ کے دل میں یہ خیال گزرے کہ شاید مجھے لوکی اس قدر مرغوب ہو گی جبھی تو میں اسے برابر بچپن سے کھاتا چلا آیا ہوں۔ آپ اس خیال کو اپنے دل سے گزر جانے دیجیے۔ اس کے بعد میں آپ سے بات کروں گا، ممکن ہے میں اس سے پہلے ہی آپ کو قتل کر ڈالوں۔ کیونکہ اگر میں اس دنیا میں کسی سبزی سے نفرت کرتا ہوں۔ تو وہ یہ لوکی ہے۔ لوکی ہے!! سمجھ گئے آپ؟ مجھے اس سے شدید نفرت ہے۔ کیا آپ اس نفرت کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ بچپن ہی سے آپ جس چیز سے نفرت کرتے ہوں، ہر روز تقریباً ہر روز۔ آپ کا [illegible] اسی سے [illegible] لوکی کے کوفتے ہیں۔ یہ لوکی کا رائتہ ہے۔ یہ لوکی گوشت ہے۔ یہ لوکی بڑی ہے۔ یہ لوکی قماش۔ یہ محض لوکی۔ صرف لوکی۔ خالی لوکی۔ بالکل لوکی۔ صاف صاف لوکی۔ خالص لوکی۔ اور لوکی کے سوا اور کچھ نہیں مگر لوکی...... بچپن سے جوانی تک۔ گھر سے مس صوفی

کلب ہاؤس تک۔ لوکی ...... لوکی ...... لوکی ...... کیا یہ کسی آدمی کو پاگل بنا دینے کے لیے کافی نہیں ہے ...... ؟

اور آخر یہ روز روز یہ لوکی ہی کیوں کھانے میں ملتی ہے؟ محض اس لیے کہ سستی ہے! محض اس لیے کہ سبزی اور بے مزہ ہے؟ اس دنیا میں ہر چیز کا ایک مزہ ہوتا ہے۔ ایک ذائقہ ہوتا ہے۔ اس کی اپنی ایک شخصیت ہوتی ہے۔ کریلے کھائیے۔ صاف معلوم ہوتا ہے آپ کریلے کھا رہے ہیں۔ مولی کھائیے آپ کبھی نہیں کہہ سکتے کہ آپ چقندر کھا رہے ہیں۔ فرنچ بین کھائیے کبھی انگریزی بین معلوم نہ ہوں گے۔ اگر اچھی طرح سے پکا ہو تو اس کے ذائقے میں ہمیشہ ایک ہلکی سی تلخی باقی رہتی ہے۔ جیسے اس کا ذائقہ آپ پر ہنس رہا ہو۔ گویا تو فرانسیسیوں کا ہنستا گزار رہا ہے۔ یعنی انگریزی بین سے آپ اس قسم کے کردار کی توقع نہیں کر سکتے۔ ہر حال میں زیادہ دیر تک فرنچ بین کی تعریف نہ کروں گا۔ ممکن ہے بہت سے لوگوں کو فرنچ بین پسند نہ ہو۔ ان لوگوں کے سامنے اس کی تعریف کرنا گویا بھینس کے آگے فرنچ بین بجانا ہے!

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ اس دنیا میں ہر سبزی کا ایک ذائقہ ہے۔ اور اگر نہیں ہے تو اس کم بخت لوکی کا کوئی ذائقہ نہیں ہے۔ اس کا اپنا کوئی ذائقہ ہی نہیں ہے۔ کوئی مزہ ہی نہیں ہے۔ عجب بے رنگ شخصیت ہے اس کی۔ یہ نہ کھٹی ہے۔ نہ میٹھی ہے نہ نمکین ہے نہ تیکھی ہے نہ کڑوی ہے نہ کسیلی ہے۔ اس کم بخت کا کوئی ذائقہ ہی نہیں ہے۔ مگر جب دیکھئے دسترخوان پر دھری ہوتی ہے۔ میں ساری زندگی اس کے خلاف لڑتا رہوں گا۔ گھر میں ماں باپ کے ساتھ۔ ہاسٹل میں باورچی کے ساتھ اور بورڈنگ ہاؤس میں مس سوفی کے ساتھ۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں۔ اب تک میں کب کا پاگل ہو کر پاگل خانے چلا گیا ہوتا۔ مگر بس یہی سوچ کر رہ جاتا ہوں کہ اگر وہاں بھی کھانے کو لوکی ہی ملی تو؟

ابھی اس روز کا ذکر ہے میں اپنے دوست پرویز کے ساتھ بورڈنگ ہاؤس کے لان میں بیٹھا ہوا لنچ کر رہا تھا۔ سردی کا موسم تھا چمکیلا دن تھا۔ دھوپ صاف اور کھلی تھی۔ کہیں پر بادلوں کا شائبہ نہ تھا۔ لان کی سبز مخملیں دوب بے حد مقابل کسی حسینہ پیکر کسی دلنواز عربدہ جو کو دیکھنا چاہتی تھی۔ اتنے میں مس سوفی لنچ لے کر آئی۔ لنچ میں لوکی تھی۔ جب وہ لنچ رکھ کر چلی گئی۔ تو میں چند لمحے تو دم بخود رہا۔ آخر میں نے پرویز سے کہا۔

"اس دنیا میں انصاف کہیں نہیں ہے!"

پرویز نے میرا مطلب غلط سمجھا۔ وہ جس چھاپہ خانہ میں نوکر ہے۔ وہاں جو کہانیوں کا رسالہ چھپتا ہے۔ اُسے میں نے پرویز کی سفارش سے ایک افسانہ بھیجا تھا جو کل ہی واپس آیا تھا۔ ایڈیٹر نے افسانہ واپس کرتے ہوئے لکھا تھا۔ آپ کے افسانے میں ایک غریب گڈریئے اور اس کی بھیڑوں کا ذکر ہے۔ ہمارے پڑھنے والے غریب گڈریوں میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔ نہ انھیں بھیڑوں کے مونڈے جانے کے طریقوں میں کوئی دلکشی نظر آتی ہے۔ آپ کے افسانے میں کوئی عورت نہیں ہے۔ صرف بھیڑیں ہی بھیڑیں ہیں۔ بہتر ہوگا اگر آپ مقامی رنگ سے احتراز کریں۔ اور اپنے ادب میں ابدیت پیدا کریں۔ علیٰ ھذا القیاس......

پرویز نے سمجھا میں اس افسانے کے لوٹائے جانے کے بارے میں شکایت کر رہا ہوں۔ وہ ڈبل روٹی کے ٹکڑے پر لوکی کا ٹکڑا رکھتے ہوئے بولا۔ "بے چارہ ایڈیٹر سچ تو کہتا ہے۔ اگر تم اپنے افسانے میں بھیڑ کے بجائے عورت رکھ دیتے۔ تو کیا حرج تھا!"

"تم کیا جانو، افسانہ نگاری کیا ہوتی ہے؟" میں نے چلا کر پرویز سے کہا۔ "تم فوڈی ہو۔ تم جس شوق سے لوکی کھاتے ہو۔ اسی خبط سے عورت کا ذکر کرتے ہو۔ اسی انہماک سے بھیڑ کا گوشت کھاتے ہو۔ تمہیں کیا معلوم بھیڑ اور عورت میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ تم قطعاً حساس نہیں ہو۔"

"حساس کیا ہوتا ہے؟" پرویز ڈبل روٹی کا ایک ٹکڑا اپنے منہ میں رکھ کر بولا۔

"حساس؟ حساس وہ آدمی ہوتا ہے جو لوکی پسند نہ کرے۔ لیکن لوکی کھانے پر مجبور ہو۔ جو خوبصورت عورتوں پر افسانے لکھنا چاہے۔ لیکن بھیڑوں کے ذکر پر مجبور ہو جائے...... کیا تم — کیا تم — کیا تم دیکھ نہیں سکتے اس وقت میرے سامنے کھانے کی میز پر کیا دھرا ہے؟"

"وہی کچھ ہے۔ جو میں کھا رہا ہوں۔" پرویز بڑے اطمینان سے بولا۔ "لوکی ہے! آخر لوکی میں ایسی کیا برائی ہے؟"

"مجھے اس کے پھیکے پن سے نفرت ہے! پرویز!! لوکی کھانے سے تو یہ کہیں بہتر ہے۔ کہ آدمی گھاس کھا لے۔ دیکھو۔ اس لان کی ہری ہری گھاس کس قدر عمدہ ہے؟ میرا جی چاہتا ہے کہ میں ایک بکری ہوتا اور اس گھاس کو کھا جاتا۔ پھر ایک انسان ہوتا اور اس بکری کو کھا جاتا۔ پھر ایک کارخانہ ہوتا اور وہ مجھے کھا جاتا...... پھر میری ہڈیاں قبر میں سڑتیں اور ان کے جوڑ جوڑ سے وہی گھاس پھوٹ کر اگتی اور میری ساری قبر پر ہری ہری گھاس کی صورت میں پھیل جاتی جہاں پھر کوئی بکری آ کر...... ارے پرویز کتنا خوبصورت ابدی خیال ہے! آج کل مجھے اس قسم کے ابدی خیال بہت ستاتے ہیں۔ لوکی۔ گھاس۔ گوشت۔ بکری۔ کارخانہ۔ قبر۔ موت، شاید میں اسی بہانے اپنے ادب میں ابدیت اور ازلیت میں ابد ڈھونڈتا ہوں! عورت کیا ہے؟ مرد کیوں ہے؟ بکری کہاں ہے؟ دشت مجنوں کدھر ہے؟ شب فراق کیسے کٹی؟ میں بھوکا ہوں!...... نہیں...... نہیں...... بھوک کی بات مت کرو۔ تیسرے درجے کا ادب مت پیدا کرو۔ تم انسان ہو۔ ارے بھوکا تو کتا بھی رہتا ہے۔ پھر انسان اور کتے میں کیا فرق ہوا؟ اس لیے بھوک کی بات مت کرو۔ افلاس کی بات مت کرو۔ غریبی کا ذکر مت کرو۔ یہ سب گندی اور رذیل باتیں ہیں۔ اس سے ڈرائنگ روم کی خوب صورت فضا پراگندہ ہوتی ہے۔ بات کرو شب فراق کی۔ رخ زیبا کی، ابروئے ظالم کی فراموش صفت آنکھوں کی۔ گیسوئے لیلائے شب کی، جو ٹیائے رعشکہائے، گیسوئے آہوئے لیلائے ختن...... ہائیں۔ کیا بکواس کرتے ہو۔ اتنی اضافتیں یکدم سے لگا دیں؟ جانتے نہیں ہو۔ اعلیٰ ادب میں صرف دو اضافتیں جائز ہیں۔ زندگی میں چاہے آٹھ بچے ہو جائیں۔ اور نو اضافتیں لگ جائیں۔ مگر اعلیٰ ادب میں دو اضافتیں جائز ہیں۔ اور صرف ایک موضوع۔ عورت!......"

پرویز میری باتیں خاموشی سے سنتا رہا۔ اسے معلوم تھا کہ جب میرے سامنے لوکی آ جائے۔ میں اسی طرح بہکتا ہوں۔ جیسے لوگ شراب پی کر بہکتے ہیں۔ اس نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"کسی طرح آج تو تم لوکی کھا لو۔ کل صوفی کی جگہ اس کی چھوٹی بہن ثریا آ رہی ہے۔ اس سے نئے مینو کی سفارش کریں گے تمہارے لیے......"

"اور صوفی کہاں جا رہی ہے......؟" میں نے بدقت تمام لوکی کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"صوفی اپنے وطن جا رہی ہے۔ ڈیڑھ ماہ کے لیے..."

میں نے لوکی کھاتے ہوئے کہا۔ "پرویز۔ اگر کل سے اس بورڈنگ ہاؤس میں مجھے لوکی ملی۔ تو میں یہ بورڈنگ ہاؤس ہی چھوڑ دوں گا — میں اپنی جان دے دوں گا۔ خود کشی کر لوں گا۔ مگر......"

مگر خوبصورت وہ بہت ہی ہوتا مگر اس [illegible] کہ وہ سر سے [illegible] کی طرح ثریا آ گئی تھی۔ اور ثریا نے بھی لوکی کی تیاری کی تھی [illegible] مگر لوکی بڑی دلچسپ تھی۔ ثریا بہت ہی خوبصورت تھی۔ اور جب وہ پلیٹ لے کر [illegible] سامنے رکھ رہی تھی۔ تو اُس کی انگلیاں ایسی لگ رہی تھیں جیسے سفید [illegible] ڈالیوں کی طرح [illegible] معلوم ہوتی تھیں۔ ثریا ایک [illegible] عورت کی طرح حسین تھی جس پر [illegible] پھول نے [illegible] تو میں اُسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ پرویز نے انتہائی سنجیدہ ہو کر ثریا سے کہا:

"میری دوست آج سے تمہارا [illegible] "

"کیوں؟" ثریا نے گھما کر اپنی آنکھوں کو میری طرف گھمایا۔

"اسے لوکی پسند نہیں ہے!" پرویز نے [illegible] سے اُسے [illegible] ہوئے بولا۔

"لوکی پسند نہیں ہے؟" ثریا نے میری طرف ایسی نگاہوں سے دیکھا۔ جیسے اُسے میرے آدمی ہونے میں شبہ پیدا ہو چلا ہو۔ "لوکی تو میں اس قدر عمدہ پکاتی ہوں، اس قدر عمدہ کہ سب تعریف کرتے ہیں۔ آج کی لوکی تو میں نے [illegible] کے گوشت میں [illegible] دھیمے دھیمے آنچ پر پکائی ہے۔ کھا کر دیکھئے۔ بالکل گوشت کا سا [illegible] آئے گا [illegible] آپ کو لوکی پسند نہیں ہے؟" ثریا نے میری طرف متعجبانہ نظروں سے دیکھا۔ کہ میرا دل وہیں موم ہی کی طرح پگھلنے لگا .....

"نہیں..... نہیں..... یہ بات نہیں ہے۔" میں نے مسکرا کر ثریا سے کہا۔ "مجھے تو دراصل لوکی اتنی ہی خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔ جتنی تمہاری ایسی خوبصورت عورت۔"

ثریا ہنسی..... "اونہہ! بھلا عورت اور لوکی میں کیا مشابہت ہے۔ آپ تو بہت دور کی بات کرنے لگے ہو مسٹر۔"

"گدھا ہے یہ!" پرویز ثریا کی توجہ اپنی جانب مبذول کرنے کے لیے میرا مذاق اُڑا رہا تھا۔

"نہیں ثریا عورت اور لوکی دونوں میں غضب کی مشابہت ہوتی ہے۔ عورت کی طرح لوکی کا سر بھی چھوٹا ہوتا ہے اور دھڑ موٹا ہوتا ہے۔ عورت کی طرح لوکی کی جلد بھی بے حد ملائم اور چکنی ہوتی ہے۔ خوبصورت عورت کی طرح اچھی لوکی کا رنگ بھی زیتونی ہوتا ہے۔ اور جب ہوا کے جھونکے سے ہری ہری بیل پر لوکیاں جھومتی ہیں۔ تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا [illegible] کے لیے کہیں جا رہی ہوں۔"

ثریا نے خوشی سے تالی بجائی اور میرے قریب میز پر بیٹھ گئی۔ پرویز کا رنگ اُڑ گیا.....

میں نے کہا "اچھی لوکی اچھی عورت کی طرح دل کی بڑی نرم ہوتی ہے۔ حسین عورت اور حسین لوکی دونوں کو بڑھاپے تک پہنچنے نہیں دیا جاتا۔ پہلے ہی سے توڑ لیا جاتا ہے۔ لوکی کوئی کدو اور [illegible] کی طرح نہیں ہے کہ جب تک پختہ عمر کو نہ پہنچ جائے بے کار ہے۔ لوکی تو جتنی کم عمر کی ہوگی۔ اتنی مزے کی ہوگی۔ بھلا بڈھی لوکی بھی کسی نے کھائی ہے؟ بڈھی لوکی کی رنگت پیلی پڑ جاتی ہے۔ اس کی کھال سخت اور جھری دار ہو جاتی ہے۔ اندر سے گودہ سڑ جاتا ہے۔ بیج کھاری کی [illegible] کی طرح اندر ہی اندر کھنکنے لگتے ہیں۔ اُس عمر میں لوگ لوکی کے بیج نکال کر اُس کا [illegible] بناتے ہیں۔ [illegible] سے گندے برتن صاف کر ڈالتے ہیں..... بڈھی عورتوں کی طرح.....

لیکن جوان لوکی کی گردن ہائے ثریا۔ بالکل تمہاری گردن کی طرح صراحی دار ہوتی ہے اور..... اُس میں ایسی ہلکی ہلکی سی مہک آتی ہے..... جیسے جوانی میں خوبصورت عورت کے بدن سے آتی ہے..... ذرا میرے قریب آؤ....."

"بس..... بس....." ثریا ہنستے ہنستے شرما گئی اور فوراً وہاں سے بھاگ گئی۔

مگر اس دن کے بعد سے ڈیڑھ ماہ تک ثریا نے مجھے لوکی نہیں کھلائی۔ عورت اپنے مقابلے میں کسی دوسرے کی تعریف [illegible] کر سکتی چاہے وہ لوکی ہی کیوں نہ ہو۔ اور یہ میرے حق میں بہت اچھا ہوا۔ میں لوکی کھانے سے بچ گیا۔ آدمی ایک وقت میں ایک ہی کام کر سکتا ہے۔ یا عشق کرے یا لوکی کھائے ......!!

ڈیڑھ ماہ کے عرصے کے بعد جب سونی واپس آئی۔ تو میری شادی ثریا سے ہو چکی تھی۔ مگر سونی کے آنے کے بعد پھر سے ہمارے گھر میں لوکی کی آمد و رفت شروع ہو گئی۔ دو چار روز تو میں نے صبر کیا۔ آخر ایک دن میں نے جھلا کر کہا، "یہ کیا مذاق ہے؟ ہر روز وہی لوکی! لوکی؟ لوکی؟ کیا لوکی کے سوا اور کوئی سبزی نہیں ہے اس دنیا میں؟

میری آواز سن کر سونی اور ثریا دونوں کچن سے باہر دوڑیں۔ ایک کے ہاتھ میں چمٹا تھا۔ دوسری کے ہاتھ میں بیلن تھا۔ دونوں نے اکدم غضب ناک ہو کر کہا۔

"کیا ہے؟ کیوں شور مچا رہے ہو؟"

میں دونوں بہنوں کو دیکھ کر سہم گیا۔

آخر میں نے آہستہ سے اپنی نظریں جھکائیں اور دھیرے سے مسکین لہجے میں کہا۔

"کچھ نہیں۔ اس پلیٹ میں تھوڑی سی لوکی رکھ دو!"

ہینڈ پمپ

خدیجہ مستور

شام ڈھلے کا وقت تھی۔ ہینڈ پمپ کے قریب مستری دوبارہ فرش بنا رہا تھا۔ سیمنٹ پہ ایک دو کنکریاں جیسے ہی ٹکیں تو احاطے کی ساری عورتیں کام کاج چھوڑ کے ہٹ ہٹ کے کھڑی ہو گئیں۔ وہ بڑے جھک جھک کر ہینڈ پمپ کی ہتھی کو کرنا چاہتے تو چھمی بیگم بیچ میں گھر کے روک دیتیں۔

"خبردار جو ابھی ہاتھ لگایا! ابھی کچا ہے، اکھڑ جائے گا فرش۔"

وہ ہنس کے اپنے ہاتھوں کی کھجلی دل ہی دل کر رہ جاتے۔

"ارے مائی کچی بات ہے جو اکھڑ جائے گا ہینڈ پمپ ہے ہینڈ پمپ۔" مستری نے زور سے قہقہہ لگایا۔

"تم اپنا کام کرو جی، منڈیر کچی ہے کہ نہیں! پانی دھرنے سے اکھڑ سکے گی کہ نہیں!" چھمی بیگم نے مستری کو قائل کر دیا اور ساتھ ہی بے قابو بچوں کو روکنے کے لیے چیخنے لگیں۔

"ارے کمبختو! ذرا پرے الگ ہو۔ ایک تو بیچاری نے پانی کا آرام دیا ہے اوپر سے نقصان بھی پہنچانے مرے آئے ہاتھ توڑ دوں گی کم بختوں کے۔"

لڑکوں سے ہٹ کر عورتیں چھمی بیگم کی شان میں قصیدے پڑھنے لگیں۔

"چھمی بیگم تو نیکی کا فرشتہ ہیں۔"

"دیکھو بیٹا! یہ مریں گی تو شہید ہوں گی۔" ایک عورت نے چپکے سے کہا اور مارے خلوص کے آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"اصیل خاندان کے لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں ورنہ کون اپنی محنت کا پیسہ دوسروں کے آرام پر خرچ کرتا ہے۔"

"احاطے کا مالک تو ایسا کنجوس ہے کہ ایک ہینڈ پمپ لگوا کر نہ دیا۔ کہہ کہہ کر زبان تھک گئی۔ ہمیشہ یہی ٹکا سا جواب دیا کہ سارے لوگ چندہ کر کے لگوا لو۔"

"میں نے کہا ——" ایک عورت کچھ کہتے کہتے رک گئی کیونکہ مستری اپنا تہبند جھاڑتا ہوا کھڑا ہو گیا تھا۔ چھمی بیگم نے جھک جھک کر مستری کے کام کو دیکھا اور پھر نیفے میں کھسے ہوئے بٹوے کو نکال کر دام گننے لگیں۔

"لو میاں یہ چار روپے گن لو۔" چھمی بیگم نے انتہائی مجبوری والے انداز سے روپے اس کی ہتھیلی پر رکھ دیے۔

"پانچ روپے سے ایک پیسہ کم نہ ہوگا۔" مستری نے چاروں روپے چنی بیگم کی مٹھی میں ٹھونس دیے۔

بڑی دیر تک روپوں کی چیل جھپٹی ہوتی رہی۔ احاطے کی ساری عورتیں چنی بیگم کی حمایت میں مستری کو جلی کٹی سنا رہی تھیں۔

"تو جی ہم ہینڈ پمپ اکھیڑے دیتے ہیں۔ ہمیں ایک پیسہ نہیں چاہئے۔" مستری عورتوں سے ہار مانتے ہوئے بڑی بے دردی سے ہینڈ پمپ کی طرف بڑھا۔ روپے کچی منڈیر پر اس طرح پھینکے کہ نشان پڑ گئے۔

"ارے ظالم! لے اپنا روپیہ۔" چنی بیگم نے بوکھلا کر بٹوے سے آخری روپیہ بھی نکال دیا اور پھر بٹوا جھاڑ کر نیفے میں اڑس لیا۔

مستری کے جاتے ہی چنی بیگم دھپ سے ہینڈ پمپ کے پاس بیٹھ گئیں۔ دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا دیے۔

"چنی بیگم کی تو نے ہی عزت رکھی ہے، کسی کی محتاج نہ رہی، قربان جاؤں تیری ذات کے۔"

چنی بیگم نے پھیلے ہوئے ہاتھ سمیٹ کر آنسو پونچھ لیے۔ اس وقت پرند بسیرے کی تلاش میں سرپٹ اڑے چلے جا رہے تھے۔

"چنی بیگم اللہ تم کو جنت میں جگہ دے گا۔ کیسے تیری جیری کو ٹھیوں کے چکر کاٹتے، پیروں انگاروں کے۔ جھکے کھاتے جب کہیں ایک گھونٹ پانی نصیب ہوتا۔ اتنی اتنی دور سے پانی ڈھونے میں شانے ٹوٹ جاتے۔"

عورتیں پھر قصیدے شروع کر رہی تھیں مگر ڈراتی ہوئی رات نے انھیں خاموش کر دیا۔ وہ سب تو ہنڈیا چولھے کی فکر میں بھاگیں مگر بچے اسی طرح منڈلاتے رہے۔

چنی بیگم نے بچوں کو ڈرانے کے لیے ایک پتلی سی چھڑی اٹھا لی اور ہینڈ پمپ کے پاس کھاٹ ڈال کر بیٹھ گئیں۔ لڑکے تو ویسے بھی کسی کا رعب نہ مانتے، اس کمزور سی چھڑی سے کیا ڈرتے۔ پھر بھی جانے کیا بات تھی کہ اس وقت وہ اس عجیب و غریب چیز میں ہاتھ نہ لگا رہے تھے۔ یوں ہی ہینڈ پمپ کے پاس کھڑے آپس میں دھکم پیل کرتے رہے۔ چنی بیگم برابر چھڑی ہلاتی رہیں مگر لڑکے بھی اسی وقت سرکے جب بھوک بری طرح ستانے لگی۔

چنی بیگم نے ساری رات آنکھوں میں گزار دی۔ خوشی اور خطرے دونوں ہی نے نیند بھگا دی تھی۔ کتا بھی پاس سے گزرتا تو اچھل کر چھڑی والا ہاتھ اونچا کر دیتیں۔ کتے پر بھی شریر لڑکے کا شبہ ہوتا رہا "ارے ہاں کہیں چپکے سے نہانے نہ آ گیا ہو۔ ہٹ ناس جائے کم بخت کا، کہیں منڈیر پر چڑھ کر پیشاب نہ کر دے۔"

چھڑی ہاتھ میں لے کر وہ کتے کو احاطے سے باہر نکال آئیں مگر ذرا ہی دیر بعد ایک چھوڑ کئی کئی کتے گشت کرنے آ جاتے۔ اس پر غضب یہ کہ ادھر چاند ابھرا اور ان کم بختوں نے منہ اٹھا اٹھا کر رونا شروع کر دیا۔ چنی بیگم یہ سوچ کر تڑپ اٹھیں کہ ابھی نیا نیا ہینڈ پمپ لگا ہے اور یہ کتے رو رو کر نحوست پھیلا رہے ہیں۔

وہ بڑے جوش سے اٹھیں اور کتوں کی اس قسط کو بھی احاطے سے باہر نکال آئیں۔ تھوڑی دیر تک تو وہ کتوں کی واپسی کا انتظار کرتی رہیں، پھر مطمئن ہو کر اپنی دانائی پر عش عش کرنے لگیں۔

"تو بھلا یہ روپے یوں بیٹھے بیٹھے کھا جاتے تو پھر کیا ہوتا، اس گھبھانے تو کہیں کا نہیں رکھا۔ کچھ دن بعد لوگ اپاہج سمجھ کر ٹکڑے ڈالنے لگتے، اب عزت تو رہ گئی، کوئی محتاج تو نہ کہے گا۔" ——— انھوں نے بڑے فخر سے آسمان کی طرف دیکھا ——— "صدقے جاؤں تیرے مولا، چنی بیگم نے ہمیشہ اپنی محنت کی کمائی کھائی ہے۔"

چنی بیگم نے تو اس وقت سے اپنی محنت سے پیٹ بھرنا سیکھا تھا جب وہ دس گیارہ سال کی تھیں۔ بیوہ ماں ہانڈی میں کھانا پکاتیں تو چنی بیگم چھوٹے موٹے برتن مانجھ دھو کر رکھ دیتیں۔ ان کی اماں کو چنی بیگم سے عشق تھا۔ وہ بڑے فخر سے کہتیں کہ اگر چنی بیگم نہ ہوتی تو اس بڑھاپے اور گٹھیا کے روگ میں بھوکی مر جاتیں۔

چنی بیگم یوں ہی محنت کرتے کرتے ایک دن چونک پڑیں۔ پتہ چلا کہ سہانے خواب دیکھنے کا زمانہ دل کے آس پاس سے سرک رہا ہے۔ انھی دنوں محلے میں چھٹیا بیگم کی شادی ہوئی تھی۔ ایک دن وہ چائے کے لئے گئیں تو چھٹیا بیگم اپنے میاں کے زانو پر سر رکھے ٹھنک رہی تھیں۔ چنی بیگم یہ دیکھ کر ذرا بھی ٹس سے مس نہ ہوئیں۔ اسی دن چنی بیگم کو بھی چاہا کہ وہ کسی کا سہارا لے کر پڑ رہیں کہیں ٹھٹک گئی تھیں۔
ان کی اماں نے کنکھیوں سے دیکھ کر تاڑ لیا کہ چنی بیگم کا جی کام کاج سے اچاٹ ہو رہا ہے۔ انھوں نے دو چار دن دوڑ دھوپ کی اور جھٹ پٹ بیاہ کر دیا۔

سسرال جا کر چنی بیگم کا دل ٹوٹ گیا۔ زانو پر سر رکھنے کی تمنا ایک طرف رہی وہاں تو نصیب بھر آنکھ بھی نہ ملا۔ میاں چنڈو کا شوقین ملا۔ سارا دن اونگھنا اور پھر اپنی ماں کے بٹوے سے پیسے چھپ کر مفت کی روٹیاں توڑنا۔

میاں کے نکھٹو پن کے طعنے چنی بیگم کو برداشت کرنے پڑتے۔ وہ سارا دن محنت کرتیں، سب کی خدمت کرتیں، پھر بھی جب دو نوالے اٹھانے بیٹھتیں تو ساس نندوں کا کلیجہ جل جاتا۔

"اے ہے بڑے بڑے نوالے نگل رہی ہے جیسے اپنے خصم کی کمائی ہو۔"

چنی بیگم سب کچھ سنتیں اور گھٹنوں میں سر دیے کھانا زہر مار کرتی رہتیں۔ چالیس سال کے مرد کی تمام برائیاں چنی بیگم کے سر تھوپ دی گئیں۔ ان پر کسی کو رحم نہ آیا۔

اماں باوا نے ترکس لاڈ سے چنی بیگم نام رکھا تھا مگر سسرال میں ساس نندوں اور جٹھانی نے چنیا کر دیا۔ جٹھانی اپنے تین سال کے بیٹے کے لئے لونڈے کو گود میں لیے دودھ پلاتی رہتی۔ پیاس لگتی تو چنی بیگم پر حکم چلاتی۔ کماؤ میاں کی بیوی تھی اس لیے ساس نندوں کی بھی چہیتی تھی۔ چنی بیگم نے کیسا کیسا چاہا کہ ان کا میاں نشہ کرنا چھوڑ دے، اپنے بڑے بھائی کی طرح کام سے لگ جائے مگر میاں ایسی باتیں سنتا تو انجانی بے زاری سے اونگھنے لگتا۔

چنی بیگم نے ایک بار بہت واسطے دیے تو اس نے دو وقت چنڈو کا ناغہ کر دیا مگر حالت یہ رہی کہ آنکھیں بند کیے فراقِ جاناں میں پڑا رہا۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ ساس نے جو اپنے بیٹے کی یہ حالت دیکھی تو چنی بیگم کے پیچھے پڑ گئیں۔

"اری منحوس میرے لال کو کھا لے گی، یہ اسے جیتا نہ چھوڑے گی۔" اماں نے کمر بند سے چونی کھول کر اپنے لال کو پکڑا دی اور دھکے دے کر باہر بھیج دیا کہ کچھ کھا پی آئے۔

اس دن چنی بیگم آپے سے باہر ہو گئیں۔ ایسی ایسی سنائیں کہ لوگوں نے کانوں پر ہاتھ دھر لیے۔ وہ فریاد کی کہ سننے والوں کے دل دہل گئے۔

ساس نندوں نے جب دیکھا کہ چنی بیگم تو ہاتھوں سے نکل گئیں تو اسی وقت انھیں چوٹی سے پکڑ کر گلی میں پھینک دیا۔ چنی بیگم زبردستی پھر سے گھر میں جا گھسیں اور گھنے گھنے کوسنے دیتی اپنے جہیز کا لوٹا کٹورا اور صندوقچیا اٹھا باہر آ گئیں۔ جب وہ روتی پیٹتی چلیں تو تم

خود بخود اسی حویلی کی طرف اٹھنے لگے جہاں آٹھ سال تک ان کی اماں کھانا پکاتی رہی تھیں۔

زار و قطار روتی ہوئی چھنی بیگم حویلی کی دہلیز پر جا بیٹھیں۔ بڑی بیگم نے جو انھیں اس حال میں دیکھا تو مارے دردمندی کے کلیجے سے لپٹا کر خود بھی رو دیں۔

"تمہیں تو اپنی سہاگ کی بوٹی ہے آخر ہوا کیا؟" بڑی بیگم نے ہلک ہلک کر پوچھا اور چھنی بیگم نے شروع سے آخر تک سارا احوال کہہ سنایا۔

بس اسی وقت سے چھنی بیگم نے اپنی ماں کی جگہ سنبھال لی۔ باورچی خانے کی الماری پر اپنے جہیز کا لوٹا کٹورا وغیرہ رکھ کر کام میں جٹ گئیں۔

رات کھانا پکا کر جب چھنی بیگم صحن میں آ کر بیٹھیں تو ٹھنڈی ہوا اور کھلی ہوئی چاندنی میں میاں یاد آ گیا۔ ادھر پیٹ میں بھی کوئی ننھی سی جان پھدکتی ہوئی معلوم ہوتی۔

"اے پلنگ ڈال کر لیٹ رہو چھنی بیگم، بھوک لگی ہو تو پہلے ہی کھا لو، اس حالت میں بھوک بہت لگتی ہے۔" خاندانی بیگم نے جب پیار سے دو بول کہے تو چھنی بیگم خوشی سے نڈھال ہو گئیں۔ انھیں پہلی بار احساس ہوا کہ محنت کر کے پیٹ بھرنے میں کیسا سکھ نصیب ہوتا ہے۔ میاں کی یاد کو انھوں نے کتے کی طرح دھتکارنے کی کوشش کی۔

"ارے اس رشتے کا کیا، بس منہ دیکھے کی محبت ہوتی ہے۔"

چھنی بیگم نے حویلی میں دس سال گزار دیے۔ لڑکا پونے دس سال کا ہو گیا۔ بیگم نے مارے باندھے دس پارے بھی پڑھا دیے۔ چھنی بیگم کی اماں کب کی مر گئیں۔ میاں نے دوسری شادی کر لی تھی، ساس کے مرنے کی خبر بھی مل گئی تھی۔ ایک بار میاں کو سڑک پر بھی دیکھا تھا۔ جو رستے چلتے کہیں چلے جا رہے تھے۔ چھنی بیگم قریب ہی کی دکان پر کھڑی ترکاریاں خرید رہی تھیں۔ کلیجے میں ہوک اٹھی مگر جلد ہی قابو پا لیا۔ پھر بھی گھر آئیں تو لڑکے کو سینے سے لگا کر دیر تک روتی رہیں۔ بیگم صاحبہ نے بڑی مشکل سے تسلی دے کر چپ کرایا۔

زمانہ کتنی تیزی سے گزر رہا تھا۔ بیگم صاحبہ کے دانت ٹوٹنے لگے۔ چھنی بیگم کا لڑکا جوان ہو گیا تھا۔ بڑے سرکار نے اسے اپنی دکان پر نوکر رکھ لیا تھا۔ بیگم صاحبہ نے ایک اچھے ناک نقشے کی یتیم لڑکی تلاش کر کے لڑکے کا نکاح بھی کرا دیا تھا اور چھنی بیگم کا صاف ستھرا چہرہ باورچی خانے کی دھنواں ہوتی دیواروں کا ایک ٹکڑا معلوم ہونے لگا تھا۔

بہو کے آتے ہی جانے کیوں چھنی بیگم کا دل اُچاٹ ہو گیا۔ بہو سے کچھ یوں نفرت ہو گئی۔ بیگم صاحبہ کو جو کام ہوتا بہو کو آواز دیتیں ادھر بہو تھی کہ گھونگھٹ الٹ کر ساس کے کاموں پر پل پڑتی۔ چھنی کو نفرت بس اسی وجہ سے تھی، بہو ان کا حق چھین رہی تھی، بیگم صاحبہ اسے شہ دے رہی تھیں۔

چھنی بیگم کو ہر وقت یہ خیال ستاتا کہ بہو ذرا ہاتھ بٹا لیتی ہے تو یہی سمجھے گی کہ اپنی محنت کی کمائی کھا رہی ہے۔

شروع شروع میں تو وہ اسے صرف جھڑکتی رہیں، پھر زبان گالیوں پر کھل گئی۔ بہو کٹورا سی آنکھیں پھاڑ کر حیرت سے دیکھتی اور کونوں میں منہ چھپا چھپا کر روتی، ادھر بیگم صاحبہ کا یہ حال کہ ساری توجہ کا مرکز جوان جہان بہو تھی۔ بس غلطی یہی، بیگم صاحبہ کے سامنے کام کر ڈالتی۔ بیگم صاحبہ کو تو جیسے یاد ہی نہ رہا تھا کہ گھر میں چھنی بیگم بھی ہیں، کبھی بھولے سے چھنی بیگم کو آواز دے لی تو جلدی سے کہتیں کہ تم نہیں بہو کو بھیجو۔ چھنی بیگم انگاروں پر لوٹنے لگتیں۔

ابھی وہ دل ہی دل میں انھوں نے سُنا کر میاں ہو گئے۔ چنی بیگم نے اپنے ہاتھوں میں پڑی ہوئی دونوں موٹی موٹی چوڑیوں کو بیٹے سے اُتار لیا۔ اس دن انھوں نے کوئی کام نہ کیا۔ سارا دن کوٹھڑی میں پڑی رہیں۔ جانے کون کون سی حسرت ناک باتیں یاد آتی رہیں۔

پھر کھانے کی آئی تو اپنی آنسوؤں کی ساری جھڑی بہہ برسا دی۔ ان کا گمان یہی ہے کہ بیگم صاحب کے پاس جا کے بیٹھی۔ بیگم صاحب نے بھانپ لیا کہ چنی بیگم کو دماغ چل گیا ہے۔ انھوں نے بڑے پیار سے سمجھا بجھا کر صلاح دی کہ اب چنی بیگم اللہ اللہ کریں اور بہو کی خدمت کرتی رہیں۔

چنی بیگم کے دل کو دھکا سا لگا مگر انھوں نے سوچا کہ چلو اچھا ہوا جو بات صاف ہو گئی۔

"اللہ کسی کا محتاج نہ کرے بیگم صاحب۔۔۔" چنی بیگم نے بھی دو ٹوک بات شروع کر دی۔ "کھائیں گے تو اپنی محنت کا ورنہ بھوکے بھلے۔ جب آپ کے کام کی نہیں رہی تو بیشک بہو کی خدمت میں کہیں اور کما کھاؤں گی۔ ابھی تو ہڈیوں میں اتنی طاقت ہے کہ دوسروں کو کھلا کر کھاؤں۔ مجھے اب اجازت دیجئے چنی بیگم آپ کو یاد رکھے گی۔"

چنی بیگم اٹھ کھڑی ہوئیں۔ بیگم صاحب باتیں باتیں کرتی رہیں مگر وہ اپنے جہیز کا لوٹا کٹورا اور صندوقچی بغل میں داب باہر نکل کھڑی ہوئیں۔

بھرے ننگے پاؤں گلی تک بھاگی۔ بیٹا اسٹیشن تک ساتھ ساتھ گیا مگر چنی بیگم کا دل نہ پسیجا۔ انھیں تو اس شہر تک سے نفرت ہو گئی تھی۔ لاہور جانے والی گاڑی تیار تھی وہ ٹکٹ لے کر بیٹھ گئیں۔

لڑکا برابر منتیں کرتا رہا۔ واسطے دیتا رہا مگر چنی بیگم نے ایک نہ سنی۔ نیفے میں کھسے ہوئے بٹوے کو نکال کر دس کا ایک نوٹ لڑکے کے ہاتھ میں تھما دیا۔

'ارے چل۔ بڑا آیا میری فکر کرنے والا! بیگم کے کام کی نہیں رہی جا رہی ہیں تیری عورت محتاجی کے طعنے دے دے کر جوتیاں لگاتی ہے۔ ان روپوں سے کپڑے بنا بچوں کے ننگے پھر رہے ہیں' بھلا تیری کمائی میں ایسی برکت کہاں جو تن بھی ڈھک سکے۔ لڑکے کے صاف ستھرے ثابت کپڑے انھیں نئے معلوم ہو رہے تھے مگر لڑکا تو پیسے کو دیکھنے اور سوچنے کے بوجھ میں نہ تھا۔ بس چنی بیگم کو گاڑی سے اتارنے کی دھن سوار تھی۔

گاڑی چلی تب بھی لڑکا ساتھ ساتھ دوڑتا رہا۔ ایک ذرا دیر کے لیے چنی بیگم کو ایسا محسوس ہوا کہ گاڑی کے سارے پہیے ان کے کلیجے پر سے گزر گئے ہیں۔

گاڑی پلیٹ فارم چھوڑ گئی تو لڑکا وہیں سر سے ہاتھ کھڑا پسینہ پونچھتا رہا۔ چنی بیگم کھڑکی سے سر نکالے اسے دیکھتی رہیں۔ کئی اسٹیشن آئے اور گزر گئے مگر وہ اسی طرح پلیٹ فارم کے سرے کو تکتی رہیں۔

لاہور آ کر کئی دن تک شہر کے اندر ہی جتنے ہیں دھکے کھاتی پھریں۔ گھر گھر جھانکتیں مگر کوئی نوکری کی بات نہ کرتا۔ جس گھر میں جاتیں وہاں بیویاں کاموں میں جٹی نظر آتیں۔ چنی بیگم کا جی جل کر خاک ہو جاتا۔ لو بھلا جب بیویاں نوکروں کے کام کرنے لگیں تو پھر اس دنیا میں کیا رہ گیا۔ فقیرنیوں جیسے مزاج ہیں یہاں کی بیگموں کے، اپنی دلی کی کیا بات ہے۔

چنی بیگم کئی دن تک اپنی دلی کی یاد میں پھڑکتی رہیں اور پھر گھومتی گھامتی شہر کے اس حصے میں آگئیں جہاں ہر طرف سکون

اور خاموشی کا ڈیرہ پڑا ہوا تھا۔ کوٹھیوں کے پھاٹک کھلے ہوئے تھے اور کہیں کہیں آیائیں بچوں کو لیے ٹہل رہی تھیں۔ چھی بیگم نے بڑی احتیاط کے ساتھ ایک کوٹھی کے پھاٹک میں قدم رکھ ہی دیا اور وہیں بیٹھے بیٹھے آیا سے گاڑھی چھاننے لگیں۔ ذرا سی دیر میں انھیں سب حال چال معلوم ہو گیا۔ تنخواہیں اچھی ہیں، کام زیادہ نہیں، بالائی آمدنی بھی ہو جاتی ہے۔ خانساماں سے دوستی گانٹھ لو تو اپنے گھر جیسا کھانے پینے کا مزا آ جاتا ہے۔

چھی بیگم ان باتوں کو سن سن کر دل ہی دل میں گناہوں کی معافی مانگتی رہیں مگر زبان سے کچھ نہ کہا۔ کسی سے جا کر پوچھ نہ سکیں، نوکری ملنی بھی تو مشکل تھی۔ آیا نے ان سے وعدہ کر لیا کہ جلد ہی اچھی سی کوٹھی دلا دے گی مگر یہ وعدہ کرتے ہوئے گود میں ننھے سے بچے کو ایک زور کا تھپڑ لگا بیٹھی۔ بچے نے خواہ مخواہ رونا شروع کر دیا تھا۔

چھی بیگم نے آیا کی گود سے بچے کو چھین لیا۔

"اری آیا ہو کر بیگموں کے بچے پر ہاتھ اٹھاتی ہے، نمک کھا کر یہ نمک حرامی۔"

چھی بیگم بچے کو پچکارتے کوٹھی کے اندر داخل ہو گئیں۔ بیگم صاحبہ سنگھار میز کے سامنے بیٹھی آرائش میں مصروف تھیں۔ چھی بیگم نے بچے کو ان کی گود میں بٹھا دیا۔

"ایسے زور سے تھپڑ مارا ہے کہ اب تک کلیجہ کانپ رہا ہے میرا۔ کیا اس بانجھ کے آگے اولاد نہیں۔" چھی بیگم غصے سے بھری ہوئی تھیں۔ بیگم نے انھیں اچھی طرح بٹھا کر حال پوچھا اور پرانی آیا کو اسی وقت جواب دے کر چھی بیگم کو رکھ لیا۔ چھی بیگم نے لاکھ کہا کہ یہ ذکر نہ کروں گی، کسی کی روزی پر ڈاکہ نہیں ڈالنا ہے مگر بیگم نے ایک نہ سنی۔

چند ہی دن میں چھی بیگم گھر کی مالکن بن گئیں۔ بیگم صاحبہ ہر بات میں ان سے مشورہ کرتیں۔ بچے اس طرح ہل گئے کہ ایک منٹ کو جان نہ چھوڑتے۔ باورچی خانے کی خبر لیے رہتیں۔ ہر ہفتے نیا خانساماں رکھا جاتا۔ چوری اور بے ایمانی سے تو چھی بیگم کو قلبی بغض تھا۔ جب انسان اپنی محنت سے کما سکتا ہے تو پھر چوری کیوں کرے۔

"بے ایمان آدمی کا مرتے وقت سؤر جیسا منہ ہو جاتا ہے۔ ہاں یہ بات بڑی بڑی کتابوں میں لکھا ہے۔" یہ چھی بیگم کے زریں اقوال تھے جو ہمیشہ بڑی بڑی کتابوں میں لکھے ہوتے۔

چھی بیگم مہینے کے مہینے اپنے بیٹے کو پانچ روپے کا منی آرڈر کراتیں اور ہر خط میں لکھاتیں کہ کلو بیٹے لگا کر نہ پھر پڑیو تیری کمائی میں ایسی کہاں کی برکت، جتنے کی ضرورت ہو لکھ بھیجیو۔ جواب میں لڑکا ایک ہی رٹ لگائے رکھتا کہ بس تم تو واپس آ جاؤ، میں خدمت کروں گا۔ چھی بیگم خط پڑھوا کر ہنستیں۔

"کبھی کچھ بھیج نہ دیا، یوں ہی محتاج بنا کر ایک کونے میں ڈالنے کو بلا رہا ہے، وحشت تیرے کی سسرے۔"

چھی بیگم یہاں بہت خوش تھیں، گھر سنبھالنے میں انھیں ذرا بھی دقت نہ ہوتی۔ ہاں شروع شروع میں کوٹھی کے لان کی حفاظت میں بڑے جتن کرنے پڑے تھے۔ بات یہ تھی کہ اس جگہ کارپوریشن کے نل نہ لگے تھے۔ کوٹھیوں میں یا تو ہینڈ پمپ لگے تھے یا پھر ٹیوب ویل سے پانی کا انتظام تھا۔ کم بخت اِدھر اُدھر کے لوگ سنسان دوپہروں میں لان میں لگے ہوئے ہینڈ پمپوں سے پانی بھر لے جایا کرتے۔ چھی بیگم پھاٹک بند کر لیتیں تو لوگ باہر کھڑے گڑگڑایا کرتے۔ دو ایک بار تو پانی لے جانے والوں سے کشتی تک کی نوبت آ گئی تھی۔

"دریا کی سبیل لگی ہے؟ بیگم کی اجازت نہیں، کسی نے اٹھایا تو خیر نہیں!"

وہ لوگ جو بغیر کسی مزاحمت کے پانی بھرتے رہے تھے اب انھیں دور دور جانا پڑتا۔ چنی بیگم کی صورت سے نفرت ہوگئی تھی انھیں، ادھر سے گزرتے ہوئے چنی بیگم کو گھنی گھنی گالیاں دیتے۔

"ہونھ!" چنی بیگم منہ بنا لیتیں۔ "اپنی ماں بہنوں کو یاد کر رہے ہیں، ہمیں کیا؟"

بیگم صاحبہ ان سے اس قدر خوش رہتیں کہ بس حد تھی۔ ان کی پانداری کی داد دیتیں۔ بات یہ تھی، چنی بیگم کے آنے سے پہلے تو یہ حال تھا کہ ادھر دوپہر ہوئی اور لوگوں نے آکر پانی بھرنا شروع کیا۔ ذرا ان سے دو چار آنے لے کر مرے سے تماشہ دیکھنے بچے آتے، سارے پھول توڑے جاتے، پودوں کو روند ڈالتے۔ بیگم صاحبہ شام کو لان میں آتیں تو چیخ چیخ کر برا حال کر لیتیں۔ نوکر گھنے پیڑ کے نیچے بیٹھ جاتے۔

کچھ دنوں سے چنی بیگم پیروں کی ہڈیوں میں ہلکا ہلکا درد محسوس کر رہی تھیں۔ کام کرنے کو جی نہ چاہتا۔ گھڑی بھر بیٹھے بیٹھے ٹانگیں جواب دے جاتیں۔ بچے کو گود میں لے کر کھڑی ہوتیں تو بس یہی جی چاہتا کہ بیٹھ جاؤں مگر وہ ٹہلے جاتیں۔ ہر کام اسی تندہی سے کرتیں۔ بغیر کام کے تنخواہ لینا تو انھیں سؤر کھانے کے برابر معلوم ہوتا۔

درد جب ذرا زیادہ بڑھتا تو مارے دکھ کے پیر اٹھتیں۔

"ارے کتے تو ماں کی گود سے اتر کر کہاں آ گیا، ناس جائے تیرا!"

کوس کوس کر تھک گئیں مگر درد کا ناس نہ گیا۔ ہاں درد نے گھٹنوں کا ناس مار دیا۔ کام یوں ہی پڑا رہتا مگر چنی بیگم سے کچھ نہ ہوتا۔ بچے ان کی گود میں چڑھنے کو بلکتے مگر ان سے اٹھائے نہ جاتے۔ بیگم صاحبہ نے یہ حال دیکھا تو ان کا کلیجہ ہی پھٹ گیا۔ انھوں نے سمجھ لیا کہ اب کاہلی سوار ہو رہی ہے۔ حرام کی روٹیاں کھانے کو دل چاہ رہا ہے۔ انھوں نے کچھ کہا تو نہیں مگر چنی بیگم سے بے اعتنائی برتنی شروع کر دی۔ بے اعتنائی کے بعد بھی جب چنی بیگم کام سے جی چراتی رہیں تو بیگم صاحبہ کو بولنا ہی پڑا۔

"میں تو پہلے سے سوچ رہی تھی کہ اب کام چھوڑ دوں۔ بیگم صاحب یہ گھٹنوں کا درد ایسا آن لگا ہے کہ کچھ نہیں کر پاتی۔ یہ نہ سمجھنا کہ چنی بیگم مفت کا کھا کر خوش ہوتی ہے۔ اس نے تو ہمیشہ اپنی محنت کی کمائی کھائی ہے۔" چنی بیگم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "اب تک بچوں کی محبت نے روک کے رکھا تھا۔ پر اب رخصت کی اجازت دیجیے۔ میں دوسری عورت کا انتظام کروا دوں گی۔"

بیگم صاحبہ باتیں کرتی رہیں۔ ایسی نوکرانی کا تو علاج کرانے کو بھی تیار تھیں مگر چنی بیگم نے ایک نہ سنی۔ دوسری عورت کا انتظام کر دیا۔ خود ہی گھر دکھایا، کام سمجھایا۔ ڈانٹ ڈانٹ کر ہدایتیں دیں۔

"خبردار جو مسٹنڈے پانی بھرنے آئیں، خیال رکھیو۔ میرے ہوتے یہ باغیچہ پھولوں سے لدا ہے۔ میرے راج میں کسی نے ایک کٹورا پانی نہیں کھینچا۔"

چنی بیگم اپنے جہیز کا لوٹا کٹورا اور صندوقچیا اٹھا آنسو پونچھتی گھر سے باہر نکل گئیں۔

ذرا دور پر ایک گھنے درخت کی چھاؤں تلے بیٹھی ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھرتی رہیں۔ پھر اٹھ کر احاطے کے مالک کی کوٹھی پر چلی گئیں۔ مالک سے بات کر کے دو روپے پیشگی کرایے کے ٹکائے اور کوٹھری کا تالا کھول کر سامان رکھ دیا۔ دو ڈھائی سو روپے ان کے پاس تھے۔ وہ برابر سوچ رہی تھیں کہ کسی سیانے سے علاج کرا کے مہینہ پندرہ دن میں ٹھیک ہو جائیں گی۔

احاطے والے تو یہی جانتے تھے کہ لڑکے تھے جو بیگم صاحبہ کی کوٹھی پہ پانی بھرنے آتے تھے۔ چنی بیگم کو دیکھ کر سب نے منہ پھیر لیا
چنی بیگم آپ ہی آپ سب کی اکثریت پر بچتی رہیں تو سب کے دل صاف ہو گئے۔ "ان بیچاری کا کیا قصور تھا" یہ تو اور کہتیں۔

چنی بیگم نے احاطے کے ایک حکیم کا علاج شروع کر دیا۔ بیس پچیس روپے خرچ ہو گئے مگر فائدہ خاک نہ ہوا۔ شہر میں جا کر کسی بڑے ڈاکٹر کا علاج کرانے کے لیے نہ تو روپیہ تھا نہ کوئی سہارا۔ اور کم بخت مرض بھی بیگم کو نیچا دکھانے پر تلا ہوا تھا۔ کبھی کبھی تو جی چاہتا کہ لڑکے کو خط لکھ کر بلا لیں پھر فوراً اس خیال کو دھتکار دیتیں۔ بہو کم بخت جوتیاں اٹھاتے گی اس نا جی کی زندگی سے خدا بچائے۔

زیادہ اداس ہوتیں تو کوٹھری سے نکل کر گھنے درخت کی چھاؤں تلے آ پڑتیں۔ احاطے کی عورتیں جمع ہو جاتیں اور ان کے مشغلۂ اقبال پر سر جوڑ رہتیں۔ چنی بیگم کو دنیا بھر کے معاملات میں دخل تھا۔

دن گزرتے گئے مگر چنی بیگم کے مرض میں افاقہ نہ ہوا۔ ان کے گھٹنے سوج گئے تھے۔ اب تو ان سے اپنی روٹی بھی نہ پکائی جاتی احاطے کی بیوہ شبراتن سے بڑا یارانہ تھا۔ شبراتن کو چار چھ آنے مہینہ دے کر اپنی روٹی پکوا لیتیں۔ وہی چنی بیگم کے لیے ایک بالٹی پانی لا دیتی جس میں کئی کئی دن گزارہ کرتیں۔

بیکاری نے جیسے جتنا بھی سکھا دیا تھا مگر چنی بیگم کو امید تھی کہ وہ اچھی ہو کر اس سے زیادہ کما لیں گی۔ وہ ضرور اچھی ہوں گی۔ آرام کرنے کی خاطر سارا سارا دن دھوپ میں پڑی سوجے ہوئے گھٹنے سینکتی رہتیں۔ مرض کو دور کرنے کے لیے ساری دعائیں پڑھتی رہتیں۔

ان ہی دنوں انھوں نے سنا کہ پاکستان بن گیا ہے۔ ہندو مسلم فساد ہو رہے ہیں۔ مسلمان پاکستان آ رہے ہیں۔ دلی لٹ گئی اور ان کے دو چار آدمی بھی کیمپ سے سیدھے احاطے میں آ پڑے۔ لڑکے کے لیے پوچھا تو سب نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ چنی بیگم کا دل ٹوٹ گیا۔ انھیں یقین ہو گیا کہ بہو نے لڑکے کو پاکستان آنے سے روک لیا ہوگا۔ ڈرتی ہو گی کہ ساس کو ٹکڑا روٹی نہ دینی پڑ جائے۔ اس خیال کے آتے ہی انھوں نے بہو کو جی بھر کر گالیاں دیں اور گھنٹوں روتی رہیں۔ ایک نامعلوم سا سہارا تھا وہ بھی ٹوٹ گیا۔ تباہی کا بھوت ان کے سامنے طرح طرح سے ناچ رہا تھا اور چنی بیگم بڑی بے بسی سے اس خونی رقص کو دیکھنے سے انکار کر دیتیں۔ اب تو انھوں نے علاج کرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ باقی ماندہ روپوں کے بٹوے کو سینے سے لگائے پڑی رہتیں۔

انھی دنوں احاطے کی آبادی بڑھ گئی۔ کوئی کوٹھری خالی نہ دکھائی دیتی۔ لوگ پانی کے لیے دھکے کھاتے پھرتے۔ ایک ایک بالٹی پانی کے لیے دور دور تک جانا پڑتا۔ ایک دن تو چنی بیگم کئی گھنٹے پیاسی پڑی رہیں۔ مئی کا مہینہ تھا، لوگ پانی کی قلت سے بلبلاتے پھرتے۔ انھی دنوں چنی بیگم کی سمجھ میں یہ ترکیب آئی۔ اپنے ایک معتبر دلی والے سے مشورہ کر کے تیس روپے اس کے ہاتھ میں رکھ دیے کہ پرانا ہی ہینڈ پمپ خرید کر لگوا دے۔ اس کام کے بعد چنی بیگم سجدے میں گر گئیں اور رو رو کر خدا سے دعا کرتی رہیں کہ انھیں صاف موت کے بستر سے اٹھائیں۔

صبح چھاؤنی کی طرف سے کوچ کا بگل بجنے کی آواز آ رہی تھی اور کہیں قریب کی مسجد میں مؤذن اذان دے رہا تھا۔ چنی بیگم ایسی سرشاری کے عالم میں اٹھیں اور ہینڈ پمپ کی ہتھی گھمائی۔ سفید موتی سی دھار بچھے فرش پر بہ گئی۔ انھوں نے بڑے چاؤ سے کلی کی، منہ دھویا اور خالی پیٹ ہی دو گھونٹ ٹھنڈا ٹھنڈا پانی پی لیا۔

بیگم کے ہینڈ پمپ کا پانی بھی کتنا ٹھنڈا نہ تھا۔ انھوں نے بے حد مسرت سے سوچنا شروع کیا۔ شبراتن جو پانی لاتی تھی وہ تو بالکل اونٹا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ پانی تو اسے کہتے ہیں۔ چنی بیگم نے بڑے غرور سے ہر طرف دیکھا۔ کوٹھریوں کے آگے بچھے

بعض لوگ اب تک سوتے پڑے تھے۔

"کم بختوں کی روزی میں اسی لیے برکت نہیں ہوتی۔ اذان کے وقت تک نیند سوتے رہتے ہیں۔" چنی بیگم نے بستر پر بیٹھے بیٹھے کلمہ آج بھی ہمیشہ کی طرح ماتھے پہ ٹھونکا۔ انھیں تو آج اللہ کا نور برستا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

ذرا دیر بعد احاطے والے جاگ پڑے۔ پہلا کام یہی تھا کہ سب بالٹیاں اور گھڑے اٹھائے ہینڈ پمپ کی طرف بھاگے۔ مردوں کو جلدی تھی کہ آج تو وہ نہا دھو کر ہی مزدوری پہ جائیں گے، ادھر عورتوں کو ہانڈی چولھے کی فکر، سب ایک دوسرے سے آگے پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"مشٹنڈو لٹیرو!" چنی بیگم نے پہلی ہی بالٹی کو چلتا کیا۔ "یہ عمر آگئی، خدا کبھی کسی کا مفت کھایا پیا نہ کھلایا۔ روپیہ مہینہ ٹھہرا، جتنا پانی چاہو بھرو مگر یہ خیال رہے کہ لونڈے نہیں نہائیں گے ادھر، ہینڈ پر ٹوٹ جائے گی ہاں۔"

قطار سے آگے بڑھی ہوئی بالٹیاں آپس میں ٹکرا کر جہاں کی تہاں رہ گئیں۔

"کیا کہا چنی بیگم؟ ارے کچھ تو خدا کا خوف کرو۔ ایک روپیہ مہینہ کدھر سے لائیں ہم مزدور سا آدمی۔ بھلا کوئی پانی بھی بیچتا ہے؟"

"لو، پانی تو اپنی حکومت تک بیچتی ہے۔ شہر کے اندر سب پانی کا کرایہ دیتے ہیں کہ نہیں۔ یہاں مفت کی بات نہیں چلے گی۔ لگوا لیتے نا تم لوگ اپنا ہینڈ پمپ۔ ایک ایک روپیہ پیشگی جمع کرا دو سب لوگ۔"

چنی بیگم نے مستری کو روپے دینے کے بعد بڑا اچھا حساب لگا کر رکھا تھا۔ صبح صبح پانی پیا تھا جو خالی معدے کو جیسے کاٹ رہا تھا مگر چنی بیگم محسوس نہ کر رہی تھیں۔ اپنے ہینڈ پمپ کا پانی جو تھا۔ ویسے آج تو انھیں جوڑوں کا درد بھی نہ محسوس ہو رہا تھا۔

صرف چار روپے چنی بیگم کے بستر پر گرے اور چار بالٹیاں پانی سے بھرنے لگیں۔ باقی تمام لوگ احاطے سے باہر سڑک کی طرف چل دیے۔ چنی بیگم نے چاروں روپے بٹوے میں رکھ لیے۔

"ہاں ہاں جاؤ، خوب بھرو پانی۔ اللہ طاقت دے تو میل میل سے بھر لاؤ۔ کوئی خوشامد تھوڑی کرتا ہے کہ ہمارے ہینڈ پمپ سے پانی بھرو۔ اسے دیکھو پانی میں خود بھر دوں گی۔ تم لوگ بالٹی زور سے رکھتے ہو، سیمنٹ اکھڑ جائے گی اور چنی بیگم بھی ہاتھ جاتے بنیوں کی کھانے کی نہیں۔"

"آج کل دنیا میں کوئی فرشتہ نہیں، سب شیطان بستے ہیں، پانی بیچے گی بڑی آئی بیگم بن کر۔" عورتیں جب پانی لے کر احاطے میں واپس آ رہی تھیں تو زور زور سے باتیں کر رہی تھیں تاکہ چنی بیگم بھی سن لیں۔

بچے سارا دن ہینڈ پمپ کے گرد منڈلاتے رہے۔ وہ چپ چاپ تپتے ہوئے پتھروں کو کبھی کبھی کر للچائی نظروں سے ایک ساں دیکھے جاتے، پر چنی بیگم کا لہو جلا کرتا تھا۔

چنی بیگم سارا دن ہینڈ پمپ کے پاس بیٹھی رہتیں، وہیں کھانا کھاتیں، وہیں پلنگ ڈال کر سوتیں، پھر بھی ہر وقت خطرہ رہتا کہ کہیں کوئی مفت میں پانی نہ بھر لے جائے، کہیں لڑکے نہانا نہ شروع کر دیں۔ وہ تو کہو ہینڈ پمپ پہ گھنے درخت کا سایہ تھا ورنہ مئی کی دھوپ میں پگھل کر ہینڈ پمپ کے پانی کی طرح بہ جاتیں۔

چنی بیگم کو چار روپوں نے رنجیدہ کر دیا تھا۔ بھلا اس میں کیا کھائیں گی اور کیا پہنیں گی، کس طرح اس موذی مرض کا علاج کریں گی۔ حکیم اللہ والے نے بتایا تھا کہ گٹھیا کی ایک بڑی اچھی دوا ایجاد کی ہے۔ بس پندرہ روپوں کی ضرورت ہے۔

ہینڈ پمپ لگے بیس پچیس دن ہو گئے۔ چاروں روپے ختم ہو گئے۔ دوسرے دن کھانے کو آٹا بھی نہ تھا۔ چنی بیگم پھر بھی بیٹھی نہ تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ لوگ ضد کر رہے ہیں۔ کچھ دن بعد آپ ہی عقل آ جائے گی، کہاں تک تیری میری کٹھیوں کے دھکے کھائیں گے۔

آج چنیا بیگم نے صبح سے کچھ نہ کھایا تھا۔ جب بھوک زیادہ ستاتی تو پاس رکھے ہوئے المونیم کے کٹورے میں تازہ ٹھنڈا پانی بھر کر پی لیتیں۔

"آہ ہائے کیسا ٹھنڈا پانی ہے" ــــ وہ لمبی سی ڈکار لیتیں ـــ "اور یہ موئے نا شکرے کہ ایک روپیہ مہینہ دینے میں جان نکلتی ہے۔"

شام ہوتے ہوتے چنی بیگم بھوک سے نڈھال ہو گئیں پھر بھی چار روپوں کے بدلے میں انھوں نے رات کے ۹ بجے تک آخری بالٹیاں بھریں۔

رات جیسے تیسے گزر گئی۔ صبح جب چاروں گھروں والے پانی بھرانے آئے تو چنی بیگم نے آنکھ بھی نہ کھولی۔ انھوں نے اٹھنا چاہا تو ہلا بھی نہ گیا۔

"آج تم خود بھر لو میاں۔ ایک دن کا پانی میں مفت بھر دوں گی۔" انھوں نے مری سی آواز میں کہا۔

صرف شبراتن کو معلوم تھا کہ روٹی نہ ملنے سے یہ حال ہے۔ اس نے لاکھ چاہا کہ چنی بیگم اس کے گھر کی روٹی کھا لیں مگر وہ رحم کی یہ بھیک کس طرح قبول کرتیں۔

ذرا ہی دیر میں احاطے والوں کو معلوم ہو گیا کہ چنی بیگم بھوکی ہیں۔ وہ محض اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے ہمدردی کا جامہ پہن کر آ گئے۔ چنی بیگم کو جیسے ہی دو روپے ملے ان میں ایک دم جان آ گئی۔ اٹھ کر جلدی جلدی پانی بھرنے لگیں۔

پانی بھر کر شبراتن کو روپے دیے کہ آٹا وغیرہ لے آئے۔

سات روپوں سے آگے نہ بڑھے۔ چنی بیگم کے گھٹنے شروع کر چکنے لگے تھے۔ جانے کتنی مدت سے علاج نہ ہوا تھا۔ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئی تھیں۔ بس بیٹھے بیٹھے ہتی چلاتی رہتیں۔

جون کے آخری دن تھے۔ لونڈے گرمی سے بلبلا کر ہینڈ پمپ پر ٹوٹ پڑتے مگر چنی بیگم کا پہرہ سخت تھا۔ مجال تھی جو ہل جائیں۔ ایسا لگتا کہ سنتری انھیں بھی وہیں گاڑ گیا ہے۔

"ارے مردودوں اپنی اماں سے کہو کہ روپیہ مہینہ دیں پھر خوب پانی بھر بھر کر نہلاؤں گی۔ ایسا ٹھنڈا مزے دار پانی ہے کہ جیسے برف بھرا ہے جسموں پہ۔" چنی بیگم لڑکوں کو پھٹکارتیں مگر ان پر ذرا بھی اثر نہ ہوتا۔ یوں ہی کھڑے منڈلایا کرتے۔

آج لڑکوں کا موڈ بہت خطرناک ہو رہا تھا۔ وہ سب لنگوٹیاں کس کر آئے تھے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ مائیں اونگھ رہی تھیں، لڑکے ہینڈ پمپ پر ٹوٹ پڑے۔

چنی بیگم انھیں دھکے مار مار کر تھک گئیں۔ کشتی تک کی نوبت آ گئی۔ مائیں کوسنے سن کر رو دیں، لڑکوں کو ملی تماشہ اس طرح جیسے ننھا دے رہی ہوں۔ لڑکے ٹھاٹ سے نہا رہے تھے۔ ایک ہتھی گھماتا اور چار چار پانی کی دھاروں میں چلے پڑتے۔

"اب لاؤ آنہ آنہ دو، دو سے کٹوری تماشہ کیا دیکھ رہی ہو؟" چنی بیگم کلیجہ پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہی تھیں۔

"ہم کہاں سے لائیں، نہانے والوں سے لو، روک کیوں نہیں دیا؟" لڑکوں کے جسموں سے جتنا میل دھل رہا تھا اُن کے سینوں سے غبار پھٹ رہا تھا۔ کب سے نہیں نہایا تھا کم بختوں کو۔

اس کے بعد تو چنی بیگم کا بھرم کمزور پڑ گیا۔ لڑکوں کو راہ سوجھ گئی تھی اور دوسروں کو بھی راستہ مل گیا تھا۔ لڑکے تو پہرے بھی ٹھاٹ سے نہانے لگے اور عورتیں بغیر معاوضے کے زبردستی پانی بھر کر لے جاتیں۔ چنی بیگم چیختی چلاتی رہتیں، گالیاں بکتیں مگر کچھ نہ کر پاتیں۔ ساروں کی صورت سے نفرت ہو گئی تھی۔ بس چلتا تو ان پانی چوروں کو زندہ گڑوا دیتیں۔ یہ سات گھر جو ایک روپیہ دیتے تھے انھوں نے بھی سرکشی کر دی۔ وہ بھی مفت میں پانی لے جاتے۔ جب چنی بیگم کی گالیاں خوفناک ہوتیں تو سب اس طرح ہنستے جیسے وہ پاگل ہو گئی ہوں۔

آخر چنی بیگم ہینڈ پمپ کے پاس سے سرک کر اپنی کوٹھڑی میں جا بیٹھیں۔ جوڑا ایسے شروع ہو گئے تھے کہ ہینڈ پمپ کی حفاظت کی اجازت بھی نہ دیتے۔ بس وہ اپنی کوٹھڑی میں بیٹھی بیٹھی کوسنوں اور گالیوں کی بوچھار کرتی رہتیں۔ اسے کیسی بے دردی سے نہاتے کہ منوں پانی بہ جاتا۔ ہینڈ پمپ کے آس پاس دلدل کی سی حالت ہو گئی تھی۔ دیکھتے دیکھتے وہ کوٹھڑی کا دروازہ بند کر لیتیں۔ آخر کو کھڑکی سے وہ یہ حالت دیکھتیں مگر یہ کیفیت زیادہ دیر نہ رہتی وہ پھر دروازہ کھول دیتیں اور کوسنے دینے شروع کر دیتیں۔

کل سے انھوں نے کچھ نہ کھایا تھا۔ مارے کمزوری کے کانوں میں سائیں سائیں ہو رہی تھی۔ ہینڈ پمپ کی چیں چیں چلانے کی آواز بھی نہ سنائی دیتی۔ شبراتن نے کئی چکر لگائے، اپنی روٹی کھلانے کی ضد کی مگر چنی بیگم نہ مانیں۔

"اری شبراتن یوں محتاجی کی زندگی نہ گزاروں گی، احاطے والوں سے روپیے دلوا دو۔"

شبراتن چلی گئی تو رینگتی ہوئی ہینڈ پمپ تک گئیں اور ایک کٹورا پانی بھر کر پی لیا۔ پھر ایسا چکر آیا کہ وہیں گر پڑیں۔ ذرا دیر بعد ہوش آیا تو اپنی کوٹھڑی میں لیٹی تھیں۔

رات کو احاطے والی دو عورتیں ایک ایک روٹی پر دال چٹنی رکھ کر لے آئیں تو چنی بیگم میں لڑنے کی جان آ گئی۔

"اپنی اماں بہنوں کو دو خیرات، مجھے محتاج سمجھا ہے؟ لاؤ دام ادا کرو پانی کے، اللہ نے چاہا تو دنیا ہی میں بدلہ ملے گا۔"

عورتیں بکس پر رکھی ہوئی تام چینی کی پلیٹ میں روٹیاں رکھ کر چلی گئیں۔ چنی بیگم بڑی دیر تک چیختی رہیں۔

"ارے کم بختوں لے جاؤ اپنی اماں بہنوں کو ڈال دو یہ روٹیاں۔"

شام ہو گئی، کوٹھڑی میں مچھر بھنبھنانے لگے۔ چنی بیگم مارے نقاہت کے اندر ہی لیٹی رہیں۔ چھاؤنی سے واپسی کے دو رنگ بگل کی آواز آ رہی تھی۔ ساتھ ہی ہتھی کے چلنے کی کھٹا کھٹ سنائی دے رہی تھی۔ آج تو ایسا معلوم ہوتا جیسے ساری دنیا کے لوگ ہینڈ پمپ پر ٹوٹ پڑے۔ جانے چنی بیگم میں ایک دم کہاں کی طاقت آ گئی۔ وہ بڑی پھرتی سے ہینڈ پمپ کی طرف جھپٹیں۔

"پانی کا کرایہ دو، یوں کسی نے پانی بھرا تو ہاتھ توڑ دوں گی۔" پورے پورے مرد پانی بھر رہے تھے۔ چنی بیگم سے کسی کی ایک انگلی بھی نہ ٹوٹی۔

"ارے چنی بیگم تم کو کیا، ہم سب تمہاری اس وقت تک خدمت کریں گے جب تک جیو گی۔"

"اپنی اماں بہنوں کی خدمت کرو۔" چنی بیگم نے اپنے حساب گالی دی۔

سب ہنستے گئے تو وہ خود کو گرتا ہوا محسوس کر کے کوٹھڑی میں آگئیں۔ کوٹھڑی میں اندھیرا ہو رہا تھا۔ انھوں نے طاق میں سے چراغ جلایا۔ روٹی کی پلیٹ کو اٹھا کر دیکھا اور پھر رکھ دیا۔ ایک پتلی سی کھاٹ کو کھینچ کھینچ کر بڑی محنت سے باہر نکالا اور اس پر بیٹھ رات بھر کھانسی نے تڑپا تڑپا دیا تو تڑپ کے رینگتی ہوئی اپنی کوٹھڑی میں گئیں۔ اللہ مارے جو یہ روٹیاں کھانے کے لئے تھے وہ وہیں بکس پر لٹک گئیں۔

ذرا دیر بعد اللہ رکھے کی بیوی پیتل کی لٹیا میں گرم گرم چائے اور ایک روٹی لیے آگئی۔ چھنی بیگم نے جلدی سے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ "ارے یہ دودھ اتنا ذرا سا ڈال کر لائی ہے اور روٹی میں گھی بھی نہیں چپڑا نیک بخت، پانی تو اتنا بھرتی ہے کہ حد نہیں۔ اب ذرا خیال رکھیو دلہن!"

فتنی

علی عباس حسینی

ہیڈ ماسٹر کے سامنے مقدمہ پیش تھا۔ ماسٹرنی ان کا سوتا سا جمال چھیڑے، اور ان کے پیشانی سامنے ماسٹر صاحب سر ہی جھکائے کھڑے تھے
مجرم اور ... بورڈنگ کا ایک طالب علم بہرحال: صرف مدعیان حاضر تھے! مجرم بیمار و بیمار و پریشان تھا۔ فیصلہ کا ایک طرفہ ہونا یقینی تھا۔
ماسٹرنی اور ان کے بچی کے مقابلے میں کسی طالب علم کی کیا بساط! ماسٹرنی کا اشارہ ہی کافی تھا۔ ان سے سب ہی ڈرتے تھے۔ وہ تھیں ہیڈ ماسٹر صاحب
کی جابر بہن، جب چاہتیں ماسٹر صاحب کا کان پکڑ کر اسکول سے استعفیٰ دلوا دیتیں اور اسکول کے لیے ماسٹر صاحب کی خدمتیں وقف تھیں۔
سب ہی ان کی عزت کرتے تھے، ساتھی ان کی شرافت و انسانیت کی وجہ سے، لڑکے ان کی لیاقت و قابلیت کے باعث اور بیچارے ماسٹر
ان کی مستعدی اور کام کی لگن کی بدولت۔

لڑکوں کی نظر میں ماسٹر صاحب میں دو کمزوریاں تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ خود ہی قاعدے قانون کے پابند نہ تھے بلکہ لڑکوں سے بھی
ہر قاعدے قانون کی پابندی کراتے تھے اور لڑکوں سے لا پابندی سے گھبرا اب مدرسے کا خیر۔ طالب علم کی سب سے بڑی چیز پابندی ہے
خواہ وہ اخلاقی پابندی ہو، تعلیمی پابندی ہو یا قاعدے قانون کی ہو۔ وہ ایسی ساری زنجیروں کو توڑنا اپنا فطری حق سمجھتا ہے۔ اس لیے اس عمر کے
چودہ برس پر مجبور تھی لڑکے ماسٹر صاحب کی ان دو قانون کی پابندیوں سے بہت عاجز تھے اور وہ خود سے خطابات عطا کرنے میں دنیا جہان کے شاعروں
اور آمروں سے زیادہ فیاض! اس لیے انھوں نے ان کا نام رکھا تھا ماسٹر "فُتی" اور ان کی بیوی کا ماسٹرنی "فتنی"!

اس لیے کہ ماسٹر فُتی صرف اسکول ہی میں ان سے پابندی نہ کراتے بلکہ بورڈنگ میں عذاب جان بنی ان کے ساتھ لگی رہتی۔ وہ
بورڈنگ کے سپرنٹنڈنٹ بھی تو تھے۔ پڑھنے لکھنے، اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، سونے جاگنے ہر بات میں ان کا قاعدہ قانون ہزاروں کی طرح سامنے آجاتا۔
حاضری دیتے وقت سارا درجہ بالکل جیسا سیدھا ہے۔ ذرا اِدھر اُدھر انھوں نے ڈانٹا "قاعدے سے کھڑے ہو" کلاس میں کسی نے کرسی کی کرسی سے
سے ذرا اسے جلیبی بنالیا، وہ غرائے "قاعدے سے بیٹھو!" ذرا لیٹ جاتے وقت ذرا چٹخارے لے کر کھایا، چپ چپ کی تو ولیانی ڈانٹ گرجے
"قاعدے سے کھاؤ!" شام کے وقت دریا جانے کے لڑکوں کی طرح بے گھنٹی اور واٹ کے ساتھ گھلے کر نکلے، انھوں نے جیبیں پر کر دو ک
دیا: "سائیکل رکھ دو! اس پر گھنٹی نہیں ہے! یہ خلاف قانون ہے۔ اس پر لیمپ نہیں ہے! یہ خلاف قانون ہے!"

شریمتی فتنی کی دوسری کمزوری تھیں فتنی بیگم۔ ان کی شریمتی ماسٹرنی صاحبہ۔ جس قدر وہ رسے تازے اور چوڑے چکلے تھیں اتنی ہی وہ دبلی پتلی
دبلی پتلی تھیں۔ مزاج تھا کہ تیا مرچ، زبان تھی کہ نمک پاش، جو پاس سے گزرا اکثر سا ہو گیا، جس نے دو باتیں کیں جل بھن گیا۔ منہ سے

مگر وہ نہ ہوتیں تو بورڈنگ کا کام دو دن نہ چلتا۔ وہاں کے انتظام کی ساری خوبیاں انہی کے دم سے تھیں۔ بیچارے ماسٹر صاحب تو تھے [illegible] ٹھنڈے، انھیں غصّہ ہی نہ آتا۔ بس یہ انہی کی عقابی نظر اور فوجی گرفت تھی کہ ایسے منہ زور بھی سدھ گئے تھے۔ "بچّے تو بچّے ہی ہیں!" اور یہ فقرہ ماسٹر صاحب کے ارشاد ہوتا تھا، "ہاں اگر کوئی ڈانٹ پلاتا ہے تو وہ ہے مسز...!" ماسٹرنی کی نظر میں مہندر سے زیادہ نیک، سیدھا اور فرماں بردار لڑکا نہ اس وقت تک پیدا ہوا تھا اور نہ کبھی دنیا میں اس کے پیدا ہونے کی امید تھی اور وہ بیاں سے آنکھوں کا شعل کمیت [illegible] اور صاحب تیم چڑھا بھی۔ بورڈنگ بھر کے لڑکوں پر حکومت جتاتا تھا۔ ماسٹر صاحب کا سالا تھا جس کی بہن اندر اس کا بھائی تھا۔ اس لیے ماسٹر صاحب میں اور نہ لڑکوں میں اتنا دم تھا کہ اسے ٹوک سکیں۔ اندر باہر فوجیں گرجتیں، مشین گنیں چلتیں، بجلیاں گرتیں، کوندے لپکتے اس لیے وہ بورڈنگ کا بے والیا ہوا سانڈ تھا۔ جس کو بھی چاہا شیپ گاڑی، جس کی کتاب کاپی ہوئی لے بھاگا۔ ہر ایک کو ڈانٹتا، گھرکتا، گالی دے دیتا، ماریں سب جھڑکی چٹکی، کہا کھاؤ کھلا دیا۔ اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ لڑکے اس سے ڈرتے تھے، چپراسی اس سے ڈرتے، خود ماسٹر صاحب اس سے ڈرتے۔ بس اگر کوئی اس کی دھونس نہ کھاتا تو وہ تھا ہریش!

جس طرح ایک میان میں دو تلواریں اور ایک ملک میں دو خودسر بادشاہ نہیں رہ سکتے، اسی طرح ایک بورڈنگ میں دو سردار نہیں رہ سکتے۔ ان دونوں میں چوٹ ضرور ہوگی۔ مہندر کو اگر اپنی بہن کی پشت پناہی پر گھمنڈ تھا تو ہریش کو اپنی جسمانی قوت اور اپنے کردار پر۔ مہندر اپنی بہن کا بھائی تھا، "ٹھیکیدار" سو کی موٹا، بھاری پیکر، ہریش تھا خوش رو، ہاتھ پاؤں کا ٹھیک، اٹھتی جوانی، پندرہ برس کا سن، مگر جب بھی دونوں میں ٹکر ہوتی جیت مہندر ہی کی ہوتی۔ دو دل ایک ہو کر پہاڑ ڈھا سکتے ہیں، یہاں تو ماسٹرنی اور مہندر کی مجموعی قوت کا صرف ایک نوجوان مقابل تھا۔ اس لیے ہریش کئی بار جرمانے سہہ چکا تھا، کئی دفعہ جرمانے دے چکا تھا اور آخر میں یہ نوٹس بھی پا چکا تھا کہ اب کے جو شکایت آئی تو وہ اسکول سے نکال دیا جائے گا۔ قفقی اس کا خیال آتے ہی مانت پیس کر کہتیں "میں اس پاجی کو اسکول سے نکلوا کر ہی سانس لوں گی!"

آج کچھ ایسا ہی سامان بھی ہو گیا تھا۔ ہریش اسکاؤٹ کے کپڑے پہنے سائیکل لیے باہر جا رہا تھا۔ شہر میں سیلاب کی بدولت سیکڑوں گھر گر رہے تھے۔ اسکول کے اسکاؤٹ بھی لوگوں کو گھروں سے نکالنے اور دوسری جگہ پہنچانے میں مدد دے رہے تھے۔ ہریش کو اپنی ڈیوٹی پر پہنچنے کی جلدی تھی۔ ایسے میں یہ کون دیکھتا ہے کہ سائیکل پر گھنٹی ہے یا نہیں مگر مہندر کے لیے تو بہانہ مل گیا۔ اس نے سامنے آ کر کہا: "کہاں سے چلے بے گھنٹی کی سائیکل پر؟"

ہریش نے سائیکل پر اطمینان سے بیٹھتے ہوئے کہا: "تم کون ہوتے ہو پوچھنے والے قفقی کی دُم!"

مہندر نے آپے سے باہر ہو کر اس پر ہاتھ چھوڑ دیا۔ ہریش نے جھکائی دی اور سائیکل پر بیٹھے ہی بیٹھے پوری قوت سے لات ماری۔ مہندر اُلٹ گیا۔ پیچھے تھا بجلی کا کھمبا اور اس کے پاس ہی زمین پر پتا ہوا لوہے کا گولا۔ سر تو بارے ٹکرایا، ٹانگیں گولے میں اُلجھیں اور وہ زمین پر منہ کے بل آ رہا۔ راستوں نے ہریش کی مزاج پرسی کی، زمین نے گھٹنوں کی تواضع کی اور بار اور گولے نے ٹخنے اور سر کی خبر لی۔ وہ تو "ہائے مجھے مار ڈالا، میری ماں!" کہہ کر چیختا رہا اور ہریش سیٹی بجاتا سائیکل تیز چلاتا نو دو گیارہ ہو گیا۔

اسی لیے اس وقت بورڈنگ اور ہیڈ ماسٹر کے دفتر کا درمیانی حصہ رن کی زمین کی طرح ہل رہا تھا۔ قفقی مرحبہ فیر ابھی زخمی مہندر کو مطلوبہ مرہم پٹی کر کے لائی تھیں، دے رہی تھیں۔ ماسٹر صاحب خاموش تھے مگر ضبط کی طرح وہ بھی شل ہو رہے تھے۔ ہیڈ ماسٹر کو معاملے کے ہر پہلو پر غور کرنے اور مدعا علیہ کے بیان لینے اور صفائی کے گواہ طلب کرنے کا موقع نہ تھا۔ قفقی اپنی تیز سیٹی کی طرح بجتی آواز میں میز پر ہاتھ پٹک کر کہہ رہی تھیں "یا تو اب اس

ہریش کو اسکول اور بورڈنگ سے نکالا جائے یا ابھی ابھی ان کا (یہ غلام خاص ماسٹر صاحب کی طرف اشارہ تھا) دونوں شخصوں سے استعفا طلب کیجیے۔"
ہیڈ ماسٹر کے پاس اس الٹی میٹم کا ایک ہی جواب ہو سکتا تھا۔ انھوں نے "آرڈر بک" منگائی کہ ہریش کو اسکول سے نکالنے کا حکم لکھ دیں۔

ابھی انھوں نے قلم اٹھایا ہی تھا کہ دفعتاً برساتی میں ایک موٹر آکر رکی۔ حاکم ضلع اتر کر آگے آگے اور اس کے پیچھے پیچھے ماسٹرنی اور ایک لڑکا ہریش کو سنبھالے ہوئے موٹر سے اترے۔ ہیڈ ماسٹر کرسی چھوڑ کر بڑھے۔ "کیا ہوا جناب؟ آپ نے کیسے زحمت کی؟" انھوں نے گھبرا کر پوچھا۔

مجسٹریٹ نے ہریش کی طرف اشارہ کر کے کہا: "میں آپ کے اس ہونہار طالب علم کے ساتھ آیا ہوں: اس بچے نے اپنی جان پر کھیل کر ایک عورت اور اس کی دو بچیوں کو ایک گرتے ہوئے مکان سے نکالا ہے۔ مکان کا اگلا حصہ گر چکا تھا، بقیہ حصے گر رہے تھے، یہ تینوں جانیں اندر پھنس گئی تھیں۔ کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ اپنے کو ہلاکت میں ڈال کر انھیں بچانے جائے۔ یہ لڑکا اسی حالت میں مکان میں گھس گیا اور انھیں نکال لایا۔ خود اس کے پاؤں میں ایک گرتے ہوئے شہتیر سے خراش بھی آگئی اور جگہ جگہ چھوٹی چھوٹی اور بھی چوٹیں آگئی ہیں۔ میں تو اسے اسپتال میں داخل کرنا چاہتا تھا مگر یہ مانا ہی نہیں۔ کہتا ہے میں اپنے بورڈنگ ہی جاؤں گا۔ وہیں مجھے کچھ جلد آرام ہو جائے گا۔۔۔۔۔"

تقی جلدی سے بات کاٹ کر بول اٹھیں: "جناب ہم اپنے بورڈنگ میں بچوں کو اس طرح آرام سے رکھتے ہیں کہ وہ اسے گھر سمجھتے ہیں!" اور وہ اس طرح آگے بڑھ آئیں جیسے ہریش کی ساری تعریفیں وصول کرنے کا تنہا انھی کو حق ہے۔

کلکٹر نے انھیں معترفانہ نظروں سے دیکھ کر کہا: "اچھا تو یہ آپ ہی کی مادرانہ شفقتوں کا نتیجہ ہے کہ بچے بورڈنگ کو گھر سمجھتے ہیں۔ میری طرف سے اپنے ممتا بھرے برتاؤ پر دلی مبارکباد قبول کیجیے۔" اور وہ ہریش کی طرف جسے اب آرام کرسی پر لٹا دیا گیا تھا اشارہ کر کے بولے "سمجھیے یہ آپ اپنا بچہ! آپ اس پر جتنا بھی ناز کریں بجا ہے۔"

ہیڈ ماسٹر جب کلکٹر کو رخصت کر کے کمرے میں پلٹے تو انھوں نے دیکھا ماسٹرنی ہریش کے سر پر ہاتھ رکھے بڑی محبت سے پوچھ رہی تھیں: "کہاں چوٹ لگی میرے بچے؟"

ہیڈ ماسٹر نے اپنی میز تک پہنچ کر کھنکار کر انھیں اپنی طرف متوجہ کیا اور "آرڈر بک" کی طرف اشارہ کر کے پوچھا: "اب کیا حکم لکھوں ماسٹرنی جی؟" اور تعمیل حکم کے لیے قلم بھی اٹھا لیا۔

ماسٹرنی کچھ جواب دینا ہی چاہتی تھیں کہ ویسے ہی ہریش ایک ہلکی سی آہ کے ساتھ کسمسایا۔ انھوں نے فوراً اس پر جھک کر پوچھا "کیا بہت تکلیف ہے بیٹے؟"

مہندر بھلا بھابی کی محبت میں اپنے رقیب خاص کی یہ شرکت کیسے دیکھ سکتا تھا؟ وہ ایک طنزیہ قہقہہ لگا کر بولا: "ارے بنا ہوا ہے دیدی! بہروپیا ہے، بہروپیا!"

ماسٹرنی کا چہرہ دہکتے لوہے کی طرح سرخ ہو گیا۔ وہ گرجیں: "چپ رہ پاجی کہیں کا شریر!"

پھر وہ لپکتی ہوئی میز کے قریب آئیں۔ ذرا جھک کر انھوں نے بڑی ہی کڑی نگاہوں سے اپنے پتی دیو کو گھور کر دیکھا اور کہا۔۔۔

"مستقبل ایسا ہو گا جب آپ نے مندر کی صفائی و طرفداری میں ایک لفظ بھی سے کہا!"

اس کے بعد وہ ہیڈ ماسٹر سے مخاطب ہوئیں: "مگر دیکھئے کہ ہریش نے جس طرح اسکول اور بورڈنگ کا کام چلایا ہے [illegible] بڑا فخر ہے اور میں اسے اس کار نمایاں پر اپنی طرف سے انعام میں ایک تمغہ دوں گی"

مندر کے منہ سے ایک ہلکی سی سسکی نکل گئی۔ ماسٹر صاحب بیوی کے بجائے تیرہ دنوں سے کچھ ذکر کرتے سے گھبرا [illegible] مسکرائے اور ماسٹر جی نے پورے مجمع پر ایک فاتحانہ نظر ڈالی ——

ہریش نے پاس کھڑے ہوئے اسکاؤٹ سے آنکھ مار کر آہستہ سے کہا —— "یہ میری اپنی تنخواہ!"

رات، چور اور چاند

(مسلسل)

بلونت سنگھ

پاؔلا سنگھ کے دیکھتے دیکھتے حالات نے ایسا پلٹا کھایا جس کا اسے خواب میں خیال تک نہ تھا۔

سرنوں کے والدین کو حقائق کا اس قدر شدید احساس ہوا کہ انھوں نے فوراً خاندان کے چند نیک اور معزز بزرگوں کو مشورے کے لیے جمع کیا اور سارے حالات ان کے سامنے کھول کر رکھ دیے۔ اتفاق رائے سے یہ طے پایا کہ جلد از جلد لڑکی کی شادی کر دی جائے اور اس دوران میں لڑکی کی کڑی نگرانی کی جائے۔

پرتھی پال سنگھ کے باپ نے تو انکار کر دیا تھا اب سوال یہ تھا کہ شادی کس کے ساتھ کی جائے۔ نرنجن سنگھ اور جنداں کمرے میں بند خفیہ مشورے کرتے اور یہ ایسا معاملہ تھا کہ اور زیادہ تاخیر کی گنجائش ہی نہ رہی تھی۔

نرنجن سنگھ نے دبی زبان سے پاؔلی کا ذکر کیا۔

"اب یہ اپنا لڑکا پاؔلی ہے۔ آخر اس کا کیا کیا جائے کہ اول تو خاندان ہی نیک نام نہیں۔ خیر اس کو بھی چھوڑو، باپ کے مرنے کے بعد اننا سنگھ تو بھلے آدمیوں کی طرح زندگی بسر کر رہا ہے۔ باقی رہا پاؔلی سو اس کی بابت بھی کوئی ایسی ویسی بات سننے میں نہیں آئی لیکن ہے نکھٹو۔ اتنے دنوں پردیس میں نہ جانے کیا کرتا رہا ہے پلے پھوٹی کوڑی نہیں، اتنے مہینوں سے یہاں آوارہ گھوم رہا ہے کوئی کاروبار ہی شروع کر دیتا۔ زمین خریدنے کو کہہ رہا تھا وہ بھی نہیں خریدی۔ میں تو سمجھتا ہوں یہ بھی ڈھکوسلا تھا..... اُف کیا مصیبت ہے لڑکیوں کی۔ کس لاڈ پیار سے پالا تھا اسے۔ خیال تھا کسی اچھے گھرانے میں شادی کریں گے جہاں آرام سے زندگی بسر کرے گی۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اسے کہیں نہ کہیں دھکیل کر ہی سہی آبرو بچا لیں....."

جنداں بولی۔

"جو ہو سو ہو۔ اب پاؔلی کا نام نہ لو۔ لڑکی پھر گاؤں کی گاؤں ہی میں رہے گی، اگر پھر کوئی بات اٹھی تو کون ذمہ دار ہوگا اور اس کا نتیجہ بھی کیا جانے کیا نکلے۔ اس مردود کا تو اب کہیں پردیس میں منہ کالا کرو۔ تمہارا کیا سب باتیں تو عورتوں کو سہنا پڑتی ہیں۔ وہ چلی جائے گی تو جان بھی چھوٹ جائے گی..... پاؔلی پر مجھے بھی شک ہے۔ نہ کوئی کام کرتا ہے نہ اس کی جیب میں پیسہ ہے نہ کوئی ہنر جانتا ہے

یہ تو سوچ کر وہ روپیہ کیسے کمائے گا۔ آپ کہاں سے کھائے گا، لڑکی کو کیا کھلائے گا۔ ابھی تو گھر میں بیٹھا کھا رہا ہے لیکن شادی ہو جانے پر تو یہ بات نہ رہے گی۔ پھر تو بڑے بھائی بھی کہیں گے کہ بیٹا اپنا کماؤ اور کھاؤ اور زمین بھی تو بہت نہیں ان کے پاس ــــ"

اس پہ دونوں طرف خاموشی طاری رہی۔ پھر جنداں کو جو خیال آیا تو کہنے لگی۔

"وہ جو حوالدار کا ذکر کر رہے تھے تم۔ اس میں کیا حرج ہے تم اسے چٹھی کیوں نہیں لکھ دیتے۔"

"ہاں خوب یاد دلایا لیکن تمہیں معلوم ہے نا کہ وہ دو سال سے رنڈوا بیٹھا ہے۔"

"کوئی بچہ وچہ ہے پہلی عورت سے؟"

"نہیں ــــ ایک تھا سو مر گیا۔"

"بس تو پھر کیا حرج ہے؟"

"عمر چالیس کے لگ بھگ ہو گی۔ صورت بھی کچھ ایسی ویسی ہی ہے لیکن ایسی بُری بھی نہیں۔"

"کماتا تو ہے؟"

"ہاں بتایا نا حوالدار ہے سرکاری نوکری بالکل پکّی اور ویسے بھی جس سے پوچھو یہی کہتا ہے کہ بڑا نیک بڑا گو رکھ ہے سہرو و زمینیں اٹھ کر پاٹھ کرتا ہے، گوردوارے میں مقاشیکتا ہے۔ فوجیوں والی کوئی علت نہیں۔ شراب اور بدمعاش عورتوں سے کوسوں دور بھاگتا ہے یقین جانو سب لوگ اس کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ میں اسے مل چکا ہوں۔ واقعی لوگ جو اس کی تعریف کرتے ہیں وہ جھوٹ نہیں۔ میں نے سُنا ہے کہ پہلی بیوی کو وہ پھول کی طرح رکھتا تھا۔ کیا مجال جو ایک مرتبہ تُو بھی کہا ہو اسے، حالانکہ وہ بڑی لڑاکا تھی۔ دیکھنے والے کہتے کہ اگر کوئی اور مرد ہوتا تو چوٹی سے پکڑ کر نکال باہر کرتا لیکن وہ کہتا میری عورت جھگڑالو ضرور ہے پر دل کی بُری نہیں، نہ اس میں کوئی اور عیب ہے۔ اس کی محبت میں تو عورت بھی کافی سُدھر گئی تھی۔ دراصل بیچارا بچپن ہی میں یتیم ہو گیا تھا۔ بیچارے کو گھر بسانے کی بڑی تمنا ہے۔ اس نے دو ایک مرتبہ اور آدمیوں کی معرفت کہلوایا بھی ہے۔"

"اچھا، کب کی بات ہے یہ؟"

"لو اور سُنو تمہارے دماغ ہے یا سر میں گوبر بھرا ہے میں نے پچھلے سال تم سے اس بات کا ذکر بھی کیا تھا اور تم نے کہا تھا کہ میں اپنی چاند سی لڑکی کے لیے بہت ہی خوبصورت اور رائیر دولہا لاؤں گی۔ رنڈوے سے لڑکی کی شادی ہرگز ہرگز نہیں کروں گی۔"

"بھئی مجھے تو کچھ یاد نہیں۔ نہ میں پوچھتی ہوں اب اس کی شادی تو نہ ہوئی ہو گی۔"

"کیا جانئے۔"

"اچھا تو ہے نر۔ ہمیں اور کیا چاہئے۔ چالیس برس کی عمر بہت زیادہ تو نہیں نا۔ جب پہلی سے بچہ نہیں نا...... ارے ہاں یاد آگئی بات، تم نے ذکر کیا تھا مگر مجھے تو زیادہ اعتراض بچے پر تھا۔ اب کہتے ہو کہ وہ مر گیا......"

"ہاں ہاں اب کوئی حرج نہیں۔ بن بچے کا رنڈوا ابھی تو کنوارا ہی سمجھنا چاہئے۔"

"ہاں اب اس موقعہ اس سے ہو جائے تو سمجھو کہ تمہاری خوش نصیبی سمجھو۔"

"دیکھئے کہیں شادی نہ ہو گئی ہو اس کی۔"

"پالی کہہ دو ناکہ اگر شادی نہ ہوئی ہو تو ہمیں وہ فوراً اطلاع دے دے"

آپیرواں ایسی طرح مشورہ کر لینے کے بعد زنجن سنگھ نے جگرم سنگھ حوالدار کو چٹھی لکھ دی۔ چار روز بعد جواب آیا تو لفافہ زنجن سنگھ سے کھلا تو میں کا نپنے لگے۔ اس نے بیوی کو بلایا ۔۔۔ وہ لے کر سے میں جا کر اسے کھولا اور جلدی جلدی پڑھنا شروع کیا تو پچکے چہرے کی سرخی عود کر آئی ———

"لو میاں! تیرا کام بن گیا"

"جنداں کی چھاتی پر سے بھی مانو پتھر کی سل ہٹ گئی۔ ہنس کر بولی۔"

"تمہیں بھی مبارک ہو۔ اچھا ہوا اب آٹھ دس روز تک لڑکی کو روانہ کر کے چین کی سانس لیں گے۔ میں نے تو پہلے ہی مشہور کر دیا تھا ہم حوالدار سے شادی کر رہے ہیں سرخرو لی"

"اصل بات ہی کی اگر اس کی شادی پہلے ہی سے کہیں ہو چکی ہوتی تو پھر!"

جنداں نے ذرا بات ٹال کر بولی۔

"میرا دل جو کہتا تھا کہ ہمارا کام بن کر رہے گا۔ میں گھبرا گئی تھی۔ لوگوں کو کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خیر اب ڈرنے سے کیا فائدہ اب تو شادی کی فکر کرو"

ان تین چار دنوں کے اندر ایک طرف تو زنجن سنگھ اور دوسرے بزرگوں نے اصل واقعات پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی اور دوسرا طرف جنداں کی چرب زبانی نے لوگوں کے دل موہ لیے۔ جس ماچھی نے سرنوں اور پنگی پالی کو ساتھ ساتھ دیکھا تھا اسے بلا کر نہ صرف دھمکیاں دی گئیں بلکہ اسے اور اس کے ساتھیوں کو کچھ روپے بھی دے کر ان کے منہ بند کر دیے۔ اب ان کا بیان یہ تھا کہ ہم نے اچھی طرح پہچانا نہیں ممکن ہے کوئی اور عورت ہو۔ چونکہ کافی اندھیرا تھا اس لیے غلطی کا امکان بھی تھا۔ ادھر حوالدار بکرم سنگھ کو جیسے منگنی اور بیاہ کی پیشکش ہو کر گزر گیا۔ اڑتی ہوئی افواہیں بھی پہنچیں لیکن گاؤں کے چند نیک طینت بزرگوں نے بیچ میں پڑ کر سب شکوک رفع دفع کر دیے۔ حوالدار بھی سخت مزاج تند تھا، فطرتاً نیک بھی تھا چنانچہ وہ ان پر ایمان لے آیا۔

جنداں کی یہ خاص خوبی تھی کہ ایک مرتبہ جو سر پر مصیبت آن پڑتی تو پھر وہ حالات کا مقابلہ بڑی جرأت اور خندہ پیشانی سے کرتی تھی۔

گھر میں شادی کی چہل پہل پیدا ہو گئی۔ جنداں نے اپنی گفتار، حرکات اور سکنات سے غیر معمولی بات کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ اس نے ہنسی مذاق سے سب کو خوش رکھا اور گاؤں میں اگر کسی عورت کے دل میں میل تھا بھی تو جنداں خاندانی پندار کو بالائے طاق رکھ کر ان میں سے ہر ایک کے گھر میں پہنچی۔ بڑی خوشامد اور محبت سے انہیں بہلانے کی کوشش کی۔ جب شادی سے آٹھ دس روز پہلے رات کو گانا بجانا شروع ہوا تو جنداں سنداں کے ہاں پہنچی۔ جنداں بہت ذہین تھی۔ اسے معلوم تھا کہ سنداں کے دماغ میں کیا خیالات ہیں اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ کس طرح اس کے دل کو رام کیا جا سکتا ہے۔ جنداں کی پیار بھری باتیں سن کر سنداں کا دل پسیج گیا۔ وہ سوچنے لگی کہ بیچاری دکھیا ہے۔ سر پر مصیبت پڑی ہے، ایسے موقع پر پھر کانا ٹھیک نہیں۔ رخصت ہونے سے پہلے جنداں نے پالی کے کندھے پر بڑے پیار سے ہاتھ پھیر کر کہا۔

"بیٹا پالی! اب تو بہن کی شادی میں تجھے ضرور مدد کرنی چاہیے"

اس وقت جنداں کی صورت اس قدر مظلوم اور معصوم بنی ہوئی تھی کہ پالی انکار نہ کر سکا اور پھر اس نے یہ بھی سوچا کہ بیچاری جنداں چاچی کو

کیا معلوم کہیں سرفوں کی محبت ہی گرفتار ہوں۔ ڈوبتے کو تنکے کے سہارے والی بات تھی۔ اس نے یہ بھی سوچا کہ اس بہانے سے ان کے وہاں بلا تکلف جانے آنے کا موقع ملتا رہے گا اور یہ بھی ممکن ہے اس دوران میں سرفوں سے بات چیت ہو جائے اور اگر اب بھی وہ اس کی جانب توجہ کرے تو پھر اسے ہمیشہ کے لیے اپنا بنانے کی کوئی صورت بھی نکال جا سکے گی۔

ادھر اس کے ذہن میں یہ خیالات تھے تو اُدھر اس کی ماں بڑے اخلاص سے بولی۔

"ہاں بہن کیوں نہیں آئے گا۔ بچپن سے ساتھ ساتھ کھیلے ہیں بھلا اب اس کی شادی میں یہ مدد نہ کرے گا تو اور کون کرے گا؟"

جب راتوں کو بیاہ کے گیت گانے کے لیے بلاوا آیا تو سنداں اور تاباں جھٹ پٹ پکے برتن سے فرصت پا کر نوراں بیاہ والے گھر کو چل دیں۔

پہلی رات کو ہی وہاں بڑی چہل پہل ہو گئی تھی۔ سرفوں کی سہیلیاں رنگ برنگ کی چندریاں اوڑھے ڈھولک لے کر بیٹھ گئیں۔ ایک لڑکی نے ڈھولک پر بجانے کے لیے ٹھیکرا ہاتھ میں پکڑا تو بڑی بوڑھی عورتیں بولیں۔

"ٹھہرو چھوکریو! پہلے سہاگ گیت گانے دو ہمیں۔"

لڑکیاں چلّا کر بولیں۔

"اچھی بات! لو ہم ڈھولک بالکل نہیں بجائیں گی۔"

چنانچہ دو چار بوڑھی عورتوں نے چندھیکیوں کی سی تھرّاتی ہوئی آواز نکال کر سہاگ گیت شروع کیا۔

ہے میرے بابلا میرا کاج رچا

دھرتی راجیا وے

میرا کاج رچا

رفتہ رفتہ چند خوش گلو عورتوں اور لڑکیوں کی ملی جلی آوازیں بلند ہوئیں تو خاموش فضا گیت کے درد اور کسک سے تھرتھرانے لگی۔ اس طرح سات سہاگ گیت گا چکیں تو اب لڑکیوں کا ہنگامہ شروع ہوا۔ وہ بھی بس اشارے کی منتظر بیٹھی تھیں فوراً ڈھولک دھم دھمانے اور ٹھیکرا بجانے لگیں۔

بڑی بوڑھیوں نے منہ سے ایسے زور کی سانس چھوڑی جیسے انھوں نے بڑا بھاری کام انجام دیا ہو۔ چند بول اٹھیں "ہے بھاجنداں انگیٹھیوں کے اُپلے تو راکھ ہو گئے اب اور ڈالو اُپلے تو ذرا کر"

جنداں تو بات بات پر ہنستی اور سر تسلیم خم کرتی۔ مجال کیا جو کسی کو شکایت کرنے کا موقع دے۔ سبھوں کے دل پر ایسا جادو کر ڈالا تھا اس نے کہ وہ سرفوں کی بابت افواہوں کو بے بنیاد سمجھنے لگیں۔ وہ خود اٹھ کر اُپلے لینے کے لیے پسار سے باہر نکل گئی۔ چند بوڑھیوں نے جو دبی زبان سے سرفوں کا تذکرہ کر رہی تھیں اتفاق رائے سے یہ نتیجہ نکالا کہ کیا جنداں اور کیا سرفوں دونوں بہت ہی نیک ہیں، لوگوں پر بانگھ دو کی مار نہ معلوم کیوں جلتے ہیں ان کے گھرانے سے۔

اس بات کی بھنک جنداں کے کان میں بھی جا پڑی۔ اس کا دل مارے خوشی کے ناچ اٹھا اس نے نہ صرف انگیٹھی دہکا دی بلکہ سب عورتوں خصوصاً بوڑھیوں کو ٹانگوں پر ڈالنے کے لیے کمبل اور کھیس بھی دے دیے۔

لڑکیوں نے ڈھولک اور اس پر ٹھیکری بجا بجا کر چٹکیلے گیت گانے شروع کیے۔

جیسی جاننا ہو، وہ سنانے لگا تنہا۔

ایک گیت ختم ہوتا، وہ سا شروع کر دیا جاتا۔ شہر کی لڑکیوں نے گیتوں کی آڑ لے کر اپنے دلوں کی بھڑاس نکالی۔ محبت کے معاملوں کے چٹکلے سنا کر ہونٹوں کی کھنک کھنک جاتیں، رات ڈھل ڈھل پڑتی، چھتیاں دھڑک دھڑک جاتیں۔ محبت اور فرقت، شرارت اور چھیڑ چھاڑ اور ہونٹوں کے تبسم سے فضا رنگین رہی۔

رات کے بارہ ایک بجے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ بالآخر جب محفل برخاست ہوئی تو چنداں نے چاؤ بھری کی بجائے ایک ڈیڑھ پاؤ گڑ ہر عورت کی جھولی میں ڈال دیا۔ حاضرین پر بہت خوشگوار اثر ہوا۔ نوجوان لڑکیوں میں بعض ایسی بھی تھیں جنہوں نے سرنوں کی بات کی اور نسیں سنی تھی انہوں نے جاتے جاتے سرنوں کے ہونٹوں کی چٹکیاں لینے سے بھی احتراز نہیں کیا۔

جوں جوں دن گزرتے گئے ان دنوں ان کے گھر میں پالا کے پیرے چھپ چھپ بڑھتے گئے۔ وہ سارے گھر میں بے محابا دندناتا پھرتا لیکن بظاہر چنداں کو اس پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ ادھر ادھر کے بھاگ دوڑ والے کاموں میں پالی مدد بھی بہت کرتا اور شکر پالی میں جب کبھی چنداں سے مڈبھیڑ ہوتی تو وہ بڑی شفقت کے ساتھ دردانہ انداز میں مسکرا دیتی۔ یہاں تک کہ پالی کو یقین سا ہونے لگا کہ اگر چاچی چنداں کو اس کے دل کی کیفیت کا علم ہو جائے تو وہ فوراً مرد وہ شادی کر کرا کر اپنی لڑکی کا اس کے ساتھ بیاہ رچا دے۔

پالی کو اپنی ماں پر بھی غصہ آنے لگا۔ ایک تو اسے ڈھب سے بات کرنی ہی نہیں آتی تھی۔ اگر اسے تھوڑی بہت عقل ہوتی تو سرنوں ان کے ہاتھ سے جنگلی چڑیا کی مانند پھر سے اڑ نہ جاتی۔ پھر اسے اس بات کا خیال آیا کہ سرنوں کو اس سے محبت ہی نہیں تھی۔ اس نے کبھی بھول کر بھی کیا تو کس سے، پیشین پرتھی پال سنگھ سے۔ وہ خوبصورت ہی سے شہد ا دکھائی دیتا تھا۔ لیکن گاؤں کی ناتجربہ کار لڑکیوں کو اس بات کا علم ہی کہاں ہوتا ہے۔ ظاہری ٹیپ ٹاپ پر جان دیتی ہیں اور آخر کار ساری دنیا کی رسوائی اور جگ ہنسائی کا نشانہ بن کر بیٹھ رہتی ہیں عمر بھر۔ بھائی کی خوش فہمی بھی حماقت پر مبنی تھی۔ عین اس کی ناک تلے سرنوں غیر سے پریم کا کھیل کھیلتی رہی لیکن وہ یہی سمجھتی۔ یہ سرپرتھی پال سنگھ بڑا شریف آدمی ہے اور بچاری سرنوں بہت ہی بھولی بھالی ہے۔ اسے ان باتوں کی ہوا بھی نہیں لگی۔ اب کوئی پوچھے کہ کیا ہوئی وہ شرافت ان دونوں کی!....

درحقیقت کیسے چالاک نکلے یہ دونوں۔ سب کی آنکھوں میں دھول ڈال کر محبت کی پینگیں بڑھاتے رہے۔ سرنوں کو تو ناتجربہ کار سمجھ کر معاف کیا جا سکتا ہے لیکن پرتھی پال سنگھ کی حرامزدگی قابلِ نفرین ہے۔ کس قدر پاجی پن کا ثبوت دیا ہے اس پیشین کے بچے نے۔ کوئی کان پکڑ کر پوچھے اس حرامزادے سے کہ جب تجھے اس لڑکی سے کوئی محبت ہی نہیں تو پھر بیچاری کی آبرو کیوں برباد کرتا ہے ——— اس طرح پالی نے اخلاق اور شرافت کا نام لے کر دل ہی دل میں ہزاروں گالیاں سنا ڈالیں پرتھی پال سنگھ کو۔

ان دنوں سرنوں کی عجیب حالت ہو رہی تھی۔ اس نے کسی سے بھی بات کرنا بالکل بند کر دیا تھا۔ نہ اس کے چہرے سے کسی جذبے کا اظہار ہوتا تھا۔ یہ سب سے زیادہ پریشان کن چیز تھی۔ وہ سب سے الگ تھلگ ہو بیٹھی تھی۔ میلے کچیلے پھٹے پرانے کپڑے پہنے وہ اوندھے منہ لیٹی رہتی تھی۔ اس کے بدن کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ دل کی گہرائیوں سے اک ہوک سی اٹھتی تھی لیکن وہ اسے دبا کر رہ جاتی۔ اس کی سہیلیاں، رشتہ دار حتیٰ کہ والدین اس کے لیے بالکل اجنبی بن کر رہ گئے تھے۔ گھر کی گہما گہمی سے بے پروا الگ تھلگ گوشے میں منہ چھپائے سرنوں کو جب پالی دیکھتا تو اس کی کنپٹیاں جلنے لگتیں۔ آنکھوں میں ریت کے ذرے محسوس ہونے لگتے۔ حالات کی نئی کروٹ پر وہ دانت پیس کر رہ جاتا۔ آخر یہ بھی کوئی تک ہے۔ لیکن آخر وہ کر ہی کیا سکتا تھا

عجیب سماج تھا یہ . . . عجیب قوانین تھے اس کے۔ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے اور پھر وہ زیادہ دور تک سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ عجیب قسم کی مجبوری اور لاچاری نے اسے بے دست و پا بنا دیا تھا۔ اس نے سرنوں سے بات چیت کرنی چاہی لیکن سب بے سود کیونکہ اوّل تو وہ جواب ہی نہیں دیتی تھی اور اگر مجبور ہو کر جواب دیتی بھی تو بہت مختصر۔ جتنا مطلوب۔ اس کی بے رُخی دیکھ کر پالی کے حوصلے پست ہو گئے تھے۔ سارا دن گھر میں اِدھر سے اُدھر اس طرح گھومتا رہتا تھا جیسے خواب دیکھ رہا ہو یا کوئی شخص راہ گم کر کے ٹھوکریں کھاتا پھر رہا ہو۔

شادی کے دن قریب آ رہے تھے۔ وقت گزرتا جا رہا تھا، ہر پل پانی کے بلبلے کے مانند بنتا اور پھر ناپید ہو جاتا تھا۔

پالا سنگھ کو بعض اوقات یہ دیکھ کر تعجب ہوتا تھا کہ ہر شخص، ہر عورت، ہر لڑکی، ہر بچہ اپنے اپنے کام میں کتنی خوش خوش گھوم رہے ہیں۔ وہ لمحے جو پالی کے سینے پر چکی کے پتھر کی مانند اسے روندتے ہوئے گزر رہے تھے وہ ان سب لوگوں پر کچھ بھی اثر نہیں کرتے تھے۔

انسان ایک دوسرے سے کس قدر دور ہے۔

بڑے بڑے چولہے کھد گئے، انھیں گوبر اور بھس ملی مٹی سے لیپ دیا گیا۔ بڑے بڑے کندے ان میں ٹھونس کر ان میں آگ بھڑکا دی گئی اور ان پر بھاری بھرکم کڑاہے چڑھا دیے گئے۔ حلوائی بڑے بڑے کڑچھوں سے کھانڈ کا شیرہ پکانے لگے۔ چوکور مٹھائیاں اور نمکین مٹھڑیاں تلی جانے لگیں۔ ان کی خوشبو جو ہوا میں اُڑی تو گاؤں کے کالے پیلے کتوں نے بیاہ والے گھر کا رُخ کیا اور اسی کے دروازے پر بڑی بے نیازی سے اداس سنیاسیوں کی طرح دھونی رما کر ڈیرے لگا دیے۔

شگن کے روز سرنوں ایک پیڑھی پر بٹھلا دی گئی۔ سسرال سے آیا ہوا لاگ (ایک پھول دار کپڑا) اس پر اوڑھا دیا گیا۔ سنتو، ہستاں، پیارو، میتو، پریتو اور اس کی دیگر بے شمار سہیلیوں اور عورتوں نے اسے گھیر لیا۔ شگن یعنی ناریل، کھیلیں، کھانڈ کے کھلونے، کشمش، چھوہارے، بتاشے وغیرہ اس کی جھولی میں ڈال دیے گئے اور پھر سکھیاں مطالبہ کرنے لگیں کہ لاؤ ہمیں دو بتاشے، کشمش۔ سرنوں کو ان رسوم سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ پہلے تو وہ ہمجولیوں کی چہلوں سے بے پروا اور ان کے تقاضوں سے بے نیاز چپ چاپ بیٹھی رہی اور اپنی بے کیف آنکھوں سے زمین کی جانب تاکتی رہی اور جب انھوں نے بہت زیادہ پریشان کیا تو انتہائی روکھے پن سے اس نے کشمش، بتاشے جھولی میں سے نکال کر سب میں بانٹ دیے یہاں تک کہ اس کی جھولی خالی ہو گئی۔

سرنوں کے دل کی کیفیت کو سوائے رکھی کے اور کون سمجھ سکتی تھی۔

جب سرنوں پیڑھی سے اُٹھ کر سر نہوڑائے اندر والے کمرے کی جانب لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے بڑھی تو رکھی بھی ساتھ ساتھ ہو لی۔ اس نے سرنوں کا بے حس ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ اس ہاتھ کی نرمی اور لوچ نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ اب تو وہ ہاتھ سرد تھا ——— محض سرد!

اندر پہنچ کر سرنوں دھڑام سے پلنگ پر اوندھے منہ گر پڑی۔ رکھی سمجھی شاید رونے کو ہے۔ وہ کچھ دیر تک چپ چاپ کھڑی رہی پھر اس نے اس کے لمبے اور بوجھل بالوں کو ایک جانب ہٹا کر اور اس کے چہرے کا رُخ پھیر کر اپنے سامنے کر لیا لیکن رونا دھونا کہاں! اس کی آنکھوں میں نام کو بھی آنسو نہیں تھے بلکہ وہ بے رنگ اور بے کیف سی نظر آتی تھیں۔

رکھی نے اس کے رخسار پر ہلکے سے ہاتھ پھیر کر کہا۔

"سرنوں!"

سمجھ نہیں پائی اور پھر اس کے تیمار دار جانے لگی جب اس نے کوئی جواب نہ دیا تو وہ سرفوں کے خسارے پر شمار ہمیشہ پوشیدہ کر دے گی۔

اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ تو اس کی کال سمجھ کر کیا ہو گیا تھا کہ بیچاری کو کیا مصیبت تو نہیں پڑ گئی۔ وہ سمجھتی تھی کہ کہیں سرفوں اپنی جان کھو نہ بیٹھے وہ باتوں کو ایک جانب۔ اس کی شادی، جیسے انسان سے ہو، یہ تھی جو در اصل اس کا اہل نہیں تھا اور دوسری طرف اس کے عیب سے جس کے شادی وہ لا جیتی تھی سے دھوکا دیا تھا۔ ایسے نازک موقع پر اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ یہ ذکر کوئی معمولی ذکر نہیں تھا اس اعتماد کو تو کبھی اس کا دل بھلا سکتا تھا جس کے دل پر گزری ہو۔

شادی میں دو دن باقی رہ گئے تو سرفوں کو مایاں بٹھا دیا گیا۔ شادی بیاہ کے موقع پر سارا گاؤں ہر جگہ موقف رہتا ہے چنانچہ مایاں والے دن بھی کئی سہیلیاں اور رشتے دار عورتیں آن جمع ہوئیں۔ پھر رات کا کھانا کھا کر دونوں کی سہیلیوں نے گانا دیا اور پھر لڑکی کے ماموں نے ایک ایک کر کے جوڑا پہنانا شروع کیا۔ سب لوگ بڑے اشتیاق سے دلہن کو چڑھتے دیکھ رہے تھے مگر ابھی سرفوں کے چہرے پر رونق نہیں لوٹی تھی۔ شاید اس نے سر بھی نہ دھویا ہو۔ بال تو خیر خشک پڑے تھے لیکن اس کی گوری گوری بانہوں میں سرخ سرخ چوڑا سجھ جانے سے دلہن کی صورت نکھر آئی تھی۔ کئی عورتوں کے منہ سے بے اختیار تعریفی کلمات نکل گئے۔

- ماشاء اللہ، ماشاء اللہ۔ دیکھو تو کیسا اچھا سج کر آیا ہے ……

یہ باتیں سن کر جندراں پھولی نہیں سمائی تھی۔ وہ بیٹی کے دل سے قطعاً بے خبر نہیں تھی لیکن اس پر کس کا زور تھا۔ اسے کیسے معلوم تھا کہ یہ شادی ایسی افراتفری میں ہوگی۔ وہ خود ان چیزوں کے لیے کب تیار تھی لیکن حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ اس کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہیں رہا تھا۔

سرفوں اور پالی کے لیے اذیت وہ لمحے بڑی مشکل سے گزر رہے تھے یہاں تک کہ شادی کا دن آن پہنچا۔ اس روز دھرم شالہ میں بارات کے اترنے کے انتظامات مکمل کر دیے گئے۔

بیاہ والے گھر میں تقریباً سارا گاؤں جمع تھا۔ اس معاملے میں جندراں کو امید سے بڑھ کر کامیابی ہوئی تھی۔ بچے بچے کی زبان پر بارات کا نام تھا۔ بارات کب آئے گی۔ پھر اندازے لگائے جانے لگے کہ فلاں وقت تک بارات ضرور پہنچ جائے گی۔ بالآخر دن ڈھلے بارات دھرم شالہ میں پہنچ گئی۔ ان کے ناشتے کے لیے مٹھائی کے بڑے بڑے تھال اور گرم گرم دودھ کے بڑے بڑے پتیلے بھیج دیے گئے۔

براتیوں کی خاطر مدارات کرنے میں پالی بھی شامل تھا۔ اس کی حرکات و سکنات میں تیزی و تندی ضرور تھی لیکن وہ اپنا کام کیے جا رہا تھا۔ وہ خاموش تھا۔ اس کے دل کو یقین نہیں ہوتا تھا کہ یہ شادی ہو جائے گی۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے آخری وقت پر کوئی رکاوٹ پیدا ہو جائے گی کہ یہ شادی رک جائے گی۔ یہ شادی ہو نہیں سکے گی۔ کس قدر عجیب خیال تھا جو بھی کیوں کر ہو سکتا تھا۔ اس کے ذہن میں کوئی ترکیب آئی نہیں تھی۔ جہاں تک سرفوں کا تعلق تھا اسے کسی بات سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ وہ آنکھیں بند کیے سنتی تھی نہ دیکھتی تھی اور نہ کچھ محسوس ہی کرتی تھی جیسے وہ اس دنیا کی مخلوق ہی نہ ہو۔ جیسے وہ محض ایک بے جان پتھر ہو۔

رات کے وقت باراتیوں کو کھانا کھلانے کے لیے گھر بلایا گیا تھا۔ گھر کے طویل و عریض صحن میں صفیں بچھا دی گئی تھیں۔ سردیوں کا موسم تھا اس لیے یہی طے پایا کہ جس قدر جلد ہو سکے باراتیوں کو کھانا کھلا دیا جائے۔

براتیوں کی آمد بجائے خود ایک ایسا واقعہ ہوتا ہے جسے دیکھنے کے لیے لوگ بے چین ہوتے ہیں۔

بالآخر دھرم شالہ سے بارات چلی۔

جب وہ بیاہ والی گلی میں گھسے تو لوگ اپنے اپنے مکانوں کی چھتوں کی منڈیروں سے انھیں تکنے لگے۔ جب وہ مکان کے قریب پہنچے تو دیگر آدمیوں کے ساتھ پالی بھی انھیں دیکھنے کے لیے مکان سے باہر آگیا۔

باراتیوں میں لڑکے بالے جوان اور بوڑھے سبھی شامل تھے۔ گیس کی تیز روشنی میں باجے والوں کے چمکیلے ساز اور وردیاں جگمگا رہی تھیں۔ باراتی اپنی حیثیت کے مطابق اچھے اچھے کپڑے پہنے رنگین پگڑیاں باندھے تھے۔ وہ لوگ زیادہ میلے کچیلے کپڑوں میں رہنے کے عادی تھے اس لیے نئے کپڑے پہنے وہ کچھ انوکھے سے دکھائی دیتے تھے۔ ان میں سے بیشتر کے ہاتھ میں لمبی کرپان تھمی تھی۔ بعض کے پاس موٹر یا ٹرک کے اسٹیرنگ کی نالی کی بنی ہوئی بغیر لائسنس کی دیسی بندوقیں بھی تھیں بعض نے تہبندوں کے اندر دیسی ساخت کے پستول جن میں بارہ بور کے کارتوس ہی چلتے تھے اڑس رکھے تھے۔ ان کے موٹے چمڑے کے بنے ہوئے دیسی جوتے واقعی قابل دید تھے۔ سفر کی وجہ سے ان میں سے بیشتر کی چھوٹی بڑی داڑھیاں گرد میں اٹی ہوئی تھیں۔

مکان کے قریب پہنچ کر بینڈ والے تو چپ ہو گئے البتہ تھوڑی سی تیں تیں ٹیں ٹیں کے بعد ڈھولکی اور چھینے بجنے لگے اور کسی نے مینڈک کی سی ٹرّاتی ہوئی آواز میں گانا شروع کیا۔

ہم گھر ساجن آئے
ساچے میل ملائے

پالی گانے والوں کے بے تحاشا کھلے ہوئے منہ کے دہانے دیکھتا رہا۔ کس قدر بڑا پاکھنڈ تھا۔

ساچے میل ملائے

انھیں یہ کہتے ہوئے شرم محسوس ہونی چاہیئے۔ اُدھر لڑکی کا دل رو رہا تھا، اس بے چاری کے کلیجے پر چھریاں چل رہی تھیں اِدھر یہ مردود ساچے میل ملا رہے تھے۔

پالی کا جی چاہتا تھا کہ لٹھ گھما کر ان سب کے منہ توڑ دے اور انھیں اس گلی سے اُلٹے پاؤں بھگا دے۔

ایک شبد ختم ہوتا تو دوسرا شروع ہو جاتا لیکن پالی کا دھیان شبدوں کی جانب نہیں تھا۔ وہ تو محض ان کی ہلتی جلتی داڑھیوں کو دیکھ دیکھ کر ان سے نفرت کر رہا تھا۔

جب بارات کھانا کھانے کے لیے بیٹھی تو دلھن کے کھانے کی تھالی جس میں دراصل کئی لڑکیوں کے لیے کھانا موجود تھا دولھا کے پاس بھیج دی گئی۔ اس پر پچیس روپے رکھ کر تھالی واپس لوٹا دی گئی۔ دلھن نے وہ کھانا اپنی سکھیوں میں تقسیم کر دیا۔ سب کے اصرار پر کچھ کھانا خود بھی زہر مار کر لیا۔

اِدھر جب کہ باراتی کھانا کھانے میں مصروف تھے لڑکیوں نے گیت گانے شروع کر دیے اُدھر چند سہیلیوں نے سرتی کو گھیر لیا، مہندی گھول دی گئی اور سکھیوں نے زبردستی اس کے ہاتھوں اور پیروں پر مہندی رچانی چاہی تو معمولی احتجاج کے بعد سرتی ماتھے پر بازو رکھ کر چارپائی پر لیٹ گئی۔ انھوں نے اس کے ہاتھوں کی ہتھیلیوں، انگلیوں کے آگے پیچھے مہندی تھوپ دی اور پھر اس کے پاؤں کے تلووں اور اس کی انگلیوں

یہ ... جاتی ہیں -
بات پکی ہو -

دوسرے روز نشے اسی کنوارے بندھن کی رسم ادا کی گئی۔ دلہن کو نہلا دھلا کر پہنایا گیا۔ سہیلیاں اور رشتہ دار عورتیں اس کے گرد بیٹھ گئیں۔ کنوارے بال بنے اس کے بالوں میں تیل ڈالا گیا اور ہاتھوں پر مہندی لگائی گئی۔ سب کام ہو چکا تو دلہن کو سنوارا گیا اس کے بالوں کو نیا بنانے سے پہلے کرلیا گیا اور مکمل کر کے پیشانی کی ٹکی لگائی۔

جب شام ہوئی تو اس وقت تک سب کام ہو چکے تھے جب تک کہ اس کا دامن اس کے ہاتھوں کو ڈھکا رہا ہے سب بیٹھے رہے۔ جہاں پر لوگ بیٹھے ہوئے تھے بعد میں ملے جلے اور دلہن کنوارے سے ملاقات ہوئی۔

شام ہونے کے بعد دلہن کو کپڑے پہنائے گئے۔ پھولوں سے دلہن کا منہ ڈھک دیا اور پھر گجرا پہنا کر تیار کیا گیا۔ زیورات سونے چاندی کے تھے۔ دلہن کے ہاتھوں میں چار چار چوڑیاں، سر پر سونے کا جھومر، کلائیوں پر کنگن، گلے میں ہار، ناک میں نتھ، کانوں میں بندے اور جھمکے، غرض ہر قسم کے زیورات سے دلہن کو سجا کر جب دلہن تیار ہو گئی تو اس پر نگاہ نہیں ٹکتی تھی۔

پالا سنگھ نے سرتوں کو اب دیکھا تو جمال پایا کی تاب نہیں لا سکا۔

اس کے بعد دلہن کو کپڑوں میں لپیٹ کر گڑیا سا بنا کر گورو گرنتھ صاحب کے روبرو لے گئے جہاں دولہا پہلے سے بیٹھا تھا۔

اب پھر رشتہ داروں کا دور چلا۔ بالآخر دلہن کا دامن دولہا کے دامن سے باندھ دیا گیا اور اب لڑکی کے رشتے دار گرنتھ صاحب کے گرد گھیرا ڈال کر کھڑے ہو گئے۔ آگے آگے دولہا اور پیچھے پیچھے دلہن گرو گرنتھ صاحب کے چکر کاٹنے لگے۔ گھر میں بڑی بوڑھی دلہن کو حلقے میں کھڑے ہوئے آدمی باری باری سہارا دیتے تھے۔ اس حلقے میں خود پالا بھی کھڑا تھا۔ جب وہ سرتوں کے شانوں کو تھام کر آگے کرانے لگے تو سرتوں کو اس بات کا احساس ہوا کہ یہ ہاتھ میرے ہاتھ ہیں۔ آج وہ سرتوں کو اپنے ہاتھوں سے ایک غیر کے سپرد کر رہا تھا۔

ساری رسوم پوری ہو چکیں تو دلہن کے دولہا کو بھی اس کے سسرال والوں کے دوار لے جایا گیا۔ وہ شخص میانہ قد اکہرے بدن والا اور سیدھی سادی صورت کا مالک تھا لیکن وہ بھلا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ ایک گھر کے ہر قسم کی اپنی ذمہ داریاں سمجھے اور پھر انہیں پورے طور سے نبھانے والا انسان۔

یہ ساری رسوم اور واقعات جو پالا سنگھ کی نظروں سے گزرے تو وہ نڈھال سا ہو گیا اس کا دل جلنے اور ٹوٹنے لگا۔ وہ بیاہ والے گھر سے جان چھڑا کر اپنے گھر کو چلا آیا۔

دولہا کے ساتھ گاؤں کی لڑکیوں نے خوب ہنسی مذاق کیا۔ وہ سارا دن ہنستے کھیلتے گزر گیا۔ شام کو رخصتی کے وقت بھائیوں نے ہی کر ڈولی میں بٹھا دیا۔

ڈولی کے اٹھتے وقت عجب دردناک سماں بندھا۔ سرتوں اپنی سہیلیوں کو بے حد محبوب تھی۔ ہر سہیلی اس کے گلے سے لپٹ لپٹ کر روئی تھی خصوصاً ککی کو سرتوں نے اس قدر بھینچ کر گلے سے لگایا کہ علیحدہ ہونے میں نہ آتی تھی۔

بہر کیف یہ گھڑی بھی گزر گئی۔

دلہن بیاہ کے دیس کو روانہ ہو گئی۔

اس گہما گہمی میں پالا سنگھ کی سارے دن کی غیر حاضری کو کسی نے محسوس تک نہیں کیا۔

شعلی کے چلے جانے کے بعد جنداں سب سے الگ بیٹھا گھر کے اندر کی جانب تک رہا تھا..... سنسان جہاں پہلے اس کی
کی رونق ہوتی تھی اب وہاں ہو کا عالم طاری تھا۔

جنداں شیشے کے رنگ کی دیواروں کو دیکھ کر بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ وہ بچوں کے مانند دھاڑیں مار مار کر رونے لگی
اس کی آواز باہر تک سنی جا رہی تھی۔

بہ تیمل کی گاڑی سڑک تک پہنچا تھا۔ وہاں سے لاری میں بیٹھ کر شہر اور شہر سے ریل گاڑی میں بیٹھ کر رودھا کے دیس کو جانا تھا۔

بارات دوشالہ گاؤں سے ایک بیل رہ رہ نکل آئی تھی۔ رنگین کپڑوں والے آدمی ناچتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔

دفعتاً ان سے کچھ فاصلے پر ویرانے میں ایک صورت نمودار ہوئی —— وہ بالا سنگھ تھا۔

وہ اس گھڑ سواری کی جانب دیکھ رہا تھا جس سے وہ دل ہی دل میں امنگوں کی دنیا آباد کیے اپنے گاؤں کو آیا تھا اب اسی راہ سے اس کی امیدوں کا جنازہ اپنی منزل کی جانب تیزی سے بڑھا جا رہا تھا۔ ڈولی اٹھائے ہوئے کہاروں کی کالی پتلی لیکن مضبوط ٹانگیں بڑی پھرتی سے اٹھ رہی تھیں۔

لمحہ بہ لمحہ شعلی اس کی نظروں میں دھندلی ہوتی جا رہی تھی۔

ادھر وہ مجسمے کے مانند تنہا کھڑا تھا اور دوسری جانب پر اسرار چاند کھجوریوں کی اوٹ سے طلوع ہو رہا تھا۔

راجکماری پارول

رشید سعید قمی

یہ قصہ ہے ایک شہر کی جو ایک شہزادی تھی — ایک کہانی ایک رات کی بات نہیں، وہ تو صدیوں سے مشہور ہے۔ وہ تو پارول کی کہانی ہے — پارول جو کبھی کبھی شہزادی سے کہیں زیادہ نظر آتی تھی اس جاتی تھی زندگی بھر ماننے سے بیاہ کرنے کی چاہ والی ہے جو کسی مندر کی بیاہتا ہو جاتی ہے یا پھر وہ کسی گاؤں کی گلیوں میں کھیلنے والی لڑکی ہے جو رستوں اس کے کھیتوں میں مر جاتی ہے —

اب تم کو پارول پسند کرنے لگی: نانی ایک کہانی:

دن کا وقت تھا نانی اماں شال اوڑھے بیٹھیں کہ بچوں کے ساز راستہ بھول جائیں گے:

پیار کے پچھلے بند ہو گیا — بجلی کی روشنی گل ہو گئی۔ پارول کی ماں نے دیا جلا کر کھڑکی میں رکھ دیا۔

"میں نے کہا اب مزا آئے گا — اب ہماری پارول نانی کی کہانی سنے گی:

نانی اماں نے خفا ہو کر کہا تو بجلی کی روشنی ہونے پر کہانی سنائیں گی۔

میں نے کہا — نانی اماں کی کہانی تو دیے کی روشنی والی ابھی آتی ہے — بجلی کی روشنی میں تو اس کی تصویر چندھیا جائے گی:

ایک چوتھائی صدی سے ایک دو برس اوپر ہو چلا جب میں نے اس عورت کو پہلے پہل دیکھا تھا تب وہ ادھیڑ عمر کی تھی — میری ساس — خیر میری ساس تو وہ اب بھی ہے لیکن تب اس کی پیشانی پر جھریاں نہ تھیں — جیسے کھیت میں ہل چلنے سے لکیریں کھنچ جاتی ہیں ویسا کی پیشانی پر سے کوئی جھریاں پیدا کرتا ہے۔ ان جھریوں کے پیچھے پارول کی نانی اماں کا تجربہ ہے — پارول اسے نہیں سمجھ پاتی — میں کہنا چاہتا تھا کہ یہ بڑھیا ایسی ہے کہ کوئی کوکا کی تعبیر ہے — میں دماغ کی شاعر کے اس خیال تک جا پہنچی —

خونِ رگِ معمار کی گرمی سے ہے تعمیر
میخانۂ حافظ ہو کہ بت خانۂ بہزاد

بظاہر میں نے اتنا ہی کہا — پل پل بیت رہا ہے — وہ سب کی تعمیر کر رہا ہے — وہ ہمارے تجربے کو نت نیا کر رہا ہے — وہ ہمارے سانچے کو ڈھال رہا ہے — وہ اس تعمیر میں نقش و نگار کی نقاشی کر رہا ہے:

نانی کم سمجھی تھی شاید سو رہی تھی کہ دیے کی روشنی بہت کم ہے بجلی کی روشنی کا انتظار تھا۔

بڑی مشکل سے نانی اماں کے لب ہلے اور انھوں نے کہا: کون سی کہانی سنو گی پارول؟ "اب پارول کو تو کہانی چاہیے — اور جو کی

کہانی ہر بار ادھوری رہی . . .

میں نے کہا: "پارل تو آج وہی کہانی سنے گی، ادھوری چندر مکھی، راجکماری کی کہانی۔"

"وہ تو کبھی آ نے پوری سنا چکی ہوں۔" نانی اماں نے جواب دیا۔

میں نے زور دے کر کہا کہ "وہ پھر سے کیا بگڑتا ہے" ۔۔۔ میرا بس چلے تو دیپک کی روشنی میں ہی پارل کو نانی اماں کی کہانی سننے کے لیے تیار کر دوں۔

نانی اماں نے ہنس کر میری بات پر پانی پھیر دیا: "میں تو کبھی کا جی بھر جانے ہوئے بھی وہی پرانا پارل منہ سے نکالتی ہوں — دیا باقی جلے بتیس بلا ٹلے:"

"نانی سناؤ نا کہانی" پارل نے اپنی ننھی دنیا سر کرنے کے انداز میں کہا۔

میں نے کہا: "چین دیش کا ایک سیانا آدمی کہہ گیا ہے کہ اس سنسار میں ندیاں بہت زیادہ ہیں اور پل کم۔"

"تم الگ ڈگر رہے ہو" پارل کی نانی نے ڈانٹ پلائی "تم کیا سمجھتے ہو کہ پارل کہانی سن چکی — ویسے کہانی تو ندی کی بھی ہو سکتی ہے اور پل کی بھی۔"

میں نے کہا: "آج تو وہی کہانی سنے گی پارل بار دو۔ اس راجکماری کی کہانی جس کا بیاہ نہ ہو سکا۔"

"اس کا ٹکٹ لگے گا" نانی اماں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اب شروع بھی کرو نا وہ کہانی" پارو کی ماں نے سویٹر بنتے ہوئے کہا۔ "کہانی سنانا تو اتنا کٹھن نہیں جتنا سویٹر بننا۔"

"نانی اب سناؤ بھی" پارل نے نانی اماں کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

دیپک کی لو میں نانی اماں کی ناک نہ جانے کیوں اتنی اوپر کو ابھری ہوئی دکھائی دی۔ میں نے ان کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا جیسے ان کی کلپنا کی سوئی بہت پیچھے گھوم گئی ہو۔

پارل نانی اماں کے قریب ہو گئی جیسے وہ کھڑکی سے نظر آ رہے چاند کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھنا چاہتی ہو کہ چاند کی ماں اب تک چرخہ کاتتے کاتتے تھک کیوں نہیں گئی۔

نانی اماں کہنے لگیں: "بہت پہلے کی بات ہے — بہت دور دیش کی بات ہے — وہاں ایک راجہ راج کرتا تھا۔ جس نے راجکمار کا بیاہ ایک چندر مکھی سے کرنا طے کیا — روپ ایسا جیسے گلاب کی کلی — پتلی پتلی انگلیاں — نرم نرم ہاتھ — جیسے کنول کے ادھ بھرے کٹورے — من کے بھاؤ نینوں میں چھلکتے رہتے اور راجکمار کو لگتا کہ کہیں دور سے کوئی راگنی سنائی دے رہی ہو۔ ایک دن کیا ہوا جب راجکمار صبح سویرے نیند سے جاگ کر اٹھ بیٹھا تو اس نے دیکھا کہ چندر مکھی کے کمل نینوں میں وہ پہلی سی جوت اجاگر نہیں ہے — وید بلائے گئے۔ سیانے نے ہر طرح علاج کیا لیکن راجکماری کے کمل نینوں میں جوت لوٹ کر نہ آئی۔"

"جوت کہاں چلی گئی نانی؟" پارل نے ایسا پوچھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کی آنکھوں سے آج نیند غائب ہو چکی ہے۔

"پھر کیا ہونا تھا" نانی اماں کی جھریوں میں جیسے کوئی جوت جگمگا اٹھی۔

"ہاں تو راجہ نے ڈگی بجانے والے کو بھیج کر گاؤں گاؤں منادی کرائی کہ اگر کسی کو آنکھوں کی جوت لوٹانے کا گر آتا ہو تو وہ آئے اور

ہم گھٹ سے اور ہر ماتھا ٹیک پہنچے :

" یہ میری خوشی کی کوئی حد نہیں اور سے دنیا میں جیا آیا ہے " یہ کہہ کر سب رو دئے۔

ہم لوگ بیچ میں ہو کے آ رہے ہیں کہانی بند کر دوں گی " نانی اماں نے پھر سے کہانی کی بات چھیڑ دی۔

" پھر جوت آ گئی نانی ؟ " پارل مسکرائی " اور پھر راجکماری کا بیاہ ہو گیا —— ؟

" ہوا یہ کہ میری راجکماری " نانی اماں نے پارل کا منہ چوم لیا " آگے سنو ! بسنتی مالی نے راجکماری کے قریب ہو کر دو بارہ جن کی آنکھوں میں جھانکنے کا جتن کیا۔ اور جواب میں راجکماری کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کے پھول کھل اٹھے۔

راجکمار نے بسنتی مالی کا بازو تھام کر کہا " تیرا مطلب ہے کہ میں اسے پریم نہیں کرتا —— اور بسنتی کو ساتھ لے کر باہر نکل گیا۔

پھر بسنتی بولی " راجکمار جی، کچھ ایسا کوئی اور ساجھ کاری ڈھونڈ کر لاؤں " راجکمار کو یہ بات اچھی لگی اور بسنتی کو ساتھ لے کر کسی سیانے کی بات یاد آئی کہ سب سے بڑا گُر وہ ہے جو کسی پریمی کی راہ میں رکا ہے۔

" پھر نانی —— ؟ " صوفے پر بیٹھے بیٹھے پارل نے نانی کے گلے میں باہیں ڈالتے ہوئے کہا۔

" پھر راستے میں ایک جوتشی آیا اور اس نے کہا —— مہاراج ! راجکماری کی جوت بن میں رہنے والے گیانی کے پاس ہے —— جا کر اس سے تھوڑا سا امرت مانگ لاؤ —— وہ امرت راجکماری کی آنکھوں میں ڈالنے سے پھر وہی جوت لوٹ آئے گی —— اور راجکمار نے بسنتی کو ساتھ لے کر اس گیانی کی تلاش میں نکل پڑا۔

وقت کی لو تھرتھرا رہی تھی۔ نانی اماں بیٹھی تھیں جیسے انہیں زندگی کی بلندی کا پہلی طرح احساس ہو جیسے ان کا قد بیٹھے سے اونچا ہو گیا ہو۔ پارل کی ماں کو سویٹر بننے سے فرصت نہ تھی اور پارل تھی کہ نانی اماں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بیٹھی تھی۔

نانی اماں کہتی چلی گئیں " یہ گیانی اور کوئی نہیں تھا —— وہی بانسری والا تھا جو اپنی بانسری کے جادو سے راجکماری کی سوئی محبت کو جگا کر خود پیچھے ہٹ گیا تھا اور اب راجکمار کو اس بات کا علم نہ تھا۔

کمار نے پوچھا " آپ کے جیون میں کیا ہے بھگوان ؟ "

اور پرم گیانی نے جواب دیا " پریم اور آنند "

راجکمار بولا " میں تو امرت کی چند بوندیں چاہتا ہوں اپنی ہونے والی رانی کی آنکھوں میں ٹپکانے کے لیے "

گیانی بولا " اس امرت کا تو مول دینا ہو گا "

راجکمار نے پوچھا " کیا مول لو گے —— ؟ "

گیانی نے مسکرا کر کہا " ایک بوند پریم کے بدلے دینا ہو گا —— اور ایک بوند آنند کے بدلے اپنا سارا گھمنڈ "

راجکماری بے بس ہو گئی۔ بولی: "اسے صورت اتر اپنے راجکمار کے پیچھے تو راجہ بھی ٹیک نہیں کر سکتا —!"
کہتے کہتے نانی اماں چپ ہو گئیں۔ پارل نے جھٹ کہا: "آگے چلو نانی!"
"راجکمار نے حکم دیا کہ اس ایک منگتے گیانی کے ہاتھ پاؤں باندھ کر جنگل میں ڈال دو۔"
"ہوں!" میں نے ہنکارا بھرا۔
پارل میرے قریب آ گئی — جیسے اس نے مجھے بھی منگتے کے روپ میں دیکھ لیا ہو —
پارل کی ماں نے ہنس کر کہا: "نانی اماں کی کہانی تو سو لاکھ کی ایک ہی کہانی ہے جیسے یہ ایک نالا ہو اور ان گنت صدیوں سے گاتا
میں بہتی ہو اور ہم تک پہنچی ہو۔"
میرے کمرے میں مسلسل کی کھڑکیوں والی نانی اماں آج رفاقت اور پیار کے سنگم پر ایک مورتی کی طرح بیٹھی تھیں — میری کلپنا میرے
سنی اور اس تقریر کی طرف گھوم گئی کہ لوک کتھا کہنی ایک رات کی بات نہیں —
نانی اماں کی شخصیت میرے تصور پر چھائی ہوئی تھی — انھیں بھانت بھانت کی کہانیاں یاد تھیں۔ وہ جب بھی کوئی کہانی سناتیں اس میں
نئی تعمیر کا موقع رہ جاتا۔ کہانی کے ڈھانچے کو وہ جتنا چاہتیں لمبا کرتی جاتیں جیسے وہ اپنے چرخے پر سوت کا لمبا تار نکال رہی ہوں — کہانی ان کی گود
میں پلی تھی، اس کی آرتی اتارتیں، اسے پانی پلاتیں — ایک کہانی کی رسے وہ جیسے سو سو رسے جوڑتی جاتیں۔
مجھے یاد آیا کہ ریڈیو پر نشر کی ہوئی تقریر میں یہ بھی تو کہا گیا تھا کہ لوک کتھا تاریخی اوراق کا درجہ رکھتی ہے۔
پارل کی آنکھوں میں نیند کا بوجھ آ چلا تھا۔ وہ صوفے پر لیٹ گئی — شاید اس نے سوچا کہ کہانی ختم ہو گئی — اس نے دوبارہ اٹھ کر
بیٹھنے کی کوشش کی لیکن معلوم ہوتا تھا کہ اب جاگتے رہنا اس کے بس کا روگ نہیں —
بہت جلد پارل سو گئی اور اس کی ماں ہنس کر بولی: "چلو پارل تو سمندر کی آگ بجھانے چلی گئی —" پارل کی نانی اماں نے پوپلے
منہ سے قہقہہ لگایا۔

میں نے کہا: "میں تو آج پوری کہانی سنوں گا۔"
"اے بیٹا مجھے اب ہلکان نہ کرو۔" پارل کی نانی اماں نے ٹالنا چاہا۔
"چلو سنا دو ماں!" پارل کی ماں نے ہنستے ہنستے میری سفارش کی۔
"اچھا تو آج تم بھی پارل بن گئے۔" نانی اماں ہنس پڑیں۔
میں نے کہا: "تمہاری کہانی کے بدلے میں ایک کہانی سنا کر چکا دوں گا۔"
"تو پہلے تم سنا دو وہ کہانی — پیچھے مکر گئے تو میں کس سے شکایت کروں گی۔"
"تو لو ایک کہانی!" میں مسکرایا۔
"ہوں!" نانی نے ہنکارا بھرا۔
میں نے بڑے رکھ رکھاؤ کے ساتھ صوفے سے ٹیک لگائی اور کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہنا شروع کیا —
"یہ کہانی بہت پرانی ہے — کوہ قاف کی کہانی ہے — ایک پری کی کہانی بس یہ سمجھ لو کہ سامنے کوہ قاف کی ایک جھیل ہے —

کھڑکی کے کواڑ سے لگی ہے، ہماری طرف دو بچے پر جھک رہے ہیں اور ان کے ساتھ ساتھ [illegible] جن کی انگلیاں [illegible] ہوئی ہیں جنہیں نے
[illegible] کیا ہے کہ ہوا بہ سرخ کو کوئی ہیں گر گئیں۔ اس جیل میں ہر کسی تی تھی جو ایک نالا اور اس نالے میں [illegible] برسے [illegible] جیسے
[illegible] سب پیچھے کر اس کی [illegible] سے ہیں رہتے [illegible] دیکھ رہی ہوگی:

"پھر کیا ہوا؟" نانی اماں نے چنکارا بھرا۔

"اماں اب تو پارل بڑی ہو گئی۔" پارل کی ماں نے قہقہہ لگایا۔

میں نے کہا: "کیوں، اب اگر نانی اماں پارل ہو جائیں ——— نانی اماں کی بھی تو کوئی نانی اماں رہی ہوں گی اور پھر لوک کتھا کوئی ایک بات کی بات تو نہیں ——— سنتری سنتری لوک کتھا ہے ——— کل ماں اور راگنی کی پیاسی پیاری ——— شاید پارل کی نانی اماں کوہ قاف کی اس لوک کتھا سے سات پاتال میں اتر کر کوئی نیا مطلب ڈھونڈ رہی تھیں:

"اے بیٹا! جب تو اُن پر چڑھ جو اب ——— اب اس جملے ہی میں ہیں کہ سات روں کی آتا ہے جو سات پاتال میں؟"

"یہ تمہیں کہانی نہیں سنا رہی گئے۔" پارل کی ماں ہنس پڑی۔ نانی اماں کی کہانی تو کوئی نانی اماں ہی سنا سکتی ہے۔

"تمہارا مطلب ہے مجھے کوہ قاف کی وہ کہانی نہیں آتی؟ تمہیں تو دیکھ لیا اور میں نے پارل کی ماں کی طرف دیکھ کر کہا: "تم یہ کیوں بھول جاتی ہو کہ میں نے پارل کا نام ایک لوک کتھا سے ہی لیا ہے۔"

"مجھے پارل نام بالکل ناپسند ہے" پارل کی ماں جھنجھلا کر بولی۔ "تم نے شروع میں بتایا ہوتا کہ پارل کے ساتھ وہ منحوس سی لوک کتھا جڑی ہوئی ہے تو میں ہرگز یہ نام نہ رکھنے دیتی۔ بھلا کوئی بات ہوئی کہ بنگال کی لوک کتھا کی اس لڑکی کا نام پنجاب میں لا کر اتنی پیاری باتیں کرنے والی لڑکی کے ماتھے باندھ دیا جائے۔"

"وہ کون سی کہانی ہے؟" پارل کی نانی اماں نے اچنبھے سے پوچھا۔

"اب تم فیصلہ کر لو کہ پہلے کوہ قاف کی کہانی سناؤں یا بنگال کی وہ کہانی جس سے پارل کا نام لیا گیا؟"

"پہلے بنگال کی سناؤ۔" نانی اماں مسکرائیں۔

"وہ کہانی تو بس اتنی سی ہے کہ ایک سوتیلی ماں نے اپنی سوت کی اکلوتی بیٹی اور سات بیٹوں کو مار کر کہیں دور گڑھے میں پھینک دیا تھا۔ وہ لڑکی ایک پیلا ارپوما بن گئی جس پر پارل کے سفید پھول کھلتے تھے ——— اور سات بھائی چمپا کے سات پودے بن گئے۔ بنگال میں نانی اماں کے منہ سے اکثر وہ بول نکل جاتا ہے ——— سات بھائی چمپا جاگو ——— کیسے بہن پارل جاگو ——— مطلب یہ کہ پہلے پارل آواز دیتی ہے: سات بھائی چمپا جاگو ——— اور اس کے جواب میں سات بھائی چمپا پوچھتے ہیں: کیوں بہن پارل تم ہمیں کاہے کو پکار رہی ہو؟ اب پارل نام مجھے اس لیے اچھا لگا کہ لوک کتھا کی وہ لڑکی مر کر بھی مری نہیں تھی۔"

"میرا بس چلے تو پارل نام بدل ڈالوں۔" پارل کی ماں نے سوتی پارل کا منہ چوم لیا۔ "اتنی پیاری بچی اور یہ منحوس سا نام۔" اور اس نے دوبارہ پارل کا منہ چوم لیا۔

نانی اماں ہنس کر بولیں: "سوتے ہوئے کا منہ چومنا بھی کیا۔ منہ چومنے والے کو مزا آئے تو تب جب کہ لطف حاصل ہو جس کا منہ چوما جائے۔ پارل جاگ رہی ہوتی تو میں اس کا منہ چوم لیتی اور اسے پارل پھول والی کہانی سناتی۔"

پارل کی ماں نے ہنس کر کہا "میں تو سمجھی تھی یہ نام بدل ڈالتی۔" "مشکل تو یہ ہے کہ وہ کہانی سُنا کر انھوں نے پارل کر ہی باندھ کر دیا۔ اب مجھے دوسرا نام پسند نہیں۔"

"کہانی کی ایسی ہی بات ہے بیٹی" نانی اماں نے دیے کی لٹکاتی لَو کے قریب آنکھیں لے جا کر کہا "پارل جس کا ایک سپنا تھا جو جاگتی بڑی ہے۔ کہانی کی راجکماری مر کر بھی پھولدار پودا ہو جاتی ہے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ آدمی اپنا روپ پہچان لے۔ ایک کہانی اور دوسری کہانی میں بھی فرق ہو گا ——— کیوں میں کچھ جھوٹ کہتی ہوں؟ پرمیشور جانتا ہے کہ میں نے اپنا جیون کہانیوں میں ہی گزار دیا۔"

"کچھ بھی ہو ——— میں تو یہ نام بدل کر چھوڑوں گی۔"

پارل کی ماں نے پارل کی آنکھوں پر جھک کر کہا "کیسے سو رہی ہے جیسے کوئی سپنوں میں کھو گئی ہو۔"

"اب وہ کوہ قاف کی کہانی سُنا دو نا بیٹیا" پارل کی نانی اماں نے مُسکرا کر بولیں۔

"ہاں تو گھور اندھیرے میں رہتے رہتے کوہ قاف کی اس جھیل کی وہ راجکماری پارل اوب گئی۔"

"راجکماری پارل!" پارل کی ماں نے چونک کر کہا "اسے بھی تم نے جنگل کی کسی ٹھنڈی چھاؤں والا نام دے ڈالا۔"

"اب سُنو تو" میں نے زور دے کر کہا "نام بہا کیا رکھا ہے؟ ہاں تو کوہ قاف کی اس جھیل کی راجکماری پارل نے تو تھک کر جھیل کی ٹہنیوں پر چہکنے والے پنچھیوں سے کہا میرے لیے روشنی کی ایک کرن تو لے آؤ۔ پنچھیوں نے یہ بات اَن سُنی کر دی۔ راجکماری پارل روہانسی ہو کر پنکھ پھڑپھڑاتے ہوئے بولی "روشنی کے پہاڑ سے میرے لیے روشنی کی نھی نھی کوئی پیاسی سی کرن لیتے آؤ۔" اب کے پھر پارل راجکماری کی التجا گویا پتھر کی طرح جھیل میں ڈوب گئی۔ ایک دن شام ہوتے ہی پروانوں کی ایک ٹولی آئی۔ راجکماری پارل بولی تم میں سے جو کوئی بھی میرے لیے روشنی کی کرن لیتا آئے گا، میں اسی کے ساتھ بیاہ کر لوں گی۔"

"پھر کیا ہوا؟" نانی اماں چپ نہ رہ سکیں۔

"پھر کیا ہونا تھا پروانے چاروں کھونٹ پھیل گئے اور ہر دیے پر جل جل کر راکھ ہونے لگے۔"

"ہوں" پارل کی ماں بھی ہنکارا بھرے بنا نہ رہ سکی۔

"اچھا تو تم بھی رس لے رہی ہو۔ دن مہینے برس بیتتے چلے گئے۔ برس اور صدیاں نہ جانے کتنے جُگ بیت گئے ——— ایک بھی پروانہ راجکماری پارل کی خاطر کے کسی کونے پر روشنی کی کوئی کرن نہ لا سکا۔"

"پھر کیا ہوا؟" نانی اماں نے بڑی بیتابی سے پوچھا۔

"ایک دن ایک جگنو نہ جانے کہاں سے اس جھیل کے کنارے آ پہنچا ——— راجکماری پارل کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا ——— اس نے پیار سے بانہیں پھیلاتے ہوئے کہا "جُگ جُگ جیو جھم جھم آؤ ——— آؤ میرے پروانے ——— آخر تم میرے لیے روشنی کی کرن لیتے آئے" لیکن جگنو بیچارہ راجکماری پارل کی بات کیا سمجھ پاتا ——— اب وہ راجکماری پارل کی بانہوں میں تھا ——— راجکماری پارل نے اس کے ساتھ بیاہ کر لیا اور [illegible] سکھ سے گزرنے لگی ——— ادھر بیچارے پروانوں تک راجکماری پارل اور جگنو کے بیاہ کی خبر کون پہنچاتا ——— پروانہ تو آج بھی دیے کی لَو پر جل کر راکھ ہونے کو تیار رہتا ہے ——— اس کے من میں ایک ہی اُمنگ ہے کہ وہ کسی طرح دیے کی لَو لے اڑے اور راجکماری کی شرط پوری کر کے اس سے بیاہ کر لے۔"

پارل کی ماں نے ننھی پارل کا منہ چوم لیا ——— دیے کی لَو پر پروانے بھسم ہو رہے تھے۔

تو کالونی سے چلی جاتی ... پارو کی نانی اماں کو غم سا ہو گئیں۔ جگل ... پارل کو ... [illegible] اور ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی ... جب راجکماری ... [illegible] ... [illegible] ... [illegible] ... جیسے ... [illegible] ... جو آج تک سمجھ سے باہر ہیں۔

"پھر کیا ہوا؟" پارل کی ماں جیسے کچھ دور سے بول رہی ہو۔

"پھر کیا ہوا ہے۔ نانی اماں نے کہانی کو آگے بڑھایا۔ راجکمار کے سفر کی ... کر کے ... [illegible] ... اور پھر راجکمار ایک سر ... [illegible] ... راجکماری ..." کہتے کہتے پارل کی نانی اماں چپ ہو گئیں۔

"پھر کیا ہوا؟" میں نے بڑی بے تابی سے پوچھا۔

پارل کی نانی اماں نے بات کا رخ بدل کر کہا: "کوہ قاف کی اس جھیل کی وہ راجکماری پارل تو کبھی نہ روتی ہو گی۔"

"وہ کیوں روتی؟" پارل کی ماں بول پڑی۔ "... اس کا تو بیاہ ہو گیا ——— اور پھر بچا بیاہ تو ایک بار ہی ہوتا ہے۔"

"پھر پروانوں کو اس لیے بیاہ کی خبر کیوں نہ ملی؟" پارل کی نانی اماں نے جیسے دونوں کو سمجھاتے ہوئے کہا: "پروانے ... سے تو راجکمار پارل کے ... دوستی کی ... سے جانے کے ... آج تک جل رہے ہیں۔ جگنو نے پروانوں کو دھوکا دیا ——— اس دھوکے کا راجکماری پارل کو پتہ چل گیا ہے تو وہ ... پروانوں کے لیے روتے روتے اندھی ہو جاتی۔"

"اس کو چھوڑو۔" میں نے کہا: "دونوں کہانیاں الگ الگ ہیں۔"

"میں تو الگ الگ نہیں مانتی۔" پارل کی نانی اماں نے گمبھیر ہو کر کہا: "میں تو ... ماں کے ہاتھوں ... [illegible] ... کہانی کو بھی اسی کہانی کی ایک کڑی سمجھتی ہوں ——— میری اس کہانی کی ... [illegible] ... راجکماری ... [illegible] ... راجکماری اندھی ہو گئی۔" پارل کی ماں سوتی پارل پر جھک گئی اور پھر میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی: "ان کی عقل نہ جانے کہاں چرنے چلی گئی تھی جب انھوں نے اپنی پیاری لڑکی کا نام پارل رکھ دیا۔"

میں نے کہا: "جب بیاہ بجھ جائے گا اور ... پارل جائے گی اس وقت ... [illegible] ... جیسے ... [illegible] ... راجکماری تھا۔ بار کمل ... ہے پارل راجکماری کی انگلی پکڑ کر میں بہت دور تک چلوں گا ——— میرا تو خیال ہے کہ میں چپ ہی رہوں گا اور میں تو پارل راجکماری کی طرح مر مر کر ......"

"ارے بیٹا ایسا بول منہ سے نہیں نکالتے۔" نانی اماں نے ... انداز میں ... [illegible] ... تم جگ ......"

اتنے میں بجلی آ گئی اور تھوڑی دیر بعد ریڈیو بجنے لگا۔

پارل راجکماری سوتے سوتے بڑبڑا رہی تھی جیسے سمندر کی آگ بجھانے کے بعد اب مچھلیوں کی راجکماری سے اپنا تعارف کرا رہی ہو۔

مومی مورت

صالحہ عابد حسین

بھری ایک سرد و سیاہ رات تھی۔ آسمان پر گھنگھور گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ تابناک تاروں اور پورن ماشی چاند کے روشن چہرے کو سیاہ بادلوں کی نقاب نے چھپا رکھا تھا۔ کبھی کبھی بجلی زور سے تڑپتی تو اس کی تیز چمک دھرم پور کے چھوٹے سے اسٹیشن پر بیٹھے ہوئے مسافروں کے خوف زدہ، خوف سے تنے ہوئے چہروں اور ٹھٹھرے ہوئے جسموں کو نمایاں کر دیتی اور دم بھر میں پھر وہ اسی تاریکی کا جز بن جاتے ——— صرف اسٹیشن ماسٹر کے کمرے سے نکلتی ہوئی دھیمی روشنی کا دھندلا سا عکس البتہ کچھ مسافروں کے پیروں کو اجاگر کر رہا تھا۔ کبھی کبھی کسی کی دبی دبی کراہ یا بیزار بڑبڑاہٹ اس خاموشی کو توڑ دیتی تھی۔

زور کا ایک تڑاخا ہوا ——— بجلی کی ایک لہر چلتے ہوئے پلیٹ فارم پر بیٹھے لیٹے کھڑے مسافروں کے طرح طرح کے چہروں کی جھلکیں دیتی ہوئی نکل گئی اور ساتھ ہی بادل کی زور کی کڑک نے دلوں کو ہلا دیا ——— کڑک کی آواز میں ملی ہوئی ایک نسوانی چیخ فضا میں گونج گئی۔ بعض مسافروں نے چونک کر اپنے ارد گرد دیکھا........ مگر آواز پلیٹ فارم کے آخری کونے سے آتی معلوم ہوتی تھی ——— اس لیے پھر سب سکڑ کر لپٹ کر، بیزار ہو کر اونگھنے لگے۔

ایک بڑے سے بکس پر بیٹھا ہوا کوئی مسافر کھڑا ہو گیا ——— دھیمی سی آواز میں اس نے کہا: "خان صاحب ——— میں ذرا ادھر جا کر دیکھوں کس کی چیخ تھی یہ........!" اور قدم آگے بڑھ گئے۔

"بابو جی ——— میں بھی چلتا ہوں" دوسری بھاری آواز نے کہا اور ایک لمبا تڑنگا ہیولا زمین پر سے اٹھ کھڑا ہوا تو ——— ایسا معلوم ہوا جیسے سارے پلیٹ فارم پر چھا گیا ہو...... اور آگے جانے والے کے پیچھے لپکا۔ خاموشی اور اندھیرے میں سبک قدموں کی چاپ کے ساتھ ساتھ فوجی بوٹوں کی دھمک عجیب سی معلوم ہو رہی تھی۔

بجلی پھر چمکی ——— اور چند گز پرے زمین پر پڑی ایک گٹھڑی میں سے ایک دردناک کراہ کی آواز پھر سنائی دی "آ۔ آ ——— عورت ہے" لپک کر آگے بڑھی اور گٹھڑی پر جھک کر آہستہ سے بولی "کیوں جی ——— تم کون ہو ——— تمہیں کیا تکلیف ہے؟"

ایک دلدوز کراہ کے سوا کوئی جواب نہ تھا۔

وہ اور جھکی اور منہ سے چادر ہٹانے لگی ——— دور کہیں بجلی کی چمک ہوئی اور اس روشنی میں ایک نوجوان عورت کا چہرہ نظر آیا جو کرب سے

چہرہ بالکل سفید پڑا ہوا تھا اور بڑی بڑی سیاہ آنکھیں کچھ ایسی معلوم ہوتی تھیں کہ باہر نکل پڑیں گی ـــ بس ایک پل کے لیے بڑی مشکل سے اس نے اپنی بات کہی ـــ

صاحب کرو اس کے پاس بیٹھی اور بے چین ہو کر پوچھا "بہن ـــ بہن ـــ کچھ تو بولو ـــ تمہیں کیا تکلیف ہے ـــ؟"

اس نے جواب دینا چاہا ـــ "میں ـــ میں ـــ آہ ـــ" الفاظ ہونٹوں پر ہی رک گئے اور ایک کرب کے عالم میں اس کا سارا جسم تڑپنے لگا ـــ عورت نے اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا تو اس کی انگلیاں اتنے زور سے کھنچی ہوئی تھیں جیسے بے شمار کھنچاؤ میں رسے ہیں ـــ پھر جیسے ایک سخت ہاتھ اس کے نرم و نازک ہاتھ میں تھا ـــ اس نے گھبرائی آواز میں پکارا "حافظ صاحب ـــ یہ بیچاری شاید بیہوش ہے ـــ ذرا لپک کر جاؤ اور ہسپتال کی ڈاکٹر یا نرس کو تو لے آؤ ـــ جلدی ـــ"

"اور آپ یہاں اکیلی ڈر جائیں گی نہیں؟"

"وقت ضائع مت کرو ـــ جلدی جاؤ ـــ"

وہ ادھر بھاگے ـــ بجلی پھر تیزی سے اسٹیشن کی ٹین کی چھت پر اور بوندیں ٹپ ٹپ ـــ اس کے دل کی دھک دھک کا مقابلہ کر رہی تھی ـــ اس نے دیکھا کہ رضیہ کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں ـــ وہ بیہوش نہیں معلوم ہوتی۔

"بہن ـــ ذرا سنبھلو ـــ مجھے بتاؤ تو تمہیں کیا تکلیف ہے ـــ کہیں درد ہے ـــ ہوا لگ رہی ہے ـــ؟ بخار ہے ـــ؟"

"آہ ـــ کیا بتاؤں ـــ مجھ بہن ـــ بہت ـــ میرے ـــ درد ـــ ہو رہا ہے ـــ"

"کہاں ـــ سینے میں؟"

"نہیں ـــ پیٹ میں ـــ آہ ـــ اوہ ـــ"

"کیا تم بالکل اکیلی ہو بہن ـــ کوئی ساتھ نہیں ـــ؟"

"نہیں میرا ـــ کوئی ـــ نہیں ـــ اس دنیا میں کوئی نہیں ـــ"

اور درد و کرب کی پھر ایک تیز لہر آئی ـــ اس کے ہاتھ جو چند منٹ کے لیے نرم پڑ گئے تھے پھر اکڑنے لگے اور دوسری عورت کی انگلیاں اس کے ہاتھوں کی گرفت میں اس طرح آ گئیں جیسے شکنجے میں کس دی جاتی ہیں ـــ خود اس کے منہ سے بھی ہی آہ نکل گئی ـــ وہ حیران تھی ـــ یہ کیسا درد ہے ـــ کیسی تکلیف ہے!

چند سیکنڈ بعد اس کی انگلیاں رضیہ کی گرفت سے آزاد ہوئیں تو اسے ایسا لگا جیسے دو چار چوٹ لگی ہوں ـــ مگر اس وقت اپنی انگلیوں کی فکر کا وقت کہاں تھا ـــ اس نے دوبارہ پوچھا "بہن مجھ پر بھی نہیں ـــ کیسا درد ہے یہ ـــ کب سے ہے ـــ" جواب سننے کے لیے اس پر بالکل جھک گئی تھی ـــ شرم اور درد اور بے کسی میں ڈوبی ہوئی ایک آواز اس کے کان میں آئی "درد ـــ آہ کیا بتاؤں ـــ میں ـــ مجھے ـــ میں ـــ بدبخت ـــ آہ ـــ بہن ـــ مجھے ـــ درد ـــ درد ـــ لگے ہیں ـــ"

ایک منٹ کے لیے اس کا دماغ چکرایا ـــ "درد لگے ہیں؟ درد لگے ہیں؟ کیا مطلب؟" اور بجلی کی تڑپ کے ساتھ اس کے دماغ میں ادراک کا ایک کوندا لپکا اور ساری حقیقت اس کی سمجھ میں آ گئی۔

اسی وقت خانصاحب ٹارچ اور کمبل لے کر پہنچ گئے۔

لپک کر اس نے کمبل لیا اور تڑپتی عورت کو چاروں طرف سے اس میں لپیٹ کر جھک کر اس سے بولی "بہن [illegible] اللہ مالک ہے —— دیکھو میں ابھی کچھ انتظام کرتی ہوں ——"

وہ اپنے سامان کی طرف واپس پہنچی۔ چاروں طرف ٹارچ کی روشنی ڈال کر دیکھا۔ پلیٹ فارم پر زیادہ مسافر نہ تھے —— [illegible] بیٹھے یا لیٹے اونگھ رہے تھے۔ ایک کونے میں ایک اپنے پرانے سے بکس کا سہارا لیے پہلے سے بڑھتی ہوئی خنکی سے ایک عورت [illegible] ہوئے دیکھا تو لپک کر اس کے پاس پہنچی اور اس کا شانہ ہلایا۔ "اے بہن ذرا اٹھنا۔"

کھردرے لہجے میں چونک کر جواب ملا "کیا ہے بی بی؟ کیوں مجھے سوتے سے جگا دے رہی ہے —— واہ ——"

"دیکھنا بہن —— وہ ادھر —— اس کونے میں —— ایک عورت بیچاری بیمار ہے —— میں اس کے لیے کچھ انتظام کرنے جا رہی ہوں اتنی دیر تم اس کے پاس جا بیٹھو بہن ——" اس نے خوشامد کے ساتھ کہا۔

"استغفار —— میں نا جاؤں —— جانے کون ہے کون نہیں —— پھر اللہ جانے کون بیماری ہوا ——"

اس نے جھک کر کان میں کچھ کہا۔ عورت کے لہجے میں فوراً تبدیلی آگئی "ہے ہے —— توبہ توبہ —— بیچاری —— اس کے ساتھ کوئی تو ہوگا نا ——؟"

"کوئی بھی نہیں اس کے ساتھ تو —— اور ابھی بالکل نوعمر ہے۔ مشکل سے ۱۸، ۱۹ برس کی ہوگی ——"

"بہتر —— —— اور برقعہ سنبھالتی عورت کھڑی ہوگئی۔ "یہ تو بڑا مرے سے سو رہا ہے ——" اس نے مولی دو سوتی میں لپٹے ایک دیہاتی مرد کی طرف عجیب انداز سے دیکھا ——

"وہ ادھر اس کونے میں چلی جاؤ۔"

برقعہ والی سٹرپٹر سلیپر گھسیٹتی اس طرف روانہ ہوگئی۔

خانصاحب پیچھے کھڑے غور سے اپنی مالکہ کو دیکھ رہے تھے۔ آخر یہ کرنا کیا چاہتی ہے —— وہ چند لمحے ماتھے پہ ہاتھ رکھے جیسے کچھ سوچتی رہی اور پھر پلٹی۔ "چلو خانصاحب اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں میرے ساتھ۔"

"اسٹیشن ماسٹر بڑا کھرا سا آدمی ہے بی بی —— وہاں جا کر کیا کرنا ہے ——" ہم دو بار جا کر خوشامد کیا —— کہا ہماری بی بی جی سردی میں سکڑ رہا ہے —— پر —— سالا مانتا ہی نہیں —— فرسٹ کلاس کا ٹکٹ مانگتا ہے۔"

اس نے خان کی بڑبڑاہٹ پر کوئی توجہ نہیں دی اور تیزی سے اس کمرے کی طرف بڑھی جس میں سے روشنی کی پتلی سی لکیر اس انداز سے نکل رہی تھی جیسے کسی مایوس دل میں آشا کا مدھم سا دیپک ٹمٹما رہا ہو۔

"کیا میں اندر آسکتی ہوں؟"

پرانی وضع کی ایک لمبی سی آرام کرسی پر نوجوان اسٹیشن ماسٹر پڑا اونگھ رہا تھا اور برابر کی میز پر ایک اندھی لالٹین ٹمٹما رہی تھی۔ کسی عورت کی نرم رسیلی التجا آمیز آواز نے جیسے اس کے کانوں میں رس گھول دیا —— دل میں گدگدی ہونے لگی —— اس وقت —— آدھی رات کو یہ کون ہے جو اس کے دل کے دروازے پر دستک دے رہی ہے۔ جوش اور مسرت سے کانپتے لہجے میں اس نے کہا

"کھٹ... کھٹ... کیجیے — مہربانی — دروازہ کھولیے :"

پشت کھڑکی کے شیشوں والا دروازہ کھلا اور گھسا تو وہ شیشی کو توڑ کر بڑبڑا کر ہوگئے، اور اس کی مدھم روشنی میں سفید ساڑھی میں ملبوس ایک نازک اندام عورت ہاتھ جوڑے کھڑی تھی۔ اس کی جھلک اسے ایسی لگی جیسے آسمان سے کوئی اپسرا اتر آئی ہو — وہ ہکا بکا رہ گیا۔ "آؤ آؤ — اندر آجاؤ — کیوں کھڑی ہو — اس آرام کرسی پر بیٹھ جاؤ" لہجے میں ایسا کھلا پن تھا جیسے کسی کو کسی اور وقت شاید وہ اس سے نہ بچا سکتا — مگر اس وقت تو اسے کسی بات کا بھی ہوش نہ تھا — وہ چند لمحے آگے بڑھی "دیکھیے باہر بہت سردی ہو رہی ہے — سب مسافر پریشان ہو رہے ہیں"

"ابھی تمہیں اور مسافروں سے کیا مطلب — تمہارے لیے یہ کمرہ حاضر ..." اور ٹھیک اسی وقت اس کی نظر دروازے میں کھڑی ایک چھ فٹ کی شکل پر پڑی۔ ماتھے پر بل آ گئے، آواز میں کاروباری کرختگی پیدا ہو گئی۔

"کیا کام ہے تم لوگوں کو؟" اس نے پہچان لیا کہ یہ وہی شخص ہے جو دو بار پہلے بھی اس سے آکر جھگڑ چکا ہے۔

خان نے کرخت لہجے میں کہا: "بابو جی ذرا باہر نکل کر دیکھو کیسی سخت سردی پڑ رہی ہے، ہوا لگے کہ پار ہوئی جاتی ہے — لو اب تو اولے بھی گرنے لگے ہیں — جلدی سے کمرہ کھلواؤ — نہیں تو پھر — میں بھی پٹھان کا پُوت ہوں :"

"کیا بک بک لگائی ہے — آیا بڑا پٹھان کا پوت — ویٹنگ روم صرف فرسٹ کلاس پسنجر کے لیے ہے — ہر ایرے غیرے کے لیے نہیں ..." اور وہ پھر اپنی آرام کرسی پر دراز ہو گیا۔

"سنیے تو سہی — باہر ایک عورت —" عورت نے اسے نرمی سے مخاطب کیا۔

"ابھی میں کسی عورت وورت کو نہیں جانتا — قانون تو قانون ہی ہے :"

عورت غصے میں دو قدم اور آگے بڑھ گئی "بابو صاحب! قانون آدمی کے لیے بنا ہے — آدمی قانون کے لیے نہیں بنا ہے — میں اپنے لیے ویٹنگ روم کھلوانا نہیں چاہتی — بلکہ باہر ایک بے کس عورت بیمار ہے — سردی اور ہوا میں وہ مر جائے گی — اس کے لیے کمرے کی اشد ضرورت ہے —"

"اس کا ٹکٹ ....؟"

"اس کا ٹکٹ غالباً تھرڈ کا ہے — مگر اسے فوراً کسی گرم اور بند جگہ پہنچانا ہے ......"

"ہوں — پر میں اس کے لیے کیا کر سکتا ہوں بھلا؟"

"بابو صاحب — وہ — وہ عورت — اس کی حالت بہت خراب ہے — میرا مطلب ہے کہ ......"

"جی ہاں! میں آپ کا مطلب سمجھ گیا — وہ بیمار ہے اور مجھے اس کی تیمار داری کرنی چاہیے" لہجے میں سخت طنز تھا "لیکن آپ بھولتی ہیں کہ میں سرکاری افسر ہوں کسی اسپتال کی نرس نہیں — میرا فرض صرف اپنی ڈیوٹی ادا کرنا ہے"

"آپ سمجھے نہیں" اس نے اب بھی ہمت نہیں ہاری اور بڑی مشکل سے وہ الفاظ جو کسی طرح اس حقیر اور بے غیرت مرد کے سامنے اس سے ادا نہیں ہو رہے تھے — اس نے کہہ ہی ڈالے "آپ سمجھے تو اس کے بچہ ہونے والا ہے — درد — شروع ہو گئے ہیں —"

بابو صاحب کے ہونٹوں پر ایک نفرت بھری طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی: "ہوں ــــ یہ ہونے والا ہے ــــ [illegible] ہو گئے ــــ بات یہ ہے کہ یہ زچہ خانہ نہیں اسٹیشن ماسٹر کا کمرہ ہے۔"

"تم انسان نہیں حیوان ہو ــــ تمہارے سینے میں دل نہیں پتھر ہے ــــ" خفیف سی اس کی آواز آتی [illegible] پاؤں گھٹے ہوئے تھکی مسافر چونک پڑے۔ "بے حس ــــ بے درد ــــ ایک بیکس عورت انسان کو جنم دینے کے لیے موت سے [illegible] ایڑیاں رگڑ رہی ہے ــــ ہر طرف سردی، ہوا تیز ہے ــــ اور تم یہاں کھڑے مجھ سے قانون بگھار رہے ہو ــــ شرم نہیں آتی تمہیں؟"

بابو صاحب کا چہرہ اترا سا نکل آیا ــــ بیچارے نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ کوئی عورت کسی مرد کو اس طرح ڈانٹ بھی سکتی ہے ــــ

"کھولو ابھی ویٹنگ روم ــــ ورنہ دو جانوں کا خون تم پر ہوگا اور تمہیں جیل پہنچانے کا فرض میں انجام دوں گی ــــ" اس کی آواز میں حکم بھی تھا اور دھمکی بھی!

بابو کا چہرہ پہلے سرخ، پھر سفید اور پھر زرد پڑ گیا۔ ایک لفظ بولے بغیر اس نے میز کی دراز سے ایک موٹی سی زنگ خوردہ چابی نکال کر زور سے پھینکی جو خان کے قدموں میں جا کر گری اور اس نے جھک کر فوراً ہی اسے اٹھا لیا۔

وہ چلتے جاتے چلی "شکریہ ــــ مگر آج کا واقعہ یاد رکھنا بابو ــــ پہلے انسان بننا سیکھو۔"

ویٹنگ روم کا دروازہ کھلتے ہی گھٹن، سیلن اور بدبو کا ایک تیز بھبکا آیا کہ وہ گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی ــــ "خان صاحب تم ذرا جلدی سے یہ میز صاف کر دو اور ایک آدھ کھڑکی ذرا دیر کے لیے کھول دو ــــ میں اس بیچاری کو لاتی ہوں ــــ" یہ کہتی ہوئی وہ تیزی سے چلی گئی اور خان صاحب نے لال لال آنکھوں سے بابو کو گھورتے ہوئے لالٹین اس کے ہاتھ سے لے لی اور کمرے کے اندر داخل ہو گئے۔ کمرے میں ایک بھدی سی ایک میز کمرے کے بیشتر حصہ کو گھیرے ہوئے تھی۔ چاروں طرف چند بید اور لکڑی کی پرانی وضع کی کرسیاں اور بنچیں پڑی تھیں۔

دو تین منٹ بعد دونوں عورتیں مریضہ کو سنبھالے ہوئے کمرے میں داخل ہوئیں ــــ وہ بڑی شدید تکلیف کے ساتھ گھسٹتی ہوئی آ رہی تھی جیسے اس کی ٹانگوں میں بالکل ہی دم نہ ہو ــــ

لالٹین کی مدھم روشنی میں بھی اس کا ہر نقش، نقشِ حسن نمایاں ہوئے بغیر نہیں رہا۔ بابو نے کھڑے آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہا تھا کہ ایک تیز آواز اس کے کان میں برسنے کی طرح پہنچی: "یہاں کیوں کھڑے ہو، باہر جاؤ ــــ" اور وہ اس تیزی سے باہر کی طرف بھاگا کہ بند دروازے سے زور سے سر ٹکرایا۔ ابھی جھنجھلاہٹ اور کھسیاہٹ سے چھٹنے بھی نہ پایا تھا کہ اس صفدر، عورت کی آواز پھر آئی: "خان صاحب! بابو صاحب کے کوارٹر سے پانی گرم کرنے کے لیے انگیٹھی اور کیتلی وغیرہ اور ایک تیز چاقو لے آؤ ــــ سب کے دام ادا کر دیے جائیں گے ــــ اور ہاں ــــ بابو صاحب سے کہو کسی کو بھیج کر قصبہ میں جو بھی ڈاکٹر یا لیڈی ڈاکٹر ہو اسے فوراً بلائیں ــــ جتنی فیس مانگیں گے ادا کر دی جائے گی ــــ اور ہاں تم میرا بستر اور بکس یہاں دے جاؤ ــــ"

لالٹین اندر رہ گئی، دروازہ بند ہو گیا اور وہ بھیگی بلی بنا خان کے ساتھ اپنے کوارٹر کی طرف چل پڑا۔

اس نے کوٹ اتار کر کرسی پر پھینک دیا اور برقعہ پوش عورت سے بولی: "ماں جی ــــ تم بھی اپنا برقعہ اتار ڈالو اور ذرا مجھے سہارا دو

توہمات کی پرچھائیوں سے

بڑی مشکل سے تشنج ہوتی ہوئی حسینہ کو دونوں نے بیڈ پر لٹا دیا اور چاروں طرف سے اسے کمبل سے ڈھک دیا۔
اسی وقت خان سلطان نے کہا تو اس نے کہا: "خان صاحب اللہ کے لیے جلدی ڈاکٹر بلوائیے ـــ اگر کوئی مل جائے تو ـــ"

"بہت خوب سرکار!" اور بھاری قدم دور جاتے ہوئے سنائی دیے۔

"اسے جیتی ڈاکٹر کیا کرے گا ـــــ یہ عورتوں کے پردے کی باتیں ہیں۔ اے اللہ نہ کرے کہ شریف زادیاں ایسے وقت مردوں کے ہاتھ پڑیں۔ مردوں کا تو ایسے وقت اگر دیکھ لے تو یہ سمجھ کر بس . . . . " اس نے بڑی بی کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی انھیں روک دیا "اماں جی باتوں کا وقت نہیں . . . . . دیکھو . . . . . دیکھو . . . . . اسے کیا ہوا جا رہا ہے؟"

مریضہ نے پوری قوت سے ایک ہاتھ میں اس کی کلائی بھینچ رکھی تھی اور دوسرے ہاتھ سے بیڈ کے کنارے کو توڑے ڈال رہی تھی ـــــ چہرے کا نیچے کا حصہ شدتِ کرب سے غبارہ بنا ہوا تھا جیسے ایک دوسرے کے اوپر اتنے زور سے جڑ گئی تھی جیسے سارا جبڑا اب ٹوٹ کے ہو جائے گا۔ سیاہ آنکھیں اُبلتے اُبلتے معلوم ہوتا تھا باہر نکل پڑیں گی۔ ماتھے اور گالوں پر پسینے کے موٹے موٹے قطرے یوں چمک رہے تھے جیسے برگِ گل پر شبنم کے قطرے کانپ رہے ہوں ـــ ایک گھٹی ہوئی سی آواز اس کے گلے سے نکل رہی تھی۔ ایسی آواز جو اس نے اس سے پہلے کسی اتنے بڑے انسان کے منہ سے نہ سنی تھی ـــــ اس کا چہرہ بالکل سفید پڑ گیا تھا اور سارا جسم جیسے کھڑی کانپ رہی تھی!

"اسے بیٹی۔ گھبراؤ مت کیوں ہے ـــ بس اب وقت بالکل قریب ہے ـــ تم بیٹھ پکڑے رہو بچے کو سنبھال لوں گی" یہ بڑھیا نے بڑے اطمینان سے اپنے موٹے کھردرے ہاتھوں کو اوپر نچایا جن میں لاتعداد چاندی کے چھلے اور انگوٹھیاں اور کلائیوں میں چوڑیاں بنانے جہاں گجریاں وغیرہ چمک رہی تھیں اور سب پر میل کی موٹی تہہ جمی ہوئی تھی۔

اس نے گھبرا گھبرا کر دو تین بار اس کے ہاتھوں کی طرف دیکھا ـــ پھر اپنے ہاتھوں کی طرف ـــ "نہ نہ ـــ ماں جی ـــ تم ذرا یہ دکھاؤ ـــ بچہ میں سنبھال لوں گی ـــ" اور یہ کہتے کہتے اس نے اپنی کلائی بڑی مشکل سے زچہ کی گرفت سے چھڑائی۔ دو انگوٹھیاں انگلیوں سے اتار کر بڑھیا کے ہاتھ میں دیں اور پھرتی سے غسل خانہ میں جا کر ہاتھ دھونے لگی ـــ پانی بے حد سرد تھا اور صابن نے کب کا بھرا ہوا تھا مگر یہ سب سوچنے کا وقت کہاں تھا۔ منٹ بھر بعد وہ زچہ کی پائنتی کھڑی تھی اور بڑھیا اس کی انگوٹھیاں اپنی موٹی موٹی انگلیوں میں پھنسائے شادی کے بچوں کی طرح ہلا ہلا کر بجا رہی تھی۔

ایک درد و محبت میں ڈوبی ہوئی نحیف آواز جس کا شہد سا رس کر بستاک اذیت نے نچوڑ لیا تھا اس کے کان میں آئی "آہ ـــ اوہ ـــ اُف ـــ میری بہن ـــ تم ـــ تم ـــ کیا اسی دنیا کی رہنے والی ہو ـــ نہیں ـــ نہیں تم تو جنت کی حور ہو ـــ فرشتہ ہو ـــ میری مصیبت پر رحم کھا کر خدا نے تمہیں ـــ آہ ـــ اوہ ـــ اُف ـــ" اور پھر وہی درد کا ریلا ـــ وہی چہرہ کا خوفناک پن ـــ وہی مٹھیوں کی زبردست گرفت اور گھٹی ہوئی عجیب و غریب آواز ـــ اور اگلے لمحہ اس نے ہاتھوں پر ایک نرم سی بجلی کی سی چھلتی سی چیز محسوس کی اور ماں کی بھیانک چیخوں کے ساتھ ساتھ نوزائیدہ بچے نے گلا پھاڑ پھاڑ کر بین الاقوامی زبانوں میں دنیا کو مخاطب کرنا شروع کیا۔ وہ اعلان کر رہا تھا کہ[1]

---

[1] ٹیگور کا ایک قول "ہر نوزائیدہ بچہ دنیا میں یہ پیام لاتا ہے کہ خدا ابھی انسان سے مایوس نہیں ہوا ـــ"

خدا ابھی انسان سے مایوس نہیں ہوا

رات کا اندھیرا چھٹ چکا۔ گھٹا برس کر کھل گئی اور ہوا کی تیزی اور خنکی میں کچھ اور بھی اضافہ ہو گیا —— کچھ دھندلا آسمان پر بادلوں کے اکا دکا ٹکڑے سفید بادبانی کشتیوں کی طرح ادھر ادھر تیرتے نظر آ رہے تھے۔ مشرق کی سمت افق پر آفتاب کا گول نارنجی چہرہ جھانک رہا تھا۔

دھوم پور اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں لالٹین آخری بار جھلملا کر بجھ چکی ہے۔ ایک پراسرار خاموشی اور دھند کمرے میں چھائی ہوئی ہے۔

میز پر زچہ کمبل میں لپٹی ہوئی بے حس و حرکت لیٹی ہے۔ میز کی داہنی طرف اس کی تیمار دار دوست اس پر جھکی ہوئی کھڑی ہے۔ چہرے پر تھکن، بے چینی اور پریشانی کے آثار صاف نظر آ رہے ہیں —— بائیں جانب ایک ادھیڑ عمر کا ڈاکٹر کانوں پر اسٹیتھسکوپ (STETHOSCOPE) لگائے مریضہ کے دل کا معائنہ کر رہا ہے۔ ڈاکٹر اور تیمار دار دونوں کے سر اتنے قریب ہیں کہ سیاہ بال سفید بالوں سے سرگوشی کرتے معلوم ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر نے جھکا ہوا سر اٹھایا۔ اسٹیتھسکوپ کو احتیاط سے تہ کر کے جیب میں رکھا۔ عین اسی وقت روشن دان سے سورج کی پہلی کرن کمرے میں داخل ہوئی۔ اب ڈاکٹر تیمار دار اور مریضہ کے چہروں کو دیکھ سکتا تھا۔

مریضہ اس حالت میں بھی حسن کا ایک کامل نمونہ تھی۔ ہاتھی دانت کا سا بے داغ رنگ، وینس کا سا متناسب جسم، ہرن کی سی حسین آنکھیں، لمبے لمبے سیاہ بال جو بے ترتیبی سے میز پر، ماتھے پر اور سینہ پر بکھرے ہوئے تھے —— موت کا سایہ بھی جو اس کے ہر طرف منڈلا رہا تھا اس خداداد حسن کو مٹا نہ سکا تھا۔

چند لمحے کے لیے تیمار دار اور ڈاکٹر دونوں بت بنے ہوئے پورن ماشی چاند کی اس سندرتا سے مبہوت ہو کر رہ گئے —— نظر اٹھا کر دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

تیمار دار کا گندمی رنگ رات بھر کی مشقت اور پریشانی نے زرد کر دیا تھا۔ چھوٹی چھوٹی تیز اور ذہین آنکھوں کی چمک میں شب بیداری کی سرخی بھی شامل ہو گئی تھی اور پتلے پتلے گلابی نیم وا ہونٹوں پر ایک تھکی ہوئی مسکراہٹ چغلی کھا رہی تھی کہ وہ محض عادتاً ان ہونٹوں پر کھیل رہی ہے .... مریضہ پر جھکی وہ بالکل ایسی لگ رہی تھی جیسے کوئی نازک سی شاخ گل لچک کھا کر جھک آئی ہو۔

ڈاکٹر کے سخت بے رنگ چہرے پر ان دونوں کو دیکھتے دیکھتے نرمی، گھلاوٹ اور شفقت کا ہلکا ہلکا رنگ ابھرنے لگا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا "بی بی تم نے رات بھر سخت محنت کی ہے —— ذرا دیر بیٹھ کر آرام کر لو ——"

"نہیں ڈاکٹر صاحب —— جب تک ان کو ہوش نہ آ جائے —— ڈاکٹر صاحب! کیا ہوش آ جائے گا؟ —— بچ جائے گی یہ بیچاری ——؟" اس کی آواز میں سخت بے قراری تھی۔

ڈاکٹر کے چہرے پر مایوسی کا رنگ صاف جھلک رہا تھا "خدا میں سب قدرت ہے بہن ——!" اس نے پیشہ ورانہ امید افزائی کے انداز میں جواب دیا۔

"ڈاکٹر صاحب —— کیا —— کیا میری ناواقفیت اور جہالت کی وجہ سے تو —— ان کو —— کوئی —— کوئی نقصان تو نہیں پہنچا ——؟" آواز خوف سے کانپ رہی تھی۔

"نہیں نہیں تم نے تو بڑے سلیقے اور سمجھداری سے کیس کیا —— ورنہ —— بچے کو بچانا محال تھا —— ایسی حالت تھی ماں کی کہ

سلطان بھائی کا شیر ——— ہو جاتا ——— خدانخواستہ ——— معلوم ہوتا ہے تمہیں اس کا اچھا تجربہ ہے ——

"میں ڈاکٹر ہوں نے تو آج سے پہلے ——— کبھی ——— یہ ——— کبھی اس قسم کا ——— کیس دیکھا تک نہ تھا ——"

"تعجب ہے ——— درحال تمہارے کانوں نے کس سے کام لیا ——— تمہیں ماں بنا تجربہ ہو گا ——— کتنے بچے ہیں تمہارے؟"

ڈاکٹر خود تو مریض سے زیادہ تیمار دار سے دلچسپی ہو گئی تھی ——

"میں ——— میرے ——— جی ——— میرے ڈاکٹر کوئی بچہ نہیں ——— شرم، حجاب اور مایوسی کی ملی جلی آواز میں مشکل سے ادا ہو پائی تھی ——

"آہ ——— وہ ——— سارے ——— مر جائیں ——— ہائے ——— میں ——— میں کہاں ——— ایک کراہ کے ساتھ ٹوٹے ٹوٹے ہو کر چند لفظ مریضہ کے منہ سے نکلے اور دونوں اس پر جھک گئے "گھبراؤ نہیں تم اسپتال میں ہو" ——— ڈاکٹر نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"تو پھر ——— میرا ——— بچہ ——— ؟"

"ہاں تمہارے ہاں ہوا ہے" ڈاکٹر نے کہا۔

"زندہ ؟" بڑی مشکل سے جیسے وہ یہ لفظ ادا کر سکی۔

"ہاں ہاں زندہ ہے ——" عورت نے کہا اور خوش ہو کر لپک کر کمرے کے آخری سرے کی طرف گئی جہاں ایک بید کی ٹوکری میں ریشمی غلافوں میں لپٹا ہوا بچہ پڑا تھا۔ بیچارا اس دنیا کے بارے میں شاید سوچ رہا تھا ——— اس نے آہستہ ——— بہت ہی آہستہ سے بچے کو سنبھال کر ہاتھوں پر اٹھایا اور اس انداز سے پھونک پھونک کر قدم رکھتی ہوئی آگے بڑھی ——— جیسے کوئی معصوم بچہ شیشے کے کسی نازک سے برتن کو لے کر چلتا ہے ——— اور دھیرے سے اس نے بچے کو ماں کے پہلو میں لٹا دیا ——

ماں کے بے رنگ چہرے پر مسرت کا ایک ہلکا سا رنگ آیا اور گزر گیا ——— بے دھیانی میں ایک ہاتھ ذرا سا اٹھا اور گر گیا ——— ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ ابھری اور ڈوب گئی ——— آنکھوں میں چمک آئی اور آنسو بن کر ڈھلک گئی ——

اس نے بچے کے منہ سے رضائی ہٹا دی اور اسے ایسا لگا کہ ماں کی آنکھوں میں اس کی ساری روح کھنچ آئی جو اس جس اشتیاق، جس ممتا، جس محبت سے اس ننھی سی بچی، جھریوں بھری سرخ سرخ چیز کو دیکھ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر تیمار دار ——— شدت جذبات سے کانپ رہی تھی ——— آہ ——— ممتا کی یہ انمول دولت!! اس کی آنکھوں میں آنسوؤں نے سچے موتیوں کی چمک پیدا کر دی تھی۔

ماں چند لمحے بچے پر پیار سے اپنا زرد ہاتھ پھیرتی رہی "لڑکا ہے ؟"

"نہیں لڑکی ہے بہن"

"آہ ——— لڑکی ہے ——— بدنصیب ماں کی ——— بدنصیب بیٹی ——— کاش تو زندہ نہ ہوتی ——— لڑکی نہ ہوتی ——— آہ ——"

"نہیں بہن کیسی باتیں کر رہی ہو"

ماں خالی خالی نظروں سے کبھی تیمار دار کو کبھی بچی کو دیکھتی رہی ——— اور پھر ——— بڑی صاف آواز میں جو کسی طرح بھی ایسی کمزور و نڈھال مریض کی آواز نہ لگتی تھی بولی: "میری بچی ——— اچھا ہوا کہ تو خوبصورت نہیں ——— اپنی ماں کے حسن کی لعنت تیرے حصے میں نہیں آئی ——— شاید اس کی سی بدقسمتی سے بھی تو بچ جائے ——— شاید درندے ——— حیوان ——— شیطان ——— تجھے نہ بھنبھوڑیں ——— شاید تیری بدصورتی تیری محافظ

بن جائے ——— آہ ——— میری بچی ——— !"

وہ دونوں حیران و پریشان کھڑے اس کی باتیں سن رہے تھے ! یہ ہذیان ہے یا ہوش و خرد کے کلمے؟ اس کا چہرہ اب اور بھی زیادہ زرد ہو چکا تھا جیسے ہلدی کی پوری گرہ پیس کر مل دی گئی ہو اور شفاف ماتھے پر سیاہی آ چکی تھی ——— ۔

ڈاکٹر نے گھبرا کر اس کی نبض پر انگلیاں رکھیں، مایوسی کے ساتھ گردن ہلائی اور جھک کر آہستہ سے بولا: "بیٹی! اپنا نام ——— بچی کے باپ کا نام ——— اس کا کچھ اتہ پتہ ——— خاندان کا کچھ حال تو بتاؤ ——"

"آہ ——— اس کے سب ہیں ——— ماں ——— باپ ——— کوئی نہیں ——— ہے ——— سب ——— سب اس کی جان کے دشمن ہو چکے ——— آہ ——— اس کا اس بھری دنیا میں کوئی نہیں ——— " جانے وہ اور کیا کہہ رہی تھی ——— مگر اب کچھ سنائی نہ دیتا تھا ——— صرف ہونٹوں کی ہلکی ہلکی حرکت دیکھی جا سکتی تھی !

پھر اس نے اپنا نحیف ہاتھ جانے کیسے گریبان کے اندر ڈالا اور ایک چھوٹی سی تھیلی نکال کر ڈاکٹر کے ہاتھ میں تھما دی اور بہت جیسے بہت کوشش سے اس نے اپنا سر تیماردار کی طرف موڑا ——— " آہ بہن ——— تم ——— کتنی ——— اچھی ہو ——— ے ——— ری ——— بچ ——— ی ——— بچ ——— چی؟" الفاظ سے زیادہ اس کی بجھی ہوئی مدہم نظروں نے اپنا مطلب ادا کر دیا۔

اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش ہو رہی تھی۔ اس نے جلدی سے بچی کو اٹھا کر اپنی چھاتی سے لگا لیا اور سسکتی ہوئی بولی: "بہن ——— تمہاری بچی میری بچی ہے ——— میری جان ——— ——"

ماں کے کمان جیسے ہونٹوں پر مدھ بھری مسکراہٹ کھل اٹھی جیسے کسی سوکھی شاخ پر اچانک کوئی ننھی سی کلی مسکرا اٹھے یا ڈوبتے سورج پر سے ایک دم بادل ہٹ جائے اور اس کی کوئی کرن چمک اٹھے ——— پھر اس کی نظریں ڈاکٹر کی طرف مڑیں: "ڈاکٹر ——— بیب ——— بچی ——— اس کا حق ——— شاید ——— سرپرست ——— "

مگر پھر کوئی آواز نہ نکلی ——— پتلیاں پھر گئیں ——— گردن سخت ہو گئی ——— ہاتھ میز سے نیچے لٹک گیا۔

میز پر ایک بے جان مومی مورت کے سوا اور کچھ بھی نہ تھا۔

عین اس وقت بچی نے پوری قوت سے گلا پھاڑ پھاڑ کر رونا شروع کر دیا۔

راج دُلارے

احمد شریف

بڑی کلب والوں نے جب اجلاس میں جعفر سے ڈرامے کی نائیکہ کا پارٹ قبول کرنے کی استدعا کی تو اس کا جذبۂ شوق کچھ یا گی انگڑائی لے کر جاگ اٹھا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ جلدی سے تالیاں بجائے۔ ۔ ۔ مگر اب وہ دن تو نہیں رہے تھے جب شروع سردیوں میں بھاٹی گیٹ کے باہر پارسیوں کے تھیٹر بمبئی سے آکر ڈیرے جما لیتے اور وہ جلوں میں جا کر بیٹھ جاتا اور پھر وہیں بیٹھا آدھی آدھی رات تک دیکھتا رہتا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے۔ سہراب اور رستم کے چہرے گھوم گئے جن کو دیکھتے دیکھتے اسے یاد بھی نہ رہتا تھا کہ اس کے ابا اپنے کمرے میں کرپا ہاتھ باندھے اس کے انتظار میں ٹہل رہے ہوں گے۔ ان دنوں جب بید لگنے سے اس کے جسم پر انگارے دہکنے لگتے تو اس میں بھی وہ لذت محسوس کرتا جیسے اونچے تخت کے چبوترے سے کرسی پر بھی ایک ناٹک ہو رہا ہو اور پھر سے دربار میں جا کر وقت کے حکم سے اس کی ننگی پیٹھ پر کوڑے پڑ رہے ہوں۔

اب وہ دن بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ فوج کی نوکری اسے انگلی لگائے شہر بہ شہر لیے پھری تھی۔ وضعداری ایک عجیب قسم کا رکھ رکھاؤ اس کی شخصیت کا جزو بن چکا تھا اور ایک دم حامی بھر لینے میں اسے خوف سا محسوس ہوتا تھا جیسے اس طرح کرنے سے اس کی شخصیت بے اثر سی ننگی بچی ہو کر ذہنی کا منہ چڑانے لگے گی۔

اس نے اپنے ارد گرد نگاہ ڈالی سب اسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اس نے پھرتی سے پتلی زبان ہونٹوں پر پھیر کر انھیں تر کیا۔ ہنسی ضبط کرنے کی کوشش میں اس کی لمبی ناک کی پھننگ اوپر والے ہونٹ سے مس ہوتے ہوتے بچی۔ اس نے کندھے اندر کی طرف سکیڑ کر دونوں ہاتھ پھیلا دیے اور رک رک کر کہنے لگا۔

”اگر آپ لوگوں کی یہی مرضی ہے تو مجھے منظور ہے مگر اس ڈرامے میں عورت کا پارٹ عورت ہی کرے گی۔“

بڑی کلب والے یہ بات سن کر ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ کسی کے چہرے پر خوشی کی جھلک نظر نہ آئی ــــ راولپنڈی جیسے شہر میں ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ عورتوں کے پارٹ کے لیے لڑکے تک تو ملتے نہیں تھے پھر عورتیں کہاں سے آتیں۔ ایک فقری تھا جو ہر ڈرامے میں ہر لیسز لگائے ریشمی دوپٹہ اوڑھے سٹیج پر پہنچ جاتا اور مردانی آواز پر قابو پاتے پاتے اپنا پارٹ تک بھول جاتا۔

جعفر نے کن انکھیوں سے ماحول کا جائزہ لیا۔ سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کوئی آواز نہیں تھی۔ سب کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اسے

خاموشی اختیار کرلی۔ اس نے سوچا کہیں بڑی کلب والے اپنی درخواست واپس ہی نہ لے لیں اور اس کے اندر چھپا ہوا فنکار کہیں پھر سے سو جائے ——— وہ شروع ہی سے اس بات کا مخالف تھا کہ مرد زنانہ رول ادا کریں۔ عورتوں کی سی لچک، بانکپن اور نزاکت بھلا مردوں میں کہاں!

اچانک بھاری بھرکم ڈیل ڈول والے شیرازی نے پلکوں کو کئی بار جھپکا کر آنکھیں اس طرح بند کرلیں کہ پانی کے دو موٹے موٹے قطرے گوشوں سے ڈھلک پڑے۔ جعفر نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا مگر اس نے اپنے ڈھیلے جبڑے کا نچلا حصہ اس طرح کھینچا جیسے گوشت کے تنے ہوئے پٹھے کو ہموار کر رہا ہو اور پھر اس نے لگاتار کندھے جھٹکائے اور اس کی کرسی کے پائے کڑکڑی سے فرش پر بجنے لگے۔ وہ جعفر کی طرف جھکا اور کہنے لگا۔

"عورت کا انتظام ہو جائے گا جی ——— آپ ریہرسل شروع کرا دیں۔"

اور پھر اگلے دن سے جعفر نے ریہرسل شروع کرا دی۔ "نیا مکان" کھیلنے کے لیے شیرازی کئی روز تک کلرک کی بیوی کے مکالمے موٹی اور بے سُری آواز میں بولتا رہا۔ وہ ریہرسل کے لیے آتا تو جعفر اسے تنہا دیکھ کر مرجھا سا جاتا اور اگر کبھی اس سے پوچھتا۔

"وہ عورت کہاں ہے شیرازی؟"

تو شیرازی بڑے اطمینان سے گردن کا کوئی تنا ہوا پٹھا ہموار کر کے کہتا۔

"آپ فکر نہ کریں جعفر صاحب   سب انتظام ہو جائے گا۔"

جعفر سوچتا ڈراما اسٹیج ہونے میں دن ہی کتنے ہیں۔ اگر کوئی عورت نہ ملی تو شیرازی چپکے سے کہہ دے گا ——— جعفر صاحب اس مرتبہ مردوں سے کام چلا لیں، عورت کا انتظام دوسرے ڈرامے کے لیے کر لیں گے ——— مگر اس بات کا اسے دل ہی دل میں اعتراف کرنا پڑا کہ شیرازی بڑے کام کا آدمی تھا۔

ڈراما اسٹیج ہونے سے دو روز قبل شیرازی نہ جانے کہاں سے لیلیٰ کو پکڑ لایا۔ اس کے نمبر سے ساتھی کو دیکھ کر جعفر لیلیٰ کے کمتر درجے کا بھی اندازہ لگانے میں کامیاب تو ہو گیا مگر وہ اس قابل نہیں تھی کہ کلرک کی اٹھارہ بیس سالہ بیوی بن کر ذرا اوپر کے سبز گھونگھٹ چھپا کر پٹھان کا دل لبھا لیتی۔ جعفر نے اس کی بے نوری آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقوں کی طرف دیکھا۔ جب وہ کچھ کہنے کے لیے مڑا تو شیرازی لپک کر اس کے قریب آگیا اور اسے ایک طرف لے جا کر آہستہ سے بولا۔

"دو راتوں کے سو روپے مانگتی ہے جعفر صاحب!"

"سو روپے؟"

جعفر نے مڑ کر لیلیٰ کی طرف دیکھا اور اسے خیال آیا وہ سو روپے تو سارے مہینے میں بھی نہیں کماتی ہو گی ——— مگر ڈرامے کے لیے عورت چاہیے تھی اور دو روز بعد ڈراما اسٹیج ہونے والا تھا، اس نے حامی بھر لی ——— دو روز رات گئے تک ریہرسل ہوتی رہی ———

ڈرامے والے روز لیلیٰ وقت سے ایک گھنٹہ پہلے گھر ہی سے میک اپ کر کے چلی آئی اور اسٹیج کے ایک طرف بیٹھ کر جعفر کو پُراسرار نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ کانوں تک پھیلی ہوئی زلفیں اور پیشانی پر بالوں کے کرل دے کر بنائے ہوئے دو چاند اور اس پر اس کی پُراسرار نگاہیں ——— جعفر نے اسے دیکھا تو جل کر رہ گیا۔ وہ جلدی سے اٹھا اور اس کا بازو پکڑ کر کھینچتا ہوا اسے گرین روم میں لے گیا۔ پہلے تو وہ ہچکچائی پھر جعفر کے ہاتھ کا دباؤ اپنے بازو پر محسوس کر کے لپک سی گئی۔ اس کے ساتھی حیرانی سے گرین روم کی طرف دیکھتے رہے اور جب

پہلے اللہ رکھا بھی اس حسین لڑکی کے روپ میں دیکھ کر جعفر کی صلاحیتوں کے قائل ہو گئے۔

ڈرامے کے بعد رقص کے اس شو کی کامیابی پر جعفر سے زیادہ شیرازی خوش تھا۔ وہ ایک ایسے شخص کی طرح خوش نظر آ رہا تھا جو وقت کے تقاضوں کو سمجھتا تھا جو جدید ڈرامے کی تکنیک اور اسے پیش کرنے کے ڈھنگ سے واقف تھا۔ جعفر کے سامنے والی کرسی پر بیٹھے بیٹھے، اس نے ساتھیوں پر ایک نگاہ ڈالی اور جعفر کے قریب ہو کر کہنے لگا۔

"جعفر صاحب! اپیل چل گئی۔"

"کہاں؟" جعفر نے حیرانی سے پوچھا۔

"لوگوں سے — یہی اس بننے کے لیے۔"

"اچھا!"

شیرازی نے جلدی جلدی کندھے جھٹکائے اور چہرے پر معنی خیز ہنسی لا کر بولا۔

"جانے سے پہلے کہہ رہی تھی — اگر کوئی چندے میرے قریب گیا تو پھر بھی مجھے بھول نہیں سکتا۔"

جعفر کے ہونٹوں کے کناروں نے پھیل کر اس کی مسکراہٹ کا اظہار کر دیا۔

وہیں بیٹھے بیٹھے شو کی کامیابی کا سہرا کسی کے سر باندھنے کی بات نہ جانے کیسے چل نکلی اور کچھ ایسا بیچ پڑا کہ جبار سینے پر ہاتھ مار کر کہنے لگا۔

"اگر میں اور وجاہت نہ ہوتے تو ملال ہی تو ہوتے۔"

اس کا لہجہ متکبرانہ تھا۔ سب اپنی اپنی جگہ چپ سے ہو کر رہ گئے۔ جعفر کو احساس تھا کہ ان کی کامیابی میں جبار اور وجاہت کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ اوس کے رقص نے تماشائیوں کا دل لبھایا تھا۔ تحسین و آفرین کے ڈونگرے بھی برسے تھے ان پر مگر جعفر کے نزدیک جدید ڈرامے میں رقص اور موسیقی کی حیثیت ثانوی تھی۔ اس کے سامنے برطانیہ اور امریکہ کے ڈرامے تھے جن کی اوپیرا اور بیلے سے الگ حیثیت تھی مگر شیرازی نے اسے کچھ کہنے کا موقع نہ دیا اور جبار کو مخاطب کر کے بولا۔

"اس میں شک نہیں کہ تمہارا رقص اچھا تھا مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ تم اور وجاہت نہ ہوتے تو شو کامیاب ہی نہ ہوتا۔"

"تو اگلی دفعہ دیکھ لیں گے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اگر ہمارے بغیر کام چل سکتا ہے تو ہمارا یہاں رہنا فضول ہے۔"

"دیکھو یعنی یہ بات نہیں۔" جعفر نے بیچ بچاؤ کے خیال سے کہا۔

مگر جبار نے اس کی بات کاٹ دی اور کرسی سے اٹھتا ہوا بولا۔ "جی بس یہی بات ہے — ہم دیکھیں گے جب ہمارے بغیر آپ کا شو کامیاب ہو جائے گا — آؤ وجاہت —"

اس سے پہلے کہ کوئی انہیں روکتا وہ اٹھ کر چلے گئے۔ محفل ویران سی ہو کر رہ گئی۔ جعفر جانتا تھا کہ جبار اور وجاہت کا ساتھ چھوٹنا

جیسے شہر میں ڈراما سوسائٹی کو مقبول بنانے میں مددگار ثابت ہوا۔ لوگ ابھی تک سٹیج پر ایکٹروں کو بے حیائی سے کولہے مٹکاتے اور بے تکی چھلانگیں لگاتے جذباتی ہوتے پر سینہ پھلاتے دیکھ کر خوش ہونے کے عادی تھے۔ گھنگھروؤں کے چھناکوں کے ساتھ تماش بینی کی لپک جاتی تھی اور اچھی بات کو آوارگی کے لیے تنہا چھوڑ دیتے ـــــ لیکن جب جبار اور وجاہت دروازے سے باہر نکل گئے تو ظاہر وہ تھیٹر کے [illegible] قمر، نذیر، وقار اور محمود جیسے مخلص ساتھیوں کو بے تکلفی سے مخاطب کر کے پوچھنے لگا۔

"ضرب لگتی دوستو ـــــ اب!"

"اجی اب کیا ـــــ ہمارا ہر قدم ترقی کی طرف ہی اٹھے گا۔"

شیرازی نے بڑے اعتماد سے کہا اور اسی مجلس میں ماڈرن تھیٹر کی بنیاد ڈال کر اگلے کے پروگرام کا خاکہ مرتب کر لیا گیا۔ اگر جبار اور وجاہت یوں الگ نہ ہو جاتے تو شاید سب کام تکمیل کے مراحل اتنی سرعت سے طے نہ کرتے۔ اب تو سب پر ایک جنون سوار تھا۔ جنون سا تھا کہ ملک بھر میں ماڈرن تھیٹر کا چرچا ہونے لگے۔ لوگ جب جدید ڈرامے کا ذکر کریں تو ماڈرن تھیٹر کا نام سرفہرست ہو ـــــ اگلے سال نے پر شو دینے کے لیے ہال کا مسئلہ درپیش ہوا تو شیرازی نے بڑی معقول رائے دی، کہنے لگا۔

"گرمیاں آ رہی ہیں، کیوں نہ یہ شو مری میں دیا جائے۔ بڑے بڑے امیر لوگ وہاں ہوں گے۔ دوہرا فائدہ ہوگا، معقول آمدنی ہوگی اور ماڈرن تھیٹر کا نام بھی روشن ہو جائے گا۔"

سب نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور مری میں لگاتار تین روز تک شو دینے کے لیے بینک اسٹیبری ہی پر شام سے رات گئے تک ریہرسل شروع ہو گئی۔ ریہرسل کے دوران ہی میں جعفر کو ماڈرن تھیٹر کے لیے اپنے دفتر اور اس کے بعد اپنے ہال کا خیال پیدا ہوا۔ پرائی چھت کے نیچے ریہرسل کرتے وہ اس لڑکی کی طرح محسوس کرتا جس پر نہاتے وقت اچانک کسی مرد کی نظر پڑ جائے۔

ریہرسل کے ساتھ ساتھ اس نے دفتر کے لیے بھی تگ و دو شروع کر دی۔

انہی دنوں شیرازی ایک شوخ سے لڑکے کو وہاں لایا۔ اس کا نام محسن تھا۔ شیرازی نے تعارف کرایا تو قمر نے بڑے تپاک سے اس سے ہاتھ ملا کر کہا۔

"میرا نام قمر ہے۔"

اور کرسی چھوڑ کر جگہ اس کے لیے خالی کر دی۔ اس کے چہرے پر شدید سی مسکراہٹ تھی۔ وہ تصوراتی تصور میں محسن کو دوپٹہ پہنے، دوپٹہ اوڑھے سٹیج پر دیکھ رہا تھا اور مطمئن تھا کہ محسن اس رول میں اس سے کچھ زیادہ ہی جچے گا۔

کوہ مری جانے سے تین چار روز قبل ایک شام محسن جعفر کے پاس جا بیٹھا اور بڑے ہی رازدارانہ انداز میں کہنے لگا۔

"جی ـــــ اگر آپ کہیں تو ایک لڑکی کو ساتھ لے چلیں۔"

شیرازی بھی پاس ہی بیٹھا تھا۔ اس کے کانوں میں بھنک پڑی تو وہ کھسک کر اور قریب ہو گیا اور جعفر کے کانوں کی سرخ لووں کو نظر انداز کر کے پوچھنے لگا۔

"کون ہے وہ؟"

"ایک اینگلو ہے ـــــ ناچنا بھی جانتی ہے۔"

"اور نام کیا ہے اس کا؟"
"تھیلا"

"اچھا ——— وہ ——— میں جانتا ہوں اسے" پھر جعفر سے مخاطب ہو کر کہنے لگا: "جعفر صاحب! بہت خوب ہے تھیلا اس کا رقص دیکھ کر رنگ جیسے گھل گئے ہوں۔ بعض کا سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے!"

"تو کیا وہ جانے کی بھی" مسعود نے پوچھا۔

شیرازی نے جلدی سے گردن کا پٹھا ابھارا کیا اور کہنے لگا۔

"آپ فکر نہ کریں۔ اس کا انتظام میں کر دوں گا۔ کچھ دے دلا کے اسے اور بیہ [illegible] میں آ جائے گی۔"

تھیلا کے ذکر سے ساتھیوں کے کھلتے ہوئے چہرے دیکھ کر جعفر [illegible] کر رہا۔

بدرما نس پامالی کی طرف سے آل کھیل کا مکمل ملنے پر سب سے او سے جنہ نا [illegible] ایک روز پہلے مری چلی گئی۔ تھیلا مصروفیات کی وجہ سے ساتھ نہ جا سکی۔ اس نے اگلے روز آنے کا وعدہ کیا۔

چلتے وقت سب کے دلوں میں خوشگواری سی مچل رہی تھی۔ [illegible] گنگناتے رہے اور جعفر سارا راستہ خاموش بیٹھا باہر کی طرف منہ کیے اونچی اونچی پہاڑیوں کو دیکھتا رہا۔

جعفر کی توقعات کے مطابق ہوٹل میں سب لوگ [illegible] سے رہے۔ ہوٹل کا مالک چچا امداد علی کر پہلا تھا [illegible] میں کمرہ اٹھا شیرازی آتے ہی [illegible] سنبھالے [illegible] سب اپنے اپنے ایک کونے میں [illegible] جب جعفر کو پتہ چلا کہ ان کا انتظام چچا امداد علی کی وساطت سے ہوا ہے تو اس نے بڑے خلوص سے اس کا شکریہ ادا کیا اور پھر [illegible] کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔

رات گئے تک اجتماعی کوششوں کے باوجود [illegible] کا پچھلا حصہ کسی ننگے بھوکے فقیر کی طرح آنکھیں پھاڑے انہیں دیکھتا رہا۔ اس خلا کو پُر کرنے کے لیے تختے نہیں تھے اور ساری حالت اس بستی کی طرح تنگ ہو چکی تھی جس میں مہمانوں کی اچانک آمد پر دو ماتمیاں ڈال دیا گیا ہو ——— ابھی تو دس بارہ آدمیوں کے لیے رات کے [illegible] کی فکر دامنگیر تھی مگر چچا امداد علی نے ان مہمانوں کے لیے مستقل کے آسرے پر گھر کھول رکھا۔ اس کی فیاضی پر سب کا زور چاہا ہال کر نعرہ لگائیں ——— چچا امداد علی زندہ باد ——— [illegible] پائندہ باد ——— لیکن تھکن کی وجہ سے سب چپ رہے۔ جو بستر لائے تھے انہوں نے بستر کھول کر ننگے فرش پر بچھا لیے اور جس کسی کے سینگ سمائے لیٹ گیا۔

شیرازی کو اپنے بجائے جعفر کی فکر تھی۔ وہ چاہتا تھا جعفر کے سونے کے لیے کوئی ایسی جگہ مل جائے جس سے اس کی امتیازی حیثیت برقرار رہے۔ اسے نہ جانے کیوں یہ خوف تھا کہ جعفر اگر سب کے ساتھ فرش پر لیٹ گیا تو جدید [illegible] ڈھول میں اٹ کر رہ جائے گا۔ اس نے ساتھ والے کمرے میں جعفر کا بستر بلیرڈ ٹیبل پر لگا کر اپنا بستر اس کے قریب ہی زمین پر لگا لیا۔ دونوں چپ چاپ اپنے اپنے بستروں پر لیٹ گئے۔

شیرازی سر کے نیچے بازو رکھے چھت تک رہا تھا۔ روشندان سے آنے والی چاندنی کی پتلی سی لکیر کو دیکھ رہا تھا۔ تھکن کے باوجود اسے نیند

نیند آ رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا اگر شو ناکام رہا تو جعفر کا دل ٹوٹ جائے گا، جبار اور وجاہت غلیظ بلاتے پھریں گے، ساڑھے تین تیشہ کا نام گمنامی کے اندھیرے میں چھپ جائے گا اور سرپھروں کی یہ منڈلی تتر بتر ہو جائے گی۔

جعفر بیڈ ٹیبل پر جھکا کروٹیں بدل رہا تھا۔ شیرازی کو اس کی بے چینی کا احساس تھا۔ اسے خیال آیا جعفر کو بھی تو نیند نہیں آ رہی ہوگی۔ کون جانتا تھا آنے والی کل امیدوں کے تاج محل پر کامیابی کا پرچم لہرائے گی یا ناکامی کی وجہ سے ان کے دلوں میں تیرہ ستانوں کی سی ویرانی پھیل جائے گی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور آہستہ سے پکارا۔

"جعفر صاحب!"

"ہوں۔"

جعفر نے وہیں پڑے پڑے ہنکارا بھرا۔

"آپ فکر نہ کریں۔ ہمارا شو کامیاب رہے گا۔ آپ دو گھنٹے آرام کر لیں۔"

"یہ بات نہیں شیرازی — کھٹمل سونے نہیں دیتے۔"

"میں سمجھا آپ شاید شو کے بارے میں سوچ رہے تھے۔"

دونوں خاموش ہو کر اپنے اپنے خیالوں میں کھو گئے۔

اگلی صبح شیرازی باہر نکلا تو جعفر آنکھیں بند کیے برآمدے میں سو رہا تھا۔ اس وقت وہ جدید ڈرامے کے بارے میں کچھ سوچنے کی بجائے صرف مسکرا دیا۔

اس روز سب بے حد مصروف رہے۔ سٹیج کے پچھلے حصے کا خلا پُر کرنے کی کوئی سبیل نہ بن سکی تو وہاں بیک گراؤنڈ کا پردہ لٹکا دیا اور پیٹیوں کے اوپر لمبے لمبے تختے جن کے کناروں پر کیلیں سر نکالے کھڑی تھیں وہاں ڈال دیے۔ شیرازی نے چچا امداد علی سے کہہ کر گرین روم کے برابر والا کمرہ جعفر کے لیے حاصل کر لیا اور مزید اطمینان کی خاطر اس کا بستر اٹھا کر وہاں رکھ آیا۔

شام ہوتے ہوتے تھیلا بھی پہنچ گئی۔ محسن دوپہری سے اڈے پر اس کا منتظر تھا۔ وہ تھیلا کا بستر سنبھالے اس کے ساتھ ساتھ قدم اٹھانے میں بڑی لذت محسوس کر رہا تھا۔ شیرازی نے اسے دیکھا تو صرف مسکرا دیا۔

شو کا آغاز تھیلا کے ناچ سے ہونا تھا۔ وہ گرین روم میں میک اپ کر رہی تھی۔ سب اس کے پاس ہی جمع تھے۔ محسن آرائش کا سامان اٹھا اٹھا کر دے رہا تھا۔ تھیلا نے سفید ریشمی جالی کا ٹخنوں سے اونچا لہنگا اور آدھی آستین کی چولی پہن رکھی تھی جس کے نیچے سرخ رنگ کی تنگ انگیا اس کی بھرپور چھاتیوں میں دھنسی جا رہی تھی۔ اس کا شہابی بدن ریشمی جالی سے آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔ اس نے آرائش سے فارغ ہو کر ڈھیلے لہنگے کو کسنا چاہا تو اچانک ازار بند ٹوٹ گیا اور لہنگا اس کے پیروں میں آ رہا۔ گوری گوری رانوں پر حائل مہین سا پردہ ہٹ جانے سے یک بارگی بجلی سی کوند گئی اور سب کی نگاہیں اس کے بھرے بھرے گداز جسم پر پھسلتی چلی گئیں۔ شیرازی نے مسکرا کر جعفر کی طرف دیکھا۔ وہ کھڑکی سے باہر اونچی نیچی پہاڑیوں پر جگنوؤں کی طرح ٹمٹماتے دیوں کو دیکھ رہا تھا۔ محسن لہنگا اٹھانے کے لیے جھکا تو تھیلا نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا اور مسکرا کر کہنے لگی۔

"نیور مائنڈ بے بی۔"

سب کھلکھلا کر ہنس دیے۔ محسن نے شرما کر سر جھکا لیا اور مغنی کی طرف جاتے ہوئے بولا
"اوستے ۔۔۔ لو۔۔۔۔"

تاثیر سوچ میں پڑ گیا۔ یہ کہہ کر وہ بیٹھ گیا۔ روشنی کا انتظام اس کے ذمہ تھا۔ اس نے اٹھ کر ہال کی بتیاں بجھا دیں اور دوسرے لمحے تیز روشنی ہونے لگی۔ سٹیج کی اطراف سے بند ادھ کھلے دودھیا روشنی کی دودھیا سرچ لائٹ تماشائیوں پر جا پڑی۔ تھیلا شمع کی طرح سٹیج پر آ گئی۔ ہال تالیوں سے گونج اٹھا ۔۔۔ تھیلا نے رقص شروع کر دیا جیسے بجلی کی لہروں کو سمیٹ لیا ہو۔ اس کے جسم کے ابھار رقص کی لہروں میں اس طرح نمایاں ہو گئے کہ دیکھنے والوں کے جذبات بھڑک اٹھے۔

پھر اچانک تھیلا جوانی کے نشے میں مستانہ وار گھوم گئی۔ اچانک اس کا پیر سٹیج کے پیچھے خلا کے کنارے پر پڑا۔ وہ لڑکھڑائی، سنبھلی، پھر پرندہ جیسے کہ آسمان سے ٹوٹنے والی پری کی طرح اس گڑھے میں جا گری۔ ایک چیخ تماشائیوں کے شور میں گم ہو کر رہ گئی۔ سب سنبھل کر آگے سے ہٹا۔ وہ سٹیج سے نیچے پڑی تھی۔ جعفر کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ اس نے پردہ گرا دیا۔

صباؤ تھیلا کے لیے بستر بچھاؤ:

"کہاں؟"

"اوسے کہیں بھی بچھاؤ مگر جلدی ۔۔۔ نہ جانے بچاری کے کہاں کہاں چوٹیں آئی ہوں گی۔"

سب نے اسے ہاتھوں پر سنبھالے گرین روم میں لے آئے۔ وہ نڈھال سی ہوتی جا رہی تھی۔ محسن دوڑا ہوا آیا اور انہیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ ایک بار پھر وہ نرم و نازک جسم کئی ہاتھوں نے سنبھال لیا۔ چولی مسک چکی تھی۔ ہونٹ الٹ کر سرخ ہو گیا اور ماتھے سے خون رس رہا تھا۔ جعفر تھیلا کی کمر کے نیچے ہاتھ کا سہارا دیے ہوئے تھا۔ تنگ برآمدے سے گزرتے تو اس نے اپنے ہاتھ پر گرم گرم سی نمی محسوس کی۔ محسن نے جھک کر چھوٹے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ جعفر کا بستر ایک کونے میں پڑا تھا۔ جلدی جلدی چارپائی پر تھیلا کا بستر بچھا دیا گیا اور تھیلا کو اس چارپائی پر لٹا دیا۔ جعفر نے روشنی میں اپنا ہاتھ دیکھا جو تازہ خون میں لتھڑا ہوا تھا۔

ہال میں سیٹیاں بج رہی تھیں۔ پردہ نہ اٹھنے کی وجہ سے تماشائی شور مچا رہے تھے۔ جعفر بوکھلایا ہوا دروازے کی طرف لپکا۔ اس کی نظر شیرازی پر پڑی تو وہ اس سے بولا۔

"شیرازی، تم جا کر ڈراما شروع کرا دو۔"

شیرازی ایک نظر تھیلا پر ڈال کر دروازے کی طرف ہو لیا۔ جعفر پھر تھیلا کے پاس آ کھڑا ہوا۔ وہ چارپائی پر پڑی ہلکے ہلکے سانس لے رہی تھی۔ شیرازی ابھی دروازے کے قریب ہی تھا کہ جعفر نے اس کے پاس آ کر کہا۔

"شیرازی! تھیلا کی حالت اچھی نہیں۔ کسی ڈاکٹر کو بلا لاؤ اور تاثیر سے کہتے جاؤ وہ ڈراما شروع کرا دے۔"

شیرازی نے جانے سے پہلے کچھ تامل کیا تو جعفر اس کی ہچکچاہٹ کی وجہ سمجھ کر اس کا شانہ تھپتھپا کر بولا۔

"ڈاکٹر کی فیس کا انتظام ہو جائے گا۔"

شیرازی کے جانے کے بعد وہ دبے پاؤں تھیلا کی چارپائی کی پٹی پر آ بیٹھا۔ پٹی اس کے بوجھ سے جھک گئی۔ تھیلا نیم بیہوشی کی حالت میں پڑی تھی۔ جعفر نے ڈرتے ڈرتے اس کی پیشانی کو چھوا اور آہستہ سے آواز دی۔

"شکیلا!"

"ہوں!"

اس نے ڈوبتی ہوئی آواز میں ہنکارا بھرا۔

"کیسی طبیعت ہے؟"

"بہت چوٹیں آئی ہیں مسٹر جعفر"

اس نے آنکھیں کھول دیں اور سسکی لے کر ایک ٹانگ کو ذرا سا اٹھا کر زخمی ران دکھاتے ہوئے بولی۔

"بہت ٹیسیں اٹھ رہی ہیں یہاں"

زخموں کے گرد خون خشک ہو کر جم گیا تھا۔ جعفر کی نگاہیں زخموں سے ذرا اوپر ران کے اس ابھار پر پڑیں جو کسے ہوئے جانگیے کی وجہ سے نمایاں ہو گیا تھا جہاں سرخی اور بھی گمبھیر ہو گئی تھی۔ سڈول ران پر دو چھوٹے چھوٹے زخم جیسے دو انگارے بن کر جعفر کے ذہن میں دہکنے لگے۔ اس کا دل چاہا وہ ان زخموں کو بڑے پیار سے سہلائے اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے مندمل ہو جائیں اور پھر گوری ران پر ہلکا سا نشان بھی باقی نہ رہے —— ان کی نگاہیں ملیں اور شکیلا کی آنکھوں میں ایک شرارہ سا چمکا۔ اس نے مسکرا کر جعفر کا ہاتھ تھام لیا اور کہنے لگی۔

"آپ فکر نہ کریں۔ میں اچھی ہو جاؤں گی۔"

اتنے میں محسن دودھ کا گلاس لیے اندر داخل ہوا۔ جعفر نے شکیلا کو شانوں سے پکڑ کر اٹھایا اور گلاس اس کے ہونٹوں سے لگایا۔ وہ اس کی آغوش میں نیم دراز ہو کر چھوٹے چھوٹے گھونٹ لے کر دودھ پینے لگی۔ اس کے مرمریں جسم کی گرمی جعفر کے رگ و پے میں دوڑ گئی تو اس نے شکیلا سے الگ رہنے کے لیے اپنا جسم سکیڑ لیا۔

"میں کل بھی ناچوں گی مسٹر جعفر۔ ماڈرن تھیٹر کے لیے میں جان تک دے سکتی ہوں۔"

شکیلا نے گلاس ہونٹوں سے ہٹا کر کہا۔ جعفر اس کی آنکھوں میں ایک کہانی پڑھ رہا تھا۔ وہ اسے پرے ہٹا کر جلدی سے کھڑا ہو گیا مگر شکیلا نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور جذبات سے مغلوب آواز میں بولی۔

"رات کو آپ یہیں سو جائیں۔ شاید مجھے آپ کی ضرورت پڑے۔ میری طبیعت اچھی نہیں۔"

جعفر نے ہاتھ چھڑا لیا اور دروازے کی طرف جاتے ہوئے بولا۔

"محسن سو جائے گا تمہارے پاس۔"

"محسن!!"

اس نے پلٹ کر محسن کی طرف دیکھا جو چارپائی کی پائنتی خاموش کھڑا تھا اور مسکرانے لگی۔ اس کی آنکھوں میں نہ جانے کیسے آپ ہی آپ ممتا جھلکنے لگی اور جعفر یہ سوچتا ہوا باہر نکل آیا —— شاید لڑکیوں کے دلوں میں پیدائش سے بھی پہلے ممتا کا جذبہ موجود ہوتا ہے۔

ڈاکٹر آیا تو شکیلا نے دروازے ہی سے اسے واپس کر دیا۔ جعفر چپکے سے ڈاکٹر کے ساتھ ہو لیا اور زخموں پر لگانے کے لیے پنسلین مرہم اور پینے کے لیے مکسچر لے آیا۔

اس رات درد کے باوجود شکیلا بار بار دروازے کی طرف دیکھتی رہی لیکن ہر طرف خاموشی چھائی رہی۔ اس کی چارپائی پر چھاتی تو

محسن کمال مسکرا کر کروٹ بدل لیتا اور پھر لمبی سانس چھوڑ کر گھٹنے پیٹ سے لگا لیتا۔

جعفر کی آنکھ اس وقت کھلی جب کئی موٹی موٹی بوندیں اس کے چہرے پر آ گریں۔ اس نے ہڑبڑا کر چھت کی طرف دیکھا۔ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ خیمے پر بوندیں ٹوٹ رہی تھیں کالے کالے بادل ڈراؤنے، چھت کی جھریوں سے بھی نیچے اتر آئے تھے۔

شیرازی ایک طرف بیٹھا چپ چاپ رہا۔ وہ کل کے جلسے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ قریب ہی آئینے کے سامنے بیٹھا جعفر میک اپ کر رہا تھا۔ ہوا کے جھونکے کے ساتھ بوندوں کے یکبارگی چہرے پر پڑنے سے اسے جیسے اطمینان سا ہو رہا تھا۔ کسی جگہ بیٹھ کر ہونے کے باوجود رات بھر وہ بڑا سو نہ سکا تھا مگر بظاہر معلوم ہوتا تھا جیسے گہری نیند سو رہا ہو۔ وہ اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا اور جب تھیٹر کا خیال آتے ہی اتنے اہتمام سے اس کے ناشتے کے بندوبست میں لگ گیا کہ اس کے ساتھ چپ چاپ گفتگو شروع کرنے لگے۔

خیمے کی چھت پر بوندیں ٹپکتی رہی تھیں۔ کبھی کبھی بادل اتنے زور سے گرجتے کہ سٹیج کے تختے تک ہل جاتے۔ جعفر نے دن میں کئی بار بڑے خلوص سے دعا مانگی تھی کہ بارش رک جائے مگر بارش کا زور بڑھتا ہی گیا اور اس وقت وہ پردے کے پیچھے کھڑا دور رات ہی جھری سے تماشائیوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ انھیں گننے لگا —— ایک، دو، تین —— صرف تین ہی آدمی اگلی صف میں بیٹھے تھے۔ اس نے سارے ہال کا جائزہ لیا۔ کل تیرہ تماشائی تھے —— اس نے سوچا ان کے ٹکٹوں کے پیسوں سے تو ایک وقت کا کھانا بھی نہیں چل سکتا۔

شیرازی ونگ میں کھڑا کندھے جھٹک رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ اتنے زور سے گردن کا پٹھا ہموار کرتا کہ ذرا سے دیکھ کر گھبرا جاتا۔ جعفر کو اس حالت میں دیکھ کر شیرازی کو خوف سا آ رہا تھا۔ وہ اس کے پاس آیا اور اسے بازو سے پکڑ کر دوسرے ونگ میں لے جا کر کہنے لگا۔

”جعفر صاحب! یوں پریشان ہونے سے تو کام نہیں چلے گا۔“

”تماشائیوں کی تعداد تو تم دیکھ ہی رہے ہو۔“

جعفر نے مایوسی سے کہا۔

”دیکھ رہا ہوں جی۔ کل بھی تو یہی حال تھا جو کچھ کیسا بھی ہوا تھا۔ لوگوں نے سٹیج پر آ کر ہمیں مبارکباد دی تھی۔ آج بارش کی وجہ سے لوگ نہیں آ سکے تو نہ سہی۔“

”مگر سارا خرچ کیسے پورا ہو گا؟“

”سب ہو جائے گا۔ آپ فکر نہ کریں۔ چچا امداد علی سے لے کر جو روپے خرچ کیے تھے ان میں سے تھوڑے سے باقی ہیں۔ وہ کل کی آمدنی میں سے واپس دے دیں گے۔ جو بچے گا اس سے پنڈی پہنچ جائیں گے۔“

”اچھی بات ہے۔ شو شروع کرا دو۔“

شیرازی کچھ دیر وہیں کھڑا کندھوں کا بوجھ اتارتا رہا پھر دوسرے ونگ سے ہوتا ہوا گرین روم میں چلا گیا۔ محسن منہ لٹکائے ایک طرف بیٹھا تھا۔ ذرا سی دیر پہلے حقہ پینے والے [illegible] آپ میں مشغول تھے۔ شیرازی نے محسن سے پوچھا۔

”وہ کہاں ہے؟“

”کون؟“

"ارے میری تمھاری ـــ شکیلا ـــ اور کون"

شیرازی کا لہجہ ابھی تک تلخ تھا۔

"وہ نہیں آسکے گی"

"کیوں؟"

"اس کی حالت اچھی نہیں۔"

"ارے تو ۔ ۔ ۔ ۔"

شیرازی نے جھنجھلا کر سر کے بال نوچ لیے اور ایک کرسی پر گر کر بڑبڑانے لگا۔

"سب کا بیڑا آج ہی غرق ہونا تھا۔ سالی شکیلا ہی تھا تو نصیب سے مل گئی ہوتی ـــــ اور اس کو دیکھ کر آغا صاحب نکالے پھولے آغا جی دل ہے تو ضرور سمجھے گا ماڈرن تھیٹر کا نام ـــــ سائن فٹ ـــ"

اس نے ڈراما شروع کرادیا اور جعفر کو تلاش کرنے لگا۔ وہ چاہتا تھا جعفر کو تسلی دے یا شاید وہ خود اس بات کا متمنی تھا کہ کوئی اس کی ڈھارس بندھائے۔ جعفر برآمدے میں کھڑا سرِشام پھیلے ہوئے اندھیرے میں سامنے والے مکان کی روشن کھڑکی پر نمایاں دو سایوں کو دیکھ رہا تھا جو ایک دوسرے میں پیوست ہوتے جارہے تھے۔ شیرازی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ دونوں کی نگاہیں ملیں تو ان کے ہونٹوں پہ ایک سی مسکراہٹ آگئی۔ وہ شکیلا کے کمرے کی طرف ہولیے۔

شکیلا بخار کی حالت میں بڑبڑا رہی تھی۔ وہ پریشان ہو کر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ محسن کی حالت بھوکے بچے کی سی تھی جو چھاتی کی طرف بے چینی سے چکر کاٹ رہا تھا۔ جعفر نے اسے اپنے ساتھ لگا کر پیار سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا اور بڑی ہمدردی سے بولا۔

"فکر نہ کرو، شکیلا اچھی ہو جائے گی۔"

محسن اس کی بغل میں سر دے کر سسکیاں لینے لگا۔

جعفر نے آگے بڑھ کر شکیلا کی پیشانی پہ ہاتھ رکھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس نے انگارے کو چھو لیا ہو۔ اس نے گھبرا کر شیرازی کی طرف دیکھا اور شیرازی صرف کندھے جھٹک کر رہ گیا۔ جعفر نے کہا۔

"میرا خیال ہے کل صبح شکیلا کو پنڈی بھیج دیں۔"

شیرازی خاموش رہا۔ پھر چپ چاپ کمرے سے نکل کر گرین روم کی طرف چلا گیا۔

بس پنڈی جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ شکیلا بس کی پشت پر سر ٹیکے نڈھال سی بیٹھی تھی۔ جعفر اور شیرازی ایک طرف اداس کھڑے تھے اور ان کے قریب محسن ایک بنچ پر بیٹھا حسرت بھری نگاہوں سے شکیلا کے مضمحل اور اداس چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ جعفر کی نگاہ اس پر پڑی تو وہ اسے دیکھ کر مغموم ہو گیا۔ اسے خیال آیا ـــــ نہ جانے محسن کے ننھے سے دل میں کیسے کیسے طوفان اٹھ رہے ہوں گے ـــــ اس نے شیرازی کے قریب آکر کہا۔

"شیرازی!"

"جی!"

"محسن کو تسلیمات کے ساتھ بھیج دو۔"

"محسن کو؟"

"ہاں ——— راستے میں ... باتیاں سکھا دو۔"

"ٹھیک ہے۔"

جعفر خوش تھا کہ محسن تسلیمات کے ساتھ پنڈی چلا جائے گا۔ وہ جانتا تھا تسلیمات کی عدم موجودگی میں بات جو محسن کی آنکھوں میں ... کی جھلک میں آگئی تھی۔

شکر ہے بارش نے سب امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ ہوا میں کے بیچ جب لبنوسے کندھوں پر سنبھالے اپنے فن کا ... مال روڈ سے بس کے اڈے کی طرف اتر رہے تھے تو پورش وسطانہ جاری ہو رہی تھی۔ چچا امداد علی موٹل کے برآمدے میں کھڑا تھا۔ ماڈرن تھیٹر کے نام خبہ عانہ ... اس کی جیب میں پڑا تھا مگر اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ وہ جانتا تھا سب ... سر پھرے اور بند نہیں ہوتے۔ بل مانگ کر زخمی دلوں پر نمک پاشی کرنا اس کے نزدیک بڑی ہی حرکت تھی۔

مری میں پیش آنے والے حالات کی تمام تفصیل پر افسوس ہے کہ شاید میں گزر جاتیں۔ ماڈرن تھیٹر پہاڑیوں کے بادل اور گھومنے کر چھا جاتے کر کچھ عرصہ بعد مال روڈ پر رونق ہو جانے سے سب کے دلوں میں شگوفے سے پھوٹنے لگے اور سب نے مل کر افتتاح کا پروگرام مرتب کر ڈالا۔ شیرازی اور تقی سہرے سے چھپے ہوئے دعوتی کارڈ سول اور ملٹری افسروں اور شہر کے باذوق لوگوں میں تقسیم کرتے پھرے۔

ماڈرن تھیٹر کا دفتر نئی نویلی دلہن کی طرح سجا ہوا تھا۔ فرش پر مانگے کے اعلیٰ قالین بچھے ہوئے تھے۔ دیواروں پر جدید ڈراما سے متعلق معلوماتی چارٹ آویزاں تھے۔ جعفر کے گھر سے آئی ہوئی رنگین چوکیاں کرسیاں ... پڑی تھیں اور رنگ برنگے کوشن دیواروں کے ساتھ رکھے ہوئے تھے۔ ساتھ والے کمرے میں تاثیر اور محمود مہمانوں کے لیے مٹھائیاں اور بسکٹ لفافوں میں ڈال رہے تھے ... سے ذرا ہٹ کر بڑے سے دیگچے میں پشاوری قہوہ کے لیے پانی ابل رہا تھا۔ محسن چولہے کے سامنے بیٹھا لکڑیاں کھسکا رہا تھا۔

جعفر نیلے رنگ کی بیری پہنے، دستانوں کا جوڑا ہاتھ میں لیے، سیاہ رجسٹر بازو پر ڈالے شانِ بے نیازی سے داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر چناروں کی سرخی اور آنکھوں میں چڑھتے سورج کی کرنیں جھلملا رہی تھیں۔ وہ بار بار اپنے ہونٹوں کو سکیڑ کر دانہ آنا ... بنا لیتا کہ لبوں کی سرخی بے حد نمایاں ہو جاتی۔ اس نے اندر آکر گردوپیش پر نظر ڈالی۔ جب اس کی نظر فلوٹ ماسٹر پر پڑی تو دستانے اس کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچے۔ وہ کچھ دیر گھورا اس کی طرف دیکھتا رہا۔ فلوٹ ماسٹر کے کانوں میں مرکیاں جھلملا رہی تھیں۔ پھٹی ہوئی شلوار کو چھپانے کے لیے اس نے بیٹھے رہنے کا ... گھٹنوں پر پسیٹ کر رکھا تھا۔ جعفر مرجھا سا گیا اور کٹے ہوئے پتنگ کی طرح ایک چوکی پر گر گیا۔ اس نے شیرازی کو پاس بلا کر انگریزی میں پوچھا۔

"یہ کون ہے؟"

"تاثیر لایا ہے اسے۔ بہتر ہی ہے فلوٹ بھی اچھا بجا لیتا ہے۔"

"وہ سب ٹھیک ہے ——— مگر یہ ہم میں سے نہیں شیرازی۔ ہم جس دنیا کے خواب دیکھ رہے ہیں وہ ... کا باشندہ نہیں۔"

فلوٹ ماسٹر مسکین تھا۔ وہ ان کی گفتگو سن کر چپکے سے اٹھ کر باہر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی جعفر کی نظر
پر پڑی جس کو تالیوں پر رکھ کر فلوٹ ماسٹر بیٹھا ہوا تھا۔ جعفر مسکرا کر اٹھا اور اینٹ باہر پھینک آیا۔ تاثیر کو اس حادثہ کا پتہ چلا تو وہ بھنّاتا ہوا آگیا اور
شیرازی کو جو سٹیج کے پیچھے سے جا کر کہنے لگا۔

"یار یہ جعفر صاحب کی بہت زیادتی ہے۔"

"کیا؟"

"اس نے فلوٹ ماسٹر کو نکال دیا ہے۔ ہارمونیم بجانے والا بھی اس کے ساتھ ہی چلا گیا ہے — سارا پروگرام تباہ ہو جائے گا۔"

"تم فکر نہ کرو جان۔" شیرازی نے اسے پچکارا — "ماڈرن تھیٹر کا وقار تو اونچا رہے گا۔"

تاثیر اس کی بات نہ سمجھ کر غصے کی حالت میں وہاں سے ہٹ کر چولہے کے پاس جا کھڑا ہوا اور ہاتھ پھیلا کر آگ سینکنے لگا —
پروگرام کے وقت شیرازی نے ہارمونیم سنبھال لیا اور محمود طبلے پر ہلکی ہلکی تال دیتا رہا۔ گھریلو ماحول کی اس رنگ برنگی محفل کو دیکھ کر تاثیر کا غصہ جاتا رہا اور وہ سوچنے لگا — اگر اس محفل میں فلوٹ ماسٹر ہوتا تو اس کی موجودگی ایسی ہی ہوتی جیسے سیمنٹ اور چونے سے بنی ہوئی عمارت کی پیشانی پر لگی ہوئی کالی ہنڈیا۔

اور جب سیمنٹ فیکٹری واہ سے آفر آئی تو شیرازی اس دوکاندار کی طرح آلتی پالتی مار کر جم کر بیٹھا جس کا کاروبار چل نکلا ہو۔ اس کے نزدیک ماڈرن تھیٹر کی کامیابی کا دور شروع ہو چکا تھا۔ اس نے فیکٹری والوں کی طرف سے دی گئی رعایات پڑھ کر سنائیں —— رات کا کھانا، آنے جانے کے لیے فری بس اور ڈھائی سو روپے نقد — محمود جو ٹھوڑی ہاتھ پر رکھے بیٹھا تھا بڑی سادگی سے بولا۔

"منظور کر دو جی — ڈھائی سو روپے نقد، اور روٹی کپڑا مفت — برے نہیں۔"

اس وقت پہلی بار لوگوں نے جعفر کو قہقہہ مار کر ہنستے سنا۔

"لیکن وہاں ناچ گانے کے بغیر کام نہیں چلے گا۔"

شیرازی نے کندھے جھٹک کر کہا۔ سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ جعفر گردن جھکائے تھوڑی دیر کچھ سوچتا رہا، پھر پوچھنے لگا۔

"وہ کیوں؟"

"وہاں سب مزدور طبقہ ہے۔"

"تو پھر ان کے لیے بھانڈوں کی ٹولی پکڑ کر کہاں سے لائیں؟"

"اب دیکھ لیں — کوشش کریں تو ناچنے والیوں کا بندوبست ہو سکتا ہے۔"

"کون ہیں وہ؟"

"وہی ہیں۔"

شیرازی اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا جیسے اس نے ساری تفصیل بتا دی ہو۔ جعفر نے ذرا آگے ہو کر کرسی کے ہتھے پر ہاتھ رکھا اور سر جھکا کر پوچھنے لگا۔

"کون — وہ تو نہیں — میری رشکِ قمر؟"

تجربے سے محسوس کرتا۔

"[illegible]"

"ہمیں ۔۔۔ کے لیے ہمارے دل میں جگہ نہیں۔ ہم ۔۔۔ [illegible] قصائی گلی میں بیٹھنا چاہئے"

جعفر نے سنجیدگی سے کہا۔ کافی دیر تک محفل پر سناٹا چھایا رہا۔ جب خاموشی ناگوار گزرنے لگی تو جعفر نے شیرازی سے کہا

"انہیں کھو دینا غلط ہے ۔۔۔ ہم اپنے آپ کو زندگی کے تانے بانے سے سمجھنے لگے کہ حقیقت کا ادراک ہونے لگے ۔۔۔ فکر نہ کرو ۔۔۔ وہ خوش ہو جائیں گے ۔۔۔ ہمارے ملک کا وجود بہت کمزور ہے۔"

ماڈرن تھیٹر کا فرقہ ۔۔۔ تک آباد رہنے لگا۔ پڑوس میں ۔۔۔ دیر تک ۔۔۔ دیکھنے والے ۔۔۔ کے جھوکے سے ۔۔۔ سے اٹھ کر بھاگتے۔ انہیں ملنے بلانے لگتے اور طرح طرح کی حرکتیں کرتے دیکھتے اور پھر آپس میں ایک دوسرے کو دیکھ کر اس طرح ہنس دیتے جیسے ۔۔۔ کے پیچھے بے وقوفوں کے بادشاہ جمع ہوں۔

وہ جانے میں تھوڑے ہی دن باقی تھے جعفر محفل میں سے ٹھیک ٹھاک کھڑا ریہرسل کرنے والوں کو ہدایات دے رہا تھا کہ شیرازی آیا اور جعفر کے پاس جا کر ایک خط نکال کر اسے دیا۔ جعفر نے خط پڑھا اور اسے ایک طرف ڈال کر مضمحل سا ہو کر کرسی پر جھک گیا۔ کافی دیر تک وہ یونہی سر جھکائے کھڑا رہا اور شیرازی دل ہی دل میں ندامت محسوس کرنے لگا کہ اس نے وہ خط لا کر اسے کیوں دیا۔ جعفر نے ایک سانس بھری اور سب سے مخاطب ہو کر بولا۔ "تھیٹر کی دنیا میں ابھی ہم بہت پیچھے ہیں ۔۔۔ سیکرٹری وہاں کا خط آیا ہے لکھا ہے ڈرامیٹک پارٹی کے یہاں آنے کی ضرورت نہیں۔"

"جبار اور وجاہت ابھی اس پروگرام کے لیے کوشش کر رہے ہیں" شیرازی نے وضاحت کی جعفر کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اس نے اس طرح منہ بنایا جیسے اندر ہی اندر کوئی چیز اس کے دل کو کھرچ رہی ہو مگر اس نے جلدی ہی اپنی حالت پر قابو پا لیا اور پیشانی ایک ہاتھ میں تھام کر آنکھیں بند کر لیں۔ سب کے چہرے لٹک گئے۔ ڈرامیٹک پارٹی میں اور دورے کے درمیان دیوار بن کر حائل ہو گئی ۔۔۔ انہیں یقین تھا اب وہ ۔۔۔ [illegible] جانے کے لیے کوئی بس ۔۔۔ تھیٹر کے دروازے پر نہیں رکے گی۔ سب ریہرسل چھوڑ کر سانس روکے جعفر کی طرف دیکھ رہے تھے شیرازی نے زور زور سے کندھے جھٹکائے اور آنکھیں زور سے بند کر کے پانی کے دو قطرے ٹپکا کر آہستہ سے کہا۔

"چچا امداد علی کا بل ابھی باقی ہے کہیں وہ بھی نادہندگی نہ کر لے۔"

جعفر نے بنو ماس کی طرف دیکھا اور ایک ہاتھ سے پیشانی رگڑنے لگا۔ وہ دیر تک تذبذب کے عالم میں کھڑا رہا پھر بچے کے سے انداز میں بولا۔

"جاؤ شیرازی ان قصائی گلی والیوں کو لے آؤ۔"

"قصائی گلی والیوں کو؟" شیرازی نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہاں شیرازی عزت کا سوال ہے۔"

شیرازی نے غور سے جعفر کی طرف دیکھا۔ وہ اس طرح کھڑا تھا جیسے شکست خوردہ پورس سکندر کے دربار میں کھڑا ہو۔

مغرب کی ہواؤں میں

عنایت اللہ

آنکھ کھلی تو شام کے پانچ بج رہے تھے۔ زیادہ سو لیا تھا یا بھونڈے سے ایک خواب کا اثر تھا کہ مزاج اکھڑا اکھڑا سا محسوس ہوا۔ اعصاب بھی تھکے تھکے سے لگے۔ میں نے اٹھ کر سمندر کی طرف کھلنے والی کھڑکی کھولی تو ہوا کے تیز جھونکوں نے میری پیشانی پر پڑے ہوئے بالوں کو بڑے پیار سے پیچھے کر دیا۔ ان مرطوب اور خنک جھونکوں نے جیسے روٹھے ہوئے بچے کو بہلا لیا ہو۔ سمندر دنیا کے رنج و غم دھو ڈالتا ہے۔ میں نے آنکھیں بند کر دیں یا آنکھیں قرار پا کے خود ہی بند ہو گئیں۔ نیند اور خواب کے اثر کو سمندری ہوا نے دھو ڈالا۔ کمرے میں چائے کی پیالیوں کی ہلکی ہلکی ٹن ٹن کی لطیف سی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میری آنکھیں کھل گئیں۔ میرے سامنے کلفٹن کا ساحل دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ ساون کے گھنے بادلوں کے سائے تیزی سے سمندر کی سطح پر تیرتے ریت پر پھسلتے ہوٹل کے اوپر سے گزرتے جا رہے تھے۔ موجیں بڑھتی چلی آ رہی تھیں۔ ساحل کو چوم چوم کر موجیں ٹوٹ رہی تھیں۔ لوٹ رہی تھیں پھر آنے کے لیے۔ سورج سمندر میں ایستادہ چٹان پر بیٹھا ریت اور پانی کے اس کھیل کو مسکراتی ہوئی الوداعی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ سورج کی بجھتی ہوئی آخری کرنوں کی زرد روشنی کو میں جسم کے انگ انگ میں محسوس کر رہا تھا۔ اس تپش میں بھی روح افزا رنگ تھا۔

کمرے میں پیالیوں کا ترنم، "صاحب! چلیے" کے مانوس الفاظ اور بیرے کے کمرے میں سے نکلنے کی آہٹ ذرا سی دیر کے لیے گونج کر خاموش ہو چکی تھی اور میری نگاہیں کلفٹن کے ساحل پر بکھرے ہوئے انسانوں کے ساتھ کھیل رہی تھیں۔ ساتھ والے مزار کے گنبد سے کبوتروں کا غول بے ہنگم پھڑپھڑاہٹ سے اڑا۔ ذرا اوپر اٹھا اور زمین کی طرف آنے لگا۔ میری نظروں نے اس غول کے تعاقب میں زمین کی طرف دیکھا۔ کبوتروں نے زمین پر اترنے کے لیے تولے ہوئے پروں کو پھر جنبش دی جیسے ڈر گئے ہوں اور غول پھر ہوا میں بلند ہو گیا لیکن میری نگاہیں زمین سے اٹھ نہ سکیں۔ دو گھوڑے مستانہ خرام جا رہے تھے۔ ایک پر ایک ادھیڑ عمر آدمی سوار تھا۔ سر کے بال سفید ہو چکے تھے پر ایک گونہ وقار اور بیٹھنے کے انداز میں بھی جلال تھا۔ دوسرا سوار ایک نوجوان لڑکی تھی۔ اس نے پتلون پہن رکھی تھی۔ تنگ قمیص اس کے جسم کے نپے تلے نشیب و فراز کو بے نقاب کر رہی تھی۔ بھورے رنگ کے کٹے ہوئے بال مغرب کی خنک ہواؤں سے کھیل رہے تھے۔ سپیدی مائل گلابی چہرے کی گولائی اور مرمریں گردن کا خم حسن و صحت کے بل کھا رہا تھا۔ گھوڑے کی پیٹھ پر لڑکی کا اٹھتا ہوا جسم جیسے جھیل کی چھوٹی چھوٹی لہروں پر کنول کا پھول تیر رہا ہو۔ گھوڑے میرے ہوٹل سے تھوڑی ہی دور جا رہے تھے۔ میں منظر کی دلکشی میں ضرورت سے زیادہ جذب ہونے لگا تھا کہ کمرے میں پاؤں کی آہٹ سنائی دی جو بڑھتے بڑھتے میرے کندھے پر ایک بے تکلفانہ تھپکی پر آ ختم ہوئی اور ساتھ ہی ایک مانوس سا ہیلو ہیلو

کہ جس سے میری پریشانی کا آغاز ہوا کرتا تھا۔ میں نے غور کر دیکھا حفیظ باہر جانے کے لیے تیار ہو کر آیا تھا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے معلوم ہوتا ہے ابھی ابھی سو کر اٹھے ہو۔۔۔" حفیظ نے نہایت شگفتہ انداز سے کہا۔۔۔ "اور ابھی تک بھی رکھی ہوئی ہے"

میں نے حفیظ کو جواب دینے سے پہلے ایک بار پھر غور سے دیکھا اور میرا دل بیٹھ سا گیا۔ مجھے زندگی میں پہلی بار حفیظ پر غصہ آیا۔ وہ دو گھوڑے [illegible] وارث میں جب بچے تھے۔ میں نے انھیں خلاف توقع تیار کیا تھا [illegible] تو آج [illegible] تھے حفیظ جانے کیا کچھ کہہ رہا تھا اور وہ غالباً کمرے میں ادھر ادھر ٹہل بھی رہا تھا۔ میری نگاہوں نے گھوڑوں کو تلاش کر ہی لیا۔ کمرے کا ماحول تیزی سے بدلتا جا رہا تھا اور وہ [illegible] گیا تھا کہ اب سمندر کے نزدیک ساحل پر جا رہا تھا۔

"یہ سب کچھ کیا ہے تمھیں؟" حفیظ نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں، وہ۔۔ گھوڑے۔۔"

حفیظ چاہتے کی پیالی اٹھا کر میرے قریب آ کھڑا ہوا۔ میں نے ساحل کی طرف دیکھا تو اس کے چہرے پر اس قسم کی مسکراہٹ پھیل گئی جس نے مجھے ایک نئی کہانی کا نقطۂ آغاز بتا دیا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ تم نے اب پہلی بار دیکھا ہے"

"ہاں، وہ بھی دور سے دیکھے تھے۔"

"تو کل قریب سے دکھا دوں گا۔"

یہ معلوم کر کے مجھے مسرت سی ہوئی کہ حفیظ ان دونوں کو جانتا ہی نہیں بلکہ ان کے ساتھ راہ و رسم بھی پیدا کر چکا ہے۔

"یہ باپ بیٹی ہیں کیا؟" میں نے پوچھا۔

"باپ بیٹی نہیں۔۔۔" حفیظ نے مجھے مسکراتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "میاں بیوی!"

"میاں بیوی؟" یوں لگا جیسے مغرب کی ہواؤں کی تندی بڑھ گئی ہے اور کمرہ گرم ہو گیا ہے۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا لیکن حفیظ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا یقین کرنا ہی پڑا۔

گھوڑے بہت دور ساحل پر جا رہے تھے۔ کچھ تو مزار کے گنبد پر مڑ چکے تھے اور میرے ہاتھوں کے حصے اڑ رہے تھے۔

"لڑکی کی عمر مشکل بائیس برس ہو گی اور خاوند نصف صدی سے زیادہ جی چکا ہے۔۔۔۔" حفیظ کہہ رہا تھا۔ "وہ میڈیکل سروس کا ریٹائرڈ کرنل ہے۔ آدمی خوب ہے اور لڑکی بہت تیز ہے۔ بڑی سوشل ہے لیکن قدرے ریزرو۔ بہرحال میرے ساتھ خاصی کھل گئی ہے۔"

حفیظ کے "کھل جانے" کی اصطلاح کو میں خوب سمجھتا تھا۔ عجیب زندہ دل انسان تھا۔ طبیعت میں بلا کی شگفتگی اور رنگ و خیال میں جاذبیت، چہرہ ہر وقت روح افزا مسکراہٹ کی طرح کھلا رہتا تھا اور پیانو پر اس کی انگلیاں یوں چلتی تھیں جیسے ندی کا پانی چھوٹے چھوٹے پتھروں میں سے گزر رہا ہو۔ کون تھا جو پہلی ہی ملاقات میں حفیظ سے نہ کھل جاتا تھا۔ اس لڑکی کا حفیظ کے ساتھ بے تکلف ہو جانا میرے لیے حیران کن نہ تھا لیکن میں ایک جانے پہچانے خدشے کے خیال سے قدرے پریشان سا ہوا۔ بڑھاپے اور شباب کا یہ ملاپ بجائے خود حزنیہ تھا اور ان دونوں کے درمیان حفیظ جیسی متناطیسی جوانی کے آ جانے میں مجھے معاشرے کی بسا اوقات سچی ہوتی کہانی کا پس منظر دکھائی دینے لگا۔ وہی طلب

ہو کر واپس چلی جاتی ہیں۔ اسی طرح ایک مرتبہ گوری سنتے چلے آئے ہیں اور شاید سنتے ہی چلے جائیں گے۔

"ارے نہیں یار!...." حفیظ نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا: "ایسی کوئی بات نہیں۔ لڑکی اس خاوند پر دل و جان سے فدا ہے۔ یہ نہ سمجھو کہ جلد ہی مر جائے گا۔ یہ تو محض ہم نے ذرا سی چاشنی پیدا کرنے کا بہانہ ہے کہ میں نے لڑکی سے راہ و رسم پیدا کر لی ہے۔ کہانی کی ہیروئن ہے وہ، معروف ہیں اور منفرد ہی کیا ہے۔...." حفیظ پر شاعرانہ سی کیفیت طاری ہونے لگی۔ "واللہ! ساون کے ان بوجھل بادلوں کی چھاؤں میں قہقہے لگاتے ہوئے سمندر کے کنارے روحی کی دلگداز مسکراہٹیں اور شوخیاں...... سبحان اللہ!"

اس کا نام روحی تھا۔

دو ہی روز بعد ساحل کے ساتھ ساتھ، ہر شام، چار گھوڑے جا رہے تھے۔ آگے آگے روحی اور حفیظ کا اور پیچھے پیچھے میرا اور کرنل کا۔ حفیظ نے دو گھوڑے، ایک اپنے لیے اور ایک میرے لیے، پورے ڈیڑھ ماہ کے لیے کرایے پر لے رکھے تھے۔ پہلی ملاقات میں ہی ہم نے کرنل اور روحی کے متعلق تمام تر تفصیلات معلوم کر لیں۔ وہ بھی یہاں ہماری طرح چھٹیاں گزارنے آئے ہوئے تھے۔ میں نے جونہی کرنل کو بتایا کہ میں بھی حفیظ کے ساتھ سول ایوی ایشن کا سیکنڈ پائلٹ ہوں تو اس نے بے ساختگی سے پوچھا: "تو پھر آپ فرانس کئی بار گئے ہوں گے؟"

بظاہر یہ ضمنی یا سرسری قسم کا سوال معلوم ہوتا تھا لیکن میں نے کرنل کے چہرے کا جائزہ لیا تو میں نے اس کے تاثر میں نمایاں تبدیلی دیکھی جس سے صاف پتہ چلتا تھا کہ فرانس کے ساتھ کرنل کی گہری وابستگی ہے جسے دلچسپی بھی کہا جا سکتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ کسی حادثے کی تلخ یادوں نے انگڑائی لی ہو۔ اس شام بات آئی گئی ہو گئی۔ حفیظ اور روحی واپس آ رہے تھے۔ ہم چاروں اکٹھے واپس لوٹے۔ مزار کے پاس پہنچ کر ہم نے کرنل اور روحی کو الوداعی سلام کہا۔ میں نے ان دونوں کی مسکراہٹوں کو بغور دیکھا۔ کرنل کی مسکراہٹ میں بے ساختگی، محبت اور خلوص کی جھلک نمایاں تھی اور روحی کی مسکراہٹ میں چلبلا پن، دلکشی اور رسمی قسم کا تصنع تھا لیکن مسکراہٹ حفیظ کے الفاظ میں یقیناً جانفزا تھی۔ روحی کی آنکھوں میں میں نے ایسی چمک دیکھی جس میں شباب کی قیامت خیزیاں بیدار ہونے سے پہلے کی انگڑائیاں لے رہی تھیں۔ ہم دونوں ان دونوں کو جاتا ہوا دیکھتے رہے۔ ذرا دور جا کر روحی نے پیچھے دیکھا اور بازو اوپر کر کے ہاتھ ہلا کر پھر الوداع کہی جس کا جواب حفیظ نے پرجوش طریقے سے بازو ہلا کر دیا۔

"کرنل کچھ کہتا تھا؟" حفیظ نے مجھ سے پوچھا: "یعنی میرے اور روحی کے متعلق؟"

"نہیں تو!" میں نے جواب دیا: "وہ زیادہ دیر اپنے اور میرے متعلق باتیں کرتا رہا تھا۔"

پھر ہر شام ہم چاروں ساحل پر جانے لگے۔ ہم بہت دور تک چلے جایا کرتے تھے۔ ترتیب وہی ہوتی تھی — آگے آگے روحی اور حفیظ اور پیچھے پیچھے کرنل اور میں۔

حفیظ اور روحی جس قدر آپس میں گھل مل ہوتے جا رہے تھے میں تقریباً اسی قدر کرنل کی باوقار سنجیدگی اور پُرجلال زندہ دلی میں محو ہونے لگ گیا۔ اس کے سفید بالوں، نیلی آنکھوں اور سپیدی مائل گندمی چہرے پر چھائے ہوئے پچاس برسوں کے نقوش میں ایک خاص کشش تھی۔ اس کی باتوں اور لب و لہجے میں زندگی کا رچاؤ ابھی تک جوان تھا لیکن روحی کی موجودگی میں کرنل عمر سے زیادہ بوڑھا دکھائی دیتا تھا۔ روحی حسین تو تھی ہی لیکن کرنل کے ساتھ رہتا ہے میں وہ بہت ہی حسین اور بچوں کی طرح معصوم دکھائی دیتی تھی۔ کرنل کے ساتھ وہ یوں باتیں کرتی تھی جیسے اسے

معلوم ہی نہیں کہ وہ نوبیاہتا دوشیزہ ہے اور اس کا خاوند جوانی کے برسوں گزر کے بڑھاپے کی بھینٹ چڑھ چکا ہے یا شاید روحی کو معلوم ہی نہ تھا کہ وہ اس کی بیوی ہے۔ وہ اسے بھولی اور بے خبر سمجھتی تھی۔ بےشک وہ شب روحی کرنل کو چاہتی تھی۔

بعض اوقات جب وہ حفیظ کے ساتھ ساتھ گھوڑے پر سوار ہو کے بہت دور تک نکل جاتی تھی تو گھوم کر پیچھے دیکھتی تھی — گھوڑے کو دوڑا کر کرنل کے قریب آ سکتی تھی وہ بچوں کی طرح کرنل کے بازو کو کھینچ کر کہتی ——— "آپ تو اتنی دور رہ جاتے ہیں۔ ساتھ رہتے نا" ——— ایسے میں وہ نفس کی پیاس کی بجھی دکھائی دیتی تھی اور کرنل کا پیار سے عجیب انداز ——— روحی کا ہاتھ تھام کر یا اس کے بالوں کو سہلا کر کہنا: "تم چلو روحی! ہم آ رہے ہیں۔"

"دیکھو حفیظ! روحی کا آپس میں اس قدر گھل مل جانا!" ..... ایک شام میں نے روحی کو اسی طرح کرنل کے بازو کے ساتھ چپکے ہوئے دیکھا تو چاہا کہ انھیں تنہا چھوڑ دوں اور حفیظ سے جا ملوں اور اسے کہوں ——— "حفیظ! روحی جوان نہیں رہ گئی ہے۔ جانے کون سی جنس کی تشنگی نے اسے کرنل کے بڑھاپے میں دھکیلا ہے۔ وہ اس کے محاسن سے پہلے تک کبھی سستانا چاہتی ہے۔ اگر وہ بچی نہیں تو کرنل بھی بوڑھا نہیں۔ آؤ حفیظ! ہم ان کی دنیا سے نکل چلیں۔ ان دونوں نے اپنی دنیا پیار سے سجالی ہے۔ کرنل بوڑھا ہی سہی اس کی روح جوان ہے حفیظ! ——— روحی سے بھی جوان ——— جسم جوان ہو کر بوڑھا ہوتا ہے، یہ جسم کی ٹریجیڈی ہے اور روح بوڑھی ہو کر جوان ہوتی ہے، یہ روح کی کامیڈی ہے ——— روحی کو کرنل کی روح سے عشق ہو گیا ہے۔ کرنل کی بے غم گردن اور کندھوں کی سیدھائی میں ایک روح ابھی تک زندہ ہے جو لمحہ لمحہ جوان ہوتا جا رہا ہے۔ روحی اس پر روح پھونک رہی ہے۔ حفیظ! آؤ، کہیں ایسا نہ ہو کہ ......" لیکن حفیظ مجھ سے بیس پچیس قدم دور تھا اور روحی کا گھوڑا اسے اور کرنل کو اکیلا چھوڑ کر پھر حفیظ کی طرف بھاگا جا رہا تھا۔

"روحی نے میری مرجھائی ہوئی روح کو زندہ کر دیا ہے۔ ...." کرنل نے روحی کی طرف دیکھ کر جذبات سے بھرپور لہجے میں کہا "میرے سینے میں ابھی تک دوسری جنگِ عظیم کی توپیں گرج رہی ہیں۔ میرے دماغ میں ابھی تک بمبار جہازوں کے ہیبت ناک غول آباد بستیوں پر بم برسا برسا کر انسانی زندگی کو ملبے گرد اور سیاہ دھوئیں میں دفن کر رہے ہیں۔ ابھی تک میرے دماغ میں زلزلے بپا کیے ہوئے ہیں۔ میری روح ابھی تک مشین گنوں کی آتش باری سے لرز رہی ہے۔ میرے اعصاب ٹوٹ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو چکے تھے۔ میں فوج میں ڈاکٹر تھا۔ میں زخمیوں کے کیمپوں اور ہسپتالوں میں شبانہ روز موت کے ساتھ سینہ سپر رہا ہوں۔ میں نے سینکڑوں کو موت کے منہ سے کھینچا ہے لیکن ان میں سے اکثر کا ایک آدھ بازو یا ٹانگ موت کے منہ میں ہی رہ گئی۔ ہزاروں تھے جو میرے سامنے میری ہزار کوششوں کے باوجود مر گئے۔ جنگ ختم ہونے کے پانچ برس بعد تک میں ذہن اور روح سے خون کے دھبے نہ دھو سکا۔ میری تنہا راتوں میں زخمی کراہتے رہتے تھے۔ جنگ کی ہیبت ناکیاں مجھے جوانی میں ہی بوڑھا کر چکی تھیں اور میں دنیا کی گہما گہمی سے کنارہ کش ہوتا جا رہا تھا۔ میں ملازمت سے ریٹائر ہو گیا اور پرائیویٹ پریکٹس شروع کر دی۔ میں نے انسانوں کی خدمت میں دن رات کا چین صرف کر ڈالا۔ میں ہر لمحہ مرض اور موت سے نبرد آزما رہا۔ میں نے ہر لمحہ ہر جگہ سکون تلاش کیا، سکون کہیں نہ ملا۔ توپوں کی گرج اور زخمیوں کی آہ و بکا میرے سینے میں بڑھتی ہی گئی۔ ایک روز روحی میرے پاس سر درد کے علاج کے لیے آئی تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے تمام درد ختم ہونے لگے ہیں۔ وہ کئی بار میرے پاس آئی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ آتی رہے۔ وہ آتی رہی اور ایک دن وہ میری زندگی میں داخل ہو گئی۔ میرے سکڑے ہوئے اعصاب ٹھکانے پر آنے لگے۔ اب یوں لگتا ہے جیسے میں نے اپنے آپ سے سمجھوتہ کر لیا ہے۔ گو اب بھی جنگ کے ہولناک مناظر مجھے کبھی کبھی پریشان کرتے ہیں لیکن

میں بیدی کی معصومیت سے گنگنا اٹھی ہیں، انسان کی بربریت کو بھول جاتا ہوں......"

میں کرنل کی باتوں میں جذب ہو گیا تھا۔ گھوڑے آہستہ آہستہ چلے جا رہے تھے۔ ہوائیں بہت تیز چل رہی تھیں۔ روحی اور حفیظ ہم سے بہت دور آگے چلے جا رہے تھے۔ کرنل کا لہجہ کسی قدر درد آلود تھا اور ہونٹوں پر زیر لب تبسم جس میں جانے کتنی ہی لاشوں کی ہچکیاں سسکیاں سمائی ہوئی تھیں۔ کرنل کے لہجے میں درد کی آمیزش زیادہ ہو گئی۔ وہ مجھے جنگ کی ہولناکیوں کے قصے سنا رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ دوسری جنگ عظیم پرانی بات ہو گئی ہے اور دنیا اب ایک اور جنگ کی تیاریاں مکمل کر چکی ہے۔ لاشیں گل سڑ گئی ہیں اور ان پر گری ہوئی عمارتوں کی جگہ نئی عمارتیں تعمیر ہو چکی ہیں، ایک بار پھر گرنے کے لیے۔ جو فوجی اس جنگ کی بھینٹ چڑھ گئے تھے اب ان کے بیٹے فوج میں بھرتی ہو گئے ہیں ایک اور جنگ کی بھینٹ چڑھنے کو۔ مصر اور یونان کے دیوتا پھر زندہ ہو گئے ہیں اور انسانوں کا خون مانگ رہے ہیں۔ کرنل کو معلوم تھا کہ وہ کوئی نئی بات نہیں سنا رہا لیکن اس کے سنانے کا انداز یقیناً نیا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے ذہن میں جنگ ابھی تک ختم نہیں ہوئی۔

ایک طویل روداد سناتے سناتے اس نے کہا ـــ "انسان نے انسان کو کس طرح مارا! ہر طریقے سے۔ کس طرح کاٹا، قصاب کی طرح۔ وہ جانتا تھا کہ وہ خود بھی کٹنے والا ہے، وہ کٹنے سے پہلے اپنی موت کا انتقام لے رہا تھا لیکن فرانسیسیوں نے جس طرح جرمنوں کو مارا ...." کرنل چپ ہو گیا۔ اس کے جسم نے جھرجھری لی۔

اس نے بتایا کہ فرانس کو جرمنی کے چنگل سے چھڑا کر جب اتحادی فوجیں وہاں پہنچیں تو وہ بھی ایک یونٹ کے ساتھ وہاں گیا۔ فرانس کے باشندوں نے اسے بتایا کہ ـــ جرمن افسر فرانسیسیوں کے ساتھ ان کی کوٹھیوں اور بنگلوں میں رہتے تھے اور وہاں ہر طرح کی عیاشی اور حکومت کرتے تھے۔ فرانسیسیوں نے کئی جرمن افسروں کو قتل کیا اور خود گولی کا نشانہ بن گئے۔ آخر کسی فرانسیسی نے قتل کا عجیب و غریب طریقہ ایجاد کیا۔ وہ اس طرح کہ وہاں اکثر مکانوں کی سیڑھیاں ماربل یا اچھی قسم کے پتھروں یا لکڑی کی بنی ہوئی ہیں۔ اوپر سے پہلی یا دوسری سیڑھی پر صابن مل دیا جاتا تھا اور نیچے ایک آدمی موٹا سا ڈنڈا لے کے چھپ جاتا تھا۔ جب جرمن افسر سیڑھیوں پر چڑھتا یا اترتا تھا تو اس کا پاؤں پھسل جاتا تھا اور وہ بُری طرح لڑھکتا ہوا نیچے آ رہتا تھا۔ بیشتر اس کے کہ وہ سنبھل سکے ڈنڈا اس کے سر کے نازک حصے پر پڑتا تھا۔ گرنے والا کچھ تو چوٹ سے اور زیادہ تر اچانک صدمے سے مر جاتا تھا اور فوجی پولیس اسے "سیڑھیوں سے گر کر مرنے" کا حادثہ کہہ کر خاموش ہو جاتی تھی۔ یہ طریقہ سینہ بہ سینہ مقبول عام ہو گیا اور کئی قصبوں اور شہروں میں ایسے حادثے ہوئے۔ کسی کو بھی شک نہ ہوا کہ اصل ماجرا کیا ہے۔ اتنے میں جرمن فوجیں پسپا ہو گئیں اور فرانسیسیوں کا راز راز ہی رہا۔"

"کسی کو جان سے مارنے کا یہ طریقہ نہایت کامیاب ہے......" کرنل ذرا سا خاموش رہ کر بولا "آدمی مر جاتا ہے اور کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا کہ یہ قتل ہے۔ لیکن یہ بے حد بہیمانہ اور سفاکانہ طریقہ ہے۔ میں نے ہمیشہ جنگ کی بربریت کو بھولنے کی کوشش کی ہے اور بہت کچھ بھول بھی گیا ہوں لیکن اس طریقۂ قتل کو نہیں بھول سکا...... سیڑھی پر ذرا سا صابن چپکا دیا..... اُف خدایا! اور ایک انسان کی زندگی ختم، صابن کے بلبلے کی طرح......" اس پر شاید رقت طاری ہو گئی تھی۔ وہ کچھ دیر گم سم رہا۔

روحی اور حفیظ واپس آ رہے تھے۔ میں نے باتوں کا رخ بدلنا چاہا تاکہ کرنل کی مزاجی کیفیت سنبھل جائے لیکن روحی کو آتا دیکھ کر ہی اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ وہ ذرا سا مسکرایا اور کہنے لگا ـــ "میں نے ایک بار روحی کو یہی بات سنائی تو وہ اس قدر خوفزدہ ہوئی کہ مجھے کہنے لگی 'خدارا ایسی ڈراؤنی باتیں مجھے نہ سنایا کریں'..... بڑی معصوم لڑکی ہے۔ کاش میں اس قدر بوڑھا نہ ہوتا۔ لیکن، روحی نے کبھی اسے محسوس

کھنچی ہوئی مسکراہٹیں، پنسل سے کھینچے ہوئے ابروؤں کی کمانیں، سینٹ کی بھینی بھینی خوشبو، آنکھوں میں دوڑتے ہوئے گلابی ڈورے۔ شوخ چوڑیوں میں چھپے ہوئے مردوں کی ہلکی ہلکی سی ہنسی۔ رنگ برنگ کے لباس زیب تن کئے جوان اور ادھیڑ عمر کی عورتیں جنہوں نے اپنے جسموں کے بالائی حصے زیادہ سے زیادہ برہنہ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کر رکھی تھی۔ ادھر کسی کے جوڑے میں مسکراتا ہوا پھول، ادھر کسی کے ماتھے پر کنڈلی مارے ہوئے زلفوں کی لٹ۔ سورج مکھی کو یوں محسوس ہوا جیسے سامنے ایک سفید جھومتے ہیں اور مستقبل ایک حرفِ باطل۔ دفعتاً نغمہ ساز کی ایک لہر اٹھی۔ مرد عورتوں کے جوڑے ساز کی سنگت میں لکڑی کے صاف ستھرے فرش پر رقص کرنے لگے۔ پیانو نواز کی انگلیاں کمال پھرتی سے پیانو کے پردوں پر ناچیں۔ کلیرونٹ کی آواز فضا کو چیر کر پیانو کے سُر سے بھڑ گئی۔ ادھر سمبلز نے سماعت کو جکڑ لیا۔ سیکسافون کی آواز تڑپ تڑپ کر رقص کی جان بن گئی۔ طبل نواز نے تھپ دے کر رقص کو نقطۂ عروج پر پہنچا دیا۔ بھرپور زندگی کے ساگر میں طوفان آ گیا۔ چمکتے ہوئے سیاہ جوتے اور اونچی ایڑی کی سینڈلیں فرش کے سینے پر تیزی سے گردش کرنے لگیں۔ کسی نے سورج مکھی کے انگ انگ جھنجھوڑ کر بیدار کر دیا۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے موت کبھی بھی اس کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹا نہیں سکتی۔ اب وہ سمٹ کر بیٹھا یہ قطرہ نہیں بن سکتی۔ اب اس نے توانائی کا راز پا لیا ہے۔ اب وہ جی سکتی ہے۔ خوش رہ سکتی ہے۔ مسکرا سکتی ہے۔ وہ سوچنے لگی رخشندہ کتنی اچھی ہے۔ اس نے تو پہلے بھی کئی بار اسے "فلور شو" کی دعوت دی تھی مگر ہر مرتبہ وہ کسی نہ کسی بہانے کی آڑ لے کر کنی کاٹ جاتی۔ لیکن آج شام جیسے وہ زندگی کے ڈھرے سے ہٹ کر چلنے کے لیے تیار بیٹھی تھی۔ کسی اچانک تبدیلی کی راہ تک رہی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ بغیر کسی پس و پیش کے رخشندہ اور آفتاب کے ہمراہ ہو لی۔ تاکہ سفید دیواروں والے کمرے کی اداس تنہائیوں سے نکل کر زندگی کی رونق اور گہما گہمی کو دیکھ سکے۔ سن سکے۔ محسوس کر سکے۔ آرکیسٹرا ایک دلکش ترنمی انداز میں جھنجھناتا ہوا آہستہ آہستہ ڈوبتی لہروں کا روپ دھار کر خاموش ہو گیا۔ رقص کرنے والوں کے قدم رک گئے۔ دیکھنے والوں نے تالیاں بجا بجا کر داد دی۔ طبل نواز نے جیب میں سے رومال نکال کر اپنے ماتھے پر سے پسینہ پونچھا۔ میزوں پر پھر سے جام کھنکنے لگے۔ رخشندہ نے سرخ کوٹ اتار کر کرسی کی پشت پر ڈال دیا۔

"سورج مکھی!" رخشندہ بیئر کے دو چار بڑے بڑے گھونٹ اوپر تلے پینے کے بعد بولی۔

"یس ڈارلنگ" سورج مکھی متوجہ ہوئی۔

"آفتاب پاگل ہے!"

سورج مکھی نے غور سے آفتاب کی طرف دیکھا۔ کھلتا ہوا رنگ۔ گھنگھریالے بال۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں۔ وہ نہایت سلیقے سے بیئر پی رہا تھا۔ اس کی نگاہیں میز پر گڑی ہوئی تھیں۔ اس کی کشادہ پیشانی پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں ابھر آئی تھیں۔ آفتاب کو وہ پہلے بھی دو چار مرتبہ مل چکی تھی۔ یونہی رسمی طور پر، سرسری انداز میں۔ "آپ سے مل کر خوشی ہوئی" ٹھنڈا اور بے جان فقرہ دہراتے ہوئے۔ لیکن اتنا وہ جانتی تھی کہ آفتاب انگریزی کا پروفیسر ہے۔ ایک مرتبہ اسے رخشندہ نے بتایا تھا کہ آفتاب نے ہیملٹ کا پورا ڈرامہ حفظ کر رکھا ہے۔ اور ایک دفعہ کلاس میں ہیملٹ کی خود کلامی دہراتے ہوئے اس پر عجیب کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ اس کے چہرے سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ اس کے منہ سے جھاگ اڑ رہے تھے۔ الفاظ کے سوز و گداز

میں ڈوب کر وہ اپنے آپ کو بھول گیا تھا۔ اس کے بعد وہ ایک عرصے تک بیمار رہا تھا۔

"سورج مکھی، میں بغیر کسی تمہید کے سارا قصہ چار لفظوں میں سنا دیتی ہوں" رخشندہ نے بہکتے ہوئے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ "اگر میں آج صبح آفتاب کا دیوان نہ دیکھ لیتی تو شاید کسی کو پتہ بھی نہ چلتا کہ وہ تم سے محبت کرتا ہے۔ اس نے تمہاری نیلی آنکھوں، تمہارے چہرے اور رخسار کے کالے تل پر سینکڑوں اشعار......"

"رخشندہ پلیز!" آفتاب اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"اچھا اب میں کچھ نہیں کہوں گی" رخشندہ چہکتے ہوئے بولی۔

آفتاب چپ چاپ بیٹھ گیا۔

سورج مکھی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ موتیوں کی لڑی ایسے دانت چمکے۔ نیلی جھیلوں میں چھائے ہوئے نشے کے بادل چھٹے۔ ہونٹوں کی سرخ کلیاں کھل کھل گئیں۔

قریب بیٹھے ہوئے افراد گھور گھور کر آفتاب کی طرف دیکھنے لگے۔

یکایک کیبرے شروع ہونے کا اعلان ہوا۔ برقی قمقموں نے آنکھیں میچ لیں۔ موسیقی کی ہم آہنگی میں ایک نیم برہنہ عورت تھرکتی، ناچتی، مسکراہٹوں کے پھول برساتی، بیچ میزوں کے پہنچ کر رک گئی۔ فلڈ لائٹ کی زد میں آ کر وہ سیکوئنس پلیٹے جو اس کے بدن پر نہایت بے دلی سے ٹنکے ہوئے تھے، جگ مگ جگ مگ کرنے لگے۔ معاً وہ بجلی کی طرح کوندی۔ سپاٹ لائٹ کی سرخی میں اس کے بدن کے تھرتھراتے ہوئے خطوط نے عجب تندی سے للکارا۔ شراب آلود آنکھوں کی پکار گونجی۔ ہونٹوں کے دہکتے ہوئے سرخ انگاروں نے آواز دی۔ اور پھر آن کی آن میں اس کے مرمریں بدن نے ہوا میں لہریے بنا کر تماشائیوں کا لہو گرما دیا۔

جذبات کی اس ہلچل میں شریک ہو کر سورج مکھی نے اپنے دونوں ہاتھ میز پر پھیلا دیئے۔ اس سانس لیتے ہوئے اندھیرے میں وہ سوچنے لگی کہ اگر اتفاق سے کسی کا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھو جائے تو.........

وہ رات لاگوس کی تمام دلفریبیاں اپنے آنچل میں چھپا کر ماضی کے دھندلکے میں گم ہو گئی۔ سورج مکھی کو لمحہ بہ لمحہ احساس ہونے لگا جیسے اب وہ اس دنیا میں تنہا نہیں۔ اس کی ذات پر چھائے ہوئے وہ ابتدائی رنگ کسی کو شعر کہنے پر اکسا سکتے ہیں۔ وہ آمد کا سرچشمہ و منبع بن سکتی ہے۔ اُسے مسٹر اینتھونی کی باتیں یاد آنے لگیں۔ ان باتوں کی کوکھ سے لاگوس کی سنہری لکیریں ابھر کر حال کی پگڈنڈیوں پر پھیل گئیں۔

دوسرے دن وہ خود رخشندہ کو ملنے چلی گئی۔ آفتاب سے مل کر اور بعد میں رخشندہ کی باتیں سن کر اس نے آفتاب کے خیال کو باسی روٹی کا ٹکڑا سمجھ کر اگل دیا۔ وہ سچ مچ پاگل تھا۔ رخشندہ نے اسے بتایا "وہ تم سے کم اور تمہارے نام سے زیادہ پیار کرتا ہے" یہ سن کر سورج مکھی کی انا کو ایک دھچکا سا لگا۔ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے بچھو نے اُس کے رخسار کے کالے تل پر ڈنک مار دیا ہو۔ جیسے ہوا میں اڑتے ہوئے باز نے غوطہ لگا کر اس کی نیلی آنکھیں نوچ لی ہوں۔ وہ درد سے تلملا اٹھی۔ ساری شام رخشندہ کے ہمراہ کلب میں اس نے جی کھول کر وہسکی پی۔ سگریٹ کے کش لیے۔ پوکر کی بازی کھیلی۔ مردوں سے کھلم کھلا باتیں کیں۔ رخشندہ نے اُسے بتایا "آج ہمارے گھر میں افراتفری پھیل گئی تھی۔ خون کے دباؤ کی وجہ سے آفتاب کی بری حالت ہو گئی تھی۔

سے گھسٹ جیکا کا ایک بڑا سا گھونٹ حلق سے نیچے اتار کر بیہودہ سا ایک ٹوٹکا جملہ رخشندہ کے منہ پر دے مارا۔ اسے فوراً ہی پتا چل
تیزی سے دوڑنے لگی۔ آواب گھنگھرو بجنے لگے۔ نشست و برخاست کے سلیقوں میں لغزشیں آنے لگیں۔ رخشندہ نے گھڑی گھڑی ناشتہ کرنا کم
کر دیا اور پھر ہنستے ہوئے ایک جنس گھر کی باہوں میں باہیں ڈال کر باہر نکل گئی۔ ایک منحوس صورت نوجوان نے فوراً ٹیکسی کو لفٹ
کی پیشکش کی اور چند لمحوں کے بعد وہ اپنا سر اس نوجوان کے شانے پر رکھے ٹیکسی کی اگلی نشست پر بیٹھی ہمک رہی تھی۔ ایک سکون سا،
ایک تسکین سی نس نس میں سرایت کرنے لگی۔ پھر تھوڑے ہی دنوں میں اسے رخشندہ کے سہارے کی ضرورت نہ رہی۔ وہ خود
اپنے پاؤں پر کھڑی ہو گئی۔ جھجک، آنکھیں موند کر ایک کونے میں جا بیٹھی۔ اب وہ مردوں سے اس طرح باتیں کرتی جیسے پھل والے
سے پوچھ رہی ہو کہ نارنگیاں ترش تو نہیں! جب وہ کسی مرد کے اچھے سلے ہوئے سوٹ کی تعریف کرتی تو اس انداز سے جیسے
کسی نئی کتاب کی خوشنما گیٹ اپ پر اپنی رائے کا اظہار کر رہی ہو۔ جب اسے محبت کا جواب محبت سے دینا پڑتا تو اسے ہلکا سا
احساس ہوتا جیسے وہ کسی اچھے شعر کی داد دے رہی ہو۔ اس منزل پر پہنچ کر وہ ماضی کی بہت سی باتوں کو یاد کر کے ہنس پڑتی۔
ان باتوں میں محبت کا تصور بھی شامل تھا۔ ان دنوں اس کا خیال تھا کہ راز و نیاز کی باتیں صرف وہاں ہو سکتی ہیں جہاں کوئی
دیکھتا ہو نہ سنتا۔ لیکن اب وہ جانتی تھی کہ یہ دلبرانہ باتیں کسی وقت اور کسی جگہ ہو سکتی ہیں۔ شاپنگ کرتے وقت، آفس میں
کافی پیتے ہوئے، اس وقت جب کوئی اپنے سگریٹ لائیٹر سے اس کا سگریٹ سلگا رہا ہو۔ جب کوئی ڈائننگ ہال میں ادب
سے کھڑا ہو کر بے بازو کی کرسی کو پشت سے تھام لے اور وہ مسکراتے ہوئے شکریہ کہہ کر بیٹھ جائے۔ جب والز کی دھن بج
رہی ہو اور کوئی نیا چہرہ ناچ کی مسرت حاصل کرنے کے لیے اپنے ہاتھ بڑھا دے اور پھر رقص کرتے کرتے یوں محسوس ہونے
لگے جیسے اجنبیت کوئی شے نہیں۔ بیگانگی پرانا قصہ ہے۔ زندگی گھل مل جانے میں ہے۔ رنگ میں ہونے کے اس حلقے میں زندگی تیزی
سے گردش کرنے لگی۔ ساری اور چولی کے درمیان کمر کا حصہ زیادہ سے زیادہ عریاں نظر آنے لگا۔ سر کے بالوں کو ترشوا کر وہ
اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگی۔ نسیں کھنچ جاتیں تو وہسکی کی آنچ سے آسودگی حاصل کر لیتی۔ وقت بیتنے لگتا تو گھل مل
کر لمحات کو بہاراں کر لیتی۔ اور پھر سچ مچ وہ سورج مکھی کا پھول بن گئی۔ جدھر مرد کی جوانی کا سورج طلوع ہوتے دیکھتی بے اختیار
ادھر منہ موڑ لیتی۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ محسوس کرنے لگی کہ جب عورت گھر کی چار دیواری سے نکل کر کلب، ریستوران اور ڈانس ہال
پر پہنچ جاتی ہے تو ایک فاتح بن جاتی ہے اور پھر اس کے سامنے ہر نوجوان سپرز گھٹنے ٹیک دیتا ہے۔ لیکن ایک دن زندگی
کی اس راہ پر تیزی سے چلتے چلتے اسے یوں لگا جیسے اس کے پاؤں میں کانٹا چبھ گیا ہو۔ وہ رک کر سوچنے لگی کہ یہ جو بات
کہا جاتا ہے لیکن پہلی فاتح عورت کو پرے پھینک کر دوسری فاتح عورت کو اپنی مملکت بخش دینے کا اختیار رکھتا ہے۔ یہ خیال
اس کے دل میں پیدا نہ ہوتا اگر فرم کا منیجر اسے ملازمت سے برطرف کر کے نئی سیکرٹری نہ رکھ لیتا۔ یہ وہی منیجر تھا جس نے
اس کی آنکھوں کی پتلی جھیلوں سے متاثر ہو کر دو شعر کہہ ڈالے تھے۔ جس نے اس کے چہرے کی زردی اور کالے تل کی دلکشی
بیان کرنے میں عجیب و غریب تشبیہات اور استعارے تراش کر اپنی خوش ذوقی کا ثبوت دیا تھا۔ سورج مکھی برطرفی کا نوٹس ہاتھ
میں تھامے، گردن جھکائے فرم کی سیڑھیوں سے نیچے اتر آئی لیکن دوسرے ہی دن سینہ تان کر ایک نئی فرم کے زینے سے
اوپر چڑھ گئی۔ اور کل کے منیجر کی اچانک بے رخی کو بھول کر آج کے منیجر کی من موہ لینے والی باتوں سے لطف اندوز ہونے لگی۔

اور جب ایک قلیل عرصے کے بعد دوسری فرم کے منیجر نے بیباکی طور پر وہی برتاؤ کیا جو پہلی فرم کے منیجر نے کیا تھا تو اُسے پہلی سی حیرت نہ ہوئی۔ رفتہ رفتہ وہ مرد کو ریاضی کی مشق سمجھ کر ضرب تقسیم کرنے لگی۔ لیکن ایک سنیچر کی شام، اس کے دل کو آج کا یہ تسلیم کرنا پڑا کہ مرد ریاضی کی مشق نہیں، وہ تو سچا موتی ہے جس کی آب سے زندگی نکھر پاتی ہے۔ وہ پہلی ہی ملاقات میں اپنے دل کی امانت سونپ چکی تھی۔ دو چند ہی ہفتوں میں منگنی کی انگوٹھی پہنا سکتا ہے۔ اختر نے یہ سب کچھ بات کی بات میں سورج مکھی کو دے دیا۔ اور جب وہ اپنے جذبات پر قابو نہ پا سکا تو ایک معصوم بچے کی طرح اپنا سر سورج مکھی کے سینہ پہ رکھ کر آنسو بہانے لگا۔ اور سورج مکھی نے دل کی آواز سن کر خود کو اختر کے سپرد کر دیا۔ وہ سمجھی کہ سویرا تو اب ہوا ہے۔ لیکن ایک سہ ماہی کے اندر اندر گھپ اندھیرا چھا گیا۔ ایک شام، کلب میں اختر سورج مکھی کو پہچان بھی نہ سکا۔ اختر کے ساتھ کوئی اور لڑکی تھی۔ اس لڑکی کی انگلی میں بھی ویسی ہی انگوٹھی تھی جیسی اس نے سورج مکھی کو پہنائی تھی۔ بات چل نکلی تو سورج مکھی کو پتہ چلا کہ ایسی انگوٹھیاں تو وہ کئی لڑکیوں کو پہنا چکا ہے۔ اسی جذبہ کے ماتحت وہ ڈرامائی انداز میں، سورج مکھی کو یوں لگا جیسے کسی نے اس کے منہ پر طمانچہ مار دیا ہو۔ وہ تیز تیز قدموں سے بار میں پہنچی اور سرخ گدی والے اونچے سٹول پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ رم کا بڑا پیگ غٹا غٹ پی کر اس نے کانچ کا خالی گلاس سفید پتھر کے ٹھنڈے کاؤنٹر پر رکھا؛ وہ بلاؤز کے اندر سے رومال نکال کر ہونٹوں کو خشک کرنے لگی۔ رم کی حرارت نسوں کو آسودگی نہ پہنچا سکی۔ ادھر سے آتی ہوئی ہنسی کی آواز، ادھر سے بڑھتا ہوا مسکراہٹوں کا ریلا، نہایت بے دردی سے ٹکرا کر وہ بار سے نکل کر برآمدے میں چلی گئی۔ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے کلب کا ہر لمحہ اس کے منہ پر تھوک رہا ہو۔ برآمدے کی سیڑھیوں سے اتر کر کچھ دیر وہ لان پر ٹہلتی رہی اور پھر آہستہ آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی کلب کے احاطہ سے باہر نکل گئی۔

اس رات اس کے خیالوں کی آگ سے شعلے لپک لپک کر اس کے جسم کو چاٹتے رہے۔ اور اس کے گوشت کی سڑاند نے اس کی قوت شامہ کو ادھ موا کر چھوڑا۔

دوسرے دن جب سفید دیواروں والے کمرے کی اُداس تنہائی میں اس کے دل، ضمیر اور دماغ نے جولیس سیزر کے تابوت میں کیلیں گاڑ دیں تو اس کے ہاتھ کی انگلیوں میں ایک بے چینی سی پیدا ہو گئی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ ایک تیز چاقو ہاتھوں میں لے کر کلب میں چلی جائے اور پھر اس مرد کا سینہ چیر ڈالے جس نے بہروپ بھر کر اسے دھوکہ دیا تھا جس سے پیار کے پردے میں ہر مرتبہ جھوٹ بولا تھا۔ پھر اُسے آفتاب کا خیال آ گیا۔ جس کی محبت کوڑھی تھی۔ جس کا پیار مدقوق تھا۔ جو اس کے عشق میں شعر لکھ سکتا تھا لیکن برملا اظہار محبت کرنے کی جرأت نہ رکھتا تھا جس نے اس دوران میں اسے کوئی آدھ درجن خط لکھے تھے۔ اس نے ہر خط کی ہر سطر میں ایک ناقابل بیان درد کی لذت تھی۔ سورج مکھی کی آنکھوں کے سامنے گذشتہ واقعات ایک ایک کر کے گھومنے لگے۔ آج بھی آفتاب کے آخری خط کے سیاہ حروف ماضی سے ابھر کر کمرے کی سفید دیواروں پر پھیل پھیل گئے۔ وہ خط پڑھ کر سورج مکھی باسی روٹی کے اُگلے ہوئے ٹکڑے کو پلکوں سے جھاڑ پونچھ کر اپنانے کے لیے بیقرار ہو گئی تھی۔ اس دن وہ سرخ ساڑی پہن کر رخشندہ کے گھر چلی گئی تھی۔ رخشندہ اور گھر کے دیگر افراد کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ آفتاب اپنی لائبریری میں مطالعہ کر رہا تھا۔ سورج مکھی اس کے پاس بیٹھ گئی تھی۔ آفتاب کی کشادہ پیشانی پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں ابھر آئی تھیں۔ اس کا چہرہ خوفناک طور پر زرد تھا۔ اس کی آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے۔

”آفتاب!“ اس نے کپکپاتی ہوئی آواز میں پکارا تھا۔

اُس آواز میں صدیوں کا درد چھپا ہوا تھا جیسے وہ کہہ رہی ہو "میں تھک گئی ہوں۔ میں اب فاتح نہیں بننا چاہتی۔ مجھے قید کرو تاکہ میں عورت بن جاؤں۔ اس گستاخ خاموشی کو توڑ ڈالو تاکہ نئی زندگی کے سوتے پھوٹ پڑیں۔"

آفتاب نے کوئی جواب نہ دیا تھا۔ اس کی ٹھوڑی کانپنے لگی تھی۔ اس کی نگاہیں کتاب پر گڑی تھیں۔ سورج مکھی ایک کرب ناک خاموشی کا بوجھ لوٹا جیسے کہ سب پیل رام گھبراہٹ آئی تھی۔ جھنجھلاہٹ میں اس نے سوچا تھا کہ ایسی پیار محبت سے تو بہرا بیوں کی محبت کہیں اچھی ہے۔ ایسی تاریک روشنی سے تو روشن تاریکی کہیں بہتر ہے۔ اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا دبا کر دم گھونٹ رکھنا اور دنیا سے الگ تھلگ رہ کر چپکے چپکے دل کی چیز اس کو حروف میں منتقل کرتے۔ یہ تاکہاں کی دیانتداری ہے۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ جولیس ہر رنگ میں جولیس ہے۔ وہ بولے تو بھی اور نہ بولے تو بھی۔ لیکن نہ بولنے والا جولیس بولنے والے جولیس سے زیادہ خطرناک ہے۔ کیونکہ پیٹھ کی نہ ختم ہونے والی چپ سے دوسرے کی وقتی جھنجھلاہٹ زندگی کے چند لمحات کو خوشگوار بنا دیتی ہے۔

آج ان خیالوں کی رو میں بہتے ہوئے سورج مکھی نے چاروں طرف دیکھا تو کمرے کی سفید دیواریں نیلی پیلی جھلیوں کو گھورنے لگیں۔ لکڑی کے پہرے سے جو کچھ بن طرح آفتاب کا منظر جھپکی لے کر دھندلا گیا۔ گلدان کے کناروں پر جھکے ہوئے نرگس کے باسی پھول اپنی آنکھوں کو ملنے لگے۔ طشتری میں رکھے ہوئے سرخ سرخ سیب بھت سانپ بن کر ناچنے لگے۔ ہاتھی کی ہاتھی چار ہرنے کے ترتیب سے رکھی ہوئی ساتھ کی رلکاتی سرہانے کی جانب ادھیڑے دھرے ہوئے سرخ ریشمی تکیے، میز پر پڑی ہوئی سنہری جلد والی کتاب کے بکھرے ہوئے حروف، سب پرچھائیاں بن کر ادھر ادھر دوڑنے لگے۔ ٹن ٹن کانوشکل گھنٹی بج اٹھی۔ سسٹر انیتھونی کی آواز فضا میں گونجنے لگی۔ برف ایسا لباس، سیاہ تسبیح، چھوٹی سی صلیب۔ وہاں سے یہاں تک بکھری ہوئی زندگی کی کلیاں اور کانٹے۔ ایک جولیس، دوسرا، تیسرا، بہروپ بدل کے چہرے فضا میں تیرنے لگے۔ اس کا دل دھائیں دھائیں کرنے لگا۔ اس کے دائیں ہاتھ کی بے جان انگلیوں نے میز پر سے چاقو اٹھا لیا۔ بائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور نگینہ نے چاقو کھولا۔ آبدار پھل سامنے تھا۔ اس کے دانت بھینچ گئے۔ بایاں ہاتھ بلند ہوا۔ اس نے پھل تیز نوک ایک سیب میں گاڑ دی۔ اور ایسا کرنے میں سورج مکھی کو ایک عجیب و غریب راحت کا احساس ہوا۔ جیسے اس نے جولیس کے سینے میں خنجر بھونک دیا ہو۔ اور لہو کے گرم گرم قطرے ٹپ ٹپ اس کے پاؤں پر گرے ہوں اور وہ چیخ چیخ کر کہہ رہی ہو "میں فاتح ہوں، میں کلیوپیٹرا ہوں، میں الفاظ میں قید نہیں رہ سکتی، میں باغی ہو کر کتاب کے زنداں سے نکل آئی ہوں، میری ایک منزل لا گذر رہے ہے۔ میں والز کی دھن پر ناچ سکتی ہوں، مجھے ایک جولیس چھوڑ دے گا تو میں دوسرے جولیس کی سلطنت پر قبضہ کروں گی۔" ان آوازوں کا شور بلند سے بلند تر ہوتا گیا تھا کہ اسے یوں محسوس ہوا جیسے ابھی اس کے کانوں کے پردے پھٹ جائیں گے۔ اس کی ہڈی ہڈی چیخ اٹھی جیسے لوہے کے ہتھوڑے اس کے جوڑ جوڑ پر دھما دھم برس پڑے ہوں۔ اس نے اپنا دایاں رخسار میز پر رکھ دیا۔ دونوں بازو پھیلا دیئے اور آنکھیں بند کر لیں۔

دھپ دھپ کسی کے قدموں کی آواز آئی۔ اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ دفعتاً کمرہ کی چیزیں آپس میں گڈمڈ ہو کر تیزی سے چکر کاٹنے لگیں۔ آفتاب اس کے سامنے کھڑا تھا۔ آج اس کے ماتھے پر پسینے کی ایک بوند بھی نہ تھی۔ آج اس نے ایسی نگاہ سے دیکھا کہ سورج مکھی دو قدم پرے ہٹ کر اپنے دل کی دھڑکن پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔

آفتاب بڑھ کر پلنگ پر چت لیٹ گیا۔

"سورج مکھی آجاؤ میرے قریب" آفتاب نے آہستہ سے کہا اور پھر سبز ساڑھی کی رعنائی سے ٹانگیں ڈھانپ کر آنکھیں بند کر لیں۔

سورج مکھی نے حقارت سے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا لیا۔ اس کے انگ انگ میں چنگاریاں دوڑنے لگیں۔ کانوں کی لویں گرم انگارے بن گئیں۔ نیلی آنکھوں میں جوالا پھٹ پڑی۔ پہلی فرم کے منیجر نے بھی اسی پلنگ پر یہی الفاظ استعمال کئے تھے۔ آخری طلب نے بھی اسی رنگ میں پکارا تھا۔ ہر حریص نے وہی ناٹک کھیلا تھا۔ تمام بہروپیے مختلف سمتوں سے چل کر اسی مرکز پر پہنچے تھے۔

"سورج مکھی آجاؤ میرے قریب"

سورج مکھی دیوار سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ جیسے وہ میدانِ کارزار میں محاذ پر ڈٹ گئی ہو۔ اس کا سینہ تن گیا۔ اس کے اندر سے آواز آئی "میں لالہ رخ ہوں۔ سورج مکھی مر گئی ہے۔ میں چابی دیا ہوا کھلونا نہیں ہوں۔"

اس کا دماغ کھول اٹھا۔ کنپٹیاں پھڑکنے لگیں۔ رخسار تپ گئے۔ رگ رگ سُلگ اٹھی۔ وہ مجسم شعلہ بن گئی۔ وہ شعلہ ہر حریص کے نقش و نگار کو جلا کر راکھ کرتا ہوا میز کی طرف لپکا۔ اس نے بغیر سوچے سمجھے سیب میں سے چاقو نکال کر دائیں ہاتھ کی گرفت میں لے لیا اور بجلی کی طرح کوند کر اس نے آبدار پھل آفتاب کے سینے میں بھونک دیا۔

سرخ ریشمی تکیہ اور سبز ساڑھی کی رعنائی سانس لینے لگی۔ کھلے دروازے میں پڑا نیلا پردہ لرزنے لگا۔ سورج مکھی نے کوئی چیخ نہ سن کر اپنے چہرے پر سے دونوں ہاتھ ہٹائے۔ لہو کا ایک قطرہ بھی نہ نکلا تھا۔ سہم کر اس نے دروازے کی طرف دیکھا اور پھر کانپتے ہوئے ہاتھ سے آبدار پھل برف ایسے گوشت سے نکال کر زرد ٹائیلوں کے فرش پر پھینک دیا۔ اس نے جھک کر دیکھا۔ پلکوں نے جامد پتلیوں پر سائے کر رکھے تھے۔ آج آفتاب کے ماتھے پر پسینے کی ایک بوند بھی نہ تھی۔ اس کے بے حس ہاتھ پلنگ کی پٹی سے نیچے لٹک رہے تھے۔

لمحات کا قافلہ پلٹ کر پیچھے کی طرف چلنے لگا۔

داؤد

صادق حسین

ٹیلوں کے اُس پار ڈھول کی دھمادھم گونجی۔ شہنائیوں کی آوازیں بلند ہوئیں۔ گاؤں کی عورتیں گھریلو دھندے جہاں کے تہاں چھوڑ پھینک کر چھتوں پر چڑھ گئیں۔

داؤد سینہ تانے بیچ راستے کے کھڑا تھا۔ حسبِ معمول اس کے دائیں ہاتھ میں لٹھ تھا جس پر جڑے ہوئے پیتل کے کوکے ڈھلتے ہوئے سورج کی ترچھی شعاعوں میں چمک رہے تھے۔

بلند قامت، گٹھیلا بدن، ایہ بڑی بڑی مونچھیں، چہرے پر زخموں کے نشان، دونوں بانہوں سے جھانکتے ہوئے صافے کے دو شملے، تانبے ایسی گردن میں تعویذ جس پر چاندی کا خول، ململ کا کرتا، شلوار کے پائنچوں پر چوہرا چوہرا بخیہ، یہ سب کچھ تو پوٹھوہار کے علاقے میں دوسرے نوجوانوں میں بھی پایا جاتا تھا، جن کی یاد میں دوشیزائیں ڈھولک پر رومان بھرے گیت گاتی تھیں۔ کھیتوں میں درانتیاں چلاتے چلاتے لمحہ بھر کے لیے ہاتھ روک کر اپنے اپنے ماہیے کی دو چار باتیں کرکے نئی توانائی حاصل کرتی تھیں۔ کنوئیں پر پریم راز سہیلیاں دوسروں کی حدِ سماعت سے بچ کر تصورات کا چاندی سونا سرگوشیاں کرکے آپس میں بانٹ لیتی تھیں۔ ڈھولک پر، کھیتوں میں، کنوئیں پر جب بات میں بات نکل کر داؤد کے نام تک پہنچ جاتی تو نوجوان لڑکیاں ناک بھوں چڑھا لیتیں۔ سگھڑ عورتوں میں داؤد کا ذکر چھڑتا تو اُسے جھولیاں بھر بھر کے بددعائیں دیتیں۔ چوپال پر بڑے بوڑھوں کی گفتگو میں داؤد کا نام آتا تو کان پکڑ استغفار پڑھتے۔ اور جب مائیں ضدی بچوں کو لوریاں دے دے کر تھک جاتیں تو "وہ داؤد آیا" کہہ کر انھیں ڈراتیں۔ نفرت اور خوف کی یہ لہریں اُس چھوٹے سے گاؤں سے نکل کر پوٹھوہار کے تمام علاقے میں پھیل گئی تھیں۔ چوری ضلع کے صدر مقام میں ہوتی اور پولیس سب سے پہلے داؤد کے گاؤں کی تلاشی لیتی۔ قتل کی واردات خاص تحصیل میں ہوتی اور تھانے سے داؤد کو بلاوا آجاتا۔ اسی لیے وہ چھوٹا سا گاؤں بڑا بدنام تھا۔ وہاں کے باشندے داؤد سے اس لیے بھی نالاں تھے کہ وہ ہر بات میں پہل کرتا تھا۔ دیہاتیوں کے دلوں میں خوف تھا اور نفرت بھی۔ خوف کی فولادی انگلیوں نے نفرت کا گلا گھونٹ رکھا تھا چنانچہ داؤد کے منہ پر بات کرنے کے لیے دل گردے کی ضرورت تھی خصوصاً اُس دن تو داؤد کی دھاک بیٹھ گئی تھی جس دن اُس نے پیتل کے چمکتے ہوئے کوکوں والا لٹھ بلند کرکے تحصیلدار کو بھگا دیا تھا۔ یہ بات اور تھی کہ بعد میں اُسے جیل کی ہوا کھانی پڑی۔ لیکن یہ کوئی انوکھا واقعہ نہ تھا اور پھر جیل کے اندر بھی تو داؤد کا طوطی بولتا تھا۔

آج بھی داؤد نے پہل کی۔ ڈھول کی پیں پیں اور دھما دھم سُن کر وہ گھر سے باہر نکل آیا اور ایک پہاڑ بن کر بیچ راستے میں کھڑا ہو گیا۔ آہستہ آہستہ گاؤں کے چند بزرگ، کچھ نوجوان اور بہت سے بچے اُس پہاڑ کے آس پاس جمع ہو گئے۔ ڈھول اور شہنائیوں کی آوازیں قریب آنے لگیں۔ اور پھر کچھ دیر کے بعد برات پہاڑ کے سامنے پہنچ کر رُک گئی۔ دُولہا، سہرا باندھے موتیا کی کلیوں سے سجی ہوئی ایک گھوڑی پر سوار تھا۔ اس کے ارد گرد براتی کھڑے تھے۔ ڈھول اور شہنائیوں کی آوازیں بند ہو گئیں۔ سناٹا چھا گیا۔

"برات کہاں سے آ رہی ہے؟" داؤد براتیوں سے مخاطب ہو کر بولا۔

"شہر سے" جواباً آواز آئی۔

"آپ لوگوں کو آج رات یہاں رُکنا پڑے گا" داؤد نے حاکمانہ لہجے میں کہا۔

"کیوں؟" براتیوں میں سے ایک عمر رسیدہ شخص نے پوچھا۔

"ہماری مرضی" داؤد نے یہ کہتے ہوئے لٹھ کو اپنے کاندھوں پر متوازی رکھ کر اُس پر دونوں بازو پھیلا دیئے۔ شہری آپس میں کھسر پھسر کرنے لگے۔

"آپ لوگ ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتے" پہاڑ کڑک کر بولا۔

ایک سفید ریش دیہاتی لاٹھی ٹیکتا ہوا مجمع میں سے باہر نکلا اور براتیوں سے مخاطب ہو کر بولا "ہمارے بزرگوں کے وقت سے یہ روایت چلی آئی ہے۔ آج تک کوئی برات یہاں رُکے بغیر آگے نہیں گئی۔"

"ہم وقت پر لڑکی والوں کے ہاں پہنچنا چاہتے ہیں" ایک شہری بولا۔

"ہم نے ہمیشہ اپنی روایتوں پر وقت کو قربان کیا ہے" گاؤں کے ایک نوجوان نے سینہ تان کر کہا۔

"آپ لوگ رُکے بغیر چلے گئے تو ہماری ناک کٹ جائے گی" ایک بڈھے دیہاتی نے تیلے جذباتی ہو کر کہا۔

جب شہریوں نے دیکھا کہ پہاڑ کو ہٹا کر آگے بڑھنا ممکن نہیں تو چار و ناچار انھوں نے دعوت قبول کر لی۔ پھر تو چوپال پر میلہ لگ گیا۔ اِدھر بکرا ذبح کر دیا گیا۔ اُدھر عورتیں آٹا گوندھنے لگیں۔ چھڑکاؤ ہو گیا۔ مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو چاروں طرف پھیل گئی۔ چارپائیاں اور کھٹولے بچھ گئے۔ چلم کا دور چلنے لگا۔ چھ سات عورتیں بیک وقت توے پر روٹیاں پکانے لگیں۔ کھانے کے بعد مراثیوں نے سوانگ بھرا۔ مارے قہقہوں کے شہری لوٹ پوٹ ہو گئے۔ دوسرے دن گاؤں کے مرد اور بچے براتیوں کے ساتھ چل کر ٹاہلی کے پیڑوں تک گئے اور الوداع کہہ کر لوٹ آئے۔ مگر داؤد ایک ٹاہلی کے پیڑ کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اُس کی نگاہیں گاؤں کی سمت جاتے ہوئے مردوں اور بچوں کا تعاقب کرنے لگیں۔ قریب قریب ہر ایک نے صاف ستھرے کپڑے پہن رکھے تھے۔ داؤد جانتا تھا کہ اس موسم میں جبکہ فصل ربیع کٹ چکتی ہے کسان اپنے پھٹے پرانے کپڑے اتار کر نیا لباس پہنتا ہے۔ گندم بیچ کر قرض ادا کرتا ہے۔ بیٹی کا جہیز تیار کرتا ہے۔ دیوانی مقدمہ کی پیروی میں کسی نامی وکیل کے سامنے روپوں کی ڈھیری لگا دیتا ہے۔ اور اگر نئے پہلے سکوں کی جھنکار سن کر بدمست ہو جائے تو اپنے بھائی بند کا سر پھوڑ کر ضابطۂ فوجداری کے چنگل میں پھنس جاتا ہے۔

چند لمحوں میں مرد اور بچے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ اب داؤد کے سامنے کچے مکان تھے جن کی دیواریں سانجھی تھیں۔

"کیا بات ہے استاد؟" اس شخص نے دوسرے خوف سے پوچھا۔ استاد قدم قدم چلتا ہوا امانت میاں کے قریب جا کر رک گیا۔

"میرے ابا!" استاد نے چیخ کر کہا اور پھر دوڑ کر امانت میاں سے لپٹ گیا۔

"کون ہو؟" امانت میاں نے رو کھے پن سے دریافت کیا۔

"میں ہوں ظفر، آپ کا بیٹا"

"نہیں استاد تمہیں غلطی ہوئی ہے۔ میں تمہارا باپ نہیں ہوں" امانت میاں نے جھلا کر استاد کے ہاتھوں سے دبا کر کہا اور پھر ظفر کو سامنے سے ہٹا کر تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا۔



ٹیلیفون نمبر
۲۵۲۵

رجسٹرڈ ایل نمبر
۵۳۱۲

زندگی آمیز اور زندگی ادب نمائندہ

نقوش

۸۳، ۸۴

اگست سنہ ۱۹۶۰ء

مدیر

محمد طفیل

قیمت
موجودہ شمارہ
تین روپے

سالانہ چندہ ۲۰ روپے
ممالک غیر سے ۲۵ روپے

ادارۂ فروغ اردو ○ لاہور

اس پرچے کے کسی مضمون، افسانے، نظم یا غزل کے نقل کرنے کی اجازت نہیں

فہرست

طارق — محمد طفیل

مضامین

نظمیں، غزلیں

دل شاہجہانپوری کا غیر مطبوعہ کلام

حامد عزیز مدنی

افسانے

انتظاریہ

محمد طفیل ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر ادارہ فروغِ اُردو، ایبک روڈ لاہور سے شائع کیا

طلوع

ذاتی جھگڑوں سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ بعض دوستوں کا منشا یہ بھی ہے۔ میں نے انتخابی پرچوں کے بارے میں اصولی باتوں کو چھیڑا تو کراچی کا ایک پرچہ ... صاحب نے اس ضمن میں جو کچھ لکھا تھا۔ اس کا مخاطب کوئی ایک رسالہ نہ تھا۔ بلکہ وہ سارے ہی رسالے تھے جو صرف انتخاب چھاپا کرتے ہیں۔ مگر موصوف نے بے قابو ہو کر (واضح اشاروں کے ساتھ) غریب نقوش کو بُرا بھلا کہہ ڈالا۔ دیکھیے سینہ زوری ہو تو بلی ہمیں سے میاؤں یعنی ایک تو ہماری اجازت کے بغیر چیزیں چھاپیں۔ اُلٹا ڈانٹیں بھی — نہ تو کسی سے بھی الجھنا نہیں چاہتے۔ نہ ہمیں کسی ایک رسالے سے کوئی سروکار ہے۔ نہ ہم اس بحث کو ذاتی بحث بنانا چاہتے ہیں۔

یاروں نے کہا (مدیران رسائل نے) کہ کسی طرح انتخابی پرچوں کی وبا کو روکا جائے۔ ورنہ ایک دن ایسا آئے گا کہ ہمارے پرچے بند ہو جائیں گے (اس لیے کہ ہم نئے مضامین حاصل کرنے کے لیے ان تھک محنت کرتے ہیں) اور انتخابی پرچے نکالا کریں گے (اس لیے کہ انھوں نے دو روپے کی قینچی خرید لی ہے)

اسی ضمن میں میں نے ایک آدھ بار پہلے بھی لکھا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آج میں اپنے ساتھ چند دوستوں کو بھی لایا ہوں۔ پہلے آپ اُن کی باتیں سُن لیں۔ میں تو گھر کا آدمی ہوں۔ میری باتیں تو آپ روز سنتے ہیں:۔

برادرم۔ سلام مسنون۔ آپ کا ایک خط دس بارہ دن پہلے آیا تھا اور میں عجب چکر میں پڑ گیا کہ کیا جواب دوں؟ اس سے چھوٹنے نہ پایا تھا کہ ایک اور خط آ گیا اور اب پھر دو دن جواب سوچنے میں گزر گئے۔

برادرِ عزیز! مجھے اپنی دونوں آنکھیں پیاری ہیں۔ آپ بھی مجھے عزیز ہیں اور شمس صاحب بھی۔ آپ کی شکایت کو رفع کرنے کے لیے میں نے شمس صاحب سے کہہ دیا تھا کہ جو مضمون نقل کریں اس کی اجازت پہلے مضمون نگار سے حاصل کریں۔ دوسری بات یہ کہ نقوش کے تازہ پرچہ سے کوئی مضمون فوراً نقل نہ کریں۔ تیسرے یہ کہ جس مضمون کا کاپی رائٹ صاحبِ رسالہ کے پاس ہو اُسے یا تو نقل نہ کریں یا صاحبِ رسالہ سے اجازت لے کر نقل کریں۔ میری اور آپ کی گفتگو میں یہی باتیں طے ہوئی تھیں۔ شمس صاحب نے ان تمام شرائط کو منظور کر لیا اور ان پر عمل بھی کرنے لگے۔ اب میں اُن سے کیا کہوں؟ میرے خیال میں تو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ ”نقوش“ کا قدر دان تو نقوش ہی خریدے گا۔ وہ اس کا انتظار نہیں کرے گا کہ نقوش کے اچھے افسانے جب

نقوش میں چھپ کر آپ بھلے تر شدہ سے ہوں گا۔ نقوش ہی تو ایک بڑی قدر ہے بلکہ پہلے سے جیسے رد نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا آپ خوش روی سے کام لیجئے ۔۔ باقی روشنیاں تو کشکولوں کی ہی جگہ پاتی ہیں۔

حالت۔ شاہد احمد

طفیل صاحب، اس وقت یہی اشعار ذہن میں ہیں جو عجیب ہوں۔ جہاں تک مجھے ادب عالیہ کی تک شائقین ہوں گے انتخابی پرچوں کا مسئلہ خاص ہے۔ دیا، ان مسئلہ ہے میں کاروباری طرف سے اعتبار یقیناً غیر مستحسن سمجھتا ہوں لیکن اس بارے میں آپ کی رائے زیادہ وقیع ہے۔ فقط

محمد طفیل

انتخابی رسائل میں ادبی تخلیقات کی بے دریغ اشاعت ایک مسئلہ بن گئی ہے۔ ہر مہینے مختلف معیاری ادبی رسائل کے مضامین نظم و نثر کا انتخاب چھاپنے والے اصحاب کے پاس اگر اپنے اس فعل کا کوئی جواز ہے تو صرف یہ کہ زبوں کارے باب سے نیچے لکھے طبقے کا ادبی اور جمالیاتی ذوق نکھرتا ہے۔ ادیبوں اور شاعروں کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا ہے اور ان کے قارئین کا حلقہ وسیع تر ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انتخاب کے سہارے چلنے والے رسالے اپنے فعل کا جواز پیش کر کے درپردہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم تو ایسا کر کے ادیبوں اور شاعروں پر احسان کرتے ہیں اور انھیں ہمارا ممنون ہونا چاہئے اور ہمیں حرف شکایت زبان پر نہیں لانا چاہئے۔ ان اصحاب میں سے کسی نے بھی یہ سوچنے کی تکلیف گوارا نہیں کی (اور اگر سوچا ہے تو اس کا اظہار کرنا مناسب نہیں سمجھتے) کہ اگر پاکستانی فن کاروں کے افسانے اور نظمیں دوبارہ اشاعت کے مستحق ہیں تو بار اشاعت کے معقول معاوضے[2] کے بھی تو مستحق ہیں۔ دوسروں کو بزعم خود ان کی جیبوں کے بوجھ سے چھٹکارا دلا کر اپنے ماہنامے ہیں۔ شائع کرنے والے چاہے محل کھڑے کر لیں۔ گو ہمیشہ حسب منشا ہی کا دعویٰ ہے کہ اگر بعض حضرات کو ڈائجسٹ قسم کے رسالے چھاپنے کا شوق ہے تو انھیں اس حقیقت کو بھی تو پیش نظر رکھنا چاہیے کہ ادیب اپنی تخلیق صرف ایک رسالے کو اشاعت کے لیے دیتا ہے اور اس کے بعد سب تخلیقات کو اس توقع کے ساتھ مجموعوں میں جمع کر دیتا ہے کہ ادب کے قارئین انھیں باقاعدہ خریدیں گے۔ اگر انتخابی رسالے چھاپنے والے اصحاب کو لوگوں کا ادبی ذوق نکھارنے، ادیبوں اور شاعروں کی مقبولیت میں اضافہ کرنے اور ان کے قارئین کا حلقہ وسیع تر کرنے کے مقاصد ایسے ہی عزیز ہیں (اور یقیناً یہ بڑے مبارک مقاصد ہیں) تو وہ چاہیں کہ معیاری ادبی کتابوں کی بیش از بیش خریداری کی ملک گیر تحریک چلائیں۔ اس کام کے لیے وہ رسائل میں سے مضامین چپکے سے اچک لینے کے بجائے ہر مہینے نئی ادبی مطبوعات کی ایک جامع اور خوبصورت فہرست شائع کیا کریں۔ یوں وہ ادب اور ادیب کی بے مثال خدمت کریں گے۔ مگر کیا وہ ایسا کریں گے جبکہ اس ماہانہ فہرست کتب کو بہت ہی کم لوگ خریدیں گے اور انھیں

---

[1] بھائی شاہد کا ماہنامہ نقوش سے عملاً کوئی تعلق نہیں۔ صرف مدیر نقوش سے دوستی ہے۔ جس کا اظہار اس خط سے بھی ہوتا ہے۔

[2] سنا ہے کہ یہ حضرات دس روپے فی غزل اور بیس روپے فی افسانہ کے حساب سے ادیبوں کو نواز رہے ہیں۔

بہت ہی کم آمدنی ہوگی۔ ثابت ہوا کہ اصل مقصد نہ ادب کی خدمت ہے اور نہ ادیب کی (اخلاقی) امداد۔ اصل مقصد حصولِ زر ہے۔ اس صورت میں پاکستانی ادیبوں اور شاعروں کا فرض ہے کہ وہ اپنے اس ہمہ گیر استحصال کو متحد ہو کر روکیں۔ جن ادیبوں اور شاعروں نے ان "انتخابی" رسائل کو اپنی تخلیقات مفت میں چھاپنے کے "دوامی" اجازت نامے دے دیئے ہیں وہ یہ اجازت نامے واپس لے لیں اور صرف اس صورت میں اجازت دیں جب یہ رسالے انہیں معقول اور مناسب بلکہ پہلی اشاعت سے دُگنا معاوضہ دینے کو تیار ہوں۔ آخر ادیبوں اور شاعروں کو اپنی کتابوں کے پانچ دس ہزار مستقل قارئین سے ہاتھ دھونے کی اجرت تو ملنی چاہیے۔

احمد ندیم قاسمی

کیا ہمارے ہاں کوئی صحیح قسم کا ادبی ڈائجسٹ چھپ رہا ہے؟ صحیح قسم کا میں نے اس لیے کہا ہے کہ کوئی بھی شریفانہ کام ہو اس کے چند آداب ہوتے ہیں۔ اگر یہ آداب ملحوظ نہ رکھے جائیں تو بلیک مارکیٹ، تجارت اور سرقہ بھی فن کہلائے گا۔

ہمارے اکثر انتخابی پرچے انتخاب کے کسی معقول معیار سے محروم ہیں۔ مگر یہ تو اُن کا ذاتی معاملہ ہے۔ ممکن ہے ان کے نزدیک انتخاب کا یہی معیار معقول اور مقبول ہو۔

انتخاب کے معاملے میں نہ تو ادیب کی رائے لی جاتی ہے، نہ اجازت اور نہ معاوضے کی ادائیگی کا مفاد شکن معاملہ سامنے رکھا جاتا ہے۔ ادیب کو تو صرف اس اعلیٰ قسم کی بات سے خوش کر دیا جاتا ہے کہ اس کی تخلیق انتخاب میں آگئی ہے۔ بھلا خوشی سے بڑا معاوضہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ ـــ انتخابی جرائد ادھر ادیب کو خوشیوں کے معاوضے سے مالا مال کرتے ہیں، اُدھر اُن ادبی رسائل کا شکریہ بھی ادا کر دیتے ہیں جن کی چیزوں سے اپنے پرچے کو مالا مال کرتے ہیں۔ شکایت کا کسی کو بھی موقعہ نہیں دیا جاتا۔ مگر مشکل یہ ہے شکریہ اور خوشیوں کا معاوضہ دونوں بڑے مہنگے پڑ رہے ہیں۔ انتخابی رسائل ان پرچوں کا گلا گھونٹ رہے ہیں جو ہزاروں دقتوں کے بعد ادیب کو معاوضہ ادا کر کے اپنے آپ کو بناتے سنوارتے ہیں۔ مگر ان کا شمارہ ابھی اپنے قارئین تک ڈھنگ سے پہنچنے بھی نہیں پاتا کہ انتخابی جریدے ان کا نچوڑ حاصل کر کے اسٹال پر پہنچ جاتے ہیں۔ لکھا لکھایا سامان مل گیا، چھاپ کر سستے داموں بیچ ڈالا۔ ادھر قاری کا یہ رویہ کہ انتخاب کا انتظار ہو رہا ہے مہنگے ادبی رسائل کون خریدے۔ روپیہ بارہ آنے خرچ کر کے ملک کے تمام رسائل کے ادب کا نچوڑ پڑھ لیا گیا۔ اس سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا کہ اس انتخاب میں واقعی نچوڑ ہے یا نہیں۔

ان باتوں کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ادبی رسائل کے مالک سوچنے لگے ہیں کہ کیوں نہ وہ بھی آسان ترکیب استعمال کریں۔ مجھے ایک اچھے خاصے اشاعتی ادارے کے بارے میں معلوم ہے کہ پہلے اس نے ایک ادبی پرچہ چھاپنے کا ارادہ کیا تھا مگر بعد میں ادبی ڈائجسٹ شائع کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ دراصل ہمارے ملک کا ماحول ابھی ادبی ڈائجسٹ کے لیے مناسب نہیں ہے۔ پڑھے لکھے باذوق پاکستانیوں کی تعداد کم ہے۔ اچھے ادبی رسائل بھی دو چار ہی شائع ہوتے ہیں۔ معقول کتابوں کی منڈی بھی محدود ہے۔ اگر ادبی رسائل اور کتب کا حصہ انتخابی جریدے سنبھال لیں تو انجام ظاہر ہے۔

خدیجہ مستور

برادرم طفیل صاحب! اس وقت مسئلہ پیشِ نظر یہ ہے کہ یہ جو "..." اور "....." وغیرہ اُردو کے موقت الشیوع رسائل و جرائد میں سے منتقلاً چیزیں لے کر شائع ہو رہے ہیں تو ان کے اس اقدام سے نتائج کیا برآمد ہوتے ہیں اور ہم اس سے کن صورتوں میں اور کہاں تک متاثر ہوتے ہیں! ـــ میں یہاں دو حیثیتوں سے اظہارِ خیال کروں گا۔ میری پہلی حیثیت ایک مصنف کی ہے۔ ایک ایسے

مصنف کی جو کچھ تجارتی منزلت بھی جانات ہے — یہ بات واضح ہے کہ ایک مصنف رسائل و جرائد میں جو کچھ لکھتا ہے اس نقطۂ نظر سے لکھتا ہے کہ ایک دن اس کی بھی ذہنی کاوشیں جمع ہو کر ایک مستقل صورت یعنی کتابی شکل اختیار کر لیں گی اور وہ ناشر سے اس کتاب کے عوض ایک معقول معاوضہ حاصل کرنے کا حقدار ہو جائے گا۔ اب اگر کسی مصنف کی تخلیقات کتابی شکل پذیر ہونے سے پیشتر دوسری جگہ منظر عام پر آ چکی ہوں تو لازماً اس کے پڑھنے والوں کا حلقہ محدود ہو جائے گا اور نتیجۃً کتاب زیادہ فروخت نہیں ہو سکے گی جس کا اثر براہ راست مصنف کی ذات پر پڑے گا — اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ مذکورہ بالا پرچوں کی روش تجارتی اعتبار سے ہر مصنف کے لیے نقصان دہ ہے۔

میری دوسری حیثیت ایک ایڈیٹر کی ہے — ایک ایسے ایڈیٹر کی جس کی زندگی کے ہر دم میں سترہ سال ایک ادبی ماہنامے کے ادارتی فرائض ادا کرتے ہوئے گزر گئے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ ادارت کتنی محنت شاقہ کی متقاضی ہے اور مدیر رسالہ کو اپنا رسالہ زندہ رکھنے کے لیے کیا کچھ کرنا پڑتا ہے۔ پڑھنے والوں کے سامنے جو مضامین نظم و نثر آتے ہیں وہ عموماً اس انداز میں نہیں آتے جس انداز میں مضمون نگار نے انہیں لکھا ہے — مدیر بسا اوقات خصوصی محنت کر کے ان کی نوک پلک درست کرتا ہے۔ ان کے حصول کی خاطر اہل قلم سے طویل مراسلت کرتا ہے بعض مضامین پر معاوضہ بھی دیتا ہے اور نہ جانے کیا کچھ کرتا ہے۔ جب کہیں جا کے رسالہ چھپ کر قارئین کے سامنے پیش ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں کیا ایک ایڈیٹر کے لیے یہ صریحاً ناانصافی نہیں کہ سرتوڑ محنت تو وہ کرے اور فائدہ اس کے اپنے پرچے کی بجائے ان رسالوں کو پہنچ جائے جن کے مدیران کرام وقت کا بہت مختصر حصہ صرف کر کے مختلف رسالوں کے منتخب مضامین نظم و نثر پر محض نشان لگا کے کاتبوں کے حوالے کر دیں اور یوں ان کے رسالے اشاعت پذیر ہو کر مارکیٹ کے بیشتر حصے پر غاصبانہ قبضہ کر لیتے ہیں؟

یہ ایک بدیہی امر ہے کہ جو پرچہ ہر ماہ ہمارے معیاری جریدوں کی نمایاں چیزیں اپنے دامن میں سمیٹ کر ملے اس کا خیر مقدم ان پرچوں کے مقابلے میں زیادہ گرمجوشی سے کیا جاتا ہے جن سے وہ زندگی حاصل کرتا ہے — اور یہ پچھلے پرچوں پر ایک ناقابل برداشت ظلم ہے۔ ان زیادتی کرنے والے پرچوں کے خلاف متفقہ طور پر قدم اٹھانا نہایت ضروری ہے۔ اور اس ظلم کے خلاف جو آواز بھی بلند ہو گی اسے اہل علم اور مدیران رسائل و جرائد کی پرجوش تائید حاصل ہو گی۔

میرزا ادیب

اردو میں ڈائجسٹ طرز کے رسائل کا سوال اردو ادب میں ایک لمحۂ فکریہ بن گیا ہے۔ سب سے اوّل ہمیں دیکھنا چاہیے کہ یہ بدعت جہاں سے آئی ہے وہاں اُن کا طرز عمل کیا ہے۔ یورپ اور امریکہ میں جو ڈائجسٹ رسائل شائع ہو رہے ہیں۔ وہ دو قسم کے ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جو مطبوعہ شائع شدہ کتب اور مضامین کا خلاصہ تیار کرا کر شائع کرتے ہیں۔ کسی بڑے ناول یا مضمون کا خلاصہ یعنی نفس مضمون کسی قابل اہل قلم سے چند صفحات میں تیار کرایا جاتا ہے اور مرتب کنندہ کو اس کا معاوضہ دیا جاتا ہے۔ اس سے اصل کتاب یا مضمون یا افسانہ کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچتا بلکہ جن لوگوں کو یہ پسند ہو یا اُن کے مذاق کی چیز معلوم ہو وہ اصل کتاب یا مضمون حاصل کر کے اُس کا مطالعہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اس سے رسائل اور کتب کی اشاعت میں مدد ملتی ہے۔ دوسری قسم کے وہ ڈائجسٹ رسائل ہیں جو مدیران رسائل سے اجازت حاصل کر کے ان کے حوالے سے مضمون نقل کرتے ہیں — پاکستان کے اردو ڈائجسٹ رسائل کتابوں، افسانوں یا مضامین کا خلاصہ تو تیار نہیں کراتے کیونکہ یہ کام تو اصل سے زیادہ مشکل ہوتا ہے اور اس پر خرچ بھی زیادہ آتا ہے۔ بلکہ وہ دوسرے رسائل کے مضامین کو اکثر بلا اجازت نقل کر کے شائع کر دیتے ہیں۔ یہ تو وہی کہاوت ہوئی "ہینگ لگے نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آئے"۔

ہمارے ہاں یہ بدعت کوئی نئی نہیں ہے۔ اس سے قبل بھی ایسا ہوتا رہا ہے۔ میرے عزیز دوست اختر شیرانی مرحوم نے اسی قسم کا ایک رسالہ "انتخاب" کے نام سے جاری کیا تھا۔ جو چند مہینے شائع ہونے کے بعد بند ہو گیا۔ اس رسالہ کے تمام مضامین دوسرے رسائل سے نقل کیے جاتے تھے اور کتابت طباعت بہترین ہوتی تھی اور مضامین پر اختر صاحب کے لکھے ہوئے تعارفی نوٹ عالمانہ اور محققانہ ہوتے تھے اس کے باوجود پبلک نے اس رسالہ کو سخت ناپسند کیا تھا۔ بلکہ بعض تو اٹھا کر پھینک دیتے اور کہتے کہ اوہ! اس میں تو تمام مضامین مطبوعہ ہوتے ہیں۔ اس زمانہ میں مطبوعہ مضمون چھاپنا ایک گالی تھی اور کسی ادیب یا رسالہ کی بڑے سے بڑی ہتک کی بات تھی کہ وہ کوئی شائع شدہ مضمون نقل کرے میں ۲۸ سال سے نیرنگِ خیال کو شائع کر رہا ہوں۔ کیونکر اور کیسے؟ اس کی واردات لکھوں تو خونِ جگر اور آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی ایک چیخ و پکار کی داستان ہوگی۔ ہم لوگ ایک مضمون حاصل کرنے کے لیے کیا کچھ کرتے ہیں۔ پہلے زمانے میں مضمون دس بیس روپیہ سے نہیں ملتے تھے۔ یا تو معاوضہ لینا گناہ اور ہتک سمجھتے تھے۔ وہ اگر لکھتے تھے تو شوق سے اپنے نام کے لیے، خدمتِ فن کے لیے، ادب کے لیے۔ عوام کے افادہ کے لیے۔ اس کے لیے ایڈیٹروں کو اہلِ قلم سے ذاتی دوستانہ تعلقات پیدا کرنے پڑتے تھے۔ اس سلسلہ میں خاکسار نے ہندوستان کے درجنوں سفر کیے، دہلی، علی گڑھ، آگرہ، لکھنؤ، کلکتہ، حیدرآباد اور بمبئی تک خاک چھانی۔ ہزاروں روپیہ بیاں ہوتا تھا اور اس کا مقصد وحید صرف اہلِ قلم سے ذاتی تعارف و تعلق پیدا کرنا ہوتا تھا۔ اب آپ اندازہ کیجیے کہ آج کے معاوضہ سے جو بعض اصحاب حاصل کر رہے ہیں۔ ہمیں اس مد میں سے زیادہ رقم خرچ کرنی پڑتی تھی اور اس کے ساتھ زحمتِ سفر مستزاد۔

ایک واقعہ سن لیجیے۔ سید امتیاز علی تاج نیرنگِ خیال میں لکھا کرتے تھے۔ اُن سے ایک مضمون حاصل کرنے کے لیے مجھے کتنی پریشانی اور دقت ہوتی تھی۔ اس کا اندازہ قارئینِ کرام نہیں کر سکتے۔ ہر اہلِ قلم جداگانہ مزاج اور انفرادی ساخت رکھتا ہے۔ امتیاز صاحب سے مجھے ایک افسانہ تین مہینے کی تگ و دو کے بعد ملا۔ یقین کیجیے کہ یہ چیز اٹھائیسویں چکر میں ملی تھی۔ ایک ایڈیٹر[1] ۲۸ بار کوشش کرنے کے بعد ایک مضمون حاصل کرتا ہے۔ آپ نے کتنا وقت اس کے لیے دیا اور تانگہ (سواری) کے اخراجات کیا ہوئے۔ کیونکہ وہاں جب بھی جانا پڑتا، دوری مسافت کی وجہ سے بغیر سواری کے نہ جا سکتا تھا۔ یہ افسانہ نیرنگِ خیال میں شائع ہوا تو میرے دوست اختر صاحب نے اسے "انتخاب" میں نقل کر لیا۔ چند دن بعد وہ میرے ہاں تشریف لائے تو میں نے انھیں کہا کہ اختر صاحب دو سو روپیہ آپ کے ذمہ ہیں۔ وہ کہنے لگے کیسے! میں نے کہا آپ نے نیرنگِ خیال سے جناب تاج صاحب کا جو افسانہ نقل کر لیا ہے اس کا معاوضہ! اختر صاحب نے کہا۔ واہ حضرت! دیکھیے افسانہ نقل کیا اور ٹھاٹھ سے نقل کیا اور حوالہ بھی دیا اور نوٹ بھی لکھا۔ کیا آپ نے تاج صاحب کو کچھ معاوضہ دیا تھا؟ میں نے کہا معاوضہ تو نہیں دیا نہ وہ مجھ سے معاوضہ لیتے ہیں۔ لیکن تین ماہ کی کوشش کے بعد اٹھائیسویں پھیرے میں یہ افسانہ ملا تھا۔ اب آپ اندازہ کیجیے کہ آپ نے اُسے نقل کر کے نیرنگِ خیال کی انفرادیت، وقار اور شہرت کو نقصان پہنچایا۔

حقیقتِ حال کا صحیح اندازہ کرنے کے بعد انھوں نے سر جھکا لیا اور کہنے لگے "حکیم صاحب میں نے اس بات کا تو اندازہ ہی نہیں کیا تھا۔ ہماری قینچی بے پناہ ظلم کر رہی ہے۔ اور اس کے ساتھ پبلک بھی پرچے سے نفرت کرتی ہے اور کہتی ہے کہ اس میں تو چھاپہ شدہ (نقل شدہ) مضامین ہوتے ہیں۔ اس مقصد میں مجھے کامیابی نہیں ہوئی، یہ پرچہ تو خود بخود بند ہو جائے گا۔" اور آخر انتخاب بند ہو گیا

---

[1] اس شمارہ میں مجنوں گورکھپوری کا ایک طویل افسانہ "تنہائی" چھپ رہا ہے۔ خود موصوف کا خط پڑھ لیجیے اور دیکھ لیجیے کہ میں نے ایک افسانہ حاصل کرنے کے لیے کتنے برس صرف کر دیے ہیں۔ (مدیر)

... چاہیے ... ان کا ... لیے نیت نہیں رہتی ... اور معیت ہوجاتی ہے ... [illegible]
فلسفے کا سکت اور محبت اپنے میں نہیں پاتا۔

وہ رسالے جو نقل شدہ مضامین کے بل بوتے پر تجارت کرتے ہیں انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ مضامین کا حصول کتنا دشوار اور مشکل مسئلہ ہے اور نقد معاوضہ سے زیادہ ہمت تعلقات اور مضمون حاصل کرنے کی جدوجہد ہے۔ پھر کسی ایڈیٹر کی تخلیق یا اس کی جاں فشانی اُسے اپنے پرچے کی زینت بنائے تو کیا یہ ظلم نہیں ہوگا؟

حکیم یوسف حسن

میرا اندازہ یہ ہے کہ اب تک کسی نے بھی اس مسئلے کے اس پہلو پر سوچا ہی نہ تھا۔ بظاہر تو یہ سہانا خواب ہے۔ مگر اس کی تعبیر بے حد خوفناک۔

ارادہ نہ تھا کہ اس مسئلے میں احباب کو بھی زحمت دیتا جو ہو جاتا سو ہے کی حد تک صحیح ہی کیا ہے۔ ... دی تو وہ پہلے ہی سے بیٹھے تھے۔ ساتھ ہولیے۔ اب میں اس سلسلے کو پوری معقولیت کے ساتھ اور آگے بڑھاؤں گا۔ پاک و ہند کے سارے ادیب میرے دوست ہیں، میرے بھائی ہیں۔ وہ میری بات سنیں گے اور ہماری جائز مشکلوں میں ہمارا ساتھ بھی دیں گے۔

سب سے پہلے تو انتخابی پرچوں پر یہ چوٹ پڑی کہ انھیں مصنفین کو بھی معاوضہ دینا پڑ گیا۔ ورنہ صاحب پہلے کون پوچھنے والا تھا۔ میں نے اس مسئلے کو اٹھایا۔ رائٹرز گلڈ نے غور کیا۔ نتیجہ معاوضے کی صورت مصنف کے حق میں نکلا۔

سوال یہ ہے کہ کیا معاوضہ مل جانے پر مصنف کے حقوق کی پوری پوری حفاظت ہوجاتی ہے۔ اس سلسلے میں ہاجرہ مسرور صاحبہ کا ایک انٹرویو قابل توجہ ہے۔ جو ہفت روزہ نصرت (۲۴ اپریل سنہ ۱۹۶۱ء) میں چھپا تھا۔

"دراصل افسانے کے تنزل کا پراپیگنڈا کرنے میں کسی حد تک ہمارے ناشروں کا بھی ہاتھ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ افسانوں کا مجموعہ اب بکتا ہی نہیں لہٰذا اسے شائع کرنا خسارے کا سودا ہے۔ وہ لوگ بھی ایک حد تک سچے ہیں۔ اگر آج ایک افسانہ کسی پرچے میں چھپتا ہے تو دوسرے رسالے اُسے نقل کرکے حسب توفیق استفادہ کرلیتے ہیں۔ پھر رہی سہی کسر ہمارے چند ایک ریڈرز ڈائجسٹ قسم کے پرچے نکال دیتے ہیں۔ میرا اپنا ایک افسانہ "مول تول" اب تک چھ دفعہ شائع ہوچکا ہے۔ اس طرح ایک افسانہ قاری کی ایک بڑی تعداد کی نظر سے گزر جاتا ہے۔ اور جب ایک مصنف کے ایسے ہی افسانے مجموعے کی شکل میں شائع ہوتے ہیں تو قاری انھیں پہلے ہی متعدد بار پڑھ چکا ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ مجموعہ خریدنے میں پوری دلچسپی نہیں لیتا۔"

بعض دوست یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہمارا افسانہ پانچ دس پرچوں میں نقل ہوجائے گا تو اس سے ہماری پبلسٹی میں اضافہ ہوگا۔ یہ بات ایک مبتدی کے لیے تو شاید سودمند ہو۔ مگر جس ادیب کا ادب میں کوئی مقام ہے اور اس کی کتابیں بھی چھپتی ہوں۔ اس کے لیے یہ سودا قطعاً سودمند نہیں۔ اس ضمن میں ہاجرہ مسرور صاحبہ کا تجزیہ بہرصورت قابل غور ہے۔ اگر انتخابی پرچوں کی روش یہی رہی تو نوبت یہاں تک پہنچنے کا خطرہ ہے کہ ادیب کو اپنی دائمی زندگی برقرار رکھنے کے لیے خود اپنی گرہ سے اپنی کتابیں چھپوانا پڑیں گی۔

رسائل قاری اور مصنف کے درمیان ایک طرح کا رابطہ ہوتے ہیں۔ آج جتنے بھی بڑے بڑے ادیب نظر آتے ہیں۔ انھوں نے پہلے پہل

رسائل ہی میں لکھنا سیکھا۔ کسی نے نیرنگِ خیال میں، کسی نے ادبِ لطیف میں، کسی نے ساقی میں (وغیرہم)۔ رسائل ہی کے ذریعہ ادیب نامور ہوئے اگر نئے اور ذہین قلمکاروں کی ذہنی کاوشوں کو یہ رسالے منظرِ عام پر نہ لاتے تو آج کئی بڑے ادیبوں کا وجود ہی نہ ہوتا۔ وہ اپنی تمام تر قابلیتوں کے باوجود گوشۂ گمنامی میں پڑے رہ جاتے۔ ظاہر ہے کہ ادب کی بقا اور نشو و نما کے لیے اچھے اچھے ادبی رسالوں کا وجود بے حد ضروری ہے جو اچھے لکھنے والوں کے جوہروں کو، دربھی بنا سنوار کے قارئین کے سامنے پیش کریں اور جو بالکل مبتدی ہوں۔ ان کی اس انداز میں تربیت کریں کہ وہ مستقبل کے ایسے ادیب بن سکیں۔ جن پر ادب فخر کرے۔ بے شک ہر نیا ادیب اپنی ہی صلاحیتوں سے چمکتا ہے۔ مگر اس میں مدیرانِ رسائل کی جانکنی بھی شامل ہوتی ہے۔ میرے نزدیک تو اچھے رسائل نئے ادیبوں کے لیے ٹریننگ اسکول ہوتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ وہ رسائل جو ادب کی ترویج و ترقی کی بنیاد ہیں۔ وہ آج انتخابی پرچوں کے ہاتھوں اپنی آبرو لٹوا رہے ہیں۔ اس لیے کہ ہمارے یہ دوست محض ذاتی تجارت کی خاطر، ہر پرچے سے پانچ دس چیزیں اُڑا لیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو پرچے صحیح معنوں میں ادب کی خدمت کر رہے ہیں وہ سخت پریشان ہیں۔ ان کی اشاعت پر یہ پرچے اثر انداز ہو رہے ہیں اور ایک وقت آئے گا کہ جن کے دم سے اُردو ادب کی ترویج و ترقی کی روایات وابستہ ہیں۔ وہ سب دم توڑ دیں گے۔ آج انتخابی پرچوں کی حوصلہ افزائی کا بالکل یہی مطلب ہے کہ ادب کی جڑوں کو کاٹ کر رکھ دیا جائے، ور شاخوں اور پتوں کی نشوونما ہی کو ادب کی ترویج و ترقی سمجھ لیا جائے۔

بعض دوست یہ کہتے ہیں کہ ادارۂ نقوش نے بھی تو تین چار نمبر صرف انتخابات پر مشتمل چھاپے ہیں۔ جی ہاں، یہ جرم سرزد ہو چکا ہے نقوش نے اپنی تیرہ سالہ زندگی میں، صرف چار نمبر (افسانہ نمبر، غزل نمبر، طنز و مزاح نمبر اور آخر میں خود نقوش ہی کا انتخاب ادبِ عالیہ نمبر) ایسے چھاپے ہیں۔ جو لوگ موجودہ انتخابی پرچوں سے اُن کا مقابلہ کرتے ہیں۔ وہ بڑے بے درد ہیں۔ اس لیے کہ میں نے ایک ایک نمبر پر برسوں ہی محنت کی۔ اگر میں اور مجھ سے پہلے کچھ اور باہمت حضرات ایسا نہ کرتے تو آج نہ کوئی تذکرہ ملتا اور نہ اُردو ادب کی تاریخ ہی کا کوئی سراغ ملتا۔ دوسرے میں نے آج کے پرچوں کو اُٹھا کر لال پنسل سے نشان نہیں لگا دیئے تھے جو کسی پر زد پڑتی۔

آج انتخابی پرچے چھاپنے والے، کسی نہ کسی حیثیت میں، پہلے نئی چیزیں ہی حاصل کر کے اپنے رسالے چھاپا کرتے تھے۔ وہ کام کٹھن تھا۔ محنت طلب تھا۔ سوجھ بوجھ چاہتا تھا۔ اس لیے یہ لوگ اس امتحان میں پورے نہ اُترے۔ مارکیٹ میں اُن کے پرچوں کو کوئی اہمیت حاصل نہ ہوئی۔ اس طرح جب نقصان ہوا تو انھوں نے تعمیری کام کرنے والے پرچوں پر ہلہ بول دیا۔ اب اُن کی قینچی ہے اور ہم مدیرانِ رسائل کی محنتوں کا خون!

اس مہم میں مَیں اکیلا نہیں ہوں۔ مدیرانِ رسائل میرے ساتھ ہیں۔ ادیب میرے ساتھ ہیں۔ اس لیے ہم اپنے اُن دوستوں کو ضرور سمجھا سکیں گے۔ جو اس وقت اپنی ذاتی منفعت کی بنا پر، علم و ادب کی خدمت کا دعویٰ کر رہے ہیں۔

محمد طفیل

مولانا ابوالکلام کی قدیم تحریریں

قاضی عبدالودود

ہندوستان میں ایک [illegible] ابوالکلام [illegible] سب سے [illegible] اور [illegible] میں [illegible] ہے۔ اس [illegible] سے معلوم ہوتا ہے کہ [illegible] [illegible] سے [illegible] ہیں فہرست [illegible] [illegible] کرنے والے [illegible] ۱۹۰۳ء میں شائع ہوا [illegible] وکیل [illegible] ۱۹۰۶ء [illegible] [illegible] کی کوئی [illegible] ۱۹۰۳ء کے کسی [illegible] میری نظر سے نہیں گزرا۔

ابتدا میں آزاد کا تعلق غالب رنجور بدایونی کے [illegible] کی بدولت قائم ہوا تھا اور عجب نہیں کہ ۱۹۰۳ء سے قبل بھی ان کی کوئی تحریر اس میں شائع ہوئی ہو۔ اس [illegible] کے بعد کہ ۱۹۰۶ء تک اس سے تعلق کے باقی رہنے کا ثبوت موجود ہے۔ آزاد کا جو مضمون نقل ہوگا اس میں نہ استدلال کا زور ہے اور نہ اسلوب بیان کی خوبی۔

فہرست سے معلوم ہوتا ہے کہ آزاد کا "وکیل" سے تعلق ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوا، لیکن جو مضمون "وکیل" سے نقل ہوگا اس کے آخر میں مرقوم ہے "مضمون نگار وکیل امرتسر"۔ ممکن ہے یہ عارضی قیام ہو اور بعد میں وکیل سے مستقل تعلق بعد کو قائم ہوا ہو۔ اس مضمون کا اسلوب بیان نسبتاً بہتر ہے مگر اس میں کوئی خاص خوبی نہیں۔ یہ مضمون جس وقت طبع ہوا تھا آزاد سید احمد خاں کے بڑے مداح تھے۔ [illegible] صاحب نے اپنے مضمون (آزاد نمبر "اردو ادب") میں اس کا اعتراف کیا ہے مگر ساتھ ساتھ یہ لکھا ہے کہ ابتدائی زمانے میں بھی آزاد کو سید احمد خاں سے سیاسی اختلاف تھا۔ یہ ہرگز صحیح نہیں۔ خود آزاد کی بعض تحریروں سے کامل ہمنوائی ثابت ہے۔

"اک بتِ سیمیں بدن سے کرلیا لندن میں عقد"

"ہیں! یہ تم نے کیا کہا، "اک بت سیمیں بدن سے کرلیا لندن میں عقد؟" "جی ہاں!" "ضعف! کرلیا لندن میں عقد؟" "آخر کیا وجہ؟ کیوں کر لیا لندن میں عقد؟" "بس یہ نہ پوچھیے۔" "کیوں، کس لیے؟ کیا آپ کو ہندوستان میں کوئی پری تمثال ایسی نہیں ملی تھی کہ آپ کو معشوقانِ یورپ کی تلاش ہوئی؟ کیا آپ کو ہندوستان میں کوئی سیمیں بدن نہیں نظر آئی تھی کہ [illegible] (کذا) والا کو مسانِ[?] یورپ کی طرف توجہ

کرتی ہیں؟ بھلا ایک مسلمان کے لیے یہ بات نازیبا نہیں ہے کہ وہ اپنی قوم اور اپنے خاندان کو چھوڑ کر غیر قوم، غیر مذہب، غیر خیال کی طبیعتوں سے تعلق پیدا کرے، کیوں جناب! فرمائیے نہیں، مغلس نہ سمجھئے ادھر دیکھئے، کیا آپ کے کانشنس نے آپ کو اس امر کی اجازت دی ہے کہ آپ بلا ضرورت اس قوم سے کوئی تعلق پیدا کریں (وکذا) ہیں آپ ... قدرت نے متضاد طبیعتیں رکھی ہوں؟"

"واہ حضرت وا! آپ بھی اسی پرانی لکیر کے فقیر نکلے۔ ابھی تک پرانے خیالات سے آپ کا دماغ خالی نہیں ہوا ہے ناصح (وکذا) نئی روشنی کی تیز شعاعوں سے محروم رہا ہے ورنہ اس قدر تاریکی اس میں نہ ہوتی۔ آجکل کی حالت سے آپ بالکل بے خبر ہیں یا ہیں۔ یا خواب دیکھ رہے ہیں۔ فی زمانہ اس امر کی سخت ضرورت ہے کہ فاتح قوم سے اب ہندو قوم رابطہ پیدا کریں اور میل جول بڑھائیں تاکہ ان میں ہم میں اُنس پیدا ہو اور وہ وحشت نہ رہے جو جاری ترقی میں (جو فاتح قوم کی توجہ پر موقوف ہے) حائل ہوتی ہے۔ علاوہ اس کے انھیں اس امر کا موقع دیا جائے کہ وہ اپنے شکوک کو جو مسلمانوں کی جانب مذہبی اور پولیٹیکل امور میں ان سے دور ہیں جیسے ہوئے ہیں رفع کریں اس لیے اگر یہ قوی تعلق پیدا ہو جائے تو جس ان امور کا بہت اچھا موقع ہاتھ آئے گا۔ بس اسی خیال سے آج خاص خاص لوگوں نے بھی ... سے میل جول کر لیا (وکذا) ہیں۔"

"کیا خوب! اے جناب! کیا فاتح قوم سے میل جول بڑھانے کے یہی معنی ہیں کہ ان سے یہ تعلق پیدا کیا جائے؟ کیا مواصلت مشارکت امور ... وغیرہ باعث میل جول کے نہیں ہیں؟ ان الاسباب المحبۃ اربعۃ اشیاء المجالسۃ والمکالمۃ والماکلۃ والمہاداۃ (وکذا) میں میل جول کے سب یہ باتیں کچھ کم ہیں؟ اور آپ کا یہ کہنا کہ ان کی توجہ ہماری ترقی کا ذریعہ ہے محض غلط ہے۔ آپ کسی ترقی یافتہ قوم کی مثال نہیں پیش کر سکتے کہ گورنمنٹ یا فاتح قوم کی توجہ سے ترقی پائی ہو بلکہ جن قوموں میں سلف ہلپ کا خیال قدرت نے پیدا کر دیا ہے انھوں نے خود ترقی کے اسباب پیدا کیے۔ خود مدارس جاری کیے، خود علوم و فنون کی تکمیل کے لیے دار العلوم قائم کیے، خود آرٹ کے اسکول کھولے بلا امداد غیر اپنے خیال اور رائے کی مدد سے بے شک وہ ترقی کر گئے چنانچہ اس کی مثال کے لیے اہل یورپ کافی ہیں۔ ہاں ایسے موقعوں میں گورنمنٹ ہمارا معاون و مددگار ہے اور یہ اس کا فرض ہے مگر اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں۔

جواب ندارد..... (کچھ دیر بعد)... "اچھا جانے دیجئے یہ وجہ نہ سہی لیکن فرمائیے جناب کہ اسلام نے تو اہل کتاب سے ہم کو اس تعلق کی اجازت دی تھی پھر جانے کیا گفتگو کیا ہے؟"

"ہاں! آئیے اب آپ مذہب کے دامنگیر ہوئے ہیں۔ سنئے مذہب اسلام نے جس زمانے میں اس امر کی اجازت دی تھی بلا اس کے اس زمانے میں چارہ بھی نہ تھا۔ علاوہ اس کے مذہب اسلام کی آزادی اپنی یہ معنی رکھتی ہے کہ مذہب اسلام انسانی ضرورتوں کے لیے ایک حد تک آزادی دینے والا ہے اور اس میں نہایت تسہیل ملحوظ رکھی گئی ہے جس سے اس کی جامعیت اور نافعیت متحقق ہو اور اکثر مواقع میں جب کہ اتفاقیہ اس تعلق کی ضرورت ہو تو اہل کتاب سے مذہب کی ممانعت بیچ میں حائل نہ ہو، نہ یہ کہ بلا کسی خیال مصلحت کے ہر زمانے میں اس پر زور دیا جائے۔ علاوہ اس کے اس زمانے میں آجکل کی قوم فاتح مستثنیٰ تھی، ہر طرف اسلامی سلطنت چھائی ہوئی تھی اس لیے اس تعلق سے مسلمانوں کو ہرگز ان مضرتوں اور برے اثروں کا خوف نہ تھا جس قدر کہ آج برعکس حالت پیش ہو جانے سے درپیش ہے۔ جس طرح کہ ہم مفتوح اور یورپین قوم فاتح ہے اسی طرح اس تعلق میں بھی عورت فاتح اور مرد مفتوح رہے گا۔ ایسی حالت میں اندازہ ہو سکتا ہے کہ اولاد پر کس قدر عورت کے اخلاق و عادات اور مذہب کا برا اثر پڑے گا؟

جیسوں باتیں مذہب میں ایسی جائز رکھی گئی ہیں، وہ اکثر مواقع کے لحاظ سے نقصان رساں ثابت ہوئی ہیں اس سے اس کی طرف سے بالکل چشم پوشی نہیں کرنی چاہیئے۔

موقلین۔ تو فرمایئے کہ اس تعلق کا کیا برا اثر اولاد پر پڑ سکتا ہے؟ اولاد پر باپ کا اثر زیادہ موثر ہوگا۔ جیسا کہ میرے نزدیک یہ بات مسلم معلوم ہوتی ہے۔ اگر آپ کوئی ایسا واقعہ پیش کر دیں کہ جس سے اس امر کی تصدیق ہو تو یہ آپ کا فرمانا بھی قرار دیا جائے ورنہ آپ نے کہا اور میں نے مانا۔

کیا آپ کو نہیں معلوم؟ آپ تو پڑھے لکھے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ شاید آپ نے مسٹر ایس۔ ایم۔ ...کی لکھی ہوئی کتاب "تاریخ" آپ نے دیکھی ہوگی۔ پہلے میں وہاں کا ایک تاریخی واقعہ جو اسلامی سلطنت میں واقع ہوا پیش کرتا ہوں۔ اس سے آپ اندازہ فرما لیجئے گا کہ اس کا یورپین سلطنت ہے اور اس زمانے میں اسلامی اور نصرانی تعلق تھا، جیسا کہ ایسا واقعہ پیش آیا۔ اس واقعے کو سرسری طور پر شاید آپ دیکھ چکے ہیں۔ اندلس میں جب کہ عبدالرحمن ثانی کی سلطنت تھی اور جس نے عیسائیوں کو مذہبی آزادی دے رکھی تھی، ایک بھائی بہن واقعے کے لحاظ سے اندلس گزرے ہیں۔ ایک لڑکی تھی جس کا نام فلورا تھا اور اس کا بھائی زیاد ناؤ تھا۔ فلورا کا باپ ایک اندلسی منصفی مسلمان تھا جس نے ایک عیسائی حسین عورت سے عشق پیدا کر لیا تھا اس سے فلورا پیدا ہوئی[1]۔ باوجودیکہ باپ مسلمان نے اسلامی نام رکھ کر اس کا ... کر دیا مگر اس عیسائی عورت نے اپنے طریقے کے موافق اپنی زبان میں اس کا نام فلورا رکھا۔ باپ ہر وقت گھر میں رہ نہیں سکتا تھا، ماں کا سایہ اس پر ہر وقت پڑتا تھا اس سبب سے فلورا کے دل میں عیسائی مذہب کی ... جما دیں۔ ماں مرگئی، باپ مرگیا، بھائی زیاد صرف باقی رہا۔ زیاد نے فلورا کو حاصل کرنے کی کوشش کی تاکہ وہ ایک مسلمان کے نیچے سے نکل جائے۔ فلورا کو زیاد نے ہر چند سمجھایا کہ مذہب اسلام ... مگر ہنوز ... نہ لگی تھی نہ لگی۔ معاملے نے طول پکڑا، زیاد کے گھر عیسائی آنے لگیں اور اس کے نکالنے کی کوشش کرنے لگیں۔ زیاد نے بڑی خوب انتظام کیا مگر بے سود۔ فلورا نکل اور کہاں کہاں پہنچی۔ زیاد اس کی تلاش میں پریشان ہوا۔ کہاں کہاں کی خاک چھانی اور کدھر کدھر کی مٹی اڑائی۔ بالآخر بہت سخت سخت واقعے اس کی بدولت پیش آئے۔ سلطنت کو حیرانی ہوئی، رعایا کو پریشانی، زیاد اور فلورا دونوں برباد ہوئے اور دیکھنے والے افسوسناک نگاہ سے دیکھتے رہے۔ الغرض باوجودیکہ فاتح قوم مسلمان تھی لیکن پھر بھی اسی تعلق نے کیا کیا گل کھلائے، کتنے خاندان برباد ہوئے، کتنے جان سے گئے، تمام اسلامی اور عیسائی دنیا میں تہلکہ مچ گیا۔ یہ سب کچھ کیوں ہوا؟ کس سبب سے ہوا؟ یہ سب اسی تعلق کی وجہ سے ہوا۔ اسی کم بخت تعلق نے یہ سب کچھ کیا جس کی یہ کچھ آپ تعریف کر رہے ہیں۔ اب غور فرمایئے کہ آج کل فاتح قوم کا اثر بالکل رعایا پر چھایا ہوا ہے۔ فاتح قوم سے یہ تعلق کیا ایسی نہیں پیدا کرتا، کر چکا ہے، اور نہ ... کرے گا۔

جواب ندارد۔۔۔۔ (ادھر ادھر دیکھ کر) "اچھا آپ (کھانس کر) جانے دیجئے۔ مگر۔۔۔۔۔ (کھانس کر) مگر اس کا کیا جواب ہے کہ ہم ایسے تعلیم یافتہ لوگوں کو تعلیم یافتہ عورتوں کی ضرورت ہے، وہ ابھی از ہندوستانیاں مفقود۔ پھر کیا کیا جائے؟ مجبوراً ہمیں دوسری تعلیم یافتہ معزز قوم (ذرا تبسم کے ساتھ) کی طرف توجہ کرنی پڑتی ہے۔ کیا ہم ایسے "تعلیم یافتہ" جاہلہ عورتوں کی زبان سے ننگی نگوڑی بہوت پریت

---

[1] اول کا نام فلورا طورنڈا ہے۔

کی جاہلانہ اور نامہربانی کی آوازیں سن سکتے ہیں؟"

۔۔ اتنی یہ آپ کا ارشاد ایک پہلو سے بجا ہے، جیسا کہ جناب چودھری خوشی محمد صاحب ناظر نے اس پر کانفرنس کے کیمپ میں ظاہر کیا۔ تب۔ اس جماعت نسواں سے یہ اچھا عذر آپ کے ہاتھ آگیا ہے اور جب تک تعلیم نسواں کا خیال ہندوستان میں نہ ہو گا اس حق (کذا) کا آپ کو موقع ملتا ہے کہ ابھی حضرت نہیں اگر آپ محب قوم ہیں تو آپ کو چاہیے کہ آپ تعلیم نسواں کو جاری کرنے کی کوشش کریں اور عورتوں کو اس قابل بنائیں کہ ان سے عقد کریں تاکہ یہ ضرورت قوم کو تعلیم پر آمادہ کرے۔ نہ یہ کہ آپ یہ عذر پیش کرکے غیر قوم کی تعلیم یافتہ لیڈیوں کو یہ پہلو نشاط کے مزے میں (خاک مزے ہیں) زندگی بسر کریں اور اس سے مستغنی ہو جائیں سوا اس کے جو ہندوستانیوں نے یہ تعلق کیا ہے ان میں اکثر ایسے نکلیں گے جو اپنے اس کیے پر پشیمان ہو رہے ہیں اور اس خرچ اور آزادی کے متحمل نہیں ہو سکتے جو اس سبب سے کرنے پڑتے ہیں (کذا) کیا آپ کسی ایک معزز شخص کے حالات سے بھی واقف نہیں جنھوں نے یہ تعلق پیدا کرکے تقریباً اپنی زندگی تلخ کر رکھی ہو؟ مگر افسوس ہے کہ اس پر بھی آپ ایسے (کذا) ناواقفوں کی آنکھیں نہیں کھلتیں اور یورپ کی سفید رو لیڈیوں کو دیکھ کر چکا چوند ہو جاتی ہیں۔ مگر ہاں! یہ ضرور ہے کہ آپ لوگ ایک حد تک معذور اور مجبور بھی ہیں۔ یہ سب کچھ کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ لندن میں تعلیمی خیال سے ایک جوشیلے نوجوان کا جانا اور وہاں چار طرف حسن ہی حسن کا نظر آنا ایک ایسا نظارہ ہے جسے دیکھ کر بے اختیار نہ ہونا مشکل امر ہے۔

ہمارے مکرم دوست سید اکبر حسین صاحب سشن جج سہارنپور نے تعلیم یافتہ گروہ پر سے اس اعتراض کو رفع کرنے کی نرم کوشش کی ہے اور ایک عجیب و غریب دلچسپ نظم لکھی ہے۔ اس نظم نے ہم کو بہت ہی لطف حاصل کرنے کا موقع دیا ہے۔ ہم نہیں پسند کرتے کہ اس لطف سے ناظرین "پنچ" محروم رہیں ایسی حالت میں کہ اس کا پہلا مصرع عنوان پر ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ اس نظم میں انھوں نے یہ اعتراض رفع کیا ہے اس کی داد ناظرین پر چھوڑتا ہوں۔

قطعہ۔

اک مس سیمیں بدن سے کر لیا لندن میں عقد   اس خطا پر سن رہا ہوں طعنہ ہائے دل خراش
کوئی کہتا ہے کہ بس اس نے بگاڑی نسل و قوم   کوئی کہتا ہے کہ ہے یہ بد خصال و بد معاش
دل میں کچھ انصاف کرتا ہی نہیں کوئی بزرگ   ہو کے خود مجبور یہ کرتا ہوں اس پردے کو فاش
ہو رہی تھی تاکید لندن جاؤ انگریزی پڑھو   قوم انگلش سے ملو سیکھو وہی طرز معاش[۱]
جگمگاتے ہوٹلوں میں جا کے نظارے کرو   سوپ و کاری کی طرف راغب ہو چھوڑو دال ماش
جب عمل اس پر کیا پریوں کا سایہ پڑ گیا   جس سے تھا دل کی حرارت کو سراسر انتعاش
سامنے تھیں لیڈیاں زہرہ وش و جادو نظر   یاں جوانی کی امنگ اور ان کو عاشق کی تلاش
دونوں جانب تھا دلوں میں جوشش خون[۲] فتنہ زا   دل ہی تھا آخر نہیں تھی برف کی یہ کوئی قاش

۱؎ کذا   ۲؎ یہاں پر کاغذ پھٹ گیا ہے۔ خون کا حرف ن موجود ہے۔

اس کی [illegible] | جان اس کی [illegible] اس کی [illegible]
[illegible] | [illegible]
[illegible] | حضرت سید سے جا کر [illegible]
[illegible] | [illegible] ہشیار باش

مرحوم حضرت آپ نے جو [illegible] بیان کی ہیں ان کی وہ تمام تصدیق کر سکتے ہیں جو ان کو پیچھے [illegible] دیکھ چکے ہیں۔ آپ میں کوئی شک نہیں کہ شیخ کامل (کذا) لندن جانے والوں کے ساتھ بھی یہی حال ہے۔ راقم حضرت آغا [illegible]۔

بقلم ابوالکلام محی الدین احمد [illegible] کلکتہ۔

ممالک اسلامیہ اور سید احمد خانی خیالات

راز [illegible] ظاہر ہوا!
اب تو ہے سب کی زبان پر جو ہمارے سینہ میں ہے

سید احمد خان مرحوم کی بے نظیر فطری قابلیت، بے مثل عالی دماغی اور ان کی اسلامی تحقیقات کی قدر اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ جو آواز اب سے تیس چالیس برس پیشتر اس اسلامی دور کے آخری مجدد کی زبانی سرزمین ہند میں بلند ہوئی تھی آج مصر، اسلامبول اور خود ہندوستان کے ہر روشن خیال اور تعلیم یافتہ شخص کی زبان سے نکل رہی ہے۔ وہ راگ جو اس زمانے میں ہمارے کانوں کو نہایت ناگوار [illegible] تھا اور جسے ہم اپنے خیال میں بے وقت کی راگنی سمجھ رہے تھے آج ہمارے تعلیم یافتہ کانوں کو نہایت [illegible] معلوم ہوتا ہے اور ہم بھی کہ اس راگ پرست ہوتے جاتے ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص اسی راگ پر مٹا ہوا ہے۔ کھلی مخالفت خود ہم کو اب شرمناک معلوم ہوتی ہے اور تعجب ہے کہ ایسی صاف اور صریح باتیں بھی تعصب اور (کذا) جہالت کے سبب ہی کیونکر ہمیں ناگوار معلوم ہوتی تھیں۔ اس زمانے میں سید[1] کی مثال ایک ایسے روشن ضمیر مدبر کی سی ہے جو غفلت اور ناواقفی کے زمانے میں ایک اونچے پہاڑ کی بلند چوٹی پر چڑھ کر اپنی غافل قوم کو ایسی تعلیم دینا شروع کر دے جسے ان کی جہالت اور غفلت سے کوئی نسبت نہ ہو۔ ان کے کمزور خیالات ان کی حد سے بڑھی ہوئی غفلت اس تعلیم کے حاصل کرنے کی متحمل نہ ہو۔ وہ اس روشن ضمیر کے روشن خیالات پر ہنسیں اور اس کی عاقلانہ تعلیم کو دیوانگی سے تعبیر کریں۔ جہالت کا زور ان کی طبیعتوں پر یہاں تک غالب آئے کہ وہ اس محب قوم کو دشمن ملت سمجھ کر اس کی مخالفت پر آمادہ ہو جائیں۔ تعصب کا خوفناک دیو ان کی عقل پر یہاں تک مستولی ہو جائے کہ وہ اپنے جان و ایمان کے فدائی کی جان لینے اور اس خدمت قومی کے عوض ہر طرح طرح کی تکلیفیں دینے میں [illegible] سمجھیں مگر وہ روشن ضمیر مدبر اور محب قوم ان کی ان جاہلانہ حرکتوں کو بچوں کی نادان حرکات سے تشبیہ دے اور انھیں اپنی بھلائی اور برائی سے ناواقف سمجھ کر انھیں ایسی قابل سرزنش حرکتوں پر بھی معذور رکھے لیکن یہ پکار پکار کر کہے کہ اس زمانے کو دور نہ سمجھو جب تم میں اپنی برائی بھلائی کی تمیز ہو جائے گی اور تم وہ سمجھو گے جو میں آج سمجھ رہا ہوں اور وہ جانو گے جو میں آج جان رہا ہوں۔

۱؎ سید کے نیچے سر سید احمد خان مرحوم

اس وقت نہ میری اس محنت کی قدر کرو گے اور نصیب میری خدمتِ قومی اور محبتِ وطنی یاد آئے گی۔ سرسید نے ہی سب سے پہلے یہ دعویٰ کیا کہ اگر بائیبل پر صحیح اصول پر تفسیر کی جائے تو وہ اختلاف دور ہو جائے جو بائیبل کے مطالب اور قرآن مجید میں مدت سے مانا جاتا ہے اور ثابت ہو جائے کہ تثلیث کے مسئلے کو الہامی بائیبل سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ خود عیسائیوں کا ساختہ پرداختہ مضمون ہے۔ اسی دعوے کا عملی ثبوت تبیین الکلام کی تین جلدوں سے ملتا ہے جو سرسید نے اس زمانے میں لکھ کر شائع کی تھیں۔ یہی وہ ضرورت جس نے سرسید کو اس قسم کے رسالے لکھنے پر آمادہ کیا تھا ایک مدت کے بعد مصر میں ایک عیسائی عالم نے محسوس کی اور وحدت ادیان کے نام سے ایک اخبار جاری کیا جس کی اصلی غرض یہ تھی کہ یہ مقصد اسلام، نصرانیت اور یہودیت پر ظاہر کر کے انہیں وحدت فی الادیان پر آمادہ کیا جائے۔ سرسید ہی دنیائے اسلام میں وہ پہلا شخص ہے جس نے پہلے پہل یہ ضرورت محسوس کی کہ جدید فلسفے کے مقابلے میں جدید علم الکلام کی ضرورت ہے اور قدیم متکلمین کی تصنیفات موجودہ علوم کے لیے کافی نہیں ہیں۔ اگرچہ اس زمانے میں علمائے اسلام نے اس خیال کی بڑی مخالفت کی لیکن آگے چل کر زمانے نے یہ راز بھی اچھی طرح سمجھا دیا۔ خود علماء اس طرف متوجہ ہوئے اور علم کلام کا جدید اسلوب پر ترتیب دینا اسلام کی اصلی خدمت سمجھی گئی۔ ندوۃ العلماء کے ابتدائی جلسوں کی رپورٹ سامنے رکھو اور شاہ سلیمان صاحب پھلواری اور مولوی محمد حسین صاحب الہ آبادی، مولوی محمد ابراہیم صاحب آروی مرحوم کی تقریریں دیکھو اسی ضرورت کا رونا نظر آئے گا جس کے پیش کرنے پر انہیں علمائے ایک زمانے میں سرسید کی تکفیر کی تھی۔ ممالک اسلامیہ میں اس ضرورت پر ایک عرصے سے توجہ ہو رہی ہے۔ رسالۃ الحمیدیہ جو اسی موضوع پر ایک طرابلسی عالم کی تصنیف ہے، ہندوستان میں اچھی طرح شائع ہو چکا ہے اس کے علاوہ الحق الصریح، الاسلام والمدنیہ وغیرہ کئی کتابیں اسی ضرورت پر مصر و بغداد میں شائع ہوئی ہیں۔ مصر اور اسلامبول کے اسلامی رسالوں میں اکثر یہ بحث چھڑی رہتی ہے اور اس پر مبسوط تحریریں لکھی جاتی ہیں۔ المنار مصر کے جس نے غور سے یہ فائل دیکھے ہیں وہ ہمارے قول کی تصدیق کر سکتا ہے۔ مصر کے مفتی اور جامع ازہر کے کلیہ شیخ محمد عبدہ دنیائے اسلام میں ایک بے بدل عالم و فاضل تسلیم کیے جاتے ہیں، المنار میں آج کل آپ کے درس قرآن کا اقتباس تفسیر القرآن کے عنوان سے شائع ہو رہا ہے جس میں اسی اصول پر قرآن شریف کی تفسیر کی جاتی ہے جو کبھی ہندوستان میں مستوجب تکفیر سمجھا گیا تھا۔ حال میں مصر کے ایک روشن خیال عالم محمد فرید وجدی کی اسی موضوع پر ایک مبسوط کتاب ماہواری رسالے کی طرح مسلسل شائع ہو رہی ہے جس کا نام الاسلام فی عصر العلم ہے۔ افسوس جو خیال اب سے ۳۰ برس پہلے سرسید مرحوم نے ظاہر کیا تھا وہی خیال آج کل اسلامی دنیا کا ہو رہا ہے اور انسان فطرتاً آزاد ہے اور اس کی یہ آزادی کسی خارجی اثر سے زائل نہیں ہوتی۔ قدیم فلاسفہ اس قدرتی آزادی کی تہ کو نہ پہنچ سکے اور دنیا میں غلامی کی خلافِ فطرت رسم پیدا ہو گئی۔ افلاطون الٰہی نے انسانی فطرت میں استثنا کو دخل دیا اور صرف اہلِ یونان کو آزادی کا مستحق قرار دیا۔ اسی طرح یورپ بھی ایک عرصے تک غلامی کا حامی رہا لیکن جب علم کی روشنی جہالت کی تاریکی پر غالب آئی تو تمام یورپ نے انسان کو فطرۃً آزاد تسلیم کر لیا اور ایک یورپین کو جس آزادی کا مستحق سمجھا وہی استحقاق ایک حبشی اور سرکیشین کے لیے لازمی قرار دیا لیکن برخلاف اس کے اسلامی دنیا ایک عرصے سے غلامی کو جائز سمجھ رہی ہے اور عام طور پر وہاں اس کا رواج ترقی کر رہا ہے۔ سلطان المعظم کا تمام محل سرکیشین لونڈیوں سے آباد ہے اور حرمین شریفین کی رونق غلاموں سے کی جا رہی ہے۔ یورپ اسلام پر بڑے زور سے معترض ہے کہ اسلام انسان کو اس کی فطری آزادی سے محروم رکھتا ہے اور غلامی کی ناپاک رسم کا حامی ہے۔ اس اعتراض کے رفع کرنے کا سب سے پہلے اسلامی دنیا میں سرسید کو خیال ہوا اور مرحوم نے "ایسیز آن دی لائف آف محمد" میں عقلی و نقلی دلائل سے اسلام کو اس رسم کی اعانت سے بری ثابت کیا اور لکھا کہ مسلمانوں کے افعال کا بانیٔ مذہب

[illegible]
[illegible] ... روشن خیال ... [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] ... مصنف کا ... [illegible]
[illegible]
[illegible] ... مصنف کی ... [illegible] ہے۔

غالب اور حادثۂ اسیری

(ایک معاصر شہادت اور قطعۂ تاریخ)

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

غالب کے واقعۂ اسیری کے حالات ابھی پوری طرح سامنے نہیں آئے۔ اس زمانے میں ذاتی وجاہت اور وضعداری کے آداب ہی کچھ ایسے تھے کہ انسانی کمزوریوں کو زیادہ سے زیادہ درپردہ رکھا جاتا تھا، اور ہر بات میں ایک خاص رکھ رکھاؤ اور سلیقہ برتنے کے انداز کو ترجیح دی جاتی تھی۔ فن کا دامن شرافت اور معصومیت سے کچھ اس طرح بندھا ہوا تھا کہ فنکار کی ذرا سی لغزش سے اس کی عظمت پر حرف آسکتا تھا۔ چنانچہ غالب بھی قید کے واقعے کو اپنی بہت بڑی "بے آبروئی" تصور کرنے پر مجبور تھے۔ جہاں تک بن پڑا، انھوں نے اس واقعے کا ذکر نہیں کیا۔ غالب کے اولین سوانح نگار حالی نے بھی، چونکہ وہ قدیم اخلاق و آداب کے دلدادہ تھے، غالب کی سیرت کے ان پہلوؤں کو تحقیق کی روشنی میں لانا پسند نہیں کیا۔ بلکہ ان کی شخصیت کو زیادہ سے زیادہ مثالی بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی۔

عام شہرت کے برخلاف غالب قماربازی کے الزام میں ایک دفعہ نہیں دو دفعہ ماخوذ ہوئے تھے۔ پہلا واقعہ ۱۸۴۱ء کا اور دوسرا ۱۸۴۷ء کا ہے۔ مرزا حیرت دہلوی نے اپنی کتاب "چراغ دہلی" میں غالب کے حادثۂ اسیری کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے: "مرزا صاحب کے ساتھ بہت رعایت کی گئی۔ کسی قسم کی توہین نہیں ہوئی اور کسی نے ہتھکڑی تک نہیں لگایا بلکہ ضمانت پر رہا کر دیئے گئے۔"[1] اس روایت میں ظاہر ہے کہ غالب کے پہلے واقعۂ گرفتاری کا ذکر کیا گیا ہے، کیونکہ دوسری بار تو باوجود کوششوں کے قید ہو ہی گئی۔ پہلے واقعۂ گرفتاری سے متعلق ہماری معلومات کا مستند ترین ماخذ "دہلی اردو اخبار" ہے۔ جس میں غالب کی گرفتاری کی خبر ۱۵ اگست ۱۸۴۱ء کو چھپی تھی۔[2] یہاں سے اسے سب سے پہلے امداد صابری صاحب نے "تاریخ صحافت اردو" میں نقل کیا۔[3] لیکن انھوں نے غالب کی پہلی گرفتاری سے متعلق اس خبر کی اہمیت کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا۔ اس کی طرف پہلی بار ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے توجہ دلائی۔[4] مالک رام صاحب نے "ذکر غالب" کے تیسرے اڈیشن

---

[1] چراغ دہلی، حیرت دہلوی، ص ۲۲۷

[2] دہلی اردو اخبار، مورخہ ۱۵ اگست ۱۸۴۱ء مخزونہ نیشنل آرکائیوز آف انڈیا، نئی دہلی

[3] تاریخ صحافت اردو، امداد صابری، دہلی، جنوری ۱۹۵۳ء، ص ۱۴۰

[4] کلاسکی ادب، ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، دہلی، جولائی ۱۹۵۳ء، ص ۴

میں اس خبر کا ذکر امداد صابری صاحب سے ... نے دہلی اردو اخبار کی تاریخ ... لکھی ہے جو غلط ہے۔ غالب کی گرفتاری کی یہ خبر ۱۵ اگست ۱۸۴۱ء کے اردو اخبار میں شائع ہوئی تھی۔ اس خبر سے جو نکتے نکلتے ہیں غالب کے ... سے متعلق بعض اہم نتائج اخذ کرتے ہیں ... اس سے پہلے اسے ایک نظر دیکھ لینا ضروری ہے:

"... سنا گیا ہے کہ ان دنوں تھانہ گزر قاسم خاں میں ... نو جوان کے ... سے اکثر نامی قمار باز ... لئے مثلاً ... خاں وغیرہ کے ... کھیلتے ہیں بڑا لہ ... لیکن بسبب رعب اور کثرت مردم سے یا کسی طرح سے کوئی تھانہ دار دست انداز نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی ... سے دن ... نیا تھانہ دار جو قوم سے سید ... جری سنا جاتا ہے مقرر ہوا ہے۔ ... بہت مدت کا ذکر ہے ... ان میں بھی یہ بہت ... کرتا رہا ہے ... بنے تو ہے۔ ... مرزا ابوالقاسم ... نواب شمس الدین قاتل ولیم فریزر صاحب سے قرابت قریبہ میں ہے ... جب ... کی سعی و سفارش ... لیکن ... وجاہت کو کام فرمایا ... سب کو گرفتار کیا۔ عدالت سے جرمانہ علیٰ قدر مراتب ہوا۔ مرزا ابوالقاسم پر سو روپے۔ سزا ادا نہ کریں تو چار مہینے قید ... کی خدا ... دیانت کو کام ... اس علاقہ میں بہت رشتہ دار ... کے ہیں۔ کچھ تعجب نہیں کہ وقت بے وقت چوٹ چیٹ کریں ... دیانت ان کی وبال جان ہو۔ حکام رسے تھانہ دار کو چاہیے کہ بہت عزیز رکھیں۔ ایسا آدمی کم یاب ہوتا ہے۔"[3]

حیرت ہے کہ اس واقعہ کا ذکر کسی دوسرے معاصر نے نہیں کیا۔ نہ ہی غالب نے اپنے اس طرح معتوب ہونے کی طرف کوئی اشارہ کیا ہے۔ یادگار غالب بھی اس واقعہ سے خالی ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ خود غالب نے یا ان کے کسی بہی خواہ نے جرمانہ کی رقم ادا کر دی اور اس طرح وہ قید کی آفت ناگہانی سے بچ گئے۔ دہلی اردو اخبار کے اس بیان پر مندرجہ ذیل تنقیحات قائم ہوتی ہیں:

۱۔ غالب کا مکان قمار بازی کا اڈا تھا۔

۲۔ اس میں بڑے بڑے نامی قمار باز شریک ہوتے تھے۔

۳۔ نیا تھانیدار جو قوم سے سید تھا، بہت بے طمع اور جری تھا۔

۴۔ تمام قمار باز گرفتار ہوئے اور عدالت سے علیٰ قدر مراتب جرمانہ ہوا۔

۵۔ مرزا غالب پر سو روپے جرمانہ اور عدم ادائیگی کی صورت میں چار ماہ قید کی سزا ہوئی۔

۶۔ اس خبر میں غالب کے قید ہونے کا کوئی ذکر نہیں۔

---

[1] ذکر غالب، مالک رام، (اشاعت سوم) دہلی ۱۹۵۵ء ص ۸۲

[2] یہ جملہ غور طلب ہے۔ بظاہر یہاں "قاتل ولیم فریزر کے قرابت قریبہ" کا کوئی محل نہ تھا۔ لیکن اس کے بعض مسطروں میں جو مفہوم جھلک رہا ہے وہ خاصا اہم ہے۔

[3] دہلی اردو اخبار مورخہ ۱۵ اگست ۱۸۴۱ء مخزونہ نیشنل آرکائیوز آف انڈیا، نئی دہلی۔

اس واقعے کے چھ برس بعد غالب قمار بازی کی وجہ سے دوسری بار ۱۸۴۷ء میں محبوس ہوئے۔ اس دفعہ احباب اعزہ کی سعی و سفارش کے باوجود رہا نہ ہو سکے۔ یہ واقعہ غالب پر سخت شاق گزرا۔ یہ وہی واقعۂ اسیری ہے جس سے متعلق غالب کے ایک معاصر شاعر کا بیان اور قطعہ تاریخ پیش کرنا مقصود ہے۔ اس سے چونکہ بعض اہم معلومات حاصل ہوتی ہیں، ان کا صحیح تجزیہ کرنے کے لیے اس واقعے سے متعلق خود غالب نے اور ان کے معاصرین کے بیانات کو سامنے رکھنا نہایت ضروری ہے۔ سب سے پہلے ان خبروں کو پیش کیا جاتا ہے جو غالب کے معاصر اخبارات میں ان کی گرفتاری کے دوران میں شائع ہوئی تھیں۔

(الف) غالب کے واقعۂ اسیری سے متعلق سب سے پہلی خبر جو اس وقت ہماری اطلاع میں ہے، ماسٹر رام چندر کے مرتب "فوائد الناظرین" دہلی میں مورخہ ۳۱ مئی ۱۸۴۷ء کو شائع ہوئی۔

"خبر دہلی: ۲۵ مئی کو بیچ مکان جناب مرزا نوشہ اسد اللہ خاں صاحب کے قمار بازی ہو رہی تھی۔ چنانچہ کوتوال صاحب خبر پا کر وہاں گئے اور جناب مرزا صاحب کو مع چند اور قمار بازوں کے گرفتار کر کے کوتوالی میں لے آئے۔ اب دیکھنا چاہیے کہ صاحب مجسٹریٹ ان کے متعلق کیا حکم دیتے ہیں۔"[1]

غالب کی گرفتاری کی تاریخ یعنی ۲۵ مئی ۱۸۴۷ء فقط اسی خبر سے معلوم ہوتی ہے۔ یہ خبر ان کی گرفتاری کے چھ روز بعد شائع ہوئی۔ مجسٹریٹ نے اپنا فیصلہ نہیں سنایا تھا۔ ظاہر ہے یہ زمانہ انھوں نے حوالات میں گزارا ہوگا۔

(ب) اس سلسلے کی دوسری خبر بمبئی کے احسن الاخبار کی ہے۔ اس اخبار میں دہلی اور دربار شاہی سے متعلق جو حالات چھپتے تھے ان کا ترجمہ خواجہ حسن نظامی نے "دہلی کا آخری سانس" کے نام سے کتابی صورت میں شائع کر دیا ہے۔ اس کتاب میں غالب کی گرفتاری کا ذکر ۲۵ جون ۱۸۴۷ء کی خبروں میں، یعنی گرفتاری کے پورے ایک ماہ بعد یوں آیا ہے:

"مرزا اسد اللہ خاں بہادر کو دشمنوں کی غلط اطلاعات کے باعث قمار بازی کے جرم میں قید کیا گیا۔ معظم الدولہ بہادر کے نام سفارشی چٹھی لکھی گئی کہ ان کو رہا کر دیا جائے۔ یہ معززین شہر میں سے ہیں اور جو کچھ ہوا ہے، محض حاسدوں کی فتنہ پردازی کا نتیجہ ہے۔ عدالت فوجداری سے نواب صاحب فلاں بہادر نے جواب دیا کہ مقدمہ عدالت کے سپرد ہے۔ ایسی حالت میں قانون سفارش کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔"[2]

۲ جولائی ۱۸۴۷ء کی خبروں میں پھر اس مقدمے کے فیصلے کا ذکر یوں آیا ہے:

"مرزا اسد اللہ خاں غالب پر عدالت فوجداری میں جو مقدمہ دائر تھا، اس کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ مرزا صاحب کو چھ مہینے قید بامشقت اور دو سو روپے جرمانے کی سزا

---

[1] ص ۸۰، شمارہ ۱۰۔ بحوالہ "قدیم اخبارات کی کچھ جلدیں" امتیاز علی عرشی، نوائے ادب اپریل ۱۹۵۸ء

[2] دہلی کا آخری سانس، خواجہ حسن نظامی ص ۱۷۱

جوئی اور دوسرے روپے شرط ادا نہیں ہوتی تو چوتھا [illegible] اور اس پر جوئے کا مزہ رہتا ہے
کے علاوہ اور تاش کے روپے زیادہ دور سے جاتے ہیں نوشت معاف ہو جاتے ہیں۔ جب
[illegible] بات ... جاتا ہے کہ [illegible] سے حاصل ہوتے ہیں سونے یا چیزی
کا تحفہ دیا جاتا ہے اور کوئی چیز ایسی نہیں جلتے تو [illegible] اس قدر شعف اور
شعب کا یہ دانت ہے مرزا صاحب کی طاقت سے باہر ہے۔ بلکہ [illegible]
ہے [illegible] کی بات ہے کہ اگر تفتیش جج کی عدالت میں جا پہنچ جائے اور اس مقدمہ
پر غور ثانی ہو تو نہ صرف [illegible] ہو جائے بلکہ عدالت [illegible] ہے مقدمہ
خارج ہو جائے۔ یہ بات [illegible] واقعات سے بالکل ظاہر ہے کہ ایسے باکمال
شخص کو جس کی عزت [illegible] کا جوہر لوگوں کے دلوں پر نقش ہو سکے معمولی جرم
میں اتنی سزا دی جائے جس سے [illegible] جائے قانونی احتمال ہے۔[1]

(ج) مولوی کریم الدین نے غالب کے واقعۂ اسیری کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"ان دنوں میں یعنی [illegible] ۱۸۴۷ء [illegible] ان پر جرمانہ سرکار سے [illegible] پڑا جس کے سبب ان کو بہت رنج لاحق حال ہوا ....."[2]

(د) حالی نے "یادگارِ غالب" میں غالب کی گرفتاری کے حالات پوری طرح بیان نہیں کیے۔ لہٰذا ان الفاظ میں صفائی پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

"مرزا کو شطرنج اور چوسر کھیلنے کی بہت عادت تھی اور چوسر جب کبھی کھیلتے تھے برائے نام کچھ بازی بد کر کھیلا کرتے تھے۔"[3]

(ہ) اس واقعہ سے متعلق کچھ اشارے سید ناصر نذیر فراق دہلوی کی کتاب "لال قلعہ کی ایک جھلک" میں بھی ملتے ہیں۔ جس میں قلعہ کے بعض حالات وہاں کی ایک قدیم ملازمہ بی خانم کی زبانی لکھے گئے ہیں۔ اس کے مطابق مرزا غالب کا مقدمہ کنور وزیر علی خاں کی عدالت میں پیش ہوا اور قبل از وقت رہائی لاٹ صاحب بہادر اور بڑے افسر کے اختیارات خاص کی وجہ سے ہوئی۔ گرفتاری کی وجہ انھوں نے یوں بیان کی ہے:

"کان گنہگار ہیں میں نے سنا کہ محبوب علی خاں خواجہ سرا اور شہر کے کئی اشراف آدمی مل کر راتوں کو جوا کھیلتے تھے اور لاکھ لاکھ روپے کی بازی لگائی جاتی تھی اور جو شخص جیتا تھا، محبوب خاں اس کی جیت کا روپیہ بہنگیوں میں لدوا کر اس کے گھر

---

[1] دہلی کا آخری سانس، خواجہ حسن نظامی صفحہ ۱۷۴ اور ۱۷۵

[2] کریم الدین، تذکرہ طبقات شعرائے ہند ۱۸۴۷ء، صفحہ ۳۷۸

[3] یادگار غالب، حالی، طبع لاہور، صفحہ ۲۷

بجھوا دیتا تھا۔ مرزا نوشہ (غالب) کی حیثیت اتنی بھاری بازی لگانے کی نہ تھی۔ مگر کرتوڑ نہیں۔
...... کسی نہ کسی طرح مرزا صاحب اس صحبت میں پہنچ گئے۔ کوتوال جواریوں کی گھات میں لگا ہوا تھا۔ آج اس کا داؤ لگ گیا۔ اس نے سب کو پکڑ دھر لیا:[1]

(۵) اس سلسلے میں مفصل بیان سراج الدین کا ہے۔ جسے مولانا ابوالکلام آزاد نے غلام رسول مہر کو ایک نوٹ کی صورت میں لکھا تھا۔ جو ان کی کتاب "غالب" میں شامل ہے۔ اس کے ضروری حصے یہاں نقل کئے جاتے ہیں:

"غدر سے پہلے مرزا کی آمدنی کا وسیلہ صرف سرکاری وظیفہ اور قلعہ کے پچاس روپے تھے[2] چونکہ زندگی رئیسانہ بسر کرنا چاہتے تھے اس لیے ہمیشہ مقروض و پریشان حال رہتے تھے۔ اس زمانے میں دہلی کے بے فکر رئیس زادوں اور چاندنی چوک کے بعض جوہری بچوں نے گزران وقت کے جو مشغلے اختیار کر رکھے تھے ان میں ایک قمار کا بھی مشغلہ تھا۔ گنجفہ عام طور پر کھیلا جاتا تھا اور شہر کے کئی دیوان خانوں کی مجلسیں اس باب میں شہرت رکھتی تھیں۔ مرزا بھی اس کے شائق تھے۔ رفتہ رفتہ ان کے یہاں چاندنی چوک کے بعض جوہری بچے آنے لگے اور باقاعدہ جوا بازی شروع ہو گئی۔ قمار کا عام قاعدہ یہ ہے کہ صاحب مجلس (یا یوں کہا جائے کہ مہتمم قمار خانہ) کا ایک خاص حصہ ہر بازی میں ہوا کرتا ہے۔ جو بھی جیتے، فی صدی اتنا صاحب مجلس کا ہو گا۔ مرزا صاحب کے دیوان خانے میں مجلسیں جمنے لگیں تو وہ صاحب مجلس ہو گئے اور ایک اچھی خاصی رقم بے محنت و مشقت وصول ہونے لگی۔ وہ خود بھی کھیلتے تھے اور چونکہ اچھے کھلاڑی تھے۔ اس لیے اس میں بھی کچھ نہ کچھ مار ہی لیتے تھے......"

"عرصہ تک شہر کے کوتوال اور حکام ایسے لوگ رہے جن سے مرزا غالب کی رسم و راہ رہتی تھی۔ اس لیے ان کے خلاف نہ تو کسی طرح کا شبہ کیا جاتا تھا۔ نہ قانونی اقدام کا اندیشہ تھا۔ انھیں میں ایک کوتوال قتیل کا شاگرد مرزا خانی بھی تھے......"

"لیکن غالباً ۱۸۴۵ء میں آگرہ سے تبدیل ہو کر ایک نیا کوتوال آیا۔ یہ مرزا خانی کی طرح نہ تو شاعر تھا نہ سخن طراز کہ غالب کا قدر شناس ہوتا۔ نرا کوتوال تھا۔ اس نے آتے ہی سختی کے ساتھ دیکھ بھال شروع کر دی اور جاسوس لگا دیئے...... بالآخر ایک دن ایسے موقعہ پر، کہ مجلس قمار گرم اور روپیوں کی ڈھیریاں چنی ہوئی تھیں، کوتوال پہنچا اور دستک

---

[1] لال قلعہ کی ایک جھلک، سید ناصر نذیر فراق دہلوی، طبع دہلی، صفحہ ۳۴، ۳۵

[2] مولانا آزاد کا یہ بیان غالب کے دوسرے واقعۂ اسیری یعنی ۱۸۴۷ء سے متعلق ہے لیکن اس وقت قلعہ کے پچاس روپے کہاں تھے۔ مولانا سے تسامح ہوا ہے۔ غالب تو گرفتاری کے تین برس بعد ۱۸۵۰ء میں قلعہ کے ملازم ہوئے (ذکرِ غالب، مالک رام، ص ۶۷)

دی [illegible] سے نکل جانے کے بعد صاحب [illegible] ہیں [illegible]

[illegible] منشی گھنشام لال عاشق [illegible] نقل کیا جاتا ہے [illegible]

عاشق [illegible] غالب سے [illegible] تھے [illegible] غالب کے [illegible] سے متعلق [illegible]

[illegible] قطعہ میں عاشق نے [illegible] تاریخیں نکالی ہیں [illegible]

ملاحظہ ہو :

[illegible] سے [illegible]
۱۲۵۷ [illegible]

[illegible]
۱۲۶۳ھ

[illegible] غالب [illegible] دل پر ہو
۱۲۶۳ھ

[illegible] کان [illegible] سے [illegible]

[illegible] میرزا [illegible] کر ہو

[illegible] غمخوار [illegible] فیض الحسن [illegible] ہے
۱۹۰۴ [illegible]

---

[1] غالب، غلام رسول مہر، ص ۱۸۶ ۔ [2] منشی گھنشام لال عاشق ۔ دہلی کے باشندہ ماتھر تھے ۔ ان کے والد رائے چھی لال شاہ عالم ثانی اور اکبر شاہ ثانی کے زمانے میں دیوانی کے عہدوں پر سرفراز تھے ۔ بہادر شاہ کے میر منشی مکند لال انھیں کے بھتیجے تھے ۔ یہ خود اکبر شاہ ثانی کے عہد میں مرزا بابر خلف اکبر شاہ کے ملازم رہے ۔ خوش نویسی اور موسیقی سے گہرا لگاؤ تھا ۔ شاعری میں شاہ نصیر کے تربیت یافتہ تھے ۔ اور انھیں کی طرح سنگلاخ زمینوں کو پانی کرنا شعر گوئی کی معراج سمجھتے تھے ۔ صنائع بدائع پر جان چھڑکتے تھے اور ساری توجہ چست بندشوں، خوشنما ترکیبوں اور الفاظ کی شعبدہ بازی پر صرف کرتے تھے ۔ طبیعت تیز و طرار پائی تھی ۔ دو غزلے، سہ غزلے لکھ کر اپنی قادر الکلامی کا لوہا منوا لیتے تھے ۔ تاریخ گوئی میں بھی طاق تھے ۔ ان کا انتقال ۶۰ برس کی عمر میں ۱۸۶۵ء میں ہوا ۔ ان کے دیوان کا قلمی نسخہ ان کے پوتے منشی بنس گوپال المتخلص بہ شاعر کے پاس محفوظ تھا، جسے انھوں نے موہن لال ماتھر دہلوی کے مقدمے کے ساتھ کا یستھ سبھا دہلی سے شائع کر دیا ہے ۔

عاشق کے نواسے منشی بہاری لال مشتاق غالب کے شاگرد تھے ۔ اردو فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے ۔ ان کے چھوٹے بھائی گوری شنکر قیصر بھی صاحب دیوان تھے ۔ ان دونوں کے انتخابات دہلی سے شائع ہو چکے ہیں ۔

[مقدمہ کلام عاشق، تلامذۂ غالب صفحہ ۲۵۹، دیباچہ دیوان مشتاق، دیباچہ دیوان قیصر، تذکرہ بہار سخن صفحہ ۲۷۲ نیز سخن شعرا، نساخ ص ۳۲۱]

میر بازو کو ذرا تعویذ تقدیر نے عاصی
اسد کو جو جنوں سے گھسیٹا رہ زنداں ہے[1]

اس قطعۂ تاریخ کی وجہ تصنیف عاصی نے ایک حاشیہ میں لکھی ہے جس سے بعض اہم باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

"مرزا نوشہ نے شاعر بے بدل دہلی، رند مشرب، متخلص بہ اسد و غالب سے فیض الحسن خاں کوتوال دہلی کو ناحق عداوت پیدا ہو گئی اور اس نے بعلت قماربازی ان کو قید کرا دیا جس کی مندرجہ ذیل تاریخ نکالی گئی ..... بروقت گرفتاری کوتوال مع جوب رفقا میں بیٹھ کر موقع پر گئے اور ظاہر کیا کہ سواریاں زنانی آئی ہیں۔ اس دھوکے سے اندر داخل ہو گئے اور اندر مکان کے قمار بازی ہو رہی تھی باہم اس قدر ہو رہی کہ باہر کا دروازہ بند تھی۔ مگر زینہ کے اندر بہت جمعیت تھی اور کئی آدمی بر خلاف پہنچ گئے۔ گرفتار کر کے قید کرا دیا۔ بہت سے رئیس اور شرفا اس حرکت سے ناراض ہوئے۔ اور عدالت میں برأت کے ساعی ہوئے مگر قید ہو ہی گئی۔

ایک روز مسٹر راس صاحب سول سرجن دہلی قید یا جیل خانہ کو ملاحظہ کرنے گئے حضرت کے پاس تک پہنچ گئے اور حال دریافت کیا۔ آپ نے فی البدیہہ یہ فرمایا ؎

جس دن سے کہ ہم غم زدہ زنجیر بپا ہیں
کپڑوں میں جوئیں بخیے کے ٹانکوں سے سوا ہیں

اس وقت ڈاکٹر صاحب نے گورنمنٹ کو چٹھی لکھ کر رہا کرا دیا۔"[2]

غور طلب امور

مندرجہ بالا شہادتوں کی روشنی میں سب سے اہم مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعی غالب قمار بازی کے جرم کے مرتکب نہیں ہوئے تھے؟ اس بارے میں پیش کردہ بیانات میں گہرا تضاد ہے۔ بیان "ج" میں گرفتاری کے اسباب کا ذکر نہیں کیا گیا۔ اس لیے اس مسئلے میں وہ خارج از بحث ہے۔ بیان "ب" (احسن الاخبار) اور "د" (یادگار غالب) سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ غالب جوا نہیں کھیلتے تھے۔ اس کے برعکس بیان "الف"، "د" اور "ز" سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب کا مکان قمار بازی کا اڈا بنا ہوا تھا اور وہ خود بھی جوا کھیلتے تھے۔ بیان "ہ" ان متضاد بیانوں میں سے کونسا قرین صحت ہے۔ یہ فیصلہ کرنے کے لیے ان مختلف بیانات کی صحت اور استناد کا درجہ متعین کرنا ضروری ہے

---

[1] کلام عاصی، ص ۲۶۲۔ اس قطعہ تاریخ کے علاوہ عاصی کے دیوان میں "غدر دہلی" "قتل ولیم فریزر، شادی حضرت بہادر شاہ ہمراہ زینت محل، وفات نراین داس ممبر (جج عدالت برج موہن دتاتریہ کیفی) کی تاریخیں بھی ملتی ہیں۔

[2] ایضاً ص ۲۶۳، ۲۶۴

میں اس پر تبصرہ بالکل غیرجانبدارانہ ہو سکتا ہے

سب سے پہلے قرین مصالح نے جس امر کا احساس دلانا ضروری سمجھا، وہ حالی کا بیان نادرستی عبارت ہے۔ وہ وضاحت نہ کرتا کہ تذکرہ معاصرین نے یہ بات کیوں مان لی کہ حالی پہچان نہ سکے تھے۔ حالی کا یہ حصہ جس میں ان کی عدم مطابقت ہے، اس کو اس کے بیان کی حقیقی حیثیت دو مولانا ابوالکلام آزاد نے بتا دی ہے :

"مولانا حالی مرحوم نے اس واقعہ کی نسبت جو کچھ لکھا ہے وہ حقیقت کے خلاف ہے وہ چونکہ مرحوم سوانح نگاری کو حقیقت نگاری سمجھتے تھے۔ اس لیے پسند نہیں کرتے تھے کہ وہ حقیقت لکھ دی جائے۔ حیاتِ جاوید میں بھی انھوں نے ہر جگہ یہی کیا ہے۔ ... جو صاحب اس معاملے کو اس رنگ میں ظاہر کیا ہے کہ گویا کوئی بات ہی نہیں جو مرزا شطرنج کا شوق تھا۔ اس شوق کی تکمیل کے لیے برائے نام کچھ بازی بدلیا کرتے تھے۔ کوتوال چونکہ دشمن تھا، اس لیے قمار بازی کا مقدمہ بنا دیا۔ حالانکہ بالکل اس کے خلاف ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ پورا قمار بازی کا معاملہ تھا اور نواب امیرالدین مرحوم (والی لوہارو) نے خطوں میں مرزا نے اپنے مکان کو جوا بازی کا اڈا بنا رکھا تھا۔"[1]

غالب کے سوانح نگار کی حیثیت سے حالی کی کوتاہیاں بیان کرنے کا یہ موقع نہیں۔ اتنا کہنا ہے کہ اس زمانے میں غالب سے متعلق جو معلومات حاصل ہو سکتی تھیں، حالی نے ان سے پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ اسی سہل پسندی کی وجہ سے صرف غالب کے حالاتِ زندگی میں بعض غلطیاں راہ پا گئی ہیں، بلکہ ان کی سیرت و شخصیت کے بعض اہم پہلو بھی تشنہ رہ گئے ہیں[3]

حالی کی طرح احسن الاخبار نے بھی غالب کی قمار بازی کو تسلیم نہیں کیا۔ اس نے لکھا ہے کہ مرزا دشمنوں کی غلط اطلاعات کے باعث گرفتار ہوئے اور جو کچھ ہوا محض حاسدوں کی فتنہ پردازی کی وجہ سے ہوا۔ احسن الاخبار کی شہادت بھی تحقیق اور تاریخی دونوں اعتبار سے مردود ہے۔ یہ اخبار دہلی سے نہیں بمبئی سے نکلتا تھا۔ اس زمانے میں فاصلوں کی دوری اور سفر کی مشکلات کے باعث خبر رسانی واقعات کی رفتار کا ساتھ نہیں دے سکتی تھی۔ چنانچہ یہ خبر بھی غالب کی گرفتاری کے تیس دن بعد شائع ہوئی۔ اس میں بادشاہ کے سفارشی خط کا بھی ذکر ہے جو ریذیڈنٹ کو لکھا گیا تھا۔ غالب کی گرفتاری، احباب و اعزہ کی دوڑ دھوپ، بہادر شاہ کا خط لکھنا، ریذیڈنٹ کا کورا جواب دینا واقعات کا ایک سلسلہ ہے جس کا اثر دہلی کے عوام پر غالب سے ہمدردی کی صورت میں ظاہر ہوا ہو گا۔ اور احسن الاخبار کے نامہ نگار کا اسی سے

---

[1] تذکرہ حالی از اسمٰعیل پانی پتی میں لکھا ہے کہ غالب سے حالی کے تعلقات کا آغاز ہنگامہ سنہ ستاون کے بعد شیفتہ کی ملازمت سے پہلے ہوا۔ نیز ملاحظہ ہو، راقم الحروف کا مضمون "یادگارِ غالب" سالنامہ پگڈنڈی، امرتسر، ۱۹۵۶ء

[2] نقشِ آزاد، مرتبہ غلام رسول مہر، طبع دہلی صفحہ ۲۷۹، ۲۸۰

[3] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "یادگارِ غالب کا تحقیقی مطالعہ" ڈاکٹر وحید قریشی، سویرا لاہور، ۲۴۲

متاثر ہونا خلاف قیاس نہیں۔ چنانچہ وہ غالب کو قطعاً بے قصور گردانتے ہوئے ان کی گرفتاری کا باعث "دشمنوں کی غلط اطلاعات" قرار دیتا ہے۔ احسن الاخبار میں اس واقعہ سے متعلق جو دوسری خبر شائع ہوئی ہے اس میں بھی غالب سے گہری ہمدردی کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ اس کی آخری سطروں میں جو احتجاج کیا گیا ہے، ان میں غالب کی طرفداری کا رنگ نمایاں ہے۔ دوسری خبر میں احسن الاخبار نے غالب کے "جرم" کو قبول تو کر لیا ہے، لیکن وہ اسے "معمولی" قرار دیتا ہے۔ اور ان کی سزا میں رعایت فقط اس بنا پر طلب کرتا ہے کہ وہ ایک ایسے "باکمال" شخص ہیں، جن کی عزت اور حشمت کا دبدبہ لوگوں کے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے" یہ دلیل سراسر جذبات پر مبنی ہے حالانکہ قانون کے سامنے باکمال اور بے کمال اور رئیس و مفلس سب کا درجہ برابر ہے۔ غرض حالی کی طرح احسن الاخبار کے بیان میں بھی غالب سے عقیدت و محبت کا جذبہ پایا جاتا ہے اور اس میں غالب کے دامن کو قمار بازی سے پاک دکھانے کی جو کوشش کی گئی ہے، وہ جانبداری پر مبنی ہے۔

یہ معلوم کر لینے کے بعد کہ حالی اور احسن الاخبار کے بیانات تحقیقی اعتبار سے قابل اعتنا نہیں، ہم گواہوں کے دوسرے فریق کی طرف آتے ہیں جس نے غالب کو قمار بازی کا مرتکب بتایا ہے۔ اس فریق میں فوائد الناظرین، سر امیرالدین اور گمنام فلاں عامی شامل ہیں۔ فوائد الناظرین وہ پہلا اخبار ہے جس نے غالب کی گرفتاری کی خبر شائع کی۔ گرفتاری کی تاریخ بھی اسی خبر سے معلوم ہوتی ہے۔ یہ خبر اس زمانے کے حالات کے مطابق تاخیر سے بھی شائع نہیں ہوئی۔ ایڈیٹر یا نامہ نگار نے اس پر کوئی تبصرہ بھی نہیں لکھا۔ اس کی نوعیت محض اطلاعی ہے اور اس میں کسی رنگ آمیزی کو دخل نہیں۔ اس حقیقت کے پیش نظر اس خبر کو صحیح تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیئے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے سر امیرالدین کی زبانی جو روایت نقل کی ہے اس میں غالب پر صاف الفاظ میں قمار بازی کا الزام عائد کیا گیا ہے۔ اس روایت کے قوی نہ ہونے کی تین وجوہ ہیں:

(۱) غالب کے واقعۂ اسیری کے وقت امیرالدین پیدا ہی نہیں ہوئے تھے[1]۔ اس لیے یہ روایت ہم تک ایک سے زیادہ واسطوں سے پہنچی ہے۔

(۲) غالب کے قید ہونے کے بعد لوہارو خاندان کا طرز عمل نہایت افسوسناک تھا[2]۔ ان حالات میں سر امیرالدین کا بیان غیر جانبدارانہ نہیں ہو سکتا۔

---

[*] پورا نام، نواب سر امیرالدین احمد خاں، فرخ مرزا۔ بیٹے تھے نواب علاؤالدین احمد خاں علائی کے جنھیں مرزا غالب نے اپنا خلیفۂ ثانی بنایا تھا۔ وہ نواب امین الدین احمد خاں رئیس لوہارو کے بڑے صاحبزادے تھے جن کے والد نواب احمد بخش خاں غالب کے خسر نواب الٰہی بخش خاں معروف کے بھائی تھے۔

[1] "سر امیرالدین، غالب کی وفات کے وقت زیادہ سے زیادہ آٹھ برس کے ہوں گے" ان کے نام غالب کا خط غالباً ۱۸۶۷ء کا واقعہ ہے (مہر: خطوط غالب صفحہ ۷۴۱، ۱۱۱)۔ غالب اسیری کے ۲۲ برس بعد تک زندہ رہے۔ اس طرح امیرالدین کی پیدائش تقریباً ۱۸۶۱ء یعنی واقعہ قید کے ۱۳ یا ۱۴ برس بعد ہوئی۔

[2] غلام رسول مہر، غالب، صفحہ ۱۸۷، ۱۸۸

(۱۰) محمد آزاد کے بیان میں حالی کی تردید کا شدید جذبہ پایا جاتا ہے جس کے باعث وہ انتہا پسندی کا شکار ہو سکتے ہیں۔
البتہ اس روایت کے حق میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ دونوں صورتوں میں حویلیوں پر تو پردہ پڑ سکتا ہے۔ لیکن معائب اور کمزوریاں ضرور سامنے آجاتی ہیں۔ محمود نگری کو کہا گیا ہے کہ ذاتی خامیوں اور کمزوریوں کا پردہ اسی وقت چاک ہوا جب کسی مخالف نے اپنے بے باکانہ انداز سے ان کی تشہیر کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس واقعہ کا تعلق بھی چونکہ غالب کی ایک کمزوری سے ہے۔ اس سے متعلق کوبارو خاندان کے ایک فرد کا بیان مبالغے سے قطع نظر اصلیت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ حصہ صاحب غالب کی قمار بازی کی تصدیق فرمانروائے لوہارو اور ایک دہلوی صاحب کے مضمون سے اس عاصی کے بیان سے بھی ہو جاتی ہے۔

شیخ محمد اکرام نے "غالب نامہ" میں عاصی کی عبارت کو "قید" کے ذیل میں درج تو کیا ہے لیکن قطعہ تاریخ پیش نہیں کیا۔ اس سے متعلق ان کی رائے یہ ہے:

"شاید عاصی، غالب کا دل سے قدردان نہ تھا۔ چنانچہ جو قطعہ تاریخ اس نے لکھا ہے، اس سے غالب کی صریح توہین ہوتی ہے۔"[۱]

یہاں مولف "غالب نامہ" غالب پرستی کا شکار ہو گئے ہیں۔ یہ منطق خوب ہے کہ چونکہ عاصی کے قطعہ تاریخ سے "غالب کی صریح توہین ہوتی ہے" اس لیے ان کے بیان کو ناقابل اعتنا قرار دے دیا جائے۔ صداقت ہمیشہ تلخ ہوتی ہے اور اگر ایک شخص نے غالب کے واقعۂ قید سے متعلق بھی باتوں کو صاف صاف بیان کر دیا تو اسے غالب کے قدردانوں اور بہی خواہوں کے زمرے سے خارج کرتے ہوئے اس کے بیان کی اہمیت کو کم کرنا کہاں کا ادبی انصاف ہے؟ یہ قید بجائے خود توہین آمیز تھی، پھر غالب کے کسی قدردان اور بہی خواہ سے یہ توقع کتنی عجیب ہے کہ وہ حرفِ صداقت زبان پر لائے گا۔ واقعۂ قید سے متعلق حقیقتِ حال کا اظہار یا تو کوئی غیر جانبدار فریق کر سکتا ہے یا پھر مخالف دوسرا گروہ دوسری حالت میں مبالغے کا قوی احتمال ہے۔ ہمارے نزدیک عاصی کو غالب کا مخالف یا معاند قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں۔ وہ اپنے بیان میں وہ غالب کو "شاعرِ بے بدل" کہتا ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ دہلی میں اس وقت قدر دانی کے اعتبار سے شاعروں کے دو خاص گروہ تھے۔ غالب ایک مخصوص حلقے میں پسند کیے جاتے تھے اور عوام زیادہ تر ذوق کے پرستار تھے۔ عاصی شاہ نصیر کے شاگرد تھے اور جب شاہ نصیر سے ذوق کے تعلقات کشیدہ ہوئے تو عاصی بھی ذوق کے مخالف ہو گئے۔ چنانچہ تیلیوں والے معرکہ خیز مشاعرے میں جو قدیم دلی کالج میں منعقد ہوا تھا، عاصی نے ذوق اور ان کے ہواخواہوں کو نیچا دکھانے کی پوری کوشش کی تھی۔[۲] ذوق سے عاصی کی کشیدگی کے پیش نظر

---

[۱] غالب نامہ، شیخ محمد اکرام، طبع لکھنؤ، صفحہ ۱۰۵

[۲] محمد حسین آزاد نے آب حیات میں اس معرکے کا ذکر یوں کیا ہے: "جن دنوں شاہ صاحب سے (ذوق کے) معرکے ہو رہے تھے، منشی فیض پارسا دہلی کالج میں مدرس حساب تھے...... انھوں نے مدرسہ میں بڑی دھوم دھام سے مشاعرہ کیا...... ان دنوں میں مدرسہ اجمیری دروازہ کے باہر تھا۔ شہر کے دروازے ۹ بجے بند ہو جاتے تھے۔ گڈھ کپتان سے اجازت لی کہ مشاعرہ کے دن ۲ بجے (رات) تک اجمیری دروازہ کھلا رہا کرے۔ غرض مشاعرہ مذکور اس شان و شکوہ سے جاری ہوا کہ پھر کوئی ایسا مشاعرہ دلی میں نہیں ہوا۔ شہر کے رؤسا اور تمام نامی شاعر موجود ہوتے تھے۔ سب کی نگاہیں شاہ صاحب اور شیخ صاحب کی طرف ہوتی تھیں۔ چنانچہ ایک مشاعرہ میں شاہ صاحب نے غزل — قفس کی تیلیاں، خس کی تیلیاں پڑھی۔ دوسرے مشاعرے میں یہی طرح ہو گئی۔ سب غزلیں کہہ کر لائے۔ شیخ مرحوم نے دو غزلہ لکھا۔
(باقی اگلے صفحہ پر)

یہ ضروری تو نہیں کہ ان کے غالب سے اچھے تعلقات تھے۔ لیکن بغیر کسی ثبوت کے انھیں غالب کا بدخواہ یا مخالف قرار دینا بھی غلط ہوگا۔ ذوق سے ان کی ہنگامہ آرائی اور غالب سے متعلق قطعہ تاریخ میں ان کے لہجے کی حق گوئی سے یہ نتیجہ ضرور نکالا جا سکتا ہے کہ وہ اگر غالب کے قدر داں نہ تھے، تو ان کے مخالف بھی نہ تھے۔ ان حالات میں عاصی کا بیان قطعاً غیر جانبدارانہ قرار پاتا ہے اور ایسے بیان کی تاریخی اور تحقیقی حیثیت مسلّم ہے۔ غرض عاصی اور فوائد الناظرین کے بیانات کی روشنی میں یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ غالب قمار بازی کے مرتکب ہوئے تھے۔ اس سے ان کی عظمت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ بلکہ ان کی سیرت کا ایک پہلو سامنے آجاتا ہے۔ غالب اپنی ادبی عظمت کی وجہ سے ہمیں محبوب ہیں لیکن کسی محبوب شخصیت کا ہر لحاظ سے مثالی ہونا ضروری نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ایسی شخصیت کی انسانی کمزوریاں

(حاشیہ بقیہ)

اور اس پر کچھ تکرار ہوئی۔ اس پر جوش میں آکر فرمایا کہ برس دن تک جو مشاعرہ ہو، اس میں سوائے غزل طرحی کے ایک غزل اس زمین میں کہے چنانچہ دو مشاعروں میں ایسا ہوا۔ ایسے معرکوں میں عوام الناس بھی شامل ہوتے تھے۔ تیسرے جلسے میں جب انھوں نے غزل پڑھی تو بعض شخصوں نے کچھ کچھ چوٹیں کیں۔ جنھیں شیخ صاحب کے طرف دار سمجھے کہ شاہ صاحب کے اشارے سے ہوئیں۔ زیادہ تر یہ کہ شاہ وجیہ الدین منیر یعنی شاہ صاحب کے صاحبزادے نے یہ شعر بھی پڑھ دیا:

گرچہ قندیلِ سخن کو منڈھ لیا تو کیا ہوا
ڈھانچ میں تو ہیں وہی اگلے برس کی تیلیاں

اس پر تکرار زیادہ ہوئی اور مشاعرہ بند کر دیا گیا کہ مبادا زیادہ بے لطفی ہو جائے۔" (آبِ حیات طبع پانزدہم صفحہ ۴۶۷)

آزاد نے جس شعر کا حوالہ دیا ہے، وہ منیر کا نہیں، بلکہ گھنشام لال عاصی کا ہے۔ ان کے کلیات میں منجملہ اس شعر کے پوری غزل موجود ہے۔ اس مشاعرے میں چونکہ ذوق کا پلہ نیچا رہا تھا۔ آزاد نے نہ صرف باقی روئداد کو حذف کر دیا بلکہ عاصی کے شعر کو بھی منیر کے نام سے لکھ دیا۔ جب لوگوں نے اس غلطی پر اعتراض کیا تو آزاد نے حاشیے میں فقط اتنا لکھا: "بعض بزرگوں سے سنا کہ لالہ گھنشام داس لال، عاصی نے پڑھا تھا۔ وہ بھی شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔" (آبِ حیات، صفحہ ۴۶۸) واقعہ یہ ہے کہ مشاعرہ میں شاہ نصیر کی غزل پر اعتراضاً ذوق نے اپنے تلمیذ بہادر شاہ ظفر کی غزل میں چند اشعار پڑھے تھے۔ مطلع یہ تھا:

قافیہ میں گر نہ تھیں حضرت کے بس کی تیلیاں
یار کی چلون میں ہوں پائے مگس کی تیلیاں

اس پر آئندہ مشاعرہ معرکے کا قرار پایا۔ عاصی نے اس مشاعرے میں طرحی غزل سے پہلے "چھیڑ کی غزل پڑھی" اس کے آخری دو شعر یہ تھے:

کل شیخ جی ہرن کی طرح بھاگے چوکڑی — سیدھی سڑک بھی چل سکے نہ متھرا پہنچ سکے
عاصی وہ تیلیوں کی غزل اب کرو رقم — جس کو نہ سالک و گوہر یکتا پہنچ سکے

اس کے بعد عاصی نے ۴۲ اشعار کی بڑی سیر قوافی غزل پیش کی۔ جسے سن کر سامعین نے "ایمانا کہا کہ عاصی کی غزل لاجواب اور قابلِ تحسین ہے اور ذوق پر فوقیت رکھتی ہے" یہ غزل عاصی کے کلیات میں موجود ہے، اور اس کے بعض قوافی یہ ہیں: حبس، عطر چرس، کوہ بوس، انفاس بوس، عاشق بے دسترس، بید قرس، مرس، ودس، ترس وغیرہ (کلام عاصی صفحہ ۱۴۴-۱۴۸)

کو سامنے رکھنے کے بعد ہی اس کی عظمت کو صحیح پس منظر کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے۔ غالب اپنے معاشرے کے بچے خود تھے۔ ان میں کم و بیش وہ تمام خوبیاں اور خامیاں تھیں جو اس زمانے کے سماج میں لازمی ہو سکتی ہیں۔ لیکن ان کمزوریوں کے باوجود وہ فن کی ان بلندیوں تک پہنچ گئے جہاں اُن کا کلام بہ یک معنوں میں حلقۂ شام و سحر سے نکل کر جاوداں ہو چکا ہے۔ حالی کے بیان سے غالب کے واقعۂ اسیری سے متعلق جن اسباب پہ روشنی پڑتی ہے وہ یہ ہیں:

کوتوال سے دشمنی

واقعۂ اسیری کے بارے میں غالب کی تصانیف سے زیادہ مدد نہیں ملتی۔ انھوں نے جو اسی شعر کا ایک فارسی ترکیب بند، قید کی حالت میں لکھا تھا، جسے متفقہ طور پر ان کی بہترین نظموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن ان کے احباب وغیرہ نے اس خیال سے "حبسیہ" کو کلیاتِ نظم میں شامل نہ کیا کہ اس سے غالب کی قید ہمیشہ کے لیے منظرِ عام پر آ جائے گی۔ گو بعد میں یہ متفرق فارسی کلام کے مجموعہ "سبد چیں" میں شائع کر دیا گیا۔[۱] اس میں غالب نے اسیری کے حالات و جذبات تو بیان کئے ہیں، لیکن قید کے اسباب و علل کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا۔ حبسیہ کو کلیاتِ نظم میں شامل نہ کرنے کے واقعہ سے شبہ ہوتا ہے کہ غالب کے ایسے خطوط کی اشاعت بھی روک لی گئی جن میں قید سے متعلق کوئی بات ہو گی۔ ایسے ہی ایک فارسی خط کے اقتباس کا ترجمہ حالی نے پیش کیا ہے۔ یہ خط اُن کے فارسی خطوط میں شامل نہیں۔ اس میں غالب نے اپنے قید ہونے کی وجہ کوتوال سے دشمنی کو قرار دیا ہے:

"کوتوال دشمن تھا اور مجسٹریٹ ناواقف۔ فتنہ گھات میں تھا اور ستارہ گردش میں۔ باوجودیکہ مجسٹریٹ کوتوال کا حاکم ہے، میرے باب میں وہ کوتوال کا محکوم بن گیا۔ اور میری قید کا حکم صادر کر دیا۔"[۲]

مولانا آزاد اس سے متعلق فرماتے ہیں:

مدت تک شہر کے کوتوال اور حکام ایسے لوگ رہے جن سے مرزا غالب کی رسم و راہ رہی تھی...... انھیں میں ایک کوتوال قتیل کے شاگرد مرزا خانی بھی تھے...... لیکن غالباً ۱۸۴۸ء میں آگرہ سے تبدیل ہو کر ایک نیا کوتوال آیا۔ یہ مرزا خانی کی طرح نہ تو شاعر تھا نہ نثر طراز کہ غالب کا قدر شناس ہوتا۔ نرا کوتوال تھا...[۳]

---

[۱] منشی ہرگوپال تفتہ کے نام ۱۰ دسمبر ۱۸۵۳ء کے ایک خط میں غالب نے لکھا ہے: "سرکارِ انگریزی میں بڑا پایہ رکھتا تھا، رئیس زادوں میں گنا جاتا تھا۔ پورا خلعت پاتا تھا۔ اب بدنام ہو گیا ہوں اور ایک بہت بڑا دھبہ لگ گیا ہے۔"

(اسعدی، طبع لاہور، صفحہ ۸۲)

[۱] سبد چیں، صفحہ ۲۴-۲۰۔ نیز ملاحظہ ہو "یوسف ہندی قید فرنگ میں" مطبوعہ حیدرآباد

[۲] یادگارِ غالب، صفحہ ۲۷

[۳] نقشِ آزاد، صفحہ ۲۸۱

یہ ٹھیک ہے کہ جب تک مرزا خانی دہلی میں تھے، غالب کو کسی قسم کا خطرہ نہ تھا۔ لیکن مولانا کا یہ بیان محل نظر ہے کہ نیا کوتوال ۱۸۴۵ء میں آگرے سے تبدیل ہو کر آیا۔ غالب اس واقعہ سے چھ برس پہلے ۱۸۴۱ء میں بھی قمار بازی کے الزام میں معتوب ہو چکے تھے اور دہلی اردو اخبار نے صاف الفاظ میں ان کی گرفتاری کو نئے تھانیدار کا کارنامہ قرار دیا تھا۔

"اب تھوڑے دن ہوئے یہ تھانیدار قوم سے سید اور بہت جری سنا جاتا ہے، مقرر ہوا ہے۔ یہ پہلے جمعدار تھا، بہت مدت کا نوکر ہے۔ جمعداری میں بھی یہ بہت گرفتاری مجرموں کی کرتا رہا ہے۔"... [1]

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مرزا خانی کے بعد نیا کوتوال بقول آزاد ۱۸۴۵ء میں نہیں بلکہ ۱۸۴۱ء یا اس سے کچھ پہلے مقرر ہوا۔ دوسرے یہ تھانیدار آگرہ سے تبدیل ہو کر نہیں آیا، بلکہ دہلی میں "مدت کا نوکر" تھا، اور "پہلے جمعدار تھا"۔ دہلی اردو اخبار نے اس کا نام درج نہیں کیا۔ فقط یہی لکھا ہے کہ یہ قوم کا سید ہے۔ گھنشام لال عاصی نے کوتوال کا نام اپنے قطعہ تاریخ اور توضیحی عبارت میں "فیض الحسن خاں" بتایا ہے۔ احسن الاخبار مورخہ ۱۵ دسمبر ۱۸۴۵ء کی ایک خبر میں بتایا گیا ہے:

"گورنر جنرل نے دہلی میں دربار عام کیا تھا اور اس میں غالب کو خلعت ہفت پارچہ و سہ رقم جواہر اور فیض الحسن کوتوال کو ایک شالی رومال عطا فرمایا۔" [2]

ظاہر ہے کہ یہ اعزاز فیض الحسن کو حسن خدمت کی بنا پر بخشا گیا اور وہ دربار کے انعقاد (۱۸۴۵) سے قبل دہلی میں اپنی کارگزاریوں کا ثبوت پیش کر چکا ہوگا۔ قیاس ہے کہ غالب کی پہلی گرفتاری بھی اسی کوتوال کے ہاتھوں عمل میں آئی ہوگی اور وہ برسوں غالب کے درپے رہا ہوگا۔ عاصی کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ "غالب سے فیض الحسن خاں کوتوال دہلی کو ناحق عداوت پیدا ہو گئی۔" اس عداوت کا ذکر خود غالب کے خطوط میں بھی ملتا ہے۔ لیکن مولانا آزاد اسے نظر انداز کرتے ہوئے گرفتاری کی تمام تر وجہ غالب کی قمار بازی کو قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ قمار بازی شہر کے دوسرے حصوں میں بھی ہوتی تھی اور بقول ان کے:

"شہر کی یہ رسم ٹھہر گئی تھی کہ رئیس زادوں کے دیوان خانے مستثنیٰ سمجھے جاتے تھے۔ گویا ان کی وہ نوعیت مان لی گئی تھی جو آج کل کے کلبوں میں برج کھیلنے کی ہے۔ انھیں از راہ تجاہل رئیسانہ تفریحوں میں تصور کیا جاتا تھا۔" [3]

ان حالات میں کوتوال کا فقط غالب کو نشانۂ عتاب بنانا، غالب سے ذاتی عداوت ہی کی بنا پر سمجھا جا سکتا ہے۔ اور عاصی کے بیان سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

گرفتاری کے حالات

مولانا آزاد لکھتے ہیں:-

"ایک دن ایسے موقع پر کہ مجلس گرم اور روپیوں کی ڈھیریاں چنی ہوئی تھیں، کوتوال

---

[1] دہلی اردو اخبار، مورخہ ۱۵ اگست ۱۸۴۱ء، مخزونہ نیشنل آرکائیوز آف انڈیا، نئی دہلی۔ [2] حوالہ سابق، نوائے ادب، اپریل ۱۹۵۵ء
[3] نقش آزاد، صفحہ ۲۸۱

چنانچہ اندر دروازہ پر دستک دی۔ اور لوگ تو پچھواڑے سے نکل بھاگے، صاحبِ مکان یعنی مرزا دھر لیے گئے۔" [1]

لیکن حالی نے گرفتاری کے جو حالات لکھے ہیں، وہ اس سے مختلف ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ گرفتاری کے وقت کوتوال جب دفعتہً موقع پر آگئے اور ظاہر کیا کہ سواریاں زنانی آتی ہیں۔ اس طرح دھوکے سے اندر داخل ہوگئے۔ مولانا کا یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ "اور لوگ تو پچھواڑے سے نکل بھاگے صاحبِ مکان یعنی مرزا دھر لیے گئے" اس کے برعکس حالی لکھتے ہیں کہ "صاحبِ مکان کے عزیز جوتی باجہ اس قدر ہو رہی کہ باہر تک آواز آتی تھی۔ مگر زینے کے اندر بہت بھیڑ تھی اور کچھ اٹاری پر تند اتر پہنچ گئے" غرض غالب تنہا گرفتار نہیں ہوئے تھے بلکہ ان کے ساتھ دوسرے قمار باز بھی دھر لیے گئے تھے۔ نواب الناظرین کی پیش کردہ خبر واقعت میں بھی صاف الفاظ میں اس کا ذکر موجود ہے:

"جناب میرزا صاحب کو معہ چند اور قمار بازوں کے گرفتار کرکے کوتوالی میں لے آئے...."

متنازعہ فیہ شعر

نظامی بدایونی نے شرح دیوانِ غالب میں لکھا ہے کہ قید خانے میں غالب کے کپڑوں میں جوئیں ہوگئی تھیں۔ ان کو چن رہے تھے کہ ایک افسر نے جاکر پرسشِ مزاج کی، غالب نے فی البدیہہ یہ شعر پڑھا:

جس دن سے کہ ہم خستہ گرفتارِ بلا ہیں
کپڑوں میں جوئیں بخیے کے ٹانکوں سے سوا ہیں [2]

اس شعر سے متعلق غلام رسول مہر لکھتے ہیں:

"میرا خیال ہے کہ یہ شعر غالب کا نہیں۔ اس سے قطع نظر شعر کی شانِ نزول قطعاً ناقابلِ قبول ہے...... بے یاری اور درماندگی کی یہ حالت کیونکر قرینِ قیاس سمجھی جاسکتی ہے کہ غالب کے کپڑوں میں جوئیں ہوگئی تھیں اور ایک افسر ملاقات کے لیے آیا تو وہ جوئیں نکال رہے تھے۔ ...... لہذا جو صورت اس شعر میں پیش کی گئی ہے وہ بہر اعتبار مستبعد ہے۔" [3]

حالانکہ اس شعر میں جو صورت پیش کی گئی ہے۔ وہ حقیقت ہی پر مبنی ہے۔ بات دراصل غالب کی "بے یاری" اور "درماندگی" کی نہیں، جیل خانے کے کپڑوں کی ہے۔ غالب کو جیل خانے میں آتے ہی اپنا لباس اُتار کر جیل خانے کے کپڑے پہننے پڑے ہوں گے۔

---

[1] نقش آزاد، صفحہ ۲۸۲
[2] دیوان غالب مع شرح نظامی، طبع ششم، ص ۲۱۸
[3] مہر، غالب صفحہ ۱۸۴

اُس زمانے میں ہندوستانی جیل خانوں کے کپڑوں کی جو حالت ہوگی، بآسانی قیاس کی جا سکتی ہے۔ مختلف قیدیوں کے استعمال کی وجہ سے، جو بیشتر غلیظ اور میلے کچیلے رہنے کے عادی ہوتے ہیں، ان کپڑوں میں جوئیں ہو جاتی ہوں گی۔ مجبوراً وہی کپڑے غالب کو بھی پہننے پڑتے ہوں گے۔ چنانچہ اپنے شعر میں غالب نے جو حالت بیان کی ہے، وہ ہرگز مستبعد نہیں اور مہر صاحب کا یہ خیال کہ "یہ شعر غالب کا نہیں" تحقیقی طور پر صحیح نہیں۔ حالی کے بیان سے بھی یہ شعر غالب ہی کا ثابت ہوتا ہے۔ انھوں نے بالتصریح لکھا ہے:

"ایک روز مسٹر... اس صاحب سول سرجن دہلی قیدیانِ جیل خانہ کا ملاحظہ کرتے کرتے حضرت کے پاس تک پہنچ گئے اور حال دریافت کیا۔ آپ نے فی البدیہہ یہ فرمایا:

جس دن سے کہ ہم غمزدۂ زنجیر بپا ہیں
کپڑوں میں جوئیں بخیے کے ٹانکوں سے سوا ہیں

نظامی بدایونی کے ہاں اس شعر کا پہلا مصرع قدرے مختلف ہے۔ (یعنی "غمزدۂ زنجیر بپا" کی جگہ "خستۂ گرفتار بلا") لیکن نظامی کی روایت پر حالی کے بیان کو فوقیت حاصل ہے۔ کیونکہ ایک تو یہ قدیم تر ہے اور دوسرے یہ بیان غالب کی زندگی میں دہلی میں لکھا گیا۔

قبل از وقت رہائی

سید ناصر نذیر فراق دہلوی نے غالب کے مقدمے کے جو حالات بیان کئے ہیں، ان میں لکھا ہے کہ ان کی قبل از وقت رہائی والٹی یا کسی اور بڑے افسر کے اختیاراتِ خاص کی وجہ سے ہوئی۔ اُن کے الفاظ ہیں: "مرزا صاحب کو قید میں پڑے چند روز ہوئے تھے، جو ان کی خوش نصیبی سے لاٹ یا ان جیسا کوئی اور بڑا حاکم شاہجہان آباد میں آیا اور مرزا صاحب کے عزیزوں نے اُس سے جا کر مرزا صاحب کی بپتا کہی اور اس نے اپنے اختیار سے مرزا صاحب کو فوراً چھوڑ دیا۔"[1]

مگر غالب کا وہ بیان جو حالی نے نقل کیا ہے، اس کے برعکس ہے:

"سیشن جج، باوجودیکہ میرا دوست تھا اور ہمیشہ مجھ سے دوستی اور مہربانی کے برتاؤ برتتا تھا اور اکثر صحبتوں میں بے تکلفانہ ملتا تھا۔ اس نے بھی اغماض اور تغافل اختیار کیا۔ صدر میں اپیل کیا۔ مگر کسی نے نہ سنا اور وہی حکم بحال رہا۔ پھر معلوم نہیں کیا باعث ہوا کہ جب آدھی میعاد گزر گئی۔ تو مجسٹریٹ کو رحم آیا اور صدر میں میری رہائی کی رپورٹ کی اور وہاں سے حکم رہائی کا آگیا۔"[2]

غالب کے یہ الفاظ کہ "پھر معلوم نہیں، کیا باعث ہوا کہ جب آدھی میعاد گزر گئی تو مجسٹریٹ کو رحم آیا" غور طلب ہیں۔ گویا خود غالب کو اپنی قبل از وقت رہائی کے اسباب کا صحیح علم نہ تھا۔ مجسٹریٹ کو "رحم" آنا بھی معنی خیز ہے۔ حالانکہ مجسٹریٹ کے رحم و کرم کو پوری طرح آزمایا جا چکا تھا۔ اور بادشاہ سے سفارش کروانے اور صدر میں اپیل کے باوجود قید کی سزا برقرار رہی تھی۔ ایسے حالات میں ملزم کی رہائی محض مجسٹریٹ کے رحم

---

[1] لال قلعہ کی ایک جھلک، صفحہ ۳۵

[2] یادگار غالب، صفحہ ۲۷

کی بنا پر عمل میں نہیں آ سکتی۔ مجسٹریٹ سے اگر احکام صادر کروائی کی درخواست کی ہوگی تو وہ یقیناً قانونی حیلے اور دلیل کے نہ ہوگی۔ یہ دلیل کیا ہو سکتی ہے، اس سلسلے میں حالی کا بیان ہماری کچھ رہنمائی کرتا ہے۔ حالی کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب غالب نے سول سرجن کے پوچھنے پر اپنی ناگفتہ بہ حالت کا شکستہ انداز میں اظہار کیا تو "اسی وقت ڈاکٹر صاحب نے گورنمنٹ کو چٹھی لکھ کر رہا کروا دیا۔"[1] غرض مسٹر راس نے غالب کی رہائی کی سفارش کر کے اپنا فرض بطریق احسن انجام دیا۔ لیکن اس نیک نام شخص نے اپنا احسان جتانے کی کوئی کوشش نہیں کی، ورنہ غالب اپنی رہائی کو مجسٹریٹ کے رحم پر محمول نہ کرتے۔

واقعہ قید کے ایام میں غالب کی تندرستی خراب رہنے کا ذکر احسن الاخبار میں بھی ملتا ہے:

"مرزا صاحب بوجہ مرض کے علیل رہتے ہیں، سوائے پرہیزی غذا قلیہ چپاتی کے اور کوئی چیز نہیں کھاتے۔۔۔۔۔ اس قدر ضعف اور مصیبت کا برداشت کرنا مرزا صاحب کی طاقت سے باہر ہے بلکہ ہلاکت کا اندیشہ ہے۔"[2]

ان بیانات کے مد نظر غالب کی قبل از وقت رہائی کا مسئلہ پوری طرح حل ہو جاتا ہے یعنی گرفتاری کے وقت ان کی صحت اچھی نہ تھی۔ تقریباً نصف سزا کاٹ چکنے کے بعد ان کی تندرستی مزید خراب ہو گئی اور جب مسٹر راس سول سرجن نے ان کی ناگفتہ بہ حالت دیکھی تو وہ رہائی کی رپورٹ کرنے پر مجبور ہو گئے۔ غرض غالب خرابی صحت کی وجہ سے قبل از وقت رہا کر دیے گئے اور اس میں مجسٹریٹ کے رحم و کرم کو مطلق کوئی دخل نہ تھا۔

---

[1] احسن الاخبار کے ایک پرچے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر راس جولائی ۱۸۴۷ء میں دہلی میں تھا۔ (نوائے ادب، اپریل ۱۹۵۰ء)
[2] دہلی کا آخری سانس، صفحہ ۱۷۴

آنکھوں کے مرثیے

محمد علم الدین سالک

انسانی کردار میں بعض اخلاقی خوبیوں کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ ان میں استقلال اور تحمل اتنی نمایاں اہمیت رکھتی ہیں کہ انسان کی بدولت انسان نڈر ہو کر بڑے سے بڑے خطرے میں کود پڑتا ہے۔ کسی بلند مقصد کے لیے جان کی بازی لگا دیتا ہے۔ مصائب و آلام کی پروا نہیں کرتا، بڑی سے بڑی شکست کا خندہ پیشانی سے خیر مقدم کرتا ہے۔ اور تحمل کا سررشتہ ہاتھ سے نہیں چھوڑتا

تیمور اور اس کی اولاد اس لحاظ سے شاہان عالم کی صف میں بہت ممتاز ہے۔ موت سے کھیل جانا ان کے لیے کوئی بڑی بات نہیں۔ یہ وصف ان میں آخری دم تک قائم رہا۔

تیموریوں کی زندگی کے اس روشن پہلو کے ساتھ ساتھ ایک اور وصف بھی نظر آتا ہے جس نے ان کی زندگی کو بڑا دلچسپ بنا دیا ہے۔ یہ ان کی شعر و ادب سے وابستگی ہے۔ وہ بڑے ادب نواز تھے۔ شعراء کے مربی اور ادیبوں کے محسن ہونے کے علاوہ خود شعر کا صحیح ذوق اور ادب کا ستھرا مذاق رکھتے تھے۔ یہ چیز انھیں میراث میں ملی تھی۔ گویا یہ ان کے گوشت پوست کا ایک حصہ تھا۔ وہ شعر کہتے، شعر سنتے اور شعر کا مزا لیتے مگر کیا مجال کہ ان کے شاہانہ مشاغل میں کسی قسم کا فرق آتا۔ ان کا ایک روزمرہ پروگرام تھا جس پر وہ بڑی سختی سے کاربند ہوتے تھے۔

ادب اور شعر دربار زندگی کے لیے ضروری تھے اس لیے بھی انھیں شعر سے لگاؤ رکھنا ضروری تھا۔ بابر سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک ہر بادشاہ دل کھول کر ادب نوازی کرتا، اچھے شعر کی داد دیتا، شعر کی خامیوں پر شعراء کو ٹوکتا اور وقت بے وقت خود بھی شعر کہتا۔ ان کی زندگی میں بعض نہایت خطرناک مواقع پیدا ہوئے جہاں انھیں جان سے کھیلنا پڑا مگر انھوں نے ایسے موقعوں پر بھی شعر و ادب کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور زندگی کی ان تلخیوں کو شعر و ادب میں سمو کر ایسا گلدستہ تیار کیا جس سے شعر و ادب کی دنیا اب تک مہک رہی ہے۔

ہندوستان میں آل تیمور کا سلسلہ بابر سے شروع ہوتا اور بہادر شاہ پر ختم ہو جاتا ہے۔ ان میں سے ہر شہزادہ اور ہر بادشاہ اس خوبی سے آراستہ نظر آتا ہے۔ بابر دنیا کی عظیم المرتبت شخصیتوں میں سے ہے۔ پروفیسر ٹائن بی کے قول کے مطابق "وہ اپنے زمانے میں مشرق و مغرب کی وہ شخصیت ہے جو بذات خود سب سے زیادہ شائستہ، مہذب اور متمدن تھی۔ بلکہ اس کا دربار اور اس کی ذات ثقافت کا زبردست مرکز تھی اور اس کی بدولت ثقافت اور فنون لطیفہ کو بے حد فروغ حاصل ہوا۔"

بابر دلیر اور جری سپاہی، تجربہ کار جرنیل اور رہبر، اولوالعزم سردار تھا جس پر ادنیٰ سپاہی سے لے کر اعلیٰ سردار تک جان چھڑکتا اور اس کے ساتھ مرنا اور جینا فخر سمجھتا تھا۔ اس کی زندگی کا ایک ایک واقعہ اولوالعزمی، استقلال، اور تحمل کا شاہکار ہے۔ اس کی زندگی کی یہ داستان بڑی دلکش

سچ یہ ہے اس کا ایک ایک واقعہ نہ صرف عبرت و بصیرت کا مرقع ہے بلکہ بڑا دلکش و دلآویز بھی ہے۔ اس نے جو شجاعت اور جلادت دکھائی وہ قابل ... جبلتوں سے ... آپ کو ... عقل کا یکسر متحرک ثابت کیا، بڑے سے بڑے ہلاکت آفریں ... ہمت کش مرحلوں پر اس نے خوش خوئی کو ہاتھ سے نہ جانے دیا اور خوش مزاجی کو قائم رکھا۔ مایوسی اور یاس کا سایہ تک نہ پڑنے دیا۔ وہ عظیم الشان سلطنت کا مالک ہے تب بھی وہ انتہائی ہشاش بشاش ہے اور اگر وہ دشمنوں سے شکست کھا کر سر چھپانے کے لیے جگہ تلاش کر رہا ہے۔ تب بھی اس کا چہرہ دلی مسرت کی غمازی کرتا ہے ——— جہاں موقع ملتا ہے دوستوں کے ساتھ مل کر جشن مناتا ہے۔ کسی چشمے کے پاس سبزے کے فرش مخمل پر بیٹھ کر شعر خوانی کرتا۔ موسیقی کی تانیں اڑاتا۔ دوستوں سے خوش گپیاں کرتا۔ لطیف مزاح سے خود بھی لطف اندوز ہوتا اور دوسروں کو بھی اس روحانی خوشی میں شامل کرتا ہے۔ فرصت پا کر اپنے زندگی کے واقعات کو ہلکے پھلکے انداز میں قلمبند کر کے آنے والی نسلوں کے لیے ایک ایسا مرقع بنا گیا ہے جو اب بھی اتنا ہی دلچسپ اور دلکش ہے جتنا آج سے صدیوں پہلے تھا۔

کامران

بابر کی زندگی کا یہ پہلو علیحدہ تفصیل چاہتا ہے۔ ہم اس کی اولاد میں سے اس کے بیٹے کامران کی زندگی سے اس قسم کا ایک پہلو پیش کرتے ہیں جس میں بابر کے کردار کی جھلک نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ کامران بابر کا دوسرا بیٹا اور ہمایوں کا چھوٹا بھائی تھا۔ بابر نے اپنی سرپرستی میں اسے تعلیم و تربیت دی۔ وہ بڑا زبردست شہسوار اور علم و موسیقی کا دلدادہ تھا۔ بدقسمتی سے اس نے اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے ہمایوں کے راستے میں طرح طرح کی مشکلات پیدا کیں۔ وہ ایک مدت تک ہمایوں کے خلاف برسرپیکار رہا حتیٰ کہ آخر جب وہ اپنے بھائی سے شکست کھا کر سلیم شاہ سوری کے ہاں چلا گیا۔ اسے امید تھی کہ اسلام شاہ ہمایوں کے خلاف اس کی مدد کرے گا اور وہ کابل کا علاقہ دوبارہ ہمایوں سے چھین لے گا مگر واقعات نے بہت جلد اس پر ثابت کر دیا کہ وہ اپنے آپ کو دھوکا دے رہا ہے۔ اسلام شاہ اس کی مدد کرنا تو درکنار اس کی زندگی کے درپے ہے چنانچہ وہ اس کے ہاں سے بھاگا اور آدم خاں گکھڑ کے ہاں پناہ گزیں ہوا۔

اب کامران نے گکھڑ سردار کو ہمایوں کے خلاف اکسایا مگر وہ اس پر آمادہ نہ ہوا۔ اس کے بعد اس نے ہمایوں کے خلاف لڑنے کے لیے اس سے مدد چاہی مگر اس کی یہ امید بھی بر نہ آئی۔ آدم خان اسے طائف الحیل سے ٹالتا رہا۔ اور در پردہ وہ ہمایوں سے صلح صفائی کے بارے میں خط و کتابت کرتا رہا۔ چنانچہ دونوں کا آپس میں معاہدہ ہو گیا۔ کامران کو بھی اس کا علم ہوا۔ اس نے بھاگنے کا ارادہ کیا لیکن آدم خاں کے سپاہی اور دوسرے نوکر سائے کی طرح اس پر مسلط رہتے تھے۔ گویا وہ ان کی حراست میں تھا جہاں سے بھاگنا ناممکن تھا۔ ناچار اس نے ان کے ساتھ بسر اوقات کرنی شروع کی۔

ہمایوں سارے حالات سے باخبر تھا۔ وہ کامران کی طرف توجہ دینے سے پہلے کابل کا نظم و نسق درست کرنا چاہتا تھا۔ اس کے بعد وہ ہندوستان کی مہم کے لیے تیار ہونا چاہتا تھا جب وہ ان حالات سے عہدہ برآ ہو گیا اور مہم کے لیے تیاری کر لی تو اس نے لشکر کے قاضی اور قاضی چاند کو سلطان آدم گکھڑ کے پاس روانہ کیا کہ وہ مرزا کامران کو ان کے حوالے کر دے تاکہ وہ میرزا کامران کو سمجھا بجھا کر راہ راست پر لائیں مگر ان کی یہ کوشش ناکام ثابت ہوئی۔ اور میرزا کامران نے ہمایوں کی اطاعت قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

کامران کو چند سرداروں کی حراست میں ہمایوں کے کیمپ میں لایا گیا۔ ہمایوں کی دلی خواہش تھی کہ وہ کامران پر کسی قسم کی سختی نہ

کرے اور اگر میرزا اطاعت قبول کرے تو اسے ایک بہت بڑی جاگیر بخش دے۔ لیکن امیروں کو جب اس بات کا علم ہوا تو وہ بہت بدظن ہوئے۔ وہ عفو کی صورت میں ہمایوں کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انھوں نے ہمایوں سے کہا کہ کامران نے بڑے بڑے جرم کیے ہیں اسے بڑی سے بڑی سزا ملنی چاہیے۔ وہ اس کا مستحق ہے۔ حق اور انصاف اسی بات کا تقاضا کرتا ہے۔ بادشاہ نے ان کی باتیں سنیں اور وقتی طور پر انھیں ٹال دیا۔ وہ بجائے کامران کے بارے میں مراحم خسروانہ سے کام لیتا رہا۔ اس کی حرکات سے چشم پوشی کرتا رہا اور ہر موقع پر لطف و کرم سے پیش آتا رہا۔ امرا نے جب یہ حالت دیکھی تو وہ بہت پریشان ہوئے۔ انھوں نے سمجھا کہ اگر حالات ایسے ہی رہے تو دوبارہ فتنہ و فساد کا دروازہ کھل جائے گا۔ شور و شر پیدا ہوگا۔ جنگ و جدل کی آگ بھڑک اٹھے گی۔

اب وہ ایک عظیم اجماع کے ساتھ بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض داشت پیش کرتے ہوئے کہا کہ رحمت و عاطفت بادشاہی فطرت عالی اور عطوفت والا کا تقاضا یہی ہے کہ بڑے سے بڑے گناہوں کو معاف کر دیا جائے۔ مگر دور اندیشی اور عاقبت بینی کا تقاضا ہے کہ ستیزہ کار مردم آزار بدعہد اور قاتل کو اس کے اعمال کی سزا ضرور دی جائے تاکہ اس کی طبعی شر پسندی سے خلق خدا محفوظ رہے اور ان کی عافیت پر کسی قسم کی آفت نہ آئے۔ دور اندیشی اور دوسری یہ ہے کہ ایک آدمی کی آسائش کو خلق خدا کی آسائش پر ترجیح نہ دی جائے۔ شکستہ دل اور آزردہ حال لوگوں کے اطمینان کے لیے ایک ظالم کو مٹا دینا ہی عدالت ہے۔ خاص کر جب ایسا کرنے سے ہزاروں کام خود بخود درجہ بہ اصلاح ہو جائیں گے۔ اس صورت حال میں رحم سے کام لینا عین بے انصافی ہوگی۔ میرزا کامران نے کیا کچھ نہیں کیا۔ اس نے بھائی چارے کو بالائے طاق رکھا۔ قدم قدم پر کفران نعمت کیا اور ہر موقع پر فتنہ و فساد برپا کیا۔ اس کے کردہ گناہوں کو اب نظر انداز خیال نہیں کیا جا سکتا۔ معاملہ اب رحم کی حد سے گزر چکا ہے۔ اس کو ملک عدم کا مسافر بنائیں تاکہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہزار ہا قسم کی بلاؤں سے نجات پائے اور اس کا نامہ اعمال بھی زیادہ سیاہ نہ ہو۔ ایک مدت مدید گزر چکی ہے کہ اس شریر اور فتنہ سرشت کے اثر سے رعایا کا مال و اسباب غارت ہوا۔ جانیں تلف ہوئیں۔ عزت و ناموس لٹا۔ اس لیے اب وقت ہے کہ اس موذی کے ہاتھوں سے خلق کو نجات دلائی جائے۔

ہمایوں بڑا عالی فطرت تھا۔ اس نے بڑے ٹھنڈے دل سے امیروں کی معروضات سنیں۔ وہ ابھی اس معاملے میں کسی قسم کا اقدام نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اگر ایسے بشر کو اللہ تعالیٰ نے باقی رکھا ہے تو کسی خاص غرض اور مصلحت کے لیے ہوگا۔ اس کے علاوہ اسے اپنے باپ کی وصیت اچھی طرح یاد تھی اس لیے وہ کامران کو مارنا نہیں چاہتا تھا۔ امرا نے یہ دیکھ کر پھر جرأت سے کام لیا اور کہا کہ اس سفاک اور بے باک کی وجہ سے طرح طرح کے فتنے پیدا ہوئے۔ ناحق خون ریزی ہوئی۔ ہمیں بڑے بڑے صدمے اٹھانے پڑے۔ چنانچہ امرا اور علما کی ایک جماعت نے اس بارے میں ایک محضر تیار کر کے بادشاہ کے سامنے پیش کیا۔ بادشاہ نے یہی محضر میرزا کامران کے پاس بھیج دیا۔ جب اس نے اسے مطالعہ کیا تو یہ لکھا کہ جن لوگوں نے میرے قتل پر فتویٰ دیا ہے انھیں لوگوں کی بدولت مجھے آج یہ دن دیکھنا نصیب ہوا ہے۔

ہمایوں عجب کشمکش و پیچ میں مبتلا تھا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ کافی غور و خوض کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ کامران کو ظاہری بصارت سے محروم کر دیا جائے۔ اس طرح ایک اٹھتا ہوا فتنہ دب گیا۔ امیروں کی تسلی ہو گئی۔ علما اس کامیابی پر بڑے نازاں تھے کہ اب فتنہ و فساد کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں گے۔

کامران کی بصارت زائل کرنے سے ہمایوں کی غرض و غایت یہ تھی کہ بادشاہت کے لیے اس کی ساری سرگرمیاں ختم ہو جائیں کیونکہ اندھا بادشاہ نہیں ہو سکتا اور اگر وہ کبھی تخت و تاج کا دعویٰ بھی کرے تو اسے عوام کی تائید حاصل نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ اسلام میں اکثر شہزادوں کو

شمالی ملک کے مقامات بکثرت ملتے ہیں ۔

اس فیصلے کا اعلان ہوا۔ بادشاہ نے پانچ آدمی اس کام کے لیے نامزد کیے۔ ان میں ایک جوہر آفتابچی بھی تھا۔ جوہر آفتابچی نے ہمایوں کے زمانۂ حکومت کی یادداشتیں تذکرۃ الواقعات کی صورت میں مرتب کی ہیں۔ چونکہ وہ اس مہم میں خود بھی شریک تھا۔ اس واسطے اس نے یہ واقعہ زیادہ تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ہم اسی سے یہ سارا واقعہ یہاں درج کرتے ہیں۔

رمضان ۹۶۰ھ کا واقعہ ہے۔ عصر کی نماز کا وقت تھا جو ہر کامران کے خیمے میں آیا۔ میرزا کامران نے اس سے مصلیٰ طلب کیا۔ جوہر نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ میرزا نے اسی مصلیٰ پر مغرب کی نماز بھی پڑھی۔ نماز سے فارغ ہو کر اس نے جوہر سے پوچھا۔ تمہارا نام کیا ہے۔ تم کتنے عرصے سے بادشاہ کی خدمت میں ہو؟ اس نے جواب دیا۔ میرا نام جوہر ہے اور میں انیس برس سے بادشاہ کا نوکر ہوں۔ کامران نے کہا تم تو پرانے نوکر ہو۔ کبھی تم نے مرزا عسکری کی نوکری بھی کی ہے؟ جوہر نے نفی میں جواب دیا۔ اس کے بعد میرزا نے کہا کہ مجھ سے رمضان کے کچھ روزے قضا ہو گئے ہیں۔ کیا تو میرے عوض روزے رکھے گا؟ جوہر نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا کہ آپ کو خود قضا روزے رکھنے کا بہت وقت مل جائے گا۔ آپ ایسی بے دلی کی باتیں کیوں کرتے ہیں۔ دل کو مضبوط رکھیں اور صبر نہ ہاریں۔ پھر کامران نے پوچھا۔ کیا تم جانتے ہو کہ میری گردن ماریں گے؟ جوہر نے جواب دیا :

رموز مملکت خویش خسرواں دانند

البتہ میں اپنی عقل سے یہ جانتا ہوں کہ کوئی شخص اپنے بازو کو اپنے ہاتھ سے نہیں توڑتا۔ آپ یہ بھی جانتے ہیں ہمایوں بادشاہ بڑا بامروت ہے۔

یہ رات اسی قسم کی باتوں میں بسر ہو گئی۔ دوسرے دن بادشاہ نے حکم دیا کہ میرزا کی آنکھوں میں نشتر لگایا جائے۔ جب نوکروں کے پاس یہ حکم پہنچا تو سوال پیدا ہوا کہ یہ دردناک خدمت کون انجام دے۔ کوئی بھی یہ کام کرنے کے لیے آمادہ نہ تھا۔ سلطان علی بخشی نے علی دوست ایشک آقاسی سے کہا کہ تو نشتر لگا۔ علی دوست نے اسے جواب دیا کہ تیری احتیاط کی حالت تو یہ ہے کہ تو اگر کسی کو ایک شاہرخی دے سکتا ہے تو پہلے بادشاہ سے پوچھ لیتا ہے۔ میں تیرے کہنے سے یہ کام کیوں کروں۔ بادشاہ نے اگر پوچھا کہ تم نے میرے بھائی کو کس کے حکم سے اندھا کیا تو میں اسے کیا جواب دوں گا۔ سلطان علی بخشی نے بھی جوہر سے کہا کہ یہ کام مجھ سے نہ ہوگا۔

جوہر نے یہ دیکھ کر کہا۔ آؤ۔ بادشاہ کے پاس چلیں۔ اس سے پوچھ آئیں۔ چنانچہ جوہر، علی دوست، سلطان علی بخشی، غلام علی شش انگشت بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ علی دوست نے ترکی میں کہا۔ کوئی آدمی نشتر لگانا نہیں چاہتا۔ بادشاہ بہت برافروختہ ہوا۔ اسے ترکی میں جواب دیا۔ اگر کوئی اور یہ کام نہیں کرتا تو تجھے کیا ہوا ہے۔ تو خود کیوں نہیں کرتا۔

بادشاہ کا یہ حکم سن کر علی دوست میرزا کامران کے پاس آیا اور معذرت پیش کرتے ہوئے کہا۔ اگر میں یہ بات اپنی طرف سے بنا کر کہوں تو اللہ تعالیٰ میری زبان گدی سے کھینچ لے۔ یہ بادشاہ کا حکم ہے ہم مجبور ہیں کہ اسے مانیں اور تمہاری آنکھوں میں نشتر لگائیں ۔

میرزا کامران نے بڑے تحمل سے جواب دیا۔ مجھے مار ہی کیوں نہیں ڈالتے۔ علی دوست نے کہا کہ بادشاہ کے حکم کے بغیر آپ کو کون مار سکتا ہے۔ اس کے بعد میرزا کامران بڑے سکون اور اطمینان کے ساتھ نشتر لگوانے کے لیے تیار ہوا۔ اس کی چال میں بڑا وقار تھا۔ اس کی نقل و حرکت میں جو متانت پائی جاتی تھی، وہ خیمے کے باہر آیا۔ علی دوست کے ہاتھ میں رومال تھا۔ اس نے اس کا گیند بنایا۔ میرزا چت لیٹ گیا۔ گیند اس کے گلے میں ٹھونس دیا گیا۔ چار آدمیوں نے میرزا کے بازو اور ٹانگیں سنبھالیں۔ دو آدمیوں نے آنکھوں میں نشتر لگانا شروع کیا۔ اس کی آنکھ

میں کم و بیش پچاس نشتر لگائے گئے۔ میرزا نے اس تکلیف کو بڑے تحمل سے برداشت کیا۔ اس کی زبان سے اُف تک نہ نکلی۔ حتیٰ کہ شخص جو اس کے زانو پر بیٹھا ہوا تھا اس نے جب اس کے گھٹنے کو زور کی سے دبایا تو میرزا نے فقط اتنا کہا: میں یہ جانتا ہوں کہ جو کچھ تمہارا کام ہو رہا ہے۔ ہو جانے دو تم مجھ سے نہیں بچ سکتے۔ پھر ایک مجبور انسان پر یہ دباؤ اور تشدد کیوں؟ اس سارے عرصے میں اس نے اس بات کے سوا کوئی لفظ زبان سے نہ نکالا۔ مگر جب اس کی آنکھوں میں لیموں نچوڑ کر نمک چھڑکا گیا تو وہ شدتِ درد سے تڑپ اٹھا اور بے اختیار ہو کر بولا:۔

"یا الٰہی۔ یا الٰہی۔ میں نے اس دنیا میں جتنے بُرے کام کئے تھے۔ ان کا خمیازہ میں نے
اِسی دنیا میں بھگت لیا ہے۔ اب عاقبت میں مجھ پر رحم کرنا"

متاخرین میں سے بعض مؤرخوں نے لکھا ہے کہ اس موقع پر کامران نے ایک شعر لکھا جس کے لفظ مینۂ سے اس کے اندھا ہونے کی تاریخ سنہ ۹۶۰ھ نکلتی ہے۔ یہ شعر تو مل نہیں سکا البتہ ایک اور شاعر نے اس واقعہ کی تاریخ "چشم پوشید زبیداد سپہر" سے نکالی ہے۔

جب یہ سب کچھ ہو چکا تو میرزا کو گھوڑے پر سوار کیا گیا۔ وہ شاہی لشکر کے عقب میں روانہ ہوا۔ تھوڑی دور جا کر لشکر نے پڑاؤ کیا۔ میرزا کامران کے لیے جو جگہ مقرر کی گئی تھی وہ ذرا زیادہ گرم تھی۔ چنانچہ وہ دوبارہ گھوڑے پر سوار ہوا اور لشکرگاہ کی طرف روانہ ہوا۔ اسے میرزا قاسم کے خیمے میں اتارا گیا۔ اس وقت کامران بہت بے چین تھا۔ ہوا بھی گرم تھی اور ویسے بھی میرزا کے زخم تازہ تھے۔ جوہر میرزا کی بے کلی نہ دیکھ سکا۔ وہ اپنے ڈیرے پر آیا اور وہاں مغموم ہو کر بیٹھ گیا۔ بادشاہ کی نظر اس پر پڑی۔ اس سے سارا ماجرا دریافت کیا جسے سن کر ہمایوں پر رقت طاری ہو گئی۔

میرزا کامران نے اسی روز منعم خاں کے پاس آدمی بھیجا کہ وہ کسی طرح بیگ ملوک کو اس کی خدمت کے لیے بھیج دے۔ یہ خوش عہد میرزا کامران کا خاص آدمی تھا۔ اور اس پر میرزا کی خاص توجہ تھی۔ جب وہ آیا تو میرزا نے بیگ ملوک کا ہاتھ اپنی اندھی آنکھوں پر رکھ کر کہا ؎

ہر چند کہ چشم بر رخت پردہ کشیدہ است
بینا ست چشمے کہ بسے روئے تو دیدہ است

(گو میری ظاہری آنکھیں جاتی رہی ہیں مگر اہلِ بصیرت کی وہ آنکھ باقی ہے جس نے بارہا تیرا چہرہ دیکھا ہے)

دریائے اٹک کے کنارے تک کامران بادشاہ کے ساتھ رہا اور جب وہ وہاں سے کابل کے لیے واپس ہوا تو میرزا نے منعم خاں کو بلا کر کہا: تم جانتے ہو کہ میں کابل میں کس شان و شوکت کے ساتھ رہا ہوں۔ میں نے وہاں بادشاہی کی ہے اور وہاں کے لوگوں کو میرا جاہ و جلال یاد ہے۔ اب میں کن آنکھوں کو لے کر وہاں جاؤں اور وہاں کے لوگوں کو کیا منہ دکھاؤں۔ مجھے مکہ مکرمہ جانے کی اجازت دلوا دو۔

منعم خاں نے ہمایوں سے سارا ماجرا بیان کیا اور میرزا کامران کی درخواست دہرائی۔ ہمایوں اپنے بھائی کی حالت سے واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ آنکھوں کی بینائی سے محروم ہے۔ حجاز میں اس کا گزر کیسے ہوگا۔ اس لیے وہ اجازت دینے میں متامل تھا۔ وہ دن بھر اس مسئلے پر غور کرتا رہا۔ آخر امیروں کی سفارش پر اس نے میرزا کو اجازت دے دی۔

کامران نے بادشاہ کا شکریہ ادا کیا اور اس سے ملنے کی درخواست کی۔ ہمایوں اس سے ملنے سے گھبراتا تھا۔ آخر اس نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ خود میرزا کے پاس آئے گا بشرطیکہ وہ اس ملاقات کے موقع پر جزع فزع نہ کرے۔ میرزا نے یہ شرط مان لی۔ ہمایوں اس سے ملنے کے لیے اس کے خیمے میں آیا۔ میرزا سلام تعظیم و تکریم بجا لایا۔ اور یہ شعر پڑھے ؎

نہ قدر و شوکت سلطان نہ گشت چیزے کم
ز التفات بہ خوبست سرائے دہقانی
کلاہ گوشہ دہقان بہ آفتاب رسید
کہ سایہ بر سرش انداخت چو تو سلطانی

ایک لمحہ کی خاموشی کے بعد میرزا نے پھر عرض کیا ؎

بر جانم از تو ہر چہ رسد جائے منت است   گر ناوک جفاست و گر خنجر ستم

یہ اشعار جن کا لفظ لفظ دردِ دل میں ڈوبا ہوا تھا، ان کو سن کر بادشاہ کے دل میں اتر گئے۔ وہ میرزا کے چہرے کو دیکھتا رہا۔ آخر جب اسے سکون حاصل ہوا تو اس نے اتنا کہا۔ خدا گواہ ہے میں نے اپنی خوشی سے یہ کام نہیں کیا۔ میں بہت شرمندہ ہوں، کاش تم مجھ سے پہلے تم میرا یہ حال کرتے۔

میرزا کامران نے جواب نہیں دیا۔ استقلال اور بڑی نیازمندی سے بولا۔ یہاں کون کون آدمی ہیں؟ اسے حاضرین کے نام بتائے گئے۔ اس نے کہا۔ دوستو! تم سب گواہ رہو اگر میں اپنے آپ کو بے گناہ خیال کرتا تو اس وقت جب کہ جہاں پناہ یہاں تشریف فرما ہیں۔ میں اس بات کا اعلان کرتا ہوں پورے یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ میں ہلاک ہونے کے قابل تھا مگر حضرت نے میری جان بخشی کی اور اس کے سوا حجاز مقدس جانے کی اجازت بھی دی۔ اس احسان کے شکریے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں۔ اس نے میری بدی اور بدعہدی پر قلم عفو پھیرا۔

اس کے بعد کامران نے اپنے بیٹے اور بیٹیوں کی سفارش کی۔ بادشاہ نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ وہ میرے اپنے بچے ہیں میں ان سے ہمیشہ نیک سلوک کروں گا۔

اس کے بعد میرزا کو رخصت کیا اور اس کے نوکروں میں سے جو اس کے ساتھ جانا چاہتے تھے انھیں بھی اجازت دی مگر خود غرض دنیا میں جنس وفا نایاب ہے۔ اس کے بیشتر ساتھیوں اور نوکروں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ البتہ اس کی بیوی ماہ چوچک نے جیسا خوب نبھایا اس کا پورا ساتھ دیا۔ اسے روکنے کی کوشش کی گئی مگر وہ اپنے ارادے پر قائم رہی۔ اور جب وہ جہاز پر سوار ہوئی تو اس کا باپ حسین انغو اسے روکنے کے لیے وہاں پہنچا مگر وفا پرست ماہ چوچک نے باپ کو جواب دیا "تم نے مجھے خاوند کے سپرد اس وقت کیا جب وہ بادشاہ تھا۔ اب تم مجھے اس سے اس لیے جدا کرنا چاہتے ہو کہ وہ تباہ حال اور شکستہ دل ہے۔ ادبار اور نکبت کی گھٹائیں اسے ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ پہلے شاید اسے میری ضرورت نہ ہو۔ لیکن اب اسے قدم قدم پر میری ضرورت ہے۔ اس حالت میں میں اس کا ساتھ کیسے چھوڑ سکتی ہوں۔" باپ اس کی باتوں سے بہت متاثر ہوا۔ اس کی شوہر پرستی اور وفا کی بڑی تعریف کی اور اسے رخصت کیا۔

کامران تین حج کرنے کے بعد ۱۱۔ ذی الحجہ ۹۶۴ھ کو فوت ہوا۔ ملا قاسم کاہی نے تاریخ وفات کے متعلق مندرجہ ذیل قطعہ لکھا ؎

کامراں آں کہ بادشاہی را   کس نہ بود است ہیچ او در خورد
شد ز کابل بہ مکہ و آنجا   جان بحق داد و تن بخاک سپرد
گفت تاریخ او چنیں کاہی
بادشاہ کامران بہ مکہ بمرد

وصفی نامی شاعر نے بھی کامران کی تاریخ وفات کہی ہے ؎

شدہ کامران خسرو نامدار — کہ از سلطنت سر بکیواں رساند
مجاور شد اندر حرم چار سال — بکلی دل از قید عالم رہاند
زبعد وقوف رہِ حج جبین — باحرامِ حج جاں بجاناں فشاند
چو در خواب دیشب درآمد شبے — حکایت نمود و دعائے خویش خواند
بگفت او بہ پرسند از فوت ما
بگو شاہ مرحوم در مکہ ماند
۹۶۴ھ

(بدایونی ص ۱۳۳)

ابوالقاسم شوکتی

کامران کا بیٹا ابوالقاسم شوکتی بھی شاعر، ادیب اور استقلال کا پیکر تھا۔ اکبر نے جب اتکہ خیل کے نرغے میں پھنس کر بیرم خاں کے ہاتھ سے عنانِ اختیارات چھیننے چاہے اور آگرہ سے دہلی کی جانب روانہ ہوا تو ماہم انگہ نے اس خوف سے کہ کہیں بیرم خاں اسے اکبر کے خلاف تخت پر نہ بٹھا دے۔ ابوالقاسم کو گوالیار کے قلعہ میں نظر بند کر دیا اور ۹۷۲ھ میں جب خان زمان علی قلی خاں سیستانی اور اس کے بھائی بہادر خاں سیستانی نے جون پور میں علم بغاوت بلند کیا اور اس کے اگلے ہی سال اکبر کے سوتیلے بھائی میرزا حکیم نے بھی سرکشی شروع کی تو اکبر کو ابوالقاسم کی طرف سے پھر خدشہ پیدا ہوا۔ اس نے امیروں کے مشورہ سے اس خار کو ہمیشہ کے لیے راستہ سے دور کرنے کا حکم دیا۔ امیر کے کچھ امرا جو قلعوں ہی سے خائف تھے چنانچہ جگران اس نے گوالیار جا کر اسے ٹھکانے لگایا۔ جب جلاد اس کا سر قلم کرنے لگا تو اس نے فی البدیہہ یہ شعر کہا ؎

فلک بہ کشتنِ من ایں قدر شتاب مکن
چو خواہم از ستمت مُرد اضطراب مکن

ایک خانہ زاد شاعر نے اس کی بڑی عجیب غریب تاریخ کہی ہے۔

نہالِ بوستانِ کامرانی — فتاد از صرصرِ غم ناگہانی
ابوالقاسم کہ گشت از کشتنِ او — بسانِ غنچہ خون جانِ جہانی
رقم زد وحشی تاریخِ قتلش — نماند از کامراں نام و نشانی
۹۷۲ھ

ایک اور شاعر نے اس کی تاریخ یوں کہی ہے ؎

خسرو گلرخاں ابوالقاسم — آنکہ مہ از رخش منور شد
رفت و از رفتنش دل خلقاں — پارہ پارہ چو ذرہ احمر شد
سالِ تاریخش از خرد جستم — خرم سوئے باغ عنبر شد
بلبلِ ناگہاں بافغاں گفت

شہریار

جہانگیر کے آخری ایام حکومت تھے۔ اس کی صحت روز بروز خراب ہو رہی تھی۔ جانشینی کے لیے کوئی خاص قاعدہ مقرر نہ تھا اس لیے سلطنت کے خیر خواہوں کو تشویش لاحق تھی۔ جہانگیر کا سب سے بڑا بیٹا خسرو مر چکا تھا۔ پرویز بھی اس دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔ میدان میں دو امیدوار موجود تھے۔ شاہ جہان اور شہریار ——— شہریار اہل دربار میں چنداں ہر دلعزیز نہ تھا مگر نور جہاں کی بیٹی لاڈلی بیگم جو شیر افگن سے تھی اس سے بیاہی ہوئی تھی۔ اس لیے نور جہاں کی دلی خواہش تھی کہ ہندوستان کا تاج اس کے سر پر رکھا جائے۔ شاہ جہان آصف خان کی لڑکی ارجمند بانو سے بیاہا ہوا تھا اور اپنے اندر وہ تمام صلاحیتیں رکھتا تھا جو ایک اچھے بادشاہ میں ہونی چاہئیں۔ وہ مدبر، جفاکش، رعیت نواز اور عادت کا پابند ہونے کے علاوہ ایک اچھا سپاہی اور بڑے درجے کا سپہ سالار بھی تھا۔ وہ درباریوں میں ہر دلعزیز تھا۔ نور جہاں نے ہر چند کوشش کی کہ وہ اہل دربار اور رعایا کی نظروں سے گر جائے مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکی۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ نور جہاں کی دراندازیوں سے تنگ آ کر بغاوت پر آمادہ ہوا اور کھلے بندوں شاہی افواج سے لڑتا رہا۔ بعض امیروں نے بادشاہ کے حکم سے اس کا مقابلہ بھی کیا مگر شاہجہان سے جو عقیدت انھیں تھی وہ بدستور قائم رہی۔ اس میں کسی قسم کا فرق نہ آیا۔ وہ اب بھی رعایا اور دربار کی آنکھوں کا تارا بنا رہا۔

شہریار نہ تو رعایا میں ہر دلعزیز تھا نہ درباری طبقہ اسے پسند کرتا تھا۔ وہ ناشدنی کے لقب سے مشہور تھا اور بعض اوقات ایسی حرکتیں بھی کر جاتا تھا جو شاہی وقار کے منافی ہوتی تھیں۔ امرا کا ایک طبقہ محض نور جہاں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اس کی وفاداری کا زبانی دم بھرتا تھا۔

۱۰۳۶ھ کی بہار کا موسم تھا کہ جہانگیر عازم کشمیر ہوا۔ اس کے ساتھ نور جہاں، آصف خان، شہریار اور مرحوم شہزادہ خسرو کا بیٹا داور بخش عرف میرزا بلاقی بھی تھا۔ شاہجہان دکن میں تھا۔ جہانگیر کھوئی ہوئی صحت کی تلاش میں کشمیر پہنچا مگر جنت ارضی کی آب و ہوا اس کی صحت کی بحالی میں کسی طرح بھی مفید ثابت نہ ہوئی۔ وہ دمہ کا مریض تھا۔ مرض نے یہاں پہنچ کر شدت اختیار کر لی۔ نقاہت بڑھتی گئی۔ جسمانی کمزوری نے ڈیرے ڈال دیئے۔ بھوک ختم ہو گئی اور خیر خواہان سلطنت کو بادشاہ کا انجام سامنے نظر آنے لگا۔ اب بادشاہ گھوڑے کی بجائے پالکی میں سوار ہو کر باہر نکلتا۔

انہی ایام میں شہریار پر داء الثعلب کا شدید حملہ ہوا۔ اس کے سر، داڑھی، مونچھوں، بھوؤں اور پلکوں کے بال گر گئے۔ اطبا نے اس کا علاج بڑی احتیاط سے کیا مگر اسے کوئی افاقہ نہ ہوا۔ آخر انھوں نے مشورہ دیا کہ وہ کشمیر جیسے سرد مقام کو چھوڑ کر میدانی علاقے میں چلا جائے چنانچہ وہ لاہور چلا آیا۔

شہریار کے کشمیر سے چلے آنے کے کچھ عرصہ بعد بادشاہ بھی لاہور کے ارادے سے چل کھڑا ہوا۔ جب وہ بیرم کلہ کے مقام پر پہنچا تو اسے شکار کی سوجھی۔ یہ اس کی پرانی شکار گاہ تھی اور وہ کشمیر سے آتے جاتے یہاں شکار کھیلا کرتا تھا۔ یہاں ایک حادثہ کی بنا پر اس کی صحت اور بھی بگڑ گئی۔ اس نے اس مقام کو خیر باد کہا اور دوسرے دن تھنہ پہنچا۔ یہاں سے چل کر وہ راجوری آیا جہاں سے وہ چنگس میں خیمہ زن ہوا۔ یہاں اس کی حالت بے حد نازک ہو گئی۔ رات بڑی بے قراری سے گزری۔ ۲۷ صفر ۱۰۳۶ھ مطابق ۸ اکتوبر ۱۶۲۷ء کو اس نے اپنی جان

جان آفریں کے سپرد کر دی۔

بادشاہ کی وفات نے ایک دفعہ پھر جانشینی کے جھگڑے کو تازہ کر دیا۔ اب ہر جانب سے کوشش شروع ہوئی۔ نورجہاں نے شہریار کو خط لکھا اور انھیں اس حادثے کی اطلاع دی۔ مگر آصف خاں نے اندر ہی اندر کچھ ایسی چال چلی کہ بہت کم بااثر امیر نورجہاں تک پہنچے۔ اس نے اس کے ساتھ یہ کوشش بھی کی کہ نورجہاں کی حیثیت ایک نظربندی سی ہو کر رہ گئی۔ آصف خاں نے اپنے ایک وفادار ہرکارے بنارسی نامی کو اپنی انگوٹھی دے کر شاہجہان کو یہ پیغام بھیجا کہ وہ فوراً آگرہ پہنچ کر ہندوستان کے تخت پر قبضہ کرے۔ درمیانی وقفے کے لیے اس نے خسرو کے بیٹے داور بخش کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔

داور بخش کو یقین نہ آتا تھا کہ آصف خاں شاہجہان کو چھوڑ کر اس کا ساتھ دے گا۔ مگر جہاندیدہ آصف خاں نے اسے اس طرح سبز باغ دکھائے اور قسمیں کھا کھا کر اپنی وفا کا یقین دلایا کہ داور بخش قربانی کا بکرا بننے پر راضی ہو گیا۔ ارادت خاں نے بھی آصف خاں کے ساتھ مل کر نئے شہنشاہ کو مبارک باد دی۔ چنانچہ جمعہ کے دن اس کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ اس طرح داور بخش پورے طور پر آصف خاں کے پنجے میں آ گیا۔

شاہجہان کے چاروں بیٹے نورجہاں کی حراست میں تھے۔ کیونکہ جب شاہجہان اور جہانگیر کے درمیان صلح صفائی ہوئی تھی تو اسے اپنی وفا کا یقین دلانے کے لیے اپنے چاروں بیٹے یرغمال کے طور پر بادشاہ کے پاس چھوڑنے پڑے تھے۔ آصف خاں جانتا تھا کہ اگر یہ شہزادے اسی طرح نورجہاں کے پاس رہے تو وہ انھیں کسی وقت ختم کر سکتی ہے۔ اس لیے انھیں اس کے پنجے سے نکالنا بڑا ضروری ہے۔ چنانچہ پہرا توڑنے کے ساتھ ساتھ اس نے چاروں شہزادوں کو نورجہاں کے پنجے سے چھڑا لیا۔

یہ سب کچھ ایک ہی دن میں ہوا۔ ان حالات سے نمٹنے کے بعد دوسرے دن آصف خاں بھمبر پہنچا۔ جہاں بادشاہ کی تجہیز و تکفین کی رسوم ادا ہوئیں۔ نماز جنازہ پڑھی گئی۔ نعش تابوت میں رکھ کر لاہور روانہ کی گئی تاکہ اسے باغ دلکشا میں دفن کیا جائے۔ یہ باغ نورجہاں کا تھا۔ بادشاہ کی خواہش تھی کہ اسے وہاں دفن کیا جائے چنانچہ اس کی یہ خواہش پوری کی گئی۔

شہریار لاہور میں تھا۔ نورجہاں نے کسی نہ کسی طرح اسے سب واقعات کی اطلاع پہنچائی۔ حالانکہ آصف خاں نے یہ بندوبست کر رکھا تھا کہ نورجہاں کا تعلق بیرونی دنیا سے ٹوٹ جائے تاکہ جو کچھ یہاں ہو رہا ہے۔ اس سے شہریار اور اس کے ساتھی بالکل بے خبر رہیں اور وہ چپ چاپ لاہور پر قبضہ کر لے۔ مگر نورجہاں نے اس معاملے میں اسے شکست دی۔ اس نے نہ صرف شہریار کو ساری اطلاعات بہم پہنچائیں بلکہ اسے حکم دیا کہ وہ جس قدر فوج اکٹھی کر سکے کرے۔ فوراً راوی پار کر کے اس تک پہنچے۔ شاہی فوج کم ہے وہ بڑی آسانی سے اس پر قابو پا سکتا ہے۔

شہریار اس پیغام سے گھبرا سا گیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ مگر لاڈلی بیگم نے اس کی ڈھارس بندھائی اور اسے جرأت دلا کر مجبور کیا کہ وہ اپنی بادشاہت کا اعلان کرے۔ اس نے شاہی خزانہ اور قلعہ لاہور پر قبضہ کیا۔ اور ایک ہفتہ کے اندر اندر ستر لاکھ روپیہ سپاہیوں اور سرداروں میں بانٹ دیا۔ اس طرح اپنے گرد بہت بڑی فوج جمع کر لی۔ دولت کی اس بے پناہ بارش نے شاہی خاندان کے بعض افراد کو بھی شہریار کے جھنڈے تلے لا کھڑا کیا۔ ان میں شہزادہ دانیال کا بیٹا بایسنغر بھی تھا۔

شہریار اپنا لاؤ لشکر لے کر لاہور سے باہر نکلا۔ دریائے راوی عبور کیا اور مورچے سنبھال لیے۔ اس وقت اس کے ساتھ تین

[illegible] میں نے شہریار کے سپرد کی کہ وہ آصف خان [illegible] کے
[illegible] آصف خان کو ایک بہت سخت خط لکھا [illegible] شہنشاہ کو [illegible] سے لاہور کی جانب [illegible]
[illegible] جہاں اس کی رو سے ایک دن کے فاصلے پر پہنچ گیا ہے۔
[illegible] کے ساتھ زندہ [illegible] آصف خان کے ایک [illegible]
[illegible] قلعہ بند ہو گیا۔ آصف خان نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا [illegible]
[illegible] میں حالات یکسر بدل گئے۔
آصف خان قلعہ میں داخل ہوا۔ شہریار اپنے ساتھیوں کی بے وفائی سے اتنا سراسیمہ اور پریشان ہوا کہ وہ قلعہ سے بھاگنے کی بجائے زنان خانہ میں جا چھپا۔ جہاں سے اسے گرفتار کر لیا گیا اور چند دن کے بعد اس کی آنکھیں نکال دی گئیں۔ سبحان رائے بھنڈاری کا بیان ہے کہ جب اس کی آنکھوں کی پتلیاں کاٹی جا رہی تھیں اور وہ درد سے تڑپ رہا تھا۔ اس نے اپنے اندھا ہونے کی تاریخ یوں نظم کی ہے

ز نرگس گلاب ار چہ تتواں کشید — کشیدند از نرگس من گلاب
اگر از تو پرسند تاریخ من — بگو کور شد دیدۂ آفتاب

۱۰۳۷ھ

استقلال کی یہ عظیم الشان مثال ہے۔ شہریار کو مورخ ناشدنی کہتے ہیں یعنی وہ نالائق اور ناکارہ تھا مگر جب اس پر مصیبت پڑی تو اس نے اپنے استقلال کو ان ابیات کو قائم رکھا اور خندہ پیشانی سے اس کا مقابلہ کرتے ہوئے اس واقعہ کو منظوم کر کے ہمیشہ کے لیے جریدۂ روزگار پر ثبت کر دیا ہے۔ اس قسم کی مصیبتوں سے انسانیت نکھرتی ہے اور دوسروں کے لیے عبرت اندوزی کا سرمایہ بن جاتی ہے۔

شاہ عالم ثانی

خاندان تیموریہ میں آنکھیں نکالے جانے اور اس مصیبت کے وقت استقلال اور تحمل کا سررشتہ ہاتھ سے نہ چھوڑنے کی چوتھی زبردست مثال شاہ عالم کی ہے۔

شہزادہ عالی گہر جو بعد میں شاہ عالم کے لقب سے تیموری شوکت وجلال کے مزار کا مجاور رہا تاریخ ہندوستان میں کچھ ایسی زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ اس کی بادشاہت کے بارے میں کسی ظریف کا مقولہ ہے کہ "بادشاہی شاہ عالم از دلی تا پالم"۔ وہ رحم دل، تحمل مزاج اور صاحب مروت تھا۔ مصیبت کے وقت خاص طور پر استقلال کا مظاہرہ کرتا۔ مگر جواں مردی اور شجاعت سے عاری تھا۔ جن کی ان حالات میں ضرورت تھی۔ رحم اور مروت کی یہ حالت تھی کہ کوئی شخص خواہ کتنی ہی بے وفائی اور دغا کا اظہار کرتا، جب وہ اس کے سامنے آتا تو اس کی آنکھیں خود بخود جھک جاتیں اور وہ اس کے تمام گناہوں پر خط تنسیخ کھینچ دیتا۔ اس کے بعد وہ اس کے بارے میں سب کچھ بھول جاتا جس کی وجہ سے سلطنت کا نظم ونسق بگڑتا ہی چلا گیا۔ شاہ عالم بڑا شاکر و صابر تھا۔ ہر حال میں اللہ کا شکر گزار رہتا۔ مصائب و آلام کے طوفانوں میں وہ کبھی حوصلہ نہ ہارتا۔ ہمیشہ بہت بلند رکھتا۔

شاہ عالم اپنے باپ عالمگیر ثانی کے قتل کے بعد ہندوستان کے تخت پر بیٹھا۔ وہ دہلی سے دور بہار میں قسمت آزمائی کر رہا تھا کہ وہیں اس کی بادشاہت کا اعلان ہوا۔ آخر بکسر کی جنگ کے بعد اس کا مستقل قیام الہ آباد میں ہو گیا۔ وہ شجاع الدولہ اور ایسٹ انڈیا کمپنی دونوں کے درمیان

گھرا ہوا تھا۔ وہ اسے جس طرح چاہتے استعمال کرتے۔ دہلی میں نجیب الدولہ امیر الامرا اور شہزادہ جواں بخت بادشاہ کے نائب تھے۔ نجیب الدولہ نے سلطنت کی گرتی ہوئی عمارت کو سہارا دینے کی کوشش کی مگر حالات ایسے بگڑ چکے تھے کہ اس کا سنبھلنا ناممکن تھا۔ مرہٹے پانی پت کی تیسری لڑائی کے بعد شمال کا رخ کرتے ہوئے گھبراتے تھے۔ جاٹ، گوجر اور راجپوت لوٹ کھسوٹ مچا رہے تھے۔ شجاع الدولہ اپنی سلطنت کی وسعت میں ہمہ تن مصروف تھا۔ اس کا لقب نواب وزیر تھا۔ مگر اسے دہلی سے کسی قسم کا کوئی لگاؤ نہ تھا، وہ یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ دہلی کی سلطنت مٹے یا رہے وہ صوبہ اودھ کو ایک سلطنت کی صورت دے کر رہے گا۔

ان حوصلہ شکن حالات میں نجیب الدولہ نے آٹھ برس تک بڑی بیدار مغزی، دلیری اور شجاعت سے شمالی ہندوستان میں امن و امان قائم رکھا۔ اس کی زندگی ہی میں مرہٹوں نے اپنے آپ کو درست کر لیا۔ اور ایک مرتبہ پھر وہ ہندوستان گیری کا خواب دیکھنے لگے۔ دکن کی تاخت و تاراج کے بعد انھوں نے شمالی ہندوستان کا رخ کیا۔ نجیب الدولہ نے یہ دیکھ کر کہ دہلی کے حالات خود دہلی میں مسلمان امیر اور دربار کے بڑے بڑے سردار خود غرضی کا شکار ہو کر ایک دوسرے کی گردن کاٹنے پر تلے ہوئے ہیں، ان ناساز گار حالات میں مرہٹوں کا مقابلہ تو کیا ہو سکے گا، یہی کمی سلطنت کا بچانا بھی مشکل ہے، اس نے مرہٹوں کے ساتھ صلح کر لی۔ حکومت دہلی نے پیشوا کو اقلیم ہند میں وسیع اختیارات سونپ دیئے اور یہ بھی فیصلہ کیا کہ شاہ عالم، جو الٰہ آباد میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے نظربند کی حیثیت سے زندگی بسر کر رہا ہے، دہلی لایا جائے اور اس کی سرپرستی میں ملک کے امن و امان کے لیے کوشش کی جائے۔ چنانچہ مرہٹے اس پر متفق ہو گئے۔

شاہ عالم سے اس سلسلے میں گفت و شنید شروع ہوئی۔ وہ بھی دہلی آنا چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ مرہٹہ سرداروں کے قول و فعل سے مطمئن ہو کر عازم دہلی ہوا اور بارہ سال کی جلاوطنی کے بعد ۱۷۷۱ء کے آخر میں دہلی پہنچا۔ بڑے زور شور سے اس کا استقبال ہوا۔ اب نجیب الدولہ مر چکا تھا۔ نجف خاں دہلی کے سیاہ و سفید کا مالک تھا۔ ضابطہ خاں اپنے باپ نجیب الدولہ کا عہدہ لینا چاہتا تھا۔ تکوجی ہلکر وا سے اندور اس کا بڑا سرپرست تھا۔ ہلکر کا اثر دربار میں بھی تھا۔ اس نے بڑی کوشش کی مگر حالات نے ضابطہ خاں کا ساتھ نہ دیا۔ وہ کبھی تو امیر الامرا ہوتا کبھی فقط ایک معمولی سردار بن کر رہ جاتا۔

دہلی کی حالت دن بدن ابتر ہو رہی تھی، بڑی بڑی مہمات کے لیے روپیہ درکار تھا مگر یہاں خزانہ خالی تھا۔ بادشاہ بالکل کنگال تھا یہاں تک کہ جب ۱۷۷۵ء میں اس کی ماں لال کنور فوت ہوئی تو شاہ عالم کے پاس اتنی رقم بھی نہ تھی کہ وہ اس کا مقبرہ بنوا سکے۔ ان حالات میں نجف خاں نے بہت ہاتھ پاؤں مارے۔ وہ سلطنت کے ہر حریف سے لڑا۔ مگر جہاں گھر کے اندر دشمن موجود ہوں وہاں ایک آدمی کی کوشش سے کیا ہوتا ہے۔ شاہ عالم ان حالات کو خوب سمجھتا تھا مگر کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ نجف خاں کے مرنے کے بعد حالات نے پھر پلٹا کھایا۔ مرہٹوں کا اثر و رسوخ بہت زیادہ بڑھ گیا۔ جسے ہر صاحب بصیرت بڑے خوف و ہراس سے دیکھتا تھا، سب سے زیادہ خطرہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو تھا۔ مگر وہ کچھ کر نہیں سکتے تھے

یہ دیکھ کر غلام قادر روہیلہ جو ضابطہ خاں کا بیٹا تھا، منصور علی خاں خواجہ سرا کی وساطت سے بادشاہ کے حضور میں پیش ہوا۔ اس کے ساتھ مغل فوج کا سردار اسماعیل بیگ بھی تھا۔ یہ دونوں مادھوجی سندھیا کے خلاف ہاتھ پاؤں مار رہے تھے، سندھیا کا اقتدار دربار پہ چھایا ہوا تھا۔ بادشاہ ایک طرف سندھیا سے امداد طلب کر رہا تھا، دوسری طرف وہ غلام قادر روہیلہ اور اسمٰعیل بیگ کو بھی ساتھ رکھنا چاہتا تھا۔ سندھیا کی فوجیں ادھر ادھر منتشر تھیں۔ بیگم شمرو جو اس وقت دہلی میں تھی اور جس کے ہوتے ہوئے خطرات لال قلعہ سے دور ہی دور رہتے تھے، حالات سے مایوس ہو کر اپنی ریاست سردھنا میں چلی گئی، اس نے یہ بھی کہا کہ مادھوجی سندھیا معترض ہوتے ہوئے دہلی کی مہم میں کیوں شریک نہیں ہوتا اور بادشاہ کی امداد کے لیے خود کیوں نہیں آتا، سوال میں کچھ کالا کالا ضرور ہے۔

بیگم شہر سے جانے نہ دے۔ جو نقطہ نہایت ہمدردی مساعی بادشاہ کے ساتھ رہ گیا تھا۔ وہ بھی بہت اور جوڑ سے بادشاہ کے خلاف کام کر رہا تھا۔ مگر مغل سرداروں نے اسے دھمکیاں دے دے کر بادشاہ سے علیحدہ کر دیا۔ اس بیچ سے نیز وفادار منصور علی خاں نے بھی ہمسرا نے کیا۔

جب اسمٰعیل بیگ اور غلام قادر بادشاہ کے حضور پیش ہوئے تو کورنش اور تسلیمات کے بعد دونوں نے عرض کیا کہ ہم دونوں جو کام کرتے ہیں وہ جہاں پناہ کی خیرخواہی کے لیے ہے۔ بادشاہ سب کچھ سمجھتا تھا اور اپنی مجبوری اور معذوری سے بھی واقف تھا۔ مگر اس نے دونوں کو خلعت عطا کئے۔ غلام قادر کی امیر الامرائی کا اعلان کیا۔ ادھر بھی سندھیا اپنے عہدے سے موقوف کیا گیا اور اسمٰعیل بیگ تمام افواج کا سپہ سالار مقرر ہوا۔

غلام قادر روہیلہ نے کچھ دنوں بعد بادشاہ سے کہا کہ ہماری سپاہ کا ارادہ ہے کہ وہ متھرا پر حملہ کر کے مرہٹوں کو شمالی ہندوستان سے بھگا دے۔ جتنے امیر وہاں موجود تھے سب نے تائید کی۔ مگر تیل واس خزانچی نے یہ عذر پیش کیا کہ خزانہ خالی ہے فوج کے مصارف کون برداشت کرے گا؟ غلام قادر نے خزانچی کو بُرا بھلا کہا۔ وہ مارے غصے کے بیتاب ہوگیا۔ بات دراصل یہ تھی کہ شاہ عالم نے ایک خط مادھوجی سندھیا کو لکھا تھا کہ وہ اس کی امداد کے لیے آئے۔ یہ خط غلام قادر کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ اس نے خط نکالا بادشاہ کے سامنے پیش کیا۔ دونوں نے انکار کیا۔ غلام قادر نے اسی وقت حکم دیا کہ شاہی کھاروں فوراً ہتھیار ڈال دے۔ اس نے شاہ عالم کو حراست میں لے لیا اور اسے قید کر کے سلیم گڑھ بھجوا دیا۔

اس سے فارغ ہو کر اس نے ایک تیموری شہزادے کو قید سے نکالا اور اس کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ سب امیروں اور سرداروں کو حکم دیا کہ وہ اس کی بادشاہت کو تسلیم کرتے ہوئے اس کے ہاتھ پر بیعت کریں۔

غلام قادر نے تین دن تک بادشاہ کو بے آب و دانہ رکھا۔ اور باقاعدہ قلعہ لوٹنے کا فیصلہ کیا۔ مگر اسمٰعیل بیگ بھی برابر کا شریک تھا۔ اس واسطے پہلے اسے ٹالا اور کہا کہ حالات کو قابو میں رکھنے کے لیے تمہارا فوج میں ہونا ضروری ہے۔ وہ اس چکمے میں آگیا مگر لشکر میں پہنچ کر اپنی اس حماقت پر بہت پچھتایا۔ اس نے اتنا ضرور کیا کہ شہر کے دولت مند اہل کاروں کو بلا کر کہہ دیا کہ تم ہوشیار رہنا۔ اپنی حفاظت کا بندوبست رکھنا۔ ساتھ ہی اپنے سپاہیوں اور نائبوں کو یہ حکم بھی دیا کہ اگر روہیلے شہر کو لوٹیں تو تم بھی خوب لوٹو۔

غلام قادر نے سب سے اوّل نئے بادشاہ کو حکم دیا کہ اپنی تمام بیگمات سے زیورات، جواہرات اور قیمتی سامان لے لو۔ اس نے حکم کی تعمیل کی۔ جب یہ سامان جمع ہوگیا تو روہیلے نے اس پر قبضہ کر لیا۔

یہاں سے فارغ ہو کر اس نے شاہ عالم پر دباؤ ڈالا کہ وہ بتلائے اس نے دولت کہاں چھپا رکھی ہے اور کہاں کہاں دفینے موجود ہیں۔ شاہ عالم نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ اب اس پر سختی شروع ہوئی۔ کوئی ایسا ظلم و ستم نہ تھا جو اس بوڑھے بادشاہ اور اس کی اولاد پر نہ توڑا گیا ہو۔ شروع شروع میں اس نے نئے بادشاہ بیدار بخت سے اسے خوب پٹوایا، ۳۰ جولائی ۱۷۸۸ء کو شاہی خاندان کی بیگمات کو پٹوانا شروع کیا۔ ان کے جسم پر نیل پڑ گئے۔ ان کے گال تھپڑوں سے لال ہوگئے۔ جب ان کو پیٹا جاتا تو سارا محل ان کی دردناک چیخوں سے گونج اٹھتا۔

اس دوران میں کبھی کبھی روہیلے کو خیال آتا کہ کہیں اسمٰعیل ان کی مدد کے لیے نہ آ دھمکے۔ اس لیے اس کا منہ بند کرنے اور اسے روکنے کے لیے ۱۳ جولائی کو پانچ لاکھ روپے اس کے پاس بھیج دیئے۔ جس پر اس نے احتجاج کیا۔ چند روز بعد اس نے مزید سات لاکھ روپیہ بھیجا۔

یکم اگست کو پھر بادشاہ پر سختی شروع ہوئی کہ وہ دفینے اور خزانے بتلائے۔ مگر اسے پتہ ہوتا تو وہ بتاتا۔ جب نوبت حد سے بڑھ گئی تو

بوڑھے بادشاہ نے کہا: "عالم پناہ خزانہ کہاں ہے؟ کیا میرے پیٹ میں رکھا ہے۔ اگر وہاں ہے تو اسے چیر کر نکال لے۔" غلام قادر نے کہا: "وقت آنے گا تو ایسا بھی کیا جائے گا۔"

شاہ عالم سے مایوس ہو کر اس نے بڑی بوڑھی بیگمات پر تشدد و تڑانا شروع کیا۔ ان سب میں ملکہ زمانی اور ممتاز محل امتیازی حیثیت رکھتی تھیں۔ وہ شہر میں رہتی تھیں۔ جو کچھ ان کے پاس تھا وہ لوٹ لیا گیا۔ مزید مال و دولت بتانے کے لیے ان پر سختیاں کی گئیں۔

جب وہ ہر طرف سے مایوس ہو گیا تو اس نے تخت کو آگ لگا کر سارا سونا اور چاندی اس میں سے نکال لیا۔ محلات کے فرش اکھاڑے۔ اس خیال سے کہ شاید خزانہ ان کے نیچے دفن ہو۔ تین دن تک قلعہ میں یہی کام ہوتا رہا۔

۱۰ اگست ۱۷۸۸ء کو دوبارہ بادشاہ طلب کیا گیا۔ غلام قادر دیوان خاص میں بیٹھا ہوا تھا۔ بادشاہ اس کے حضور میں پیش ہوا۔ غلام قادر روہیلے کے ساتھ یعقوب علی خاں اور چار پانچ روہیلے پٹھان اور بھی تھے۔ اس نے بادشاہ سے خزانہ دریافت کیا۔ شاہ عالم نے بڑے تحمل سے جواب دیا کہ اگر مجھے دفینوں کا علم ہوتا تو میں چاندی اور سونے کے ظروف بیچ کر اپنے نوکروں کو تنخواہ کیوں دیتا؟ اگر میرے آباؤ اجداد میں سے کسی نے یہاں کوئی خزانہ دفن کیا ہے تو مجھے اس کا علم کیونکر ہو سکتا ہے۔

غلام قادر نے جھلا کر کہا۔ "تو بیکار محض ہے۔ اس دنیا میں تیرا کیا کام۔ تیری آنکھیں نکال لینی چاہییں۔" شاہ عالم نے کہا: "اے کمبخت! یہ آنکھیں وہ ہیں جو ساٹھ برس تک کلام اللہ پڑھتی رہی ہیں۔ انھوں نے تیرا کیا بگاڑا ہے۔ انھیں نکال کر تجھے کیا ملے گا؟"

یہ سن کر روہیلے نے منہ پھیر لیا اور حکم دیا کہ بادشاہ کے بیٹوں اور پوتوں کو خوب پیٹا جائے۔ چنانچہ نوکروں نے اس حکم کی تعمیل کی۔ یہ دیکھ کر بوڑھے شاہ عالم نے کہا: "میں نے یہ عذاب اور مصیبت دیکھنے کے لیے ان آنکھوں کو باقی رکھنے کے لیے نہیں کہا تھا۔ انھیں فوراً نکال ڈال۔ اب ان کا کیا فائدہ ہے؟"

غلام قادر غصے سے بے قابو ہو کر تخت سے کود پڑا۔ بادشاہ کو فرش پر لٹایا۔ چھاتی پر چڑھا اور اپنے خنجر سے بادشاہ کی ایک آنکھ نکال ڈالی۔ دوسری آنکھ نکالنے کا حکم یعقوب علی خاں کو دیا۔ اس نے ایسا کرنے سے انکار کیا۔ روہیلے نے تلوار سے اس کا سر قلم کر دیا۔ اس کے دوسرے ساتھی یہ دیکھ کر دہل گئے۔ انھوں نے فوراً بادشاہ کی دوسری آنکھ نکال دی۔

اس کے بعد شاہ عالم کو سلیم گڑھ بھیج دیا گیا۔ اس وقت تمام قلعے کے رہنے والے تصویر غم بنے ہوئے تھے۔ بیگمات اور شہزادیاں ہائے عالم، وائے عالم کہہ کر سر پیٹ رہی تھیں۔ کوئی یہ دردناک واقعہ دیکھ کر بیہوش پڑی ہوئی تھی۔ کسی پر سکتے کا عالم طاری تھا۔ کوئی سسکیاں بھر رہی تھی۔ غرضیکہ سب پر غم و الم کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔

جب شاہ عالم کی آنکھیں نکالی جا چکیں تو غلام قادر کو پھر اسمٰعیل بیگ کا خیال آیا چنانچہ اس واقعہ کے دو دن بعد اسے ایک بہت بڑی رقم اور بھیجی۔

شہر والوں کو کچھ خبر نہ تھی کہ لال قلعہ کی چار دیواری میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ چند روز کے بعد انھیں علم ہوا تو وہ خوف کے مارے شہر چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ ۱۴ اگست کو مرہٹوں کی فوج پہنچ گئی۔ انھوں نے لوگوں کو تسلی و تشفی دی اور یقین دلایا کہ ان کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہ ہوگی۔ اب شہر کا کاروبار پھر سے جاری ہوا۔ مرہٹوں نے قلعہ کی ناکہ بندی کی۔ اور غوث گڑھ کو جانے والا راستہ بالکل روک لیا۔

اسمٰعیل بیگ یہ دیکھ کر کہ اب مرہٹے آگئے ہیں ان کے سردار ماناخاں کے پاس پہنچا اور عذر معذرت پیش کرنے کے بہانے سے نکل گیا۔ قلعے کے اندر پھر حالات بگڑے۔ روہیلہ سپاہیوں نے لوٹ کھسوٹ سے اپنا حصہ مانگا۔ اس کے ساتھ ہی سامان رسد بھی ختم ہو گیا۔ غلام قادر گھبرایا۔ اس نے بارود کو آگ لگائی اور خود میرٹھ بھاگ گیا۔

شاہ عالم نے ان حالات میں جس قدر صبر و استقلال کا ثبوت دیا، اس کا عشر عشیر بھی اگر میدان جنگ میں دکھاتا تو اسے یہ بُرا دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ اس نے اس واقعہ کے بارے میں ایک بڑی دردناک نظم لکھی جس کا ایک ایک لفظ درد میں ڈوبا ہوا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بوڑھا شاہ عالم اپنے انصار و اعوان کی طرف فریاد کا ہاتھ بڑھا بڑھا کر انھیں پکارتا ہے اور اپنی مدد کے لیے بلاتا ہے۔ اس کی یہ دردانگیز شاعری زندہ جادو ثابت ہوئی۔ مرہٹے سب سے پہلے اس کی مدد کو پہنچے اور اسے کنج قفس سے نکال کر تخت شاہی پر بٹھایا۔ یہ نظم بڑی مؤثر اور شاہ عالم کی زبوں حالی کا بہترین نمونہ ہے۔ وہ کہتا ہے ؎

صرصر حادثہ برخاست پئے خواری ما ‏ ‏ ‏ داد بر باد سر و برگ جہانداری ما
آفتاب فلک رفعت شاہی بودم ‏ ‏ ‏ بود در شام زوال آہ سیہ کاری ما
چشم ما کندہ شد از جور فلک بہتر شد ‏ ‏ ‏ کہ نہ بینیم کہ کند غیر جہانداری ما
داد افغان بچہ شوکت شاہی بر باد ‏ ‏ ‏ کیست جز ذات خدائے کہ کند یاری ما
کردہ بودیم گناہے کہ سزایش این بود ‏ ‏ ‏ ہست امید کہ بخشند گنہگاری ما
گردسی سال نظارت کہ مراد او بباد ‏ ‏ ‏ زود تر یافت تلافی ستمگاری ما
نازنیناں پری چہرہ کہ ہمدم بودند ‏ ‏ ‏ نیست جز محل مبارک بہ پرستاری ما
حق طفلاں کہ ز سی سال فراہم کردند ‏ ‏ ‏ کردہ تاراج نمودند سبکساری ما
عہد و پیماں بمیاں دادہ نمودند دغا ‏ ‏ ‏ مغلیاں خوب نمودند وفاداری ما
شیر دادیم بہ افعی بچہ و پروردیم ‏ ‏ ‏ عاقبت گشت مجز پئے خونخواری ما
قوم افغان و مغلیہ ہمہ بازی رفتند ‏ ‏ ‏ بسکہ گشتند مجز بہ گرفتاری ما
آں گدا زادہ تیمداں کہ بدو زنج برشو ‏ ‏ ‏ بانئے جور و ستم شد بدل افگاری ما
گل محمد کہ ز مرداں بشرارت کم نیست ‏ ‏ ‏ چہ قدر کردہ وکالت بہ گرفتاری ما
ہم الہ یار و سلیمان و بدل بیگ مبین ‏ ‏ ‏ ہر سہ بستند کمر بر دل آزاری ما
شاہ تیمور کہ دارد سر نسبت با من ‏ ‏ ‏ زود باشد کہ بیاید بہ مددگاری ما
مادھو جی سیندھیا فرزند جگر بند من ‏ ‏ ‏ ہست مصروف تلافی ستمگاری ما
راجہ و راؤ زمیندار امیر و چہ فقیر ‏ ‏ ‏ حیف باشد کہ نسازند بہ غمخواری ما
حال ما گشتہ بتر ہمچو اماماں ز یزید ‏ ‏ ‏ کرد تقدیر ازل روزی ما خواری ما
بود جانکاہ زر و مال جہاں ہمچو مرض ‏ ‏ ‏ دفع از فضل الٰہی شدہ بیماری ما

آصف الدوله واگریزکه دو سه زمن ماند   چه عجب گر بنماید مددگاری ما

آفتاب از فلک امروز تب بی زدی

باز فردو بده ایزد سر و سرداری ما

شاہ عالم شاعر تھا۔ فارسی، اردو اور ہندی میں شعر کہتا تھا۔ اس کے ہندی کلام کا مجموعہ نادراتِ شاہی کے نام سے چھپ چکا ہے۔ اردو اور فارسی کا کلام ابھی تک گوشۂ گمنامی میں پڑا ہے۔ اگر وہ چھپ جائے تو اس زمانے کے واقعات، حوادث اور ثقافت و معاشرت کے بعض گوشوں کو بے نقاب کرنے کے علاوہ تیموریوں کی ادبی تاریخ میں ایک بہت بڑا اضافہ ہوگا جس سے اس خاندان کی ادبی روایات میں ایک تسلسل قائم ہو جائے گا۔

شاہ عالم نے جس طرح زندگی کے دن گزارے، شہزادگی سے لے کر بادشاہت تک اس نے بڑے بڑے انقلاب دیکھے۔ اپنوں کی بے وفائیاں، اغیار کی فریب کاریاں، جلاوطنی کی مصیبت اور قلعہ میں شاہی اسیر کی حیثیت سے قدم قدم پر انسانی فطرت کے نت نئے رنگوں کا منکشف ہونا، مصائب و آلام کا ہجوم کر کے آنا، ایسے واقعات ہیں جو شاعر کو صحیح معنوں میں شاعر بنا دیتے ہیں۔ اس کے کلام میں سوز و گداز اور خلوص پیدا کر دیتے ہیں اور شعر حقیقی معنوں میں شعر بن جاتا ہے جو زبان سے نکلتے ہی دل میں اتر جاتا ہے۔

شاہ عالم کی آنکھوں کا مرثیہ بھی اسی کی ایک کڑی ہے جو بڑی مؤثر ہے۔ جس نے اسے پڑھا وہ اس سے اثر پذیر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اگر شاہ عالم کا اور کوئی کلام باقی نہ رہتا تو فقط یہی نظم اس کے نام کو ہمیشہ کے لیے زندہ رکھ سکتی تھی۔ جدید ادب میں جس قسم کی شاعری پر زور دیا جاتا ہے شاہ عالم کی نظم اس کی ایک اعلیٰ مثال ہے۔ اس میں نہ مبالغہ ہے نہ جھوٹ۔ سیدھے سادے واقعات سیدھے سادے انداز میں بیان کر دیے گئے ہیں۔ لفظ لفظ میں جو درد بھرا ہوا ہے جو ہر صاحبِ دل کو تڑپنے اور سننے والوں کے دل و دماغ کو مسخر کر لیتا ہے۔

مورخوں نے اس دردناک واقعہ کو خوب بڑھا چڑھا کر لکھا ہے۔ حالانکہ یہ بھی اسی قسم کا واقعہ ہے جس قسم کے کئی واقعات پہلے ہو چکے ہیں، البتہ ایک بات جو اسے دوسروں سے مختلف بناتی ہے، وہ مغل بیگمات کی بے حرمتی اور ایذا رسانی ہے۔ اس سے پہلے تاریخ میں بیگمات کی بے حرمتی کا کوئی واقعہ نہیں ملتا۔ تیموریوں نے اپنی رعایا نوازی اور عدل گستری کے باعث لوگوں کے دلوں میں خاص عزت و وقار پیدا کر لیا تھا۔ رعایا انھیں بمنزلہ سرپرست اور ماں باپ کے سمجھتی تھی اور وہ رعایا کو بمنزلہ اولاد خیال کرتے تھے۔ بادشاہ ان کے دکھ درد میں شریک ہوتے اور ان کی خوشی میں خوش ہوتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ ان کی حکومت دلوں پر تھی، لوگ انھیں اپنے سے الگ نہ سمجھتے تھے، وحشی سے وحشی اور مہذب سے مہذب انسان مغل حرم کی دل سے عزت کرتا اور کوئی ایسی حرکت نہ کرتا جس سے ان کے وقار میں فرق آئے یا عزت و آبرو پر حرف آئے۔ چنانچہ ہم ذیل میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک سول افسر کے سفرنامے سے ایک واقعہ نقل کرتے ہیں جس سے اس خیال کی پورے طور پر تائید ہو جاتی ہے۔ اس افسر کا نام تھامس ٹوئننگ (THOMAS TWINING.) تھا۔ اس نے اس دلدوز واقعہ کے چھ برس بعد دہلی کا سفر اختیار کیا۔ یہ سفر اس نے نجی طور پر کیا تھا۔ جب وہ دہلی سے واپس ہوا تو اس کے ساتھ بیس کے قریب سپاہی تھے جو اس کی حفاظت اور رہنمائی کر رہے تھے۔ دورانِ سفر میں جب وہ ایک شہر پہنچا تو اسے بتلایا گیا کہ گوجر ڈاکوؤں کی ایک بہت بڑی جماعت جس میں دو ہزار کے قریب آدمی ہیں اس پر چھاپہ مارنے والی ہے۔ تھامس کے قول کے بموجب گوجر بڑے بہادر، خونخوار اور دلیر ڈاکو

تھے۔ یہ خبر سن کر اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ پالکی سے پیچھے ہٹ جائیں اور جب ڈاکو نزدیک آ پہنچیں تو بلند آواز سے کہیں کہ بادشاہ کے حرم کی بی بی ہے۔ اس نعرے نے جادو کا اثر کیا۔ ان میں سے ہر ایک نے جھک کر پالکی کو سلام کیا اور چپ چاپ واپس چلے گئے۔

(TRAVEL IN INDIA . PAGE 264)

جب وحشی، خونخوار اور سفاک ڈاکوؤں کے دل میں شاہی بیگمات کی یہ عزت تھی تو مہذب لوگوں کا اندازہ آپ خود ہی لگا سکتے ہیں۔ ایک بات اور قابل ذکر ہے کہ جتنا ظلم شاہ عالم پر سختیاں ہوتی رہیں۔ اس کی زبان پر بیگمات کا نام نہ آیا مگر شہامت اس نے کسی موقعہ پر بھی شکوہ و شکایت، آہ و زاری اور فریاد نہیں کی۔ یہ صبر اور تحمل کی بڑی اچھی صورت ہے۔ مگر اس سے صاف ظاہر ہے کہ اگر اس میں جرأت اور شجاعت کے جوہر بھی ہوتے تو شاید مغلیوں کے بچے ہوئے چند سال آجاتے اور اس کا خاتمہ اتنی جلدی نہ ہوتا۔

اُردو کا ایک اچھوتا ناول "نشتر"

سید مبارز الدین رفعت

ہمارے ایسے بزرگ جنھوں نے اپنی جوانی کے دنوں میں پنڈت رتن ناتھ سرشار، حکیم محمد علی اور منشی سجاد حسین ایڈیٹر اودھ پنچ کے ناول مزے لے لے کر پڑھے تھے اب آہستہ آہستہ اللہ کو پیارے ہوتے جا رہے ہیں۔ اس نسل کے کسی بزرگ کی موجودگی میں کبھی ناول کا ذکر چھڑ جائے تو بے اختیار ہو کر آپ سے پوچھ بیٹھیں گے۔ "میاں! ناول نشتر بھی پڑھا ہے؟" آپ جواب دیں گے کہ اس نام کا کوئی ناول آپ کی نظر سے نہیں گزرا۔ اس پر وہ بزرگ حیرت اور افسوس کا اظہار کرتے ہوئے فرمائیں گے کہ ناول نشتر نہیں پڑھا تو آپ نے کچھ بھی نہیں پڑھا۔ ایسے ہی بزرگوں میں ایک ہمارے ادیب شہیر حضرت نیاز فتح پوری بھی ہیں۔ مثنوی زہر عشق کا جو خوبصورت اڈیشن مجنوں گورکھپوری نے شائع کیا تھا اس کے دیباچہ "عذر لنگ" میں فرماتے ہیں: "یوں تو اپنی زندگی میں خدا معلوم کتنی بار رو چکا ہوں لیکن بعض اشک باریاں ایسی ہیں جن کی تفصیل مجھے اب بھی یاد ہے اور شاید ہمیشہ یاد رہے۔ سب سے آخر میں اس وقت جب میں نے ایک نظم "مجرم وفا" کے عنوان سے لکھی تھی...... اس سے قبل جب ناول نشتر میری نگاہ سے گزرا اور اس سے بھی پہلے عنفوان شباب میں اس وقت جب اول اول مثنوی زہر عشق کا مطالعہ میں نے کیا۔"

میں نے آج سے کوئی دس پندرہ سال پہلے یہ ناول پڑھا تھا۔ اب گلبرگہ میں جہاں یہ کتاب لکھی گئی تھی، پھر ایک بار یہ کتاب مجھے پڑھنے کے لیے مل گئی۔ اس وقت میرے سامنے نشتر کا وہ اڈیشن ہے جو مطبع نولکشور لکھنؤ سے آٹھویں بار ۱۹۲۰ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون اس کتاب کی "دوسری خواندگی" کا نتیجہ ہے۔

ناول نشتر کے مصنف منشی سجاد حسین انجم کسمنڈوی کے ساتھ تاریخ ادب اردو نے بڑی ناانصافی سے کام لیا ہے۔ وہ نشتر کے سوا کئی اور کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ ان کی ایک کتاب "کائنات" ہے جو اس وقت بہت کمیاب ہے۔ ان کی دوسری تصنیف "بگلا بھگت"

ؔ مولانا عبدالماجد دریابادی کے قول کے مطابق اس کتاب کا پہلا اڈیشن مطبع آفتاب ہند محلہ کچہری گھاٹ آگرہ سے سنہ ۱۹[illegible]ء میں شائع ہوا تھا۔ راقم الحروف کی نظر سے اس کا دوسرا اڈیشن گزرا ہے جو محمد شمس الدین خاں اکبر آبادی کے اہتمام سے ان کے مطبع شمس المطابع افضل گنج حیدرآباد دکن سے ۱۳۴۱ف (م ۱۹۲۲ء) میں شائع ہوا تھا۔ کتاب کے عنوان سے دھوکا ہوتا ہے شاید یہ کتاب فلکیات کے موضوع پر لکھی گئی ہے۔ لیکن اصل میں یہ انسانی زندگی کی رمزی یا تمثالی داستان ہے۔ اس کو پڑھ کر مشہور انگریز مصنف بنین کی کتاب "پلگرمس پراگریس"

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

گلاب ہی تھیں غالباً ناپید ہے اور اس کے بارے میں تفصیلات کا علم نہیں ہو سکا ۔ ان کی سب سے مشہور تصنیف "حیاتِ شیخ چلی" ہے جس سے اردو کے ابتدائی دور کے اتنے اچھے ناول نشتر اور حیاتِ شیخ چلی جیسی زعفران زار کتاب کے مصنف ہونے کے باوجود بھی ان کتابوں کے مصنف کو اردو ادب کی تاریخ میں جگہ نہ مل سکی ۔ مرزا محمد عسکری نے تاریخ ادبِ اردو میں، عبدالباری آسی نے تذکرۂ حمید گل میں اور آغا محمد باقر نے اپنی تاریخ نظم و نثر اردو میں ان کی کتاب "حیاتِ شیخ چلی" کا ذکر کیا ہے لیکن اسے ان کے ہمنام اور ہم عصر اڈیٹر اودھ پنچ منشی سجاد حسین سے منسوب کر دیا ہے حالانکہ اودھ پنچ کے نامور اڈیٹر منشی سجاد حسین نہ تو انجم تخلص کرتے تھے اور نہ وہ کسمنڈوی تھے۔ منشی سجاد حسین نے بھی طلسمی فانوس، حاجی بغلول اور طرحدار لونڈی جیسے ناول لکھے ہیں۔ غالباً ناول نگاری اور پھر ہمنامی کی وجہ سے سجاد حسین کسمنڈوی کی یہ تصنیف ان کے مشہور ہمعصر سے منسوب ہو گئی ۔

ناول نشتر سے صاحبِ نشتر کے سوانح حیات پر کچھ بھی روشنی نہیں پڑتی۔ اس کتاب سے بس اتنا ہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسمنڈہ (اتر پردیش) کے رہنے والے تھے۔ پھر کسی طرح انھیں ریاست حیدر آباد میں سرکاری ملازمت مل گئی تھی۔ دفتر مال میں منشی گیری کی خدمت پر مامور رہے اور رہتے رہتے گلبرگہ میں تعینات ہوئے۔ گلبرگہ ہی میں وہ ۵ رمضان ۱۳۱۱ھ کو نشتر کی تالیف سے فارغ ہوئے۔ اس کتاب کو انھوں نے اپنے محکمہ کے ایک افسرِ اعلیٰ محمد اکرام الدین خاں کے نام معنون کیا ہے جو پہلے گلبرگہ کے اول تعلقدار تھے اور نشتر کی تالیف کے وقت ایل گندل کی تعلقداری پر چلے گئے تھے۔ گلبرگہ کی مشہور "اکرام ۔ اسٹریٹ" آج بھی اس علم دوست اور فیض رساں عہدہ دار کی یاد تازہ کر رہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے اکرام الدین خاں صاحبِ ذوق عہدہ دار تھے۔ منشی سجاد حسین نے یہ کتاب ان کے صاحبِ ذوق ہونے کی وجہ سے ہی ان کے نام معنون کی ہے۔ افسری اور ماتحتی کے تعلق سے جو سطریں "پیش کش" کے عنوان کے تحت لکھی گئی ہیں۔ "یہ حقیر ترجمہ عالی جناب مولوی محمد اکرام الدین خاں صاحب بہادر اول تعلقدار ایل گندل ریاست حضور نظام دکن دام اقبالہ کے نام نامی کے ساتھ معنون کیا جاتا ہے۔ صرف جناب کی خالص عنایت اور محبت کے صلے میں اور نہ خوشامد کے واسطے بلکہ ہی او بچے اپنے نام مجھ کو باز ہیں۔"

رسالہ آج کل (دہلی) بابت ۱۵ / جون ۱۹۴۹ء میں جناب مشیر علی صدیقی نے "اردو کا ایک گم نام مصنف ——— منشی سجاد حسین انجم کسمنڈوی" کے عنوان کے تحت صاحبِ نشتر پر ایک فاضلانہ مقالہ سپردِ قلم فرمایا ہے مگر اس کی ادبی قدر و قیمت سے متعلق

(حاشیہ صفحہ سابق) یاد آ جاتی ہے یہ کتاب ادبی خوبیوں کے ساتھ ساتھ بڑے گہرے مذہبی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اس کا رنگ مصنف کی دوسری کتابوں سے بالکل ہی الگ ہے۔ اس کتاب میں خالق و مخلوق (خدا اور بندے) کے آپس کے تعلقات کی نوعیت، زندگی کی مختلف منزلوں کی کیفیت اور آخر میں روزِ حساب کا نقشہ نیم شاعرانہ، نیم فلسفیانہ اور نیم صوفیانہ انداز میں بیان کیا ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) ۱؎ اس کتاب کا دوسرا اڈیشن راقم نے دیکھا تھا۔ ۱۹۲۴ء کا چھپا ہوا تھا۔ اس کی ابتدا میں ایک مزاحیہ دیباچہ ہے اور آخر میں خود مصنف کا یہ قطعۂ تاریخ درج ہے ؎

چھپے ہیں قہقہے جو شوخیاں ہیں ہر طرف ——— ہے جو ہے سو فی المثل فرخندگی خندہ گی
سال تاریخش جو ہے گا ہاتف غیبی بگفت ——— شیخ چلی آ گئے دنیا میں با سنجیدگی

ناانصافی سے کام لیا۔ منشی سجاد حسین کے حالاتِ زندگی کے لیے صدیقی صاحب نے مجلا اور رنگوں کے ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی سے بھی استفسار کیا تھا۔ منشی صاحب سے وہ ذاتی طور پر واقف تھے۔ جواب میں ڈاکٹر صاحب نے انھیں لکھا تھا۔

"منشی سجاد حسین انجم ۱۹۰۲ء یا ۱۹۰۳ء میں بیمار پڑے۔ ملازمت سے رخصت لے کر لکھنؤ آئے اور کچھ مہینے بعد انتقال کر گئے۔ سنتالیس چھیالیس کے قریب عمر پائی تھی۔ پتلے معمولی قد و قامت کے آدمی تھے۔ سانولی رنگت، ستواں ناک، ہونٹ پتلے، داڑھی خشخشی منہ سے کدورت نمایاں، مزاج میں تمکنت تھی۔ مرزایانہ بسر کرتے اور مالی مشکلوں کا سامنا کیا کرنا۔ بصورت حال دار تو دیکھ کر بہت خفا ہوتے تھے۔ صورت یا وضع قطع سے مذہبیت نہ ظاہر ہوتی تھی مگر تھے مذہبی آدمی۔ نماز روزے کے بہت سختی سے پابند تھے۔ مولانا عبدالوہاب لکھنوی (یعنی علی برادران مولانا محمد علی و مولانا شوکت علی کے مشہور پیر مولوی عبدالباری فرنگی محلی کے والد ماجد) سے بیعت تھی اور مرشد سے والہانہ اور گہری عقیدت۔ خدا بخشے۔"

منشی سجاد حسین اودھ پنچ لکھنؤ کے ابتدائی دور کے نامہ نگار بھی رہے تھے۔ وہ شاعر بھی تھے انجم تخلص کرتے تھے۔ ان کی ایک نیچرل نظم اخبار اودھ پنچ میں شائع ہوئی تھی۔ لوگوں کو اپنے اشعار بہت کم سناتے تھے۔ ناول نشتر میں بھی انھوں نے دو ایک جگہ حسبِ حال اپنے اشعار نقل کر دیے ہیں۔ جرأت اور رنگین کے رنگ کی وہی جوبن اور انگیا والی شاعری ہے۔ ایک جگہ پوری ایک غزل نقل کر دی ہے۔ اس سے ان کی شاعری کا ایک سرسری اندازہ لگایا جا سکتا ہے ؎

بہاروں پہ ہے حسنِ زیبا کسی کا — اٹھانوں پہ ہے جوبن آیا کسی کا
جو سینے سے ڈھلکا دوپٹہ کسی کا — مسل ڈالا ظالم کلیجہ کسی کا
اسے چھپا پامال اس کو کیب — مچاتے ہے اندھیر سرمہ کسی کا
غضب دخترِ رز آج نکھری ہے ساقی — تماشہ ہے ٹوٹے جو تقویٰ کسی کا
وہ بیٹھ کی تقدیر ہیکل کی قسمت — کہ ہاتھ آگیا جوبن ابھرا کسی کا
سرِ طور کیا خاک باقی ہے موسیٰ — ادھر آؤ دکھلائیں جلوہ کسی کا
چلو ہم بھی پوچھیں مزاج مبارک — سرِ طور انجم ہے جلوہ کسی کا

اپنی غزل نقل کرنے کے بعد خود ہی حاشیے میں یہ لکھ گئے ہیں: "ناظرین ہنس پڑیں گے کہ یہ بے وقت کی راگنی کیسی۔ مگر اپنے لختِ جگر سب کو اچھے معلوم ہوتے ہیں، ٹوکنے کی بات نہیں!"

نشتر منشی سجاد حسین انجم کسمنڈوی کی پہلی تصنیف ہے۔ اصل میں یہ سید حسن شاہ نامی لکھنؤ کے کسی صاحب کی خود نوشت داستانِ معاشقہ کا فارسی سے اردو میں ترجمہ ہے۔ سید حسن شاہ کی اس فارسی تصنیف کا اب کہیں پتہ نہیں چلتا۔ معلوم نہیں اس فارسی داستان کا قلمی نسخہ کہاں سے منشی صاحب کے ہاتھ لگا تھا۔ اب چونکہ اصل فارسی کتاب ہماری دسترس میں نہیں ہے اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ منشی صاحب نے

کس حد تک اس میں اپنی طرف سے حک و اضافہ کیا ہے۔ اتنا تو یقینی معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اکثر اردو اشعار منشی صاحب نے اپنی طرف سے بڑھائے ہیں۔ ناول میں جگہ جگہ منشی صاحب نے مترجم کی حیثیت سے حاشیے بھی لکھے ہیں۔ کہیں لکھا ہے: "میں نے اصل فارسی عبارت ہی نقل کر دی ہے، ترجمہ میں اس کا لطف کہاں"۔ کہیں لکھا ہے: "یہاں حسن شاہ نے بہت سے فارسی شعر لکھے تھے، وہ سب میں نے حذف کر دیئے ہیں"۔ کہیں ہیروئن نے حسن لطیف انداز میں ہیرو کو بنایا ہے اس کی داد دی ہے، کہیں ہیرو کی حماقت پر طنز کیا ہے۔ ایک حاشیے میں تو یہاں تک لکھا ہے کہ "زنان ازبان کو میں نے بہت سنبھالا ہے ورنہ مصنف نے اس زمانے کی تہذیب کا کچھ خیال نہ کیا تھا"۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ داستان کا ڈھانچہ تو منشی صاحب نے سید حسن شاہ سے لیا ہے لیکن اس کو اپنے دلکش انداز میں ڈھال کر بیان کیا ہے، نرا ترجمہ ہی نہیں کیا ہے۔

منشی صاحب نے کتاب کی ابتدا میں "التماس مترجم" کے عنوان سے چار سطروں کا ایک مقدمہ لکھا ہے۔ اس میں فرماتے ہیں: "...... ایک فارسی قصے کا ترجمہ ہدیۂ ناظرین ہے۔ اس کتاب کے مفصل حالات کے واسطے ایک مستقل دیباچہ درکار تھا مگر نہ میں بالفعل لکھ سکتا ہوں اور نہ امید ہے کہ میرے مدنظر کی تکمیل کی جائے گی ...... مختصر یہ ہے کہ اصل کتاب سیدھی سادی فارسی ہندی آمیز زبان میں قلمی میرے پاس موجود ہے۔ سال تصنیف ۱۲۰۵ھ اور سال کتابت ۱۲۱۵ھ۔ شریف مصنف نے اپنے عشق و محبت کا واقعہ نہایت سادہ الفاظ و عبارت میں لکھا ہے۔ تکلف اور تصنع غالباً بہت ہی کم اور سچا واقعہ ہے اس لیے دیکھنے والے واقعی کلیجہ تھام لیتے ہیں ......"

اٹھارویں صدی کے آخری دن ہیں اور یہی آپ کا ملک ہندوستان جنت نشان ہے۔ شہنشاہ اورنگ زیب کی وفات کے بعد سے لگ بھگ ایک سو سال کی مسلسل خانہ جنگی، افراتفری، مرہٹوں کی لوٹ، نادر گردی اور ابدالی کی مار سے مرکزی حکومت مغلیہ چور چور اور نڈھال ہو کر سسکتی ہوئی اپنی آخری گھڑیوں کا انتظار کر رہی ہے۔ ملک میں سات سمندر پار سے آئے ہوئے بدیسی صاحبوں کے اقبال کا آفتاب طلوع ہو چکا ہے۔ شمال میں، جنوب میں، مشرق میں، مغرب میں ہر سمت انہی کا بول بالا ہے۔ کیا مدراس، کیا بنگال، کیا گجرات اور کیا پنجاب، ملک کے سبھی حصے ان کے حلقۂ اقتدار میں آتے چلے جا رہے ہیں۔ ملک میں جگہ جگہ ان کی فوجی چھاؤنیاں قائم اور ہر جگہ ان کے انتظامی افسر متعین ہوتے جا رہے ہیں۔ ادھر ہم آپس کے بغض و عناد، رشک و حسد، کینہ اور بغض میں مبتلا ایک دوسرے کے سر پھٹول میں مشغول ہیں۔ سازشوں اور ریشہ دوانیوں کے سلسلے ہیں کہ جاری ہیں۔ صدیوں کی عیاشی نے سخت کوشی کی جگہ سہل جوئی کا راستہ سجھا دیا ہے۔ نو واردوں کے بقول: "چلے میں شمشیر و سناں چھین گئی تو طاؤس و رباب ہی کے دامن میں پناہ ڈھونڈی جا رہی ہے"۔ ہندوستان میں مشرقی تمدن کا چراغ بجھنے سے پہلے اپنی پوری تابناکی کے ساتھ بھڑک رہا ہے۔ کام و دہن کی لذتوں، گوش و بصر کی مسرتوں اور ہر طرح کی حسی لذتوں کے وہ وہ سامان ہو رہے ہیں کہ بس فکر و عمل کی ساری صلاحیتیں ان ہی کے لیے وقف ہو کر رہ گئی ہیں۔ بدیسی نے فکرِ سیاست سے فراغت دے دی تو ساری سوجھ بوجھ، ساری دانائی، فراست صرف ہونے لگی بناؤ سنگھار میں، آداب میں، اطوار میں، اٹھنے میں، بیٹھنے میں، کھانے میں، پینے میں، اوڑھنے میں، بچھونے میں، غرض زندگی کے ہر فعل و عمل میں تکلف ہی تکلف برتتے ہیں۔ ارباب نشاط کے طائفے کو پروان چڑھنے کے لیے اس سے اچھے مواقع کہاں ملتے ہیں۔ ان دنوں ہندوستان میں اس نے اپنا کاروبار خوب ہی پھیلایا

اور یہ خوب ہی پھلا پھولا۔

کہتے ہیں جب کسی قوم پر سیاسی حیثیت سے زوال آنے لگتا ہے تو اس کے تمدن میں اتنی ہی نفاست اور شائستگی آنے لگتی ہے۔ تمدن کے انتہائی عروج کے دنوں میں فحاشی بھی ایک آرٹ بن جاتی ہے۔ طوائف ایک تہذیبی ادارہ کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ یہی حال فراعنہ کے مصر، فلسطینیوں اور دیوتاؤں کے یونانِ قدیم اور قیصروں کے رومۃ الکبریٰ کے تمدنی عروج کے دنوں کا تھا۔ یونان کے رئیس تھینس اور ہرکلز جیسے نامور فرزند سبس اور اسپاسانام کی طوائفوں کی محبت پر نازاں تھے۔ روم کے حماموں میں سب ہی ننگے تھے اور ان سے مستقل طور پر قحبہ خانوں کا کام لیا جاتا تھا۔ ان حماموں میں جانا اور رواداد عیش دینا، تہذیب و شائستگی کی علامت بھی جاتی تھی۔ اٹھارویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے دوران میں ہندوستانی طوائفوں نے بھی ناچ گانے، شعر و شاعری، مجلسی آداب، لباس کے تراش خراش اور رفتار و گفتار میں وہ کمال دکھایا کہ ہندوستانی امرا انھیں اپنی سرکار سے وابستہ کرنے لگے اور شرفا اپنے بچوں کو تہذیب و شائستگی، محفل کے اطوار اور گفتگو کے آداب سکھانے کے لیے ان کے پاس بھیجنے لگے۔ ایسی عورتوں کے ڈیرے اور کوٹھے ایک طرح کے کلب تھے جہاں گھڑی دو گھڑی کے لیے بیٹھنا خلافِ وضع نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ ایک طرح باوضع، صاحب ذوق اور صاحب مرتبہ ہونے کی دلیل بھی جاتی تھی۔ یہ جگہیں بڑی نفیس، شائستہ اور دلچسپ ہوتی تھیں۔ آج کل کی طوائفوں کے کوٹھوں کا ان سے مقابلہ کرنا ان کی توہین ہے۔

مشرقی تہذیب کی اس آخری بہار کی میں برائیوں کے ساتھ ساتھ اچھائی کے پہلو بھی آپ کو کافی مل جائیں گے۔ اودھ بریلے طوائفوں کا آج کے بازارِ حسن سے مقابلہ کیجیے تو کتنا زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ آج کے بازارِ حسن میں عشوہ طرازی اور ناز آفرینی کی کمی نہیں لیکن اس بازار میں جو جنس نایاب ہو گئی ہے وہ انسانیت اور شرافت ہے۔ کل کے گناہ کے کوچے اور آج کے گناہ کے کوچے میں بس فرق اسی کا دکھائی پڑتا ہے کہ کل کے گناہ کے کوچے کی دکانیں سجانے والیاں لاکھ ہرجائی ہوتے ہوئے بھی وفادار اور جاں نثار تھیں۔ آج جس آسانی کے ساتھ انھیں حاصل کیا جا سکتا ہے اس وقت ان کا حصول اتنا آسان نہ تھا۔ ایک عرصے کے میل جول کے بعد وہ کسی سے تعلق پیدا کرتی تھیں اور اس تعلق کو نباہ بھی دیتی تھیں اور کسی نیک بخت کو توبہ کی توفیق میسر ہو جاتی تو یہ بھی واقعہ ہے کہ اس کے بعد اس کی پوری زندگی عصمت و پاکبازی کی زندگی ہوتی تھی۔

عصرِ حاضر کے ایک فاضل مؤرخ نے بالکل سچ کہا ہے کہ "۱۸۵۷ء ہندوستان کی سیاسی اور ثقافتی تاریخ میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ قدیم و جدید کے درمیان یہی وہ منزل ہے جہاں سے ماضی کے نقوش بھی پڑھے جا سکتے ہیں اور مستقبل کے امکانات کا جائزہ بھی لیا جا سکتا ہے۔ مغلیہ سلطنت جس کے دامن میں ایک ایسی تہذیب نے پرورش پائی تھی جو رنگ و نسل اور مذہب و ملت کے سارے امتیازات سے بالاتر ہو کر ایک عرصہ تک ہندوستان کی سیاسی وحدت کی ضامن رہی تھی، یہاں پہنچ کر دم توڑ دیتی ہے اور اس کے ساتھ تاریخ کا ایک دور ختم ہو جاتا ہے۔ پرانا سماجی نظام اور پرانے نظریات وقت کے نئے تقاضوں کے سامنے سرنگوں ہو جاتے ہیں اور نئی سماجی قوتیں صرف فکر و نظر کے سانچے ہی توڑنے پر اکتفا نہیں کرتیں بلکہ زندگی کے سارے محور بدل ڈالتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء میں صرف ایک سیاسی نظام ہی کا جنازہ نہیں نکلتا بلکہ ہندی قرونِ وسطیٰ کا سارا تہذیبی سرمایہ بھی نیست و نابود ہو جاتا ہے۔"

ہندی قرونِ وسطیٰ کے سارے تہذیبی سرمایہ کا جنازہ نکلنے میں تقریباً نصف صدی لگ گئی۔ یہ ٹھیک ہے کہ کمپنی بہادر کے جو بھی

ملازم انگلستان سے ہندوستان بھیجے جا رہے تھے ان میں ابھی تک اپنی تہذیب کی برتری کا احساس نہیں جاگا اور ہندوستانی تہذیب کے ساتھ اس مفاہمت کا برتاؤ شروع نہیں ہوا جو بعد میں سوچی سمجھی پالیسی کے طور پر شروع ہوا۔ اس وقت ہندوستان کے ساحل پر قدم رکھتے ہی ان کی آنکھیں مشرقی تمدن کی آخری بھڑک سے کچھ ایسی چکا چوند ہوئیں کہ انھوں نے اپنی تہذیب اپنے رہن سہن اور ٹھاٹ باٹ کو یہیں کے یہاں کے طور طریق سے فروتر جانا۔ وہ بتدریج ہندوستان کے حاکم اور اونچے طبقے کی جگہ لیتے جا رہے تھے اس لیے لازمی طور پر انھوں نے رکھ رکھاؤ اور رہن سہن میں اسی طبقے کی ریس کی اور اسی کو اپنا نمونہ قرار دیا۔ عیش و عشرت کے جو جو ڈھنگ اس زوال پذیر طبقے نے ایجاد کر رکھے تھے ان سب کو ان نئے حاکموں نے اپنایا اور انھی کے انداز میں داد عیش دیتے رہے ان سے کسی طرح پیچھے نہ رہے۔ ہمارے اس دور میں عجب کہ ہر طرف مغربی تہذیب کی تقلید کا دور دورہ ہے اور علم و ہنر اور اخلاق کے ساتھ ساتھ حسن و عشق اور عیش و عشرت کے معیار ہی بدل گئے ہیں اور ہم اپنی رنگینیوں اور عیش پسندیوں میں روز بروز مغربی معیار کے پابند ہوتے جا رہے ہیں یہ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ کسی زمانے میں اسی مغربی تہذیب کے نمائندے اپنی تہذیب کو حقیر اور فروتر جان کر اسی مشرقی تہذیب کی پیروی پر فخر کرتے تھے جسے بعد میں ذلیل تر اور پست تر قرار دیا گیا۔

ناول "نشتر" کا قصہ کچھ ایسی ہی فضا میں شروع ہوتا ہے۔ اس کے ہیرو سید حسن شاہ جو خود اس داستان کے راوی ہیں اپنے آپ کو صحیح النسب سادات سے بتلاتے ہیں۔ ۱۱۷۱ھ میں پیدا ہوئے اور بچپن ہی میں یتیمی کا داغ اٹھایا۔ نانا نے ان کی پرورش کی اور تعلیم و تربیت دی۔ سولہ سترہ سال کی عمر میں اپنے نانا کے توسط سے جنرل کوٹ کے بھانجے مسٹر منگ ممبر کونسل کمپ کانپور کے خانگی منشی کی حیثیت سے نوکر ہو گئے۔ مسٹر منگ ایک خوش مزاج، عیش پسند اور خوش گزران فوجی افسر تھے۔ میر صاحب کی مستعدی، کارگزاری اور دیانت داری سے وہ بہت خوش ہوئے۔ رفتہ رفتہ ان کے سارے خانگی کاروبار میر صاحب کی نگرانی میں آ گئے اور وہ انھیں بہت چاہنے لگے۔

میر صاحب کو منگ صاحب کے پاس ملازم ہوئے کوئی تین چار سال ہوئے ہوں گے، ایک دن سر راہے ان کی ملاقات کشمیری زنانہ طائفے کے ڈھاڑی محمد اعظم سے ہو گئی۔ یہ شخص میر صاحب کے نانا کا شناسا تھا۔ میر صاحب کے نانا کی مزاج پرسی اور ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اس نے میر صاحب سے درخواست کی کہ میں نے ایک گویّے سے سن کر کچھ فارسی غزلیں کہی ہیں، ممنون ہوں گا اگر آپ میرے خیمہ پر چل کر ان کو درست فرما دیں۔ میر صاحب محمد اعظم کے خیمے پر پہنچے تو یہاں پورے طائفے کے اراکین سے ان کا تعارف ہوا۔ ان میں تیرہ چودہ سال کی ایک نہایت درجہ حسین لڑکی بھی تھی۔ پہلی ہی ملاقات میں میر صاحب اپنا نقد دل اسے نذر کر بیٹھے۔ طائفے اور خاص کر اس لڑکی کے حالات کی جستجو ہوئی تو معلوم ہوا کہ اس طائفے کا سربراہ کشمیری اعظم جی ہے پہلے تجارت کا پیشہ کرتا تھا اس میں زبردست نقصان ہوا اور دیوالہ نکل گیا تو اس کی داشتہ چنچل جان نے جو قوم کی کسبی تھی ایک طائفہ قائم کر کے ہندوستان کا رخ کیا۔ اس طائفے میں میرزائی نامی ایک عورت ہے جس کی حیثیت نائکہ کی سی ہے۔ ایک عورت گلبدن ہے اور ایک عورت بی جان ہے ان ہی کی کمائی پر طائفے کا گزر ہے۔ کانپور میں مقیم فوج کے کمانڈنگ آفیسر کلی صاحب کی سرکار میں یہ کشمیری طائفہ ملازم ہے اور وہ جو چودہ سال کی لڑکی ہے اس کی داستان حیات بھی دلچسپ ہے۔ چنچل جان کی ایک بیٹی صاحب جان اس کے کسی پہلے شوہر سے تھی صاحب جان کو ایک پٹھان سوار نے نوکر رکھ لیا اور اس کی مرضی کے خلاف اس سے نکاح کر لیا۔ اس سے یہ لڑکی پیدا ہوئی۔ اس کا نام خانم جان رکھا گیا۔ چند روز بعد پٹھان سوار مر گیا اور صاحب جان اپنی بچی کو لے کر اپنی ماں کے پاس بھاگ آئی اور کچھ دنوں بعد مر گئی۔ اعظم جی کی نوکرانی

اولاد نہ تھی ۔ ۱۲ ، ۱۳ سال کی لڑکی کو اس نے اپنی بچی بنا لیا اور اس کی تعلیم و تربیت کا بڑا اہتمام کیا۔ مرزائی کو بھی اس لڑکی سے بہت محبت ہے اور وہ بھی اسے اپنی بچی کی طرح چاہتی ہے ۔ اعظم جی کو اس کا ناچنا گانا پسند نہ تھا لیکن اس کی نانی نائکہ تھی، اس نے اعظم جی کی بات نہ مانی اور اس کو رقص و سرود کی تعلیم دلائی، اس کے باوجود اعظم جی کا خیال ہے کہ کسی شریف آدمی سے اس لڑکی کی شادی کر دی جائے کئی انگریزوں نے اس کی خواہش کی لیکن اعظم جی اور مرزائی نے قبول نہ کیا، ابھی تک وہ پاک دامن اور عفت مآب ہی ہے ۔

میر صاحب پہلی ہی ملاقات میں اپنا نقدِ دل ہار چکے تھے، کچھ ایسے لٹے کھوئے اور بدحواس ہوئے کہ ملا نفضے کے اور لوگوں نے سمجھا کہ میر صاحب پہلے ہی سے دل باختہ ہیں لیکن دل را بہ دل راہ است ، خانم جان کم عمر سہی لیکن طوائف زادی تھی ، اس کے اطراف ماحول ہی کچھ ایسا تھا کہ تیوری سے اندازہ لگا سکتی تھی کہ حضرت کا کیا حال ہے ۔ سید حسن شاہ خود بھی خوش رو تھے ، نوجوان تھے ، بیس اکیس سال سے زیادہ ان کی عمر نہ تھی ۔ پہلی ہی ملاقات میں خانم جان نے بھی میر صاحب کے لیے اپنے دل میں جگہ پائی اور یک گونہ کشش اس نے بھی میر صاحب کی طرف محسوس کی ۔

اب میر صاحب کسی نہ کسی بہانے اعظم جی کے یہاں آنے جانے لگے ۔ خانم جان سے ان کی دوسری مڈبھیڑ اس وقت ہوئی جب کہ اعظم جی کے یہاں خانم جان کی سالگرہ کا جشن ہو رہا تھا ۔ میر صاحب کو بھی اس جشن میں شرکت پر مجبور کیا گیا ۔ کھانے کے بعد میر صاحب نے گانے کی فرمائش کی، تو چونکہ بھی فارسی ادب میں طاق تھی، خانم جان نے کچھ برمحل شعر گائے، ان میں سے ایک غزل تھی ؎

آنچہ رحم از دل بَرَد از تاثیر فریادِ من است   وانکہ نسیاں آورد خاصیتِ یادِ من است

آں شکارم من کہ ہم لائق بہ کشتن نیستم   شرم می آید مرا زانکس کہ صیادِ من است

یہ اشعار سن کر میر صاحب حیران رہ گئے کہ پروردگار کس نے اس کے کان میں کہہ دیا کہ میں تم پر مرتا ہوں ۔ اس کے بعد پھر گانے کا رنگ جما تو میر صاحب کا دل بھر آیا اور کلیجہ امڈنے لگا ، بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور ہچکیاں بندھ گئیں ۔ اس کے بعد اس سخن سنج اور سخن فہم نے خواجہ حافظ کی یہ غزل چھیڑ دی ؎

یا رب آں شمعِ شب افروز زِ کاشانۂ کیست   جانِ ما سوخت نپرسید کہ جانانۂ کیست

حالیا خانہ بر اندازِ دل و دینِ من است   تا ہم آغوش کہ می باشد و ہم خانۂ کیست

اس شعر کو مکرر سہ کرر گایا ؎

یا رب ایں شاہ وش و ماہ رخ و زہرہ جبیں

دُرِ یکتائے کہ و گوہرِ یک دانۂ کیست

اس غزل سے عالم ہی اور ہو گیا ، سب کی حالت متغیر تھی اور وہ شکر سر جھکائے جس طرح گا رہی تھی ہرگز نہیں اٹھاتی تھی اور چند غزلیں گانے کے بعد اس نے یہ شعر گائے ؎

در عینِ سینۂ من زخمِ بے نشاں زدۂ   بحیرتم کہ عجب تیرِ بے کماں زدۂ

کجا روم بہ کہ گویم وچہ چارہ کنم   کہ تیرِ عشق مرا در درونِ جاں زدۂ

یہ شعر گاتے ہوئے اس نے کنکھیوں سے میر صاحب کی طرف دیکھ کر مسکرائی اور زیرِ لب کچھ کہا اور میر صاحب تڑپ کر رہ گئے ۔

اس دوسری ملاقات کے بعد میر صاحب کو یقین ہو گیا کہ جس پردہ فدا ہیں اس کے دل میں بھی ان کے لیے جگہ موجود ہے۔ میر صاحب کی اس دلگرفتاری پر ابھی کچھ زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ محمد اعظم نے راستے میں مل کر میر صاحب کو یہ خبر وحشت اثر سنائی کہ جس انگریز کمانڈنگ آفیسر کی سرکار میں یہ طائفہ ملازم تھا اس کی بدلی لکھنؤ ہو گئی۔ اس نے طائفے کو جواب دے دیا۔ اب ہم تلاش روزگار میں ہر پیر صاحب کے پاس جا رکنا جا رہے ہیں۔ یہ سنتے ہی میر صاحب کے ہوش اڑ گئے بیٹھے پڑھتے تھے کہ اپنے والد مرحوم کی ایک بیاض میں "الحصن" "حل عقد الطرائق" نظر آگیا۔ حساب کیا تو وہی دن عمل کے واسطے معین تھا اس کو نیک شگون سمجھ کر عمل پڑھا چار روز اسی دھن میں گزرے، چوتھے دن اپنے خدمتگار کو خبر لانے کے لیے محمد اعظم کے پاس بھیجا تو وہ خود ہی سراسیمہ پریشان چلا آیا۔ سب اسے عمل عقد الطرائق کی برکت کہیے یا بخت و اتفاق معلوم ہوا کہ اسی رات گلبدن نعمت خواب کسی انگریز کے ساتھ بھاگ گئی۔ ہر چند تلاش کیا پتہ نہیں چلا۔ تمام کارخانے کا دار و مدار اسی کی کمائی پر تھا۔ اب کہاں کا سفر اور کہاں کا قیام۔ اس کے بعد میر صاحب نے کچھ ایسی چال چلی اور کچھ ایسی ترکیبیں بتائیں کہ ٹننگ صاحب جن کے پاس وہ خود منشی تھے اس طائفے کو ملازم رکھنے پر آمادہ ہو گیا۔ امتحان کے طور پر پہلا مجرا ہوا تو آپ بھی اس میں موجود تھے۔ خانم جان سے حافظ کی یہ غزل گانے کی فرمائش کی ؎

حالِ دل با تو گفتنم ہوس است · خبرِ دل شنفتنم ہوس است
طمعِ خام بیں کہ قصہ فاش · از رقیباں نہفتنم ہوس است
شبِ قدرے چنیں عزیز و شریف · با تو تا روز خفتنم ہوس است
آں کہ زر دانہ چنیں نازک · در شبِ تار سفتنم ہوس است

خانم جان نے میر صاحب کی فرمائش پر یہ غزل تو گا دی لیکن اس کے بعد حافظ ہی کی ایک غزل جوابا گا دی ؎

رسید مژدہ کہ ایامِ غم نخواہد ماند · چناں نماند و چنیں نیز ہم نخواہد ماند
غنیمتے شمر اے شمعِ وصلِ پروانہ · کہ ایں معاملہ تا صبح دم نخواہد ماند
سحر ز ہاتفِ غیبم رسید مژدہ بگوش · کہ کس ہمیشہ گرفتارِ غم نخواہد ماند

صاحب کو اس طائفے کے مردوں کا گانا اور عورتوں کا رقص و سرود بہت پسند آیا اور وہ ان کی سرکار میں ملازم رکھ لیا گیا۔ جب تک گلبدن اس طائفے میں رہی، اعظم جی اور مرزائی نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ خانم جان سے پیشہ کرائیں گے۔ وہ بھاگ گئی تو مجبوراً اس کے لیے راضی ہو گئے۔ میر صاحب نے ذکر کر کھا تھے کہ اس طائفے کو ٹننگ صاحب کے پاس نوکر رکھا دیا لیکن دل میں پیچ و تاب کھاتے رہے کہ اب خانم جان صاحب سے کیسے بچی رہے گی۔ جس دن یہ طائفہ نوکر ہوا اسی رات کو ان حرام خوروں نے معمول کے مطابق خانم جان کو بنا سنوار کر صاحب کے پاس پہنچا دیا۔ وہ چلی تو گئی لیکن جب صاحب نے دست درازی کا قصد کیا تو اس نے اودھم مچائی اور زار و قطار رونا شروع کیا جس سے صاحب کے آتے حواس غائب ہو گئے۔ آدھی رات تک یہی حالت رہی۔ آخر مرزائی کو بلا کر کہا کہ جب یہ بی بی راضی نہ تھا تو کیوں تم نے بھیجا۔ ہم کو زبردستی کے ساتھ ضرورت نہیں اور اس وقت بی جان کو بھیج دو۔ خانم جان کی جگہ بی جان بھیج دی گئی اور خانم جان کی ناموس محفوظ رہی۔

اب یہ طائفہ مستقل طور پر صاحب کے بنگلے کے احاطے ہی میں میر صاحب کی قیام گاہ کے سامنے خیمہ لگا کر رہنے لگا۔ ...جان تو مستقل طور پر صاحب کی داشتہ بن گئیں اور خانم جان بھی گانا سنانے ناچ دکھانے اور اپنی شوخ و شنگ اداؤں سے صاحب کا ...ل بہلانے کے لیے نوکر رکھ لی گئیں۔

میر صاحب اور خانم جان دونوں برابر کی آگ میں جل رہے تھے، اس قرب مکانی نے عاشقی کے باورچی کے کام بن گئے ...جم اللہ کے ذریعے پہلے زبانی پیام و سلام اور بعد میں باقاعدہ مکاتبت کی صورت پیدا کر دی۔ خیمہ کی قنات میں ایک سوراخ کر کے تانک جھانک ...ور حسب حال برمحل اور موزوں اشعار سنانے کا موقع بھی فراہم کر دیا گیا۔ جس قسم کے حالات تھے ان میں اس تعلق کا چھپانا ضروری تھا، سنگت صاحب ...تا تھے اور یہ دونوں ان کی سرکار کے ملازم، طائفہ والے حرام خور تھے اور بے درد۔ خانم جان نے انتہائی دانائی اور فراست سے یہ ...ھرنگ رچایا کہ وہ میر صاحب کو ناپسند کرتی ہے اور ان سے اسے بغض قلبی ہے۔ صاحب کی موجودگی میں وہ میر صاحب پر ایسی پھبتی ...ر کستی کرتی کہ خود صاحب بہادر کو میر صاحب کی طرفداری کرنی پڑتی اور وہ خانم جان سے کہتے کہ ہمارے منشی صاحب بہت نیک آدمی ...یں، پارسا ہیں، ایماندار ہیں، لائق ہیں، قابل ہیں، ان کے ایسے ہی صفات کی وجہ سے میں ان کا ادب ہی نہیں کرتا بلکہ ان سے ڈرتا ہوں لیکن ...بروں میں معاملہ ہی کچھ اور ہوتا۔ میر صاحب کسی دردانگیز غزل کی فرمائش کرتے، وہ خانم جان گا دیتی اور پھر اس کے جواب میں آپ ہی کوئی ...ر محل غزل چھیڑ دیتی۔ یہ راز و نیاز دونوں میں ہوتے اور اس کی کراماً کاتبین کو بھی خبر نہ ہوتی۔ کبھی کبھار چوٹ کرنے میں رنجش کی نوبت بھی آ جاتی ...امہ و پیام اور قنات کے پاس کھڑے ہو کر تانکا جھانکی سب بند ہو جاتی لیکن دوسرے کی محفلوں میں پھر ایک بار ترجمان غیب کی بہترین غزلیں ...ونوں کے دلوں کی ترجمانی بنتیں اور پھر دل صاف ہو جاتے۔

ادھر خط و کتابت بھی جاری تھی۔ سید حسن شاہ کے خطوں میں بے نکے پن سے اظہار عاشقی اور "تمنائے وصال" کے سوا اور کچھ نہ ہوتا۔ خانم جان کے خط جو بڑے سلیقے سے لکھے ہوتے ان میں یہی جواب ہوتا ہے کہ چند روز اور صبر کرو میں تمہاری ہو چکی لیکن مجھ پر اسی وقت تصرف کر سکو گے جب کہ قانونی طور پر بھی تم مجھے اپنا لو۔ حرام کاری میری فطرت سے دور ہے۔ اگر یہی مقصود ہوتا تو میں کب کی اپنے جسم کا سودا کر چکی ہوتی۔ اسی درمیان میں خانم جان نے سید حسن شاہ کی محبت کا ایک امتحان بھی لے لیا۔ اس کی نانی کی ہم جولی ہم پیشہ ایک ڈیرہ دارنڈی کی اکلوتی حسین و جمیل بیٹی تھی۔ یہ عورت جو بے حساب روپیہ کما چکی تھی چاہتی تھی کہ اپنی بیٹی کسی مرد شریف سے بیاہ دے۔ خانم جان نے ایک بہانے سے یہ لڑکی میر صاحب کو دکھا دی اور پھر انھیں لکھا کہ چاہو تو اس لڑکی سے تمہارا نکاح کرا دوں۔ میر صاحب نے جب اس سلسلہ میں صاف جواب دے دیا تو تب کہیں جا کر ان کی محبت پر اسے بھروسہ ہوا۔

اتفاق دیکھیے چند ہی دنوں بعد اس لڑکی کی مسی کی رسم ٹھہر گئی۔ اس تقریب میں شریک ہونے کے لیے پورا طائفہ تیاری کرنے لگا۔ عین تقریب کے دن خانم جان نے میر صاحب سے کہا کہ آج اپنا بنگلہ خالی رکھوا دو چار شخص مل سکیں تو بہتر ورنہ وہی آدمی تجویز کر رکھو ...ل بھر وہ جو بناؤ سنگھار اور کنگھی چوٹی میں مصروف رہی لیکن جب چلنے کا وقت آیا تو انگڑائی کھٹوائی لے لحاف اوڑھ پلنگ پر لیٹ گئی۔ مرزائی نے پوچھا تو کہا ابھی میرے سر میں شدت کا درد ہونے لگا اور اعضا شکنی سی معلوم ہوتی ہے۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے تھم گئے۔ ادھر صاحب تقریب کے پاس سے آدمی پر آدمی آنے لگے۔ مرزائی نے سب کو بھیج دیا، آپ رہ گئی لیکن خانم جان نے چار گھڑی رات گئے ہم قومی کا واسطہ دے کر اسے بھی بھیج دیا۔ اس کے جانے کے بعد وہ میر صاحب کے بنگلے میں آ گئی۔ میر صاحب نے پہلے ہی چار اجنبی

غریب مسافروں کو ٹھہرا لیا تھا اور ما حضر کھانا کھلا کر کہلا لیا تھا کہ یہاں آج ایک شخص کا نکاح ہے اس سے فراغت کرکے آپ کو رخصت کر دوں گا۔ خانم جان آگئی تو ان چار آدمیوں کے سامنے تعین دو کے بعد میر صاحب نے ایجاب و قبول کے الفاظ کہے اور انھیں کچھ دے دلا کر رخصت کر دیا۔

شب وصل جس لطف سے گزری اس کا احوال تو شیخ حسن شاہ کی زبانی سننا اور قدم بہ قدم ہر جزو کے چلتے پھرتے لفظوں میں جو محاشی کی صورت میں ہیں، اصل کتاب ہی میں پڑھنا مناسب ہوگا۔ مختصر یہ کہ میر صاحب کی ہوس رانی نے تنکے کی نازک اندام خانم جان کو شدت کے بخار میں مبتلا کر دیا اور جو ڈھونگ بیماری کا رچایا گیا تھا وہ اصل کی صورت اختیار کر گیا۔ کسی کو شبہ ہوا نہ کسی کے کانوں کان خبر ہوئی میر صاحب اور خانم جان باقاعدہ میاں بیوی بن گئے۔

عشق است و ہزار بدگمانی، تو یہ کہاں محبت کا تقاضا یہ ہوا کہ تھوڑی بہت شکر رنجیاں بھی آپس میں شروع ہو گئیں۔ ہر بار رنجش غیب کی غزلوں ہی کو رنجش دل بنایا گیا۔ ادھر سے ایک غزل کی فرمائش، ادھر اس غزل کا جواب بھی سنا دیا جاتا۔ غرض بڑے حریفانہ راز و نیاز کے بعد دل صاف ہوتے۔

پوشیدہ رشتۂ ازدواج کے باوجود خانم جان کو میر صاحب کے پاس پہنچنے کا موقع ہی نہ ملتا تھا۔ میر صاحب تو تھوڑی بہت آہ و زاری کے بعد جوانی کی نیند کے مزے لیتے لیکن خانم جان اکثر رات کے پاس کھڑی ہو جاتی اور میر صاحب کو بنگلے کے برآمدے میں سوتا ہوا تکا کرتی۔ ایک بار بارش ہونے لگی۔ میر صاحب جاگے۔ قنات کی طرف نظر کی تو ایسا معلوم ہوا وہاں کوئی کھڑا ہے۔ آپ کی جو حالت ہوئی اس کا کیا کہنا، پہلا خیال یہی آیا کہ شاید چور ہے۔ طپنچہ تکیے کے نیچے سے نکال کر ہاتھ میں لے لیا۔ پھر خیال آیا شاید خانم جان ہوں گی، آہستہ سے ایک شعر پڑھا، ادھر سے جواب آیا ؎

واقف نہ ئی ز دردِ دلِ ناتوانِ من !
اینک بلب رسید ز دردِ تو جانِ من

یہ ٹپکتے کپڑوں سے خانم جان کو گود میں اٹھا لائے، دیکھا سر سے پیر تک بارش میں بھیگ چکی ہے۔ دانت سے دانت بج رہے ہیں۔ جب ذرا بات کرنے کے قابل ہوئی تو اپنا دردِ دل رو رو کر سنایا، مستقبل کے اندیشوں کا ذکر ہوا۔ میر صاحب نے بھی کچھ آہ و زاری کی لیکن آخر میں کچھ اور ہی مطالبہ کر بیٹھے۔ یہ سنتے ہی وہ نہایت بدمزہ ہو کر بولی اس قدر بے حیائی کیا ضرور ہے معلوم ہوتا ہے کہ تم اسی بات کے طالب ہو۔ اگر ایسا ہے تو یہ میری کاہشِ جاں اور سوزشِ روح کا باعث ہے۔ میر صاحب نے جواب دیا "اے میری جان! ایں امر خلاصۂ معاملات است۔" اس نے کہا شاید ہو لیکن اگر اس طرح اس کے سبب گرویدہ اور بندۂ ہوس ہونا از صاحبانِ لطافت مزاج و خوش طبعاں بمراتب نہایت نازیبا و ناگوار است۔ میر صاحب نے جواب دیا کہ اپنا تو یہ عقیدہ ہے کہ ؎

گذشتہ خواب و آئندہ خیال است
غنیمت داں ہمی دم را کہ حال است

جواب دیا کہ ہاں ع

فکرِ ہر کس بقدرِ ہمت اوست

بھلا گردشِ فلک کی چین دیتی ہے کسے انشا۔ قریب قریب ایک سال اس طائفے کو منگ صاحب کی خدمت میں بسر ہو چکا تھا۔ خانم جان اور میر صاحب کے ذہنوں میں ابھی اپنے مستقبل کے بارے میں کوئی خاکہ پوری طرح بننے نہ پایا تھا کہ یک بیک خبر آئی کہ منگ صاحب کی بدلی کانپور سے کلکتہ ہو گئی۔ منگ صاحب نے طائفے کا حساب کتاب کر کے بی جان، خانم جان وغیرہ کو انعام اکرام دے دلا کر طائفے کو موقوف کر دیا اور کلکتے جانے کی تیاری کرنے لگے۔ ان دنوں میر صاحب اور خانم جان پر جو کچھ گزر رہا ہے اس کا اندازہ وہی لگا سکتے ہیں جن پر ایسی واردات گزر چکی ہو۔ رو رو کر دونوں کا بُرا حال تھا اور کوئی تدبیر سوجھتی ہی نہ تھی۔ آخرش یہ سوچ کر بھی کیا کہ ہو بلر صاحب کے پاس چنارگڑھ چلنا چاہئے کہ اس سے پہلے بھی بی جان انہی صاحب سے وابستہ رہ چکی تھی۔ خانم جان کا یہ اندیشہ درست تھا کہ یہاں تو وہ منگ صاحب کی شرافت کی وجہ سے بچ گئی، ہر شخص منگ صاحب نہیں ہوتا۔ یہ جرام خور لے کسب پر مجبور کر دیں تو کیا ہوگا۔ میر صاحب نے خانم جان کو لے بھاگنے کا ارادہ کیا۔ وقت پر گھوڑے سے سنشاد اس کی عملی صورت بھی نہ تھی۔ ادھر طائفہ نے چنارگڑھ جانے کے لیے کشتی تلاش کرنی شروع کر دی۔ اب میر صاحب نے یہ تدبیر سوچی کہ طائفہ کی بڑی کشتی کے روانہ ہونے کے کچھ دیر بعد یہ اس کے پیچھے ایک چھوٹی سی تیز رفتار کشتی لے کر روانہ ہو جائیں، جیسے ہی موقع ملے، خانم جان بڑی کشتی سے میر صاحب کی کشتی میں منتقل ہو جائیں۔ دریائی سفر میں طائفہ کو پیچھا کرنے میں بہت دشواری پیش آئے گی۔ یہ تجویز پکی ہو گئی اور میر صاحب نے ایک کشتی بھی کرایہ پر لے لی۔ آخری بار رقص مجرا ہوا اس میں خانم جان نے ایسی ایسی پُرسوز غزلیں گائیں کہ مجلس کی حالت متغیر ہو گئی۔

ما برفتیم تو دانی و دلِ غمخور ما — بخت بد تا بہ کجا می برد آبشخور ما
بدعا آمدہ ایم ہم بدعا دست برآر — کہ وفا با تو قریں باد خدا یاور ما
بست گر ہمہ عالم بسرم جمع شوند — نتواں برد ہوائے تو بروں از سر ما
فلک آوارہ بہر سو کندم می دانی — رشک می آیدش از صحبت جاں پرور ما

گر بپرسد کہ کجا رفت ازیں جا حافظ
گو بزاری سفرے کرد و برفت از بر ما

سب کی حالت قابلِ بیان نہیں، حد یہ کہ ہر موقع پر ضبط و تحمل سے کام لینے والی خانم جان بھی کھل کر زار زار روئی اور پھر یہ غزل شروع کی ؎

فاش می گویم و از گفتۂ خود دل شادم — بندۂ عشقم و از ہر دو جہاں آزادم
طائرِ گلشن قدسم چہ دہم شرح فراق — کہ دریں دام گہ حادثہ چوں افتادم
من ملک بودم و فردوس بریں جایم بود — آدم آورد دریں دیر خراب آبادم
کوکبِ بخت مرا ہیچ منجم نشناخت — یا رب از مادرِ گیتی بچہ طالع زادم

اس شعر پر بے قرار ہو گئی اور بار بار گاتی تھی اور اگلا شعر بھی تکرار کیا ؎

می خورد خونِ دلم مردمکِ چشم سزاست — کہ چرا دل بہ جگر گوشۂ مردم دادم

پھر ایک آہِ سرد کھینچی اور کہا، ہائے میری مٹی خراب ہوتی، کاش میں پیدا ہی نہ ہوتی!

ادھر قسمت کی گردش دیکھیے، منگ صاحب نے میر صاحب کو بلا کر کہا کہ پانچ مہینے سے حساب نہیں ہوا ہے اور کوچ عنقریب درپیش ہے اس لیے مہاجنوں کا حساب جلد کر دینا چاہیے۔ حکم حاکم مرگِ مفاجات۔ میر صاحب نے اسی رات بیٹھ کر حساب کتاب درست کیا اور کاغذات صاحب کے ملاحظے میں پیش کر دیے۔ جس دن طائفہ چنار گڑھ کے لیے رخصت ہو رہا تھا اس دن صاحب کو کسی وجہ سے فرصت نہ تھی، انھوں نے کاغذات نہ دیکھے اور کہا کل دیکھیں گے۔ یعنی زہرہ صاحب کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ پھر سوچا ایک دو روز میں طائفے کی کشتی زیادہ سے زیادہ تیس پینتیس میل جا سکے گی۔ میری کشتی چھوٹی ہے، بڑی کشتی سے چنار گڑھ پہنچتے پہنچتے میں اس کو جا لوں گا۔ قصہ مختصر اسی روز طائفہ رخصت ہوا، رخصتی کا منظر روزِ حشر سے کم نہ تھا۔ طائفہ کا کوئی آدمی ایسا نہ تھا جو دھاڑیں مار کر نہ روتا تھا۔ میر صاحب بھی روتے روتے نڈھال تھے لیکن خانم جان کا عجیب حال تھا۔ ایک سکوت کے عالم میں تھی۔ نہ آنکھوں میں آنسو تھا نہ لب پر کلام مگر چہرے پر ہوائیاں اڑتی تھیں۔ ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا مگر وہ رے ضبط، اگر ہونٹ ہل جائیں تو ہونٹ کاٹ کر پھینک دے۔ اگر زبان سے اُف نکلے تو زبان کھینچ لے۔ ماتھے پر شکن نہیں، چہرے پر بل نہیں۔ سب اٹھ کر چلنے لگے تو میر صاحب نے بھی تھوڑی دور مشایعت کی۔ آخر مرزائی نے میر صاحب کے ہاتھ چومے، اور ہر شخص انتہائی رنج و ملال کے ساتھ میر صاحب سے رخصت ہونے لگا۔ روتے روتے ہر ایک کی ہچکیاں بندھی تھیں۔ کوئی اپنے ہوش میں نہ تھا مگر وہ متحمل مزاج، وہ مستقل طبع، وہ دل کے بس کو روکنے والی خانم جان اسی طرح مبہوت، چپ، خود فراموشی کے عالم میں نہ روتی تھی نہ کوئی لفظ کہتی تھی، ہاں جب سلام کر کے آگے بڑھی تو میر صاحب کے نزدیک سے ہو کے نکلی اور یہ مصرع آہستہ سے پڑھا :

ما بہ تقسیم لب ماند و دل غم خور ما !

اعظم جی کا طائفہ تو کشتی میں سوار ہو کر روانہ ہو گیا، لیکن اس کے روانہ ہونے کے چار روز بعد تک بھی حساب فہمی سے میر صاحب کو چھٹکارا نصیب نہ ہوا۔ مجبوراً صاحب سے آٹھ دس روز کی مہلت لے کر ان سے چھوٹتے ہی تیز رفتاری سے کشتی میں بیٹھ چنار گڑھ کی طرف روانہ ہو گئے۔ کڑا مانک پور کے آگے انھیں دو راہا ملا۔ یہ سیدھے آگے بڑھ گئے اور ممکنہ تیز رفتاری سے الہ آباد پہنچ گئے لیکن کہیں بھی اس بڑی کشتی کا پتہ نہ چلا۔ ملاحوں نے کہا کہ چاہے کوئی کشتی کتنی ہی تیز رفتار ہو، اتنی مدت میں ہم سے آگے الہ آباد نہیں پہنچ سکتی۔ معلوم ہوتا ہے وہ کشتی دوراہے سے دوسرے رستے پر چلی گئی۔ میر صاحب مایوس اور نامراد لوٹ آئے۔

کانپور آ کر میر صاحب نے باقی حساب تیار کرنا شروع کیا۔ آگے کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ چنار گڑھ سے ہولیر صاحب کی چٹھی منگ صاحب کے نام آئی کہ اعظم جی کا طائفہ یہاں پہنچ گیا اور میں نے بی جان کو نوکر رکھ لیا لیکن اعظم جی کی بیٹی خانم جان کو یہاں کی آب و ہوا راس نہ آئی۔ وہ یہاں آتے ہی بیمار پڑ گئی، اس کے علاج کے لیے یہ لوگ اسے لکھنؤ لے گئے ہیں۔ یہ اطلاع پا کر میر صاحب ایک ہرکارے کو لکھنؤ بھیجنا ہی چاہتے تھے کہ صاحب کے نام ایک عرضی اور میر صاحب کے نام ایک خط مرزائی کا پہنچا کہ کانپور سے نکلتے ہی راستے میں خانم جان کی طبیعت خراب ہو گئی۔ چنار گڑھ پہنچ کر حالت بگڑ گئی، علاج کے لیے اسے ہم لکھنؤ لے جا رہے ہیں۔ اس سے پہلے میر صاحب کے نانا نے اس کا علاج کیا تھا اس سے اسے صحت ہوئی تھی۔ اب بھی بار بار وہ یہی کہتی ہے کہ بڑے حکیم صاحب کے علاج سے مجھے صحت ہو جائے گی، اس لیے آپ سے درخواست ہے کہ بڑے حکیم صاحب کو کسی طرح میر صاحب کے ہمراہ لکھنؤ روانہ فرمانے کا انتظام فرمائیں۔ میر صاحب نے اپنے نانا کو لے کر لکھنؤ جانے کی

تیاری شروع کی تو صاحب نے اجازت تو دے دی لیکن حساب فہمی کے بغیر جانے سے منع کیا۔ ادھر وہ معاملات حساب صاف کرنے میں گھر گئے اور ادھر دن پر دن نکلتے رہے۔ حساب فہمی سے فراغت ہوئی تو نانا صاحب نے اسباب سفر باندھے ہیں اور کچھ دن نکالے۔ مختصر یہ کہ جب وہ لکھنؤ پہنچے ہیں، حد درجہ حساس اور ضابطہ خانم جان فراق کے جان گداز صدمے اٹھا کر اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کر چکی تھی۔ یہاں بادرچی کے لڑکے نے میر صاحب کو خانم جان کا وہ خط دیا جو اس نے مرنے سے ایک روز پہلے لکھ کر اسے دیا تھا۔ اس میں شرح فراق کے بعد وصیت کی تھی کہ میری امان تو تجھی نظر نہیں آتی میرے بعد تم میرا غم نہ کرنا اور میرے غم میں اپنے آپ کو ہلاک نہ کرنا۔ پھر اپنی محبت کی سوگند دی تھی کہ اپنی صحت کا خیال رکھنا کہ اسی میں میری خوشی ہے۔ میر صاحب بہت روئے پیٹے، چیخے چلائے لیکن اس سے کیا ہوتا ہے، ناچار کلیجے پر صبر کا پتھر رکھ کر اپنی محبوبہ کی وصیت کی تعمیل کرتے ہوئے اپنی زندگی کے باقی دن گزارنے لگے۔

خلاصہ پھر خلاصہ ہی ہے۔ اس میں اصل کا لطف کہاں، اس پہ کچھ بے بیانی اپنی، اندیشہ ہی نہیں یقین ہے کہ اس نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی ہوگی۔ لیکن اردو ادب کے اس شہ پارے کو متعارف کرانے کی اور کوئی صورت بھی تو اس کچھ بیان کو نظر نہیں آئی۔

اس ناول میں یوں تو کئی کردار ہیں لیکن اہم کردار تین ہی ہیں، منگ صاحب، میر صاحب اور خانم جان اور ان ہی کے گرد یہ پورا قصہ گھوم رہا ہے۔

سب سے پہلے منگ صاحب ہی کو لیجئے۔ آدمی عیاش سہی، اوباش سہی لیکن اس کے شریف ہونے میں کیا کلام ہے اور یہ بھی تو دیکھیے کہ اس وقت کی ہماری اونچی سوسائٹی میں یہ عیب عیب کب سمجھا جاتا تھا، یہ تو عین صاحب امارت، مہذب اور شائستہ ہونے کی دلیل سمجھی جاتی تھی۔ ہمارے چھوٹے بڑے سب امیر اسی قسم کے شغلوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ وہ بیچارہ تو ان ہی لوگوں کی نقالی کر رہا تھا لیکن اس کی یہ شرافت تو کسی طرح بھلائے نہیں بھولتی کہ خانم جان کے ہر طرح اس کے قبضہ و اختیار میں ہونے پر بھی اس نے زور اور زبردستی کا سلوک اس سے روا نہ رکھا بلکہ اس کے جذبات اور احساسات کا پورا پورا احترام کیا۔ اسے بھی دوسری عورت کے برابر تنخواہ دے کر صرف اس کی شوخ و شنگ اداؤں اور بے نظیر ذہانت و ذکاوت ہی سے جی بہلانے پر اکتفا کیا۔ بعض بدگمان طبائع کی طرح شاید آپ بھی اس واقعہ پر شبہ کا اظہار کریں، اسی لیے منشی سجاد حسین نے بحیثیت مترجم اس واقعہ پر نوٹ لکھنا ضروری سمجھا کہ :-

"ایک صاحب نے مجھ سے یہ کتاب لے کے دیکھی، بہت محظوظ ہوئے اور خانم جان کی بہت تعریف کی۔ اس کے بعد تعجب سے فرمانے لگے، منگ صاحب نے خانم جان کو چھوڑ دیا ہوگا اور وہ عاصمہ رہی ہوگی؛ میں نے کہا، وہم کا علاج تو لقمان کے پاس بھی نہیں۔"

پھر اسی واقعہ کا مقابلہ ہمارے حاکموں، رئیسوں، فاتحوں اور مجاہدوں کی ہوس رانیوں کی ہولناک داستانوں سے کیجیے۔

، دیکھی جا سکتی ہے، تقریباً قریب اسی عہد کی ایک مومنی " مجاہد " اور " رحمۃ اللہ علیہ " اور " انار افشرہ بیانو " سکے ۔ حاشیہ لکھوں کے ساتھ یاد کی جانے والی ایک تاریخی شخصیت کے طرزِ عمل سے سمجھئے ۔ اس پر بھی اپنے " مشرقی " اخلاق " و " کردار کے مداح خواں ہیں۔ محمد شاہ رنگیلے کی ایک لڑکی تھی حضرت بیگم، حسن و جمال میں ڈھونڈے سے اس کا ثانی نظر نہ آتا تھا۔ اس کی سولہ سال کی عمر تھی کہ عالمگیر ثانی نے ساٹھ سال کی عمر میں اس سے زبردستی شادی کرنی چاہی لیکن اس نے صاف انکار کیا اور زیادہ دق کرنے پر زہر کھا لینے کی دھمکی دی، اس پر خفا ہو کر عالمگیر ثانی نے اسے قید تنہائی میں ڈلوا دیا۔ ابھی وہ قید تنہائی کی سزا بھگت ہی رہی تھی کہ احمد شاہ ابدالی قہر خداوندی کی صورت میں دلی پر نازل ہوا۔ امراء اور عوام کو طرح طرح کی اذیتیں دے دے کر ان کا مال و منال ان سے چھیننے کے سوا ان مجاہد اور غازی صاحب نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان کی حسین بہو بیٹیاں بھی ان سے چھینیں۔ ان میں حضرت بیگم بھی پکڑی ہوئی آئی۔ ساٹھ سالہ عالمگیر ثانی میں انسانیت کی اتنی خوبو باقی تھی کہ اس نے حضرت بیگم کے انکار پر اسے قید میں ڈلوا دیا لیکن ۶۵ سالہ مجاہد صاحب پر اس کی آہ و زاری کا ذرا بھی اثر نہ ہوا اور آپ نے حضرت بیگم سے نکاح پڑھوا ہی لیا!

اپنے ملازموں سے رنگ صاحب کا سلوک بھی مثالی ہے۔ میر صاحب اس کے خانگی تنخواہ یاب ملازم ہیں لیکن وہ ان سے برابری کا سلوک کرتا ہے۔ عیش و طرب کی محفل ہو کہ کاروبار کی مجلس انھیں ہمیشہ اپنے برابر کرسی دیتا ہے۔ وہ میر صاحب کی شرافت، ایمان داری اور سلیقہ مندی کا معترف اور دل سے ان کا قدردان ہے۔ وہ بڑے ظرف کا آدمی ہے سامنے اپنی داشتہ اور ملازم عورتوں کے سامنے یہ کہتے بھی باک نہیں کہ میرے منشی صاحب میرے سچے خیرخواہ ہیں۔ وہ نجوست زیادہ لائق ہیں اور بے حد پاکباز ہیں۔ میں ان کے انہی صفات کی بنا پر ان سے ڈرتا ہوں۔ حالانکہ عام طور پر کم ظرف آدمی اس قسم کی عورتوں کی موجودگی میں پھیل کر ایسے پھیلتے اور پیر پھیلاتے ہیں کہ توبہ ہی بھلی۔ خوش طبعی اور ظرافت رنگ صاحب کی طبیعت کا ایک بڑا وصف ہے۔ وہ اپنے ملازمین سے برابری کی چوٹیں اور چہلیں کرتا ہے۔ رنگ صاحب کے بعد آنے والے انگریزوں سے اس شریف انگریز کے برتاؤ کا مقابلہ کیجئے جو ہندوستانیوں کو منہ لگانا گوارا نہ کرتے تھے اور ان سے میل جول کو اپنے لیے عار سمجھتے تھے اسی لیے منشی سجاد حسین بحیثیت مترجم ایک فٹ نوٹ میں بے اختیار اس کو خراجِ تحسین ادا کر گئے ہیں:۔

> " حسن شاہ اور خانم جان تو صاحبِ معاملہ تھے مگر صاحب بہادر بڑے مزے کے تھے۔ جہاں دیکھو ٹپکے پڑتے ہیں۔ افسوس اب ایسے انگریز نہیں آتے ورنہ ہم بھی بتا دیتے "۔

رنگ صاحب بڑے دل کا آدمی ہے، شاہ خرچ ہے، فیاض ہے، وہ روپے پیسے کو عزیز رکھنے والا حریص آدمی نہیں؛ انسان دوست اور انسانیت نواز آدمی ہے۔

رنگ صاحب اس وقت کی سب سے مقبول ہندوستانی زبان اردو میں نہایت روانی کے ساتھ گفتگو کرتا ہی تھا لیکن اس کے سوا اسے فارسی زبان اور فارسی ادب پر بھی اچھا خاصا عبور حاصل تھا۔

اب ناول کے ہیرو سید حسن شاہ کو لیجئے۔ سید زادے ہیں، میر صاحب کہلاتے ہیں، اپنے زمانے کے لحاظ سے اچھے خاصے تعلیم یافتہ ہیں۔ انھیں سچ مچ خانم جان سے محبت ہے لیکن ان کی محبت کے تصور میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ وہ لاکھ پاکباز سہی، پھر بھی

محبت کے بارے میں ان کا تصور جسمانی اتصال اور مادی وصال سے آگے نہیں بڑھتا۔ انھیں ہوس کار تو نہیں کہا جا سکتا لیکن میر حسن کی محبت، حال نہیں۔ محبت وہ بے شک کرتے ہیں لیکن بے محابا محبت اور اس راہ میں اپنی متاعِ عقل و دین لٹانے کی لذت سے وہ ناآشنا ہیں۔ بقول مولانا نیاز فتح پوری :۔

"نشتر اور نہر عشق دونوں کے مطالعے کے بعد صرف یہی نہیں ہوا کہ میں اشک باری پر مجبور ہو گیا ہوں بلکہ اس کے ساتھ غصہ کی بھی کیفیت مجھ پر طاری ہوئی اور ان کے مصنفوں کو میں نے بہت برا بھلا کہا کیونکہ ان دونوں کے ہیرو قریب قریب ایک ہی قسم کے کند جس رکھنے والے ہیں .... ناول نشتر میں جب ہیروئن نے جان دی تو ہیرو بھی بہت متاثر ہوا۔ لیکن یہ تاثر اس سے زیادہ نہ تھا کہ جب حضت قبر پر فاتحہ پڑھنے گئے اور اتفاق سے ان کا جوتا گڑھے میں گر گیا تو ان کو سب سے پہلے یہ فکر لاحق ہوئی کہ یہاں سے ننگے پاؤں کیونکر جاؤں گا اور آخر کار ایک رستمانہ عزم کے ساتھ انھوں نے جوتا نکال کر اس مہم کو سر کر ہی لیا۔"

سید حسن شاہ معمولی سوجھ بوجھ کے آدمی ہیں۔ ذکاوت اور ذہانت میں وہ خانم جان کے پاسنگ بھی نہیں۔ منگ صاحب کی موجودگی میں خانم جان نے جیسی خوب صورت شوخیاں کی ہیں ان کے؟ اب میں میر صاحب کی بھونڈی حرکتیں دیکھ کر ان کی عقل و دانش پر رونے کو جی چاہتا ہے۔ کتاب میں انھوں نے اپنے وہ خط بھی درج کیے ہیں جو انھوں نے خانم جان کے نام لکھے تھے۔ غالب کی زبان میں یہ خط محمد شاہی رسم مکتوب نگاری کا بہت اچھا نمونہ ہیں۔ وہی گز گز بھر کے پُر تکلف آداب و القاب اور وہی مقصدِ مکتوب سے دور پُر تصنع مضمون آرائی۔

سید حسن شاہ اور خانم جان کے کردار کا یہ فرق بھی بھلایا نہیں جا سکتا کہ سید حسن شاہ نے سید زادہ ہونے کے باوجود، لاکھ پس و پیش کے ساتھ سہی، اپنی محبوبہ کو صاحب کے نذر کرنے سے دریغ نہیں کیا اور خانم جان نے باوجود طوائف زادی ہونے کے اپنی عزت و آبرو اور اپنی عفت و عصمت کو بچانے میں اپنی حد تک کوئی کسر اٹھا نہ رکھی!

خانم جان طوائف زادی سہی لیکن عفت و عصمت کے معاملے میں پوری شریف زادی ہے۔ ہرجائی ہونا تو ایک طرف رہا، محبت کے بارے میں اس کا تصور نہایت درجہ اونچا اور پاکیزہ ہے۔ اس کی محبت میں گہرائی ہے، دردمندی ہے، سوز ہے، تڑپ ہے۔ اس کے نزدیک محبت صرف جسمانی اتصال اور مادی وصال کا نام نہیں، روحانی اتحاد اور دلی ملاپ کا نام ہے —— سید حسن شاہ کی محبت اور اپنی محبت کے فرق کو وہ بھی محسوس کرتی ہے اور اس پر اپنا کلیجہ مسوس کر رہ جاتی ہے۔ وہ جتنی صورت شکل کی حسین و جمیل ہے، اتنی ہی ذکی اور ذہین بھی ہے۔ اسی ذکاوت اور ذہانت کا نتیجہ اس کی بے پناہ شوخی اور پُر لطف شرارت ہے۔ وہ بے محابا محبت کرنا بھی جانتی ہے اور حد درجہ ضبط و تحمل سے کام لینا بھی اسے آتا ہے۔ وہ بے انتہا حساس بھی واقع ہوئی ہے، اور اسی زود حسی نے آخرکار اس کی جان پر بنا دی۔ طبیعت عشق کی خوددار بھی ہے، خانم جان محبت کی آگ میں سراپا جلنے کے باوجود بہت خوددار بھی ہے۔ اس سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہیں ہوتی جس سے اس کی محبت کی رسوائی ہو۔ حد یہ ہے کہ اسے اپنے محب اور محبوب

کی بھی کوئی ایسی حرکت گوارا نہیں ہوتی جس سے اس کی محبت کی توہین ہوتی ہو۔

خانم جان شعر و سخن کا بڑا اچھا مذاق رکھتی ہے۔ وہ برمحل اتنے اچھے شعر پڑھتی اور ایسی اچھی غزلیں گاتی ہے کہ اس کے اس پاکیزہ ادبی ذوق پر بھی لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے۔ دیوانِ حافظ کی تو وہ گویا حافظ ہے۔ بعض موقعوں پر اس نے اتنی برمحل غزلیں منتخب کی ہیں گویا وہ غزلیں اسی موقع کے لیے لکھی گئی تھیں۔ میر صاحب کے خطوط کے مقابلے میں اس کے خطوط رسمی تکلف سے عاری ہیں۔ ان خطوط کے القاب و آداب مختصر مگر بڑے جاندار ہیں۔ ان میں کسی رسمی تکلف اور ہیر پھیر کے بغیر راست حرفِ مطلب زبانِ قلم پر آ گیا ہے۔ خانم جان کے خطوں کے ایک ایک لفظ سے لکھنے والے کا خلوص، اس کے جذبے کی گہرائی اور اس کی دردمندی جھلکی پڑتی ہے۔ القاب کے اختصار اور راست مطلب نگاری کے لحاظ سے غالب کے خطوط سے یہ خط بہت ملتے جلتے ہیں۔

مختصر یہ کہ خانم جان ہر طرح محبت کرنے اور جان چھڑکنے کے قابل کردار ہے۔ سید حسن شاہ خوش بخت تھے جو ایسی پیاری شخصیت کو چاہنے اور اس سے چاہے جانے کی سعادت سے سرفراز ہوئے۔

اس مضمون کی ابتدا میں صاحبِ "نشتر" پر جناب منظر علی صدیقی کے مضمون کا ذکر آ چکا ہے۔ اس میں اور سب باتیں تو ٹھیک ہیں لیکن نشتر کی ادبی قدر و قیمت کے تعین میں صدیقی صاحب نے سخت ناانصافی سے کام لیا ہے اور لکھ دیا ہے کہ "ناول کے موجودہ معیار پر ہمیں "نشتر" کو نہیں پرکھنا چاہیے بلکہ ایک عشقیہ قصہ سمجھ کر وقت گزاری کے لیے پڑھنا چاہیے"۔ آپ اس ناول پر جناب نیاز فتح پوری کی اشک باری دیکھ چکے اب عزیز احمد کی رائے ملاحظہ فرمایئے جو بڑی حد تک اس ناانصافی کی تلافی کر دیتی ہے۔ عزیز احمد اپنی کتاب "ترقی پسند ادب" میں لکھتے ہیں:-

> ..... نشتر ایک تماش بین کی سرگزشت ہے جو غالباً میر تقی میر کا ہم عصر تھا اور جس نے فارسی میں اپنی حیاتِ معاشقہ کے متعلق یہ بے مثل کتاب لکھی۔ سجاد حسین کسمنڈوی نے اس کا اُردو میں ترجمہ کیا۔ معلوم نہیں اصل فارسی کتاب کہیں باقی بھی ہے یا نہیں لیکن اُردو ترجمہ اُردو کے چند بہترین ناولوں میں شمار کیے جانے کے قابل ہے اور اس صنف کے بہترین مغربی ناولوں کے مقابل پیش کیا جا سکتا ہے۔ نقطۂ نظر تماش بین کا ہے لیکن اپنی نفسیاتِ عشق، اپنے والہانہ جذبے کے بیان میں مصنف نے کمال کر دیا ہے۔ قصہ کی ٹریجڈی، ورتھر کی "داستانِ غم" سے کم پُر اثر نہیں۔ تفصیلات ایک ایسی زندگی پر سے پردہ اٹھاتی ہیں جو اگر ناول نہ لکھا جاتا تو شاید ہمیشہ فراموش اور نامعلوم رہتی۔ انگریزی قبضے کے ابتدائی زمانے میں شریف انگریزوں کی نوکر پیشہ اور طوائفوں، دونوں طبقوں کا ادبی ذوق، حافظ کی غزلوں کا زندگی پر اثر، کوئی اور کتاب اس زمانے کی زندگی کے اس پہلو پر روشنی نہیں ڈالتی اور اس پس منظر سے مصنف اور خانم جان کے پاکیزہ اور والہانہ عشق کا جو قصہ اُبھرتا ہے، وہ دنیا کے افسانہ کے چند بہترین قصوں میں سے ہے۔

حیدرآباد کے مزاح اور طنز نگار

نصیر الدین ہاشمی

اُردو زبان میں مزاح اور طنز نگاری کا آغاز نظیر اکبرآبادی اور غالب سے تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد اخبار اودھ پنچ کے مضمون نگار اس شعبۂ ادب کے امام نظر آتے ہیں۔ اگرچہ اس سے پہلے بعض ہجوگو ایسے گزرے ہیں جن کو اس شعبہ میں منسلک کیا جاسکتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ عصر حاضر میں ادب کی اس شاخ نے ترقی کے جو مدارج طے کیے ہیں اس کو مغربی ادب کا رہین منت قرار دیا گیا ہے۔

اُردو زبان کے مزاحیہ نگاروں پر تبصرہ کرنا آسان نہیں ہے۔ اُردو کی عمومی تاریخ سے قطع نظر جس طرح صوبہ وار تاریخیں دکن میں اُردو، پنجاب میں اُردو، مدراس میں اُردو، گجرات میں اُردو، بنگال میں اُردو، بہار میں اُردو زبان اور ادب کا ارتقا وغیرہ لکھی گئی ہیں، اسی طرح مزاحیہ نگاری کو بھی صوبہ کے لحاظ سے تقسیم کرنا چاہیے اس لیے یہاں ہم حیدرآباد (آندھرا) کے مزاحیہ نگاروں کا مختصر تذکرہ لکھتے ہیں۔

حیدرآباد کی مزاح اور طنز کا آغاز بھی ہجوگوئی سے ہوا ہے۔ قطب شاہی دور سے قطع نظر آصفی دور میں کئی شاعر ہجوگوئی کے لیے مشہور ہیں مگر ہم ان کا تذکرہ نہیں کریں گے کیونکہ ان کا مقصد محض ہجوگوئی تھا طنز اور مزاح نہیں تھا۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار ۱۸۹۵ء میں حیدرآباد آئے اور مہاراجہ سرکشن پرشاد کے متوسل ہوئے، ماہوار رسالہ دبدبۂ آصفی کے ایڈیٹر بنے۔ حیدرآباد ہی میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کی چند تصانیف یہاں بھی مرتب ہوئیں اس لیے سرشار کو اس شعبہ کا اولین معمار تسلیم کیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔

جدید دور کے پیش رو عظمت اللہ خاں مرحوم، مرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم ہیں ان کے ساتھ اور بعد کئی اصحاب اس زمرہ میں شامل ہیں۔ ہم یکے بعد دیگرے ان کا مختصر تعارف کراتے ہیں۔

(۱) عظمت اللہ خان

عظمت اللہ خاں پانچ سال کی عمر میں حیدرآباد آئے۔ یہاں ان کی تعلیم اور تربیت ہوئی۔ علی گڈھ کالج سے بی۔اے کی ڈگری لی اور مددگار ناظم تعلیمات پر تقرر ہوا اور ۱۳۴۶ھ میں جوانی میں دنیا سے چل بسے۔ جس طرح عظمت اللہ خاں جوان تھے اسی طرح ان کے ادبی کارنامے بھی جوان ہیں۔ وہ ایک بلند پایہ ادیب اور شاعر تھے۔ نثر اور نظم دونوں کی خدمت کی۔ مزاحیہ نگاری میں ان کو حیدرآباد کا اولین معمار قرار دینا چاہیے۔ انھوں نے سدا بہار پھول لگائے ہیں۔ انھوں نے اردو شاعری کے لیے ہندی بحروں استعمال کرکے ایک جدت پیدا کردی۔

نثر میں تنقیدی مضامین لکھے اور ادبی تحقیق فرمائی۔ اس کے ساتھ ہی مزاحیہ طرز پر مضامین لکھے۔ عظمت اللہ خاں کے مضامین "سریلے بول" میں شامل ہیں۔ نصاب کی کتابیں، اس کے پڑھنے سے اکتاہٹ نہیں آتی بلکہ تبسم کی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں۔ انھوں نے سیاسی، معاشرتی اور سماجی اور معاشی موضوعات کو اپنی مزاحیہ نگاری کا میدان بنایا تھا۔ سنجیدہ، دلکش، پرشگفتہ انداز میں خیال آرائی کی۔ خان صاحب نے اپنی نثر نگاری سے اردو نثر میں ایک نئی طرز کی بنیاد رکھی اور داغ بیل ڈالی۔ خان صاحب کی مزاحیہ نگاری کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

> "احباب ہم اطراف کی شکوہ کرتے ہیں، بیاں تک کہ جب صاحب خانہ کی ولیمی آئیں، سماں سسرال کی چھٹ بلائیں لیں۔ کیا کرتیں مجبور تھیں۔ سسرال کے سب حسب و نسب، ملنے کرنے کے لیے بیٹھا اور دیکھ کر رو بدو دیکھو تھا پڑا۔ جی تو یہی چاہتا ہے کہ ایسی بہو بیاہ لائیں جو بیٹے کی دامن گھلائے تو مسہری کے پارلیمنٹ سے کرسی رہے۔ مگر یہ ناممکن۔ بھلا بیٹے کی شادی کیوں کر نہ کریں۔ اس کے گھر کا آباد ہونا، اس کا سہرا دیکھنا اور پوتے کا گود میں کھلانا بھی بے چاری بڑی بی بی کا اب رہا سہا تھا۔ غرض صبر و شکر کر کے رات کاٹی اور ان سب بیٹیوں اور صاحب خاص متعلقین سے صلاح اور مداہنت کا مشورہ کیا۔ صبح ہی گھر بہ گشتی رو نزاقول سے کار گر اصول پر بہتر عمل شروع کر دیا جائے۔"

(۲) مرزا فرحت اللہ بیگ

مرزا صاحب کے خاندان کے افراد مدتوں سے حیدرآباد میں تھے۔ مرزا صاحب ۱۹۰۷ء میں حیدرآباد آئے اور ابتداءً سررشتہ تعلیمات میں مدرس مقرر ہوئے۔ پھر سررشتہ عدالت میں تبدیل ہو گئے۔ منصف، مجسٹریٹ، ناظم عدالت، سیشن جج اور انسپکٹنگ افسری کی خدمات نیک نامی سے انجام دے کر وظیفہ حاصل کیا۔ ملازمت کے زمانہ میں کئی عدالتی کمیشنوں پر مامور کیے گئے۔ ملازمت اور وظیفہ کے بعد سینکڑوں مضامین لکھے جن کے سات مجموعے خود شائع کیے اور شاعری کی ایک پمفلٹ شائع کر دی۔ مرزا فرحت اللہ بیگ اولاً مرزا الم نشرح کے نام سے مضمون لکھتے رہے جو ایک تجارتی و ادبی رسالہ میں شائع ہوتے تھے۔ یہ رسالہ ان کے قریبی عزیز حیدرآباد سے شائع کرتے تھے۔ اس کے بعد جب رسالہ اردو میں ان کا مضمون مولانا نذیر احمد کے متعلق شائع ہوا تو پھر ان کے مضامین کی دھوم مچ گئی۔ اردو کا ہر ایک رسالہ ان سے مضامین طلب کرنے لگا۔ مضامین بھی لکھے اور ان کے مجموعے بھی شائع کیے۔

بعض اصحاب مرزا فرحت اللہ بیگ کا مقابلہ رشید احمد صاحب اور پطرس اور عظیم بیگ چغتائی سے کرتے ہیں۔ اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو واضح ہوگا کہ پطرس کی مزاحیہ نگاری میں ذہنیت تو بلند نظر آتی ہے مگر زبان کی سلاست، روانی، شادابی اور فنکاری کے لحاظ سے مرزا صاحب کو ترجیح دینا ناگزیر ہے۔ رشید احمد صاحب کے مضامین میں تصنع اور آورد نظر آتی ہے۔ مرزا صاحب کے تمام مضامین آمد کا پتہ دیتے ہیں۔ ان میں تصنع نہیں ہوتا۔ مرزا صاحب کے مضامین میں متانت، شائستگی اور خوش مذاقی پائی جاتی ہے ان سے انبساط اور زندگی بشاشت حاصل ہوتی ہے۔ ڈاکٹر مولانا عبدالحق صاحب نے مرزا فرحت اللہ بیگ کے متعلق جو خیالات ظاہر کیے ہیں اس میں وہ صراحت کرتے ہیں۔

"مرزا فرحت اللہ بیگ کا طرزِ تحریر بھی ان کی طبیعت سے ملتا جلتا ہے۔ بیان سادہ ہے اور تصنع نام کو نہیں۔ ٹھیٹھ دلّی کی زبان لکھتے ہیں۔ تحریر میں شوخی بھی ہے اور ظرافت کی چاشنی بھی۔ مرزا صاحب کو فنِ مصوری میں بھی دخل ہے اس لیے ان کی نظر چیزوں کے مختلف پہلوؤں پر کھلے ہوں یا ڈھکے وہیں پڑتی ہے جہاں نکتے کی کوئی بات ہوتی ہے اور جس پر سے عام نظر سرسری طور سے گزر جاتی ہیں۔ ان کی اسی نظر کی بدولت مضمون میں جان پڑ جاتی، سیدھا سادہ بیان کا قلم خط و خال درست کر کے ایک اور ہی رنگینی پیدا کر دیتا ہے۔"

مرزا فرحت اللہ بیگ نے اگرچہ اولاً مزاحیہ رنگ میں مضمون نویسی شروع کی مگر بعد میں ادب کا کوئی ایسا موضوع نہیں رہا جس پر انھوں نے اپنے نقش ثبت نہ کیے ہوں۔ سوانح حیات، سفرنامہ، مختصر افسانہ، سماجی اصلاح، سیاسی نظریے اور ادبی تنقید وغیرہ مختلف النوع مضامین پر انھوں نے اپنے خاص انداز میں خامہ فرسائی کی ہے اور بہترین نقش چھوڑے ہیں۔ یوں تو ان کے بیسیوں مضمون زندگی جاوید کی حیثیت رکھتے ہیں مگر مولانا نذیر احمد کی سوانح حیات اور دہلی کا مشاعرہ، دیوانِ یقین اور دیوانِ نظیر کے مقدمات، پھول والوں کی سیر ایسے مضامین ہیں جن کو اردو ادب میں بلند سے بلند مرتبہ حاصل ہے۔

حیدرآباد میں مرزا فرحت اللہ نے اپنی زندگی کے پورے چالیس سال بسر کیے یعنی ۱۹۰۷ء میں حیدرآباد آ کر ملازم ہوئے اور ۱۹۴۷ء میں یہاں سے آخرت کا سفر اختیار کیا۔ تیس سال سے زیادہ انھوں نے سرکاری ملازمت میں بسر کیے اور وہ بھی عدلیہ ہی میں رہے۔ بیانات لکھتے رہے، وکیلوں کی بحث اور جرح سنتے رہے اور فیصلے کرتے رہے اور اس زمانہ میں ادب کی خدمت بھی کرتے رہے۔

جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے مرزا صاحب نہ صرف نثر کے میدان کے شہسوار تھے بلکہ نظم کی فضا میں بھی پرواز کی ہے اور اپنے دیوان کو "میری شاعری" کے عنوان سے شائع فرمایا ہے۔ مرنے سے چند سال پہلے حیدرآباد میں ایک ادبی ادارہ "اردو مجلس" کے نام سے قائم کیا تھا ہر ماہ ایک مرتبہ اس مجلس کا جلاس ہوتا اور کوئی صاحب مضمون سناتے اور اس کے بعد شعرا اپنا کلام سناتے تھے۔ یہ مجلس حیدرآباد کے بلند پایہ کے ادیبوں اور شاعروں پر مشتمل ہوتی تھی۔ مرحوم کے بعد بھی یہ ادارہ باقی ہے اور آج تک اردو کی خدمت کر رہا ہے۔

مرزا صاحب کی نثر اور نظم کا نمونہ پیش ہے:-

"مجھ کو مولوی صاحب کی طرزِ تحریر پر کوئی رائے ظاہر کرنے کا حق نہیں ہے کیونکہ اوّل تو میرے لیے ابتدا ہی میں خطائے بزرگاں گرفتن خطا است کی سب سے بڑی ٹھوکر ہے۔ دوسرے میری قابلیت محدود کی سرحد سے گزر کر مفقود کی سرحد میں آ گئی ہے لیکن باوجود ان واقعات کے میں نے مولوی صاحب کے سامنے بھی کہا، اب بھی کہتا ہوں اور ہمیشہ کہوں گا کہ محاوروں کے استعمال کا شوق مولوی صاحب کو حد سے زیادہ تھا۔ تحریر میں ہو یا تقریر میں وہ محاوروں کی ٹھونس ٹھانس سے عبارت کو بے لطف کر دیتے تھے اور بعض وقت ایسے محاورے استعمال کر جاتے تھے جو بے موقع ہی نہیں اکثر غلط ہوتے تھے خدا معلوم انھوں نے محاوروں کی کوئی فرہنگ تیار کر رکھی تھی یا کیا۔"

(ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی)

بہرحال تاریخ پیشی آگئی اور میں کتابوں کا پشتارہ بغل میں مارے ڈپٹی صاحب کے اجلاس پر پہنچ گیا۔ پہلی پیشی پہلے ہی مقدمہ کی تھی۔ اندر جا کر کیا دیکھتا ہوں کہ تیس چالیس کتے ایک رسی میں بندھے کھڑے ہیں۔ رسی کا سرا مولوی قطب صاحب کے ہاتھ میں ہے اور مولوی صاحب ڈیکولی ہیرمٹھا بیشلا سے کھڑے باتیں کر رہے ہیں۔ ڈپٹی صاحب اس وقت تک اجلاس پر تشریف نہیں لائے تھے۔ میں نے کولی صاحب سے کہا کیا آپ ان ملزموں کے وکیل ہیں؟ انھوں نے کہا ہاں۔ میں نے کہا کیا ناممکن نہ ہوگا کہ ان ناپاک ہستیوں کو عدالت کے کمرہ سے خارج کر دیا جائے؟ انھوں نے کہا نہیں ملزمین کے مواجہ میں تحقیقات ہوگی۔ بالکل قانون کے مطابق جواب تھا۔

مرزا صاحب کی مزاحیہ شاعری کا رنگ ملاحظہ ہو:۔

جناب شیخ مشکل سے چکے جب نامی جنت کو ۔۔۔ برہمن نو صلہ ملتا ہے کیا دیکھیں عمارت کا
نماز عصر کا وقفہ ہوا ہے وعظ میں زاہد ۔۔۔ جلیبی آئیں ایسے میں کہ ہے یہ وقت فرصت کا
اگر انٹل کی خدمت کا ہے حوری پر سہرا ہی کو ۔۔۔ جناب شیخ کو بھی خبط ہے حوروں کی خدمت کا
کبھی حور نے صاحب کو بلایا تھا کسی نے ۔۔۔ وہ یوں رکھی ہے چٹھی گویا پروانہ ہے جنت کا
کلکٹر ہو گئے لکھ پڑھ کے قسمت سے خلیفہ جی ۔۔۔ مگر جب یاد ہے اُن کو بھی لوگوں کی حجامت کا
چلو لیڈر ہی بن کر جیل میں تھوڑی بہت کاٹیں ۔۔۔ کہ اب ملنے دو نوں پر بند ہے پروانہ جنت کا

ابھی ڈاڑھی منڈی ہے ایک دن مونچھیں بھی غائب ہیں
عوض ہونے لگا ہے اب ناز و نخرہ پہ محبت کا

(۴) ناکارہ

محمد شفیع الدین صاحب نام اور ناکارہ لقب۔ حیدر آباد کے متوطن نظام کالج میں تعلیم پائی جبکہ اس کا تعلق مدراس یونیورسٹی سے تھا۔ خانگی مجبوریوں سے تعلیم کو مکمل نہ کر سکے۔ طالب علمی کے زمانہ سے مضمون نگاری کا شوق رہا۔ اخبار رہبر دکن سے بھی تعلق رہا۔ ان کے مضامین کا مجموعہ "صدائی" کے نام سے شائع ہو گیا ہے۔

ناکارہ صاحب مزاحیہ افسانے، ڈرامے دونوں لکھتے ہیں۔ ان کے مضامین میں قہقہہ نہیں ہوتا۔ وہ سبق آموز ہوتے ہیں۔ کسی میں طنز ہوتا ہے، کسی کے خاکے میں ایسے واقعات کا تذکرہ ہوتا ہے جس سے ہم ہنسنے لگتے ہیں۔ کسی مضمون میں اپنے گرد و پیش کے واقعات اور تجربات کی باتیں اس طرح لکھتے ہیں کہ ہم ہنسنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ کہیں وہ اپنی ذکاوت اور فراست سے انشا پردازی کو اتنا دلکش اور دلچسپ بنا دیتے ہیں کہ غیر دلچسپ مواد میں غیر معمولی شگفتگی پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کے مضامین میں طنز اور ظرافت میں خوشگوار ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور کبھی طنز ناگوار اور تلخ ہونے نہیں پاتا۔ نمونہ ملاحظہ ہو:۔

سبک آپ اور سر کے مصنوعی بال لگا کر اور ساڑھی اور کچھ پہننے کے بعد میں کتنا حسین معلوم ہو رہا تھا۔ اپنے آپ پر عاشق ہو جانے کو بے اختیار جی چاہ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی غلمان حور کے بھیس میں رستہ بھٹک کر خدا کی اس دنیا میں پہنچ گیا ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ تماشائیوں کی ایک کثیر تعداد میرے بچا عورت ہونے کے متعلق اصرار کرتی ہے لیکن کچھ لوگ کہتے ہیں کہ میں عورت ہوں نہ مرد۔ میں نے دل میں کہا کہ شاید وہ ان تماشا بینوں کو میری جوتی کو کیا غرض پڑی ہے کہ ان سیاہ کاروں کی رقیبانہ چشمک کی طرف توجہ کروں۔ لیکن میں نے نسائیت کی کیسی ہو بہو نقل اتاری تھی۔"

(تماشے پر تماشا)

"شام کو وہ لوگ اطمینان کی سانسیں اور بریانی کی ڈکاریں لیتے ہوئے رخصت ہوئے ——
آنجناب اس میں شک نہیں کنوارے آئے تھے اور شادی شدہ واپس گئے لیکن مہرباتو کو اس کا افسوس تھا اور ان کے ساتھ ہمدردی بھی کہ اکیلے آئے اور اکیلے ہی گئے ...... اور صمدانی نے ہمارے حق میں دعائے خیر کی۔ خدائے پاک وہ لہا دلہن کو ایک سال تک صبر جمیل عطا فرمائے۔۔ ...." (مس شہاب ثاقب)

(۲۸) محمد حسین آزاد

مولانا محمد حسین آزاد دنیائے اردو میں ایسے مشہور ہوئے کہ کئی اصحاب نے ان کے تخلص کو اختیار کیا اور بعضوں کا نام بھی محمد حسین رہا۔ چنانچہ حیدر آباد کے مولوی محمد حسین آزاد تخلص اپنی تمام عمر درس و تدریس میں بسر کی۔ سررشتۂ تعلیمات میں ملازم رہے۔ بعد وظیفہ اسی تدریس کے مشغلہ میں اب تک مصروف ہیں۔ شاعری میں اکبر کا رنگ اختیار کیا۔ ۱۲۹۷ھ میں حیدر آباد میں تولد ہوئے۔ پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل میں کامیابی حاصل کی حضرت امجد نے آپ کی شاعری کے متعلق حسب ذیل صراحت کی ہے:

"اگر اکبر مرحوم کی شاعری عالم وجود میں نہ آتی تب بھی ہمارے آزاد صاحب اس طرح آزادانہ اور ظریفانہ شعر کہا کرتے۔ ان کی تمام نظمیں ظرافت میں ڈوبی ہوئی ہیں۔"

حضرت امجد کی یہ صراحت حقیقت بردار ہے۔ "خیالات آزاد" کے نام سے آزاد صاحب کی نظموں کے دو حصے شائع ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ بالک لوریاں اور مسدس آزاد بھی آپ کی تصانیف میں شامل ہیں۔ نمونہ ملاحظہ ہو:۔

سفارش

یہاں سے اپنی گاڑی ہم بچا کر کیسے لے جائیں جدھر دیکھو اُدھر اٹکا ہے اک روڑا سفارش کا
لیاقت کا اگر چلتا نہیں ٹٹو تو اے حضرت لگا دو زور سے تم اس کے اک کوڑا سفارش کا

سفارش کا سے نہ لبوں پر تمھیں نہیں کہنا — ہمارے ہاں نہیں اب کرنے لگا گھر وہ سفارش کا
ترقی کا نتیجہ قابلیت سے نہ نکلے گا — لگاؤ گے نہ تا وقتیکہ تم جوڑا سفارش کا
سفارش نے نوازے بچے اونچوں کو نیچا دکھایا ہے — بڑا ہی سورما ہے جس نے منہ موڑا سفارش کا
یہ دل گردہ ہمارا دیکھو پیش داورِ محشر — قیامت میں بھی دامن ہم نے کب چھوڑا سفارش کا

ہوس

غضب کا ہے جوبن بلا کا ابھار — ہے یہ فتنہ زا کے یہ سو یہ ہوس
یہ سب کچھ ہی اس سے عاشق ہوا — محبت مجھ کو اس کی ہوئی ہے ہوس
تو کس پر سے یہ حسن کا عاشق ہوا — نہ ہوگی یہ عصمت کی فریاد رس
تو دیتا ہے دل اور وہ لیتی نہیں — کہ اس کی نظروں میں ہے خار و خس
رہ دلدار ہے یہ نہ سب ہے وہاں رسا — جو زردار ہے زور یہ ہے یہ بس
یہ بس ہے نہ پگھلے گی زر کے بغیر
یہ بس ہے نہ ہوگی کبھی ٹس سے مس

(۵) عصمت اللہ بیگ

عصمت اللہ بیگ، مرزا فرحت اللہ بیگ کے رشتہ دار تھے۔ ان کی ہی طرح نظم اور نثر میں مزاح کے گل کھلاتے رہے مگر فرق یہ ہے کہ عصمت اللہ بیگ نے زیادہ تر شاعری میں مزاحیہ نگاری کی ہے، نثر کا حصہ کم ہے اور فرحت اللہ بیگ صاحب نے نثر میں زیادہ مزاحیہ نویسی کی ہے۔

عصمت اللہ بیگ کی پیدائش تو دہلی میں ہوئی مگر کم سنی میں حیدر آباد آ گئے اور یہیں تعلیم پائی، ملازمت کی اور بالآخر وظیفہ حاصل کیا۔ اپنی مزاحیہ شاعری سے اردو زبان کی خدمت کی۔ نظم کے ساتھ نثر میں بھی مزاحیہ پہلو نظر انداز نہیں کیا۔ انھوں نے سماجی مسائل کو مزاحیہ رنگ میں بڑی خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے۔ "انوارِ تبسم" ان کے کلام کا مجموعہ شائع ہو گیا ہے، اس کے دیباچہ نگار گوپال راؤ اکبور نے یہ بالکل صحیح لکھا ہے کہ:۔

"عصمت کا اندازِ بیان بہت ہی دلکش اور ان کا اسلوب کافی شگفتہ ہے۔ وہ انگریزی لفظ کو بھی استعمال کرتے ہیں اور اس طرح کہ اشعار کا مزاحیہ رنگ اور زیادہ نکھر جائے۔ سیاسی موضوعات پر بھی ان کی نظمیں اور غزلیں اسی طنز و ظرافت اور اشاراتی رنگ کی حامل ہیں۔"

عصمت اللہ بیگ صاحب شاعری میں اکبر سے متاثر تھے۔ طنز اور ظرافت سے اصلاح کا کام لیتے تھے۔

تین چیزیں

دنیا میں اگر پوچھو تو ہیں سینکڑوں چیزیں ہیں بیش بہا اور اہم ان میں مگر تین
ان تینوں میں پہلے تو بڑا سب سے ہے پٹرول دو مرتبہ ہیں جس کے لیے آپس میں سلاطین
ڈرتے تھے مسولینی و ہٹلر بھی اسی سے وہ بلکہ ہے کسی سے جو تو اس کے ہیں شاہین
پٹرول کے بعد آتی ہے بارود کی باری ابلیس نے جاری کیے ہیں جس کے فرامین
بجھ جائے سہاگ اس کی تو جاتے ہیں پھٹک سے ارضِ حبش و مصر و شعلہ زنِ چین
ہے تیسری وہ دھات جسے کہتے ہیں لوہا ملتے ہیں جسے ان دونوں سے ہیں اس کے قوانین
بنتے ہیں اسی چیز سے ٹینک، توپ اور رسالے شمشیر و سناں تیر و تفنگ اور خرابین
قبضے میں کسی کے اگر آ جائیں یہ تینوں ہے ملک تو کیا چیز وہ دنیا کو بھی لے چھین

صلح پسندی

دشمن کو بنا لیتے ہیں ہم دوست خوشی سے ہم امن کے طالب ہیں زمانہ میں کبھی سے
اک ذوق ہیں ہم صلح پسندی ہی میں حصت مشرب ہی ہمارا نہیں لڑنا ہے کسی سے

نثر کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

"مشاعرہ کرنے میں حکیم جی ملک الشعراء تھے۔ ادھر کسی کی شادی ہوئی ادھر مشاعرہ۔ لڑکی کے بچہ ہوا اور مشاعرہ۔ کوئی بیمار ہوا مشاعرہ۔ کوئی مرا مشاعرہ۔ غرض کہ مشاعرہ کیا تھا ایک حیلہ تھا۔ پھر خرچہ کچھ نہیں۔ تانگے والوں نے قندیلوں میں سے موم بتیاں نکال کر ڈھیر لگا دیں۔ بزاز نے چاندنی کے پاٹ لا بچھا دیے۔ خیمے والوں نے دوپہر سے ڈیرے ڈال دیے۔ پنواڑی نے گلوریوں کے ڈھیر لگا دیے۔ چائے خانہ والوں نے چائے نوشی کا انتظام کر دیا۔ گڑ فروش نے ہر دم تازہ حقے اور چلمیں فراہم کر دیں۔ حکیم جی نے غزلیں کہہ دیں اور بنا دیں اور یار لوگ اکھاڑے میں جا کودے۔ چلو لینا ایک نہ دینا دو، مشاعرہ ہوا اور ہنسی خوشی ہوا۔"

(حکیم معشوق علی خان جوہر)

(۶) شمشاد

غلام پنجتن صاحب شمشاد تخلص سید سراج الحسن سراج یار جنگ جج ہائیکورٹ حیدرآباد کے بڑے فرزند، علی گڑھ اور یورپ کی تعلیم کے بعد حیدرآباد آ کر سررشتہ عدالت میں ملازم ہوئے اور سیشن جج تک ترقی پائی، وظیفہ حاصل کیا۔ حیدرآباد آنے

سے پہلے سیاسی میدان میں بہت حصہ لیا اور حیدرآباد میں اولاً سیاسی مضامین لکھے پھر ملازمت کے دائرہ میں آنے کی وجہ سے سیاست سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ وظیفہ کے بعد پھر سیاسی اور ادبی حیثیت سے میدانِ عمل میں گامزن ہیں۔ اپنے ہمعصروں کے جو حالات لکھے ہیں ان کو حیدرآباد کے بڑے لوگوں کے نام سے ادارۂ ادبیات اردو نے شائع کیا ہے۔ اس کے علاوہ کئی کتابیں آپ کے نوکِ قلم کی رہینِ منت ہیں۔ ان حالات کو بڑے دلکش انداز میں لکھا ہے اور کردار کی نقاشی چابکدستی سے کی ہے۔ غلام پنجتن صاحب جس طرح سیاسی میدان میں نڈر ہیں اسی طرح ادبی میدان میں وہ صحیح تنقید کرتے ہیں۔

آپ کی مزاحیہ شاعری خاص رنگ کی حامل ہے۔ اس میں طنز کے نشتر چبھوتے ہیں۔ نمونہ پیش ہے ؎

نہ جوتی دین فروشی سے تسلی نہ سہی — ایمان وہ بھی باقی ہو یہ بھی نہ سہی
سب جو ٹیلنگ الیکشن کی وہی کیا کم ہے — نوحہ جو کی سن نغمۂ شادی نہ سہی
دل میں اس جلوۂ سیاست سے اک ہیجان تو ہے — شرق گلچین گلستان تسلی نہ سہی
ہے ہر آئینہ میں حسنِ جلوہ گر وہ شوخ — گر نہیں ہم پہ ترا شیوۂ تمنا نہ سہی

کردار رقیبانہ انداز عاشقانہ — اظہار عاشقی کا یہ جبر محرمانہ
صیاد کا نہ کھٹکا گلچیں کا اب نہ ڈر ہے — کاندھوں پہ آندھیوں کے اپنا ہے آشیانہ
سوکھی زبان پر ہیں آزادیوں کے نغمے — اللہ رے فاقہ مستی گھر میں نہیں ہے دانہ
آقا ماں کی دلکش الفاظ ان کے میٹھے — یہ سب درست ہے لیکن مضمون عامیانہ
دورِ جدید آیا وہ دن ہوا ہوئے جب — لیلیٰ کے ماپ لے کر پھرتے تھے تازیانہ

چڑھی ہے بڑھاپے پہ ان کے جوانی — عمل بندی فلسفہ گاندھیانی
اڑا لائی کس کی زبان میری مینا — تلنگی مرہٹی نہ ہندوستانی
قفس ان کے ہاتھوں میں اور ہم قفس میں — بڑی تند روانی بڑی مہربانی
تباہی کے سامان سب ہیں مکمل — اناڑی سا مانجھی ہے نیا پرانی
جھجکتے ہیں اپنوں سے آنکھیں ملاتے — رقیبوں سے چلتی نہیں لن ترانی
وہ ہنسنے لگے سن کے میرا فسانہ — کہی ان کہی ہوگئی سب کہانی

(۷) فضل الرحمٰن

فضل الرحمٰن صاحب حیدرآباد میں تولد ہوئے۔ یہیں تعلیم پائی اور اس کی تکمیل پونہ میں کی۔ بی۔ اے آنرز کی ڈگری بمبئی یونیورسٹی سے حاصل کی۔ اولاً سٹی کالج میں معاشیات کے لکچرار مقرر ہوئے مگر سیاست میں حصہ لینے کے باعث ملازمت سے سبکدوشی حاصل کرلی۔

ایک عرصہ کے بعد اعلیٰ سرکاری عہدہ داروں کے اصرار سے پھر ملازمت میں شامل ہوئے نائب ناظم دفتر معلومات مقرر ہوئے اس کے بعد ناظم نشر و اشاعت کے بعد ناظم تعلیمات مقرر ہوئے اور اسی خدمت سے قبل عمر ۵۵ سالہ وظیفہ حاصل کر لیا فضل الرحمٰن صاحب کے ڈرامے بڑی شہرت رکھتے ہیں۔ اب تک سات ڈرامے شائع ہوئے ہیں۔ ظاہر و باطن۔ نئی روشنی۔ حشرات الارض۔ آئندہ زمانہ کار خانہ۔ سقراط۔ چنگیز۔ کلام کے دو مجموعے "دھوپ چھاؤں" اور "نقش حیات" شائع ہو چکے ہیں بقول ڈاکٹر غلام یزدانی "فضل الرحمٰن کو رکن کا میرٹ کہنا چاہیئے" فضل الرحمٰن کے مضامین میں طنز اور خوش مذاقی کا پہلو نمایاں ہوتا ہے نمونہ حسب ذیل ہے:۔

بیگم : میں اس سے زیادہ ٹھاٹ باٹ کا سامان خریدتی مگر آپ نے روپے کے لیے ایسا ترسایا کہ میری ہمت نہ پڑسکی۔

نواب : تمہاری ادنیٰ سے ادنیٰ خواہش کو پورا کرنے کے لیے میں اپنے بڑے سے بڑے عیش کو قربان کر دیتا ہوں۔ وہ کون سی ایسی فرمائش تھی جو میں نے پوری نہیں کی۔

بیگم : میں نے سونے کے پلنگ کی فرمائش کی تھی۔ سونے کے پلنگ پر کمخواب کا بچھونا اور مشجر کے تکیے۔ آپ آخر وقت تک مجھے دم دیتے رہے اور اس کے بعد خرید لائے تو ایک سڑا چاندی کا پلنگ۔

نواب : میں تمہارے حکم کے بموجب سونے کا پلنگ خریدنے کے لیے بازار گیا تھا لیکن کم بخت دکانداروں نے جب میرا عزم صدق اور تمہارا شوق دیکھا تو ایک کے چار مانگنے لگے۔ اس پر بھی مجھے کوئی عذر نہ ہوتا بشرطیکہ میرے پاس کافی روپیہ رہتا۔

بیگم : اسی لیے میں کہا کرتی تھی دو لاکھ نکال لو۔ ایک لاکھ سے کام نہیں چلے گا مگر آپ ہمیشہ اپنی ضد پر اڑے رہے۔

نواب : ضد مجھے نہیں اس مہاجن کو تھی جس کے پاس جاگیر رہن ہے۔ وہ قرض دینے پر آمادہ ہوتا تو میں دیوانہ تھا جو مفت کی رقم لینے سے انکار کرتا۔ تمہیں معلوم ہے قرض میری آمدنی کا واحد ذریعہ ہے۔ میرے نزدیک زیادہ قرض کے معنی زیادہ آمدنی کے ہیں۔"

(آئندہ زمانہ)

"میرے فاضل پیشرو اور قابل دوست علامہ احمد مدیر الاعلان نے ابھی ابھی جو تحریک صدارت آپ کی خدمت میں پیش فرمائی ہے مجھے اس کی تائید کا فخر حاصل ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس زمین کے اوپر اور اس آسمان کے نیچے اگر کوئی بااثر شخصیت اس غرض کیا انجام دینے کی اہل ہے تو ہمارے مشفق و کرم فرما ہمارے دلعزیز قومی کارکن عالی جناب معلی القاب اعزاز احمد صاحب کی ذات ستودہ صفات ہے (تالیاں) صاحب ممدوح کی شان میں اس ہیچ میرز نے چند ماہ قبل ایک قصیدہ کہا تھا۔ اگر آپ اجازت دیں تو اس نادر مرقع سے استفادہ کر کے بعض اشعار سے احباب کی ضیافت طبع کا سامان کروں ؎

زمین و آسماں میں شہرہ ہے اعزاز احمد کا
نہ کچھ حد ہے نہ کچھ اندازہ ان کے فیض بے حد کا
بزرگان سلف ہیں طفل ابجد خواں حضور ان کے
ہوا ہے ان سے روشن نام دنیا میں اب و جد کا"

(حشرات الارض)

(۸) جگن ناتھ پرشاد

حیدرآباد کے ایک مشہور کایستھ حکیم اور صاحب قلم ہیں۔ ۱۹۳۱ء میں ایک اخبار "دکن پنچ" ہفتہ وار شائع کرتے رہے جو ظریفانہ اودھ پنچ کا ایک چربہ تھا۔ نظم و نثر دونوں پر قدرت حاصل ہے اور ظرافت نگاری کا اچھا سلیقہ ہے۔ ملنسار، ہنسی اور خوش طبعی میں مشہور ہیں۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

> "اے خداوند توانا بزرگ و برتر جانتا ہے کہ سال گزشتہ "واٹرس کی" کا نزول حیدرآباد پر ہوا۔ ہزاروں مخلوق تباہ و برباد ہو گئی۔ کوئی برساتی نالا نہ ہوا جو ہیبوں کا نالہ بنا۔ جب تک ادھر زمین ہو گئیں، مفقود ہو گئے۔ بکس جو تین معصوم بچے وانہ دانہ کو ترسے محتاج بن گئے۔
> اے پروردگار جب اس گزشتہ کو بیا کم تھی تو اب اس سال اور ایک دوسری بلا "آئی ایف۔ اے۔ سی" کے نام سے حیدرآباد میں نازل ہے۔
> یا خداوندا! تجھ کو خوب روشن ہے کہ حیدرآباد کی مخلوق یوں ہی بے حال عاجز ہو رہی ہے۔ فاقہ اور مصیبتوں سے فاقہ ہو رہی ہے۔ اب یہ موجودہ بلا اور بھی فاقہ کر رہی ہے۔"
> (دکن پنچ جلد نمبر)

(۹) تمکین کاظمی

حیدرآباد کے ایک علمی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ منشی فاضل ہیں۔ دفتر دیوانی و مال، ملکی اسٹیٹ ریکارڈ آفس میں مامور تھے۔ اب وظیفہ حاصل کر لیا ہے۔ تمکین صاحب کو تاریخی اور ادبی شعبہ میں دلچسپی ہے۔ افسانے بھی لکھے ہیں۔ "غنچۂ تبسم" مزاحیہ مضامین کا مجموعہ شائع ہو گیا ہے۔ ان کے مزاحیہ مضامین میں دکنی الفاظ زیادہ ہوتے ہیں۔ حضرت نیاز فتح پوری نے اس مجموعہ کے متعلق حسب ذیل صراحت کی ہے:۔

> "تمکین کے مضامین کی سب سے بڑی خوبی محاکات اور تجزیہ جذبات کہلاتی ہے سو ان دونوں کی اچھی اچھی مثالیں اس مجموعہ میں نظر آتی ہیں۔ زبان کے لحاظ سے البتہ مجھے اکثر جگہ اختلاف ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ اختلاف شمال اور جنوب کا اختلاف ہے جس کا دور ہونا کبھی ممکن نہیں"

نمونہ ملاحظہ ہو۔

> "چوتھے طبقے کے لوگ فی زمانہ تو مالک ہیں مگر قربان جائیے خالق کے کہ اس تماشا گاہ عالم میں طرح طرح کے پتلے نچاتا ہے۔ ایک مولوی صاحب جو نہایت کم سخن، متین و سنجیدہ ہیں اس قدر مجبور ہیں کہ کوئی ان کے گھر پر ملنے جائے تو بازار سے منگوا کر پان کھلاتے ہیں، یہ محض اس سبب سے کہ بیوی صاحبہ پان کی فرمائش پر اس قدر خفا ہوتی ہیں کہ ان کو کم از کم

"اور روز تک پیٹ بھر کھانا نہیں ملتا۔ ایک بزرگ جب تک باہر رہتے ہیں چار پانچ ڈبیاں
سگریٹ کی خالی کر ڈالتے ہیں مگر گھر میں کھانا کھانے کے بعد بھی سگریٹ پینے کی مجال نہیں
اس لیے کہ بیگم صاحبہ کو اس سے نفرت ہے۔" (زن مرید)

مرزا صاحب کے بھکڑپن سے ہماری روح بھی فنا ہوتی ہے ہم نے سوچا کہ مرزا صاحب
سے نہ ملیں تو پھر قیامت آجائے گی۔ سنتے ہیں جہاں کہیں ملاقات ہوگی حضرت قصے
ڈالیں گے۔ وہ وہ بے نقط سنائیں گے کہ سنگ آمد و سخت آمد کہ کر بیٹھ بھی گئے
مرزا صاحب دیوان خانہ میں بیٹھے ایک صاحب کو ہنوٹ کے کچھ زبانی گُر بتا رہے تھے'
ایک شخص کو موجود پاکر سست ہوئی کہ چلو اس غریب سے مرزا صاحب کو جھک جھک
کرنے دو ہم تھوڑی دیر بیٹھ کر چپ آبیٹھے گئے مگر ہمارا اچنبھا ہی تھا کہ مرزا صاحب نے
بیانیہ ختم کر دیا اور متوجہ ہو گئے۔" (مرزا صاحب)

(۱۰) جلال الدین اشک

مولوی وحید الدین المخاطب نواب وحید نواز جنگ کے فرزند جامعہ عثمانیہ کے ابتدائی دور کے سپوت ہیں۔ بی۔ اے اور
ایل۔ ایل بی میں کامیابی حاصل کی۔ اپنی سلجھی ہوئی خوش مذاقی کے باعث ادبی حلقوں میں مقبول تھے۔ حیدرآباد کے سررشتہ کروڑگیری کسٹم میں
ملازم رہے۔ اس کے بعد پاکستان چلے گئے تھے۔ ۱۹۵۱ء میں وہاں انتقال ہوگیا تھا۔ ان کی تصانیف "شیطان کا انتقام" اور "سلک گہر" ہیں۔
شائع ہو چکی ہیں۔ سلکِ گوہر ایک ڈرامہ ہے۔ شیطان کا انتقام میں انھوں نے اس امر کو واضح کیا ہے کہ ہماری تہذیب شیطان کا انتقام ہے
جو انسان کے بچوں کے ساتھ لیا جا رہا ہے۔

نمونہ ملاحظہ ہو:۔

"شیطان کا پہلا حکم یہ تھا کہ جاؤ دنیا میں شاعری کرو مگر دیکھو اپنی شاعری میں عورت اور
شراب کے سوا کسی تیسری چیز کا ذکر نہ لانا۔ ہاں کبھی کبھی تنوع کی خاطر کچھ مرثیے بھی لکھ دینا اور
بیکھیو کبھی کبھی بہت کر کے قومی نظمیں بھی لکھ لیا کرو۔ تم جب اپنی شاعری میں عورت کی تعریف
کرو گے اور رنڈی کا وش سے اس کا سراپا کھینچو گے تو اس کے نتائج خاطر خواہ نکلیں گے۔
بہت سارے نوخیز طالب علم بہت سارے نیم تعلیم اور نیم دماغ تمہاری شاعری سے
متاثر ہو کر بہت جلد بلکہ بلوغ سے قبل ہی کسی نہ کسی فاحشہ کے دام میں گرفتار ہو جائیں گے
اور چار چھ مہینے یا شاید سال دو سال تک بڑی مسرور پُر کیف لذت بخش زندگی گذاریں گے
اس کے بعد تو اس کے بعد کیا ہوگا؟ ان کی صورتیں مسخ ہو جائیں گی' ان کے گال پچک

جاتیں گے۔ ان کے سینے سوکھ جائیں گے، دماغ ازکار رفتہ ہو جائیں گے، وہ زندہ رہیں گے
مگر اس طرح کہ دنیا ان کی نظروں میں تاریک ہو جائے گی۔"

(۱۱) یوسف ناظم

سابق حیدرآباد کے علاقہ مہاراشٹر کے باشندے۔ جالنہ اور اورنگ آباد میں تعلیم پائی تھی۔ حیدرآباد آکر جامعہ عثمانیہ سے بی۔اے کی ڈگری لی، لکچرر شپ کی خدمت پر مامور ہوئے۔ مزاحیہ اور طنزیہ مضامین کا اچھا سلیقہ حاصل ہے۔ طنز اور مزاح پر تحقیقی کام بھی کیا ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔ مرزا غالب کی جسمانی صحت کے عنوان سے جو مضمون لکھا ہے اس کا ایک اقتباس یہ ہے۔

"لیکن صرف بیٹھے رہنا غالب کے بس کا نہ تھا۔ ان کی فطری کاہلی کچھ اور چاہتی تھی غالب کریں بیٹھے بیٹھے بھی تھک جانے لگے، اسی سبب انھوں نے یہ فرمایا ؎

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیر بار منت درباں کیے ہوئے

پڑے رہنے میں بھی غالب نے کئی نکتے نکالے ہیں اور یہی مقام ہے جہاں اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ غالب نے بہت ہی عمدہ اور اعلیٰ قسم کی نفسیاتی شاعری کی ہے۔ غالب صرف پڑے رہنے کے ہی قائل نہ تھے بلکہ اس کار خیر میں انھیں نفاست اور آرام کا پورا پورا خیال رہتا تھا اور ہمیشہ بنا ہوا بستر بھی ساتھ رکھتے تھے تاکہ جب بھی بیٹھنے کا موقع ملے بستر بچھا لیں۔ فرماتے ہیں ؎

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

(۱۲) خواجہ یوسف الدین

حیدرآباد وطن، جامعہ عثمانیہ اور علی گڈھ سے بی۔اے، ایم۔اے، ڈپ ایڈ کی ڈگری لی۔ اس کے بعد انگلستان جاکر ایم ایڈ ہوئے۔ عثمانیہ ٹریننگ کالج کے لکچرار اور پھر اورنگ آباد کالج کے پرنسپل ہوگئے۔ ۵۵ سال کی عمر میں وظیفہ حاصل کیا۔ اب انوار العلوم کالج میں اپنے اوقات فرصت کو کام میں لاتے ہیں۔ کئی مزاحیہ مضمون لکھے ہیں۔ لیکن شعرائے اردو کے متعلق بہت کام کیا ہے۔ عبارت کا نمونہ پیش ہے:۔

"شیخ صاحب نہ صرف اپنے گاؤں اور شہر میں بلکہ دور دور بھی ایک ہوشیار لڑنے والے سمجھے جاتے تھے۔ لڑنے سے مراد یہاں ہاتھا پائی یا کشتی یا شمشیر زنی نہیں اس لیے کہ ان چیزوں سے ہمارے شیخ صاحب کو دور کا بھی تعلق نہ تھا۔ وہ لڑتے تھے کاغذ کی

دعویٰ اور پھر اس انہماک اور جوش و خروش سے کہ کچھ داستان کو وہ مانتے تھے اور جب یہ مشہور قصیدہ داروں، چپراسیوں اور اہل معاملہ کے مجمع میں بیٹھے ہوئے اپنے کارنامے کو نون مرچ لگا کر بیان کرتے تو کون تھا جو ان کی زبان و ذکاوت کی داد نہ دیتا۔

(۱۳) مرزا شکور بیگ

مرزا شکور بیگ مولوی عزیز مرزا کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ عزیز مرزا صاحب کا نام مسلم لیگ کی تاریخ میں ہمیشہ درخشاں رہے گا۔ حیدرآباد سے رخصت ہونے کے بعد انھوں نے مسلم لیگ کی سیکرٹری شپ کو سنبھالا تھا۔

مرزا شکور بیگ کی پیدائش حیدرآباد میں ہوئی۔ یہیں ابتدائی تعلیم ہوئی۔ جامعہ عثمانیہ سے بی۔ اے، ایل ایل بی میں کامیابی حاصل کی اور بعد کامیابی وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ اس وقت ورنگل کے مشہور ایڈووکیٹ ہیں اور آندھرا پردیش اسمبلی کے ممبر کانگریس کی جانب سے چنے گئے ہیں۔ شکور بیگ کی شاعری ان کی تعلیم کے زمانے سے شہرت رکھتی ہے۔ جب وہ ... لاء او ... ان کی نظمیں زمانہ تعلیم میں شہرت رکھتی تھیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

ممکن نہ ہو تو آنے کا وعدہ نہ کیجئے — ہم مانتے ہیں کبھی ایسا نہ کیجئے!
کہہ دو پرش کے خون تمنا کی داستاں — یہ مشورہ دیا کہ تمنا نہ کیجئے!
دینی ہو جو سزا وہ دیا کیجئے مگر — [illegible] کے سامنے [illegible] نہ کیجئے!
ہم مر گئے تو آپ پہ آخر مرے گا کون — سنتے ہیں اس سے ہیں کو سا نہ کیجئے
بیزار ہو کے یار نے مرزا سے یہ کہا — یوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھا نہ کیجئے

مجھے تو دل کو بہلانا پڑے گا — لبوں پر اپنے [illegible] پڑے گا
اگر مرزا کی آہوں میں ہے تاثیر — انھیں جھک مار کے آنا پڑے گا

موٹر ملے، مکان ملے، سیم و زر ملے — سب کچھ ملے خسر کی طرف سے مگر ملے
ہر جس کے دل میں درد وہ انسان نہیں ملا — لیڈر ملے، وکیل ملے، ڈاکٹر ملے

جو اسیرانِ قفس قید پہ اتراتے ہیں — وہ رہا ہو کے بھی صیاد کے گن گاتے ہیں
برسرِ عہدہ تو ان سا کوئی کج خلق نہ تھا — بعد پنشن کے یہ عالم کہ بچھے جاتے ہیں
کام کچھ کر کے دکھاتے نہیں مرزا لیکن
صرف تنقید بڑی شان سے فرماتے ہیں

(۱۴) ابراہیم جلیس

حکومت آصفیہ کے علاوہ کرناٹک (گلبرگہ) کے متوطن اور اب پاکستان کے باشندہ ہیں۔ میٹرک تک گلبرگہ میں تعلیم پائی اس کے بعد علی گڑھ گئے۔ مسلم یونیورسٹی سے بی۔ اے کی ڈگری لے کر حیدرآباد آئے اور کارپوریشن کار پردازی میں ملازم ہوئے۔ اس کے بعد کچھ عرصہ تک فلم میں ساحر لدھیانوی کے ساتھ کام کرتے رہے مگر یہاں کی فضا ان کے لیے سازگار نہ ہوئی۔ پھر حیدرآباد واپس ہو گئے اور ۱۹۴۸ء میں پاکستان چلے گئے اور وہاں اخباری دنیا اور پھر فلمی دنیا سے متعلق ہیں۔ اپنی مزاحیہ نگاری کے باعث پاکستان میں اچھی شہرت حاصل کر لی ہے۔ ان کی متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں ان میں سے بعض یہ ہیں۔ زرد چہرے۔ چور بازار۔ چالیس کروڑ بھکاری۔ نکتہ چیں۔ کچھ غم جاناں کچھ غم دوراں۔ دو ملک ایک کہانی۔ پبلک سیفٹی ریزر۔ جو کا ہے نگاہ وغیرہ

اس تفصیل کے بعد اب حیدرآباد کی مزاحیہ نگار خواتین کو پیش کیا جاتا ہے۔ اگرچہ بعض حیدرآباد سے پاکستان منتقل ہو چکی ہیں مگر چونکہ ان کے کارنامے ایک عرصے تک حیدرآباد میں وجود میں آتے رہے ان کو حیدرآباد سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔

(۱۵) آصف جہاں بیگم بلگرامی

ان کے والد عبدالمجید صاحب بلگرام کے مردم خیز قطعہ سے تعلق رکھتے تھے۔ عرصہ تک صدر مہتمم تعمیرات رہے حیدرآباد ہی میں انتقال ہوا۔ آصف جہاں کی پیدائش ۱۹۲۴ء میں حیدرآباد میں ہوئی۔ اگرچہ مدرسہ میں صرف میٹرک تک تعلیم پائی مگر مطالعہ کی بدولت اچھی قابلیت پیدا کر لی۔ کم عمری سے لکھنے کا شوق تھا اور مزاحیہ رنگ اختیار کیا۔ مضامین کا ایک مجموعہ "گل خنداں" کے نام سے شائع ہو گیا ہے۔ شادی کے بعد دوسری مصروفیتوں کے باعث لکھنا ترک کر دیا مگر جو کچھ لکھا ہے وہ قابل داد ہے۔ مرحوم مرزا فرحت اللہ بیگ نے ان کی مزاحیہ نگاری کی داد دی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں :-

> "یقین مانئے کہ مضمون واہ واہ ہے۔ مضمون پڑھتا تھا اور دل میں سوچتا تھا کہ یا اللہ یہ کیا ہونے والا ہے۔ ہم سمجھتے تھے کہ مزاحیہ مضامین لکھنا صرف مردوں ہی کا حصہ ہے لیکن اب معلوم ہوا کہ صنف نازک بھی ہماری حصہ دار بن گئی ہیں . . . . ہم مذاق سے مطلب کسی ہنسی کی بات پر ہنسی لیتے تھے مگر یہاں ہر فقرہ میں چٹکیاں لی گئی ہیں اور مزا یہ ہے کہ ہر فقرے پر بجائے رونے کے ہنسی آتی ہے۔"

اس سے واضح ہو سکتا ہے کہ آصف جہاں بیگم کا درجہ مزاحیہ نویسی میں کس قدر بلند ہے۔ اب وہ پاکستانی بن گئی ہیں اور وہاں ہی مقیم ہیں۔ نمونہ ملاحظہ ہو :-

> "انا۔ او ہو! اس کا تو نام بھی نہ لیجئے۔ یہ بچے کی قسمت کی مالک ہوتی ہے۔ جتنی خود میلی رہتی ہے اس سے زیادہ میلا بچے کو رکھتی ہے۔ اگر خود کا بچہ بھی ساتھ ہی ہو تو بیگم کے سامنے اپنے بچے کو

مارتی ہے۔ بیگم کے بچے کو پیار کرتی ہے۔ جب بچے کو پیٹ پیٹ کر تھک جاتی ہے تو بیگم کے سامنے جا کر اس صفائی کے ساتھ چٹکی لیتی ہے کہ بیگم تو بیگم ان کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہوتی اور وہ سمجھتی ہیں کہ بچہ ان کے پاس آنے کے لیے رو رہا ہے۔

بچہ زیادہ دق کرتا ہے تو افیون کی گولیاں کھلاتی ہے۔ محلے بھر کی رپورٹر ہوتی ہے جس محلہ میں ایک دو انّائیں ہوں تو سمجھ لیجئے کہ وہاں کسی رپورٹ کی قطعی ضرورت نہیں جہاں محلے میں کوئی ذرا غیر معمولی بات ہوئی اور اس کا پیٹ پھولنا شروع ہوا۔ یا جب اس وقت تک کم نہیں ہوتا جب تک کہ تمام محلے میں اس واقعہ کی خبر نہ ہو جائے گلی گلی پھرتی کرنے میں مشاق ہوتی ہے۔ محلے کے کس گھر میں کس نے کیا کھایا کیا کہا کہاں گیا سب اس سے معلوم کیجئے۔"

(گل خنداں)

(۱۶) تاج یٰسین علی خان

حیدرآباد کے ایک صاحب علم اور اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ مولوی غیاث الدین المخاطب نواب اعظم جنگ کی دختر ہیں۔ محبوبیہ اسکول میں تعلیم پائی۔ سید یٰسین علی خان صاحب ریلوے انجینئر کی شریک زندگی ہیں۔ اپنے شوہر کے ساتھ یورپ، آسٹریلیا اور عراق کا سفر کر چکی ہیں۔ شادی سے پہلے بھی مزاحیہ مضامین لکھا کرتی تھیں۔ آسٹریلیا کے سفر کے بعد اپنا سفرنامہ "آسٹریلیا کی جھلک" کے نام سے شائع کیا ہے۔

ان کے مضامین میں تخیل کی بلندی، نظر کی گہرائی اور مزاحیہ نگاری کی پوری قدرت حاصل ہے۔ ڈاکٹر زورؔ صاحب نے ان کے اس سفرنامہ کے متعلق جو صراحت اپنی تقریظ میں کی ہے وہ یہ ہے۔

"ان کے سفرنامے کے کچھ حصے ماہنامہ شہاب میں شائع ہو رہے تھے اور میں حیرت اور تعجب کے ساتھ ان کو پڑھتا تھا۔ اس کتابی صورت میں میں نے بڑے شوق سے اس کو پڑھا اور اعتراف کرتا ہوں کہ یہ خاتون . . . کی بڑی اچھی قدرت رکھتی ہیں اور اپنے خیال کے اظہار پر خوبی سے قادر ہیں۔ ان کی طبیعت میں ظرافت، شگفتگی اور انبساط کی کمی نہیں اور یہ سب خوبیاں ہی اس درجہ کو نہ پہنچ سکیں کہ خامیوں کی سرحد میں داخل ہوں۔"

اس صراحت سے تاج یٰسین علی خاں کی مزاحیہ نگاری کا حال منکشف ہو سکتا ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو:۔

"جب مجھے معلوم ہوا کہ یہاں بچے پیدا کرنے پر تنخواہیں دی جاتی ہیں تو اپنے یہاں کے بچے والوں کی بہت یاد آئی۔ دل میں حساب جوڑتی رہی کہ فلاں کو فی ہفتہ اتنے پونڈ ملتے اگر وہ آسٹریلیا میں ہوتے۔ بہرحال یہاں کی مائیں بھی بچے پیدا کرنے میں ہندوستان کی عورتوں سے پیچھے نہیں ہیں اور یہاں کی زمین تو ہندوستان کی زمین سے بہت زیادہ زرخیز ہے۔

اپنے خیالات میں علامہ صاحب کا ایک مصرع نورا زور سے گنگنا اٹھی۔ جیسے انھیں کوئی شرمندگی محسوس ہوئی کہ اس مصرعے سے ان باتوں کا کیا تعلق۔ اس کے کیا معنی ہیں۔ اس وقت یہاں کس مناسبت سے آپ نے یہ مصرع گایا وغیرہ۔ میں نے کہا آپ اپنے دماغ کی قیمتی مشینری کو ان معمولی باتوں سے تکلیف نہ دیں۔ یہ چھوٹے موٹے لوگوں کی باتیں ہیں۔"

(آسمانِ دنیا کی جھلک۔

(۱۷) زینت ساجدہ

حیدرآباد کے ایک مشائخ خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ اگرچہ اب پیری مریدی کا سلسلہ ان کے یہاں باقی نہیں رہا۔ قاضی محمود بحری اور شاہ نور راچوری ان کے اجداد میں شامل ہیں۔ زینت ساجدہ نے زنانہ کالج میں جامعہ عثمانیہ کے تحت اپنی تعلیم کی تکمیل کی۔ ایم اے ہو کر ملازمت اختیار کی۔ پی ایچ ڈی کا کورس بھی ختم کر لیا مگر ہنوز مقالہ پیش نہیں کیا۔

زنانہ کالج میں اُردو کی لکچرار ہیں اور اپنے علمی اور سوشیل کاموں کے باعث مشہور ہیں۔ انھوں نے افسانے بھی لکھے ہیں اور تنقیدی مضامین بھی۔ افسانوں کا مجموعہ "جلترنگ" شائع ہو چکا ہے۔ وہ ترقی پسند زمرہ میں شامل ہیں مگر ان کے افسانوں میں عریانی نہیں ہوتی۔ ان کے تنقیدی مضامین بلند معیار کے ہوتے ہیں۔ انھوں نے اپنے ادبی نقش سے اُردو کے معیاری ادیبوں میں اپنا مقام بہت اونچا بنا لیا ہے۔ مزاحیہ نگاری کا بھی سلیقہ ہے ان کی مزاحیہ نگاری کو خوش مذاقی میں شامل کرنا چاہئے۔ اخبار سیاست میں ان کے کئی مزاحیہ مضامین شائع ہوتے ہیں۔

(۱۸) جیلانی بانو

علامہ حیرت بدایونی کی دوسری صاحبزادی ہیں۔ علامہ بدایوں سے حیدرآباد آکر بس گئے۔ جیلانی بانو کی پیدائش حیدرآباد ہی میں ہوئی اور یہیں نشوونما پائی۔ خانگی تعلیم ہوئی اور رسمی تعلیم سے آپ جامعہ عثمانیہ کے بی۔ اے کے امتحان میں شریک ہو رہی ہیں۔

اگرچہ جیلانی بانو کو علمی میدان میں آئے صرف چند سال کا عرصہ ہوا ہے مگر اس قلیل عرصہ میں انھوں نے اپنے زورِ قلم کے جو نقش ثبت کر دیے ہیں وہ حیرت انگیز ہیں۔

ان کے افسانوں کا مجموعہ "روشنی کے مینار" پاکستان کے بین الاقوامی ادب کے مقابلہ میں درجہ اول کا تمغہ حاصل کر چکا ہے۔ جیلانی بانو کے افسانے پاکستانی رسالوں میں کثرت سے شائع ہوتے ہیں۔ حیدرآباد کے رسالوں کے علاوہ اخبار سیاست میں بھی ان کے مزاحیہ مضامین شائع ہوتے اور پسند کیے جاتے ہیں۔ جیلانی بانو نے صرف چند سال میں اُردو کی جو خدمت کی ہے اور ادبی میدان میں اپنا جو مقام بنا لیا ہے وہ قابلِ ستائش ہی نہیں بلکہ تعجب خیز ہے۔ توقع ہے کہ اگر آپ اسی طرح اُردو کی خدمت کرتی رہیں تو دنیائے اُردو میں ان کے کارنامے زندگیٔ جاوید حاصل کریں گے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

"آپ انفلوئنزا میں مبتلا ہیں۔ فلاسفی میں پی۔ ایچ ڈی کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ بیوی سے سخت قسم کی ناچاقی رہتی ہے۔ عنقریب آپ آٹھویں لڑکی کے باپ بننے والے ہیں۔ آپ

جنگ کے حامیوں میں سے ہیں۔ آپ کی عمر ساٹھ اور ستر کے درمیان ہے۔ پچھلی زندگی عشق میں گزرنے کے بجائے فکر کی بھینٹ گئی۔ ڈاکٹر اور دواؤں پر سے آپ کا عقیدہ اٹھ چکا ہے۔

اگر آپ ریڈیو سیلون کے نام پر مسکرا چکے ہیں تو پہلی بات یہ ہے کہ آپ "لتا" کی آواز پر مرتے ہیں۔ اس کے علاوہ محلے کی کئی لڑکیوں سے عشق کا کاروبار جاری ہے۔ آپ ہر وقت کسی نہ کسی بیماری میں مبتلا ہیں۔ لیکن آپ بے حد [illegible] کرتے ہیں وہ بستر پلنگ پر بیٹھے معمے حل کرتے ہیں۔ آپ مالکوس اور درباری کا فرق بتا سکتے ہیں۔ فلمی دنیا کی تاریخ پر آپ کو عبور حاصل ہے۔ شکیل، راجندر کرشن اور ساحر آپ کے پسندیدہ شاعر ہیں بلکہ غالب کی طرح داڑھی رکھنے کا آپ کو نیا شوق ہوا ہے۔

وحیدہ نسیم

وحیدہ نام اور نسیم تخلص۔ ان کے اجداد شمالی ہند سے اورنگ آباد آ کر بس گئے۔ نسیم کی پیدائش اورنگ آباد میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم وہیں ہوئی اس کے بعد حیدر آباد آ کر زنانہ کالج میں شریک ہوئیں اور ایم۔ ایس سی میں کامیابی حاصل کی۔ نسیم کے خاندان میں کئی اصحاب شاعر تھے۔ بچپن سے شاعری کا ماحول ملا۔ کالج کی تعلیم کے زمانہ ہی میں ان کی شاعری مشہور ہو گئی۔ ان کی شاعری کے کئی مجموعے تیار ہو چکے ہیں جن کو مختلف ناموں سے موسوم کیا گیا ہے مثلاً ۱۔ کوثر و تسنیم (نظموں کا مجموعہ) ۲۔ ساغر صہبا (غزلوں کا مجموعہ) ۳۔ تبسم حیات (مزاحیہ کلام) ۴۔ طفلستان (بچوں کی نظمیں) ۵۔ دربلا دوا (سیاسی نظمیں)۔

اگرچہ یہ مجموعے ہنوز زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوئے مگر ان میں کا ایک حصہ رسالوں اور اخباروں میں شائع ہو گیا ہے۔ ۱۹۴۸ء کے بعد نسیم پاکستان چلی گئیں اور اب کراچی کے سنٹرل زنانہ کالج میں لیکچرار ہیں۔

جیسا کہ تذکرہ کیا گیا ہے وحیدہ نسیم کی شاعری کا مزاحیہ حصہ تبسم حیات سے موسوم ہے اس میں بیسیوں نظمیں شامل ہیں۔ کلام میں ایک حصہ وہ ہے جو کالج کی تعلیم اور بورڈنگ کے قیام کے زمانہ میں لکھا گیا ہے۔ نسیم کا مزاحیہ کلام نہ صرف ہنسانے کا ذریعہ ہے بلکہ سبق آموز بھی ہوتا ہے۔ اس میں طنز کے نشتر ہوتے ہیں، تخیل کی بلندی اور زبان کی سلاست بھی ہوتی ہے ؎

گھنٹی بجی گھنٹی بجی اسے لو قیامت آ گئی — چہرے پہ سب کے دیکھو کیسی متانت آ گئی
اب پیاس بھی لگتی نہیں وہ بھوک ساری مر گئی — سب لڑکیوں پر اک خموشی کام اپنا کر گئی
معراج کیوں خاموش ہے ہاجرہ ساری کیا ہوئیں — پھر شکر جانے کیوں یہ گم ہے مہر ساری کیا ہوئیں
صفیہ سناتی کیوں نہیں سعیدہ بھی کیوں چہکتی نہیں — ڈرتی ہیں سب ایسا نہ ہو سب پر ہنسی آ جائے کہیں
گانے کی جو بیگم بھی کیوں ٹس سے مس ہو گئی — گویا کہ سب زندہ دلی خاموشیوں میں سو گئی
خاموش ہو بیٹھی ہو کیوں ہمدم سب کیا ہو گیا — سنجیدگی کے کیوں ہیں آثار چہرے سے عیاں

دھوبن کی یاد

آتی نہیں ہے اب تک وہ مہرباں ہماری — لیتی ہے نام جس کا اکثر زباں ہماری
جلدی سے اب وہ آئے قسمت کہاں ہماری — ہے کس جگہ یہ آخر دھوبن مہرباں ہماری
جائیں گے ہم وہیں جو دھوبن جہاں ہماری

چادر بہت سی میلی بستر پہ کب بچھائیں — تکیے غلاف اب سب کس طرح سے بچھائیں
بستر کی دیکھ حالت مٹی سے کیا ملائیں — لو ہی بتا دے دھوبن کاہے کو نہیں آتیں
میلی پڑی ہوئی ہیں سب ساریاں ہماری

غصے میں خوب اب کے ہم سب بگڑ رہے ہیں — دھوبن کے پاس آنے کپڑے سنتے ہیں
اور اس سے زیادہ جو کپڑے سب اپنے تہہ — دانی جو کچھ ان پر جو دھبے ہوتے ہیں
خالی پڑی ہوئی ہیں الماریاں ہماری

طویل نظم ہے۔

روشنی تم نے ہے پھیلائی بدرِ کامل کی طرح — داغ ڈلوائے ہیں پہ چشمانِ کنول کی طرح
لیکن اس پکوان پر ہے تم سے اک میرا سوال — آج کیوں روٹی پکانے کا تمہیں آیا خیال
بس حنا کے واسطے ناخن تمہارے وقف تھے — مجھ کو کب منظور تھا کہ ان پہ ہو آٹا جڑے
نقش ہی تھا بس پکڑنے کو تمہاری انگلیاں — ہے تعجب ان سے کس طرح پکائیں روٹیاں
روٹیوں کو دستِ نازک وقف تم نے کر دیا — نرگسی آنکھوں کو کیوں تم نے دھوئیں سے بھر لیا
پھول سے رخسار پر شرم کی تھی اک لہر — آگ کی گرمی سے اب وہ بن گئے ہیں تاب بھر
مسکراہٹ پھول برساتی تھی ہنس کر ہونٹ پر — آگ میں ڈالو نہ ان پھولوں کو چولہا پھونک کر
بس نسیمہ ختم کر دے شاعری کا سلسلہ
ڈر رہی ہوں حسن کا بھی بڑھ نہ جائے حوصلہ

دی ہے جو تو نے میرے تنِ ناتواں کو کھجلی — دے دی ہے تو نے یا رب سارے جہاں کو کھجلی
ناخن ہلال بن کر کھجلاتے ہے فلک کو — تارے بھی پھنسیاں سب ہیں آسماں کو کھجلی
پانی کی بھی سطح پہ یہ آبلے سے کیا ہیں — کیا ہو گئی خدایا آبِ رواں کو کھجلی
کمی نہیں ہے اک جا دستِ زباں کبھی بھی — مطلب ہے یہ ہوئی ہے دورِ زماں کو کھجلی
اک پیڑ کہ جو ہر دم کھجلا رہے ہیں پتے — گل پر ہیں داغ لاکھوں ہے گلستاں کو کھجلی

بستہ چنار ہر دم کھجلا کے روشِ گلشن — کہتا ہے سب سے سرو روشِ بوستاں کو کھجلی
کھجلی سے ہر جو فرصت توڑے نہ پھول کوئی — ہے بدعلاج بلبل ہو باغباں کو کھجلی
کوئی اگر یہ پوچھے یہ طلسم کیوں کہی ہے — کہہ دو کہ ہو رہی ہے میری زباں کو کھجلی

تنہا کھجا کھجا کے ہاں فائدہ بھی کیا ہے
ہوتی نسیم سارے ہندوستاں کو کھجلی

صفحاتِ گزشتہ میں حیدرآباد کے مزاحیہ نگاروں کا مختصر تعارف کرایا گیا ہے، ان کی نظم اور نثر کے نمونے بھی پیش کئے گئے ہیں اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ حیدرآبادی مزاحیہ نگاروں نے مختلف نہج سے مزاحیہ اور طنزیہ ادب کی خدمت کی ہے۔ انھوں نے اپنے نقشِ قلم سے تنوع پیدا کیا ہے۔ اگر ایک طرف سماج کی دکھتی رگوں پر نشتر لگایا ہے تو دوسری طرف کو ہی کی کڑوی گولیوں پر شکر لگا کر اس کی تلخی کو کم کرنے کی کوشش کی ہے۔ کہیں قہقہہ کا موقع پیدا کیا تو کہیں تبسم کی دنیا میں پہنچایا ہے۔ غرضکہ انھوں نے اپنے خصوصی قدروں کو کامیابی سے جولانی دی ہے۔ اُردو کے مزاحیہ اور طنزیہ ادب کو ترقی دینے میں ان کے کارنامے پسندیدہ اور بلند معیار کے حامل ہیں اور بعض تو اس صنف کے چوٹی کے ادیبوں میں شامل ہیں اور ان کے کارنامے زندگیِ جاوید کے مستحق قرار پاتے ہیں۔

گوئٹے

(پیدائش، خاندان اور شخصیت)

اختر انصاری

[گوئٹے اور اس کی شخصیت کے متعلق یہ مختصر مضمون تھامس مان کے ایک طویل مقالے کے ابتدائی حصے کا ترجمہ ہے۔ یہ مقالہ تھامس مان نے گوئٹے کے انتخابات نظم و نثر پر ایک مقدمے کے طور پر لکھا ہے۔ خود تھامس مان کے متعلق اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ وہ موجودہ دور میں جرمنی کا سب سے بڑا مصنف خیال کیا جاتا ہے۔ ۱۹۲۹ء میں اس نے لٹریچر کا نوبل پرائز حاصل کیا اور ۱۹۵۵ء میں اس کا انتقال ہوا۔]

اگست ۱۷۴۹ء کی اٹھائیسویں تاریخ تھی اور دوپہر کا وقت، فرینکفرٹ کے ایک معزز گھرانے میں ایک اٹھارہ سال کی کمسن ماں کی کوکھ سے جاں لیوا غیر معمولی تکلیف میں ایک بچے نے جنم لیا۔ اس کا بدن نیلا ہو رہا تھا اور وہ بظاہر مردہ تھا۔ گویا اس دنیا کی روشنی سے اس کو کوئی علاقہ نہیں ہے گویا وہ زندگی کی اس شاہراہ پر گامزن ہونے کا قطعی کوئی ارادہ نہیں رکھتا جس کے لیے یہ مقدر ہو چکا تھا کہ وہ ایک وسیع و عریض، گل پوش، مسرت بھری، جدوجہد سے لبریز، انسانی سعادتوں سے بھرپور اور رنگین و شاداب شاہراہ ہو۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ماں کے بطن کے بعد وہ براہِ راست زمین کے بطن میں پناہ لینا چاہتا ہے۔ کئی منٹ گزر جانے کے بعد بچے کی دادی نے جو پٹی سے لگی بیٹھی تھی، کراہتی ہوئی ماں سے کہا: "البزبتھ! بچہ زندہ ہے!" یہ ایک عورت کی آواز تھی جس کی مخاطب ایک دوسری عورت تھی اور بس! محض ایک انسانی آواز، محض ایک بشاشت آمیز گھریلو پیغام! تاہم ساری دنیا اور ساری انسانیت کو اس آواز کا مخاطب ہونا چاہیے تھا اور آج بھی پوری دو صدیوں کے بعد اس آواز کی بہجت آفرینی جوں کی توں قائم ہے جس طرح آئندہ صدیوں تک قائم رہے گی جب تک روئے زمین پر زندگی اور محبت کا وجود باقی ہے، جب تک زندگی خود اپنی چاہت میں غرق ہے، نہ اپنے حلاوت بھرے غم سے تھکتی ہے اور نہ اپنے وجود سے بیزار ہوتی ہے۔ اس وقت تک ایک عورت کے منہ سے نکلنے والی یہ آواز، یہ سادہ و بے لوث پکار "وہ زندہ ہے" یونہی گونجتی رہے گی، یونہی مسرتیاں برساتی رہے گی۔

وہ بچہ جس نے اس روز تاریکی سے بڑھ کر روشنی میں قدم رکھا، جس کا حلق آواز سے خالی تھا اور جس کا جسم جسدِ بے روح معلوم ہوتا تھا، بڑی لمبی عمر لے کر آیا تھا۔ قدرت کو یہ منظور تھا کہ وہ بے پایاں تحمل کا مالک ہو اور صحیح معنوں میں رشیوں اور پیغمبروں کی سی طویل زندگی بسر کرے، نشوونما اور تجدید و احیاء کی عظیم الشان صلاحیتوں کا ثبوت دے اپنی انسانی تقدیر کو بہ درجۂ اتم پورا کرے اور درجوں کی اس

عالی مقام پر فائض و متصرف ہو جو سلاطین و اقوام کو جھکنے پر مجبور کر دے اور جس کی خلقت و پیدائش کو خود اس نے ایک مرقع پر جلی سنہری کے سارے تحقیق و تجسس کا موضوع بنایا۔ گرما کی جس دوپہر کو وہ پیدا ہوا تھا اس کو ماضی کی آغوش میں گئے ہوئے تراسی برس ہو چکے تھے۔ تاریخ کے مہیب اور کروہ پیکر اجتماع اس کی نظروں کے سامنے سے گزر چکے تھے اور اس کے دل و دماغ پر چھاپ مار چکے تھے۔ ہفت سالہ جنگ، امریکہ کی جنگِ آزادی، انقلابِ فرانس، نپولین کا عروج، سقوط، مقدس رومانی سلطنت کا اضمحلال و انتزاع، نئی صدی کے آغاز کے ساتھ نئے زمانہ اور دنیا کے ماحول کی تغییر، بورژوائی عہد کی ابتدا، مشینی دور، اور ـــــ انقلابِ جولائی، وہ یہ پیشتر سالہ جو یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہے اپنی میز پر بیٹھا ہے۔ ـــ سپید مو اور بے لوچ، اس کی کنپٹیوں کے چاروں طرف بڑھاپے کے مخصوص خط کھنچے ہیں جس سے اس کی خود بینی اور ایک کمر سے قریب ہونے والی آنکھیں پرندوں کی آنکھوں کی مانند معلوم ہوتی ہیں۔ وائمر کا وہ مکان ہے جو بہت پہلے انسان کے پرستارانہ جذبات کے لیے ایک سجدہ گاہ بن چکا ہے۔ وہ اپنے دار المطالعہ میں جس کو دانستہ طور پر سامانِ تعیش سے بری رکھا گیا ہے اپنی میز پر بیٹھا ہے اور عمیق تفکر و تصور کے عالم میں اپنے قدیمی دوست، ماہرِ سیاست و ماہرِ لسانیات ولیم فان ہمبولٹ کے نام جو برلن میں ہے اپنا آخری خط لکھتا ہے:

"... اعلیٰ ترین ذہانت کا وصف یہ ہے کہ وہ ہر چیز کو جذب کر لیتی ہے اور پچا لیتی ہے،
اور اس کے باوجود اپنی ازلی تقدیر کو جسے ہم کردار کے نام سے موسوم کرتے ہیں خفیف سے
خفیف صدمہ بھی نہیں پہنچنے دیتی بلکہ حتی الامکان اس کو پختہ تر اور عظیم تر بناتی ہے۔ انسان کے
قویٰ اپنی آزاد جبلی معصومیت میں تربیت، تعمیر، تفکر، کامرانی، ناکامی، ترقی پذیری، ٹھہراؤ اور پھر
مزید تفکر کے ذریعے اکتسابی خصوصیات اور وہبی اوصاف کو شیر و شکر کر کے ایک ایسی متوازن
اور ہم آہنگ وحدت کو وجود میں لانے میں جو ساری دنیا کو سحر زدہ کر دیتی ہے۔

تمہارا مخلص دوست:

جے ڈبلیو فان گوئٹے"

کتنی پُر سطوت سادگی ہے، ذاتی قدر و قیمت کا یہ جائزہ کس درجہ سادہ و پُرکار ہے۔ اس میں بیک وقت ایک طفلانہ معصومیت بھی ہے اور ایک عفریتیت بھی، فرحت انگیزی بھی اور ہیبت آفرینی بھی۔ اس سے سولہ سال پیشتر چھیاسٹھ برس کی عمر میں اس نے اپنی زندگی کی ایک ایسی ہی جھلک اپنی ایک نظم میں پیش کی تھی جو پڑھنے والے کو "دنیا نے سحر زدہ" والے نغمے کی طرح متاثر بھی کرتی ہے اور چونکاتی بھی ہے۔ اس وقت وہ ایک نوجیہ خاتون، ایک نئی نویلی دلہن، مریان فان ولیمر کے ساتھ جو دیوانِ مشرق و مغرب میں زلیخا کے روپ میں ہمارے سامنے آتی ہے، ایک ایسے معاشقے میں مصروف تھا جو بے وقت کی راگنی ہوتے ہوئے بھی فنی اعتبار سے ایک مناسب وقت، اور یقیناً نتیجہ خیز معاشقہ تھا اور یاد رہے کہ یہ اس کا آخری معاشقہ ہرگز نہیں تھا۔ اپنے آخری معاشقے کا شکار وہ چوہتر سال کی عمر میں ہوا جب کہ سیکس وائمر کی ریاستِ اعلیٰ کا یہ والا مرتبت وزیرِ باتدبیر، یہ شہرۂ آفاق شاعر، میرین باد میں ایک دفعہ پھر رقص گاہ کا کنہیا بن گیا، وہ عشق، پیار، شیفتگی اور دل دارفتگی کے تمام ساز و سامان سے مسلح ہو کر ایک سترہ سال کی چھوکری کے ساتھ بیاہ رچانے پر کمربستہ ہو گیا۔ نتیجہ کچھ بھی نہیں نکلا، کیونکہ اول تو خود اس کے خاندان والوں نے اس کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کر لیا اور دوسرے وہ دوشیزہ بھی شادی کی کچھ بہت زیادہ آرزومند نہیں تھی۔ گو یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ اس نے پھر کسی دوسرے شخص کے ساتھ بھی شادی نہیں کی۔ بہرحال چھیاسٹھ برس کی عمر میں جب کہ وہ ایک والہانہ محبت میں گرفتار تھا اور مجبور بھی اپنے نرم مزاج شوہر کی آنکھوں کے سامنے

جو تاباں جوش و خروش سے سانسوں کی دلدادہ نظر آتی تھی اس نے یہ اشعار منظوم کیے ؎

کھل اٹھنے کا سماں ہے روز و شب ہاں محبت میں جواں ہے روز و شب
برف کے گالوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں آتشیں نقش نشاں ہے روز و شب

تو پیر رسائی ہو تو مشل ہو اک فسردہ کوہ کی ... ساری ہے
اور اس حافظ میں یہ ... زیبا اک تب و تاب اک ... الخ

جب کی آتش فشانی محض شاعرانہ مبالغہ ہے جہاں تک میں اسے جانتا ہوں اس کا دل کبھی کسی جوش سے پہلے ایک آتش فشاں کی مانند نہیں دہکا۔ وہ ہر قسم کی آتش فشانی کے خلاف تھا۔ ہمارا ایک کرسٹفل کی دنیا میں بھی اس کی یہ رمز تھی لیکن اک فسردہ کوہ کی روست• ذاتی شرف و وقار کا یہ بیان بے تعلقی سے بڑا ہے اور یہ صاف صداقت سے لبریز اپنے اندر حقیقی عظمت رکھتا ہے۔ کتنی بڑی بات ہے اپنے متعلق یہ کہنا ۔۔۔ یہ کہنے کا حق رکھنا! ۔۔۔ کہ میں ایک نہایت عظیم القدر اور رفیع الشان پہاڑ کی مانند ہوں جو اپنی حسن پرور برگزیدگی میں منفرد ہے اور بعید ہے اور اس کے باوجود ایک حلاوت بھرا حسن ہے جو اس پر رنگ و نور کی لطیف پھواریں برساتا ہے جو اس کی مہیب عظمت سے خوف نہیں کھاتا بلکہ اسے چومتا ہے، اسے سنوارتا ہے، اسے تب و تاب بخشتا ہے ۔۔۔ وہ حسن جو سحر کی مانند ہے!

علاوہ ازیں غیر جرمن قاری کی خاطر یہ بتانا ضروری ہے کہ نظم کی ہیئت کے پیش نظر دوسرے بند کے تیسرے مصرعے میں گوئٹے کا قافیہ ہونا چاہیے۔ یہ قافیہ جسے مصنف نے شرارتاً ایک مشرقی نام حاتم کے پردے میں چھپایا ہے اور جسے قاری کی منصب اور مخطوط سماعت توقع کے مطابق خود بخود مہیا کر دیتی ہے، اصل نام یعنی گوئٹے ہے۔

یہ ایک شان دار ادا پرستی ہے جس سے ہم یہاں دوچار ہوتے ہیں۔ ایک خود مستی جو انتہائی پُروقار ہے جو اپنی تکمیل، اپنی بالیدگی اور اپنے مختلف عناصر و اجزا کی چھان پھٹک میں اس شدت اور تسلسل کے ساتھ منہمک رہتی ہے کہ اس کے لیے خود پسندی جیسے ہلکے لفظ کا استعمال یقیناً نامناسب ہوگا۔ یہ دراصل ایک گہری انبساطی کیفیت ہے جو انا اور اس کے تدریجی ارتقا میں ڈوبنے سے حاصل ہوتی ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس نے ہم کو شاعری اور صداقت جیسی تصنیف ارزانی کی جو دنیا کی بہترین اور یقیناً دل فریب ترین خود نوشت سوانح عمری ہے۔ یہ صیغۂ واحد متکلم میں لکھا ایک ناول ہے جو ایک عدیم المثال اور ناقابلِ تقلید دل پذیری کے ساتھ یہ بتاتا ہے کہ ذہانت کس طرح وجود میں آتی ہے، کس طرح سے رفتہ الحال اور جوہر اصلی کسی پُراسرار مشیت کی تعمیل میں باہم یکجا و شکر ہوتے ہیں اور شخصیت کی کلی کیونکر رحمت و رافت کی دھوپ میں کھلتی ہے۔ شخصیت! گوئٹے نے اس چیز کو فانی انسان کی سب سے بڑی خوش طالعی اور خوش نصیبی بتایا لیکن یہ حقیقت میں کیا چیز ہے، کن عناصر سے ترتیب پاتی ہے، اس کا راز کیا ہے ۔۔۔ اور راز یہ یقیناً ہے ۔۔۔ یہ خود اس نے بھی واضح نہیں کیا۔ صحیح اور تلے تلے الفاظ کے استعمال سے اس کو خود بچی تھی اس کے باوجود اس کا یہ خیال تھا کہ ہر بات گفتنی اور لائقِ تصریح نہیں ہوتی۔ بہرحال شخصیت کے لفظ اور مظہر کے ساتھ ہم خالص ذہنی، عقلی اور قابلِ تجزیہ امور کی دنیا سے رخصت ہوتے ہیں اور فطری، عنصری اور ماورائی الفطری حقیقت کے دائرے میں داخل ہوتے ہیں جو ساری دنیا کو سحر زدہ کر دیتی ہے "اور بحث و تمحیص کا موضوع نہیں بن سکتی"

گوئٹے کی موت کے چند روز بعد وِلیم فان ہمبولٹ نے جو نہایت گہری مجتہد نظر رکھتا تھا اس حیرت ناک امر کا اظہار خیال کیا کہ یہ شخص

بغیر کسی شعوری ارادے اور کوشش کے محض اپنے وجود کی بنا پر بے حد و قیاس اثرات پیدا کرنے کا باعث ہوا تھا اس نے لکھا: "یہ چیز میں تخلیقی کام سے بالکل علیحدہ ہے جو اس نے مفکر و مصنف کی حیثیت سے سرانجام کیا۔ یہ اس کی عظیم اور منفرد شخصیت کا کارنامہ ہے۔" اس جملے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ شخصیت کا لفظ محض ایک لسانی ہتھیار ہے کسی ایسے مفہوم کو ادا کرنے کے لیے جس کے اظہار میں ناطقہ سربگریباں ہے، کسی ایسی تخلیق کو ظاہر کرنے کے لیے جس کے سوتے ذہنی نہیں بلکہ جبلی ہیں۔ شخصیت جو ہمہ گیر جاذبیت اور ہمہ عالم گیر کشش رکھتی ہے یقیناً ایک مخصوص و زبردست نہ کہ سادہ و نا تراشیدہ قوت حیات کی ساخت و پرداخت ہے۔ وہ مکارم و مفاسد اور محاسن و نقائص کا ایک آئینہ ہے ایک ایسے تناسب کے ساتھ اور ایک ایسے عمل کے ذریعے جو فطرت کے گہرے و ناقابلِ تجرباتی رازوں میں سے ایک راز ہے۔

صدیوں کی جرمن زندگی پر اگر نظر ڈالی جائے تو نسل و خون کے ایک دھارے کا پتا چلتا ہے جو غیر محسوس طور پر جاری ہے اور کوئی غیر معمولی چیز بھی نہیں ہے۔ یقیناً مادرِ فطرت کے سامنے کوئی نصب العین نہیں مگر ہم دیکھتے ہیں کہ گویا ایک نصب العین ہے ایک مخصوص نصب العین! چنانچہ گوئٹے اپنی آپ بیتی کی زبان سے یہ الفاظ ادا کرتا ہے:۔

"ممکن ہے کہ ایک تعبیر غیر متوقع طور پر کسی دیو زاد کو جنم دے یا کسی عفریت کو وجود میں لائے صرف اچھے اور برے انسانوں کی ایک نسل ہی پایانِ کار مسرت یا تباہی پیدا کرنے کا سبب بنتی ہے:"

دیوزاد اور عفریت یعنی فوق الفطرت مخلوق۔ اس کے ذہن میں دونوں کا خیال بیک وقت آتا ہے۔ وہ ان دونوں میں کوئی فرق نہیں سمجھتا اور جانتا ہے کہ جس طرح ابتہاج و مسرت میں ہمیشہ وحشت کا بھی ایک پہلو ہوتا ہے' اسی طرح دیو زادوں میں بھی عفریتی انداز کا پایا جانا لازمی ہے۔ صاف اور سیدھی نثر میں وہ اس بات کو یوں کہتا ہے "جب خانوادے ایک طویل مدت تک قائم رہتے ہیں تو بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ صفحۂ ہستی سے غائب ہونے سے قبل وہ ایک ایسے شخص کو وجود میں لاتے ہیں جو ایک مجموعہ ہوتا ہے اور ایک مظہر ہوتا ہے اپنے اجداد کے تمام اوصاف کا' نیز ان کے ایسے میلانات کا جو مخفی رہے اور بروئے کار نہ آسکے" یہ بات مختصر سے انداز میں کہی گئی ہے لیکن غیر منصفانہ تلقین کا رنگ رکھتی ہے' انسان اور فطرت کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد دیتی ہے اور اس کے اپنے فوق الفطرت وجود سے سوچ سمجھ کر استنباط کی گئی ہے لیکن ایسا ہوتا کیونکر ہے؟ امتزاج و التیام کا عمل کیونکر آگے بڑھتا ہے؟ نہایت خاموشی کے ساتھ اور بہت ہی دھیمے انداز میں۔ مختلف قبائل پھیلتے پھولتے ہیں اور آپس میں شادیاں کرتے ہیں۔ کاریگروں، اقوام اور پیشہ ور طبقوں میں آمیزش و اختلاط کے سلسلے قائم ہوتے ہیں۔ قدیم رواج کی پیروی میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے والا معمولی دستکار اپنے استاد یعنی مستری کی لڑکی سے شادی کرتا ہے۔ نوابی محل سرا کی کنیز سرکاری امین یا ناظم سے بیاہی جاتی ہے۔ پیدائش اور موت کی حدوں کے درمیان مجانست و مخالطت کا یہ بے ضرر عمل آگے بڑھتا رہتا ہے اور بظاہر کوئی اہمیت بھی نہیں رکھتا لیکن پھر بتدریج اس تعزز و توقیر کی شکل اختیار کرنے لگتا ہے جو ملکیت، ثقافت، شائستگی اور نجابت سے وابستہ ہے۔ یہاں تک کہ انجام کار ایک سٹی مجسٹریٹ کو وجود میں لانے کا باعث بنتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ لِنڈھائمر خاندان نے ٹیکسٹر خاندان کے ساتھ جو جرمنی کے جنوب سے آکر فرینکفرٹ میں بس گیا تھا' سلسلۂ ازدواج قائم کیا اور پھر اسی طرح ٹیکسٹر خاندان نے گوئٹے خاندان کے ساتھ جس کا وطنِ اصلی شمالی تھرنگین فاریسٹ اور ہرز کے پہاڑوں کا درمیانی علاقہ تھا' شادی بیاہ کے ناتے جوڑے۔

میرا خیال ہے کہ اس عظیم شاعر کی فطرت کا بہترین صحت مندترین اور سب سے زیادہ فیصلہ کن عنصر لِنڈھائمر خاندان کا وہ خون ہے

جو قدیم روسی امرا کے قرب و جوار سے آیا، جہاں پیوٹروسکی اور روحانیانہ نسلی معیار سے عقیدہ قیام سے متحد ہوتے چلے آرہے تھے۔ یہ اس کی نانی کا وطن تھا جو پیدائش کے لحاظ سے نسلاً جرمن خاندان سے اور رشتوں کے اعتبار سے شریف خاندانوں سے تعلق رکھتی تھی اور ایک مذہبی مبلغ دلدادہ شریف النفس بوڑھے رنگ کی مختلف تصویروں اور شبیہوں سے پتہ چلتا ہے کہ اپنی پیشانی، مونچھوں کی بناوٹ، اپنی ہماری آنکھیں اور اپنی عمومی وضع اس نے بعض سے ورثے میں پائی اور یقیناً یہی اس کی اصل تھا اس کے کلاسیکی رجحان کا، اس کی ہیئت پرستی اور وضاحت پسندی کا، اس کی تخلیقات کی اور دلکشی کا اور جرمن کردار سے اس کی عجیب ناخوشی کا جو کبھی عقیدہ کی شکل اختیار کر لیتا اور کبھی بیزاری کے روپ میں ظاہر ہوتی ہے۔

اس سب کے باوجود ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ وہی جرمن کردار اپنے خلوص اور کھرے اور عوامی انداز کا ایک اہم جزو تھا جو اس نے جنس تحیر اور مارٹن لوتھر کی نسل سے ورثے میں پایا۔ چنانچہ یہ کہنا حقیقت سے بعید نہ ہوگا کہ شاید ہی کبھی کسی ایسے شدید جرمن شخص نے المانویت پر ایسی سخت اور طنزانہ تنقید کی ہو اور یہ کہ جرمنوں کی مخصوص دشمنی یعنی خود دشمنی کی اس سے بہتر مثال نہیں مل سکتی۔

جاپانی نقطۂ نظر سے وہ خوش قسمت تھا جو اس منظر اس دیوزادوں کی دوڑ میں حصہ لینے والوں کا حصہ بنا، کچھ بہت جوہر نظر نہیں آتا تھا۔ اس کا دادا فریڈرک آگسٹ جارج گوٹ ... جو روشن خیال تھا جرمنی ہی کے ساتھ ... کا مطلع ہو گیا تھا۔ اس نے دو مرتبہ شادی کی اور گیارہ بچوں کا باپ بنا جن سے اکثر بچپن ہی میں فوت ہو گئے۔ صرف ایک ایسے تھے جو اس کے بعد تک زندہ رہے۔ ان بیٹوں میں بڑا بلا کا خدا پرست تھا اور ۳۶ سال کی عمر میں شدید دماغی خلل کے عالم میں جاں بحق ہوا۔ شاعر کا باپ پیٹر آن کیسیگر وہ بہن بھائیوں میں دوسرا تھا جن کے اپنی عمر رسیدہ والدین کی بڑھاپے کی اولاد، اس کا وجود اس امر کی جیتی جاگتی شہادت تھی۔ یہ ماہر قانون جس کے پاس سلطانی منشی کا عہدہ اور خطاب بھی تھا کچھ عجیب ... کا انسان واقع ہوا تھا۔ ایک طویل زمانہ ... اپنے پیشہ ورانہ کے سلسلے میں کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ نوادرات کا جمع کرنا اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا جس پر وہ بے حد خوش ہوتا تھا۔ اس کی فضیلت مآبی اور ساری حاشیہ ناقابل برداشت تھی۔ وہ ایک مماثل مزاج تھا جس کے ... دستور اصول پر ہوتا کہ ایک ہلکا سا تجزیہ بھی بآسانی حاصل ہو سکتا تھا۔ الیزبتھ نے جس کا باپ ڈاک مجسٹریٹ اور ماں لندھائم خاندان کی خاتون تھی اور جو ایک شگفتہ مزاج لڑکی تھی جب اس سے شادی کی تو اس کی عمر سترہ سال کی تھی۔ یعنی شوہر کی عمر سے ما قبل نصف۔ اس نے ہرگز کسی دانشمندی کا ثبوت نہیں دیا کیونکہ اسے اپنی زندگی کا بہترین حصہ ایک خود سر بیمار کی نرس کی حیثیت سے گزارنا پڑا۔ الیزبتھ کا باپ پیدا ہوا ان دونوں کا تک ... عمر بھی کم سے کم اپنی جوانی میں عزم و ایک شعلہ فرحاں رہا ہوگا جیسا کہ کہتے ہیں اپنی ماں کو کہا کرتا تھا۔ گویا وہ ایک شہد اتھا جو بے رحم کی عورتوں کے پیچھے بھاگا پھرتا تھا اور کبھی کبھی بھلا کے مرے شوہروں کے ہنستے ہی چڑھ جاتا تھا گویا ایک مجموعۂ اضداد تھا۔ ان حرکتوں کے باوجود اس میں کوئی کی صلاحیتیں تھیں، عیب جو کی قوت بھی اور ایک بیزار سالی بھی ——— وہ اسی سال کی عمر میں مرا۔ اس نے سنجیدگی، متانت، باضابطگی اور عزو وقار کا ثبوت دے کر اپنے دورِ شباب کی بے اعتدالیوں اور بدکاریوں کی بوجوہ احسن تلافی کر دی۔ اس نے اپنے آخری سال ایک پہیے دار کرسی پر ایک مسلوب الحواس مریض کی حیثیت سے گزارے۔

مدرسا الی منشیہ کی بیوی الیزبتھ کے یہاں چھ بچے ہوئے جن میں چار پیدائش کے وقت ہی یا بچپن ہی میں عالم بالا کی جانب منہ موڑ گئے۔ صرف ایک گورنیلیا نے اپنے بھائی وولف گانگ کا بچپن کے بعد تک ساتھ دیا۔ یہ ایک بدقسمت آزردہ مزاج لڑکی تھی جو اعصابی اور جلدی امراض کی شکار تھی۔ وہ سرد مہر اور ملا جنس تھی اور جیسا کہ اس کے بھائی نے کہا، بیوی بننے کی بجائے راہبہ بننے کے لیے پیدا ہوئی تھی تاہم اس نے شادی کی اور زچگی میں جس کے خیال سے ہی وہ پہلے ہی سے متنفر رکھا تھا، جاں بحق ہوئی۔ صرف وہی ایک تھا جو جیا اور اس بھرپور طریقے سے جیا گویا چھیوں بہن بھائیوں کی زندگی اسی کے حصے میں آگئی تھی اگرچہ یہ بھی صحیح ہے کہ وہ صحت و توانائی جس سے وہ محروم رہے تھے اور جس پر اس نے ایک غیر ارضی حرص و ہوس کے ساتھ متصرف ہونے کی کوشش کی، اس کے حصے میں بھی نہیں آئی۔

کیا داستانِ حمزہ کی اصل فارسی ہے؟

رازیزدانی

کہتے ہیں کہ نقارۂ خدا میں صداقت ہے یعنی جب کوئی بات متواتر ہر جانب سے شروع ہو جاتی ہے تو اسے سچ مان لیا جاتا ہے کہ عام و خواص سب سے خواص سے بھی یہ سننے کو ملتی ہے کہ داستانِ امیر حمزہ صاحبقران فارسی سے ترجمہ ہو کر اردو میں منتقل ہوئی ہے۔ حقیقت اس قسم کی غلط فہمیوں نے جو اردو کی داستانوں کے متعلق عام ہیں مجھے مجبور کیا کہ میں اپنی عمر کے تین سال داستان پڑھنے اور داستان کے سلسلے میں معلومات حاصل کرنے میں صرف کروں۔ لیکن اس مدت میں مجھے جو کچھ حاصل ہوا اس کو دیکھتے ہوئے مجھے بڑی خوشی ہے کہ یہ کہنے پر آمادہ ہوں کہ میری عمر کا یہ حصہ ضائع نہیں گیا ——— ان ہی حاصل شدہ معلومات میں ایک حقیقت یہ ہے کہ میں اس داستان کو فارسی سے ترجمہ شدہ داستان نہیں سمجھتا۔

اردو میں اس داستان کے فارسی سے ترجمہ ہونے کا ڈھونگ نولکشور پریس نے رچایا۔ کس وجہ سے؟ یہ تو معلوم نہیں لیکن بہرحال اس پر حیرت ہوتی ہے کہ اردو داں طبقہ نے بغیر کسی تحقیق کے پریس کے اس پروپیگنڈے کو قبول کر لیا ——— میں مانتا ہوں کہ جناب کے وقت پر پریس کا یہ پروپیگنڈہ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے اور تقریباً ہر کتاب کے اندر جہاں جہاں موقع ملا۔ چھاپے پر شائع شدہ داستانوں کا حصہ بنا لیا گیا ہے۔ چنانچہ نولکشوری طلسم ہوشربا جلد ششم صفحہ ۱ پر لکھتے ہیں:

"ملا فیضی صاحب وغیرہ نے جو ہفت دفاتر نوشیرواں نامہ وغیرہ تحریر فرمائے"

یہ ہے وہ پروپیگنڈہ جسے دیکھتے دیکھتے انسان کی نگاہ دھوکا کھا جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہی تو ہے کہ یہ ہفت دفاتر فارسی سے اردو میں ترجمہ ہوئے۔

صندلی نامہ کے مولف مولوی محمد اسمٰعیل اثر نے تو اس سلسلے میں وہ "تیر بے کمان" چلایا ہے کہ ———

درونِ سینۂ من زخم بے نشاں زدہ

فرماتے ہیں:

"جناب مرحوم و مغفور منشی نولکشور صاحب نے اس حقیر سے ارشاد فرمایا کہ ہر چند داستانِ حمزہ صاحبقراں کے کئی دفتروں کا ترجمہ ہوا ہے اور چند جلدیں اس کی مطبوع ہو کر منظورِ نظرِ ناظرین والا تمکین ہوئی ہیں...... ایک دفتر کا ترجمہ مجھ سے متعلق کیا جاتا ہے۔ یہ دفتر صندلی نامہ اضعف کے سپرد فرمایا اور شیخ تصدق حسین صاحب سے جن کے اہتمام سے نوشیرواں نامہ

[illegible]

[illegible]

ظاہر ہے کہ اس سے بڑی شامت اور کیا ہو سکتی ۔۔ [illegible] کا سراغ [illegible] کرنے سے اللہ کا
کوئی چارہ [illegible] ہے کہ ان دفتروں کے فارسی نسخے [illegible] حاصل ہو گئے تھے [illegible]
[illegible]
آتا ہے کہ [illegible] اردو میں ترجمہ ہو جانے کے بعد اصل مسودات کو [illegible]
میں محفوظ ہوں گے ۔ غور کیجئے ایسے فارسی مخطوطے جو [illegible] دنیا بھر کی [illegible]
کسی کے [illegible] جائیں تو وہ [illegible]
تو صاحب نظر [illegible] بیدار مغز اور روشن دماغ انسان تھے جس نے اپنی قوت [illegible] نولکشور [illegible] جیسا ادارہ پیدا کیا [illegible]
[illegible] جو آج بھی ان کے خاندان کے [illegible] کا قابل فخر [illegible] فارسی مخطوطے جو [illegible] کے حاصل
ان کو حاصل ہو گئے تھے [illegible]
دیوانے کے خواب کی طرح [illegible] کی بات نہیں ۔

میری خوش قسمتی [illegible] نولکشور [illegible] صاحب [illegible]
[illegible] شعبہ ادب [illegible] کے صدر بھی ہیں اور ماہنامہ [illegible] آپ ہی کے اہتمام سے شائع ہوتا ہے میں نے انہیں لکھا [illegible] کے
[illegible] کہ پرانے ریکارڈ میں داستان امیر حمزہ کے فارسی مخطوطے موجود ہوں تو مجھے بتائیں ۔۔۔۔ یوں تو [illegible] سلسلہ [illegible]
سے بڑی لمبی خط و کتابت ہوئی اور بہت سی کام کی باتیں ان سے معلوم ہوئیں لیکن داستان گویوں کے مفصل حالات اور ان مخطوطوں کے متعلق
آخر میں انھوں نے جو کچھ مجھے لکھا وہ حسب ذیل ہے :۔

"مطلوبہ حالات کتابوں میں تو موجود نہیں پروفیسر مسعود حسن رضوی کے ذریعے سراغ
لگا رہا ہوں ۔۔۔۔ اصل فارسی داستانوں کا کسی جگہ کوئی سراغ نہیں لگا۔ حقیقت یہ
ہے کہ دو ایک بنیادی کتب ضرور تھیں لیکن یہ داستانیں خود طبع کے [illegible] داستان گو
روز مرہ سناتے تھے اور کاتب لکھتے جاتے تھے یہاں تک کہ ان کی کوئی اصل بھی محفوظ
نہیں ہے یعنی جو کاتب لکھتے تھے وہ مسودات ۔ سامنے ایک چبوترہ پر جو اب بھی بنا ہے
یہ لوگ بیٹھتے تھے سامنے کاتب بیٹھتے تھے وہ سنتا اور لکھتے جاتے تھے اس سے
زیادہ ان کی کوئی اصلیت نہیں ہے ۔" ۲۲ر اپریل ۵۹ء

داستان گویوں کے جن حالات کا میں خواستگار تھا وہ تو [illegible] متعدد یاد دہانیوں کے باوجود آج تک نہیں ملے اور نہ اب کوئی توقع
باقی ہے کیونکہ مل سکتے تو مل چکے ہوتے لیکن اس خط نے جو میرے نظریات کے مطابق تھا اور اب تک میرے پاس محفوظ ہے فارسی مخطوطوں
کی موجودگی اور ان سے براہ راست ان داستانوں کے اردو میں ترجمہ ہونے کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ دو ایک بنیادی کتابوں کی موجودگی سے

مجھے انکار نہیں۔ یہ بے علم ہی ہے کہ شاہان اودھ نے داستان حمزہ کو دو بڑی بڑی جلدوں میں لکھوایا تھا۔ قمر لکھنوی نے طلسم ہوش ربا جلد ششم کے آخر میں شاہان اودھ کی لکھائی ہوئی ان دونوں کتابوں کا حوالہ دیا ہے۔

سب سے بڑی اور سب سے زیادہ افسوسناک بات جو غلطی سے ان دفتروں کے براہِ راست ترجمے کے خلاف کی جا سکتی ہے یہ ہے کہ نوشیرواں نامہ یعنی پہلے دفتر سے ایرج نامہ یعنی چوتھے دفتر تک جو صاحب ان دفتروں کے مترجم کہے جاتے ہیں یعنی شیخ تصدق حسین وہ داستان گو ضرور تھے مگر نیم خواندہ یعنی کم پڑھے لکھے تھے۔ اور اگر شیخ صاحب کے نام سے یہ ناموں کا عام ہے دستور ہو اس کی وہ عام گو خصوصاً تم ہو گئی تھی جس کے ہوتے ہوئے یہ کہا جا سکے کہ داستان جیسی کتاب کے لیے کسی فاضل فارسی داں کی ضرورت ہی کیا تھی۔ دوم یہ کہ ایک نیم خواندہ شخص فارسی کے عام محاورے جانتا ہو تو شاید اس کام کو کر بھی سکتا لیکن اس عہد میں داستان گوئی کرسیوں پر بیٹھنے والے ایک نیم خواندہ شخص کے لیے تو اور زیادہ مشکل ہے کہ وہ فارسی سے ترجمہ کر سکے۔

طلسم ہوش ربا کے۔ دیکھنے والے ہیں قمر لکھنوی اور جاہ لکھنوی ان دونوں نے اپنے اپنے مقام پر تسلیم کیا ہے کہ داستان حمزہ اور طلسم ہوش ربا دونوں میں خود لکھنؤ کے داستان گویوں نے اضافے کیے ہیں مثلاً جاہ لکھنوی لکھتے ہیں:۔

"یہ بھی واضح ہو کہ صاحب دفتر نے ہم اور اصل مصنف سے ہو گی، حال جہانگیر نہیں
لکھا ہے بلکہ یہ لکھا اب ہے ایک دوست شیخ تصدق حسین نامی ایک داستان گو نے
انھوں نے بیان کیا تھا۔" $(\frac{۴۹۳}{۴})$

گویا طلسم ہوش ربا میں جہانگیر صاحبقراں کی داستان اور طلسم کو کب کے توڑنے کا ماجرا خالص شیخ تصدق حسین کا بنایا ہوا ہے۔ قمر لکھنوی نے طلسم ہوش ربا کی چھٹی جلد صفحہ ۱۸ پر داستان حمزہ میں اپنی کاٹ و بریدے کے متعلق اور زیادہ واضح اعتراف کیا ہے۔

"بعض صاحبین نے داستان قدیم و جدید کو سماعت فرمایا ہے لیکن حقیقی آرزو رکھتے ہیں
ارشاد فرماتے ہیں کہ جس طرح سے تحقیق میں دفاترِ یعنی نوشیرواں نامہ وغیرہ و طلسم ہوش ربا
تو نے بیان کیا یہ داستانہائے دلچسپ کبھی نہ سماعت کی تھیں۔"

ابتدائی سطریں پڑھ کر ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ شاید قمر نے طریقہ بیان کی دلکشی کے متعلق کہا ہو لیکن "یہ داستانہائے دلچسپ" جو قمر کی زبان کے علاوہ کبھی سماعت میں نہ آئیں ان سے تو یہی مطلب نکالا جا سکتا ہے کہ قمر نے جہاں موقع پایا کچھ ٹکڑے اپنی طرف سے پیوند کر دیے۔

یہ کیفیت "داستان حمزہ" کی صرف اسی عہد سے ہمارے سامنے ہے جب سے اُردو میں داستان گوئی کا رواج پڑا اب ذرا ۹۸۰ھ اور ۱۰۲۲ھ سے تیرھویں صدی یعنی تقریباً ۱۲۲۵ھ تک کی اس کیفیت پر غور کیجئے جو ایسی قصہ خوانوں کے عہد میں اس داستان پر گزری ہو گی اس کا ایک اندازہ بوستان خیال سے ہوتا ہے۔ بوستان خیال ۱۱۵۵ھ سے ۱۱۷۵ھ تک لکھی گئی ہے یعنی داستان حمزہ کے ہندوستان میں آنے سے تقریباً سو سوا صدی کے بعد میر تقی خیال رموز حمزہ کے ساتھ ساتھ کوچک باختر اور بالا باختر کا حوالہ دیتے ہیں — (مقدمہ الابصار ۱/۱) گویا اس زمانہ تک نوشیرواں نامہ، کوچک باختر اور بالا باختر کے نام بھی مخصوص ہو چکے تھے حالانکہ ابتدائی رموز حمزہ میں جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں صرف دو نام پائے جاتے ہیں ایرج نامہ اور صندلی نامہ اس سے صاف ظاہر ہے کہ عراق اور ایران کے

موضوعات میں تبدیلیاں اور اضافے بھی کر دیے گئے جو قصہ ہندوستان کے لفظ … ہیں۔

اس تبدیلی کا اندازہ ہمارے مخطوطات سے ہوتا ہے جو داستان کے … کے طور پر … ملتے ہیں مثلاً

نمبر ۲۰۵۲ مجموعہ نوشیرواں نامہ کوچک باختر و بالا باختر و ایرج نامہ … کاتب … ترتیب ۱۲۶۹ھ،

تعداد صفحات ۱۰۵۲ … آغاز … سب … کی ابتدا یوں ہے۔

بعد [illegible]

[illegible]

اور خاتمہ اس طرح ہے:

… تمام شد …

… چوگان …

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۰۲۲ یا ۱۰۹۹ صفحات … ۲۰۵۸ … صفحات … تفصیل یہ ہے … ہزار … چوگان … ۲۰۰ … اور … ہیں۔ مجموعہ سب کہاں … داستان … سامنے نہیں ہے۔

نمبر ۲۰۵۳ نوشیرواں نامہ ۔ ۔ ۔ ۔ … تعداد صفحات ۱۰۸۴

نمبر ۲۰۵۴ مجموعہ کوچک باختر و بالا باختر تعداد صفحات ۱۱۳۴

صاف ظاہر ہے کہ ۲۰۵۲ پر نوشیرواں نامہ کوچک باختر، بالا باختر اور ایرج نامہ کا جو مجموعہ تھا اس کے صفحات کی تعداد کل ۱۰۵۲ تھی۔ نمبر ۲۰۵۳ پر صرف نوشیرواں نامہ آیا اور اس کے صفحات کی تعداد ۱۰۸۴ ہو گئی یعنی صرف نوشیرواں نامہ کے صفحات پورے مجموعہ سے بقدر ۳۲ صفحے بڑھ گئے۔ یہی حال کوچک باختر و بالا باختر والے مجموعہ کا ہے کہ ان کے صفحات پورے مجموعہ سے بقدر ۸۲ کے بڑھے ہوئے ہیں۔

یہیں ۲۰۴۹ کے ایرج نامہ کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس پر کاتب کا نام درج نہیں اندازہ کیا گیا ہے کہ یہ بارھویں صدی ہجری میں تحریر ہوا ہے اس کے صفحات کی تعداد ۸۵۰ ہے گویا صرف ایرج نامہ کی ضخامت۔

یہ مخطوطے اپنی زبان کے لحاظ سے … کو نہیں پہنچے بلکہ ان میں ادبی چاشنی نہ ہونے کے برابر ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے ترتیب دینے والے فارسی کے ادیب نہیں تھے ان کو پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ فارسی سے معمولی شد بد رکھنے والا کوئی ایسا شخص فارسی لکھتا چلا جاتا ہے اس اپنے زمانے کی عام شہرت کی لسانی … سے بلند نہیں بلکہ ۲۰۵۰ پر چوگان … کے نام سے ایک مخطوطہ ہے اس کے ترتیب دینے والے کی فارسی دانی اس نوعیت کی ہے کہ

(۱) صاحبقراں خواجہ عمرو سے اصرار کر رہے ہیں کہ تم بتاؤ زمرد شاہ لعین تھا کہاں بھاگ گیا اور اگر نہ بتاؤ گے تو … دنیا کے خدا ہم ساخت (۸ سے ۱۰ تک کسی صفحہ کی پانچویں سطر)

(۲) صفحہ ۲۳۳، سطر ۱، ماذیں مسل مکانی کرشانا ضمیمہ اکرشانی صحیح کرشانا؛

(۳) صفحہ ۹۴ سطر ۱۲ تا بہشت صفحہ ۲۴۳ - عمرو دو گرمی جشید صفحہ ۲۴۵ - عمرو عیار کو کشتی سفر میں غائب شد صفحات ۱۰۱،
۴۴۰ پر دفعتاً اردو لکھنا شروع کر دی ہے مثلاً گفت اے عمرو صاحبقراں مرا ملک صدرش پرویں پرست ہو کر نائب خدا منہدم کر
پہنچ گر دار ہے وہ بغیر نامہ سلام آیا ہے اس نے بھیجا ہے۔

گویا اس مخطوطے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فارسی نویس دور کے عام دفتری الفاظ سے اختیار کی گئی ہے یعنی کاتب فارسی سے زیادہ اردو سے واقف رہے اور جہاں وہ فارسی سے الجھتا ہے بے تکلف اردو شروع کر دیتا ہے لیکن جیسے ہی اسے محسوس ہوتا ہے کہ میں اردو لکھ رہا ہوں اور زمانہ فارسی کا ہے وہ فارسی شروع کر دیتا ہے۔

بہر حال یہ مخطوطے خواہ ان کی ادبی حیثیت کچھ ہی کیوں نہ ہو ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ رموز حمزہ میں فارسی قصہ خوانوں نے بہت سی آمیزیاں کی ہیں۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ چودھویں صدی کے شروع اور بارھویں صدی ہجری کے اواخر تک قصہ خوانی کا فن ہمارے دور میں منتقل ہو جانے کے بعد بجائے قصہ خوانی کے داستان گوئی کا فن کہا جانے لگا کتاب بہ کتاب نہیں بلکہ سینہ بہ سینہ منتقل ہوا ہے یعنی ہر عہد کی کتابوں کا ریکارڈ ہمارے سامنے نہیں بلکہ ہوا یہ ہے کہ کسی عہد میں کوئی مشہور قصہ خوان پیدا ہوا، اس کے دس بیس شاگرد ہوئے ہر شاگرد اپنے جوہر ذاتی کے مطابق قصہ خواں ہو گیا۔ کچھ استادوں نے اپنی طرف سے اصل داستان میں چند گلشے کچھ شاگردوں نے استاد ہو کر اپنی کثرت محنت کے جوہر دکھائے اور پھر شاگرد کے جانشینوں کے؛ تو جب داستان آئی تو انھوں نے بھی کمی نہیں کی۔ اس عالم میں ذرا اس کا اندازہ بھی کیجئے کہ ہر دور میں صرف ایک ہی قصہ خواں نہ رہا ہوگا یا ایک ہی قصہ خواں کا ایک ہی شاگرد کامل الفن نہ ہوا ہوگا۔ ہر دور میں کئی قصہ خواں ہوئے ہوں گے، ایک ایک قصہ خواں کے کئی کئی شاگرد اپنے فن میں کامل ہوئے ہوں گے۔ ہر استاد نے دوسرے سے آگے جانے کی کوشش کی ہوگی۔ ہر شاگرد نے اپنے ہم جماعت سے جداگانہ طرز بیان اختیار کرنے کی کوشش کی ہوگی اور داستان حمزہ ہر دور میں کچھ نہ کچھ آگے بڑھتی ہی ہوگی۔

ان حالات میں منشی نولکشور کے اس زمانے تک جب انھیں اس داستان کو چھاپنے کا خیال پیدا ہوا اگر "رموز حمزہ" سے آگے بڑھ کر داستان حمزہ اپنی مطبوعہ حدود تک آگئی تھی تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے اسے ضرور آگے بڑھنا چاہیے تھا۔ یہ چند کے مشہور قصہ خواں کے ہاتھوں ضرور آگے بڑھی لیکن قصہ خوانی کا فن چونکہ "علم سینہ" میں شامل تھا اور ظاہر ہے کہ علم سینہ کے متعلق روایت یہی ہے کہ "گنجینہ در سفینہ" اس لیے اس کی کوئی تحریری یادگار کسی عہد میں قائم نہیں ہوئی نہ کبھی یہ موجودہ سلسلے کے ساتھ کتابی صورت میں لکھی گئی ——— اگر ایسا ہوتا اور یہ فارسی میں کبھی سلسلہ وار لکھی جاتی تو اس کے مکمل مخطوطے خواہ بوڈلین لائبریری اور انڈیا آفس لائبریری میں ہوں یا نہ ہوں لیکن رضا لائبریری رام پور میں ضرور ہوتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد سے جب روہیل کھنڈ پر روہیلوں کی حکمرانی از گنگ تا سنگ سے محدود ہو کر صرف رام پور کی حدود تک رہ گئی اور "کمپنی بہادر" کی حکومت کی "ناخواستہ سرپرستی" نے "حوصلہ مند اور مہم جو" روہیلوں کی تلواروں کو نیام کر کے گھر کی کھونٹیوں پر لٹکا دیا تو ان شیران نیستان شجاعت نے میدان جنگ کی خوں ریزی کے جذبہ کو مطالعات بشعلۂ داستان جنگ و عشق کی صورت میں ڈھال دیا۔ "پٹھان شاعری کرنے لگے" اور دربار رام پور داستان گو صاحبقراں سننے لگا۔ دہلی اور لکھنؤ کے منتخب داستان گو دربار رام پور میں جمع ہو گئے چنانچہ بوستان خیال کی ژولیدہ بیانی کو رفع کرنے

اور داستانِ حمزہ کو زبانی کہنے والوں سے اس قدر ہی نہیں کہ نول کشور پریس سے جب چھپ کر عام ہوا
یہ بات ہم کو تسلیم کرنی ہے کہ یہ حقیقت ہے جو آج ہمارے سامنے ان داستانوں کے [illegible] سے ثابت ہوتی ہے۔ آخر
کیا بات ہے کہ [illegible] حمزہ کے بعد [illegible] یہ داستان [illegible] جیسا ہوا [illegible] اور [illegible]
کبھی داستانِ حمزہ کا کوئی فارسی سلسلہ اپنے مستقل کتاب [illegible] پایا جاتا ہے۔ [illegible]
پایا جاتا ہے۔ اس کا [illegible] سلسلہ [illegible] ثابت کر سکتے ہیں کہ [illegible]
اور پھر اس کا اردو میں ترجمہ کرنے کا کام [illegible] مصنف [illegible] نے اجازت دی [illegible]
اور [illegible] نول کشور پریس لکھنؤ نے [illegible] اسے مکمل کر دیا۔

[illegible] کے سست رفتاری سے [illegible] ہو گئے [illegible] کے سامنے
[illegible] جانتے تھے کہ [illegible] کامیابی ہے [illegible]
اس کے بعد [illegible] کے [illegible] ہو گئے [illegible] سست [illegible]
جس قصہ [illegible] کہیں [illegible] پایا جاتا [illegible] کوئی مکمل [illegible] داستانِ حمزہ [illegible]
کہیں نہ تھی۔ اگر کہیں ہوتی تو [illegible] پوری [illegible] قیمت [illegible] کوشش سے کام کر نہ
سکی۔ اس لیے کہ کہیں ہوتی تو آتی — جس [illegible] داستان [illegible] مصنف [illegible]
دوسرے [illegible] نول کشور سے کہہ کر [illegible] گئے — بہرحال یہ کہیں کسی کہانی [illegible] پہلے [illegible]
تو [illegible] نے لکھنا چاہی۔ [illegible] کے ساتھ [illegible] مکمل صورت میں — [illegible] نواب احمد سعید خاں [illegible]
کے [illegible] نواب [illegible] خاں کے [illegible] اس کی داستان [illegible] آثار [illegible]
اور [illegible] کا [illegible] داستانِ حمزہ کا [illegible] اسی سلسلہ [illegible] تفصیل سے پایا جاتا [illegible]
صورت میں پایا جانا ثابت نہیں — ثابت ہوتا ہے کہ داستانِ حمزہ [illegible] کے علاوہ اسی صورت میں داستان گو [illegible]
[illegible] نول کشور پریس نے داستان گویوں سے [illegible] اردو میں لکھوایا اور طبع کر کے شائع کر دیا۔

پہلے ۱۹۵۲ء میں

پھر ۱۹۵۴ء میں

نقوش

کے افسانہ نمبر منظرِ عام پر آئے تھے

اب ۱۹۶۰ء میں بھی

ایک غیر فانی افسانوی دستاویز

پیش کی جائے گی

دل شاہجہانپوری کا غیر مطبوعہ کلام

جو تحریریں خاص [illegible] دل شاہجہانپوری کا وہ غیر مطبوعہ [illegible] منقول ہے جو اب تک [illegible]

[illegible] تحقیق [illegible] شائع نہیں ہوا ہے۔

[illegible] ۱۹۵۵ء [illegible] آخر [illegible] شعر [illegible]

[illegible]

[illegible] صبح [illegible]

شاغل جاری رہ سکے۔

۲۴ دسمبر [illegible] کا [illegible] بہت [illegible]

اور ایک شعر کہا ہے

بہت ہے [illegible] تھی [illegible] ہستی

ساقی کچھ کسی سے کچھ لیں سے

۲۵ دسمبر [illegible] طبیعت [illegible] بہت [illegible]

سے [illegible] [illegible] ایسا معلوم ہوتا تھا [illegible]

میں دو مصرعے پڑھے

(۱) جیسی اب ہے مری حالت کبھی ایسی تو نہ تھی

(۲) اجل اتنی تو مہلت دے کہ اک سجدہ ادا کر لوں۔

۲۶ دسمبر کو صبح کو پکارا تو کوئی جواب نہیں دیا۔ قوت گویائی ختم ہو چکی تھی۔ ناک سے کچھ خون بھی بہا۔ ڈاکٹر نے دیکھ کر کہا کہ دماغ پر فالج کا شدید حملہ ہو گیا ہے۔ موت و حیات کی اس کشمکش میں اسی دن کے نہایت سکون کے ساتھ روح پرواز کر گئی۔ ۶ بجے شام بعد نماز مغرب سپرد خاک کر دیا گیا۔"

حسن نے مان لیا قابلِ تعزیر مجھے
نظر آئی ہے محبت کی یہ تقصیر مجھے

کیوں نہ ہو بادۂ سرجوش کی توقیر مجھے
مل گئی پیرِ خرابات سے تحریر مجھے

جلوۂ حسن کے مفہوم پہ جب غور کیا
ایک دھندلی سی نظر آئی ہے تصویر مجھے

اب مری وحشتِ رسوا کا عجب عالم ہے
کر دیا آپ نے وابستۂ زنجیر مجھے

بے تکلف رخِ زیبا سے اٹھائے وہ نقاب
حسن خود پائے گا اک پیکرِ تصویر مجھے

زندگی اک نئے عالم میں نظر آتی ہے
لے چلی آج کہاں گردشِ تقدیر مجھے

بھا گئی دلکشیٔ حسن مری نظروں میں
جی بہلنے کو ملی آپ کی تصویر مجھے

زلفِ شب گوں رخِ انور کی ستائش کے سوا
کوئی مضموں نہ ملا قابلِ تحریر مجھے

حسنِ دلکش کے تلوّن پہ نظر جب پہنچی
نہ رہا پھر گلۂ گردشِ تقدیر مجھے

ہر سانس ہے شرحِ ناکامی پھر عشق کو رسوا کون کرے
تکمیلِ وفا ہے مٹ جانا، جینے کی تمنا کون کرے

جو غافل تھے ہشیار ہوئے جو سوتے تھے بیدار ہوئے
جس قوم کی فطرت مردہ ہو اس قوم کو زندہ کون کرے

ہر صبح کٹی، ہر شام کٹی، بیداد سہی، افتاد سہی
انجامِ محبت جب یہ ہے اس جنس کا سودا کون کرے

حیراں ہیں نگاہیں دل بے خود مجبور ہے حسن بے پروا
اب عرضِ تمنا کس سے ہو اب عرضِ تمنا کون کرے

فطرت ہے ازل سے پابندی کچھ قدر نہیں آزادی کی
نظروں میں ہیں دلکش زنجیریں رخ جانبِ صحرا کون کرے

○

جہاں تک عشق کی توفیق ہے زخم بناتے ہیں
وہ سنتے ہیں جو ان کو سرگزشتِ دل سناتے ہیں

ادھر حق الیقیں ہے اب وہ تنہا اٹھ آتے ہیں
اُدھر انجم مری اس ذہنیت پر مسکراتے ہیں

شبِ غم اور مجبوری، یہ عالم اور مجبوری
ٹپک پڑتے ہیں آنسو جب وہ ہم کو یاد آتے ہیں

وہیں سے دورِ حسن و عشق کا آغاز ہوتا ہے
جہاں سے واقعاتِ زندگی ہم بھول جاتے ہیں

ہمیں کچھ عشق کے مفہوم پہ ہے تبصرہ کرنا
اک آہِ سرد کو عنوانِ شرحِ غم بناتے ہیں

بہا کر اشکِ خوں کھینچی تھیں جو آئینۂ دل میں
ہم ان موہوم تصویروں کو اب رنگیں بناتے ہیں

شبابِ زندگی، جلووں کا اک معصوم نظارہ
ہمیں اے دل وہ افسانے ابھی تک یاد آتے ہیں

○

بے سود ہے یہ جوشِ گریہ اے شمع سحر ہو جانے تک
چھینٹا تیرے اشکِ پیہم کا پہنچا نہ کبھی پروانے تک

اے اہلِ نظر میری ہستی سب کچھ تھی کبھی اب کچھ بھی نہیں
زندہ ہوں مگر معیارِ بقا اک سانس کے آنے جانے تک

ہاں غور سے اک خود دار نظر اپنے ہی گریباں پہ ناصح
کیا جانے رہے گا کس حد میں دیوانہ تجھے سمجھانے تک

اے خاکِ پریشاں کے ذرّو، آغوش میں تم مجھ کو لے لو
تمکین و خودی کو ٹھکراتا آیا ہوں میں ویرانے تک

آشفتہ نظامِ ہستی ہے کچھ اور نہ برہم ہو جائے
مشاطۂ فطرت کے ہاتھوں گیسوئے بتاں سلجھانے تک

وعدہ ہے مگر کس عالم میں اک شوخ تغافل فطرت کا
جب لیلئ شب کے بل کھاتے گیسو اتر آئیں شانے تک

○

اب کوئی غم گسار ہمارا نہیں رہا
دنیا کو اعتبار ہمارا نہیں رہا

اس فرطِ غم میں خون کے آنسو نکل پڑے
اب دل بھی رازدار ہمارا نہیں رہا

اس کی حضورِ پیرِ مغاں میں ہے منزلت
جو عہد پائیدار ہمارا نہیں رہا

ہر داغ ابھر کے زخم بنا زخم رشکِ گل
دل مائلِ بہار ہمارا نہیں رہا

یہ ہے مآلِ صحبتِ زاہد جناب دلی
رندوں میں اب شمار ہمارا نہیں رہا

حامد عزیز مدنی

اے عروسِ سخن

ہزار درد خریدے ہیں میں نے دل کے لیے
ہزار شیونِ جاں ہے کہ ایک پردہ ساز
ہزار کاوشِ سخن آشنا کے بعد بھی کچھ
لرز رہی ہے ترے نام سے مری آواز

تجھے خبر ہے مری لے ہے ایک مدت سے
ہجومِ کاوش میں مانند آتشِ چقماق
اسی خزاں میں جو موجِ نفس کے ساتھ گئی
ملیں گے صوت و صدا کے ہزارہا اوراق

سکونِ ہجر میں بدلی تھی آرزوئے وصال
کہ دستِ شوق سے دامن تھا نارسیدہ بہت
تو ہی تو غلوتی دیر آشنا ——— نکلی
رسومِ پردہ کشائی سے سرکشیدہ بہت

کوئی محل یہ تری برقعِ انگنی کا نہ تھا
تجھے خبر ہے مرا کارواں ہی راہ میں ہے
یہ نذرِ اوّل و آخر ہے اے عروسِ سخن
رگِ گلو کا لہو تیری بارگاہ میں ہے

معذرت

(معذرت میں بھی پشیمانی ہے) قمر

ہم نے مانا نژادِ نو ہے ابھی
شبِ تیرہ میں مینڈکوں کا جلوس

صنعتِ خامہ کار کے ہاتھوں
حرف کے آئینے میں سب معکوس

اب وجہ کی زباں ہے اس کے لیے
اجنبی ملک کا کوئی جاسوس

اس کی لکنت ہے آپ اک معترض
اس کی فرہنگ طائرِ محبوس

وہ گمانِ محاورات سے ہے
میوۂ خشک و تر سے مایوس

اس کے شربِ مدام کی حد طرف
ہر پیالے میں عکسِ چین و روس

اس کے ارژنگ میں نہیں ملتے
چشمِ آہو و کلغیِ طاؤس

یہ کہ محرومِ دانشِ پیشیں
یہ کہ نا آشنائے گبر و مجوس

لیکن اسے قبلۂ سخن گویاں
خام جنبانِ راہ کا یہ جلوس

کس سے کہیے کہ کس طرف ہے رواں
بات پر ہول راہ نا مانوس

ہر نفس اک سکوتِ مرگ اثر
ہر نفس اک صدا ہے قرنا و کوس

ہر ہیولے میں ایک عالمِ جان
ہر تصور میں عالمِ محسوس

جن رصدگاہ کے پڑھاتے ہیں
بند سرو بیت کا نیا قابوس

ہر مساوات کیمیائی ہے
سرِ مجلس اشارۂ مانوس

آج جادوگروں کے منتر سے
کوزۂ گل میں بھر اقیانوس

فرصتِ یک نفس نہیں ملتی
ایک ہی رُت ہے، کوئی ماگھ نہ پوس

دل میں اُتری ہے موجِ زہرآگیں
سر پہ ٹھہری ہے ساعتِ منحوس

کیا حنا بندیٔ عروسِ خیال
کیا عروسِ خیال کا ملبوس

رشتہ ہائے نظر دھواں ہیں تمام
بجھ گئی شمع سو گئے فانوس

زخم سر سے بدل گئے یہ لوگ
تاب صد آبگینۂ ناموس

مُجرم

کل صبح کی تازہ دم ہوا میں
بازو پہ مرے وہ سو گیا تھا

تالیفِ خیال کر رہی تھی
اسلوبِ بدن کی خوشگواری
کیا کیا تھی نزاکتوں کی ہم راز
چادر تھی کہ نافۂ تتاری
ساحل کے سکوں میں کھو گیا تھا
ٹھہرا ہوا رود ہم کناری
کب سے ہے وصال کا یہ انداز
آئینِ وجود و ضربِ کاری
جو ہاتھ اُسے حریفِ تعزیر
اس ہاتھ کی ضرور پاسداری۔
اِنسان کے قدیم جرم ہی نے
رکھ دی تھی بنائے غم گساری

آبادی کے دائرے

اے برادر۔ بازداں مکار تاری۔ کچھ نہ پوچھ
یہ سرِ قرطاس آبادی کے دکھوں۔ دائرے
کس کے یہ تابوت ہیں کس کی عماری کچھ نہ پوچھ

سرد تاریکی میں دھندلے دائرے کھوئے ہوئے
بے نکالی کھیتیاں تشکیک کی ہیں دُور تک
پیچ چوب و دار کے الفاظ میں بوئے ہوئے

دائرے تاریک، خونیں، آتشیں ژولیدہ مو
آپ خود اپنا غیاب و آپ خود اپنا حضور
جنبشِ پرکار کا دوڑا نہیں جن میں لہو

نیشِ عقرب کی طرح حرص و ہوا کی بے کلی
دل زدوں کے دائرے تیرہ طلب کی بارگیں
رشک کے تاریک کوچے خوف کی اندھی گلی

نین کے زینے، پرانی بوتلیں، میراثِ جد
علم کی بے حس کمیں گاہیں جن کی اوٹ سے
کاٹ دی ہے دیمکوں نے زندگی کی تازہ حد

مہروشانِ نیم رُخ کے عارضِ عصیاں کے خواب
آسیا گرداں بتول و مریم تنہا نشیں!
آتشِ خوابِ زلیخا، روزنِ زنداں کے خواب

اک بدن رقاصِ حبشی، آبنوسی اک شجر
طبل کی آواز سے جنتی درندوں کی عیاں
مہروشانِ نیم عریاں کی بلوتی ہے — کمر

عارضِ زرخیز، چٹیل آب و روغن کے حصار
بطنِ معدن آگ دریاؤں کے چہرے آئینے
حلقہ ہائے باد و باراں، کشت و خرمن کے حصار

ٹینک سے دبتے ہوئے بیجوں میں فصلیں بے سبیل
رحم میں تاریخ افلاسِ جہاں، لب پر سوال
خشک سالی، خشک سالی سے زمیں کے رُخ پہ نیل

سخت تریاکی دھوئیں میں ضو فشاں محنت کی آنکھ
سوئیاں قیاب میٹر بجلی ہیں محوِ شمار،
پڑھ رہی ہیں ایک تحریرِ رواں محنت کی آنکھ

ساحلوں کا جن ہے خوابیدہ جہازوں کی قطار
پی رہے ہیں رات کی نیلی سیاہی میں لہو
وہ رتیک پٹرول کے چشموں پہ گرگِ ریشہ دار

ہم غسل میں گم ہو خود مہیا رہیں سکیں
بازیِ چوگاں، خداؤں کی بساطِ خاک — پر
خوں منہ کو لگ گیا ہے جنہیں اوتاروں سکیں

وقعت بے تقریر ہے ذوقِ جنوں کے واز میں
سر بریدہ جا رہیں، زندگی ٹھنڈی وحشوں کے ہم
زندگی کی وحشتوں میں یک نیزہ خوں کے ساز میں

اے برادر یوں نہ جا، ان وادیوں سے دور ہیں
تیرتا ہے اس فضا میں ایک ہجوم ارواح کا
اس طرف دوزخ کی آبادی کا آغاز ہے سنو

دائرے وہ زندگانی کے سفر کی راہ میں
راستہ کھویا ہوا، تاریک جنگل کا محیط
روشنی آتی نہیں ہے علم بے آگاہ میں

کوئی شاخِ آشنا

شہر پر نیلے دھوئیں کی ساحری زنجیر ہے
جل رہا ہے سینۂ خورشید میں داغِ غروب
روشنی مجروح طائر کی طرح — دلگیر ہے

کچھ غلامانِ کہن پرچھائیاں حبشی نژاد
کھینچے نکلے ہیں عصیاں کا سبک رفتار رتھ
وقت کی جنبش بدی کے چاک کو دیتی ہے داد

خواب و بیداری کے تیرہ فاصلوں کے درمیاں
کتنے اندیشوں کی بے حلقہ جبیں کھول کر
ناپتا ہے اس خلا کو ایک وقتِ رائگاں

رات کے ہاتھوں چلے جانے کو ہیں نیلام میں
شہر، بندرگاہ، سیارے، سمندر روشنی
دور تک بکھری ہوئی اشیا ہیں اک گودام میں

جزر و مد کے بیچ میں ساحل کا ساکت پاؤں ہے
سو رہے ہیں آہنی جہازوں کے قطار اندر قطار
سینۂ قلزم میں گم ہوتی ہوئی اک چھاؤں ہے

روحِ قزاق و سکندر۔ لشکری ہو رہے
ان حریفانِ تلاطم سے یہاں سر ہوتے نہیں
قلزمِ چناب کس کی آرزو میں محو ہے

دور تک ہے اس فضا میں خوابِ بیداری کی جھلک
شہر سے گزری ہے آوارہ ہوا ترکشِ مدہوش
جلنے کو ہیں سینے میں ٹوٹے خلوتِ شب کا رنگ

دور تاریکی کی چادر سے شرر اُڑتے ہوئے
رات کے جنگل کا جادو ریلوے کی ورکشاپ
اک دھوئیں میں آہنی قیدوں سے کل ہٹتے ہوئے

اس فضا میں وقت۔ درد و ہجر و آغوشِ وصال
اک ثمر ضعیف تازہ نصف کرم آلودہ ہے
طالبِ جاں قرب پہ چمکا ہوا صفدی کا جمال

تیز قندیلوں میں سیمیں زندگی کے زاویے
رہگذر پر سیکڑوں رنگوں کی اک پیکار ہے
خستگی کے زاویے۔ وابستگی کے زاویے

چشمکِ ادراک کے خوابِ جنوں کے مرحلے
طعنۂ نایافت دیتی ایک روحِ ابر و باد
مرگ کی قوسیں، تغیر کے ہزاروں سلسلے

اس فضا میں وقت۔۔ روحِ جنبشِ جہانِ جمود
تتلیوں کے پہلے روپوں کے نازک جسم میں
استخوانوں سے لپٹی زندگی کی سعیِ وجود

تمتعِ زندگانی ، اجتنابِ زندگی
کربِ تولید و فشارِ جانکنی کی ساعتیں
درد کے اعشاریوں میں اک حسابِ زندگی

اے دل اے پامالِ جاناں اے مری جنابِ صبح
ڈھونڈ تو بھی درد کے تنہا نشیمن کے لیے
کوئی شاخِ آشنا بے آشیاں بے خوابِ صبح

فراق گورکھپوری

○

یاد آتی ہیں تری رعنائیاں
دل میں پڑتی ہیں کئی پرچھائیاں

جلوے کو تکرار ممکن ہی نہیں
کتنی یکتا ہیں تری یکتائیاں

زندگی گھبراہٹوں میں کٹ گئی
پوچھتے ہو کیا مری تنہائیاں

آسمانوں پر کمندیں ڈال دیں
اُف مری تخئیل کی گیرائیاں

کیا سمجھتا تھا کوئی جانِ بہار
رنگ لائیں گی مری رسوائیاں

دونوں عالم لائیں گی زیرِ نگیں
بے نوائے عشق کی دارائیاں

خالقِ آفاق بھی دیکھا کیا
مُشتِ مُشتِ خاک کی پیمائیاں

زندگی کے راز مجھ سے جان لے
میری نادانی نے کیں دانائیاں

خار و خس بھی بن گئے شاخِ نبات
ان نگاہوں کی حیات افزائیاں

ہاں نہ تھا یہ دل جب اک اُجڑا نگر
یاد آتی ہیں وہ بزم آرائیاں

زندگی کو ان نگاہوں کے طفیل
موت کی آنے لگیں انگڑائیاں

عشق کو یارو برا کہتے تو ہو
اس میں پاؤ گے کہیں اچھائیاں

عشق کے کچھ جھوٹ ہم سنتے گئے
ہاتھ کچھ آتی گئیں سچائیاں

نہ سنی میری نہ دنیا کی سنی
عشق کی اللہ رے خود رائیاں

زیرِ پا بھی دور بھی ہیں منزلیں
دیدنی ہیں عشق کی پسپائیاں

کھنچتی جاتی ہیں دلوں کی شہ رگیں
اُف تری اٹھتی ہوئی برنائیاں

دیکھ آئے آج یادوں کا نگر
ہر طرف پرچھائیاں پرچھائیاں

ذرہ ذرہ اس خرابے کا فراق
ہے دو عالم کی لیے پہنائیاں

احمد ندیم قاسمی

○

کتنے تارے تھے جو شرمندۂ تاثیر ہوئے
ریگِ زریں پہ کبھی قصر نہ تعمیر ہوئے

جن کو شاخوں سے اڑا لے گئیں امواجِ صبا
وہی گُل خاکِ چمن کے لیے اکسیر ہوئے

شب کے پہلو میں کہیں پھوٹ رہی ہے پو بھی
کبھی دنیا میں اندھیرے نہ جہانگیر ہوئے

ہم اصولوں کے حصاروں میں چھپے لاکھ، مگر
اک نگاہِ غلط انداز سے تسخیر ہوئے

وہی آواز کی قوسیں، وہی تانوں کے خطوط
چند نغمے تھے جو مل کر تری تصویر ہوئے

ایک انداز تو ہے بے سروسامانی کا
ہم تری دھن میں ترے غم سے بغلگیر ہوئے

ایک امیدِ ملاقات نے مرنے نہ دیا
زندگی بھر ترے پیماں ہی عناں گیر ہوئے

تجھ سے مل کر تجھے پا لینے کی حسرت جاگی
کچھ نئے خواب ترے خواب کی تعبیر ہوئے

اک خلا طے ہوئی اک اور خلا کی حد پر
اپنے شہپر نہ ہوئے، حلقۂ زنجیر ہوئے

ہم نے لفظوں میں لہو اپنا دمکتا پایا
لوگ وارفتۂ رنگینیٔ تحریر ہوئے

صوفی تبسم

○

جب اشک تری یاد میں آنکھوں سے ڈھلے ہیں
تاروں کے دیئے صورتِ پروانہ جلے ہیں

کیا جانئے یہ رند بُرے ہیں کہ بھلے ہیں
ساقی کی نگاہوں کے اشاروں پہ چلے ہیں

سو بار بسائی ہے شبِ وصل کی جنت
سو بار غمِ ہجر کے شعلوں میں جلے ہیں

ہر آن امنگوں کے بدلتے رہے تیور
ہر آن محبت میں نئی راہ چلے ہیں

مہتاب سے چہرے سے ستاروں کی نگاہیں
ہم لوگ انہی چاند ستاروں میں پلے ہیں

نوچے ہیں کبھی ہم نے ہواؤں کے گریباں
ناکامیٔ کوشش پہ کبھی ہاتھ ملے ہیں

تاریک فضاؤں کے اُبھرتے رہے طوفاں
پھر بھی تری یادوں کے دیئے خوب جلے ہیں

محسوس یہ ہوتا ہے کہ دنیا کی بہاریں
اُس گلکدۂ ناز کے سائے کے تلے ہیں

یونہی تو دل آویز نہیں شعرِ تبسم
یہ نقش ترے حسن کے سانچے میں ڈھلے ہیں

گہے بر طارمِ اعلیٰ نشینم

جگن ناتھ آزاد

برادرم، آداب!

بُرا نہ مانیں، میں اس قسم کی براہِ راست شاعری کے بڑا خلاف ہوں
ایک آدھ چیز پہلے بھی (بادلِ نخواستہ) چھاپ چکا ہوں۔ مزید نہ
چھپوائیں۔ آپ اس عمر میں زندہ ہیں۔ میں آج سے بھی پہلے مر چکا ہوں
بات یہ ہے کہ میں شاعری اُسے ہی سمجھتا ہوں۔ جو اشاروں
اور کنایوں میں ہو۔ میں اشتہار کو پسند نہیں کرتا۔ (مدیر)

(غالباً یہ میرے ہی خط کے جواب میں جنابِ آزاد نے نظم کہی ہے)

ایک خط کے جواب میں

اے آسمانِ صدق و صفا کے مہِ تمام — اے تیری یاد مرجعِ تکریم و احترام
ہر لفظ تیرا بادۂ اخلاص کا ہے جام — میرے سخن سے آج نہیں ہے تو شاد کام

تیری طرف سے گرچہ شکایت کی بات ہے
لیکن مری نظر میں محبت کی بات ہے

ظاہر ہوا ہے یہ ترے تازہ پیام سے — مجھ کو ذرا سا شکوہ ہے میرے کلام سے
چھلکی ہے مے جو میرے تغزل کے جام سے — شاید کہ ہٹ گیا ہوں کچھ اپنے مقام سے

کل تھا جو ذکرِ عظمتِ انساں لیے ہوئے
وہ دل ہے آج کیوں غمِ جاناں لیے ہوئے

ہے میرا فرد فرد [illegible] حقائق — [illegible] ہے گل ترا نبات
محبوب کا ہر ظلم زمانے کے حالات — نا حل مسئلے بھی دل کے [illegible]

اک نظم ایک ملک کی تصویر بھی تو ہے
اک شعر ایک صبح کی تنویر بھی تو ہے

میرے کلام میں ہے سماں میرا بھی قدر بھی — ساون کی تیرگی بھی، سحر کا [illegible] بھی
دونوں ربّ کا بھی، طرب کا وفور بھی — دل صبر و شکر بھی ہے مرا ناصبور بھی

غم بھی ہوں خوشی کے بہانے لیے مجھے
سینے میں درد لب پہ ترانے لیے ہوئے

مانند جامِ جم ہے مری شاعری کا جام — فخر کہیں جنوں کا، خرد کا کہیں پیام
اک راز ہے نہاں جو کبھی تو اک شیخ ہے کلام — لیکن کہیں نہیں ہے تصنّع کا اہتمام

خود ظرف لفظوں کے زباں سے نکل گیا
جو دل میں آ گیا وہ غزل میں ڈھل گیا

میرے کلام میں ہے سیاست کا رنگ بھی — تصویرِ صلح بھی ہے تماشائے جنگ بھی
ہے ولولہ بھی جوشِ جنوں بھی امنگ بھی — تیغ و تفنگ بھی ہے رباب اور چنگ بھی

اس میں ہے خامشی بھی ترنّم بھی اس میں ہے
فریاد بھی ہے اس میں تبسّم بھی اس میں ہے

گہرائی بحر کی بھی پہاڑوں کا اوج بھی — میرا سخن ہے ساحلِ دریا بھی موج بھی
اس میں دکھائی دے گی جوانوں کی فوج بھی — دُرّاج و سارس و طوطی و بلبل کے زوج بھی

ساحل کا ہے سکوت بھی ندی کا شور بھی
بھوروں کے زمزمے بھی بھنور کا ہے زور بھی

محمود کا بیان بھی ہے ذکرِ ایاز بھی — گویا نیاز بھی ہے مرا شعر ناز بھی
اس میں ہیں زندگی کے مسائل بھی راز بھی — میرے سخن میں سوز بھی ہے اور ساز بھی

محبوب کا الم بھی زمانے کا غم بھی ہے
بے کیفیٔ حیات بھی ہے کیف و کم بھی ہے

شاید کچھ اس میں فلسفۂ زندگی بھی ہو — علم و عمل کے ذکر کی تابندگی بھی ہو
ممکن ہے بیشِ فکر کی رخشندگی بھی ہو — پھر زیست کی گداز سے پائندگی بھی ہو

شاید نہاں ہو اس میں خموشی بھی ذکر بھی
اقبال کا گداز بھی غالب کی فکر بھی

مانا کہ اپنے دل کے سکوں سے ہوں دور بھی　　ہوں فیض یابِ لذتِ کیفِ حضور بھی
ہوں اپنے ہوش میں بھی نشے میں ہوں چور بھی　　ہوں صاحبِ جنوں بھی مگر باشعور بھی
دیوانگی کو دل میں جو پالے ہوئے ہوں میں
اس کو بہ فیضِ عقل سنبھالے ہوئے ہوں میں
ضو اس میں عشق کی تو دلِ کلبہ طور بھی　　اس جام میں ہے عمر کی مے کا سرور بھی
جس بزم میں ہے جوشِ جنوں کا وفور بھی　　اس میں ضیا طراز ہے شمعِ شعور بھی
دل سرنگوں ہے عقل کے دربار میں کبھی
آوارہ حسن و عشق کے بازار میں کبھی
اس میں ہے سازِ دیر تو سوزِ حرم بھی ہے　　یزداں کا ہے جلال و جمالِ صنم بھی ہے
شاہی کی اس میں شوکت و جاہ و حشم بھی ہے　　جمہور کا اسی میں پر افشاں علم بھی ہے
دل اپنا ذرے ذرے پہ قرباں کیے ہوئے
یہ کائنات کو ہے جلو میں لیے ہوئے
پیغمبروں کا ذکر مری شاعری کی جان　　قائم اسی کے دم سے ہے میرے سخن کی آن
پھر منکروں نے بھی تو دکھائی ہے آن بان　　یہ بھی تو ہیں میری بزمِ تکلم کے میہمان
ذرے بھی بزم میں ہیں ستاروں کی ضو بھی ہے
ظلمت کی ند بھی اور چراغوں کی لو بھی ہے
تلخابۂ حیات کے ساغر پیے ہوئے　　کیا جانے کتنے زخم ہوں دل پر لیے ہوئے
اک ہاتھ اپنا دستِ جنوں میں دیے ہوئے　　اک ہاتھ سے ہوں چاک گریباں سیے ہوئے
ہیں پاؤں خار پر تو نظر پھول پر مری
گل ریز و عطر بیز ہے یوں رہگزر مری
اس شاعری میں فکر کی پیدا جھلک بھی ہے　　کیفیتِ حیاتِ بشر کی لہک بھی ہے
درد و گدازِ عشق و جنوں کی کسک بھی ہے　　اک گلبدن کے ذکر کی اس میں مہک بھی ہے
حیرت میں ہوں میں اس کو فقط گلبدن کہوں
یا نوبہارِ نازِ فضائے حسیں کہوں
اُس نوبہارِ ناز سے اک حل کی بات تھی　　وہ نغمہ جس میں اک مری مشکل کی بات تھی
طوفاں میں گھر کے لذتِ ساحل کی بات تھی　　منزل سے دور راحتِ منزل کی بات تھی
میں بات کر رہا تھا بڑے احترام سے
اپنی نیاز مندیٔ دل کے مقام سے

وحشی بنا پہ کل جو بعداں تھا مرا کلام — شاید تری نگاہ میں تھی وہ خراب نغم
در اصل میرے خون سے لبریز تھا وہ جام — میری شکست لغزش تھی مری زندگی تمام

میرا لہو تھا وہ جو مرے گلے کی سرخی تھی
بس معترف رہو ترے پچھلے کی شے نہ تھی

اس پر بھی اپنے آپ کو کہتے ہو بے خبر — کتنا حسین ہے پھول ہی ہر ایک خوشبو
تبسم ہوں میں کہ شک ہے ہوا ہو یا مرا — جب نقش ہے اسد مرا نقش ہوا ہی

کہتے تھے ہے ہوس بھی کسے بتاں کی ہے
میرا تو یہ نہیں ہوس کی کمال کی ہے

فضل کریم فضلی

○

آرزوئے دل نہ بڑھنی تھی مگر بڑھتی گئی
مختصر سی بات، قصۂ مختصر، بڑھتی گئی

ہم نے چاہا تھا انھیں حدِ نظر تک ڈھونڈ آئیں
جس قدر بڑھتے گئے حدِ نظر بڑھتی گئی

ویسے ویسے دل میں پیدا وسوسے ہوتے گئے
جیسے جیسے ان کے آنے کی خبر بڑھتی گئی

اور تو سب نقش دل سے خود بخود مٹتے گئے
ایک ان کی یاد تھی جو عمر بھر بڑھتی گئی

بحرِ عصیاں بڑھتے بڑھتے چشمِ گریاں بن گیا
کیجیے کیا وسعتِ دامانِ تر بڑھتی گئی

ہر دعائے بے اثر کا یہ اثر الٹا ہوا
ہر دعا کے ساتھ امیدِ اثر بڑھتی گئی

راہ بھی پُرپیچ تھی، رہبر بھی ناواقف سے تھے
دُوریِ منزل، درازیِ سفر بڑھتی گئی

داخلِ زنداں اسیرانِ وفا ہوتے گئے
اور بھی کچھ رونقِ دیوار و در بڑھتی گئی

زیرِ لب فریاد پر بھی سرگراں صیّاد ہے
اور نصیبِ دشمناں یہ لے اگر بڑھتی گئی؟

جیسے جیسے اہلِ فن پر تہمتیں ہوتی گئیں
ویسے ویسے شوخیِ خونِ جگر بڑھتی گئی

ہے تو فضلیؔ بے ہنر، لیکن اب اس کا کیا علاج
اس کے دم سے دمبدم قدرِ ہنر بڑھتی گئی

عبدالحمید عدم

○

میکدے کا تیز پانی اور ہے
نشۂ عہدِ جوانی اور ہے

آپ کو نیند آتی ہے تو کل سہی
صرف تھوڑی سی کہانی اور ہے

میرے کہنے پر بھی تم راضی نہیں
کیا ابھی کچھ بدگمانی اور ہے

جسے غیر اور کو کبھی جانے بھی دو
اس کے در پردہ کہانی اور ہے

کاٹ ہے تلوار کی بھی کچھ مگر
تیری پلکوں کی روانی اور ہے

توبہ کرتا ہوں تو آتا ہے خیال
ایک جامِ ارغوانی اور ہے

دشمنوں کے دل تو ٹھنڈے ہو گئے
دوستوں کی مہربانی اور ہے

○

زاہد دیر و کعبہ بڑھ گئی ہے
خدا کو مان اب پردہ اٹھا دے

اگر میں بھول سکتا ہوں تو ظالم
خدا کے واسطے مجھ کو بھلا دے

دعائیں دینے والے خیر تیری
مجھے آج ایک جھوٹی بد دعا دے

کوئی برتاؤ تو کر بے مروّت
مجھے جرمِ محبت کی سزا دے

مری توبہ کی ساقی لاج رکھ لے
میں مانگوں یا نہ مانگوں تو پلا دے

یہ تنہائی کا عالم بھی عدم کیا
چراغِ زیست کو ہنس کر بجھا دے

عبدالمجید حیرت

○

دنیا میں جہاں بھی جائیے گا
دُکھ، درد ضرور پائیے گا
راحت بھی ضرور پائیے گا
تکلیف اگر اُٹھائیے گا

پھر کون کرے گا دلنوازی
جب آپ ہی دل دُکھائیے گا
ممکن ہو ترے غم سے چھوٹنے کی
تدبیر کوئی بتائیے گا

کانٹوں میں کہیں اُلجھ نہ جائے
دامن کو ذرا بچائیے گا
ہوتی ہے ہر ایک بات کی حد
حد سے نہ قدم بڑھائیے گا

دنیا ہی میں جب نہیں، تو آخر
کیا حشر میں کام آئیے گا
ہر پھول ہے خندہ زن چمن میں
کیا آپ نہ مسکرائیے گا

ہے آپ کا وہ بھی اک دعا گو
حیرت کو نہ بھول جائیے گا

معصوم گناہگار

(ایک باغِ حیوانات کو دیکھ کر)

پروفیسر شور

یہ وہ ہیں کہ ہے شہروں میں رسوا جن کی خودداری
نہ یہ پاپا، نہ یہ ملا، نہ یہ راہب، نہ یہ صوفی
نہ دام معبد و ہیکل، نہ فتراک کلیسائی
کسی کرتے میں یہ جھوٹی حدیثیں گھڑ نہیں سکتے
نہ عصمت کی کوئی منڈی، نہ دلالوں سے پیسے ہیں
نہ زرتشتی، نہ زناری، نہ یہ بابی، نہ نصرانی
نہ چہروں کے خاکوں سے کوئی مغرور پیشانی
نہ ہونٹوں پر ہنسی جھوٹی، نہ زہر آلودہ دلداری
نہ سکوں کی تلاوت ہے، نہ "کفر و دیں" کی ذلت
شمار ان کا نہیں زر کے تراشیدہ کمینوں میں
کلاہِ یار جنگی ہے، نہ کفشِ آسماں جاہی
ضمیر و قلب کو "سونے" کی لو پگھلا نہیں سکتی
کسی پوشاکِ زریں سے نظر دھوکا نہیں کھاتی

نہ ان کا کفر ہے ذوقی، نہ ان کا دین بازاری
نہ یہ نازی، نہ یہ تازی، نہ یہ مصری، نہ یہ کلنگی
نہ زناروں کے پھندے ہیں، نہ تسبیحوں کی گردانی
کسی منبر کے اوپر یہ دوانے چڑھ نہیں سکتے
نہ شام ذکر و قوالی، نہ چلوں کے اندھیرے ہیں
نہ سینے سے کوئی کاوش، نہ ماتھا کوئی نورانی
نہ ہاتھوں پر کسی کے خون سے قشقوں کی تابانی
نہ اخلاقوں کی عیاری، نہ آدابوں کی پرکاری
نہ یہ سونے کے پیغمبر، نہ یہ جاگیر کی امت
نہ صبحیں ان کے ہونٹوں پہ، نہ راتیں ان کے سینوں میں
نہ زنجیروں کی تاریکی، نہ قندیلِ شہنشاہی
ہوائے بام و در دشت و جبل تک جا نہیں سکتی
یہاں سورج کی تاریکی کہیں پائی نہیں جاتی

نہ حیواں، جن کا تخت و تاج سے کوئی نہیں ناتا
انھیں خود اپنی نسلوں کو نگل جانا نہیں آتا!

اِس بار

سلام مچھلی شہری

مہک دلوں کے چمن زار
مجسم ساز کے تار،
نظر پڑے ہیں "جنونِ خرد" کے پھر آثار — !

مجھے یقیں ہے ترے جواں شگوفوں پہ
مجھے یقیں ہے شگفتہ، جوان نغموں پہ
مجھے یقیں ہے چراغِ سکوں کے جلووں پہ
ترے نصیب میں ہے فتحِ دائمی اِس بار — !!
عجب فضا ہے، نہ موجِ سکوں نہ طوفاں ہے
جہاں جہاں بھی ہے ملاحِ سخت حیراں ہے
اَجل قریب ہے یا زندگی کا ساماں ہے؟
یہ کیسے رواں ہیں فلک پر "طیورِ آتش بار" ؟!
سوال یہ ہے کہ پھولوں میں آگ ہے کہ نہیں
سوال یہ ہے کہ نغموں میں آگ ہے کہ نہیں
زمیں کی صبح کے جلووں میں آگ ہے کہ نہیں
اگر یہ ہے تو ہم اہلِ چمن بھی ہیں تیار
یونہی بڑھائے چلے کاروانِ صبحِ بہار — ؟!!

گڑیا رانی

نور بجنوری

تری مانگ میں سرخ چراغ جلے
کوئی دوری دور سے ہاتھ ملے
ترے شیش محل کا نازک سا سماں
کہیں بارِ سنگھار ہے شعلہ فشاں
کہیں پیار کا چاند سسکتا ہوا
کہیں لعل و گہر کی نشیلی شاں
کہیں دھوپ چڑھے کہیں رات ڈھلے
تری مانگ میں سرخ چراغ جلے

ترے در پہ ہجوم بہاروں کا ہے
تری راہ میں ڈھیر ستاروں کا ہے
ترے ہاتھوں کی مہندی سلگتی ہے کیوں
تری آنکھوں میں داغ چناروں کا ہے
تجھے کس نے لگا لیا بڑھ کے گلے
تری مانگ میں سرخ چراغ جلے

کوئی بیتے دنوں کی کتھا رے لیے
ترے ہونٹوں سے چاہ کا زہر پیے
یونہی تیرے گھروندوں میں آگ بھرے
یونہی روپ بدل کے نئے سے نئے
کبھی دور رہے کبھی ساتھ چلے
تری مانگ میں سرخ چراغ جلے

شفقت کاظمی

○

تیرے ہر جور پہ یاں شکرِ خدا ہے اے دوست
کہ یہی مسلکِ اربابِ وفا ہے اے دوست

ہم کو اس عہدِ وفا سے تھیں امیدیں کتنی
تجھ کو جو عہدِ وفا بھول چکا ہے اے دوست

میری جانب سے نہ لائی کوئی پیغام کبھی
میری فریاد بھی صحرا کی صدا ہے اے دوست

تیرے آنے کی دوبارہ جو کوئی آس نہیں
کتنی سنسان مرے دل کی فضا ہے اے دوست

تیری یادوں سے بھی تسکینِ تمنا نہ ہوئی
وقت ہم پر کبھی ایسا بھی پڑا ہے اے دوست

کیا عجب ہے کہ تری رنجشِ بیجا کے سبب
تیرے شفقت کو سرِ ترکِ وفا ہے اے دوست

کوثر نیازی

○

باغباں کے طور یہ سمجھا گئے
فصلِ گل میں پھول کیوں مرجھا گئے

اب تو اے ظالم زمانے رحم کر
اُن کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے

اس لیے شاید نہ پوچھا حالِ دل
میری حالت دیکھ کر گھبرا گئے

شغلِ مے بے منتِ موسم رہا
جام کھنکائے تو بادل چھا گئے

ان خنک جلووں میں گرمی تو نہ تھی
کیوں نگاہوں کو پسینے آ گئے

شامِ غم سے پوچھ لیں گے ہم آج
آپ کے گیسو اگر لہرا گئے

دشمنوں سے بھی گلہ جاتا رہا
دوست ہم پر وہ کرم فرما گئے

موت ہے اس جرم کی کوثر سزا
ہم فریبِ زندگی کیوں کھا گئے

یوسف جمال انصاری

○

من و صہبا سے دل ہوا جو گداز
میں تھا اپنے سے محوِ ناز و نیاز

روح و دل میں ہیں جھگڑے کتنے
سوئے کعبہ نہیں مری پرواز

پہلے خود کو تلاش کروں میں
کُھل ہی جائے گا کائنات کا راز

سفرِ زیست کی نہیں منزل
حدِ آخر بھی نقطۂ آغاز

موت اِک جُھٹپٹے کا دریا ہے
زندگی ایک دُور کی آواز

یہ نظارے ہیں یا اشارے ہیں
گلشنِ دہر ہے کہ گلشنِ راز

اے حسیں! بے عمل نہ کہہ مجھ کو
اور اگر کھینچ لوں ردائے مجاز

کسری منہاس

○

نیازِ بے اثر کی ناز برداری پہ روتا ہوں
وہ برہم ہیں میں انجام پرستاری پہ روتا ہوں

تری خاطر سے واعظ! میں نے توبہ کر تو لی لیکن
درِ میخانہ تک آ کر گنہ گاری پہ روتا ہوں

بھلی محشر میں سب کے سامنے پرسش گناہوں کی
نگاہِ منفعل میں رحمتِ باری پہ روتا ہوں

ہوئے ہیں خشک آنسو شدتِ سوزِ محبت سے
وفائے عشق میں آنکھوں کی ناداری پہ روتا ہوں

مجھے بربادیٔ دل کا گلہ تھا عشق سے پہلے
نگاہِ شوخ اب تیری نگوں ساری پہ روتا ہوں

ابھی اک جلوۂ دلکش نگاہوں کے مقابل تھا
کھلی جب آنکھ تو میں اپنی بیداری پہ روتا ہوں

ابھی تک احترامِ عشق سے بیگانہ ہے کوئی
دلِ حسرت زدہ تیری وفاداری پہ روتا ہوں

فلک کے سامنے آ کر نظر سے یوں نہاں رہنا
مذاقِ حسن تیری آشنہ داری پہ روتا ہوں

نہ وہ اگلی سی دھڑکن ہے نہ وہ اگلی سی بیتابی
مداوائے درد! دل کی سرد بازاری پہ روتا ہوں

نہ کہنے کی جو باتیں تھیں وہ لب تک آ گئیں کسری!
پشیماں ہو کے اب انجام سے خواری پہ روتا ہوں

جمیل ملک

○

خوشبوئے پیرہن سے سلگتے رہے دماغ
آئی شبِ فراق تو گُل ہو گئے چراغ

دل کی لگی بھڑک کے نگاہوں تک آ گئی
پلکوں پہ شامِ وصل جلائے ہیں دل کے داغ

اس چشمِ مے فروش سے ہنگامِ بادہ نوش
پھوٹا وہ سیلِ نور کہ لَو دے اُٹھے ایاغ

آخر کھُلا کہ تو ہے مرے گھر کی روشنی
یوں تو ترے بغیر بھی جلتے رہے چراغ

وہ گُل کھلیں کہ جن کی مہک لازوال ہو
اِس ایک دُھن میں ہم نے سجائے ہیں کتنے باغ

جب چشم و دل بجھے تو شبستانِ شوق میں
ہم نے ہتھیلیوں پہ جلائے ہیں شب چراغ

جو وادیٔ جمال میں گُم ہو گئے جمیل
اپنی طلب کے ساتھ ہی اُن کا بھی کچھ سراغ

مظہر امام

○

انکار میں اقرار کی بات آہی گئی ہے
باتوں میں غمِ یار کی بات آہی گئی ہے

آیا ہے کبھی ذکر اگر دار و رسن کا
گیسو و قدِ یار کی بات آہی گئی ہے

آرائشِ عالم پہ کبھی بحث جو ٹھہری
اس گیسوئے خمدار کی بات آہی گئی ہے

جب سُرخیِ گلشن کا کبھی ذکر ہوا ہے
تیرے لب و رخسار کی بات آہی گئی ہے

ڈھونڈا ہے اگر زخمِ تمنا نے مداوا
اک نرگسِ بیمار کی بات آہی گئی ہے

مل بیٹھے ہیں زنداں میں اگر شام کو احباب
تیرے در و دیوار کی بات آہی گئی ہے

بے مہریِ احباب کا شکوہ جو کیا ہے
دلداریِ اغیار کی بات آہی گئی ہے

چھیڑا ہے کوئی تلخ فسانہ جو کسی نے
شیرینیِ گفتار کی بات آہی گئی ہے

جلیل حشمی

○

ہم زمانے میں محبت کے بھکاری ٹھہرے
دوست ہیں سب کے مگر دشمنِ جاں ہیں اپنے

آج کی رات کہیں شعلۂ گل ہی بھڑکے
جانے کل صبح کہاں ہوں گے ہم اڑتے پتے

جانِ من! اب کے یہ آداب ہیں تیرے کیسے
بانکپن میری غزل کا تری محفل میں لٹے

وہ صبا ہے تو رہے کس لیے گلشن سے پرے
یہ شبِ گل ہے تو کیوں سیج پہ کانٹوں کی کٹے

کیوں پھرے دشت میں دیوانے ہوئے کس کیلیے
ہم کو معلوم نہیں پوچھیے ان آنکھوں سے

مر چکیں سب کی تمنائیں سسک کر لیکن
دل کی دیوار سے راتوں کو کوئی سر پٹکے

کہیں منزل سے بھٹک جائے نہ دیوانہ کل
جادۂ شہرِ بہاراں میں بچھا دو کانٹے

ڈال دل کھول کے ان ٹوٹے ہوئے شیشوں میں
سنگ آئے ہیں بہت راہ میں ہم پہ پیارے

یہ تری یاد کا عالم شبِ تنہائی میں
جیسے لہرا کے کرن کالی گھٹا سے چھوٹے

ان بھری راہوں میں سب میرے ہیں پر کس کا ہوں؟
دوں صدا کس کو — لگے کون کلیجے سے مرے

کون اترے گا مرے دل کے گلستانوں میں
کون گزرے گا مرے چہرے کے صحراؤں سے

راکھ اس گھر میں وہ اڑتی ہے کہ جیسے حشمی
طاق میں شمع نہ تھی صحن میں مہتاب نہ تھے

احمد ظفر

○

جو منفرد ہی یہ ہو دوسرا نہ کیجئے
کانٹے ہیں تو گل کی تمنا نہ کیجئے

تخلیق کی لگن ہے تو جاں تک گنوائیے
محفل میں دل کی بات کا چرچا نہ کیجئے

اس حسنِ لازوال کو دیکھیں تو اس طرح
اس حسنِ لازوال کو رسوا نہ کیجئے

جلتے چراغ کس نے بجھائے ہیں بارہا
یہ سحر ہے تو سحر کی پروا نہ کیجئے

کیا جسم دلنشیں تھا کہ اب مشتِ خاک ہے
سوچیں ضرور اس قدر سوچا نہ کیجئے

ہم اہلِ دل ہیں اہلِ نظر اہلِ آرزو
محرومیوں کا جال بچھایا نہ کیجئے

لتا منگیشکر

شاعر ندیم

فضا میں گونج رہی ہے جو سعدلوں کا درد لیے
ہوا کے دوش پہ لرزاں ہیں عقدہ ہائے نوا
نفس نفس ہے ترنم کی سرخوشی کو فروغ
ترے لبوں سے مچلتی ہوئی جواں کرنیں
یہ گنگناتے ابھرتے ہوئے گلِ نغمہ

ترے گلو کی ادا تیری فطرتی آواز
بکھر رہے ہیں خلاؤں میں رازِ شوخیِ ساز
روش روش ہے نئی کیفیت نیا اعجاز
یہ تیری لے یہ ترا سوز یہ تری پرواز
جہاں کو بخش رہے ہیں نئے نئے انداز

بجرمِ فتنۂ دوراں جمالِ ماہ رُخاں
امید و بیم سے پرداغ بیشمار دماغ
ہزار سلسلہ ہائے ستم جلو میں لیے
کوئی خموش پسِ پردۂ جفائے رسوم
چراغِ رہگزرِ باد بن گئی ہے حیات

کسی کے حسن کی لغزش کسی نظر کا خمار
فریبِ کشمکشِ دہر ہر قدم پہ آزار
زمانہ درد کے ماروں سے برسرِ پیکار
خیالِ تازہ کو سوزش میں شعلہ ہائے فشار
ہر ایک سمت اندھیرا ہر ایک سمت غبار

ہر ایک لمحہ بدلتی ہے کروٹیں گیتی
ہر ایک زلف پریشاں ہر اک کلی مایوس
کوئی نہیں ہے مسیحا کوئی نہیں غمخوار
تصوراتِ خوش آیند ایک خوابِ گراں
ہر ایک رخ نگہ قہر ہر طرف شورش

ہر ایک لمحہ اجڑتے ہیں مفلسوں کے شباب
ہر ایک سینہ ہے صد چاک ہر جگر ہے کباب
ہر ایک ہاتھ میں نشتر ہر اک دعا زہراب
سرور و مستی و جوش و طرب ہوئے نایاب
ہر اک قدم پہ تلاطم ہر ایک گام سراب

کہاں کہاں نہ ہوئی پست عظمتِ آدم
کہاں کہاں نہ ستاروں نے ٹھوکریں کھائیں
کہاں کہاں نہ کیے رقصِ طوق نے لے کر
کہاں کہاں نہ رسن کو گلے لگایا ہے
کہاں کہاں نہ سزاوارِ دار ٹھہرے ہیں

کہاں کہاں نہ مٹی شوخ زندگی کی لکیر
کہاں کہاں نہ نگوں ہو گیا خطِ تقدیر
کہاں کہاں نہ بجائی ہے پاؤں کی زنجیر
کہاں کہاں نہ لکھی اپنے خون سے تحریر
کہاں کہاں نہ ہوئی ہم پہ کاوشِ تعزیر

کبھی کبھی اسی پہ رحل تیرہ گئی مگر
کبھی کبھی ترے آہنگِ سادہ کی تاثیر
کبھی کبھی ترے نغموں کا بوجھ اٹھاتا ہے
کبھی کبھی تو سمجھتے ہیں غم کے باطل
کبھی کبھی تو دلِ غمزدہ بھٹکتا ہے

ستم کشوں کی تمنا چمک ہی جاتی ہے
زبانِ شوخ معانی کو ڈھونڈ سکتی ہے
خزاں کو چھیڑتی فصلِ بہار آتی ہے
کبھی کبھی تو فضا بھی نغمگاتی ہے
کبھی کبھی تو مسرت بھی ہار پاتی ہے

یہ زیر و بم یہ تری دلربائی تابانی
منزلِ یہ تری آتشِ نواؤں کی قسم
اندھیری شب میں ہوا اپنے سفر کے چمک
فسونِ زیست میں ملتا نہیں سہارا ہمیں
تری صداؤں کے سیلاب میں بہا دو دیں

تمام کشتہ کر دیتے ہیں اک شعلۂ جمیل
خام فکر ترا صبح و آشتی کی دلیل
سکوں ہے ترا شعلۂ ہوا قندیل
جنونِ عشق کی ہوتی نہیں کبھی تکمیل
بس ایک نالہ ہی ہے جس تک یہی ہے سبیل

گلوں پہ گرتے ہیں جس طرح قطرۂ شبنم
چمک کے جیسے کوئی معجزۂ صبح جاگے
زمانۂ شب میں کبھی دامنِ سحر میں کبھی
تری عطا کا یہ صدقہ ترے کرم کا کفیل
عنایتوں کا تصادم لطافتوں کا خروش

شراب ناب چھلک جائے جیسے در جام
رباب چھیڑے کوئی جیسے چاند کے حکم
فسردہ ذہن پہ ہوتی ہے بارشِ الہام
جلائے بیٹھا ہوں افکار گردشِ ایام
سلام کہتا ہے شاعر ترے خلوص کے نام

سکوتِ رنج و الم کی اداس راہوں میں
تھکی ہوئی مری نظریں تھکی رہیں لیکن
ابھی حیاتِ گریزاں کے کام آئے جا
ابھی رکا تو نہیں ہے سفینۂ غمِ دل
یہ آسرا ابھی بنا آسرا ہے جینے کو

جہاں جہاں بھی حوادث سے دل ہوا دو نیم
"فسادِ سامعہ در صبح کوثر و تسنیم"
ابھی تو سخت ہیں اوقات مرحلے ہیں عظیم
ابھی ہوئی تو نہیں ہے سکون کی تنظیم
چلی بھی جا جرسِ غنچہ کی صدا پہ نسیم
کہیں تو قافلۂ نو بہار دیکھے گا"

بیوی کی بغاوت

راجہ مہدی علی خاں

وہ اک آہ بھر کر چھپا آفتاب
تپائی پہ بندی نے رکھ دی شراب
نہ میری نگاہوں سے شرما سکے
تبسم پہ لب نوش فرما سکے
خیال آ رہے ہیں مجھے پے بہ پے
بہت ہی مزیدار ہوگی یہ شے
یہ دو گھونٹ کیا میں بھی پی لوں جناب!
چھپا لوں نہیں کھائیے پیچ و تاب
ہوں اولاد میں بھی بڑے باپ کی
کروں کیوں نہ تقلید میں آپ کی
کسی دن ابھی میں بھی تو پی کے آؤں
ذرا میں بھی گھر بھر میں آفت اٹھاؤں
جو پی آئی گھر بھر کو پیٹوں گی میں
کبھی آپ کو بھی گھسیٹوں گی میں
کسی بات پر ہو گئی گر میں تیز
تو پھینکوں گی کھانا الٹ دوں گی میز
میں توڑوں گی چینی کی سب تھالیاں
لغت میں نہ ہوں۔ دوں گی وہ گالیاں
پیوں گی میں ہر روز اتنی شراب
کہ اک روز ہوگا یہ خانہ خراب
جب اس گھر پہ ہوگا فلاکت کا راج
نہ پھر بھی اتاروں گی مستی کا تاج
یہ گھر سارا نیلام کر دوں گی میں
شرابی کا ہم نام کر دوں گی میں
بہت کچھ کرے گی کنیز آپ کی
کہ لڑکی ہے یہ بھی بڑے باپ کی

(۲)

ابھی میں بھی کھڑکی سے دیکھا کروں
ابھی میں بھی آنکھوں کو سینکا کروں؟

مے سپیک مین پہ حیا کی نقاب ؟ — پھروں میں بھی گلیوں میں بے حجاب!
میں سائیکل پہ روز گھوما کروں ؟ — نگاہوں سے چہروں کو چوما کروں
کروں میں بھی سڑکوں پہ آوارگی ؟ — حسیں مرد ملیں سے کروں دل لگی ؟
میں مردوں کو آنکھوں پہ آنکھیں لگاؤں! — کبھی جب وہ ہنسے تو ٹھینگا دکھاؤں!
کروں اُن پہ بیہودہ فقرے میں چست! — جو پوچھیں وہ کیا ہے: میں ہوں خود مست!
میں پیروں رکھوں اُن کے پیروں پہ پیر — وہ جانے لگیں تو کہوں "شب بخیر!"
جو سینما میں بیٹھے کوئی پاس مرد — چکھاؤں اُسے اپنی چپل کا درد
میں سڑکوں پہ چھیڑوں اُنہیں کھانس کر — ملے جو بھی لے جاؤں میں پھانس کر
نہ ہو کالے پیلے کی کچھ بھی تمیز — کہوں "واہ کیا گھیر والی ہے چیز"
چھپیں مجھ سے ڈر کر نقابوں میں مرد — اگر دیکھ لیں مجھ کو ہو جائیں زرد
ہر اک گھر میں جاتے ہوں پرچے پڑے — سبھی مردوں میں ہوں چرچے مرے
میں نام اپنے والد کا روشن کروں ؟ — میں بھی سات سو عشق کرکے مروں ؟

کہ لڑکی ہوں میں بھی بڑے باپ کی
کروں کیوں نہ تقلید میں آپ کی

۲

میں مردوں کے کوٹھوں پہ جایا کروں! — میں نامحرم بھی دل کو لگایا کروں ؟
میں دے جاؤں اس گھر کو تنہائیاں ؟ — مرے ساتھ ہوں میری ہمسائیاں
لپ اسٹک سے گلنار کرکے یہ لب — چلیں چہلیں کرتی ہوئی سب کی سب
پھریری ہر اک حلقہ کی، کان میں — ہو اک جھرجھری سی دل و جان میں
ہو سگرٹ کا ٹن ایک ماچس کے ساتھ — چلیں جھومتی دے کے ہاتھوں میں ہاتھ
دھواں اپنے منہ سے اُڑاتی ہوئی — بڑھیں آگے اودھم مچاتی ہوئی

جہاں آئے آوازِ چنگ و رباب
کلاہوں کی اُن سیر جیبوں پہ جبیں
وہ بیٹھے ہوں سر پر لگائے ہوئے
وہ ہوں مجروں کو چھپائے ہوئے
کہیں اُٹھ کے وہ ہم سے آداب عرض!
ادا سے گوری کریں پیش وہ
چھڑیں جب ستار اور سارنگیاں
ہر اک سانس اپنی نشے میں ہو غرق
کہیں ہم "ارے مردود گاؤ گاؤ"
حسیں رت میں جب چھڑیں ٹھمریاں
ہر اک ہاتھ سینے پہ ساتھ آہ سرد
وہ گھونگھٹ سے پھینکیں نگاہوں کی چوٹ
وہ ناچیں کر کر جلاتے ہوئے
وہ دیکھیں ہمیں مسکراتے ہوئے
پکاریں یہ ہم واہ کیا تان لی
مچل کر کہیں اُن سے بے تاب
اسی طرح ہم داد دیتے رہیں
بجیں رات کے دو تو ہم لوٹ آئیں
کہیں آ کے سب اپنے شوہر سے ہم

ڈکیں دیکھ کر بزمِ رقص و شراب
ذرا ہچکچائیں پھر آگے بڑھیں
ہوں گالوں میں پوڈر رچائے ہوئے
گر حلق میں ہوں بنائے ہوئے
بجا لائیں رنڈی کا ہر ایک فرض
کریں ہم سے طے پر کم و بیش وہ
پئیں وسکی ہم، کھائیں نارنگیاں
نہ آئے فقط رات اور دن میں فرق
کری ناچ اچھا سا ہم کو دکھاؤ
قطاروں میں بیٹھی ہوں ہم، "قمریاں"
دکھائیں انھیں اپنی "الفت کا درد"
تو ہم پھینک دیں اُن پہ سو سو کے نوٹ
قدم ہوں وہ گھنگھرو بجاتے ہوئے
نگاہوں سے اُلفت جتاتے ہوئے
ہماری تو اللہ قسم جان لی۔
"یہ حرکت، یہ مُرکی، یہ توڑے، غضب!
حسینوں کی" بیداد دیتے رہیں
محبت کے ہم لے کے غم لوٹ آئیں
ابھی بستروں سے اُٹھو ایک دم

کی بھوک ہے گرم کھانا کھلاؤ
اپی "تھک گئے پیر اُٹھ کر دباؤ"

موجِ خول

احمد ندیم قاسمی

شادی کے تیسرے دن بعد راحت علی کو لگا کہ ایک سہم چھٹ گیا۔ اس نے ساجدہ کو اپنی بیوی بنا کر جلد بازی سے یکایک اس کے ابھی گھر بھر پہلے ساجدہ اس کے ذہن پر بادل کی طرح چھائی ہوئی تھی۔

پھر یہ بھی جب تازی جلے کے لڑ پڑے کہ گھر رہی تھی تو ساجدہ نے ہنسا کہ ایک بات کہہ دی تھا۔ ساجدہ نے بیچ کی طرح کا ایک لڑکی جو کرسنے کے بعد ہی ہنستے کہہ رہا تھا ہوا، ساجدہ ایسا لگتا ہے کہ ابھی "جلدی جلدی" پکار رہا ہے" اس پر راحت علی نے کہا تھا "تمہیں اپنے بچے جانے کا کتنا شوق ہے بیگم۔ یہ ٹھیک ہے کہ ان دنوں ہم بھی تمہارے انگلی ہی پکڑے رہیں گا۔ پر جھٹکا ہے۔ کہ تمہارے ماں باپ ہوتی تو یہ کہ یہ تمہیں ہر سے بچپنے سے ہے ہیں۔ سچ کہتا ہوں کہ میں نے تو ابھی تمہیں ہی غور کر دیکھا ہی نہیں۔ تمہیں کیا پتہ کہ میرے ماتھے پر بکی ہوئی بل تمہارے گنگھروں کی چھن چھن کمانے کے لیے کتنی مدت سے بے تاب ہیں۔ مگر میں تمہارے انتظار میں اتنی مدت تک جاگتے رہنے کے بعد ابھی آنکھیں بند ہی کر رہا تھا کہ تمہارا بھائی تمہیں لینے آ گیا۔ بہت خوب۔ یوں کریں کہ جلدی جا کر یہ کہہ دیں۔ پنڈی کی طرف جانا ہے جناب"

اس پر ساجدہ جس طرح مسکرائی تھی، وہ ایک عجیب مسکراہٹ تھی۔ اس مسکراہٹ میں حیا بھی تھی، غرور بھی تھا اور اس شکاری کی سی طمانیت بھی جو ہرن کو جال میں پھنسا کر اسے جال میں سے نکالنے اور ذبح کرنے سے پہلے ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ جاتا ہے۔ اور آنکھیں بند کر کے سگریٹ کے لمبے لمبے کش لگانے لگتا ہے۔ اس نے صرف اتنا کہا تھا "بھاگ تو جاؤں پر وہ پرلی طرف کھڑکی کے پاس بھائی جان جو بیٹھے ہیں!"

راحت علی نے چند مہینے پہلے جب ساجدہ کو پہلی بار دیکھا تھا، تو اسے پہلی بار یقین آیا تھا کہ اجنتا کے غاروں جیسی دیویاں آج بھی زندہ ہیں۔ ایسا چکنا چکنا رنگ کہ اسے دیکھنے کے بعد آدمی کچھ دیکھ ہی نہ سکے۔ سیاہ بھوؤں کے نیچے اتنی بڑی بڑی آنکھیں کہ بچوں کے چہروں پر بھی بڑی معلوم ہوں۔ اتنی لمبی پلکیں کہ اگر غفلت اس کے سر پر جھک رہا ہو تو پلکوں کے سائے اس کے سارے چہرے پر چلمن سی لٹکا دیں۔ پتلی نازک سی جھکی ہوئی ناک اور اتنے باریک ہونٹ جیسے سرخ ریشم کے ایک تار پر سرخ ریشم کا ایک تار رکھا ہو۔ ننھی سی گول سی ٹھوڑی اور ایسی شفاف گردن کہ پانی کا گھونٹ بھی اترتا دکھائی دے جائے۔ اس کے جسم کی ساری قوسیں اور تمام زاویے ان دیویوں کے سے تھے۔ راحت علی نے جب بھی ان دیویوں کی تصویریں دیکھی تھیں تو صحت اور جوانی سے لبالب بھرے ہوئے ان کے جسموں نے اسے یہ سوچنے پر مجبور کیا تھا کہ ان مورتیوں کے خالقوں نے ذرا سا مبالغہ ضرور کیا ہے۔ مگر اب مصور اور

شاعر، سیدھی سادی صاف نظر آنے والی حقیقت میں نئی حسن صرف یوں پیدا کر سکتے ہیں کہ چلتے چلتے اس جیسے معاملوں میں وہ اسے مبالغہ بنا جائیں۔ مگر ساجدہ کو دیکھ کر ایک پل کے لیے راحت علی کو خیال آیا تھا کہ کبھی کبھی حقائق بھی مبالغہ کرتا ہے؟ اور جب اس نے دیکھا تھا کہ چھلکا اٹھتی جھیل منسی اور چہرے پر اترتی ہوئی لرزش کر چھلکتی ہی ہے۔ تو اس نے سوچا تھا کہ بعض حقیقتیں بھی مبالغے کی حد تک حسین ہو سکتی ہیں۔

راحت علی اپنے ایک دوست عبدالمنان کا شہ بالا بن کر برات کے ساتھ آیا ہے۔ جلوہ آیا تو خلعت کو جب دلہن کی سہیلیاں عبدالمنان کو کان سے پکڑ کے اندر لے گئیں تو ظاہر ہے کہ راحت علی شہ بالا بھی دولہا کے سنگ رہنے کے لیے ان کے ساتھ ہو لیا۔ دلہن کی حویلی کے صدر دروازے کے قریب پہنچ کر ایک لڑکی چیخ اٹھی "بہنو۔ ہمارے ساتھ تو یہ کوئی غیر مرد بھی آ رہا ہے" سب لڑکیاں جو لڑکے دولہا کی طرف جا گئیں تو آگے جاتا ہوا عبدالمنان اوندھے منہ دیلے میں گر پڑا۔ ایک لڑکی اس کے اوپر سے کود گئی اور پھر سب لڑکیاں اس پر سے پھلانگتی بھاگ اٹھ گئیں۔ راحت علی نے لپک کر عبدالمنان کو اٹھایا تو سامنے سے لڑکیوں نے دو چار چراغوں کی روشنی اس کے چہرے پر جگنوؤں کی طرح مسلط کی اور پھر چیخ کر ہنسنے لگیں اور تالیاں بجاتی ہوئی اندر بھاگ گئیں۔ اوپر ڈیوڑھی کی چھت پر بھی بگڑ سا مچ گئی اور راحت علی نے عبدالمنان کو مشورہ دیا کہ سہرے کو رخ پہ سجا کر نکلیں۔ عبدالمنان لڑکیوں کی اس بدتمیزی کی وجہ سے غصے میں تھا۔ کچھ کہے بغیر چلا تو سامنے سے اس کے منہ پر ایک اور ستارہ کا چانٹا پڑا۔ اور دونوں دم بخود کھڑے رہ گئے۔ پھر ایک لڑکی یوں چیخ چیخ کر ہنسنے لگی جیسے دولہا کا شہ بالے کو بیل سمجھ کر اندر حویلی میں ہنکار رہی ہے۔ مجبوراً یہ دونوں حویلی میں آئے تو وہاں تیز روشنی نے رات کو دن بنا رکھا تھا۔ راحت علی نے پلٹ کر جب اس لڑکی کی طرف دیکھا جو دونوں کو اندر ہنکا لائی تھی۔ تو ایک مہ رو کا جی چاہا کہ وہ کہنے لگے صنوبر جانے کیا دیکھ رہے ہو؟ لڑکی رعب سے بولی "آگے چلو"۔ راحت علی نے لڑکی کی آواز پہچان لی۔ یہی تھی جس نے ایک غیر مرد کی موجودگی کا نعرہ مارا تھا اور شاید یہی تھی جس نے منہ کے بل گرے ہوئے دولہا پر سے پھاندنے کی ابتدا کی تھی۔ یہی ساجدہ تھی۔

عورتوں اور لڑکیوں سے ٹھنسے ہوئے ایک کمرے میں جب عبدالمنان اور راحت علی کے سامنے "بیڑی گلوری" لا کر رکھی گئی تو ساجدہ آئی، سب کے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی اور "بیڑی گلوری" میں سجے ہوئے ایک طشت میں سے عجیب عجیب بت اٹھا اٹھا کر دولہا سے ان کا تعارف کرانے لگی "یہ آپ کے ابا جان ہیں۔ مشرق سے مغرب تک پھیلی ہوئی توند سے پہچانیے" ساتھ ہی عورتوں کے قہقہے ایک ساتھ بلند ہوئے اور کسی نے کہا "یہ ساجدہ کم بخت تو شیطان کی خالہ نکلی"۔ ساجدہ دولہا سے مخاطب تھی "یہ آپ کی امی جان ہیں۔ دھجیوں کی طرح لٹکی ہوئی جھریوں سے پہچانیے۔ یہ آپ کے ماموں جان ہیں۔ پھینی پر رکھی ہوئی بیر برابر افیون کی گولی سے پہچانیے۔ اور یہ آپ کے شہ بالا جان ہیں۔ الو کی سی صورت سے پہچانیے" عورتیں یوں چلا چلا کر ہنس رہی تھیں جیسے رو رہی ہوں۔ اور ساجدہ آخری بت کو راحت علی کے اتنا قریب لے آئی جیسے اس کے منہ میں ٹھونس دے گی۔ بولی "یہ آپ ہیں۔ وہی کھڑا سی ناک ہے کہ نہیں؟ وہی چپٹے برابر آنکھیں ہیں کہ نہیں؟ وہی چھاج کے سے کان ہیں کہ نہیں؟ وہی غار سا دہانہ ہے کہ نہیں؟" پھر وہ عورتوں کے مجنونانہ قہقہوں کے درمیان اس بت کو راحت علی کے سامنے نچانے لگی "ہے کہ نہیں؟ ہے کہ نہیں؟ ہے کہ نہیں؟" اور راحت علی ہکا بکا اس بت کو دیکھتا رہا مگر دراصل وہ ساجدہ کو دیکھتا رہا جو سنیاتی دھندلکوں سے نکل کر یہاں چلی آئی تھی اور اپنے ساتھ اتنا بے پناہ اتنا ناقابل برداشت اور قدموں تلے سے زمین کو نکال دینے والا حسن سمیٹ لائی تھی کہ حقیقت اور مبالغے کی حدیں آپس میں خلط ملط ہو گئی تھیں۔

راحت علی کو عبدالمنان پہلے سے بتا چکا تھا کہ دلہن کی خاص سہیلی کی طرح برسوں کی پرانی رسم کے مطابق دولہا کے شہ بالے کو بھی

[illegible]

[illegible]

[illegible]

"ہائے خدیجہ! کوئی بڑی بی بولی: 'یہ کمال مت کرو۔'"

برات جب واپس لاہور پہنچی تو راحت علی ہاتھ دھو کر عبدالمنان کے پیچھے پڑ گیا کہ وہ بی بی جو سے کہہ کر ساجدہ کے رشتے کی بات کرنے میں اس کی مدد کرے۔

ایک دن عبدالمنان نے راحت علی کی موجودگی میں مذاق مذاق میں یہ ذکر چھیڑا تو رضیہ نے ساجدہ کی تعریفوں کے پل باندھ دیئے۔ بولی یہ نہ جانے اس روز سے کیا ہو گیا تھا۔ ویسے تو وہ ایسی ویسے رہنے والی لڑکی ہے کہ مجھ جیسی پرانی اور پکی سہیلی نے بھی اس کی زبان سے کبھی کوئی ایسی ویسی بات نہیں سنی۔ بس یہ دکھ ہے کہ سنا ہے اس روز پہلے تو راحت بھائی چپ چاپ بیٹھے گھڑی کھاتے رہے مگر جا کر اس کی کلائی پہ ہاتھ مارا تو چوڑیوں کی کرچیاں اس کی جلد میں اتر گئیں۔ میں جب ملنے گئی تو اس نے بتایا کہ ڈاکٹر تک نوبت پہنچی ہے اور وہ روزانہ پنسلین کے ٹیکے لے رہی ہے۔ ساجدہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ رشتہ اسی چوڑی توڑ کی طرف سے آیا ہے

تو میں سمجھ گیا حنان، دراصل وہ کہ راحت جانتی ہے بہت بھلے آدمی ہیں۔"

"میں بیچارہ شہری آدمی" راحت علی نے اپنی صفائی پیش کی۔ "مجھے کیا معلوم کہ یہ بڑی کلائی والی لڑکی اس بات کا اتنا برا مان جائے گی۔ کیسے اُسے ملنا تھا۔ حنان تم نے مجھے ذرا سا بتایا تو تھا مگر مجھے اس انتہا کی خبر نہ تھی۔ اس نے تو جیسے ہاتھ کی چوڑیوں پر ہی گرفت ڈال دی سے اب تک ہاتھ پیدا نہیں ہوا۔ خدا کی قسم میں اس خیال سے چپ چاپ بیٹھا ہوں کہ شاید مجھے اجازت ہو کر اسے دلہن بنا کے لے جاؤں۔ جب محسوس کیا کہ ہاتھ ڈھیلا چھوڑ دیا ہے تو میں نے بالکل اندھوں کی طرح اس کی کلائی پکڑی۔ آپ ہی بتائیے حنان میں کیا کرتا۔ اس میں میرا کیا قصور ہے۔"

"جانے مجھے کیا ہو گیا ہے حنان" بعد میں اس نے عبدالحنان کو بتایا تھا۔ "وہ تو مجھے بالکل بھاؤ تاؤ چاہئے کہ ساجدہ کی کلائی پر ہاتھ پڑنے سے پہلے چوڑیاں توڑ دیں تو میری آنکھیں کھلیں۔ اگرچہ میں نے تو تھپڑ کھا کر کہتا ہوں۔ خدا جانے میں کیا کر بیٹھا ہوتا مگر چوڑی ہاتھ پر ٹوٹی تھی۔ درد تو بہت ہوا پر ترس آتی تھی۔ اور پھر یہ بھی شکر ہے کہ میں نے اسے پکڑ لیا۔ میں ایسا نہ کرتا تو خدا کی قسم بچوں کی طرح رونے بیٹھ جاتا۔ وہ کسی وجہ سے نہیں۔ جانے کس وجہ سے۔ بس مجھے رونا آ جاتا۔ عورتوں کے سامنے رونا آ جاتا۔"

عبدالحنان اور اس کی بیوی جب بھی جہلم گئے۔ ساجدہ کے والدین سے ملے۔ راحت علی کے خاندان پر بھی نگاہ ڈالی اور تفصیلیں بھی معلوم کرتے رہے۔ رضیہ نے حنان کو یہ بھی بتایا کہ جب ایک بار اس نے ساجدہ سے پوچھا تو وہ بولی "کلائی ٹوٹ گئی بعد میں پرواہ نہیں۔ مجھے بھی تو وہ کچھ ایسے بُرے نہیں لگے تھے۔" راحت علی کے ماں باپ مر چکے تھے اور وہ اپنے خاندان کا واحد فرد تھا۔ اس لیے آخر میں رضیہ کے کہنے پر اس نے کہیں سے دور دراز کی ایک خالہ کا بھی سراغ لگا لیا جو عبدالحنان اور رضیہ کے ہمراہ جہلم جا کر بات پکی کر آئی اور تین مہینے بعد کی تاریخ بھی مقرر ہو گئی۔

شادی کے دن لڑکیوں نے راحت علی کو خوب بنایا مگر وہ احمقوں کی طرح چپ چاپ بیٹھا رہا۔ جہلم ہی سے اس کے لیے ایک شہ بالا ڈھونڈ نکالا گیا تھا جس نے ساجدہ کی خاص سہیلی زرینہ کے ہاتھوں چاندی کے خوبصورت کنگن کی قیمت چار چوٹیں کھانے کے بعد لے کر فرار اختیار کر لی اور سہیلیوں کو تماشا ہوا۔ ایک لڑکی میں سے کوئی تو ایک انگلی توڑ دی۔ مگر اسے جیرت سے پکڑ کر لا بٹھایا گیا اور اس کے زخم پر فلک چھڑک کر اس پر پٹی باندھ دی گئی۔ اس پر وہ کا بلبلا پڑا تھا۔ مگر راحت علی مسکراتا رہا اور رنگ رنگ والیوں جیسے گیت سنتا رہا اور سوچتا رہا کہ جب وہ پہلی بار ساجدہ سے تنہائی میں ملے گا تو اس کی کلائی پر سے خوبصورت کنگن اتارے گا اور پھر اس نے ساجدہ کے لیے بڑے شوق سے بنوائے تھے، اپنے ہاتھ اس کے سامنے پھیلا دے گا اور کہے گا یہ لو یہ تحفہ قبول کر لو کہ میں تمہاری کلائی کو ٹوٹا اُٹھائے لگا ہوں۔ مگر ساجدہ صاحب کے سامنے بار بار کبھی کلائی کو پاس رکھ کر بیچ میں سے کر کے پیچھے ہٹتی ہوئی ابھرتی رہی اور وہ سوچتا رہا کر دہ اس کی کلائی پر کہاں کہاں پیار کرے گا اور اگر کلائی پر چوڑیاں ہوئیں تو انھیں کتنی نرمی سے اِدھر اُدھر ہٹا کر اپنے ہونٹوں کے لیے جگہ بنائے گا۔

شادی کے بعد راحت علی کو ساجدہ کے ساتھ صرف دو دن گزارنے کا موقع ملا مگر ان دو دنوں میں اس کی کیفیت ایسی رہی جیسے وہ حساب زندگی کا پورا ناپ رہا ہے۔ اس کا رنگ زرد پڑ گیا تھا اور ہتھیلیاں اور تلوے ہر وقت بھیگے رہتے تھے۔ عبدالحنان نے اسے سمجھایا بھی کہ دولہا ؤں کے یہ تیور نہیں ہوتے مگر راحت علی بولا "میں کیا کروں حنان۔ میں ابھی تک یہ فیصلہ ہی نہیں کر پایا کہ میں اس لڑکی سے پیار کروں یا اس کی پوجا کروں یا اس سے نفرت کروں۔ وہ جس نے میرے ہاتھ کی ہڈیاں توڑ ڈالی تھیں اب دلہن کی

[illegible] ساجدہ [illegible]

[illegible] ساجدہ [illegible] راحت علی [illegible]

[illegible]

اس پر ساجدہ [illegible] مسکرائی تھی [illegible]

[illegible] سگریٹ کے [illegible]

جب دو روز کے قیام کے بعد ساجدہ [illegible] راحت علی سے تنہائی میں ملی [illegible] اس وقت [illegible] دروازے کو [illegible] بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا [illegible] ساجدہ [illegible] اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی تو [illegible] چونکا [illegible] اور بولا "کیا بات ہے؟"

ساجدہ کی مسکراہٹ اس کے چہرے پر [illegible] راحت علی نے [illegible] آہستہ سے [illegible] بولی "کیوں کیا بات ہے؟"

راحت علی نے جیسے [illegible] اپنے آپ کو سنبھالنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا اور ٹہلنے لگا۔ ساجدہ [illegible] حیران ہو کر [illegible] کھڑی رہ گئی جیسے [illegible] پھر وہ [illegible] دور سے آنے والی آواز میں بولی "میں آپ کو یہ بتانے آئی تھی کہ امی ابا نے اجازت دے دی ہے اور ہم آج شام کی گاڑی سے لاہور جا رہے ہیں۔"

راحت علی نے اسی طرح ٹہلتے ہوئے اور ساجدہ کی طرف دیکھے بغیر کہا "جانا چاہو تو دو چار دن اور رک جاؤ۔ میری طرف سے اجازت ہے۔"

یہ کہہ کر وہ پلنگ پر بیٹھ گیا اور ساجدہ کو [illegible] ایسا لگا [illegible] جیسے اس کی [illegible] بے ہوش ہو کر [illegible] بھاگ جائے [illegible] وہ ایک لمحہ [illegible] کھڑی راحت علی کو دیکھتی رہی جیسے اسے [illegible] کی کوشش کر رہی ہے۔ پھر اسے [illegible] رونا آگیا [illegible] پلنگ [illegible] راحت علی کے سینے پر سر رکھ کر اور بازوؤں کو اس کے شانوں پر [illegible]

لڑکیاں وہیں راحت آ کر بیٹھیں گے ... بی کی گاڑی سے چلی گئے۔
"بہت اچھا بیٹا۔" راحت علی ساجدہ کے زور زور سے قہقہے لگاتے ہوئے بہت سنجیدہ ہو کر ... ہاں ... ہو جاتا۔

وہ اسی روز یہاں سے چلے گئے۔ پھر کوئی ایک ہفتہ بعد جب محلے میں ساجدہ کی امی اور باجی وغیرہ گھر سے نکلے اس موضوع پر باتیں کر رہے تھے کہ لڑکیاں سامنے جانے کے بعد یکایک بیتے برسوں کے کمرے سے باہر نکل کر ایک کمبل میں آئیں۔ تو یکایک ساجدہ کی امی ... یہاں سے بہت دور یوں کی طرح بچے کی ... راحت علی ... ساجدہ کے ابا کے پیر پکڑ کر راحت علی کو جھڑک رہے تھے ... مگر وہاں راحت علی نے ... ایک کلمہ ... اس نے سلام کر کے کمرے کے حوالے کیا اور روتا ہوا ... کی طرح دے دیا۔

"صاحب سلام ہو رہا ہے اور وہ سب کچھ ... جب ... آدمی کیسے کر سکتا ہے؟"
ایک دن ساجدہ کی رشتہ داروں اور سہیلیوں سے بھرا ہوا ... بات بات پر انگلیاں رکھی جاتی رہیں ... آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اور ... ساجدہ کی امی ... پورے مجمع میں یوں عام ہو گیا کہ راحت علی تھوڑا سا پاگل ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم خوبصورت تو ہو مگر صرف خوبصورت ہو تمہاری خوبصورتی دوسرے ... خالی ہے۔

"یہ وجہ کیا بتاتے ہیں؟" بتانے والی سے کسی نے پوچھا۔
"اور وہ ... ہوتا ہے۔ یہاں نہیں ہوتا۔ اُدھر بڑے بڑے شہروں میں ہوتا ہے۔" پھر اس نے راحت علی کے پاگل پن کی وضاحت جاری رکھی۔ "وہ کہنے لگا ساجدہ بی بی ... کہ میں تمہیں دور سے دیکھ کر دھوکا کھا گیا تھا۔ میں سمجھا شاید تم ... سانپ ہو ... تم ... نکلیں۔"
"اس نے یہ کہا اس نے؟ ... اس نے؟" کسی نے پوچھا۔
بتانے والی بولی "اسے میں کوئی پاگل ہوں کہ پاگلوں کی باتوں کا مطلب بتاتی پھروں۔ ہاں تو پھر بہن ... کچھ ہی دن گزرے تو غضب ہو گیا۔ کل جب ساجدہ نے سوتے ہوئے راحت علی کو ذرا سا چھیڑ دیا تو اس نے ساجدہ کے منہ پر ایک تھپڑ مارا اور کہنے لگا کہ تم صرف خوبصورت ہو۔ تم صرف ایک عام سی عورت ہو۔ شادی سے پہلے میں نے تمہارے حسن کے ہاتھوں میں جو تلوار دیکھی تھی۔ وہ کہاں ہے؟ جاؤ، اپنے آپ کو میری نفرت سے بچاتی جاؤ۔"
"پاگل ہے۔ صاف پاگل ہے۔" کسی نے کہا۔
"بدتمیز ہے، وحشی ہے، درندہ ہے۔" ندیمہ جو ساجدہ کے گھٹنے کے پاس بیٹھی ہوئی تھی چلا اٹھی۔ "ہائے مجھے قسم پروردگار کی، میں تمہاری جگہ ہوتی تو اسے چھٹی کا دودھ یاد دلا دیتی۔ ساری عمر پچھتا ... اس نے تمہارے منہ پر تھپڑ مارا تو کیا تمہارے ہاتھ پر فالج گر گیا تھا؟ جواب میں تم اسے تھپڑ مارنے کے بجائے رونے لگیں اور یہاں بیٹھی ... آئیں۔ میں ہوتی تو قسم پروردگار کی۔ اسے دونوں کانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑتی اور پوچھتی کہ کیوں میاں۔ اب بتاؤ۔ درندہ ... کتنے ہوتے ہیں؟ پھر ذرا سا ... کر لیتی۔ کمینہ!"

[illegible]

کم [illegible] ساجدہ [illegible]

[illegible] سہیلیاں [illegible] راحت علی [illegible]

دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا کر [illegible] ساجدہ [illegible] تو وہ ہاتھوں کو دونوں میں [illegible] جاتے ہیں۔

پھر ایک روز جب رات کے گیارہ بجے تک گرما گرم تاش کھیلنے کے بعد سب لوگ سونے کے لیے کمروں میں [illegible] ساجدہ کی سہیلیاں اپنے اپنے گھروں کو چلی گئیں تو ایک [illegible] کے قریب [illegible] اپنے ملازم کے ساتھ [illegible] سب لوگ [illegible] دونوں ہاتھوں میں چھپا کر وہیں دروازے پر بیٹھ گئیں۔ سارے گھر میں سناٹا چھا گیا۔ پھر کسی نے [illegible] راحت علی اپنے کمرے میں نہیں ہے اور اس کے کمرے کا [illegible] دروازہ [illegible] کھلا ہے۔ [illegible] ایک دوسرے کا منہ تکتے رہے۔ پھر سب ایک دم راحت علی کے کمرے کی طرف بھاگے۔ وہاں پہنچ کر وہ پھر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے مگر [illegible] ساجدہ نے [illegible] معمہ حل کر دیا۔

[illegible] کے نوجوان رشتہ دار ایک کار میں ٹھنس ٹھنسا کر لاہور کی طرف روانہ ہو گئے اور ساجدہ کے ابا نے عبدالمنان کو تار بھجوا کر فوراً بلوایا۔ مگر جب تک یہ [illegible] راولپنڈی سے پی اے کے نام [illegible] کا خط آ چکا تھا کہ ہم بخیریت ہیں اور آپ کی خیریت نیک مطلوب ہے۔ صرف سوال یہ ہے کہ ہمیں معاف کر دیجئے۔ چھوٹے غلطیاں کرتے رہتے ہیں اور بڑے معاف کرتے رہتے ہیں۔ اور آپ ہمیں معافی کی چٹھی لکھ دیں تو ہم دونوں آپ کی قدم بوسی کے لیے فوراً حاضر ہو جائیں گے۔

راحت علی جب ساجدہ کو مکلاوے پر جہلم لایا تھا۔ اور سسرال میں اپنی بہت سی نئی رشتہ داروں اور ساجدہ کی سہیلیوں میں گھر

برآمدے میں جا کر بیٹھا تھا اور سامنے دیکھا تھا تو یکایک اسے محسوس ہوا تھا کہ اس نے ساجدہ سے شادی کر کے غلطی کی ہے۔

"یہ کون ہے؟" اس نے سوچا تھا۔ "یہ جو ساجدہ کے بالکل اُلٹ ہے۔ بلکہ پھر بھی خوبصورت ہے جس کی نسائیت میں وجاہت ہے اور جس کا رنگ اتنا صبیح ہے کہ زبان تک کو اس کا ذائقہ محسوس ہوتا ہے۔ جس کی آنکھیں اتنی بڑی بڑی ہیں کہ اس سے بھی بڑی ہوتیں تو مصنوعی معلوم ہوتیں۔ ہر پلک ہلال کی طرح خمیدہ ہے۔ خوب لمبی اور گھنی ہوئی بھویں ہیں۔ بیچ میں ہونٹوں کی گولائی تک سے نکلی ناک، ایسی جیسے یہ ساجدہ کی سی ناک ہوتی تو پورے چہرے کا ناس مار دیتی۔ بھرے بھرے ہونٹ ہیں جن کا جگہ جگہ سے ... ہے جیسے مست سا زہر آلود خون پڑے پڑے جم گیا ہو۔ سامنے سے صرف ہونٹ ٹھوڑی ہے۔ گردن میں پتلی پتلی رگیں ہیں اور جسم کے خطوط میں رعنائی بھی ہے اور توانائی بھی۔ یعنی ایک ایسا بھرپور پن جس کی وجہ سے سارا جسم گُندھا ہوا نظر آتا ہے۔" راحت علی نے سوچا تھا کہ اگر وہ مصور ہوتا تو اس لڑکی کی تصویر کھینچ کر اس کے نیچے "موت" لکھ دیتا۔

ایک ساتھ سب نے اس لڑکی کی طرف دیکھا جس کی طرف راحت علی مسلسل دیکھے جا رہا تھا۔ پھر وہ بولی تھی "بلقیس دولہا بھائی تو مجھے بالکل مریدوں کی طرح دیکھے جا رہے ہیں۔"

"ہائے زرینہ" کوئی بڑی بی بولی۔ "گالی مت بکو۔"

"گالی مت بکو زری۔" راحت علی نے راولپنڈی کے ایک ہوٹل میں اپنے کمرے کا دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ "میں تو تمہیں اپنا ایک خیال بتا رہا تھا۔ میں تو صرف یہ کہہ رہا تھا کہ دنیا کی ساری عورتیں چاہے وہ ساجدہ ہی ہوں، چاہے زرینہ ہی، جب بیوی بن کر مرد کے قریب آتی ہیں تو اپنی شخصیت کے خول میں سے نکل آتی ہیں اور سیدھی سادی عام عورتیں بن جاتی ہیں۔ میں تو تمہیں یہ بتا رہا تھا کہ ساری دنیا میں صرف ایک عورت بستی ہے۔ البتہ ہر گھر میں اس کا نام مختلف ہے!"

"پھر وہی بک بک!" زرینہ اٹھ کر بولی۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ زرینہ کے نام اس کی امی کا خط آیا تھا۔ دنیا کی تمام ماؤں کی طرح انھوں نے بھی یہ کڑوی گولی آنکھیں بند کر کے نگل لی تھی۔ انھیں فوراً جہلم بلا بھیجا تھا اور یہ فرمائش بھی کی تھی کہ آتے ہوئے جہیز کے لیے مری کی قیمتی چادریں بھی لیتی آنا۔

"اس کا مطلب تو یہ ہے" راحت علی نے کہا "کہ تمہاری امی ہم سے نہ صرف خفا نہیں ہیں بلکہ خوش ہیں۔"

"خوش کیوں نہ ہوں" زرینہ بولی۔ "میں نے انھیں باقاعدہ شادی کے دس ہزار کے خرچے سے بچایا ہے کہ نہیں؟"

دوسرے دن دوپہر کو دونوں جہلم پہنچے تو زرینہ کی ماں دس منٹ تک زرینہ کو سینے سے لگائے روتی رہیں۔ وہاں سے فارغ ہو کر انھوں نے راحت علی کے سر اور پیٹھ پر تین چار بار ہاتھ پھیرا اور اس کا کندھا چوما۔ پلٹ کر وہ زرینہ سے لپٹ گئیں — اور راحت علی نے ایک کرسی پر بیٹھ کر اپنی سامنے کی جیب میں سے کنگھی نکالی اور بال سنوارنے لگا۔

ایک دم اتنی بہت سی پڑوسنیں قطار اندر قطار صحن میں اُنڈ پڑیں۔ اور زرینہ، اس کی امی اور راحت علی ان میں گھر کے رہ گئے۔ جتنی عورتیں تھیں انھیں یوں حسرت سے دیکھے جا رہی تھیں جیسے وہ کوئی بہت بڑا معرکہ سر کر کے لوٹے ہیں۔ اِکا دُکا نوجوان لڑکیوں نے راحت علی سے چھیڑ چھاڑ کی بھی کوشش کی اور بعضوں نے اپنی چوڑیوں بھری کلائیاں بھی اس کے سامنے یہ کہہ کر پھیلا

دیکھ [illegible] کے [illegible] جب [illegible] تھا۔ جیسے اس کے سامنے [illegible] رہی ہے۔

ادھر [illegible] سب [illegible] ساجدہ [illegible] وقت اس کے ہاتھ میں [illegible]

راحت علی کے چہرے پر [illegible] ایسا [illegible] پیچھے [illegible] سب سے [illegible] طرف دیکھا [illegible] سب [illegible] قمیص میں ادھر ادھر [illegible] راحت علی نے ساجدہ کو دیکھا [illegible]

ساجدہ کے [illegible] ساجدہ [illegible] چہرہ تھا۔ [illegible] تھا۔

وہ آنکھیں بھینچے ادھر ادھر [illegible] دیکھے بغیر [illegible] راحت علی کی طرف آئی۔ اس کے قریب آ کر رک گئی۔ اپنی بڑی بڑی آنکھیں پھیلا کر اسے دیکھنے لگی۔ [illegible] جیسے کوئی [illegible] مشین کی طرح اس نے دونوں ہاتھوں سے [illegible] راحت علی کے منہ پر تھپڑوں کی بوچھاڑ کر دی۔ راحت علی بازو اٹھائے یوں [illegible] جیسے ساجدہ کی چوڑیوں نے [illegible] ہے۔ پھر اچانک اس کے [illegible] میں حرکت پیدا ہوئی اور اس نے ساجدہ کی چوڑیوں بھری کلائی دبوچ لی۔ لال لال چوڑیاں چھن سے ٹوٹیں اور ہر طرف [illegible] بکھر گئے اور ساجدہ کی کلائی کے خون سے راحت علی کی انگلیاں [illegible] ساجدہ [illegible] راحت علی پر جھپٹی اور اس کے ہاتھ میں [illegible] راحت علی نے ہاتھ سے [illegible] خون کی ایک دھار [illegible] عورتوں کو [illegible] ساجدہ کو کندھے سے جھنجھوڑ کر پوچھا "یہ کیا بکواس ہے؟"

ساجدہ نے راحت علی کے ہاتھ پر سے ہونٹ ہٹا کر ایک جھٹکے کے ساتھ اپنی کلائی چھڑا لی اور [illegible] دانتوں پر پھیلا ہوا راحت علی کا خون زرینہ نے منہ پر تھوک دیا۔ زرینہ دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا کر روتی ہوئی وہیں بیٹھ گئی اور ساجدہ واپس جانے کے لیے پلٹی ہی تھی کہ اندر کمرے میں سے زرینہ کی امی سو سو کے نوٹ ہاتھ میں لیے ہوئے چیختی چلاتی باہر نکلیں اور پکاریں "یہ لے اپنا دس ہزار کا حق مہر جس کی خاطر تو میری بچی [illegible] رہی ہے۔ میں تو [illegible] تیرے جیسے [illegible] قربان کر ڈالوں اس جوڑے پر سے۔"

ساجدہ نے جس کے ہونٹ راحت علی کے خون سے سرخ ہو رہے تھے ذرا سا رک کر زرینہ کی امی کی طرف بے پناہ حقارت سے دیکھا اور پھر رستہ بناتی ہوئی عورتوں کے ہجوم میں سے گزر کر باہر چلی گئی۔

"لائیے! اپنے بچے دے دیجئے۔" آہستگی سے زرینہ نے اس کی طرف اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔

"یہ لے لو بیٹا" اختر نے لڑکی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"بیٹا! آپ نے مجھے دیکھا ہے ناں؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں ہاں خالہ!" وہ بولی۔

اور حسرت سے یہ منظر دیکھتے ہوئے روتی ہوئی زرینہ کے سامنے جھکتے ہوئے کہا "تو میں نے آپ کی بچی کو دے دیا"

بلکہ اور وہ یوں باہر لپکا جیسے ذرا سا بھی رک گیا تو اسے بہت دیر ہو جائے گی۔ زرینہ نے یہ دیکھا تو لڑکی چھوڑ کر آنکھیں پھاڑ کر اسے جاتا دیکھنے لگی اور اس کی امی دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا کر روتی ہوئی وہیں بیٹھ گئیں۔ مگر اسے علی پتا چلا گیا۔ وہ باہر سڑک پر آگیا اور بھاگنے لگا۔ ٹھیک ٹانگے میں ساجدہ کے ابا، اس کا بھائی اور عبدالمنان اس کی طرف آ رہے تھے۔ مگر وہ انہیں نہ دیکھ سکا۔ وہ تو صرف ساجدہ کو دیکھ رہا تھا جس سے اب وہ صرف چند ہی قدموں کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔

سنترے

خواجہ احمد عباس

بت شکن نہیں ہے ہندوستانی، سمجھے۔

دفعتاً ایک ستارہ ٹوٹا اور روشنی کی لکیر بناتا ہوا فضا کی تاریکی میں جذب ہو کر غائب ہو گیا۔

بھائی جان کی کھڑکی سے ذرا سے بچی ہوئی آشا نے دیکھا۔ تارہ ٹوٹتے وقت جو خواہش کی جائے ... ہے۔

ایک نامعلوم خوف سے وہ کانپ اٹھی۔ مگر پھر اس نے اپنے دل کو سمجھایا۔ یہ سب وہم ہے۔ اگر ہر بار ستارہ ٹوٹنے پر ہوائی جہاز کریش (CRASH) ہو جایا کرے تو لوگ ہوائی جہاز میں سفر کرنا ہی چھوڑ دیں۔ اور پھر اس وقت تو اس سے زیادہ خوش قسمت لڑکی ساری دنیا میں نہ ہو گی جو کروڑ پتی ... کی بہو کی حیثیت سے ... ہنی مون منانے جا رہی ہے — بلدیو شاہ — جس کے ہاتھ میں اس وقت آشا کا ہاتھ ہے، جس کے ساتھ وہ کل ہی شادی ... ہوائی جہاز میں ساری دنیا کی سیر کو روانہ ہونے والی ہے۔ بلدیو سیٹھ ... کروڑ پتی کا اکلوتا بیٹا ہے اور ... کروڑ پتی ان بڑے بڑے ہوٹلوں کے مالک ہیں جو سارے ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں۔ دہلی میں ... مسوری میں ... گرینڈ، نینی تال میں لیک ویو، کلکتہ میں ایسٹ اینڈ، لکھنؤ میں کرسٹو پیلس، بنگلور میں ... مارے جیں، بمبئی میں ... میں میرینا ... یہ فہرست ... آپ ہی آپ ... یہ نام آتی بار سنے تھے کہ زبانی حفظ ہو گئے تھے۔

بلدیو کو اپنے باپ کی اس 'ہوٹل امپائر' پر بڑا ناز تھا اور اس نے آشا سے وعدہ کیا تھا کہ جب یہ سلطنت اس کے قبضے میں آئے گی تو وہ دہلی میں ہندوستان کا سب سے بڑا، سب سے خوبصورت اور سب سے عالیشان ہوٹل تعمیر کرائے گا اور اس کا نام ہو گا آشا پیلس۔ اور یہ وعدہ یاد کر کے آشا نے بڑی محبت اور فخر سے بلدیو کا ہاتھ دبا دیا۔ بلدیو کا ہاتھ جو ... ہینڈ کریم کے استعمال سے نرم رہتا تھا جس پر محنت نے کبھی گٹھا نہیں ڈالا تھا جس کی انگلیوں کے ناخن ... ہوٹل کی حسین ... بڑے اہتمام سے تراشتی تھیں، ان کو نوکیلا بنا کر ان پر نیل پالش لگاتی تھیں۔

بلدیو کے ہاتھ کی نرمی اور گرمی میں کتنے ہی خوشگوار وعدے تھے۔ بمبئی سے وہ بوئنگ میں قاہرہ جائیں گے، وہاں نیل کے کنارے دنیا کے مشہور ہوٹل نائل ہلٹن (NILE HILTON) کے کمرہ نمبر ... سویٹ میں ٹھہریں گے۔ اونٹ پر بیٹھ کر اہرام مصر کے سامنے تصویر کھنچوائیں گے۔ کیبرے میں نیم برہنہ مصری لڑکیوں کا ناچ دیکھیں گے۔ پھر لندن جائیں گے۔ وہاں کے سب سے بڑے ہوٹل سیوائے میں ٹھہریں گے۔ بکنگھم پیلس کے سامنے فوج کے گارڈز کے ساتھ تصویر کھنچوائیں گے۔ پھر پیرس میں فرانس کے سب سے مہنگے ہوٹل جارج پنجم میں ٹھہریں گے۔

اور پھر نیویارک میں والڈروف اسٹوریا اور پھر شکاگو۔ اور پھر لاس اینجلز (LOS ANGILES) جہاں آشا پانڈے ایکٹرس بنے گی اور گریگوری پیک (GREGORY PECK) کے ساتھ تصویر کھنچوائے گی جو "لک" اور "لائف" میں شائع ہوں گی۔ جسے دیکھ کر اس کی ساری سہیلیاں رشک سے جل مریں گی اور پھر وہ ٹوکیو جائیں گے اور وہاں کے امپیریل ہوٹل میں قیام کریں گے اور پھر ہانگ کانگ اور سنگاپور کے مشہور ہوٹلوں کا معائنہ کرتے ہوئے واپس ہندوستان آ جائیں گے۔ بہت رہے ذرا تنگ۔ یہ بھی نہ خود ہی نہ سمجھ سکا تھا۔ ڈیڈی اس سفر پر مجھے سچ مچ بھیج رہے ہیں تاکہ میں دنیا کے سب بڑے بڑے ہوٹلوں کے اسٹینڈرڈ اچھی طرح سے معلوم کر سکوں اور طور طریقوں کو اپنے ہوٹلوں میں رائج کر سکوں۔ ان سب ہوٹلوں کے مالک میرے ڈیڈی کے دوست ہیں ہندوستان میں ہوٹل کا سلسلہ وہ چکے ہیں اس لیے ان میں سے ہر ایک نے بڑے اصرار سے ہمیں مدعو کیا ہے اور چونکہ ہر جگہ میرے ساتھ ہو گا ہنی مون بھی ہو گا اس لیے ڈیڈی نے فیصلہ کیا ہے کہ اپنے ساتھ اپنی کسی ذہین اور خوبصورت ہندوستانی لڑکی کو لے کر ساری دنیا کا دورہ کر کے ہنی مون منا لیا جائے اور جوڈی نے ہنس کر پیچھے سے اس سے کہا تھا۔

AINT THAT GONNA BE WONDERFUL, SWEETIE – PIE ?

اور جوڈی کا وہ بچکانہ لہجہ یاد کر کے آشا مسکرا دی۔

ہوائی جہاز میں تقریباً مکمل اندھیرا تھا۔ زیادہ تر مسافر سو رہے تھے سامنے کی سیٹ پر ایک موٹے تازے سیٹھ صاحب بڑے زور سے خراٹے لے رہے تھے جن کی آواز ہوائی جہاز کی گڑگڑاہٹ پر بھی حاوی تھی ان کے برابر میں سیٹھانی بچے کو گود میں لیے سو رہی تھی۔ راستے کی دوسری طرف ایک اینگلو انڈین جوڑا ایک ہی کمبل تانے سو رہا تھا۔ ان سے اگلی سیٹ پر ایک کھدر پوش منسٹر اپنی سیٹ کے اوپر لگی ہوئی ننھی سی ریڈنگ لائٹ جلائے ایک امریکن جاسوسی ناول پڑھ رہے تھے۔ ان کے برابر میں شارک اسکن کا سوٹ پہنے ایک سندھی بیوپاری تھا جو منسٹر صاحب سے کانا پھوسی کرتے کرتے سو گیا تھا۔

آشا نے سوچا یہ نائٹ ایئر سروس کا سفر بھی کتنا دلچسپ اور کتنا عجیب ہوتا ہے اور اس اندھیرے ہوائی جہاز میں جو اپنی مستقل رفتار سے اندھیرے کے سمندر میں تیرتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ اس کو ایسے لگا جیسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ صرف تین گھنٹے پہلے دہلی کے پالم ایئرپورٹ سے نہیں روانہ ہوئی ہے بلکہ جیسے یہ نائٹ ایئر سروس میں سفر کر رہی ہے اور یہ زندگی کا ہوائی جہاز ہمیشہ یونہی اسی لامتناہی فضا میں اڑتا رہے گا۔ بہتا رہے گا کیونکہ وقت کے اس سمندر کا کوئی کنارہ نہیں۔ یہاں تک کہ ایک دن وہ اور یہ تمام مسافر، یہ ساری دنیا ایک گہرے سناٹے میں ڈوب جائیں گے اور کائنات کے نظام میں اتنا فرق بھی نہیں پڑے گا جتنا کروڑوں ستاروں میں سے ایک ستارہ ٹوٹ جانے سے پڑتا ہے۔

اور اسی لمحے میں یکایک ہوائی جہاز کی ساری روشنیاں جل اٹھیں اور کچھ لوگ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے مگر وہ اینگلو انڈین جوڑا اسی طرح کمبل میں لپٹا لپٹایا رہا اور سیٹھ جی بدستور خراٹے لیتے رہے آشا نے دیکھا کہ سیٹھانی بچے کو دودھ پلاتے پلاتے سو گئی تھیں اور بچہ ابھی تک ماں کی چھاتی سے چمٹا ہوا تھا اس نے یہ بھی دیکھا کہ کھدر پوش منسٹر صاحب نے روشنی ہوتے ہی وہ امریکن جاسوسی ناول جس کے اوپر ایک نقاب پوش پستول باز اور ایک نیم برہنہ عورت کی تصویر بنی ہوئی تھی بند کر کے جلدی سے اپنے کھدر کے تھیلے میں ڈال دیا جس کے دوسری طرف مہاتما گاندھی کی تصویر چھپی ہوئی تھی اور اس میں سے پنج سالہ پلان کے بارے میں ایک موٹی سی رپورٹ نکال کر ہاتھ میں سنبھال

[illegible] میں جب وہ نوکری کے ... [illegible] ... سے نکال دیا ... [illegible] ... کی حالت ... [illegible] ... سے الگ کر دیا۔

[illegible] ... مستقل ... [illegible] ... ناگپور سے ... [illegible] ...:

ناگپور!

ناگپور!!

ناگپور!!!

[illegible] ... (۲۲۰۰۵۷۳۵۵۵۰) ... [illegible] ... سے ... [illegible] ... کی ... [illegible] ... ایک آہنگ ... ایک ... تال ——— ناگپور، ناگپور، ناگپور۔

اور وہ ہوائی جہاز ... [illegible] ... کی طرف جا رہا تھا۔

وہ اب بھی ہوائی جہاز میں بیٹھی ہوئی تھی

وہ ہوائی جہاز اب بھی ناگپور ہی کے ہوائی اڈے پر تھا۔

مگر وقت اور تھا، دنیا اور تھی، وہ خود اس وقت کچھ اور تھی۔

وہ اس دن کتنی خوش تھی۔ جب رشی کی اٹھارہ ... [illegible] ... خوبصورت تھی ہو تو بلاوجہ بھی خوش ہو سکتی ہے مگر اس دن خوش ہونے کی کتنی ہی وجوہات تھیں۔ اس دن اس کا بی۔ اے کا نتیجہ بھی نکلا تھا اور وہ پاس ہو گئی تھی۔ اسی ... [illegible] ... دوسرے ... [illegible] ... کا خط ملا تھا۔ ... [illegible] ... سکولوں ... [illegible] ... ہے۔ ... [illegible] ... ہے۔ سرکاری خط حسب معمول ... [illegible] ... دن صبح کے گیارہ بجے تھا اور وقت پر پہنچنے کی صرف ایک صورت تھی کہ ناٹ ایرمیل سے روانہ ہو جائے ... [illegible] ... چلتے چلتے ماں نے ہدایت کی تھی کہ دیکھو رستے میں کوئی انجان آدمی بات چیت کرنے کی کوشش کرے تو اسے جواب نہ دینا ایسے آدمی بہت خطرناک ہوتے ہیں اور دیکھو میں نے ... [illegible] ... کو تار دے دیا ہے۔ وہ تمہیں لینے پالم آئیں گی یا اپنے کسی نوکر کو بھیجیں گی۔ جب ناٹ ایرمیل کے سب مسافر اکٹھے ہو گئے تو آشا کی ماں نے ایک عمر رسیدہ خاتون سے بیٹی کا تعارف کراتے کہا "یہ میری بچی پہلی بار ہوائی جہاز میں بیٹھ رہی ہے کرپا کرکے اس کا خیال رکھئے گا۔" وہ آشا کو جھنجھلاہٹ بھی ہوئی کہ ماں مجھے کیا بالکل دودھ پیتی بچی سمجھتی ہیں۔ مگر پھر سفر کے خوش آئند خیال سے وہ مسکرا دی اور بولی "ماں تم بالکل

مجھ اڑنے میں ایک سیکنڈ کے لیے بھی مسز نارائن کا پلو نہیں چھوڑوں گی۔"

مسز نارائن کافی مشہور سوشل ورکر تھیں، وہ مختلف کانفرنسوں میں شرکت کے لیے اکثر ہوائی جہاز سے سفر کیا کرتی تھیں۔ انھوں نے آشا کو ہدایت کی کہ سیٹ بیلٹ کیسے کسا جاتا ہے اور کس طرح کمر سیدھی رکھ کر بیٹھا جاتا ہے۔ اور تھوڑی ہی دیر میں ائیر ہوسٹس مسافروں کی طرف ٹافیوں کی کوشش کرتی رہی۔ مگر آشا محض سوچتی رہی کہ کرسی کو کر گدے دار آرام دہ ہو تو اس پر کیسے سویا جا سکتا ہے اپنے بدن کو ڈھیلا چھوڑ کر اس نے سونے کی کوشش کی مگر جب کامیاب نہیں ہوئی تو وہ کھڑکی میں سے ائیر ہوسٹس کو کام کرتے ہوئے دیکھتی رہی جو مسافروں کو ٹافیاں، کان بند کرنے کے لیے روئی، سر کے نیچے رکھنے کے لیے تکیے، اوڑھنے کے لیے کمبل، اور اطمینان قلب کے لیے اپنی شیریں مسکراہٹیں تقسیم کر رہی تھی۔ پھر روشنیاں گل کر دی گئیں اور نہ جانے کتنی دیر آشا اوپر آسمان سے بھی پرے مستقبل کے اندھیرے میں جھانکتی رہی جس کے آسمان پر دور بہت دور ستارے جگمگا رہے تھے لیکن ابھی تک اسے یہ معلوم نہ تھا کہ ان میں اس کی قسمت کا ستارہ کون سا ہے۔

اور پھر ہوائی جہاز نیچے اترنا شروع ہوا اور روشنیاں جل اٹھیں اور ائیر ہوسٹس نے اعلان کیا کہ وہاں ایک گھنٹے کے لیے ناگپور کے ہوائی اڈے پر رکے گا۔

اس نے مسز نارائن سے کہا "مگر میں تو سمجھتی تھی کہ یہ ہوائی جہاز سیدھا دلی جائے گا؟"

"جائے گا مگر ایک گھنٹے کے بعد۔"

"اور ایک گھنٹے تک ہم کیا کریں گے؟"

"تم ائیرپورٹ کے ریستوران میں جاؤ وہاں ائیر لائنس کی طرف سے کچھ ناشتہ اور کھانے پینے کو ملے گا۔"

"جی اور آپ؟"

"جی میں تو ناگپور ہی تک آئی ہوں ہماری کانفرنس یہیں ہو رہی ہے۔"

جب تقریباً سب مسافر اتر گئے تو آشا نے ائیر ہوسٹس سے کہا "اگر کوئی حرج نہ ہو تو میں یہیں ٹھہری رہوں؟"

"نہیں نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے یہ وہ جہاز ہی نہیں جائے گا۔ کلکتے جانے گا ادھر سب مسافروں اور سامان کا ادلا بدلی ہوتا ہے۔ تم کو نہیں معلوم؟"

اور پھر اس نے آشا کو بتایا کہ پانچ پانچ منٹ کے وقفے سے چار ہوائی جہاز ناگپور پہنچتے ہیں ایک دلی سے۔ ایک بمبئی سے، ایک کلکتہ اور ایک مدراس سے اور سب جگہ کے مسافر یہاں جمع ہوتے ہیں اور پھر جس کو جہاں جہاں جانا ہوتا ہے وہاں جانے والے ہوائی جہاز میں چلا جاتا ہے۔

"مگر یہ سب ناگپور میں کیوں ہوتا ہے؟"

"اس لیے کہ ناگپور ہندستان کے بیچ میں ہے۔" ائیر ہوسٹس نے ہنس کر آشا کو باہر نکالتے ہوئے کہا اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ناگپور کے سنگترے بہت اچھے ہوتے ہیں۔ جاؤ ریستوران میں آرنج جوس پیو فری۔"

"میڈم چاہئے یا [illegible] جوس؟" اس ریسٹورنٹ کے بیرے نے پوچھا۔
"اورنج جوس!" [illegible] کے [illegible] کہا۔
"اور صاحب آپ؟"
"جو میڈم نے لیے وہی ہمارے لیے۔ [illegible] جوس!"
"جی!" [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] کرسی پر بیٹھ رہا ہے [illegible] [illegible] کے گود میں [illegible] اور [illegible] کرسی پر رکھ دیا۔

[illegible] سے پوچھا۔

"جی۔ آپ [illegible] بہت ہو

[illegible] نے سوچا [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] اور دو گلاس [illegible] [illegible] [illegible] رکھ دیے

گئے۔ نوجوان نے آسا کی طرف ایک گلاس بڑھایا۔ حلق تر کیجیے۔ دیکھیے سنتروں کا مزہ کیسا ہے۔
آسا نے ایک گھونٹ لیا اور کہا: "کھٹا ہے"
نوجوان نے بھی ایک گھونٹ لیا اور کہا: "ہوں۔ کھٹا ہے"
آسا نے دوسرا گھونٹ لیا اور کہا: "اب کھٹا بھی نہیں ہے"
نوجوان نے دوسرا گھونٹ لیا اور کہا: "کھٹ میٹھا کہہ سکتے ہیں"
آسا نے تیسرا گھونٹ لے کر کہا: "بلکہ خاصا میٹھا ہے"
نوجوان نے تیسرا گھونٹ اتنا لمبا لیا کہ گلاس خالی ہوگیا۔ پھر وہ بولا۔ [illegible] کی آرزو [illegible] میں یہ مزہ کہاں۔ [illegible] ایک گلاس اسی جوس کا لاؤ۔ کہو آپ بھی پئیں گی نا!"
"ٹھیک ہے۔ میرے لیے بھی ایک گلاس اور دو"

جب بیرا نئے گلاس لایا تو نوجوان نے آشا کی طرف اپنا گلاس اٹھا کر کہا۔

"چیرز"

"جی!" آشا نے پوچھا۔

"انگلستان میں جب دو دوست شراب پینے بیٹھتے ہیں تو اس طرح ایک دوسرے کا جام صحت پیتے ہیں۔"

آشا نے ڈر کر پوچھا "آپ شراب بھی پیتے ہیں؟"

"کبھی کبھی!" نوجوان نے جواب دیا۔ "اگر دوست مجبور کریں۔ لیکن آپ فکر نہ کریں۔ اس وقت میں ملتفت نہیں ہوں۔ دوستوں کا جام صحت رس کے جوس سے بھی پیا جا سکتا ہے۔ سو چیرز۔"

"دوست!" آشا نے اپنا گلاس حیرت سے اٹھاتے ہوئے کہا۔ اسے اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا کہ وہ ماں کی ہدایت کے خلاف یوں اس نوجوان سے بلا تعارف ایسی باتیں کر رہی ہے کہ وہ اتنا بے تکلف ہو رہا ہے۔

"چیرز!"

"چیرز!"

نوجوان نے اپنا جوس کا گلاس آشا کے گلاس سے ٹکرانے کے بعد ہونٹوں سے لگایا اور غٹ غٹ کر کے ایک سانس میں پی گیا پھر اس نے خالی گلاس کو میز پر الٹا کر دیا۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ میں آپ کی صحت اور مسرت کا خواہش مند ہوں۔"

آشا کو ایسا لگا جیسے اسے چیلنج کیا جا رہا ہے۔ سو اس نے بھی گلاس اٹھایا اور ہمت کر کے ایک سانس میں پینے لگی۔ ٹھنڈا ہو کر سنگترے کا ٹھنڈا کھٹ میٹھا رس اس کے گلے کو گدگداتا ہوا اس کی رگوں کے جوان خون میں سرایت کر گیا اور گلاس کو میز پر الٹا رکھتے ہوئے نہ جانے کیوں اس کے منہ سے نکلا "ایسے ایسے تو میں ایک سو جام گلاس پی سکتی ہوں۔"

سب مسافروں کے ساتھ اندھیرے لاؤنج میں بیٹھے وہ ٹیلی ویژن پر کشمیر کی بہار دیکھ رہے تھے۔ یہ رنگین ڈاکومنٹری فلم بہت ہی حسین تھی اور ان حسین مناظر کو دیکھ کر آشا سوچ رہی تھی کہ کاش وہ بھی ایک دن کشمیر پہنچ جائے گی۔ ......

"دہلی جانے والا ہوائی جہاز تیار ہے۔ کرپا کر کے دہلی جانے والے یاتری......"

ایئرپورٹ لاؤنج کی آواز لاؤڈ اسپیکر پر گونجی۔ نوجوان نے نہ صرف اپنے دو ایئر بیگ اور موٹا فلیٹ ٹیپ ریکارڈر اور کیمرہ بلکہ آشا کا ایئر بیگ اور مٹھائی کی ٹوکری جو وہ جے پور سے ماسی کے لیے لے جا رہی تھی۔ سب سامان اپنے کاندھے پر لادا اور دوسرے سب مسافروں کے ساتھ وہ دہلی والے جہاز کی طرف چل پڑے۔

راستے میں آشا نے کہا۔ "لائیے یہ ٹوکری میں لے لوں۔ آپ کے پاس پہلے ہی بہت بوجھ ہے۔ میرا سامان آپ کیوں ڈھوتے ہیں؟"

اور نوجوان نے جواب دیا "اس لیے کہ مجھے بوجھ اٹھانے کی عادت ہے۔ اور اس کے علاوہ مجھے بعض لوگوں کا سامان ڈھونے میں مزا بھی آتا ہے۔"

ھاکر بیرا کو بیٹی دیکھنی۔
ہیروشی نے اطمینان سے اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرا۔
آشا نے نوجوان سے کہا۔ "آپ ذرا دیر سے آتے تو گاڑی چل پڑتی، ہم تو جلدی میں گھبرا گئیں۔"
اور سامنے بیٹھے ہوئے جاپانی جوڑے کو دیکھ کر اس نے پوچھا۔
"کہیں دور جانا ہے؟"
"کہیں دور۔" آشا نے جواب دیا۔
"آپ تو دیکھنے میں بالکل ایسی ہی ہندوستانی لڑکی ہیں۔"
"جی ہاں، میں ہندوستانی ہوں مگر اس وقت مدراس سے آ رہی ہوں۔ میرے والد وہاں پڑھاتے ہیں۔"
"تو ہندوستانی کہاں ہیں؟"
"میرے بابا سکھ ہیں۔ ڈگری لے کر میں پہلے دہلی میں رہتی تھی۔ پھر مدراس چلی گئی۔"
"اور اس کے بعد؟"
"بی اے میں نے مدراس یونیورسٹی سے کیا ہے۔ میرے بابا اب وہاں رہتے ہیں۔ میری ماں اسکول میں پڑھاتی ہے جس سے گزارہ ہو جاتا ہے۔"
اب ہوائی جہاز ہوا میں تھا۔ ایئر ہوسٹس نے دونوں کو تکئے اور کمبل دیئے جو دو دو دوسرے مسافروں کو چاہیے تھے، وہ ٹافی دینے لگی۔
آشا نے پورا سفر اس نوجوان سے باتیں کرنا چاہا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس نے بی اے انگریزی سے کر کے فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا ہے۔ اس کے بابا اسے آگے پڑھنے کے لیے ولایت بھیجنا چاہتے ہیں لیکن تنخواہ بھی کم ہے اور ماں کو تنخواہ ملتی ہے اس میں گھر کا خرچ بھی مشکل سے پورا ہوتا ہے۔ ہاں اگر اسکالرشپ مل جائے تو وہ جا سکتی ہے۔
"اسکالرشپ تو آپ کو نہیں ملے گا۔"
"کیوں؟"
"اس لیے کہ ہم نہیں چاہتے۔"
"آپ نہیں چاہتے کہ میں آگے پڑھوں، گورنمنٹ کے خرچ پر انگلستان ہو آؤں۔ مگر وجہ؟"
"ہے ایک وجہ۔ مگر پرائیویٹ۔"
"آپ بہت مذاق کرتے ہیں۔ آپ کو تو انجینئر کے بجائے ایکٹر ہونا چاہیے تھا۔"
"سچ؟"
"ہاں اور کیا؟" اب وہ بھی مذاق پر اتر آئی تھی۔ "صورت شکل بھی خاصی ہے آپ کی۔"
وہ ہنسنے لگا۔

آشا بولی "آپ رہنے والے کہاں کے ہیں؟"

"پیدا ہوا تھا میں پشاور میں مگر اب ہم لوگ دہلی میں رہتے ہیں۔"

"اب آپ کو بھاکڑا ڈیم جانا پڑے گا۔ کیوں؟"

"ہاں اور کیا۔ وہاں کام کرنے کے لیے ہی تو گورنمنٹ نے دو برس ولایت میں ٹریننگ دلائی ہے۔ ڈیم کے ساتھ جو بجلی گھر بن رہا ہے اس میں کام کروں گا۔"

"وہاں جنگل میں آپ رہیں گے۔ آپ کا جی نہیں گھبرائے گا؟"

"شاید گھبرائے گا۔ پھر ضرورت پڑی تو دل بہلانے کا کوئی انتظام کیا جائے گا۔"

"آپ کی مسز بھی آپ کے ساتھ جائیں گی؟"

"میری شادی نہیں ہوئی۔"

"اوہ!" ... وہ دفعتاً آشا یہ سوال کر کے جھینپ گئی اور چپ ہو گئی۔ [illegible] نے میں ایئر ہوسٹس نے روشنیاں گل کرنا شروع کر دیں اور نوجوان نے کہا "اچھا جی اب سونا چاہیے گڈ نائٹ" یہ کہہ کر اس نے سیٹ کے کنارے پر تکیہ لگایا اور کمبل اوڑھ کر دراز ہو گیا۔ تھوڑی دیر ہی میں سارے ہوائی جہاز میں سناٹا چھا گیا۔ خراٹوں کی مدھم آوازیں آنے لگیں۔

آشا نے اندھیرے میں اپنے برابر کی سیٹ سے کہا "یہ تو بتائیے کہ آپ کا نام کیا ہے؟"

مگر نوجوان نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ سو چکا تھا۔ اور آرام سے لیٹا سوتا رہا جب تک ایئر ہوسٹس نے دہلی پہنچنے کا اعلان نہ کر دیا۔

"دیکھیے آپ یہاں ٹھہریے" پالم پر اتر کر نوجوان نے آشا کی چیزیں اسے دیتے ہوئے کہا "میں گھر ٹیلیفون کروں کوئی نظر نہیں آ رہا ہے۔"

لیکن وہ [illegible] کی جانب چلا ہی تھا کہ دفعتاً اس کے پورے خاندان نے اسے گھیر لیا اور دور سے اس ملاپ کو دیکھتے ہوئے آشا کو اندازہ ہوا کہ جس نوجوان کی ہمراہی میں وہ ولایت سے یہاں آئی تھی وہ کس قسم کے خاندان سے تھا۔ اس کی ماں اور بہنیں جو بیتابی سے لپک کر اس سے لپٹ رہی تھیں شلواریں پہنے ہوئے تھیں باپ کے سر پر سفید پگڑی تھی۔ شریف سیدھے سادے متوسط درجے کے لوگ معلوم ہوتے تھے۔ وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ نوجوان ضرور اپنے گھر والوں سے اس کا تعارف کرائے گا کہ اسے خود مسز راما سوامی کے گلے کا مقابلہ کرنا پڑا۔

"تم آشا ہو۔ آشا شاستری۔" ایک موٹی بوڑھی سفید بالوں والی خاتون نے اپنے موٹے موٹے شیشے کی عینک میں سے اسے گھورتے ہوئے پوچھا اور جیسے ہی آشا نے سر ہلا کر کہا "ہاں" کہ بڑی بی نے اسے گلے سے لپٹا لیا۔ "جیتی رہو بیٹی۔ میں تمہاری ماں کی بچپن کی سہیلی ہوں۔ ہم لوگ بنگلور میں ساتھ اسکول جاتے تھے کیا دن تھے وہ بھی! مگر اب یہاں کھڑی کس کا انتظار کر رہی ہو؟ چلو موٹر باہر کھڑی ہے۔ ڈرائیور تمہارا سامان لے لے گا۔ ارے واہ تم تو اتنی لمبی ہو گئی ہو جیسے بانس۔ میں نے تو جب دیکھا تھا تو تم اتنی سی تھیں

...... [illegible]

[illegible]

[illegible]

میں ہوائی جہازوں میں پٹرول بھرنے کے منظر کو [illegible]

اور اکثر یہی سوچتی رہی [illegible]۔ مجھے دیکھ کر کتنے بولنے لگے

دہلی پہنچ کر ایک ہفتہ ٹھہری۔ ہر شام کو کناٹ پلیس کے چکر لگائے۔ ہر روز [illegible] میں [illegible] (ALPS) میں آئس کریم (CREAM) [illegible] کھائی۔ رفیوجی مارکیٹ سے [illegible] خریدتی رہی۔ اتوار کے دن پکنک کرنے قطب تک گئی۔ ہر جگہ یہ امید لے کر گئی کہ شاید کہیں وہ کمبخت نظر آ جائے۔ وہ جس کے سانولے چہرے پر مسکراتے ہوئے دانت ایسے کھلتے ہیں جیسے پھول۔ مگر وہ کہیں نظر نہ آیا۔

آخر کار ہوائی جہاز کی آواز سے چونکا دینے والی جھنکار سنائی دیتی ہے .... آشا دوسرے مسافروں کے پیچھے پیچھے اپنا ائیر بیگ اٹھائے آہستہ آہستہ چلتی رہی اور ہوائی جہاز کی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے من ہی من میں پرارتھنا کرتی رہی: ’’بھگوان کی یاد کر بس ناگپور کے ہوائی اڈے پر چھوڑ جاؤں گی جہاں اسے پایا تھا میں اسے بھول جاؤں گی ..... ملے.....‘‘

اور سب مسافر اپنی اپنی جگہ بیٹھ چکے تھے صرف ایک سیٹ خالی تھی۔ ایئر ہوسٹس نے اس کی طرف اشارہ کیا اور آشا وہاں بیٹھ کر سیٹ بیلٹ باندھنے لگی تب اس نے دیکھا کہ برابر والی سیٹ پر کوئی بیٹھا ہے۔ وہ اسے غور سے دیکھ رہا ہے ... آشا کو ... سا لگا جیسے ... سے ... اس کی ... کر رہا ہو۔ لیکن اس نے دیکھا کہ ایک ادھیڑ عمر کا گورا چٹا اور موٹا ... آدمی ہے۔ جو کالی شارک سکن کے سوٹ پر ... نکٹائی لگائے ہوئے ہے جس پر ایک ننگی عورت کی تصویر بنی ہوئی ہے جسے دیکھ کر آشا کو ایسی ابکائی آئی جیسے ... ریسٹورنٹ میں سگریٹوں کا ... ’’آپ چاہیں تو ادھر کھڑکی والی سیٹ پر آجائیے۔‘‘ اس شخص نے اپنے ہاتھ میں ہیرے کی انگوٹھیوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔ آشا نے دیکھا ... دانت ... اور شاید شراب کی کثرت سے پیلے اور گندے ہیں۔ اور گو اس نے تیز خوشبو والا سینٹ لگایا ہوا ہے پھر بھی اس کے بدن میں سے سڑے ہوئے سگرٹوں کی بو پھوٹ رہی تھی۔

سو آشا نے کہا ’’جی نہیں شکریہ میں ٹھیک ہوں‘‘ اور شارک اسکن سوٹ والے نے ایک انگریزی رسالے کا مطالعہ شروع کر دیا۔ آشا نے دیکھا کہ میگزین کا نام ہے GAY NIGHTS اور سرورق پر جو تصویر چھپی تھی اسے دیکھ کر اسے پھر ابکائی آگئی۔

مدراس کے ہوائی اڈے پر ... تھا کہ آشا نے اپنے ... آنکھیں اپنے چہرے پر ... وہ سوتی ... ایئر ہوسٹس کے ... بعد وہ انگریزی ... اپنے پورٹ فولیو میں سے اس نے یوڈی کولون (EAU DE COLOGNE) کی بوتل نکالی تھی اور تقریباً چلو بھر خوشبودار لوشن اپنے چہرے پر چھڑک لیا تھا اور پھر اپنے پیلے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے اس نے آشا سے کہا ’’اس سے میں بالکل فریش ہو جاتا ہوں۔ لیجئے آپ بھی۔‘‘

’’جی نہیں شکریہ‘‘ آشا اس قسم کے آدمی سے زیادہ بات نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن وہ اتنی آسانی سے ہار ماننے والا نہیں تھا۔

’’آپ مدراس ہی میں رہتی ہیں کیا؟‘‘

’’جی ہاں‘‘

’’تو وہاں کیا سیر کرنے گئی تھیں؟‘‘

’’جی نہیں ایک اسکالرشپ کے لیے انٹرویو تھا۔‘‘

’’خوب تو اسکالرشپ مل گیا؟‘‘

’’جی نہیں ملا‘‘

’’تو پھر اب کیا ارادہ ہے‘‘

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ہوٹل میں ریسپشنسٹ (RECEPTIONIST) کی نوکری [illegible]

[illegible] بلدیو نے عادت سے مجبور ہو کر دست درازی کرنے کی کوشش کی تھی [illegible]

سے کیا ہوتا ہے جتنے بھی مالک اور ڈائریکٹر ہوتے ہیں۔ جن کے ہاں نوجوان لڑکیاں کام کرتی ہیں وہ سب ایک دو بار ایسی کوشش کرتے ہی ہیں۔ اب یہ لڑکی کے کردار پر منحصر ہے کہ وہ اپنے آپ کو بیچ دیتی ہے یا اپنی عزت کو برقرار رکھتی ہے۔ تو نے کبھی اپنے آپ کو نہیں بیچا۔ اور کیونکہ تو نے دوسری چھچھوری اور آوارہ لڑکیوں کی طرح [illegible] نہیں بیچا اور چند ٹکوں کے عوض اپنے بدن کو فروخت نہیں کیا تو وہ جو ہر لڑکی کو ایک کھلونا سمجھتا تھا۔ وہ بھی تیری عزت کرنے پر مجبور ہو گیا۔ [illegible] سے اس نے تیرا تبادلہ دہلی میں اپنے ہیڈ آفس میں کر دیا۔ RECIEPTIONIST 1ST سے تو پرسنل سکریٹری ہو گئی۔ تجھے آج کل جیسے عالیشان ہوٹل میں رہنے کو کمرہ ملا۔ اپنے بزنس کے معاملے کے لیے بلدیو سارے ملک کا دورہ کرتا اور ہر جگہ تو ساتھ ہوتی۔ چاہے ہوائی جہاز ہو یا ایئر کنڈیشنڈ ٹرین۔ [illegible] ہو گئی جس میں سے پورے چار سو تو گھر بھیجتی رہی۔ تب ہی تو تیرے ماں باپ نے بھی اس نوکری کی مخالفت نہیں کی۔ تو نے اپنے میں بھی تو تبدیلی محسوس کی ہو گی!

وہ دبلی پتلی سانولی سی لمبی چوٹی والی لڑکی کہاں ہے جو دو برس پہلے ہوائی جہاز میں اکیلے سفر کرتے گھبراتی تھی۔ آج تو ایک اسمارٹ فیشن ایبل نوجوان کیریر وومن ہے۔ تیری تصویریں "السٹریٹڈ ویکلی" اور "کرنٹ" میں چھپتی ہیں۔ بلدیو کے ساتھ بڑے بڑے گھروں میں تجھے دعوتوں اور پارٹیوں میں عزت دی جاتی ہے۔ مانا کہ لوگ تیرے اور بلدیو کے بارے میں سکینڈل کی باتیں بھی کرتے ہیں۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔
تجھے معلوم ہے کہ تو نے کوئی پاپ نہیں کیا ہے .... بلکہ
اپنے اثر سے بلدیو کو بہت سی پرانی عادتوں سے بچایا ہے۔ اب اس نے شراب پینی کم کر دی ہے۔ پچاس سگریٹوں کے بجائے صرف

ہیں سگریٹ دوبارہ پیتا ہے۔ اب یہ مجبوری کے پیچھے وہ نہیں جانتی جو لکھنا بھی کم کر دیا ہے۔ تب ہی تو خود راشد بہادر بھی شکار کرتا پھرتے ہیں۔ جب مٹتے بھی سکتے ہیں۔ بھی آشا نے تو بلدیو کی زندگی ہی بدل دی ہے۔ اور اب کہ بلدیو نے آشا کو اپنے ساتھ سارے ہندوستان کے سفر پر چلنے کو کہا ہے تو ظاہر ہے کہ ماسٹر صاحب نے بیٹے کو شادی کی اجازت بھی دے دی ہوگی۔

ایک بار پھر وہی ناگپور ایئرپورٹ۔ گو اب وہ پہلے سے زیادہ شاندار بن گئی تھی۔ مگر ابھی صرف ایک ہی ہوائی جہاز آیا تھا اس لیے زیادہ گہما گہمی نہیں تھی۔

پھر وہی ایئرپورٹ ریستوراں۔

پھر وہی بوڑھا بیرا۔

پھر وہی سوال "میڈم چائے یا آرنج جوس؟"

بلدیو نے کہا "آرنج جوس دونوں کے لیے"

آشا نے کہا "نہیں میں چائے پیوں گی"

بلدیو نے اصرار کیا "چائے تو کوئی وقت ہے پیو، پہلے ناگپور کے سنگترے کا رس پیو۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے ناگپور کے سنگترے سارے ہندوستان میں مشہور ہیں"

"معلوم ہے" آشا نے کہا۔ اور اس نے سوچا اب میں تمہیں کیسے بتاؤں بلدیو کہ سنگترے کے رس میں میرے لیے کتنی یادوں کا زہر گھلا ہوا ہے۔

اتنے میں بیرے نے دو بھرے ہوئے گلاس سامنے لا کر رکھ دیئے۔

بلدیو نے گلاس اٹھایا اور ایک گھونٹ لے کر کہا "واہ واہ کتنا میٹھا ہے۔ میں سوچتا ہوں اپنے ہر ہوٹل کے لیے ہوائی جہاز سے ناگپور کے سنگترے منگوایا کروں تاکہ یہ فریش آرنج جوس ہمارے ہر کسٹمر (CUSTOMER) کو صبح ناشتے پر مل سکے۔ اسے پی کر — پیو نا آشا"

آشا نے گلاس اٹھایا اور ایک گھونٹ لیا۔ رس نہ صرف کھٹا تھا بلکہ اس میں ایک عجیب قسم کی کڑواہٹ تھی۔ جیسے نیم کے پتوں کا عرق گھلا ہوا ہو۔ اور اک کسیلا پن تھا جیسا سڑی ہوئی ترکاری میں ہوتا ہے اور ایک عجیب قسم کی بدبو تھی جیسے پھوڑے میں سے رستی ہوئی پیپ میں ہوتی ہے۔ ابکائی آئی اور اسے متلی ہونے لگی۔

اس نے بیرے سے کہا "اسے لے جاؤ، مجھے نہیں چاہیئے"

"تو چائے لاؤں" بیرے نے پوچھا۔

"نہیں۔ صرف سادہ پانی"

اتنے میں کسی دوسرے جہاز کے مسافر آنے شروع ہو گئے اور ریستوران میں بھیڑ ہو گئی۔

"چلو آشا" بلدیو نے کہا "پورا گھنٹہ گزارنا ہے اور یہاں تو بھیڑ بڑھتی ہی جائے گی۔ سینما ہی دیکھیں۔ وہ پہلا تار گین فلم کو منٹری

کشمیر ہمارا ہے۔

کشمیر ہمارا ہے ——— کشمیر ہمارا ہے

ان کے منہ میں ایک بڑا دن کے نعرے [illegible] تھے۔ [illegible] کی کھڑکیاں [illegible] لفظ [illegible] سے تھے۔

"بہرو تم چلو۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

وہ [illegible] نے جلدی سے [illegible] دروازہ بند کر دی۔

"[illegible] ہو۔ [illegible] ہو!"

[illegible]

[illegible] ہے۔ [illegible]

[illegible] . . .

وہ بھی اپنا کی جانب متوجہ ہو رہے [illegible] میری [illegible]

"ڈارلنگ، [illegible] مسٹری!"

وہ پھر کر اس نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ آشا نے [illegible] کا ہاتھ [illegible] کے [illegible] سے [illegible] پیڑ [illegible] کے چپکے چپکے سے ہاتھ ملانا پڑا۔

"آپ تو آشا دیوی [illegible] بیٹھیں [illegible] شکریہ۔ [illegible]"

ایک منٹ تو آشا [illegible] بیٹھی رہی۔ [illegible] ہو رہے تھے۔ وہ [illegible] ایک لمبا قد۔ ایک [illegible] چہرہ۔ [illegible]

ڈیڈی!

ڈارلنگ!

[illegible]!

مگر نہیں آشا نے اپنے آپ کو سمجھایا۔ اب بہت دیر ہو چکی ہے اب [illegible] کا خیال چھوڑ دو۔ جب [illegible] سے اب کسی جنگل میں [illegible] جانا ہو گا۔ [illegible] پیرس [illegible] ہے۔ پیرس اور لندن اور نیویارک۔ [illegible] کے ساتھ تصویر کھنچوانے [illegible] کیا واسطہ۔ جس کا تو نام بھی نہیں جانتی۔ تیری جگہ اس وقت خدیجہ کے پاس ہے۔ جس نے تیرا [illegible] ہوائی جہاز کا ٹکٹ خریدا ہے۔

اندھیرے لاؤنج میں آخر کار اس نے خدیجہ اور [illegible] کو ڈھونڈ ہی نکالا۔ ان کے پیچھے ایک کرسی خالی تھی۔ وہ چپکے سے وہاں بیٹھ گئی۔

سینما کے پردے پر چنار کے سرخ پتے جھڑ رہے تھے اور کشمیری عورتوں کا ایک [illegible] لوک گیت [illegible] رہا تھا۔

خدیجہ اور [illegible] ان کا [illegible] کر رہے تھے۔

"کیوں یار یہ لونڈیا تو نے ایسی پھانسی ہے؟ پچھلی دفعہ جب ملاقات ہوئی تو وہ بنگالن تھی تیرے پاس۔ مگر سنا ہے تو اس سے بھی الگ ہو گیا ہے؟"

"چھوڑو جی، نہیں اسے چھوڑ دینے کی فکر میں ہوں یار۔ مگر یہ زیادہ پکی ہے۔ سو اسے دنیا دکھانے لے جا رہا ہوں۔"

"مگر لوگ کہتے ہیں تو اس سے شادی کر رہا ہے؟"

"پاگل ہو گئے ہو کیا، تو تو جانتا ہی ہے اپنی زندگی کا اصول۔ گانے کا، روپیہ کمانے کا، گھر میں مرا جاتا ہوں۔ بیویاں تو نہ جانے کتنی آئیں اور گئیں۔"

اور آمنہ کو یہ محسوس کر کے کتنا تعجب ہوا کہ یہ سن کر اس کے دل پر کوئی چوٹ نہیں لگی۔ بلکہ ایسا معلوم ہوا جیسے دفعتاً بہت سی زنجیریں جو اسے جکڑے ہوئے تھیں ایک ایک کر کے زمین پر گر پڑی ہیں۔

سنیما کے پردے پر دھندلا سا نگار کا محل کھل اٹھے تھے۔ شالیمار کے فوارے چل رہے تھے۔ ڈل جھیل کی سطح پر شکاروں میں نوجوان جوڑے شگفتہ سے لدے کناروں کی سیر کر رہے تھے۔ ایک کشتی والے کی بچی مسکرا رہی تھی۔ ابتدا کا پانی بہہ رہا تھا۔ کشمیر میں بہار آ گئی تھی۔

"... لاسٹ کال فار مسٹر شاستری ..... لاسٹ کال فار مسٹر شاستری ......؟"

"بمبئی جانے والا طیارہ اب اڑنے کے لیے بالکل تیار ہے۔" اناؤنسر کی آواز ایئرپورٹ کی سنسان بلڈنگ میں گونج رہی کیونکہ سب مسافر اپنے اپنے ہوائی جہازوں میں جا چکے تھے اور پھر ایک ایک کر کے وہ سب اڑ گئے۔

دلی جانے والا ہوائی جہاز۔

مدراس جانے والا ہوائی جہاز۔

کلکتے جانے والا ہوائی جہاز۔

بمبئی جانے والا ہوائی جہاز جس میں ایک سیٹ خالی تھی۔

اور جب سب جہاز اڑ گئے اور ایئرپورٹ کے وسیع میدان میں صرف سرخ اور پیلی اور سبز روشنیاں ٹمٹماتی رہ گئیں۔ تو......

میدان کے ایک اندھیرے کونے میں وہ دو مسافر کھڑے رہ گئے جو کہیں نہیں جا رہے تھے۔ جن کی منزل آ گئی تھی۔

"آؤ، تمہیں بھیلائی لے جاؤں گا۔ پہلے تم دیکھ لو کس ماحول میں مجھے رہنا اور کام کرنا ہے۔ وہاں بڑے شہروں کی چہل پہل نہیں ہے۔ بس فولاد کا کارخانہ ہے اور اس میں کام کرنے والے ہیں......"

"اور تم ہو؟"

"ہاں میں ہوں مگر ساتھ میں گرمی ہے۔ کارخانے میں کام کرنے والے انجینئروں اور مزدوروں کے لیے کھلا ہے۔ تنخواہ صرف چار سو روپیہ ماہوار ہے۔ دو کمروں کا مکان ہے۔"

"اور تم ہو؟"

[illegible]

[illegible] سامنے [illegible]

"اور تم ... کہ اب [illegible]"

"میرا نام نرمل ہے۔ [illegible]"

[illegible]:

"میرے [illegible]

[illegible]"

"تو پھر اب؟"

"اب ہم کچھ نہیں کہے گے۔"

"میرے [illegible]

[illegible]"

"اورنج جوس" نرمل نے کہا۔

"مگر میر صاحب کو تو اورنج جوس پسند ہے۔ میں [illegible] تھا"

"تو لاؤ تو" نرمل نے [illegible] اور [illegible] گلاس بھر رہے تھا۔

نرمل نے گلاس دے دیا۔

آشا نے گلاس اٹھایا۔

نرمل نے آشا کی آنکھوں میں دیکھا اور وہاں اسے اپنی صورت نظر آئی۔

آشا نے نرمل کی آنکھوں میں دیکھا اور وہاں اسے اپنی صورت نظر آئی۔

نرمل نے اپنا گلاس آشا کے گلاس سے ٹکرایا۔

"چیئرز"

"چیئرز"

"پیو آشا"

نرمل نے گلاس منہ سے لگایا، ایک گھونٹ لیا اور ہونٹ چاٹنے لگا۔

آشا نے گلاس منہ سے لگایا اور ایک لمحے کے لیے اس کی خوشبو ہی سونگھتی رہ گئی۔ تازہ رس بھرے ناگپور کے سنگترے کی خوشبو جو کسی سینٹ سے کم نہیں ہوتی۔ پھر اس نے بھی ایک گھونٹ لیا اور حیران رہ گئی۔

سنگترے کا رس ٹھنڈا تھا۔ کھٹ مٹھا تھا۔ کھٹا جیسے بچپن میں توڑی ہوئی کچی کیریاں۔ جیسے پرانی ہوئی جانیں جیسے پہلی ملاقات۔ ایک عجیب و گداز کھٹاس جو مدتوں چٹخارہ دیتی رہتی ہے۔ اور ساتھ میں میٹھا بھی۔ رس بھری مٹھاس۔ جیسے کیوڑے میں بسی ہوئی گنڈیریوں میں

مٹھاس ہوتی ہے۔ جیسے دودھ پیتے بچوں کے ہونٹوں میں مٹھاس ہوتی ہے۔ جیسے جنت کے تیر میں مٹھاس ہوتی ہے۔

نرمل نے ایک لمبا گھونٹ لیا اور گلاس ختم کر دیا۔

آشا نے ایک لمبا گھونٹ لیا اور گلاس ختم کر دیا۔

بیرے نے کہا: "اور پئیں گے سرکار؟"

"ضرور" آشا نے کہا۔ "مجھے تو ایک گلاس اور چاہئے۔"

بیرے نے جگ سے انڈیل کر دو اور گلاس بھر کر ان کے سامنے رکھ دیئے اور اپنی ادھ کھلی آنکھوں سے ان دونوں کو دیکھتے ہوئے سوچتا رہا کہ یہ کیسے لوگ ہیں۔ وہی سنگتروں کا رس جسے پی کر یہ لڑکی چند منٹ پہلے تو گر چکی ہے اب کتنے مزے لے کر پی رہی ہے۔

اور نرمل نے آشا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"ایک نہیں۔ ابھی تو تمہیں پورے ایک سو ایک گلاس پینے پڑیں گے۔"

تنہائی

مجنوں گورکھپوری

گلستاں: سول لائنز، گورکھپور

۷-بی ۱۸۵

۵ جون ۱۹۵۰ء

محبی سلام علیک

آپ کے دو خط آئے۔ آپ کی دعوت پر مضمون بھیجنے سے قاصر رہا ہوں۔ عجیب
حالات سے دوچار رہا۔ کوئی کام نہ ہو سکا۔ بہت پریشان رہا۔ [illegible]
کی وداعی تھی۔ پھر سے بھی مجھے کہنا ہے کہ نقوش کی خدمت ہو۔ آپ کو خود اپنے کئی خط
اب تک نہ لکھ سکا۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ گزشتہ دو سال کے عرصے میں مجھ پر
کیسے حالات اور کیسی کیسی ناگہانی گزری ہیں۔ اس وقت بھی جس حالت سے گزر رہا
ہوں بعض باتیں ایسی ہیں جن کا بیان نہیں ہو سکتا۔ [illegible]
لیکن حقیقت میں مجھے اس مدت میں ایک روگ سا لگ گیا۔ اب نہیں معلوم کب تک آپ اور نقوش سیاہ
آتے ہوں اور میں دونوں سے شرمندہ ہوتا رہا ہوں۔ اب معذرت کا وقت گزر گیا۔
میں آپ سے یہ نہ کہوں گا کہ مجھے معاف کر دیجیے۔ صرف اپنے مطلب پر اکتفا کروں گا۔
ادھر تنہائی کے کچھ صفحات لکھ رکھے ہیں جن کی نقل بہت شستہ ہو چکی ہے جو
کی اشاعت میں بھیجا چاہتا ہوں۔ یہ دو قسطوں میں تھا پہلی قسط اب تیار ہو گئی اور لکھا گیا ہے۔ امید
ہے آئندہ دو ماہ کے اندر بھی آپ کو بھیج دوں گا۔ آپ مجھ سے جس قدر بھی مایوس یا بدظن ہوں
کم ہے لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر میں بہت جلد مر نہ گیا تو تنہائی کو پورا کر کے نقوش کی
خدمت میں پیش کروں گا۔ معیار دیر کا سوال البتہ ہے۔ اس مراسلہ کی رسید سے مطلع کیجیے۔

آپ کا مخلص: مجنوں گورکھپوری

ہ مضمون کے لیے ملاحظہ ہو نقوش ۲۱-۲۲، جنوری فروری ۱۹۵۲ء

(۱۴)

شاہدہ شبنم میں ایک روز پھر مجھ سے ملنے ضرور آئی تھی۔ وہ جس طرح اپنا عہدہ، خالقِ شاہ بی بی تھی اس کی یہ ادا ہی سے قائل تھی کہ اس کی طبیعت اور کردار پر حیرت بھی تھی اور رشک بھی۔ میں کبھی کبھی سوچتی رہ جاتی تھی کہ شاہدہ کس کی قرمزی بانقش ہی ہے۔ وہ قامت، چہرہ، رنگ روپ پر ناز کرنے والی عورتیں اس کے سامنے اپنے جسمانی حسن کا احساس ہار جاتے ہوئے محسوس کرتی تھیں۔ اس کا معاملہ کرنے کی جو بیں جو خیر ایک طرف اکثر مرد بھی اس کے جسمانی حسن اور بلیغ شرارت آمیز فقروں کی تاب نہ لا سکتے تھے۔ وہ میں ایسی سحر کر دینے والی شگفتگی پائی تھی کہ وہ اس سے اور اس دل کی روشنی ہو جاتے ہیں۔ جب محفل پر چھائی تھی چھا جاتی تھی۔ من کرکے کر سکے ۔ وہ پہلوؤں کے حامل کا مرقع ہیں۔ ملتے وہ ہمیشہ سی کر ایک خوش باش شگفتہ مزاج اور ہنس مکھ زندگی گزار رہی ہے۔ با صورت مجھیں سے مگر پھر سے پوچھتے کہ سنجیدہ رہ کر کیا ہی۔ ایک طرف تو اس نے انتہائی سکھ اور دوسری زندگی کے نقطۂ نظر سے بڑی اہم اور حوصلہ مند عورت تھی۔ دوسری طرف وہ بچپن کی اندرونی قوتوں میں دردمندی اور دلسوزی کا خیال رکھتی صلاحیت جب اپنے ہوئے تھی جس کو وہ ملامت رائگاں نہ جانے دیتی تھی بلکہ تمام کا صحیح حق ادا ہوتا تھا اس کی پہچان کرنی تھی۔ مجھ سے زیادہ وہ شاہدہ کے اس پہلو کو نمایاں کر رہی ہے۔ شاید کسی دوسرے نے دیکھا ہو۔

شاہدہ سے مجھے پرویز کے حرکات و سکنات اور اس کے متعلق کئی مختصر حالات پر بڑی رنج تھی مگر وہ پرویز سے جو زندگی میں ایک بیوی کے میرے دل میں شبہ پیدا ہو چلا تھا کہ اس نے مجھے دل سے قبول نہیں کیا۔ ہے وہ کسی وجہ سے ذہنی طور پر کبھی دور اور ہم نہیں مجھ سے پوری زندگی کی شکست قبول ہو۔ تو تھی جبر اپنی اپنے شخص کا محور میری بھی نہیں تھا۔ مگر ہر خیال پر ایک نامعلوم سا۔ ایک ملاقات میں شاہدہ سے کہا: "شاہدہ! مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پرویز نے کسی مصلحت سے مجھے قبول کیا ہے یا انہیں میں جو وہ محبت پیدا کی تھی وہ روز اوّل ہی سے سست اور مدھم تھی یا وہ مجھے اس پر اعتبار نہ کرنا چاہتے تھا۔"

"نہیں نہیں" شاہدہ نے ایک شوخ سی مسکراہٹ۔ "یا تم نے شاید اپنی تمام عقل کے باوجود غور نہیں کیا۔ وہ عارضی اور وقتی جذبات ہوں گے جو وقت کے ساتھ بدلتے ہیں۔ ان کی زندگی عارضی مشاغل سے بہت مختلف ہی ہے۔ یہ تو وہ ہے کہ وہ ذاتی خوشی اور ملکہ کو تمام بندگانِ خدا کی زندگی کے تقاضوں کے مقابلے میں کچھ نہیں سمجھتے۔ وہ اپنی ذاتی زندگی کی ہر راحت اور ہر خوشی کو عام مخلوق کی فلاح و بہبود پر قربان کر دینے میں راحت کرتی ہیں سب سے بڑی کامیابی سمجھتے ہیں۔ . . ."

"مگر شاہدہ تم کو معلوم نہیں کہ وہ میرے ساتھ کیسی سرد مہری سے ملتے، محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ مجھے کہنا نہ چاہیے مگر میں واقعی یہ سمجھنے لگی تھی کہ ان کی زندگی میں ایک خلا تھا جس کو میں نے پُر کرتے ہوئے اور اس لیے قدرتاً مجھے امید ہو گئی تھی کہ وہ بھی مجھے چاہنے لگیں گے۔ مگر اپنی زندگی میں کوئی اہم اور مستقل جگہ دیں گے لیکن شاید مجھے دھوکا ہوا۔ میں محبت کی ترسی ہوئی تھی اس لیے پرویز کو محبت کا دیوتا سمجھ کر ان کی پہلی جنبش تمنا بیان کی برکت تھی۔ میں ان کی محبت کو ایک آسمانی برکت سمجھ رہی تھی اور خیال تھا کہ یہ برکت ہم دونوں کو ان تمام روحانی اذیتوں سے بچا لے گی جن کے ہم شکار تھے مگر اب تو یہ سب ایک خواب سے تعبیر ہے۔ جہاں تک تصور کر پاتی ہوں مجھے اپنی ساری زندگی خالی اور بے سہارا معلوم ہوتی ہے۔ اب میں سوچتی ہوں کہ خیر آئندہ جو ہوگا سو ہوگا فی الحال میں رخصت لے کر بستی سے چلی جاؤں اور پھر یہاں واپس نہ آؤں۔ تم پرویز کی خیر خواہ کی حیثیت سے

[illegible]

[illegible]

[illegible] MNEMONIC [illegible]

[illegible]

[illegible] ایک عورت کے ساتھ [illegible] کی سیرت بیان کر رہی تھی اور میں [illegible] مجھے [illegible]

کسی کو کوئی الزام نہیں دیا جا سکتا۔ میں نے کہا: شاہدہ [illegible] سے زیادہ [illegible] کا مجھے رشک [illegible] ان کو دیکھا ہے اور ان کو پہچاننے کی کوشش کی ہے اور اس [illegible] تمہاری باتوں سے حرف بحرف اتفاق ہے مگر [illegible] نے سمجھانے کا [illegible] ہے۔ اب [illegible] محبت کا [illegible] ہے کہ سمجھنے کی کوئی صورت نظر نہیں آئی۔ میں نے [illegible] مشکل کے حل کرنے میں مدد [illegible] رکھ دیا مگر خدا کے لیے مجھے بتاؤ کہ میں کروں کیا۔"

شاہدہ نے بڑے پیار اور بڑی غمگساری کے ساتھ کہا: "کشور! اس وقت میرا دماغ خود الجھن میں ہے میں کچھ نہیں کہہ سکتی [illegible] پھر کب تم سے ملیں گے۔ آج کل [illegible] مشکل سے [illegible] دن ان کی ایک جھلک دیکھ پاتے ہیں [illegible] لوگوں سے بھی [illegible]

لیکن آج میں یہ فیصلہ کر کے جا رہی ہوں کہ پہلی ہی ملاقات میں ان کا دامن پکڑ لوں گی اور تمہارا جو حال ہے وہ ذرا بڑھا چڑھا کر بیان کروں گی تاکہ
واضح الفاظ میں ہو۔ یہ بیان کر رہی تھی مگر چلتے چلتے ایک بار پھر شاہدہ نے منظور بھائی کو ہنس کے بڑے اچھے انداز میں۔

(۱۵)

تین مہینے گزرے ہوں گے کہ ایک دن شاہدہ خلافِ معمول بڑی پریشان صورت بنائے ہوئے بڑے سویرے میرے پاس آئی اور کہنے لگی کہ کیا تم
کو کیا پتہ اور منظور بھائی جانتے ہیں ساری بات کی؟

میں اس کے چہرے کا جو رنگ دیکھ رہا تھا اس سے ملاحظہ کرنے کی کوشش کی لیکن اس کے چہرے سے کچھ بھی سمجھ میں نہ آیا۔ جب چائے سے ہم لوگ فارغ
ہو چکے تو میں نے کچھ پوچھا کہ شاہدہ! تمہاری حالت کا جو رنگ ہے کیا حقیقت اس کا کیا سبب ہے؟

شاہدہ نے ایک حسرت ناک انداز کے ساتھ جواب دیا: میں جو وکالت نامہ لے کر گئی تھی اس پر ابھی اعتراض کرنے کا حکم ہوا کہ
اس دوران میں شاہدہ کا ماسٹر صاحب پر ایک بیان واقعہ پیش آگیا ہے جو مجھے ذرا تعجب خیز معلوم ہوا۔ اچھا تم اسے اور پڑھنے کے تعلقات کی بہت
نازک اور تکلیف دہ صورت والا ہے۔

"وہ کیا؟" میں نے آنکھیں پھیلا کر پوچھا۔

شاہدہ نے کہا: "کیا کہوں جو غضب ہوا۔ ایسے غضب روز ہی ہوا کرتے ہیں لیکن ان میں کثرت سے پرویز اور شاہدہ نہیں ہوتے۔
تم کو یاد ہوگا کہ عبدالرزاق نے رقیہ کے حساب بہ کتنے غلط فہمی سے بھی لیکن سب سے بڑا شبہ ان کو یہ تھا کہ رقیہ کیا کر رہی تھی ایک معمولی
نیک رات اپنے گھر میں بند کر لو اور جب چاہیے جو سکتا ہو کر لے آیا کرو۔ لوگوں کی زبانوں پر یہی ہے لیکن معاملے کے دوران میں معلوم ہوا
کہ تم نے اپنی رپورٹ میں لکھ دیا ہے کہ رقیہ کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی گئی۔ منظور بھائی اس کے بعد تم کو مشکل ہی سے معاف کر سکیں گے
جس لہجے میں آج وہ تعجب سے اس معاملے کا تذکرہ کر رہے تھے اس سے یہ پایا جاتا تھا کہ وہ بہت آزردہ اور دلگیر ہیں۔

میں کچھ دیر کے لیے تو سناٹے میں آ گئی لیکن دھیرے دھیرے جب ساری روداد پر غور کیا تو پرویز اور اس کی جماعت کے خلاف
جس کی وہ نمائندگی کر رہے تھے یکایک غصے کا ایک شعلہ میرے اندر بھڑک اٹھا جس کی خود مجھے توقع نہیں ہو سکتی تھی۔ میں تملا کر اٹھ کھڑی ہوئی
اور شاہدہ کو تندی کے ساتھ جواب دیا: آؤ! اپنے منظور بھائی سے کہہ دینا کہ میں اب اپنے کو ان سے بہت اونچی ہستی پا رہی ہوں۔ یہ ٹھیک ہے
کہ عبدالرزاق کی بیوی میری سہیلیوں میں ہیں اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ ان کی بیوی نے ایک مرتبہ ڈاکٹری معائنے سے پہلے اس طرف اشارہ کیا تھا
لیکن میں نے صاف کہہ دیا تھا کہ میرا منصبی ضمیر گوارا نہیں کرتا کہ کسی کو بلاوجہ رسوا کروں یا واقعے کو توڑ مروڑ کر کسی عورت کی بابت کوئی غلط رپورٹ
لکھ دوں ——— اور میں نے وہی کیا جو عبدالرزاق کی بیوی سے کہا تھا اور پھر پرویز کس منہ سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ میں نے صحیح رپورٹ لکھی یا غلط
ان کو کیا معلوم؟ انھوں نے تو ایک مرتبہ بھی آکر اس کا ذکر مجھ سے نہیں کیا ورنہ ممکن تھا کہ میرا ایمان ان کے چلنے سے متزلزل ہو جاتا اور میں غلط
رپورٹ لکھ دیتی۔ اب ان سے جا کر میرے پیغام کے طور پر کہہ دو کہ رقیہ کے ساتھ جس قسم کی زیادتی وہ کہتے ہیں نہیں ہوئی ہے اور اگر میرے
معائنے اور اس وقت تک کے وقفے کے اندر کسی وقت بھی ہوئی ہو تو پھر اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوئی ہے تو میری رپورٹ کیا ثابت ہوگی۔
وہ جس سے چاہیں اس کا معائنہ کرا لیں۔ آخر میں ان سے یہ بھی کہہ دینا کہ جس نادار، مفلس اور پامال طبقے کی وہ نمائندگی کر رہے ہیں اس کا ہر فرد

[illegible]

شاید ... [illegible]

[illegible]

شاید ... [illegible] ... ہوں۔

(۱۶)

[illegible] ... اور ... کی رفتار ... حالت سے ... بالکل بے خبر ... اس دوران ... شدید ...

ایک شدید کرب ... زندگی کی گھڑیاں گزار رہی تھی۔ ہر گھڑی ایسی طویل معلوم ہوتی تھی ... برس ...

لگا کر باوجود اس کے ... گزشتہ ملاقات ... محبت کے ساتھ رخصت کیا تھا شاید ... میری طرف سے

دل میں کچھ کدورت ... بے اختیار چاہتا ... کہ ... سے ... کے ...

کہیں چلی جاؤں جہاں ... دماغی کلفتوں سے لمحہ بھر کے لیے پناہ مل جائے۔

عشق و محبت کی داستانوں سے دنیا کی تواریخ اور افسانے بھرے پڑے ہیں۔ میں جب کبھی کوئی کہانی ... پڑھتی تھی تو

مجھے اس کے اندر رموز و کنایات جو کچھ بھی ... لیکن ... یہ نہ آتا تھا کہ اگر کسی ... کی ... نصیب نہ ہو تو ... زندگی

عذاب کیسے ہو جاتی ہے اور محبت کا انجام ... اور موت پر کیوں ہوتا ہے۔ میں محبت کو زندگی کی ... اور اس نسبت کی قائل ...

... کہ محبوب پاس ہے ... اندر ... اگر ... میرا ... کہ محبت ...

سکتی ہے ... کوئی ... اور ساری زندگی محبت سے خالی رہ جائے تو یہ محرومی ضرور ہے لیکن کوئی ... نہیں ہے مگر محبوب

کو پا کر نہ پانا ایک ایسی مصیبت ہے جس سے بڑا عقوبت کا تصور نہیں کیا جا سکتا ... "دیا دیار" میں رہ کر "یار" ... اس طرح

جدا رہنا ایک ناقابلِ برداشت آزمائش تھی۔ شاہدہ نے بھی اب سکوت اختیار کر لیا تھا جو مجھے بڑی حد تک معلوم ہو رہا تھا اور اب تو حبیب بھی ہر مجبوری اور رنج کی حالت میں وصلِ حبیب کے برابر ہوتا ہے جس سے عدم رسے باہر معلوم ہوتا تھا۔

آخر کار مجھ سے زیادہ صبر نہ ہو سکا۔ ایک سنیچر کے دن میں اپنی وضع خود عاری کر کے ہاتھ سے دینے کے لیے مجبور ہو گئی۔ شاہدہ اب تک مجھ سے الگ ہو کر بھی میری ہمسایہ تھی۔ مجھے یہ یقین ہو گیا تھا کہ زندگی میں شاہدہ کے سوا کوئی دوسری ہستی ایسی نہیں جو لڑکر بچ گئے اور جس کے ساتھ پوری ہمدردی کر سکے۔ میں اس کے ظرف اور اس کی کشادہ دلی کی قائل ہو چکی تھی۔ اسی احساس اور اسی اعتماد کی بنا پر میں نے اس کو ایک خط لکھا اور اس میں پرویز کے نام بھی ایک مختصر سا خط ملفوف کر دیا جس کو میری محبت کا معجزہ کہنا چاہیے۔

"پیاری شاہدہ!

دل تو نہ ماننے کو زیادہ مدت نہیں گزری ہوگی۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ زمانہ سے بچھڑے اور پرویز کی جدائی سہتے ہوئے ایک دورِ گزر چکا۔ معلوم نہیں تم اس کو کیا سمجھو گی۔ یہ جانے کیوں مجھے بھول سا ہو رہا ہے۔ میں بھی تو عقل و ہوش کی دشمن تھی مگر اب کس منہ سے یہ دعویٰ کروں۔ اب تو یہ کس قدر مجھ سے زیادہ تری ہوش معلوم ہوتا ہے اور پھر تم تو ہوشمندی اور فراست کی دیوی ہو۔ مجھے تو یہ شکایت کرنے کا حق نہیں ہے کہ اتنے دنوں سے تم نے میری خبر لی اور نہ ہی دو پرویز کی خیریت کی۔ بیان واقعہ اور اظہار حال کا حق شاہنشاہ سے لے کر ادنیٰ گداگر کو حاصل ہے اور حال یہ ہے کہ زمین و آسمان اجنبی ہو رہے ہیں اور زندگی کی ایک ایک گھڑی قیامت کی طرح بیکار معدوم ہو رہی ہے۔ اگر مصلحت اجازت دے اور وقت نکال سکو تو کچھ دیر کے لئے مل جاؤ یا اپنی مجبوریوں کی تفصیل سے آگاہ کر دو تاکہ مجھے کسی کو تمہاری طرف سے کوئی بدگمانی نہ رہے۔ ایک رقعہ اسی خط کے ساتھ پرویز کے نام بھی بھیج رہی ہوں ان سے جب اور جہاں ملاقات ہو دے دینا اور ... لکھوں۔

تمہاری

کشور!"

اور پرویز کے نام رقعہ یہ تھا:-

"پرویز صاحب!

کسی قسم کی شکایت کرنے کا مجھے حق ہے کہ نہیں؟ اس کا فیصلہ آپ پر چھوڑتی ہوں لیکن حسرت کا ایک اردو شعر اور کسی فارسی شاعر کا ایک فارسی شعر سنائے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اردو شعر یہ ہے ؎

سو طرح الم سہتے مجبور اگر ہوتا — دیکھو تجھے کتنے تو دور اگر ہوتا

اور غالب کا یہ شعر شاید زیادہ حسب حال ہے ؎

اگرچہ دوست [illegible] ملے [illegible]

[illegible] امید [illegible] سخاست

آپ کی بجیا

کشور :

خط میں نے سرسری پڑھا۔ [illegible] تھا۔ ساجدہ سے زبانی کہلا دیا کہ اب [illegible] اور [illegible] ساجدہ کے [illegible] سے ابھی [illegible] ساجدہ کے [illegible] معلوم ہو [illegible] ساجدہ نے [illegible] اس کا کوئی جواب نہیں آیا [illegible] ہیں۔ [illegible] کے [illegible] تھے [illegible] تھا۔ [illegible] سے [illegible] کے [illegible] ہے [illegible] آہستہ [illegible] سامنے سے آؤں؟

میں نے لحاف میں منہ چھپاتے ہوئے کہا: ارے آؤ!"

[illegible] کے [illegible] ہے جو اس [illegible] زندگی [illegible] سے [illegible] زندگی [illegible] کی ایک جھلک [illegible] ہے [illegible] اور [illegible] ایک جھلک دکھا کر میری زندگی کے [illegible] میری محرومیوں کے احساس کو شدت کے ساتھ [illegible] تھا۔ [illegible] کہ اگر [illegible] چھوڑ کر [illegible] اپنی زندگی کے ساتھی کے ساتھ [illegible] کچھ دنوں سے یہ خیال [illegible] طرح [illegible] تھا کہ میرا [illegible] میرا [illegible] کے لیے ایک [illegible] ہے جس کا [illegible] اور آج یہ خیال یقین کی صورت مجھ پر چھایا ہوا تھا۔

چائے کا شغل ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ سما میرے کمرے میں چلی آئی اور مجھے ایک لفافہ دے کر کہا کہ "بیگم! یہ جواب کا لفافہ آیا ہوا ہے اور جواب مانگ رہا ہے۔"

میں نے کہا: "تم جاؤ میں جواب لکھ رہی ہوں۔"

جلد جلد میں نے لفافہ کھولا تو اس میں دو رقعے تھے۔ پہلا رقعہ ساجدہ کا تھا۔

اچھی کشور!

مجھے تمہارے ساتھ اتنی محبت اور ایسی شدید ہمدردی ہے کہ میں تمہاری ہر بات اور ہر حرکت کو نہ صرف معاف کر سکتی ہوں بلکہ اس کی قدر کرتی ہوں۔ تمہارا خط [illegible] کا ایک پرزہ تھا جو بھی شائستگی اور ضبط کے ساتھ لکھا گیا تھا۔ ایسی ہی شائستگی اور ضبط کو

تمہارے "سفینہ" کا جو حصہ کے زیرِ طبع ہیں نباہ نہیں ہو سکتا۔ میں تم سے ملنے کے لیے خود بھی آنے بے چین تھی ہی ہوں۔ لیکن میرے راستے میں بڑی رکاوٹ تھی کئی ہفتہ سے ادیب ہو گئے کہ سفر رہا ہی ہیں۔ اپنے مکان میں یکہ و تنہا پڑے ہوئے ہیں۔ ایوب ملے اور میں نے بہت چاہا کہ تمہارے پاس آ جائیں مگر انھوں نے قبول نہیں کیا۔ ٹھاکر سنیہ پال جو ان کے ڈاکٹر بھی ہیں اور کے پرانے دوست بھی ہیں جن کو میں کیا پورا شہر "گمرشنگا سنت" سمجھتا ہے ان کا علاج کر رہے ہیں۔ صبح سے شام تک شدید بخار رہتا ہے کسی وقت اترتا نہیں۔ جنا ٹائیفائیڈ کے قسم کا مرض بتایا گیا ہے۔ وہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ بے انتہا زار اور نحیف ہو گئے ہیں۔ میں نے تم کو اطلاع بھیجنا چاہی تو انھوں نے منع کر دیا۔ آج تمہارا رقعہ پاکر مجھے اجازت دی ہے کہ میں ذرا حقیقتِ حال سے آگاہ کر دوں۔ ان کا میں ایک پرزہ جو ایک پوری داستان ہے ملفوف کر رہی ہوں۔ اگر تم کسی وقت آج میرے پاس آسکو تو میں تم کو تمہارے پرویز کے پاس لے چلوں۔۔۔۔۔

باقی ملاقات کے وقت ۔۔۔۔

تمہاری معترف

شاہدہ!"

پرویز کا رقعہ یہ تھا:۔

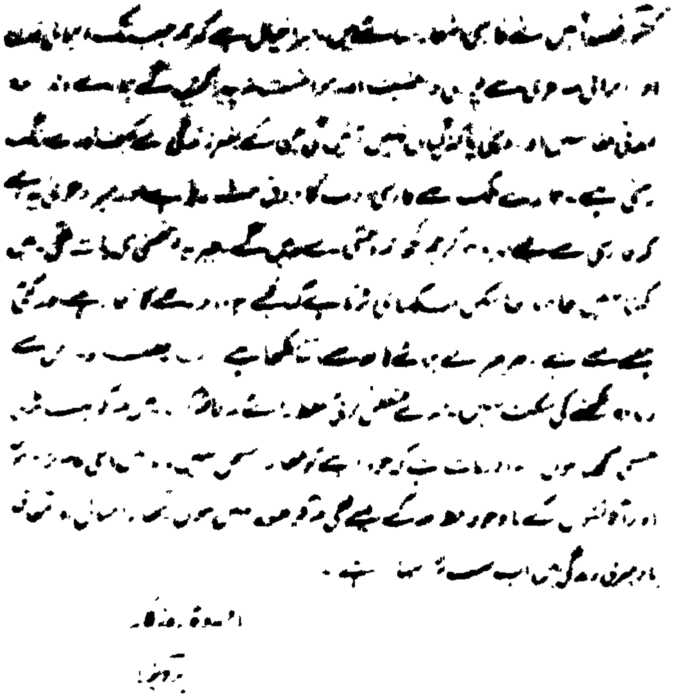
" ڈیئر کشور!

تم نے دو اشعار میں اپنا حال بیان کیا ہے اور خوب بیان کیا ہے۔ میں بھی صرف دو اشعار تم کو سنانا چاہتا ہوں اور پھر فیصلہ تم پر چھوڑتا ہوں کہ مجھے کیا سمجھو اور کیا نہ سمجھو اور کیا کرو اور کیا نہ کرو۔

عجب دردیست دور از یار بودن
صبوری کردن و ناچار بودن

یہ شعر ناجی کا ہے اور دوسرا شعر جو میری حالت کی نہایت سچی ترجمانی کرتا ہے یہ شعر خواجہ حسن دہلوی کا ہے جس کے بارے میں مشہور ہے کہ امیر خسرو کے منظورِ نظر تھے۔

گفتی کہ چرا جدائی از من
این از فلک است از حسن نیست



رات، چور اور چاند

جسونت سنگھ

(مسلسل)

[illegible] ہو چکا تھا۔

خاص طور پر [illegible] اس لیے لوگ [illegible] جلدی [illegible] سے [illegible] جاڑے [illegible] راتوں کو کھیت میں کام کرنا ہوتا ہو [illegible] اپنے کھیتوں پر جانے سے پہلے [illegible] تھے۔

[illegible] چاندنی رات [illegible] وہ [illegible] جو [illegible] نہیں تھا [illegible] اس راستے کو [illegible]۔

پھر وہ تنگ ہو کے نہر کے کنارے پہنچنے کے بعد وہ [illegible] راستے [illegible] جب [illegible] لوگ [illegible] دونوں کنارے راستے ہوتے تھے اور [illegible] جب [illegible] پیدل اور گھوڑ سوار اس کے سامنے کنارے چلا کرتے تھے۔

پرمی پال سنگھ نے رک کر ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ چاندنی رات میں دور دور تک کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ [illegible] دکھائی دے رہے تھے۔ کہیں کہیں کھیتوں میں کام کرتا ہوا کوئی آدمی یا کوئی ساتھی سوار [illegible] خاموشی کا راج تھا۔ چاندنی راتوں کے کیا کہنے۔ بہت دور [illegible] کی اڑتی ہوئی صدائیں سنائی دے جاتی تھیں۔ سب سے نمایاں منظر اس چوڑے راستے کا تھا جس کے دونوں کناروں پر ایک دوسرے کے متوازی ببول اور شیشم کے اونچے اونچے درخت میلوں دور تک چلے گئے تھے اور دور جا کر دیکھنے والے کو معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی طویل لکیر [illegible] کا سینہ چیرتا ہوا افق کی دھندلاہٹ میں گم ہو گیا ہو۔

پرمی پال سنگھ گورے چٹے رنگ اکہرے بدن کا ایک [illegible] نوجوان تھا۔ وہ [illegible] دبلا ہی تھا اس کی [illegible] بھی بہت معمولی لیکن اس کے بدن میں وہ قوت اور کس بل نہیں تھا جس کی توقع کسی دیہاتی نوجوان سے کی جا سکتی ہے۔

طویل [illegible] چند لمحوں کے لیے اس کی نگاہ کے سامنے رہا اور پھر اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ دس بجنے میں ابھی وقت کچھ زیادہ

[illegible] ہوتا تھا کیونکہ [illegible] ہوتا ہے [illegible]
[illegible] کہ اس کے [illegible]
کی طرف سے کوئی آہٹ تھی۔

وہ جیسے ٹھٹک سا ہو کر رک گیا۔

ہلکے ہلکے قدموں سے وہ آگے بڑھا [illegible] ——— لیکن خیال ہی خیال میں ——— وہ ٹھٹک گیا۔ ایک لمحہ ——— اور پھر [illegible] کر رہ گیا [illegible] کی جانب دیکھا [illegible] کی جانب [illegible] کے گھروں میں [illegible] سنائی دے رہے تھے۔

کچھ دیر وہاں کھڑے رہنے کے بعد اس نے پھر قدم بڑھایا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی شخص اس کا پیچھا کر رہا ہو۔ وہ اپنے پاؤں کے علاوہ بھی دوسرے قدموں کی چاپ بھی سن رہا تھا۔ [illegible] سے مختلف ہو گئی ...

ٹھیک پھر وہی ..... پھر وہی ..... وہی ہے اور وہاں ——— وہ پھر رک گیا۔ کس قدر واضح آواز تھی لیکن اس کے قدم رکتے ہی ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ آخر یہ سب کیا ماجرا ہے۔ آواز ضرور ہے لیکن کس کے چلنے کی آواز ہو سکتی ہے۔ کیا وہاں بھوت پریتوں کا اثر ہے ہو سکتا ہے جس وقت وہ اس راستے پر چلا ہے اسی وقت سے [illegible] کی جانب دیکھا بھی نہیں تھا ...... اس خیال کے آتے ہی اس کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے [illegible] ... لیکن ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ پڑھا لکھا انسان تھا وہ اس قسم کے توہمات پر یقین ہی نہیں رکھتا تھا۔ یہ خالصاً فکری خرافات تھی۔

وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ آخر کون ہو سکتا ہے۔ جو پیچھا کر رہا ہے ——— لیکن اس وقت اس کی جیب میں تھا ہی کیا [illegible] ایک [illegible] کام بھی کرتے تھے۔ آخر وہ بینک سے [illegible] نہیں تھا۔ [illegible] اس کا پیچھا کرے [illegible] اس کے پیچھے پیچھے چلنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ وہ مڑ کر اس سے پوچھ سکتا ہے۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اب وہ [illegible] کہ نہیں کر [illegible] آخر یہ ماجرا کیا ہے۔
... ہو سکتا ہے اس کے کان ہی بج رہے ہوں۔ کتنی درست خاموشی طاری تھی ...

ایک دم پھر وہ چل دیا لیکن پھر وہی بات۔ لیکن وہ رکا نہیں ..... پھر اجنبی آواز ...... اب پھر اجنبی آواز ...... معاملہ پھر رک گیا اور اس نے [illegible] ایک لمبا [illegible] یہ لمحہ بھر کے لیے [illegible] کا وہم نہیں تھا۔ وہ کوئی لڑکی یا دیو [illegible] نہیں تھا۔ یہ تو اس کی آنکھوں دیکھی بات تھی۔ ہو نہ ہو اس میں ضرور کوئی بھید ہے۔ یہ کوئی [illegible] نہیں ہے بلکہ اس معاملے کو اس قدر [illegible]
ہی کیا تھی اور وہ بھوت بھی نہیں تھا۔ اس میں ضرور کوئی بھید ہے۔

تاریکی میں سلسلے دکھائی دینا بھی کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ وہ عجیب ذہنی کشمکش میں گرفتار ہو گیا۔ کئی قسم کے شکوک دل میں پیدا ہو گئے۔ اس نے اس سوال کے ہر پہلو پر غور کیا لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہا شاید وہ سایہ دوبارہ دکھائی دے جائے۔ نہیں اب کچھ بھی نہیں دکھائی دیتا تھا لیکن کیسا عجیب قسم کا احساس تھا۔ ایک اجنبی جاندار چند قدموں کے فاصلے پر کھڑا سانس لے رہا تھا۔

شاید وہ بھی نظروں سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ شاید اس کی بے وقعتی کے سبب پر نظریں جھکی رہی تھیں کہ ایک انجانا سا [illegible] انسان کی آنکھیں کیل کر رہا۔ آن گرب . . .

[illegible] سب کچھ اس کے رخ پر ہوا کی ہدایات حقیقت کچھ بھی نہ ہو اس سے کہیں قریب [illegible] اس کو یقینی نہ لا کر۔ مصنف وہاں اس کے وجود کے سوالوں سے ہیں ہے۔

[illegible] تلاش کرنے کے بعد وہ آہستہ آہستہ قدم بقدم آگے بڑھنے لگا۔ یکایک اس کے بہت قریب سے پیچھے کی جانب سے قدموں کی چاپ سنائی دینے لگی۔ اس نے مڑ کر دیکھنے کی بجائے آواز دی یہاں رہ جانے کی کوشش کی اور اب [illegible] صاف طور سے سنائی دینے لگی جیسے اس کا پیچھا کر رہے اسے گھیر رہی تھی پھر وہ آواز اور بھی قریب سے سنائی دینے لگی۔ رفتہ رفتہ آواز اس کے درمیان فاصلہ کم ہونے لگا۔ اس کا دل [illegible] سے دھک دھک کرنے لگا۔ وہ حیران [illegible] کیسا ہے۔ ایسا کون شخص ہو سکتا ہے جو اس کا پیچھا کر رہا ہے یا کوئی جھوٹ ہے جو اس پر سایہ کرنے پر مجبور ہے۔ [illegible] بات تھی [illegible] اس نے [illegible] اور بھی تیز کر دی [illegible] تیزی سے پاؤں کی جانب کی آواز میں بھی تیزی پیدا ہو گئی۔ اب گھومنا [illegible] مضمون تھا۔ اب شک [illegible] کا امکان بھی باقی نہیں رہا تھا [illegible] اس کا پیچھا کرنے والا بہت قریب آ گیا ...... اس نے [illegible] بہت آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ راستے کے سب ویرانے سے جو ہر طرف [illegible] کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ جیسے اس کے پاؤں تلے کچلے جا رہے تھے اور ان کی آواز اسی کے قدموں کی آواز میں گھل مل کر عجیب قسم کے ادبی شور میں تبدیل ہو چکی تھی۔ [illegible] اس طرح آگے بڑھ رہا تھا جیسے کوئی جن اس کے پیچھے کر چلا آ رہا ہو۔ [illegible] اس کا پیچھا کر رہا۔

[illegible] سامنے دکھائی دے رہا تھا۔ اس کو یاد آیا کہ کہاں [illegible] جہاں تک وہ صبح کے وقت سیر کرنے چلے آیا کرتے ہیں۔

[illegible] پیچھے سے کسی کے دوڑنے کی آواز آئی لیکن اس نے پیچھے کی جانب گھوم کر نہیں دیکھا۔ پھر جب وہ پھلانگ کر دوسرے کنارے پر پہنچا تو پیچھے سے بھی اسی قسم کی آواز سنائی دی۔ سامنے کھال کا چھوٹا سا پل دکھائی دینے لگا۔ وہ پوری قوت سے اس کی جانب دوڑ پڑا۔ اس قدر تیزی کہ وہ کبھی پیچھا چھڑا کر نیچے پل کے نیچے پانی کے [illegible] کی [illegible] دل کو [illegible] حاصل ہوتی۔ اس نے زور زور سے سانس لیتے ہوئے [illegible] نظروں سے پیچھے کی جانب دیکھا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ پیچھا کوئی نہیں تھا ...... لیکن اب وہ اپنے دل کو یہ فریب بھی نہیں دے سکتا تھا کہ یہ سب کچھ اس کا وہم تھا بلکہ یہ حقیقت تھی کہ اس کا بڑی تیزی اور سنجیدگی سے تعاقب کیا گیا تھا لیکن وہ بال بال بچ گیا تھا۔ پیچھا کرنے والا کون شخص تھا؟ اس کا پیچھا کرنے سے اس کی غرض کیا تھی۔ کیا وہ اسے جان سے مار دینا چاہتا تھا یا اس کو یہ وہم تھا کہ اس کی بغل میں نوٹوں کا پلندہ دبا ہوا ہے۔ کچھ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ اب ہوائی جہاز کے سایوں کی تاریکی نہیں تھی بلکہ کھلی فضا اور دور دور تک پھیلے ہوئے کھیت اور ان میں ساکن کھڑے ہوئے پودے تا حد نگاہ دکھائی دے رہے تھے۔ اب خوف کی بھی کوئی بات نہیں تھی۔ بدنام علاقہ تو تھا لیکن ممکن ہے کسی نے شرارت کرنے کے خیال سے اس کا پیچھا کیا ہو لیکن اس پر حملہ کرنے کی جرأت نہ ہو سکی ہو۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

وہاں کوئی اجنبی کھڑا تھا۔

دفعتاً پرتھی پال سنگھ کے قدم رک گئے اور چند لمحوں کے لیے [illegible] ہو کر رہ گیا۔

گھٹنوں سے کچھ اونچا [illegible] سفید [illegible] تھا۔ وہ بالکل جامد و ساکن تھا۔ [illegible] اس کی آنکھیں [illegible] کے [illegible] بھی [illegible] ۔۔۔

پرتھی پال سنگھ [illegible] جانے کیوں جس [illegible] کے ساتھ ہی ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے۔ وہ بزدل نہیں تھا لیکن اس پُراسرار واقعے کے باعث اس کے ہوش [illegible] نہیں رہے تھے۔

اس وقت پرتھی پال سنگھ نے پہلے تو یہ سوچا کہ پیچھے پلٹ [illegible] جاؤں لیکن پھر اسے یوں محسوس ہوا جیسے اجنبی کہہ رہا ہو میاں! اتنی دیر سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں اب آنکھ بچا کر کہاں کو چلے۔

وہ آہستہ آہستہ اجنبی کی جانب بڑھا۔ کھلے میدان اور [illegible] رات میں وہ اتنی جرأت کر سکتا تھا حالانکہ اجنبی کا رویہ بہت مشکوک و عجیب تھا۔ اسے تعجب ہو رہا تھا کہ آخر [illegible] خاموشی [illegible] ۔ باوجود اس کے [illegible] اجنبی کی خاموشی اور بھی تعجب خیز تھی۔ مگر اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس نے اسے کہیں دیکھا ہے [illegible]!

یہی الجھن پیدا ہو گئی تھی۔ اس کی پیشانی پر پسینے کی [illegible] بوندیں چھوٹ پڑیں۔ اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے ہکلا کر کہا: میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے؟

اجنبی چپ رہا۔

پرتھی پال سنگھ [illegible] کے کنارے پر [illegible] گیا۔ وہ حیرت سے اجنبی کے منہ کو تک رہا تھا۔ آخر وہ جواب کیوں نہیں دیتا اور جب وہ اس سے صرف [illegible] قدم کے فاصلے پر تھا تو دفعتاً اجنبی نے حرکت کی۔ اس کے دانت [illegible] اور [illegible] کی آواز کے ساتھ [illegible] کی [illegible]

وہ اس کے قدموں پر آن گری ـــــ اور اس کے بعد پھر خاموشی۔

قد سے آس کے بصر پرتھی پال سنگھ اور آگے بڑھا کہ شاید وہ اس کی صورت پہچان سکے۔ وہ قد وقامت سے تک گیا وہ اس کی صورت سے واقف تھا لیکن وہ اسے اب بھی نہیں پہچان سکا۔

"میں پالا سنگھ ہوں۔"

پرتھی پال سنگھ کو بھاری بھرکم آواز شناسا سی لگی۔ ابھی تک سے یہ بات یاد نہیں آئی کہ اس نے اسے کہاں دیکھا تھا لیکن نام پالا سنگھ تو اس نے سن رکھا تھا۔ وہ اس نام کے شخص کے اوصاف سے واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ شخص اچھے کردار کا آدمی نہیں ہے اور بدمعاش ہے لیکن وہ اس کا پیچھا کیوں کر رہا تھا۔ آخر اسے اس کا کیا حق تھا لیکن شاید اس کو پیچھا کرنے والا کوئی اور ہو۔ کیوں نہ وہ اس سے دریافت ہی کرے۔

"کیا تم ہی میرا پیچھا کر رہے تھے؟"

"ہاں۔" برملا جواب ملا۔

پرتھی پال سنگھ کو کچھ غصہ بھی آیا اور کچھ تعجب بھی ہوا۔ اس نے پیشانی پر بل ڈال کر پوچھا "کیوں؟"

اس پر پالا سنگھ کا بھاری بھرکم ہاتھ ہوا میں اٹھا اور اتنا اندہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ پڑا اور پھر جب پرتھی پال لڑکھڑا کر گرا تو اُسے احساس ہوا کہ اس کی گردن اور رخسار کی رگیں جل اٹھی ہیں اور ایک کان میں بھائیں بھائیں کی آوازیں آ رہی ہیں۔ ایک تیرہ ساری دنیا اس کی آنکھوں تلے سے چکر کھا گئی۔ اس کی کس کر بندھی ہوئی سنہائی پگڑی بل کھاتی ہوئی پرے جا گری۔

پرتھی پال سنگھ کو بے حد طیش آیا۔ آنکھیں ابل پڑیں۔ آنکھ جھپکنے میں رہتی پرے اٹھا اور چیتے کی سی تیزی کے ساتھ حملہ آور کی جانب بڑھا اور بڑی تندی سے جھپٹ پڑا۔

ان معاملات میں پالا سنگھ کا ہاتھ بہت صاف تھا۔ اس نے اندھا دھند آگے بڑھتے ہوئے دشمن کے پیٹ میں گھونسا رسید کیا۔ وہ حق کی صدا کے ساتھ آگے کو جھک گیا۔ پھر تی سے بڑے دستے کی ٹھوڑی پر بھانپت جو رسید کیا تو پرتھی پال سنگھ تیورا کر جو بڑے کے گنوں کے بل پیشانی اور ناک کے بل گرا اور رو رنگ گسٹتا ہوا چلا گیا ـــــ پیشانی، ناک اور ہونٹ بُری طرح چھل گئے۔

پالا سنگھ بھی جوہر میں کود پڑا۔ شاید پرتھی پال سنگھ کے جسم پر اٹھنے کی سکت باقی نہیں رہی تھی لیکن نہ معلوم کس جذبے کے تحت وہ بڑبڑا کر اٹھا اور سیدھا کھڑا بھی نہ ہونے پایا تھا کہ پالا سنگھ نے اس کے جبڑوں تلے جبڑے دھا کے سے گھونسہ جڑ دیا۔ پرتھی پال سنگھ کو محسوس ہوا کہ اس کے مسوڑھوں میں گرم گرم نمکین خون نکل کر اس کے لعاب دہن میں مل رہا ہے اور اس کے سامنے اس کے ذہن پر بادل سے چھا رہے ہیں۔

پالا سنگھ نے حضور صاحب (حیدرآباد دکن) کا بنا ہوا صفدروں والا بھاری بھرکم کڑا آگے بڑھا کر انتہائی نفرت سے ہتھیلی کے نچلے حصے کا ایک جھانپڑ اس کے رخسار پر رسید کیا اور گوشت کی ایک بوٹی کٹ کر علیحدہ ہو گئی۔ پرتھی پال سنگھ کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے رخسار پر دہکتا ہوا انگارہ رکھ دیا گیا ہو۔

معلوم ہوتا تھا کہ اس کی ٹانگ میں گہری چوٹ آئی ہے۔ اس کے حواس تقریباً قریب مختل ہو چکے تھے اور وہ لڑکھڑا کر اور

[illegible] کوشش کی [illegible] ساتھ میں [illegible]
[illegible]:

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible] ہے۔

[illegible] نے ملک [illegible] ہے [illegible] ......
[illegible]
[illegible] کے [illegible] گئے۔

[illegible] کے ساتھ [illegible]
گاؤں [illegible] پہنچا تھا۔

جیسے ہی [illegible] پال سنگھ کا باپ اور [illegible] وقت [illegible]
اندر کی طرف بڑھا پھر پال سنگھ [illegible] سے [illegible] باہر کھینچ لیا۔

[illegible] شروع کیا۔

پال سنگھ کے سر پر تو جیسے [illegible] سوار تھا۔ اس نے نہایت [illegible] سے [illegible] پال کو [illegible]
[illegible] اور قریب تھا کہ وہ اس کا [illegible] اور گردن کی رگیں [illegible]
[illegible] گھونسوں اور پاؤں کی ٹھوکروں سے بے رحمی سے مار مار کر پال سنگھ کا [illegible] نکال دیا [illegible] بے ہوش ہو کر گر پڑا۔
بالوں سے گھسیٹ کر [illegible] کوٹھری میں بند کر دیا گیا اور [illegible] کہ رات [illegible] جانے پیاس کے [illegible] جائے۔

مردم شماری کمشنر کے نام

فکر تونسوی

عالی جناب مردم شماری کمشنر صاحب!

کل کی ڈاک سے آپ کا سوال نامہ مردم شماری موصول ہوا [illegible] آپ کے علاوہ بھی معلوم [illegible] آپ نے [illegible] آپ کا [illegible] مردم شماری کر کے [illegible] چاہتے [illegible] معاشرے [illegible] آپ [illegible] خانہ تفصیل کے ساتھ پر کیا جائے [illegible] تفصیل [illegible] معاشرے [illegible] نہیں جا سکتے ہیں۔

چونکہ آپ کا مقصد [illegible] سے [illegible] واقف [illegible] رہا ہوں۔

تاریخ پیدائش

سب سے پہلے آپ نے تاریخ پیدائش پوچھی ہے۔ [illegible] تاریخ پیدائش کا کچھ پتہ نہیں۔ والد صاحب کہہ گئے ہیں [illegible] عاشق کے ساتھ بھاگ گئی اور میری پیدائش [illegible] اس لیے مجھے [illegible] پیدائش [illegible] کا مطلب تھا [illegible] زندگی [illegible] والد صاحب سے [illegible] سکتا تھا۔

جس دن پیدا ہوا تھا اسی دن والد محترم [illegible] کے جرم میں [illegible] تھے چنانچہ [illegible] جا سکتی ہے (لیکن ایسا کرنا ایک قبیح حرکت ہوگی)

نام

آپ نے میرا نام پوچھا ہے۔ خاندانی [illegible] نام [illegible] رکھا مگر [illegible] کے نواسا

[illegible] ہمارا [illegible] کا [illegible] ۔ [illegible] چونکہ [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] ۔ [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ۔ [illegible]
[illegible] [illegible] ۔ [illegible] نام کی کچھ [illegible]
معلوم نہیں ہوتا۔

[illegible] [illegible] ۔ ۔ ۔

ولدیت

[illegible] [illegible] ۔ [illegible]
[illegible] [illegible] ۔ [illegible]
[illegible] [illegible] ۔

[illegible] [illegible] ۔ [illegible]
ان کے اصل نام کا [illegible] ۔ [illegible]

آج [illegible] [illegible] ۔ [illegible]
[illegible] [illegible] ۔

ذات

آپ نے ذات پوچھی ہے۔ [illegible] سنا ہے [illegible] راجپوت تھے اور [illegible] برس پہلے [illegible]
سے بھاگ کر یہاں آن بسے تھے۔ [illegible] ۔ [illegible]
سے ملتا ہے۔ [illegible] ۔ [illegible] معلوم ہوا ہے [illegible]
بھاٹیہ [illegible] راجپوت [illegible] ۔ [illegible]
[illegible] [illegible]

ایک بزرگ کا خیال ہے کہ ہماری اصل [illegible] ہے۔ [illegible] بھاٹیہ [illegible] ہیں۔ کئی بزرگ ہمیں بھاٹیوں کی جگہ بھاٹ
[illegible] بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم موسیقی اور شاعری [illegible] درباروں میں [illegible] بڑی قدر و منزلت [illegible]
باوجود [illegible] بھاٹ کے مقابلے پر راجپوت [illegible] ۔ [illegible] گمراہ کن ہے۔ [illegible]
کی خاطر کون اپنا نسب گرا دیتا ہے۔

عمر

عمر کے سلسلے میں کیا بتاؤں۔ تاریخ پیدائش میں کنفیوژن کے باعث صحیح پتا [illegible] نہیں۔ گزشتہ ہفتے ڈاکٹر نے بینائی ٹیسٹ

کرتے ہوئے کہا: "عینک کا بردار ناچیز کا معلوم ہوتا ہے عمر چالیس کے پیٹے میں جا پہنچی ہے۔"

پامسٹری کے ایک ماہر نے کہا تھا کہ چالیسویں برس میں پہنچتے ہی تم اچانک مشہور ہو جاؤ گے۔ چنانچہ پرسوں شب غلط سمت سے آنے والی کے نتیجے میں ملامت ہو کر سڑک پر اتنا چھینکا کہ میری ناک کی ہڈی ٹوٹ گئی اور اخباروں میں جلی سرخیوں کے ساتھ یہ خبر چھپ گئی اور میں ملک بھر میں مشہور ہو گیا۔ لہٰذا ہم چالیس ہی بھی جانے لیکن ذہنی طور پر پچھتر برس کا ہو چکا ہوں جسے کہ بہت کم سمجھتے ہیں۔

شادی شدہ یا کنوارہ

میری شادی کی کیفیت یہ ہے کہ مجھے شادی شدہ ہی سمجھئے کیونکہ بیوی کی موجودگی میں کوئی انکار ممکن نہیں۔ شادی شدگی کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ میاں بیوی، رشتہ ازدواج کی حکایت ہے مثلاً گذشتہ سال میں نے سوچا کہ اس سے پہلے مجھے ایک بیوی کی پیدائش کی مانع پیش کش ہو رہی تھی لیکن میرے ایک بچے نے کہا کہ میرے علاوہ امکانات نزدیک ہیں۔ پہلے اللہ میاں حل بتاتے ہیں، منہمانات کے سب سے پہلے جائیں گے۔ چنانچہ بچے کے مستقبل کی خاطر میں نے اپنا مستقبل خراب کر لیا تھا، اس کے باوجود پھر بھی ہوگی۔

شادی کے بعد میرا خانہ آباد ہو گیا۔ نہ صرف بیوی سے بلکہ متعدد اور چیزوں سے بھی ——— مثلاً بچوں سے جو ہوں سے بلکہ ڈبے سے چارپائیوں سے، مہمانوں سے، انگیٹھیوں سے، سارجنٹوں اور چیچوں سے اور ان سب کی خاطر مت نئے قرضوں سے۔ سوچتا ہوں اگر میری شادی نہ ہوتی تو یہ سب چیزیں کہاں جاتیں؟ کون لگاتا ترتیب؟ شادی نے مجھے ہر چیز سے ہمدردی کرنا سکھا دیا ہے۔

لیکن کبھی کبھی جب رات گہری ہو جاتی ہے سارا کنبہ خواب استراحت میں محو ہوتا ہے تو میں چند بیداری قیدکر آوازیں لگایا ہوتا ہوں مگر وہ حسب معمول نہیں آتی چنانچہ مجھ پر ایک بار پھر کنوارہ بننے کی دھن سوار ہو جاتی ہے اور میں گرم ہو کی طرح سارے گھر میں ایک ملنگ سا حلیہ پہنتا ہوں اور راہ فرار پر گامزن ہو جاتا ہوں۔ ہمیشہ یہ سوچتا ہوں کہ بیوی کی آواز آتی ہے: "جلدی سے آ جاؤ، رنگ کاٹ، یہ سب مچھروں کی کارستانی۔ اس بار آپ کے لیے ایک مچھر دانی ضرور لے آؤں گی۔"

میں اسے یہ نہیں بتاتا کہ مجھے تو گھر بھر کے مچھر کاٹ رہے ہیں بلکہ چپ چاپ چارپائی پر لیٹ جاتا ہوں اور سوچنے لگتا ہوں کہ جو بیوی مجھ سے اتنی محبت کرتی ہے اسے چھوڑ دینے سے زیادہ بہتر ہے کہ ایک مچھر دانی خرید لائی جائے۔

آمدنی

میری آمدنی کیا ہے؟ ——— اس سلسلے میں پامسٹری کے ایک عالم کا قول دہرانا مناسب سمجھتا ہوں جس نے کہا تھا تمہاری ماہانہ آمدنی ایک ہزار روپیہ ہے لیکن معلوم ہوتا ہے جیوتشی مذکور نے ہاتھ بیاد کیا۔ آمدنی کسی اور کی بتا دی ——— جس دن اس نے ایک ہزار ماہانہ آمدنی کی پیشین گوئی کی تھی اس دن میں نے خوشی مسرت سے سیونگز بینک میں سے ایک سو روپیہ نکلوا کر غریبوں اور محتاجوں کو کھانا کھلا دیا تھا۔ بس اس کے بعد تو وہ جیوتشی ہاتھ آیا نہ ایک ہزار روپیہ۔ سیونگز بینک میں وہ ایک سو روپیہ دوبارہ کبھی جمع نہیں ہو سکا؛ البتہ گذشتہ سال ایک مہینہ ایسا آیا تھا جب مجھے ایک ہزار روپے کی آمدنی ہوئی تھی لیکن بعد میں سرکار نے وہ روپیہ مع سود واپس وصول کر لیا کیونکہ میں نے وہ روپیہ بطور قرض لیا تھا۔

حضور کی ... ہی نہیں ... [illegible] سے کی
[illegible] ۔۔۔ [illegible] ۔
[illegible] ۔ [illegible]
[illegible]
[illegible] ۔۔۔

[illegible]
[illegible] ۔۔۔ [illegible]
[illegible] ۔۔۔ [illegible] ۔

مکانیت

مکان کا یہ رشتہ یہ ہے کہ تب ہمارے پاس ایک مکان تھا۔ والد محترم نے جب مستقل نوکری [illegible] کے بعد [illegible] مستقل [illegible] ایک مکان تھا [illegible] کبھی ہمیں یہ نہیں [illegible] والد صاحب [illegible] اکثر [illegible] کرے کا کس کا ہے۔ والد صاحب کا یا چچا جان کا ۔۔۔ اور جب [illegible] تیرہ سال تک کسی [illegible] مکان چھوڑ کر سے بھاگ گیا اور دوبارہ کبھی قدم نہیں رکھا۔

جو [illegible] با جانتے ہیں [illegible] سے سولہ برس کی عمر تک فٹ پاتھوں پر تھا۔ [illegible] پیدا ہوئی تو ایک دوست نے [illegible] ۔ ایک بار [illegible] "رین بسیرا" اسے تا عمر [illegible] زمین بھی ایک جا [illegible] کر دوست بنا کر وہاں اٹھا یا جہاں ایک [illegible] ۔ انسانیت کی یہ ذلیل دیکھ کر سخت غصہ آتا تھا [illegible] خیالات [illegible] ۔ [illegible] سے نکال دیا گیا۔ اس وقت سے کرایے کے مکانوں میں رہنا شروع کر دیا۔ چالیس برس کی عمر تک یہ جذبہ [illegible] کام کرتا رہا اور کرایے کے بیسیوں مکانات مجھے اپنی پناہ میں لیتے رہے۔ اس دوران میں ایک مکان کرایہ پر لیا تھا جس میں پہلے بندر رہتے تھے۔ میرے آنے کے بعد بھی وہ بندروں میں [illegible] سوال [illegible] لیکن بالآخر [illegible] ہو گیا۔ یعنی یوں کہ بندر صبح شام کھانا ہمارے ہاں تناول فرمانے لگے اور باقی وقت گھر سے باہر گزارنے لگے ۔۔۔ مگر ان میں سے ایک بندر انتہائی سرکش اور کینہ ور تھا۔ آخری وقت تک اس نے سول نافرمانی جاری رکھی۔ یعنی [illegible] پاتے ہی ہمارے [illegible] کمرے میں گھس آتا اور ہمارے کھانے پینے کی چیزیں اٹھا کر بھاگ جاتا۔ رات کو ہمارے برآمدے میں ہی سویا کرتا تھا ۔۔۔ آخر ایک بار جب اس نے میرے ننھے بچے کو کاٹ کھایا تو میں نے وہ مکان چھوڑ دیا۔

آج کل میں جس مکان میں رہتا ہوں وہ میرا اپنا ہے کیونکہ باغیانہ خیالات بالآخر تنگ آ کر مجھ سے بغاوت کر کے چلے گئے، ایک کمرہ ہے ایک باورچی خانہ، ایک ننھا سا باتھ روم اور مختصر سی بالکونی۔ اس سے زیادہ کی نہ ہوس ہے نہ گنجائش۔ بڑی شان کی کوٹھیاں اور بنگلے دیکھ کر اب نفرت بھی نہیں ہوتی کیونکہ اب عقل مند ہو گیا ہوں۔ ایک بار ایک دوست کے [illegible] بیٹھ کر ایک غزل لکھی تھی۔

احباب نے کہا: سوال کٹھنا ہے پچھلی بار آپ نے جو سوال سنائی تھی وہ نہایت سہل تھی۔
میں نے کہا: وہ میں نے اپنے ہی مکان میں بیٹھ کر لکھی تھی۔
مجھے خوف ہے کہ اگر تنازع بڑھ گیا تو یہ علم ہو جائے گا کہ میرے مکان میں جو جگہ اول لکھی جاتی ہے وہ زیادہ بہتر ہے اور سب سے پیدا
ادھر بس جگہیں ڈھائی ہیں۔

تعلیم

علم فضل میں یکتا ہوں۔ مثلاً مجھے یہ علم ہے کہ کرتا کاٹیں کاٹیں کیوں کرتا ہے اور زیادہ جسمانی ورزشیں یا دماغی کام کیوں ضروری ہیں۔ مجھے پتا ہے کہ اگر ایک روپے کا ایک سیر گھی آئے تو ایک آنے میں کچھ بھی نہیں آئے گا کیونکہ ایک آنے کا گھی خریدنے کے لیے بھی ایک آنہ کا حصہ ہی ہونا لازمی ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی سینکڑوں چیزوں کا علم رکھتا ہوں مثلاً یہ کہ دو آدمیوں میں لڑائی کروانے کا سب سے آسان طریقہ کون سا ہے۔ جھوٹ بولنے میں جھجک اور اس کی کتنی اہمیت ہے اور یہ کہ بنیادی طور پر ہر انسان میں بے وقوفی کے جراثیم موجود ہیں۔ ملنے یا نہ ملنے اس کی مرضی۔
بہت دیر بعد یہ علم بھی ہوا کہ علم کا بھی فائدہ ہے اگر اس پر عمل کیا جائے لیکن جب مجھے اس بات کا علم ہوا اس وقت تک میں نکما اور کاہل ہو چکا تھا لہٰذا میں اس نتیجے پر بھی عمل نہ کر سکا۔ ارادہ ہے کہ اگلے جنم میں احتیاط برتوں گا اور علم کا فائدہ ضرور اٹھاؤں گا (شاید اس جنم میں کسی ... کا مصنف بن جاؤں گا)

اولاد

اولاد میں میرے تین بچے ہیں اور ایک بلی۔ بلی کو بیٹی کا درجہ دیتا ہوں اور جلد ہی کوئی اچھا سا خاندانی بلا تلاش کر کے اس کے ہاتھ پیلے کر دوں گا۔
باقی تین بچوں میں دو لڑکیاں ہیں، ایک لڑکا۔ جب سے یہ تینوں بچے پیدا ہوئے ہیں میرے گھر میں ہی رہ رہے ہیں۔ اگر گھر سے باہر کبھی جاتے بھی ہیں تو شام کو پھر گھر لوٹ آتے ہیں۔ ان کے بوٹ پھٹ جائیں تو مجھ سے نئے بوٹ کا تقاضا کرتے ہیں اور اگر میں خرید کر نہ دوں تو بسورنے لگتے ہیں ——— جاؤ' زور سے نہیں بولیں گے۔"
اگر بچے اپنے باپ سے زور سے نہ بولیں تو محلہ برادری والے اعتراض کرتے ہیں اس لیے میں انھیں بوٹ خرید کر لا دیتا ہوں اور پھر وہ بوٹ پہن کر محلہ بھر کو دکھاتے پھرتے ہیں اور باپ کی ساکھ بناتے ہیں۔
میں اور میری بیوی دونوں ان کی تربیت میں جی جان سے جٹے رہتے ہیں اور وہ ان دو تربیت گاہوں میں سے الگ الگ راستوں پر بیک وقت تربیت حاصل کر رہے ہیں۔ مثلاً اگر میں ایک بچے سے کہوں کہ محلے کے بچوں سے مت لڑا کرو تو بیوی اسے کہتی ہے کہ ضرور لڑا کرو ورنہ محلے کے لڑکے تمھیں بزدل سمجھیں گے۔ ایک بار میں نے اپنی بیٹی سے کہا 'باسی روٹی مت کھایا کرو' لیکن شام کو جب لوٹا تو وہ باسی روٹی کھا رہی تھی۔ میں نے احتجاج کیا تو بیوی کہنے لگی 'کھانے دو، بچی ہے، آہستہ آہستہ سمجھ جائے گی۔' میں نے ہی اسے کھانے کے لیے کہا ہے۔
اور ہمارے بچے اتنے زیرک ہیں کہ اس دوہری تربیت پر ذرا بھی نہیں گھبراتے۔ چپ چاپ اپنا کام کیے جاتے ہیں ساعد

[illegible]

مذہب

[illegible]

[illegible]

[illegible]

سیاسی خیالات

آپ کے دوستوں کا بیان ہے کہ آپ کے سیاسی خیالات نہ تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میرے اندر سیاسی خیالات پیدا ہو گئے۔ جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ میرے اندر سیاسی خیالات آ گئے ہیں تو وہ ... آنے لگے۔ ایک بار میں نے گلاب کا ایک پھول سونگھ رہا تھا کہ ایک صاحب آ گئے اور بولے

"آپ کیسے سیاسی آدمی ہیں کہ آپ گلاب کا پھول سونگھ رہے ہیں۔ لوگ اعتراض کریں گے۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ آپ کے سیاسی خیالات کا تقاضا ہے کہ جب تک ... پھول سونگھنے کی عادت پیدا نہ ہو جائے اس وقت تک آپ بھی اس خوشبو سے پرہیز کریں اور قربانی کا ثبوت دیں۔"

"قربانی سے کیا ہوگا؟"

"آپ سیاسی رہنما بن جائیں گے۔"

—— آج کل میرے گھر کوئی نہیں آتا اور میں بلا جھجک گلاب کی خوشبو سونگھتا ہوں۔ اسی خوشبو کم بخت نے مجھے سیاسی لیڈر نہیں بننے دیا لہٰذا میرے اندر سے سیاسی خیالات نکل گئے اور صرف گلاب کی خوشبو باقی رہ گئی۔

اب سوائے خفیہ پولیس کے میرے سیاسی خیالات سے کوئی آگاہ نہیں، خود میں بھی نہیں۔"

مرمر کی ماں

احمد سعید

چینی کے سفید گلدان میں سفید گلاب کے پھول، وہ بھی اس طرح ترتیب دیے ہوئے جیسے کچھ سہاگ کاڑھ گئے ہوں یا ایک ہی ڈیزائن کے مطابق جگہ جگہ ٹانکے گئے ہوں۔ یہ گلاب تھے ریاض، اور شیریں کے شوہر ریاض احمد کو یہ وہ نہاں ہی تو تھے جیسے تکیوں کے غلاف اور بستر پوش پر کاڑھے ہوئے زردی مائل گلاب، مرتبانوں اور رات کی رانی کی طرح دکھائی دیتی تھی لیکن ریشمی دھاگے کے پھولوں اور اصل پھولوں میں کتنا فرق تھا۔ ایک میں خوشبو تھی، وہ ہواؤں میں مہک اٹھتے تھے، کھل اٹھتے تھے۔ دوسرے چپ چاپ بے زبان بے حرکت رہتے تھے۔ ریاض احمد ڈپٹی کمشنر کو سہاگ کی رات ہی اس بات کا احساس ہو گیا تھا۔ اس رات اس نے دلہن کا گھونگھٹ اٹھاتے وقت یوں محسوس کیا تھا جیسے وہ چینی کے بند سفید مرتبان کو ڈبے میں سے نکال کر انگیٹھی پر رکھ رہا ہو۔ اور اسے خدشہ ہو کہ وہ خفیف سی ٹھیس لگنے پر کہیں ٹوٹ نہ جائے........ ریاض احمد نے انگلستان میں ہی رہ کر بکھرے اڑ رہے تھے۔ مغربی تتلیوں کو ایک پھول سے دوسرے کی طرف اڑتے تھا۔ اس کا رس چوس کر تیسرے پر تاکا جا بیٹھتے دیکھ کر اسے یقین ہو گیا تھا کہ شادی کے معاملے میں دیسی عورت کا بھی دنیا میں کوئی جواب نہیں۔ چنانچہ جب وہ ملازمت کے سلسلے میں تربیت حاصل کرنے کے بعد وطن لوٹا تو اس نے گھرانی وضع کی دلہن تلاش کرنے میں تین برس صرف کر دیے۔ ایک ایسی عورت جو پردہ نہ کرنے کے باوجود نماز روزہ کی پابند ہو۔ ایک ایسی لڑکی جو تہذیب و اخلاق مرتب جانے اور انگریزی فر فر بولنے کے باوجود دن دیکھے سات پردوں ہی میں بند ہو۔ ریاض احمد کے یار دوست تو اس کے دقیانوسی خیالات سن کر ہنسا کرتے اور اس کے گھر اور خاندان والوں کو بھی اس بات پر پہلے بڑا اچنبھا ہوا کہ وہ ولایت سے ہو آنے کے باوجود دوسرے لڑکوں کے برعکس یوں معلوم ہوتا تھا جیسے حج کر کے آیا ہو۔

"......بس فرق صرف اتنا ہے کہ اس کی داڑھی باہر نہیں اندر اگی ہوئی ہے۔"

"پڑھ لکھ کر گنوا لیا ہے۔" ریاض کے دوست اسے کہتے۔

"معلوم اسے کیا ہو گیا ہے جو اپنی قیمت وصول نہیں کرتا!" ریاض کے والدین کہتے۔

لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ اسے بیوی اولاد پیدا کرنے کے لیے چاہیے تھی۔ بچے کے لیے ایک ماں اور اپنے لیے ایک رفیقہ حیات۔ غرض ہندوستانہ ہوتا ہے۔ جب ایسے دو دل جا ملیں تو سونے پر سہاگہ! ریاض احمد کی نگاہ انتخاب بھی آخر کہاں جا کر رکی۔ اس سے اپنے ہی ڈسٹرکٹ میں درگاہ والے شاہ شریف کے متولی حضرت پیر جمال کی دختر نیک اختر، شیریں جمال، ایک ایسی لڑکی نظر آئی جو

وہاں شوہر صاحب کے مکان میں [illegible] تعلق [illegible] دو برس [illegible] ایک [illegible] رکھا تھا۔ تب سے
کے محل میں گھر کر گئی تھی۔ شوہر صاحب [illegible] محسوس [illegible] شروع ہو گئی۔ پھر جیسے جیسے [illegible] مکمل [illegible]
تعلیم پانے کے بارہ [illegible] کہ بعد [illegible] جاتا رہا [illegible] کا ایک سلسلہ تھا۔ [illegible] بڑھتا گیا
بچوں سے [illegible] سنبھل [illegible] جیسے [illegible] نے [illegible]
حالات میں بنا [illegible] پیشتا [illegible] ہو۔

شیریں کی جو جماعت [illegible] تھا اس نے [illegible] کبھی [illegible] بھی نہیں رکھا تھا۔ اگر یہ بات [illegible]
معلوم [illegible] سے پہلے [illegible] کہ ہو [illegible] نہیں۔ [illegible] جیسی [illegible]
[illegible] کے پیچھے [illegible] کرنے [illegible] جانے کی
ضرورت تھی۔ [illegible] ریاض احمد [illegible] چونکہ پیر صاحب شیریں
کے [illegible] اپنے [illegible] تھا۔ [illegible] وہ ان کے [illegible] کرامت [illegible]
[illegible] تھے۔ [illegible] وقت میں [illegible]
دیتے [illegible] کسی کو ان کے [illegible] حرکت [illegible] موقع نہ تھا۔ [illegible] شیریں کی ریاض احمد [illegible]
سے شادی بھی پیر صاحب کے مریدوں نے پہلے سے قبول کر لی۔

لیکن دس برس کی رفاقت کے بعد بھی [illegible] ریاض احمد کے ہاں کوئی بچہ نہ ہوا۔ اگر ان کے گھر بچوں کی [illegible] رنگ [illegible] کا اضافہ ہوتا [illegible] اور بچے کے بغیر ریاض [illegible] محسوس کرتا جیسے شیریں اب تک کنواری ہو [illegible] سنگ مرمر کے [illegible] بھی کبھی کبھار شوہر کے اس احساس [illegible] کے باعث ٹھنڈی آہیں نکل جاتیں لیکن [illegible] کیوں نہ ہو پاتیں۔ ملک بھر کے مشہور ڈاکٹروں اور حکیموں کا علاج بھی کروا کر دیکھ لیا تھا۔ جو بے اثر ثابت ہوا۔ [illegible] صاحب نے گنڈہ تعویذ، ٹونے ٹوٹکے کے ذریعے [illegible] کی گود ہری کرنے کے [illegible] چوٹی کا زور لگا دیکھا [illegible] بے سود [illegible] کہ جو نہ ہو لڑکی کو انگریزی تعلیم دلانے اور اپنی برادری کو چھوڑ کر ایک غیر شخص کے ساتھ اس کی شادی کرنے کی سزا ہے۔ بہر حال جب پیر صاحب کی اس بارے میں کوئی پیش نہ چلی تو انھوں نے شیریں اور ریاض دونوں کو اپنے خرچ پر علاج معالجے کے لیے یورپ اور امریکہ بھیج دیا۔

غیر ممالک کے ڈاکٹروں نے بھی دیسی معالجوں کی طرح جیسے یک زبان ایک ہی رائے دینے کی سازش کر رکھی تھی۔ وہی جواب پایا جیسے [illegible] کے کان پک گئے تھے کہ جسمانی لحاظ سے تو وہ دونوں آنکھوں کا [illegible] تھے۔ انھوں نے ریاض کو البتہ یہ مشورہ ضرور دیا کہ بیوی کو مغرب کی دل کھول کر سیر کرائے۔ اس کے مطابق انھوں نے اوپیرا، تھیٹر، میوزک ہال، حتیٰ کہ نائٹ کلبوں تک کی سیر کر ڈالی۔ وہاں کی بے حجابی اور بے شرمی دیکھ کر شیریں پر جھرجھری سی طاری ہو جاتی۔ شیریں نے کئی بار ریاض سے کہا کہ وہ کسی مغربی لڑکی سے شادی کر لے شاید اس کے من کی مراد اس طرح پوری ہو جائے لیکن اگر اس کے باوجود ریاض کی خواہش پوری نہ ہوئی تو وہ سنگِ مرمر کی ایک اور دیوار اپنے گرد کھڑی کرے گا۔ وہ جواب دیتا کہ اگر قسمت میں ہی اولاد نہیں تو پھر

شکوہ کیوں۔ شاید اس میں بھی کوئی مصلحت ہو۔" ریاض سے شیریں کو ایک طویل لیکچر سنتے ہوئے کہا لیکن شیریں کو معلوم تھا کہ ساس اس وقت دماغ سے سوچ رہا تھا، دل سے نہیں۔

یورپ اور امریکہ سے واپسی پر ریاض تو بیگم کام میں محو ہو گیا لیکن اس کی والدہ نے بہو کا علاج اپنے ڈھب سے سوچا۔
"خدا بڑا رحیم و کریم ہے۔ اس سے کبھی مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ سنا ہے شاہدرہ میں ایک سائیں آیا ہے وہ بے اولاد عورتوں کا علاج کرتا ہے۔ چلو اس کو بھی دکھا لیں۔" اس نے کہا۔
"۔ ۔ ۔ وہ آئیں تو گاڑی میں چلیں گے۔" شیریں نے ساس کا دل رکھنے کے لیے جواب دیا۔ "جی، آپ سب یہ کیوں خواہ مخواہ اتنا ہلکان ہوتی ہیں۔ میں نے تو انھیں کہہ دیا ہے کہ ۔ ۔ ۔ آپ دوسری شادی کر لیں۔"
"چل پگلی۔ ایسی باتیں نہیں کیا کرتے۔ مجھے ریاض نے بتایا ہے کہ تم نے اسے اجازت دے دی ہے لیکن یاد رکھو نہ تو وہ ایسا کرے گا، نہ میں ہی اسے ایسا کرنے کی اجازت دوں گی۔"
"لیکن۔"
"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ جہاں اتنے علاج کیے یہ بھی آزما دیکھو۔ فکر نہ کرو ریاض کو پتہ نہیں لگے گا۔"
"انھیں بتا دینے میں کیا حرج ہے۔ ایسی جگہ پر کوئی مرد بھی تو ساتھ ہونا چاہیے۔"
"۔ ۔ ۔ تمھارے جیسے کیسوں میں سائیں عورت کے ساتھ مرد والے کو اجازت نہیں دیتا۔ میں جو تمھارے ساتھ ہوں گی میں بھلا کوئی ایسی ویسی جگہ تمھیں تھوڑے لے جا رہی ہوں۔"

"آؤ آؤ۔ میں تمھارا ہی انتظار کر رہا تھا۔" جب شیریں اور اس کی ساس سائیں بڈھن شاہ کے ڈیرے پر پہنچیں تو اس نے انھیں دیکھ کر جواب دیا۔ "فکر نہ کرو۔ خدا تمھاری گود ہری کرے گا۔" نہ صرف اس کے الفاظ بلکہ اس کی شکل صورت دیکھ کر ساس بہو ٹھٹک کر رہ گئیں۔ الفاظ پر اس لیے کہ سائیں کے متعلق لوگ کہتے تھے کہ اسے بنا پوچھے اپنے ملاقاتیوں کی آمد اور دل کا حال معلوم ہو جاتا ہے۔ باقی رہی شکل صورت، اس کے اعتبار سے بھی وہ نمایاں حیثیت رکھتا تھا۔ سرخ و سفید رنگ جس پر بڑھاپا نور برسا رہا تھا اور جس پر عمر کا ثبوت بھی بمشکل ملتا تھا۔ کمان کی طرح سیدھا، چاق و چوبند۔ سر کے بال ضرور براق سفید تھے جو عمر کی غمازی کر رہے تھے۔ چہرے بشرے سے عجب طمانیت اور ہمدردی ٹپکتی تھی۔ کجلائی آنکھوں میں سرخ ڈورے ان میں ایک ناگفتہ بہ خمار، جب وہ جلال میں آتا تو ان میں سے انگارے سے نکلتے۔ سننے میں آیا تھا کہ اگر وہ کسی سے نظریں ملا کر بات کرتا یا نظر اٹھا کر دیکھ بھی لیتا تو اس کا بیڑہ ضرور پار ہو جاتا۔
جب شیریں اور اس کی ساس اس کے ہاں پہنچیں تو وہاں سائیں کے پاس اس کے سائلوں کا جمگھٹا لگا ہوا تھا۔ مردانہ کیا زنانہ کیا دونوں کمرے بھرے ہوئے تھے۔ آدھ پون گھنٹے میں چند عورتوں کو فارغ کر کے وہ یک لخت اٹھ بیٹھا جیسے اسے کچھ یاد آ گیا ہو اور لپک کر اندرون خانہ سے تین چار ماہ کا ایک بچہ اٹھا لایا۔ یہ اس کی آخری نوجوان دلہن کے بطن سے تھا۔

"دیکھو خدا کی قدرت! اگر ادھر بہت سال [illegible] جیسے [illegible] کر دیں [illegible]
اس کے [illegible] کو مخاطب [illegible]
[illegible] ایک دوسرے [illegible]
[illegible] ایک دوسرے [illegible] کے پیچھے [illegible]
[illegible] کے [illegible] پھول [illegible] گئے۔

[illegible] نے [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] ہو۔

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] تھے۔

[illegible] جیسے [illegible]
اُڑتی [illegible] عورت نے اپنے [illegible]
بہت پر [illegible] چلی آتی ہیں اور واپس لوٹ جاتی ہیں جیسے ایک دوسرے سے آنکھ مچولی کھیل رہی ہوں۔

چاندنی میں ریت کے ذرّے [illegible] چمک رہے تھے۔

[illegible] عورت کے سامنے [illegible] کی دو بوتلیں [illegible] کے پاس رکھ دیں۔ [illegible]
[illegible] پانی [illegible] عورت [illegible]
[illegible] خالی۔

"آپ اس طرف نہ دیکھیں۔"
"بارہ تو بج چکے ہیں۔"
"لیکن یہاں کا منظر...... کتنا حسین معلوم ہو رہا ہے۔"
"اُف یہ کیا [illegible] تم کہہ رہی ہو؟"
"نہیں، تو پھر......"

جب عورت نے [illegible] اس کی ریشمی ساڑھی کا پلو اس کے کندھے سے پھسل گیا اور وہ کبوتری کی طرح غٹرغوں کرتے ہوئے

قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔ اس لمحے اسے محسوس ہوا جیسے دریا کی لہروں پر جوار بھاٹا اٹھا ہو۔ اب وہ مرد کے ہاتھوں سے کھسک کر اس کے پہلو سے چھٹک کر ریت پر بیٹھ گئی۔

"سنا آپ نے!" سرکنڈوں کے پیچھے سے اس کے مرد کی آواز آئی۔

"گھبرائیے نہیں، تشریف لائیے بہادر!"

فضا میں ۔ روئی کے گالوں سے زیادہ نرم، چاندنی سے زیادہ سپید پرندے اڑتے تھے، فضا ان سے کیسی کھلی ہے۔ انھیں دیکھ کر عورت کا جی چاہا کہ کبوتروں کو یکلخت پھر سے ترتیب دی جائے، انھیں سنہرے گنبد اور مینار میں رکھ دیا جائے۔ عورت نے اب کبوتر ایک ٹوکری میں بند کر دیے جن میں وہ انھیں بند کرکے لائے تھے اور جو اس کے شوہر کے پاس پڑی تھی۔

چاندنی میں ایک سیاب وحشی شعلہ سا یکدم نمودار ہو گیا۔۔۔ ۔۔۔ گنگ مہکا بیت بے نقاب ہو گیا تھا۔ اپنے چہرے کے پہلو میں رکھ کر عورت پہلے تو گھبرا گئی، اور اسے سرکنڈوں کے پیچھے سے دیکھ کر مرد بھی رہ گیا۔ سفید گلاب کی بندی جس پر سیاہ مخمل کا سا حاشیہ تھا مکمل ہی نظر آتا تھا۔ عورت نے جلدی جلدی اپنے جسم پر تنک دوپٹہ ڈالا، اس کی سانس تیزی سے چلنے لگی، اس کے چہرے کے اردگرد لٹ جھٹنے لگی اور چاندنی اس کے مکھ پر آگئی تھی۔ اس سے عورت کا جی چاہا کہ وہ ٹھنڈی ٹھنڈی ریت سے لپٹ جائے، پانی اس کے اوپر سے بہہ جائے۔ اس نے یکدم اٹھ کر ٹوکری میں سے کبوتر نکال کر اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔ کبوتروں کو اس وقت اس نے محسوس کیا جیسے اس کے سامنے کبوتروں کا ایک جوڑا آ گیا ہو۔

جب عورت نے انھیں اپنے سینے سے لگا کر بھینچ لیا تو اس کی آنکھیں اپنے آپ بند ہو گئیں۔ اس کے تصور میں سیکڑوں برس پہلے شہزادہ سلیم اور مہرالنسا کی پہلی ملاقات کا منظر گھوم گیا ۔۔۔ جب شہزادہ نے اس حسینہ کو کچھ دیر کے لیے اپنے دو کبوتر سنبھال کر رکھنے کو کہا اور واپسی پر اس کے ہاتھ خالی پاکر اس سے پوچھا کہ وہ کس طرح اڑ گئے تھے ۔۔۔۔۔ تو بہت ہی بھولی شکل بنا کر عورت کے ہاتھوں سے دونوں کبوتر پھڑپھڑا کر فضا میں اڑ گئے۔ اور ان کے جسم سے جب فضا میں خاموشی کی آواز پیدا ہوئی، عورت چونک کر اٹھ بیٹھی اور کبوتروں کو ادھر ادھر دیکھنے لگی لیکن وہ نہ جانے کہاں جا چھپے تھے شاید۔ وہ بے اختیار انھیں پکڑنے کے لیے جیسے ان کی طرف لپکی لیکن اس کا پاؤں ایک ننھے سے پتھر سے ٹکرا گیا اور وہ ریت پر گر پڑی۔ چاندنی اب سنگ مرمر کے بت کو پہلی طرح اپنی آغوش میں لے رہی تھی۔

عورت نے یکدم اٹھ کر پانی کی دونوں باہوں سے نہایا۔ اسے محسوس ہوا کہ یہ اس کے اندر روح میں سرایت کر گیا ہے۔ اس نے اپنے مرد سے دریا کے بیچ رہائش کی، اور قہقہہ لگا کر اپنا جسم ریت پر گرا دیا۔ سرکنڈوں کے پیچھے سے ایک سایہ سا ابھرا اور سنگ مرمر کی مورتی سے لپٹ گیا۔

چند ماہ بعد معلوم ہوا کہ سنگ مرمر کے بت میں زندگی کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔

وقت کی کوکھ

نوید انجم

بھابی کے۔۔۔ وہ تمام گرد پوشی

اس کی آنکھیں ایک دم کھل گئیں۔ ۔۔۔ جیسے ۔۔۔ سے پھیلنے لگی ۔۔۔ نے ساڑھے دس بجا

بال سمیٹ کر ۔۔۔ کمرے کے ۔۔۔ کی کھڑکی ۔۔۔ بیٹھے رہتے تھے ۔۔۔

کھڑکی کا کھلا ۔۔۔ اس کا ۔۔۔ جیسے ۔۔۔ نہیں ۔۔۔ کی ۔۔۔

تیرا ۔۔۔ کے ۔۔۔ زندگی ۔۔۔ کے ۔۔۔

آنکھوں سے ۔۔۔ کی ۔۔۔ کر رہی تھی

۔۔۔ کا ۔۔۔ گیا ۔۔۔ اف ۔۔۔ تو ۔۔۔

اس نے مڑ کر ایک ۔۔۔ کو دیکھا۔ ۔۔۔ کے پاس ۔۔۔ ایک عورت ۔۔۔ اس ۔۔۔ نظر ۔۔۔

اس عورت کا ۔۔۔ اور ۔۔۔ مرد ۔۔۔ جیسے وہ کوئی ۔۔۔ عورت ۔۔۔

مشغلہ ۔۔۔ جاری ۔۔۔ اس کا ۔۔۔ زندگی ۔۔۔ نے اس کے چہرے کو ۔۔۔ دیکھا ۔۔۔ معلوم ۔۔۔

مگر اس عورت کا چہرہ کسی ۔۔۔ سے عاری تھا۔ وہ ایک ۔۔۔ آتے جاتے لوگوں پر ایک نظر ڈالتی۔ ۔۔۔

۔۔۔ کے قریب پڑے ہوئے ایک کشکول ۔۔۔ آنے ۔۔۔ زندگی ۔۔۔ توبہ توبہ کرتے ۔۔۔

۔۔۔ اور ۔۔۔ وہ عورت ۔۔۔ بچوں کی طرف بھی ۔۔۔ جن کی نگاہوں ۔۔۔ معصومیت ۔۔۔

۔۔۔ کی ۔۔۔ بچوں کی جانب ۔۔۔

پلٹ کر اس نے بھابی کی طرف ۔۔۔ توبہ توبہ کر رہی تھی۔ توبہ ہے بھابی ۔۔۔ کیا یہ اس عورت کے بچے ہیں؟

بھابی نے منہ پھیر لیا۔ چلو ۔۔۔ وہ وہاں کھڑا ہونا نہ چاہتی تھی

۔۔۔ نے اپنا ۔۔۔ ایک ۔۔۔ بھابی ۔۔۔ تمام ۔۔۔ گئی۔

گھر پہنچ کر وہ اپنے کمرے میں چلی گئی ۔۔۔ کہ وہ کمرے میں ۔۔۔ کی جانب دیکھتی ۔۔۔

وہ ۔۔۔ آئینے کی طرف آئی اور ۔۔۔ کر ۔۔۔ لگی۔

اس کا چہرہ روشن تھا، رنگ صاف۔۔ کھلتا ہوا گندمی رنگ جو سہیل کو بہت پسند تھا ۔۔۔ وہی سہیل جو اس کا محرم تھا ۔۔۔ نہ صرف محرم بلکہ شگفتہ بھی اور اب تو شاید ہونے والا شوہر۔ [illegible] کیا ناک ستواں تھی جسے کئی بار سہیل نے شرارت سے کھینچا۔ اور وہ گلاب سے سرخ ہونٹ۔ جنھیں اس نے کئی بار اپنے ہونٹوں سے چھونا چاہا اور وہ ہمیشہ اپنی دلفریب ادا کے ساتھ پیچھے ہٹ گئی کہ اس کے لمس سے بچائے رکھتی۔ اور [illegible] کی وہ آنکھیں جو وہ شرارت کے طور پر [illegible] اور [illegible] لمبی تھیں اور وہ بھی خوشنما سر پر ۔۔۔ آئینہ میں خود کو دیکھتے ہوئے وہ مسکرا دی ۔۔۔ لیکن نہ جانے اسے [illegible] کا خوف [illegible] پرے غائب ہو گئی [illegible] ایک سوال ۔۔۔ پھر اچانک [illegible] اس کی بے بسی پر ہنسنے کے لیے بن گیا ۔۔۔ آنکھیں، وہ حسین آنکھیں۔ جانے کہاں گم ہو گئیں اور بے نور سے [illegible] جیسے [illegible] ہوئے دو پتھروں کی مانند اس کا منہ [illegible] لگے ۔۔۔ اور پھر سامنے لگا جیسے وہ [illegible] بازار میں کھڑی ہوئی ہے [illegible] کے ہمراہ [illegible] کی حالت میں راہ چلتے لوگوں کی نظروں سے لبریز [illegible] کا نشانہ بن رہی ہو ۔۔۔ سارے [illegible] اس کے حلق سے ایک خوفناک چیخ نکل گئی ۔۔۔ اسے احساس ہوا کہ ان لوگوں میں سہیل بھی ہو سکتا ہے اور وہ ۔۔۔ وہ [illegible] ایک سسکتی ہوئی زندگی ہے ۔۔۔ اس نے گھبرا کر اپنے منہ پر [illegible] اور سسکتی ہوئی مسہری پر گر گئی۔

بھابی اس کی چیخ سن کر بھاگی آئی ۔۔۔ اسے یوں روتا دیکھ کر [illegible] کے لیے تو وہ بڑی حیران ہوئی۔ پھر اس نے اس سے [illegible] بولی [illegible] کیا بات ہوئی رانی؟ ۔۔۔ بولو رضا!

رضا [illegible] ہو گئی [illegible] رانی ۔۔۔ رضا رانی ۔۔۔ رانی!

بھابی نے اسے [illegible] دیکھ کر پوچھا: کیا بات ہوئی؟

کچھ؟ ۔۔۔ اس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

اس کی بڑی بڑی آنکھیں ۔۔۔ نم آلود ۔۔۔ بھیگی بھیگی ۔۔۔ کتنی پیاری لگ رہی تھیں: بھابی کو وہ بڑی پیاری نظر آئی اور اس کے بازوؤں کو پکڑ کر کھینچتے ہوئے وہ بولی: "اٹھو ۔۔۔ اٹھو ۔۔۔" پھر رازداری کے لہجے میں بولی: "تمہیں سہیل سے تو کوئی بات نہیں ہوئی ۔۔۔؟"

وہ شرما گئی ۔۔۔ حیا کی سرخی نے اس کے چہرے کو بہت زیادہ حسین بنا دیا۔ اس نے کہنا چاہا: "کیسی بات کرتی ہو بھابی! بھلا [illegible] بات پر میں یوں رو سکتی ہوں ۔۔۔" مگر وہ کچھ نہ بول سکی۔ اس کے ذہن میں ایک خیال ابھرا۔ کیا میں واقعی سہیل کی کسی بات پر [illegible] رو رہی تھی ۔۔۔ [illegible] کوئی جواب نہ مل سکا اور گھبرا کر اس نے اپنے ذہن میں سے ایسے الٹ پلٹ سوال نکالنے کی کوشش کی [illegible] وہ [illegible] نہیں؟"

بھابی کچھ سمجھ نہ سکی۔ ہنس دی، پھر بولی: "پگلی! ارے ابھی آ جائے گا۔ وہ بھی تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

وہ [illegible] طرح شرمائی تو بھابی نے اسے چھیڑنا شروع کر دیا۔

شام ہوئی تو وہ اداس [illegible] ممی اور ڈیڈی [illegible] ہو گئے تھے ۔۔۔ بس ذرا سی ضد کر کے رضا نے بھابی کی مدد سے باغ جناح میں سیر کے لیے جانے کی اجازت لے لی اور سہیل کے ہمراہ باغ میں آ گئی۔ وہ دونوں گلستان فاطمہ کے ایک کونے میں جا کر

ہو گئے [illegible] سے [illegible] تھا [illegible] جب [illegible] سے [illegible]
[illegible] ہو گئے [illegible] نہیں [illegible]
[illegible] — جو [illegible]
[illegible] — ؟

وہ جب واپس گھر [illegible] ایک دوست [illegible]
کی کتاب دکھا کر [illegible] سنتے ہیں۔

[illegible] کتاب [illegible] ہے [illegible] ضرور ہے۔

رضا مسکرائی [illegible] ہے۔

رضا عجیب سی [illegible] بات [illegible] بولی۔ [illegible] اب [illegible] صورت [illegible]
بے جھجک سامنے آ رہی ہے ——؟"

[illegible] میں نے [illegible] صورت [illegible] ہے [illegible]
[illegible] ہے ——؟

سہیل نے پوچھا تو رضا نے ساری بات کہہ سنائی —— [illegible] بولی — ان جیوں کو دیکھ کر میرا تو دل دہل گیا اور بھابی
بھابی کی طبیعت خراب ہو گئی ——

سہیل نے کہا —— ہاں —— ابھی دور ہے —— جانے کتنے اور [illegible] دنیا میں ——

رضا کاٹ گئی بات کاٹ کر بولی "بس کرو اور بات کرو ——"

نعیم نے کہا "مس رضا : ایک بات اور سنئے گا —— یہ کتاب جو آپ کے ہاتھ میں ہے [illegible] کا ایک
افسانہ ہے جس میں ایک ایسا ہی کیرکٹر پیش کیا گیا ہے — یہ پڑھ کر دیکھئے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ دنیا میں فریب ——"

رضا کسی اور خیال میں کھو رہی تھی۔ اس کے ذہن میں دوپہر کے واقعات پھر رہے تھے —— وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہے
اور اس کی شکل بدل گئی ہے —— چونک کر اس نے سہیل کا ہاتھ پکڑا اور وحشت زدہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ سہیل نے بڑے پیار سے
اسے دلاسا دیا —— "تم نے خود ہی تو یہ ذکر چھیڑا اور اب خوفزدہ کیوں ہو گئی ہو ——؟"

نعیم کو احساس ہوا کہ اس سے کوئی غلطی ہو گئی تھی —— معذرت کرتے ہوئے بولا : "مجھے اجازت دیجئے ——"

رضا کا دل چاہا کہ اس سے کتاب لے کر کمرہ جاتے ہی پڑھے مگر خاموش رہ گئی۔

سہیل اسے گھر تک چھوڑنے آیا —— وہ کچھ خاموش خاموش تھی۔ کچھ بھائی آئے ہوئے تھے مگر وہ سیدھی اپنے کمرے میں چلی
گئی۔ بھابی اس کے پیچھے پیچھے آئی —— دیکھا کر مسہری پر بیٹھی ہوئی بکھرے ہوئے بالوں میں اپنی مخروطی انگلیاں یوں پھیر رہی ہے جیسے کنگھی
کر رہی ہو —— دوپٹہ مسہری پر آدھا نیچے اور آدھا اوپر کی جانب پردے کی طرح لٹک رہا ہے اور گلے کے بٹن کچھ کھلے کچھ بند —— پر
وہ ٹھٹک کر رہ گئی —— "رضا —— رضا!" بھابی نے سرگوشی کی۔

اس نے پلکیں اٹھا کر ایک کروٹ لی اور بھابی کی طرف دیکھنے لگی --- "بھابی وہ عورت!"
بھابی نے جلدی سے کہا "پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے" --- پھر وہ اس عورت کے ذکر کو ---
وہ خاموش ہو گئی

شام کو اندھیرے نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ سڑک کے دونوں کناروں پر بجلی کے کھمبے نظر آنے لگے جیسے ایک لمبی سی لکڑی کا سہارا لیے کھڑا ہو۔ --- وہ لیٹے لیٹے کمرے کی کھڑکی میں سے باہر اندھیرے میں یونہی نہ جانے کس چیز کو دیکھتی رہی۔ روشنی دیکھ کر اسے محسوس ہوا کہ ایک بم کا گولہ ہے جو بھڑک رہا ہے اور طلب کی مدھم مدھم سی روشنی --- وہ آگ ہے جو کسی بھی وقت سارے عالم کو اپنی لپیٹ میں لے کر بھسم کر سکتا ہے --- پھر یہ تمام دنیا ختم ہو جائے گی --- ان تمام نوجوانوں اور ارمانوں سے کھیلنا ہمیشہ کے لیے فنا ہو جائے گی --- وہ اس خیال کے آتے ہی لرز کر رہ گئی

پھر وہ چپ کر بھابی کے کمرے کی طرف آئی۔ اسے محسوس ہوا جیسے "یہاں سب خاموشی نے ... یہ جواب ہے۔ ماحول پر سناٹا مسلط ہو گیا اور تاریکی میں ہر چیز ڈوب گئی ہے --- جانے کہ وہ اب نہیں بھابی نہ جانے ... زندگی کی ہر شئے کو نگلنے کے لیے تیار ہے۔

گھبرا کر اس نے دروازہ کھولا اور آہستگی کے ساتھ اندر داخل ہوئی --- اندر دروازہ بند کیے بغیر وہ چپ چاپ کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے دیکھا بھابی اپنی چارپائی پر خاموش بیٹھی ہوئی ہے اور سامنے میز پر رکھا ہوا ٹیبل لیمپ روشن ہے۔ ننھے سے لیمپ کی ذرا سی روشنی نہ کر سکی تاریکی میں گھل کر ایک عجیب سی فضا پیدا کر رہی تھی۔ ہلکی ہلکی روشنی اور ہلکی ہلکی تاریکی جاں نواز ساحل اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ بھابی کے کمرے میں پھیلا ہوا تھا ----

رضا کو ایسے لگا جیسے وہ ساکت ہو جائے اور پتھر کا ایک مجسمہ بن گئی --- اس سے اپنا قدم آگے نہ بڑھایا گیا اور لرزش نے اس کے پیروں کو جوتیوں سمیت گویا دبوچ لیا! اس کے سینے کے اندر عجیب تبدیلی سی آ گئی اور دل کی دھڑکن کی آواز اتنی تیز ہو گئی کہ رضا کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کا دل اس کے بدن سے علیحدہ ہو کر گھڑی کی ٹک ٹک کی طرح چلنے لگا ہو۔ جلدی سے اس نے اپنا پنجوں پر ہاتھ رکھ کر اسے سنبھالا کہ کہیں وہ واقعی اس کے منہ کے راستے اچھل کر باہر نہ آ جائے --- اور متوحش نظروں سے بھابی کو گھورنے لگی۔
بھابی کے بے حس و حرکت جسم میں حرکت ہوئی اور رضا کو سسکیوں کی آواز سنائی دی --- بھابی بڑی آہستگی کے ساتھ اٹھی اور ٹیبل لیمپ کے پاس بیٹھ گئی --- بھابی کے چہرے پر ہلکی سی روشنی پڑی تو رضا نے دیکھا کہ وہ رو رہی تھی۔ وہاں وہاں انگارہ سی آنکھوں میں آنسوؤں نے شبنمی قطرے کیا اس دہکتی ہوئی آگ کو بجھانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے جو بھابی کے سراپا میں بھڑک رہی تھی۔
پھر بھابی نے اپنے چہرے سے اپنی آنکھوں کے ان قطروں کو پونچھا جو اگر کسی سیپ کے منہ میں گرتے تو موتی بن جاتے اور منتشل میں بیٹھی بیٹھی اپنے شوہر کی تصویر اپنے ہاتھوں میں لے کر دیکھنے لگی ----

رضا کو یوں محسوس ہوا جیسے دل ہر قسم کی بندشوں سے آزاد ہونے کے لیے جدوجہد کرنے لگا ہو --- اس کے بھیا کی تصویر تصور میں اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی --- پانچ فٹ کی وہ وجیہہ شخصیت ... اس کا خوبرو بھائی جمیل --- ہاں دیکھو ناں جمیل اسے دیکھ کر ہنس رہا ہے --- پگلی! پگلی! تم مجھے دیکھ کر اتنی حیران کیوں ہو رہی ہو --- ارے یہ آنسو کس لیے؟

وہ بے اختیار چونک اٹھی ——— [illegible] کہ [illegible] سے اس کو اٹھا کر [illegible] کے پھیلا گئی
پھر [illegible] تصویر [illegible] کی طرف اٹھ گئی —— [illegible]

اس کا دل [illegible] کہ وہ [illegible] سے [illegible] تھے [illegible]
[illegible] تھی —— [illegible] عجیب تھا —— [illegible] خیال [illegible] تھا —— وہ اس [illegible] نہیں تھا۔ [illegible]
کے [illegible] کر گئی : [illegible] تو [illegible] !

[illegible] بچے کی طرح [illegible] —— پھر ایک سانس [illegible] کی سانس کے ساتھ
ہی [illegible] نکل گئی —— اف —— اف —— وہ آ رہی ہے ——

[illegible] بات سوچ کر کہ —— [illegible] : [illegible] کوئی کتاب [illegible] —— [illegible] کے ساتھ [illegible] سے
[illegible] کا احساس ہوتا ہے —— :

[illegible] نے بے دلی سے کہا۔ نہیں —— [illegible] ——

اور [illegible] محسوس ہوا جیسے [illegible] —— وہ نہ نہیں ہے —— [illegible] ——
اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کیا کرے —— پھر وہ [illegible] اور دروازہ کھول کر [illegible] کی طرف چل دی لیکن [illegible]
ڈرائنگ روم تک [illegible] کہ اسے [illegible] کا خیال آیا اور [illegible] ہوتی گئی [illegible] ——
کوئی کتاب اس کے پاس بھی نہیں —— [illegible] اگر وہ سوچنے لگی کہ کیا کرے —— پھر اس نے [illegible]
کے پاس [illegible] پڑے ہوئے فون کو دیکھا۔ اس نے سوچا کیوں نہ [illegible] کو فون کر کے [illegible] کتاب [illegible] —— [illegible]
کے [illegible] بجے تھے۔ کوئی زیادہ دیر بھی نہیں ہوئی تھی —— یہ سوچ کر اس نے [illegible] نمبر ملایا مگر [illegible] ——
ایسے میں اسے سہیل کا خیال آیا۔

"سہیل!" اس نے فون کیا۔ "بھلا بتاؤ تو سہی —— میں کون ہوں؟"
"ارے بھابی! —— اس —— میں [illegible] —— دراصل مجھے کوئی کتاب چاہیے —— وہ بولی۔
وہ ہنس رہا تھا —— اسے بھی ہنسی آ گئی: "بھلا اس میں [illegible] کیا بات ہے؟"
"تم نے نسیم سے وہ کتاب کیوں نہ لے لی؟"
وہ چونک گئی [illegible] کہ وہ [illegible] کی کتاب پڑھنا چاہتی تھی —— اور اس کتاب کا خیال آتے ہی اسے وہ عورت یاد آ گئی
—— اور پھر وہ خوفناک [illegible] —— [illegible] —— [illegible] بالوں والی عورت! وہ سہم گئی۔ کمرے میں کسی کی آہٹ آئی۔ پھر جیسے کسی کے سانس
لینے کی آواز گونجنے لگی۔ اس کے کانوں کے پردوں سے آوازیں ٹکرانے لگیں —— کمرہ [illegible] سے بھر گیا —— وہ چیخ پڑی
—— "نہیں سہیل —— مجھے وہ کتاب نہیں چاہیے ——"
"رخشندہ —— !" اسے بھابی کی آواز سنائی دی —— اس نے پلٹ کر دیکھا۔ بھابی اس کے پیچھے کھڑی تھی
فون میں سہیل کی آواز آ رہی تھی: "تم ڈر گئیں؟ بھئی بڑی ڈرپوک ہو —— بڑی [illegible] ہو ——" وہ چھیڑنے لگا۔

رضا نے سر سے [illegible] آپ [illegible] گیا [illegible] : مجھے [illegible] دو [illegible] اچھا [illegible] سالی ماں؟ اچھا [illegible] سے
[illegible] علیحدہ کر دیا

بھابی کی [illegible] بولی : [illegible] کہ وہ [illegible] ہے —

[illegible] پھر [illegible] رضا [illegible] چاہیں! —

"[illegible]"

[illegible] : وہ خود سے کہہ رہی تھی — "بہت [illegible]"

بھابی [illegible]

[illegible] — وہ [illegible] سے [illegible] میں [illegible] — [illegible]

[illegible] وہ [illegible] ہو گئی —

رضا نے سوچ کر وہ شاید [illegible] ہو گی۔ مگر نہیں وہ تو [illegible] ہی [illegible] تھی۔ — بس [illegible] کتابیں [illegible] دیکھ رہی تھی جیسے
خواب دیکھ رہی ہو —

[illegible] — پھر [illegible] رضا نے [illegible] اٹھایا — [illegible] — نہیں! — [illegible] رضا ہوں —
کتاب نہیں ہی؟ [illegible] وقت [illegible] گا؟ [illegible] بات نہیں — اچھا کل ملیں گے — بھابی — بابی [illegible]

بھابی [illegible] رہی ہی [illegible] آج دیکھو رضا — وہ مجھے یہاں چھوڑ کر [illegible] دور چلے گئے —!

وہ بھابی کی طرف متوجہ ہوئی "بھابی فکر کیوں کرتی ہو — ابھی انھیں گئے ہی چار دن ہی تو ہوئے ہیں — بھابی!"

بھابی نے رضا کی طرف دیکھا "رضا — کیا تمہیں چار دن کچھ نہیں ہوتے — [illegible] انھیں ادھر [illegible] پاس ہی ہونا چاہیے تھا — میں انھیں بتاتی کہ ان کی خواہش پوری ہو —!" وہ رک گئی۔

رضا کو کچھ یقین نہ آیا [illegible] — "سچ بھابی!"

بھابی نے صوفے پر بازو رکھ دیے اور سر جھکا لیا — "ہاں! — میں ماں بننے والی ہوں مگر۔۔ کاش! میں انھیں بتاتی کہ ان کی یہ خواہش پوری ہونے دیکھ کر میں کتنی خوفزدہ ہوں — کتنی ڈر گئی ہوں میں —!"

رضا جیسے خوشی کے مارے دیوانی ہو گئی — "ارے بھابی! ابھی بتایا تک نہیں — ارے بھیا کتنے خوش ہوں گے — وہ تو بس آنے ہی والے ہوں گے!"

"اونہہ!" بھابی نے تلخ [illegible] — "کاش یہ جنگی مشقیں ختم ہو سکتیں —!"

رضا ایک دم جیسے بہت بڑا سیاسی مقرر [illegible] کا روپ دھار بیٹھی "امن کے لیے یہ سب چیزیں ضروری ہیں —"

"امن — امن" بھابی نے اس کی طرف [illegible] نظروں سے گھورا — "دنیا میں کون ہے جو سکون نہیں چاہتا، امن نہیں چاہتا اور پھر — پھر رضا تم کیا جانو جب میں سوچتی ہوں کہ وہ پائلٹ ہیں اور خدانخواستہ کسی روز یہ جنگی مشقیں —"

"بھابی!" اس نے [illegible] بات کاٹی۔ ..

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

وہ ... اسے ... دیکھنا ...

اسے بڑی حیرت ہو رہی تھی

اخبار کا کاغذ ... کیا ... سارا کا سارا ... چھوڑ دیا ——— اپنے کمرے میں جا کر پڑھنے لگی ... مگر ... اخبار ... اس کے کمرے میں آئی ——— اسے ... پڑھی ہے؟

"کیا؟"

"وہ جو ... تھی نا ...؟"

وہ سمجھ گئی ——— ...

... اسے گرفتار کر لیا گیا ہے ...

"کیوں؟" اس نے عجیب سے کہا، ... سے اخبار چھین لیا ——— اور پڑھنے لگی ——— مگر اخبار کے حروف جیسے اس کی نظروں کے سامنے پھیلنے لگے ——— اور آنکھوں کے سامنے چھوٹے چھوٹے معصوم ننھے ننھے بچے پھرنے لگے ———

بھابی کہہ رہی تھی ——— "کہتے ہیں کہ کل شام ... جب وہ ... میں بچے کے لیے بھیک مانگ رہی تھی کہ ایک شخص ... بہت ... اس کے بچوں پر ترس کھا کر اسے بھیک دی ——— اور ...

رعنا نے اخبار ایک طرف پھینک دیا ... "اور ——— اور؟"

"اس شخص کا ایک ہی بچہ تھا ——— ... واقعات سنانے میں کمال حاصل تھا۔ اور وہ بچہ دو تین سال ہوئے ... کی عمر ہی میں گم ہو چکا تھا ——— اس شخص کو ... میں پڑے ہوئے ایک معذور بچے پر بار بار بے اختیار پیار آتا ——— اور بچے کا نام اس کے منہ سے نکلتا ——— مگر عورت بچے کو کسی اور نام سے بلاتی رہی ——— مگر اس آدمی سے نہ رہا گیا اور اس نے اپنے بچے کا نام لے کر پکارا ——— بس بچے نے جھٹ سے پلٹ کر اسے دیکھا ——— ... وہ بچہ بول تو سکتا نہیں تھا ——— اسے بیچارے کی زبان کٹی ہوئی تھی ...!"

"ایک —" رضا مارے حیرت کے منہ کھول بیٹھی۔

بھابی بولیں: "تب پولیس کو بلا کر اس شخص نے اس عورت کو گرفتار کرا دیا —— اس عورت نے اپنے جرم کا اقرار بھی کیا —— ہے بے چاری کتنی خاندانی تھی —— لوگوں سے بھیک مانگنے کی خاطر —— اور سنا ہے کہ گھر کی تلاشی لی گئی تو دس ہزار روپیہ کا بنک بیلنس بھی جمع ہوا ہے۔"

رضا نے حسب عادت: "استغفار ہے ایسی عورت کو سخت ترین سزا ملے۔"

بھابی بولیں: "اس کو تو بس ایسی کڑی سزا ملے کہ آگے بھیک دینا بھی..."

اس دن رضا کو دن بھر یہ خیال ستاتا رہا —— اسے یوں محسوس ہوتا جیسے ابھی کوئی آفت ٹوٹ پڑنے والی ہو —— سارا دن وہ مرجھائی کلی کی مانند پریشان سی رہی۔ چہرہ سایہ ہو کر کھویا ہوا اور آنکھیں وحشت زدہ۔ بعض اوقات جب اسے یہ خیال آتا کہ وہ بھی بننے والی ہے نوعروس کی ایک لہر اس کے تن بدن میں دوڑ جاتی مگر وہ جیسے سہم کر رہ جاتی —— اللہ —— اگر کہیں کوئی عورت آ کر ان کی خوشیاں لوٹ لے ——

مجیب حسب معمول شام کو دفتر سے آیا اور اس کی طبیعت خلاف معمول بہت گھبرایا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ وہ اس عورت کے ذکر پر اپنا موڈ خراب کیے بیٹھی ہے تو بڑا ہنسا اور لگا اسے چھیڑنے۔ اس کی ان باتوں پر وہ خفا ہو کر نکل گئی —— وہ کہنے لگا۔

"بیگم —— ایسا ہوتا ہی آیا ہے —— تم خوامخواہ پریشان ہو۔"

"خدا کا شکر ہے اتنے دن پیچھے اس کا ذکر کرتے۔"

وہ بولا: "بھئی کل ہی میں نے ایک پرچے میں افسانہ میں لکھا ہے کہ ایک عورت بھیک کی خاطر اپنی ہی اولاد کو معذور کر کے لوگوں کی ہمدردی حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ دولت کی مالک بن جاتی ہے —— فرق صرف یہ ہے کہ یہاں یہ عورت دوسروں کے بچوں کو اپنی بھیک کی خاطر ——"

"بیگم —— اللہ —— نہیں نہیں بھلا کوئی اپنی اولاد کو تکلیف پہنچا سکتا ہے ——"

"پیسہ —— پیسہ سب کچھ ——"

رضا نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا —— "بس بس —— اور کچھ نہ کہو۔"

آہستگی کے ساتھ اس نے اس کا نرم و نازک ہاتھ اپنے منہ پر سے ہٹایا اور اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا —— وہ شرما گئی ——

اور پھر کچھ ہی عرصہ کے بعد جب اس نے رضا کا گھونگھٹ اٹھایا اور آنکھوں میں جھانکنا چاہا تو وہ چھوئی موئی کی طرح سمٹ کر رہ گئی —— سرخ شربتی کپڑوں میں وہ ایک گٹھڑی کی طرح پڑی ہوئی تھی اور وہ سر جھکائے ایک ہاتھ سینے پر رکھے کہنے لگا —— "بیگم آنکھیں کھولو —— میں ہوں تمہارا غلام۔"

اور پھر پالکی اٹھی۔ نہ مہندی رچا ہاتھ نہ باسا گھونگھٹ نکالے آنکھیں لاج کے مارے بند کیے رہی۔ رخصتی کے وقت بھابی نے کیسی شرارت کی تھی —— اپنے بڑھے ہوئے پیٹ کی طرف اشارہ کر کے بولی تھی: "اے رضا، ماں فرخندہ خیال رکھنا —— اتنی جلدی یہ روگ نہ لگے —— ویسے یہ روگ ہے بڑا پیارا ——" وہ سرگوشی کر گئی تھی۔

اور پھر [illegible] ابا [illegible] چھوڑ [illegible] کے ساتھ گھر [illegible] —— [illegible]
[illegible] بات [illegible] [illegible] ——
[illegible] پکڑے کھڑی ہیں۔

[illegible] جیسے [illegible] [illegible]
[illegible] وہ [illegible] لگی تھی۔

[illegible] ——
وہ [illegible] گئیں ——

بھابی [illegible] —— [illegible] ——

[illegible]

[illegible] ہوتا ہے نہیں۔

وہ [illegible] مطلب ہے۔

بھابی ہنسنے لگیں۔ —— [illegible] [illegible] بیٹھی تھا
[illegible] ——
رابعہ بھابی پر غصہ آنے لگا —— ا —— ک —— [illegible] کیا حال ہوا ——

بھابی [illegible] —— [illegible] ——

بات کاٹ کر وہ بولی: بھابی جاؤ بھی نا ——

[illegible] آج [illegible] آزادی کے ساتھ [illegible]
[illegible] کے متعلق پوچھا [illegible]
[illegible] —— اور [illegible] رضا [illegible] —— [illegible] کہ وہ [illegible]
[illegible] بچوں کو لے کر [illegible] اور پھر ——

جن سُن ہو کر رہ گئی —— پھر بھابی نے کہا کہا اس نے کچھ سنا ہی نہیں [illegible] تھی کہ
[illegible] ایک عورت کے بھی ہے —— نہیں —— نہیں۔ ——

میکے سے وہ واپس آئی تو اداس اداس سی تھی۔

پھر دن گزرنے لگے۔ پہاڑ کے سے دن —— وہ زندگی کی اس راہ پر آ گئی تھی جہاں چوراہے [illegible] —— زندگی میں
سے بہت سی نئی نئی پگڈنڈیاں جنم لیتی ہیں —— نئی راہیں نئے راستے —— اور وہ دوراہیوں میں کھڑی دل ہی دل میں [illegible] ڈر رہی تھی کہ
کہیں اس کے قدم سیدھی راہ پر چلنے کی بجائے غلط راستے پر نہ پڑ جائیں۔ [illegible] کی بجائے پگڈنڈیاں [illegible] اپنی جانب نہ کھینچ لیں۔
پھر ماہ گزرنے لگے —— چاند ہر ماہ اپنی صورت بدلنے لگا —— اس کا روپ بھی [illegible] گرگٹ کی مانند رنگ بدلنے لگا [illegible]

پریشان ہو گیا۔ وہ عجیب نظروں سے اردگرد کے لوگوں کو دیکھتی رہی، اور اس [illegible] روز کو دیکھ کر تو جانے کیوں اس کے بیٹے کے وجود میں کسی انجانی وجہ سے ایک خوف سا پیدا ہو گیا اور وہ [illegible] کے قابل نہ رہی [illegible] کہیں جنگ ہو گئی، تو وہ بم کا چھوٹا سا ٹکڑا گرے اور گرتے ہی پھٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائیں۔ [illegible] جیسے [illegible] اور وہ اپنے ہاتھوں میں پانی سے بھرے ہوئے کچے گھڑے چھپائے ہوئے ہے [illegible] ہیں اور وہ گرے [illegible]

صبح سویرے جب [illegible] گاڑی کا فوگ لگاتے ہوئے گزرتی تو وہ جو [illegible] کر [illegible] کے اوپر سے گزر جاتا تو وہ سہمی ہی ہو کر رہ جاتی۔ جہاز کا خوفناک شور گرنے ہی ایک ایسی آواز پیدا کرتا جسے سن کر اس کے [illegible] [illegible]

اور پھر وہ [illegible] آنکھیں پھاڑے [illegible] کرسیوں کی طرف دیکھتی اور [illegible] کچھ [illegible] جاتی۔ وہ اپنے ہاتھوں سے چہرہ [illegible] پیٹ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھی اور سوچتی جو [illegible] کھٹ کر رہ گئی ہوئی اور پھر [illegible] رہ جاتی۔

"تمہیں ایسے [illegible] کیا ہو گیا ہے؟"

اور وہ [illegible] کے ساتھ اسے دیکھتی ہوئی اس کی نگاہیں اپنے سوئے ہوئے [illegible] ہاتھوں پر جا ٹھہرتیں اور وہ [illegible] سے پوچھتی "مجھے کیا ہو گیا ہے؟" اور [illegible] کی سمجھ میں کچھ نہ آتا اب آنسو اس کی پریشان اور غمگین آنکھوں سے موتیوں کی مانند بہنے لگتے۔

جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا اس کی پریشانی زیادہ ہوتی جا رہی تھی۔ [illegible] کے اس حالے روز بھابی [illegible] جب بیٹھ میں موجود ہوتی [illegible] جلوگی [illegible]

وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ بس خوف زدہ نگاہوں سے بھابی کے پیٹ کو گھور کر رہ گئی۔

بھابی جیسے رازداری کے ساتھ بولی: "وہاں اسے [illegible] گے۔ —— ابھی [illegible] کو ......"

اس کا دل چاہا کہ زور سے چیخیں مارے اور بھابی کے مال [illegible] کر دے۔ —— اس کے پیٹ کو چاڑ [illegible] ایٹم کے ذرات بن کر فضا میں بکھرے اور تحلیل ہو جائے۔ —— مگر وہ کچھ نہ کر سکی۔ بڑی بے قراری اور اضطراری کیفیت کے ساتھ [illegible] شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "نہیں بھابی —— میری طبیعت ٹھیک نہیں!"

بھابی چلی گئی تو اس نے اطمینان کا سانس لیا۔

اور اس روز صبح سویرے اخبار پڑھتے ہوئے سہیل نے اسے خبر پڑھ کر سنائی: "اسے دیکھا تم نے —— فرانس نے ہائیڈروجن بم کا تجربہ کر دیا —— پہلا کامیاب تجربہ......"

وہ چیخ اٹھی —— "سہیل!"

وہ گھبرا کر اخبار چھوڑتے ہوئے اٹھا "کیا ہوا؟ کیا ہوا —— کچھ تو بولو"

اس نے اپنے نچلے لب کو دانتوں سے کاٹ کاٹ لیا اور جواب میں کچھ نہ بولی —— اور اسی وقت بھابی کے ہاں سے نوکر نے یہ اطلاع آ کر پہنچائی —— "بی بی کے ہاں لڑکا ہوا ہے۔"

اس نے مدہوشی کے سے عالم میں یہ خبر سنی اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے میکے میں وہ عورت اپنا ایک بچہ چھوڑ کر مر گئی ہو

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] دوسری طرف [illegible]

[illegible]

اسے جاتے ہی وہ بیٹھ گئی۔

[illegible]

[illegible] ——— [illegible]

[illegible]

[illegible] ———

وہ چونک گئی۔ اس نے دیکھا [illegible] کسی کی آواز آتی ہے [illegible] کوئی بھیک مانگ رہی ہے ——— اس نے بیٹھ کر سامنے کی کھڑکی سے جھانک کر دیکھنے کی کوشش کی

دہشت زدہ ہو کر وہ پلنگ پر جیسے ڈھے گئی ——— وہی عورت [illegible] بھیک مانگ رہی ہے ——— اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے پیٹ میں کسی معذور بچے نے کروٹ لی ہے وہ خود بھی تو اپنے پیٹ کی ریڑھی میں اپنے معذور بچے کو لیے بیٹھی ہے

——— اور ——— اب ؟

وہ بھی اپنے بچے کو لے کر بازاروں میں پھرے گی ——— وہ بھیک مانگے گی ——— نہیں اسے بھیک مانگنے کی ضرورت کیا ہے ؟

وہ بھیک نہیں مانگے گی وہ تو صرف اپنے بچے کی نمائش کرے گی ——— [illegible] پیدا ہونے والا معذور بچہ ——— ماں کے پیار سے محروم ———

نقل و حمل کرتا گوشت کا ایک جاندار لوتھڑا ——— سائنس کی اولاد ——— وہ اس کا بچہ نہیں !!

اسے شدت سے یہ محسوس ہونے لگا جیسے اس کے پیٹ میں اس کا بچہ نہیں [illegible] کا ایک بگولا ہے جو ایک دم اس کے

پیٹ کو چاک کر کے فضا میں تحلیل ہو کر ساری دنیا پر زہر پھیلانے لگا ـــ زہر ـــ زہر!!

اور پھر اسے ہر طرف رنگ نظر آیا سب سیاہ، مردہ فضا میں پھیلا ہوا ہے ـــ سارا ماحول کالا دھواں بن گیا ہے اور یہ تجربات اس کی نظر نے دیکھا ہے ـــ وہ ایک منظر ہو گا جو دیکھا ہو گا نہیں ـــ!

درندوں پر شرمندگی ہے ـــ پھر اس کی سفید سفید فاختاؤں کو ہلاک کر رہے ہیں یہ فاختائیں ہی ہیں ـــ جنھیں بچاؤ ـــ انھیں بچاؤ۔ ورنہ دنیا کا امن برباد ہو جائے گا۔ پھر ہم بکھر جائیں گے ـــ جیسے اس کا غرور ختم ہو رہا ہے۔

اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ بچہ نہیں جن رہی بلکہ بستر پر بہت کنکنگ کر رہی ہے اس کی رگ رگ میں کمزوری پیدا ہو گئی اور آنکھیں بند ہونے لگیں سفید سفید فاختاؤں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ پیدا ہونے لگی ـــ نہیں یہ پروں کی پھڑپھڑاہٹ فاختاؤں کی نہیں، یہ تو رحمت کے فرشتوں کے پروں کی ہے۔ یہ سارا آسمان سفید سفید فرشتوں کے سفید پروں سے بھر گیا ہے ـــ سیاہ بادل نہیں ـــ یہ امن کی فاختائیں نہیں، یہ تو رحمت سفیدی کا روپ دھار کر آئی ہے۔

پھر اس کے بدن کے سارے حصوں میں درد نے پناہ کر لیا اور تکلیف کے مارے اس کے منہ سے چیخ نکلی اس نے جیسے آخری بار ایک لمبا سانس لیا اور خود کو سفید پروں والے فرشتے کے حوالے کر دیا ـــ اور اس کا بدن خود بخود ڈھیلا ہو گیا

اس کی آنکھیں کھلیں تو اس نے ماحول کو دیکھنا چاہا مگر فضا جیسے نوزائیدہ کے ابھی ابھی تجربے کا احساس بھی باقی تھا اس دھندلکے کی چادر میں سے ہر چیز پھیکی پھیکی سی معلوم ہو رہی تھی، اس نے ڈر کر آنکھیں بند کر لیں۔

پھر سفید پروں والے فرشتے نے آہستہ سے جھک کر کہا: "اپنے بچے کو دیکھئے۔"

اس نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں ـــ سفید ـــ سفید ـــ ہر چیز سفید ـــ اور سامنے نرس کھڑی تھی وہ کہہ رہی تھی۔

"بچے کو دیکھو......"

"نہیں ـــ نہیں! وہ درد بھری آواز میں چلائی "نہیں، میں اسے نہیں دیکھ سکتی ـــ میں نہیں دیکھنا چاہتی۔"

اور اس نے آنکھیں زور سے بند کر کے دیوانوں کی طرح رونا شروع کر دیا۔

پریت کیے دُکھ ہوئے

صالحہ صدیقی

سب تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ ہم لوگ کار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ [illegible] کوشش کر رہی تھی۔ وہ بھی بہت خاموش تھے۔ [illegible] گئے۔ [illegible] سے پیار کرتے تھے [illegible] آپ [illegible]

میں خاموش رہی۔ بھائی جان نے کار اسٹارٹ کر دی۔ [illegible] بھائی صاحب [illegible] تھیں۔ [illegible] ہمارے [illegible] اصل میں [illegible] کے گیٹ کے [illegible] سے ایک شخص [illegible] کی طرف لپکا [illegible] بھائی جان اور بھابی جان [illegible] اور ہم سب حیران ہو گئے [illegible] وہ میرے پاس بیٹھ گیا اور بڑے پیار سے [illegible] لگا [illegible] تمہارے [illegible] بڑی مشکل سے چھٹی ملی ہے۔"

اب مجھ سے آنسو ضبط نہ ہو سکے اور [illegible] وہ تو [illegible] شہاب نے بتایا کہ وہ ایک ہفتہ ہمارے پاس رہے گا۔ میں نے سوچا کچھ تو دل بہلے گا۔ [illegible] بھی میرے [illegible] اس سے زیادہ [illegible] بھیا پر پیار آتا ہے [illegible] باتیں [illegible] اور پھر [illegible] کے چار دن [illegible] ایک [illegible] اس کی [illegible] چلتے وقت اس نے مجھے ایک بڑے [illegible] کے PAINTS [illegible] آپا! تم اکیلی گھبراؤ گی۔ خالی وقت میں تصویریں بنایا کرو۔ تمہارے ہاتھ میں فن ہے بھئی۔"

اس کے جانے کے بعد گھر پھر سنسان ہو گیا۔ اوپر کی منزل میں بھائی جان اور بھابی جان رہا کرتے تھے۔ [illegible] میں [illegible] میرا کام تو بس یہ رہ گیا تھا کہ ان کے خطوں کا انتظار کرتی رہوں اور تصویریں بناتی رہوں۔ ایک دن شہاب کا خط آیا۔ لکھا تھا کہ کرسمس کی چھٹیوں میں [illegible] چاہئے تاکہ [illegible] جائے [illegible] اکتا [illegible] سب سے زیادہ مجھے خوشی ہوئی۔ بھائی جان اور بھابی جان بھی فوراً رضامند ہو گئے اور دو دن بعد ہی ہم تینوں [illegible] ریل سے روانہ ہو گئے۔ [illegible] بھی سفر میں شریک ہو گیا۔ بڑا ہی خوبصورت موسم تھا۔ سفر بہت ہی اچھا گذرا۔ [illegible] پلیٹ فارم پر جبکہ ہمارا سامان اتر رہا تھا ایک صاحب آئے

اور بھائی جان سے لپٹ گئے۔ صحن میں پر چلا کر نئے درخت لگے ہوئے ہیں۔ ان کا سر نگینے کی طرح سفید تھا اور جسم ضرورت سے زیادہ موٹا۔ تعارف سے پتہ چلا کہ یہ بزرگ وہ ہیں جو بارہ سال ہوئے ہیں اور برسوں سے یہیں رہتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ ہے کہ میرے لیے دعا ہی ہو، میرے ہوتے ہوئے ہوش نہ رہا، شکریہ۔

عجیب تعلق تھا۔ بہت بحث کے بعد ماماں جان کی مانی پڑی اور ساتھ رہنے لگیں ان کا گھر دیکھ کر بڑی ونیا دیکھی تو بہت ہی خوش ہوئیں کیونکہ یہ گھر بہت کام کا تھا۔ ایک چھوٹے سے ٹیلے کے سرے پر چھوٹا سا بنگلہ سبز اور سنگ بستہ پھولوں سے گھرا ہوا تھا۔ خاص طور پر اس نے غضب کا ایک کمرہ دیا جس میں ڈھلوان پھیلا تھا۔ اس کے آگے برآمدہ تھا۔ اس برآمدے سے دو ستون جو شاعرانہ انداز سے گھل رہے تھے۔ یہاں سے دور دور تک اچھا نظارہ ہوتا تھا جس سے سوچا جا سکتا ہے کہ برفباری کا نظارہ لوٹا جا سکتا ہے۔

ماموں جان کی دو لڑکیاں تھیں۔ ماڈرن حسن سے بہت زیادہ ان کے نام راحت اور ناز تھے لیکن انھیں پیار سے رامی اور نازی کہا جاتا تھا۔ رامی نازی سے دو سال بڑی تھی۔ بھائی جان اگرچہ عمر میں ماموں جان سے کہیں چھوٹے تھے مگر شاید کہ دونوں ہم عمر لگتے تھے۔ وہ دونوں دنیا و مافیہا سے بے خبر یہاں سارا دن باغ کے کسی کونے میں بیٹھے کھیل میں محو رہتے۔ رامی اور نازی بڑی جلدی گھل مل گئیں۔ ہاں نہیں مگر مردوں کے سامنے خاص طور پر شہاب کی موجودگی میں وہ بہت کم بولتیں۔ مجھے ان کا یہ شرمیلا پن بڑا اچھا لگتا تھا۔ ان کے بھائی جان کے دن میں بھی دو مالی کے ارمان جاگ رہے تھے۔ میں سوچتی تھی کہ کیسے افسانوی طریقہ پر یہ ملاقات ہوئی ہے۔ اور نرمی کبھی نہ تھا کہ یوں۔ بجائے مجھے صوفی بھائی آتی بیاری سی مل سکتی ہے مگر یہ نہیں سمجھ سکتی تھی کہ ان میں سے کون سی اپنے شہاب کے لیے زیادہ مناسب رہے گی۔

ایک دن تو حد ہی ہو گئی۔ ہم لوگ شام کی چائے پی رہے تھے۔ باہر برف باری ہو رہی تھی۔ کچھ ناموں کا ذکر تھا۔ بھائی جان کو راشن نام زیادہ پسند تھا اور مجھے نازی۔ پتہ نہیں شہاب کو کیا سوجھی، ایک دم بولا: "مجھے تو راشن پسند ہے۔ اس کا مطلب نام سے تھا مگر وہ اس انداز سے کچھ ایسا ہوا کہ خود ہی منہ سیٹ گیا اور کہنے لگا "وہ میں سمجھ رہا ... میرا مطلب ہے اس کے معنی بڑے اچھے ہیں۔ ..... یعنی مانگ ..." میں نے بات سنبھالی۔ بھائی جان نے بھی موضوع بدلنے کے لیے جھٹ اُلٹے سیدھے معنی گنوانے شروع کر دیے مگر اتنی دیر میں رامی کا چہرہ پسینوں سے تر ہو چکا تھا۔ کسی لڑکی کا اتنا سرخ چہرہ میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ کسی بہانے اُٹھ کر چلی گئی۔ شہاب کی آنکھیں شرمندگی کے مارے زمین میں گڑی جا رہی تھیں۔ بہت ہی بے تکا سا ماحول ہو گیا۔ اس کے بعد جتنی بار بھی میرا رامی سے سامنا ہوا مجھے یہی آواز گونجتی معلوم ہوئی کہ "مجھے تو راشن پسند ہے۔ مجھے تو رامی ......"

ہماری واپسی کے دن قریب آ رہے تھے۔ برفباری زوروں پر ہو رہی تھی۔ دیپالی، جنوری کو نئے سال کی خوشی میں ماموں جان نے بڑی شاندار پارٹی دی۔ بہت سے لوگ آئے۔ ان میں کئی نوجوان رامی اور نازی کے امیدوار بھی تھے۔ اس دن ان دونوں بہنوں نے خلاف عادت شوخ رنگ کی ساڑیاں پہنی تھیں اور لپ اسٹک بھی لگائی ہوئی تھی۔ کسی بات پر رامی کو بے بی پر بے ساختہ پیار آ گیا۔ اس نے فضا سے گود میں اٹھا کر چوم لیا لیکن جونہی بے بی کو گود سے اتارا میں نے دیکھا کہ رامی کے ہونٹوں کے نقوش بے بی کی پیشانی پر بن گئے ہیں۔ اس نے بھی دیکھا اور شرمندہ سی ہو کر بولی "اوہ معاف کیجئے گا۔" میں نے بے بی کا منہ گندا کر دیا۔ مجھے خیال نہیں رہا کہ ......"

کرامات تھیں۔ میں ششدر رہ گیا۔

مجھے یہ تو معلوم تھا کہ [illegible] اس نے بہت کچھ لکھا [illegible] اس وقت وہ بڑی [illegible] سے

ہو گئی [illegible] تھا۔ ہم سب MUSICAL CHAIRS کھیلنے لگے۔ ایک بچی [illegible] سے بچ گئی [illegible]

بیمار [illegible] کھیل [illegible] رہے تھے۔ میں [illegible] کے پاس [illegible] سے

[illegible] جانی [illegible] اس کی [illegible] گئی اور میرے پاؤں [illegible] ہو گئے۔ میں نے دیکھا کہ شہاب سے [illegible]

بیماری [illegible] سے [illegible] حال [illegible] اس کی [illegible] رہی تھی۔ [illegible] سے [illegible] آئی۔ اس [illegible]

وہ ہر [illegible] دن بھر [illegible] آتے رہتے تھے [illegible] سکتے۔ [illegible] سے پڑھ رہی تھی۔ چلتے وقت نازی نے

مجھ سے فرمائش کی کہ [illegible] کے گھر کی تصویر بنا کر بھیجیں اور اس میں [illegible] ایک [illegible]۔ میں نے وعدہ کر لیا کہ [illegible]۔

[illegible] اچھا لگتا [illegible] ایسے لگتا تھا جیسے شہاب اپنا [illegible] جگہ پر [illegible] آیا ہو۔ وہ بظاہر بڑا خوش تھا مگر اس کی

[illegible] اس کے [illegible] سب [illegible] تھے۔ [illegible] کے [illegible] پر وہ [illegible] لیا۔ مجھے یقین ہے وہ دوبارہ [illegible] کر [illegible] ہوگا۔

ہم گھر پہنچے تو دیکھا اس کا خط آیا [illegible] ہے میں نے جلدی سے اس کا جواب لکھا۔ [illegible] شکر [illegible] کر دیا۔ [illegible] کا [illegible] تھا۔ اس

[illegible] اور زندگی اپنے پرانے ڈھب پر چلنے لگی۔

ایک دن میں [illegible] کر رہی [illegible] پڑھ رہی تھی کہ بے بی کا [illegible] بولی اندر گھسی۔

ڈولی [illegible] دن ڈولن کی

مامی اچھی صورت کی

وہ ساتھ ساتھ گایاں بجاتی جا رہی تھی۔ مجھے [illegible] سی لگی۔ پاس بلا کر پوچھا: تمہاری اچھی صورت والی مامی اس وقت کیا کر رہی

ہیں؟ میرا مطلب بھابی جان سے تھا۔

وہ بولی: "یہاں [illegible] ہیں۔"

میں نے کہا: "اوپر ہوں گی نا۔ تم اوپر ہی سے تو آ رہی ہو۔"

بولی: "واہ! وہ [illegible] میں ہیں۔"

میں اچھل پڑی۔ یا اللہ، یہ چار سال کی بچی نے کیسے کہہ دیا۔ کیا قدرت نے اتنی سی بچی کے دل میں بھی یہ بات ڈال دی ہے

شہاب صاحب [illegible] کی شرارت ہے؟ بڑا پاپی [illegible] ہے۔ مجھے [illegible] کے [illegible] سب دن یاد آ گئے خاص طور پر وہ [illegible] والی

شام۔ اس کے بعد مجھے نازی کی فرمائش یاد آئی۔ اس شام میں اس گھر کی تصویر بناتی رہی اور کچھ سوچتی رہی۔

دن گزرتے رہے۔ [illegible] کے دن آ چلے تھے۔ [illegible] شروع ہو چکی تھی۔ شہاب کا خط کبھی کبھی آ جاتا تھا البتہ ان کے

[illegible] پابندی سے مل رہے تھے۔ ستمبر ختم ہونے والا تھا۔ شاید ۲۹ تاریخ تھی۔ اس [illegible] دن مجھے ایک خط ملا۔ یہ نازی کا تھا۔ شہاب [illegible]

نے [illegible] سے [illegible]۔ [illegible] سے ماموں جان نے لکھا تھا کہ مامی کی کسی [illegible] سے منگنی ہو رہی ہے۔ ہم سب کو شرکت کی دعوت دی تھی۔

مجھ پر تو جیسے بجلی ہی آن گری۔ میں [illegible] ہی رہ گئی۔ [illegible] گئی۔ بھابی جان کو خط دکھایا۔ [illegible] کر بولیں: [illegible] کیا ہوا۔ دوسری [illegible]؟

"بھلا پہلا نیا ہی ہے۔" مجھے ہنسی بھی اور غصہ بھی۔ رانی بھابی جان پر غصہ آگیا۔ مگر ان بیچاری کا کیا قصور۔ ... [illegible]
تھا۔ نہیں شہاب کے دل کی بات کسی نے نہیں جانی تھی اس لیے میں چپ رہی اور اپنے کمرے میں آگئی ... [illegible]
کے بعد سے اندر کہیں گھٹ کے رہ گئے۔ امی جان نے بھی کہا تھا کہ انہیں شہاب سے ایک دوست سا لگاؤ ہو گیا ہے۔
اس کے بہت دنوں بعد تک شہاب کا کوئی خط نہیں آیا۔ میں انتظار ہی کرتی رہی۔ وہ چھٹیاں گزارنے چلے گئے
کی چھٹیاں شروع ہو گئیں۔ میں نے شہاب کو لکھا کہ وہ چھٹیاں ہمارے ساتھ گزارے۔ اس کا جواب آیا کہ میں ... [illegible]
لکھا تھا کہ وہ اس سال بھی برف باری دیکھنا چاہتا ہے گلمرگ جائے گا۔ مجھے بھی ساتھ چلنے کی دعوت دی تھی مگر میرا بالکل ارادہ نہیں تھا ... [illegible]
سے ملنا نہیں چاہتی تھی لیکن شہاب کہتا ہے کہ کس کی چلتی ہے۔ وہ خود مجھے لینے آ گیا اور بہت اصرار کیا تو میں مان گئی۔ ... [illegible]
پہلے ہی رانی بھابی نے پروگرام بنا چکے تھے اس لیے وہ ہمارے ساتھ ہی جا رہے تھے۔

پھر سے ایک سال بعد انہی دنوں میں ہم گلمرگ تھے۔ امی جان نے بڑے جوش سے ہمارا استقبال کیا۔ بہت ہی ... [illegible]
شیشے سے گلمرگ کے راستے میں بھی شکایتیں کرتے رہے کہ رانی کی منگنی میں کیوں نہیں آئے۔ مجھے رانی کو دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ مجھے
یقین سا تھا کہ صرف اپنے حجاب کی وجہ سے وہ شہاب کی محبت کا اعتراف نہ کر سکی ہوگی اور اب شہاب سے مل کر کہیں وہ تڑپ نہ جائے
کچھ ایسا ہی اندیشہ خود شہاب کو بھی تھا۔ ہم جب وہاں پہنچے اور ٹیلے پر چڑھ رہے تھے تو شہاب کی گردن جھکی ہوئی تھی شاید وہ انہی خیالات کی وجہ
سے۔ وہ سوچ رہا ہوگا کہ رانی اسے دیکھ کر کسی بہانے دوپٹہ کا پلو آنکھوں پہ رکھ لے گی۔ اس کی مسکراہٹ میں اداسی کی جھلک ہوگی۔
اس کا لباس سادہ ہوگا۔ اس کی انگلی میں کوئی انگوٹھی نہ ہوگی ...... کوئی نہیں ...... خاص طور پر اسے وہ منگنی کی انگوٹھی تو سخت ناپسند ہوگی
لیکن جب چڑھائی ختم ہوئی اور ہم ان سفیدوں کے پاس سے ہو کر برآمدے میں پہنچے تو وہاں دو لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ ... [illegible]
جس ستون سے رانی لگی کھڑی تھی اس پر سرخ پھولوں کی بیل چڑھی ہوئی تھی۔ خود رانی نے سرخ رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ کاجل کی ... [illegible]
اس کی آنکھوں کی چمک کے سامنے ماند پڑی ہوئی تھیں۔ اس کی تیسری انگلی میں ایک بڑا سا ہیرا جگمگا رہا تھا۔ بڑے انداز سے اس نے وہ
ہاتھ اٹھایا اور مسکرا کر سلام کیا۔ کمرے میں دھوپ کی چمک ہیرا انگوٹھی سے شعاعیں پھوٹیں۔ جب ہم اندر بیٹھے باتیں کر رہے تھے تو پتہ چلا
کہ آج شام رانی کے منگیتر کی دعوت ہے۔ نازی نے کہا "چلئے آج ہم آپ کا ان سے بھی تعارف کرا دیں گے۔"

شام ہوئی تو شہاب چپکے سے کہیں نکل گیا۔ کیپٹن آیا۔ وہ واقعی بڑا خوبصورت نوجوان تھا۔ بالکل ... [illegible] لیکن کسی بات میں
شہاب کا پاسنگ بھی نہیں یا شاید یہ صرف میرا خیال تھا۔ شاید شہاب کو میں دیکھی آنکھ میرے سینے میں بیدار ہو رہی تھی۔ رانی ساڑھی کے پلو سے
سر ڈھانپے شرمائی ہوئی بیٹھی تھی کیپٹن کے مذاق پر چپکے چپکے ہنس رہی تھی۔ کتنی خوش نظر آ رہی تھی وہ۔ میرا دل چاہا اس کی آنکھوں میں جھانک کر
دیکھوں کیا اس کی روح بھی یونہی ہنس رہی ہے؟ کیا اسے واقعی کیپٹن بہت پسند آیا ہے یا یہ سب کچھ بے وجہ ہو رہا ہے۔ فریب! دھوکا
اپنے آپ کو، اپنی بہن کو، کیپٹن کو، مجھ کو، شہاب کو، خود اپنے آپ کو! وہ جان بوجھ کر دھوکا کھا رہی ہے۔ اس کی روح بیتاب ہے اس
کے اندر کوئی چیز ٹوٹے جا رہی ہے۔ وہ رونا چاہتی ہے مگر ہنس رہی ہے ـــــ کیوں؟ صرف اس لیے کہ اب عقلمندی کا تقاضا یہی
ہے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکنا چاہا مگر وہ جھکی ہوئی تھیں۔ میرا دل چاہا میں اسے مجبور کر کے پوچھوں "کیا تم واقعی خوش ہو؟ سچ بتاؤ ...
دیکھو تمہیں میری قسم سچ سچ بتا دو۔"

[illegible] کمبل [illegible]
[illegible] ... [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] ... [illegible]
پھر [illegible] گئے ——— [illegible] محبت نہیں شوہر کی [illegible]

میں کمرے [illegible] روز [illegible] کوشش کے باوجود [illegible] جانے [illegible] کمبل نے [illegible] بالکل نہیں۔ پھر [illegible] احساس ہوا [illegible] گھر [illegible]۔ میں کمرے سے باہر نکلنے لگی [illegible]۔ مجھے اب [illegible] کھانے پر شہاب کو [illegible] بلانے خود چلا گیا [illegible] کہاں [illegible] نانی بولیں [illegible] باہر [illegible] وہاں [illegible] کے پاس بیٹھے [illegible] میں نے دیکھا تھا [illegible] مسکراہٹ چھپانے [illegible]۔ میری جان [illegible] میں کیا [illegible]۔ نانی جان بولے "وہاں [illegible] کیا کر رہا ہے؟" میں نے جلدی سے جواب دیا۔ وقت ہی کچھ اتنا [illegible] یہ بات [illegible] نانی ڈوبتے ہوئے سورج اور [illegible] آسمان کو دیکھ کر بس ذرا سا مسکرا دیں۔ بیوقوف!

تھوڑی دیر بعد شہاب آگیا۔ اُف خدا! اس کا [illegible] چہرہ کیسی [illegible] چھوڑ دے۔ [illegible] گئی۔ اس نے کھانا بھی ٹھیک سے نہ کھایا۔ وہ بہت ہی خاموش تھا۔ اتنی شدت کا احساس میں نے پہلی بار اسے دیکھا تھا۔ ایسا لگتا تھا کوئی دھیرے سے اس کی پلکوں کو اگر چھو دے گا تو ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگیں گے۔ اس کی شکل بڑی کسیلی ہو رہی تھی۔

خدا خدا کر کے وہ وقت گذرا اور جب دوسری صبح طلوع ہوئی تو میں حیران ہی رہ گئی۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آتا تھا۔ شہاب کی آنکھیں اگرچہ رات بھر جاگنے کی وجہ سے سوجی ہوئی تھیں مگر وہ اب رات والا شہاب نہ رہا تھا۔ وہ رات بھر میں بالکل بدل گیا تھا۔ وہ اپنی پرانی عادت پر لوٹ آیا تھا۔ بات بات پر اس کی وہی چہلیں تھیں۔ گھر میں وہی اودھم بازی پھر سے شروع ہو گئی۔ کس قسم کا انسان ہے یہ۔ میں سوچتی رہی۔ رات بھر میں اس نے جانے کیا سوچا کیا سمجھا ——— اس کی باتوں میں وہ پہلے جیسی شوخی کہاں سے آگئی اس کے قہقہوں میں کس چیز کی جھنکار سمٹ آئی ہے۔ وہ کیوں اتنا خوش دکھائی دے رہا ہے۔ کیا وہ نہیں دیکھ رہا کہ اس کی [illegible] سے [illegible] ہو گئی ہے؟ کیا اسے اب اس کا رنج نہیں؟ کیا پہلی محبت آخری نہیں ہوتی؟ آخر باتوں ہی باتوں میں میرے منہ سے نکل گیا "شہاب آخر تمہیں آج ہو کیا گیا ہے؟ کیا رات کوئی خواب دیکھ لیا جس کی تعبیر میں تمہارے چہرے پہ چمک لگ گئے؟"

بولا "خواب؟ نہیں تو۔ خواب تو میں دکھاؤں گا اب۔"

میرے منہ سے بے ساختہ نکلا "کس کو؟" اس نے پہلے دادی اور بھابی [illegible] کو دیکھا [illegible] نظریں جھک گئیں۔ جانے کیوں؟ میں کچھ بھی کچھ نہیں سمجھی۔ بس اتنا ضرور دیکھا کہ نانی کی نگاہوں میں اسی وقت خلوص کی دھیمی دھیمی خوشبو سی پھوٹنے لگیں۔ وہ کچھ ایسی لڑکی کی [illegible] جو [illegible] نہ جانتے ہوئے بھی عبادت کرکے خوش ہونا چاہتی ہو۔ شہاب نے میرے سوال کا مختصر سا جواب دیا [illegible]

کیا مطلب ہوا اس کا، یہ میں آج تک نہیں سمجھ سکی۔

شہاب کا موڈ اس شام ایسا تھا کہ وہ بے بات کے ہی ہنسے جا رہا تھا۔ پاگلوں کی طرح بے تحاشا ہنس رہا تھا۔ سب گانے کی فرمائش کر رہے تھے۔ بہت اصرار پر وہ مانا اور پھر اس نے ایک غزل سنائی۔ یہ غزل میں شاید کبھی نہ بھول سکوں گی۔ بہت کچھ دکھ بھرے تھے ہر لفظ میں۔ یہ نہ تھا کہ ایسے دکھ بھرے بولوں میں وہ غزل سنا سکے گا لیکن جب اس نے گانا شروع کیا تو ایسا لگا کہ دنیا جہان کا دکھ سمٹ کر اس کے گلے میں آ گیا ہے۔ سوز سے اس کی آواز بھاری ہوتی جاتی تھی۔ سب خاموش تھے۔ میرا دل چاہا میں اسے منع کر دوں کہ "یہ غزل مت گاؤ شہاب! خدا کے واسطے چپ ہو جاؤ۔ صبر کرو شہاب اب چپ ہو جاؤ" مگر اس کو مست دیکھ کر میں خاموش رہی۔ وہ کھویا ہوا تھا اور گا رہا تھا۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ اگر یہ یونہی گاتا رہا تو اس کے دل کے تمام آبلے منظر عام پر آ جائیں گے۔ انہی آبلوں کو چھپانے ہی کے لیے تو وہ بظاہر اتنا خوش بنا ہوا تھا۔ اس نے ٹھان لیا تھا کہ ان آبلوں کو چھپائے چھپائے پھرے گا۔ کسی کو خبر نہیں ہونے دے گا کہ ان ہنستی ہوئی آنکھوں کے پیچھے کیسے کیسے طوفان اٹھ چکے ہیں اور اٹھا کرتے ہیں مگر اس وقت وہ خواہ مخواہ جذباتی ہونے لگا۔ وہ بہت اداس تھا ۔ ۔ میرا دل چاہا اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دوں۔ سب کے کانوں میں انگلیاں دے دوں۔ اس کے ذہن سے غزل کے الفاظ چرا لوں۔ میں پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ آخر میں نے اس کے ساتھ گانا شروع کر دیا۔

لٹی چلے بن کوئلا ہو گئے کوئلا جلے بن راکھ
ہم پاپی کچھ ایسے جلے کوئلا بنے نہ راکھ

اس شعر پر وہ ایک دم رک گیا۔ شاید اسے احساس ہو گیا کہ وہ کوئی غلطی کر رہا ہے۔ جذبات کی رو میں جانے کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے۔ وہ نازی کی طرف دیکھنے لگا جو آتشدان میں جلتی ہوئی آگ کو گھور گھور کر دیکھ رہی تھی۔ آگ کی تپش سے اس کے گال تپ رہے تھے۔ شہاب اب سنبھل چکا تھا۔ بولا،

"آپا! تم نے نازی کی فرمائش بھی پوری کی یا نہیں۔ وہ تصویر والی؟"

میں نے جواب دیا "ہاں بھئی بن گئی ہے مگر میں لانا بھول گئی۔"

شہاب بولا "کوئی بات نہیں نازی۔ میں اگلے ہفتہ پھر کوئٹہ آؤں گا تب لے آؤں گا۔" اور نازی اسے مشکور نظروں سے دیکھنے لگی۔ جذبات کو ان سے تاثرات چھپانے کے لیے رانی نے منہ پھیر لیا۔

دوسری شام بے وجہ ہی اداسی پھیلی جا رہی تھی۔ میں نے جب یہ بات کہی تو شہاب بولا "اس کی روک تھام یہی ہے چلیے سب پکچر دیکھنے چلتے ہیں۔"

میں نے جان کر بہانہ بنا دیا کیونکہ میں جانا نہیں چاہتی تھی۔ رانی نے کہا کہ اس کے سر میں شدت کا درد ہے۔ کیا واقعی اس کے سر میں درد تھا؟ نازی اور شہاب پکچر دیکھنے چلے گئے۔ اس دن نازی نے آتشی رنگ کی ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ بہت ہی پیاری لگ رہی تھی۔ میرا دل چاہا یہ اور بھی زیادہ پیاری لگے اور میں شہاب سے کہوں "دیکھو شہاب نازی کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھو ان میں دن بدن کیا ہوتا جا رہا ہے۔"

دوسرے دن ہم لوگ تاش کھیل رہے تھے۔ میں نے جھٹ رانی کو پارٹنر بنا لیا۔ مجبوراً نازی اور شہاب پارٹنر بنے۔ وہ

روز ضعیف سی تھی غزل پڑھتے رہتے ہیں سب پاکستان سے متعلق ہوتی اگر۔ سب ہم دے جوالا تھی میں نے بہت
کیا مگر وہ رونے بیٹھی گئی۔ آخر میں نے اسے تماشا شروع کر دیا۔ "غزل، جو ایک آنسو کا سب بھی" شکر کرتے ادب و رہنے لگی
شہاب بولے: "آپا! آنسو بہا آسان کام ہے ہمیں پتا ہے عمل۔"
میں نے چونک کر شہاب کی طرف دیکھا۔
تیسرے دن ہم لوگ لینے گئے پر شتے ہاتھ نانی شہاب اور میں۔ ایک دکان پر ایک لڑکی نانی کو دیکھ کر شہاب نے
کہا: "نانی پیشانی ہے"۔ وہ تو وہ نانی نے بغیر جواب دیے پیسے کر کے نانی دلادی۔ اگلی دکان سے اس نے ایک جوتا خرید کر
نانی کو دے کر بولا: "لو یہ تم پہن لو ——— نانا یا ہمیں احسان کسی کا نہیں لیتا۔"
مجھے شہاب کی اس ہیرا پھیری چالاکی پر بہت ہنسی آئی۔ کچھ نہیں کہ وہ ورنہ بہانہ تو کر کے کوئی چیز اور دے کر اس سے بچا
دے رہا تھا ——— لیکن اس نے نانا اور میرے سامنے ایسا احسان کر کیوں کیا ———؟
پورے نو دن بعد ہم لوگ واپس آ رہے تھے۔ رخصت کے وقت نانی کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔ جب
چلی تو میں نے دیکھا کہ شہاب رو رہا تھا۔ میں نے پیار سے اس سے پوچھا: "کیوں رو رہے ہو شہاب؟ مگر وہ تو بڑی برائی تم نے شیشے
پہ نانی کو دیکھا تھا آپا؟ اس سے میری پیاری جیسی شاید بن رکھی تھی آپا!"
"ہاں شہاب!" میں نے جواب دیا۔
"اور وہ چاندی کی بالیاں بھی پہنے جو اسے دلوائی تھیں اماں پاؤں چھلا بھی تو ...... "اس کا گلا رندھا ہوا تھا۔
"ہاں ہاں شہاب میں نے دیکھا تھا ——— اس کے جوڑے میں تمہارے پسندیدہ پھولوں کا گجرا بھی تو تھا۔" خوشی سے
میرا سانس پھولنے لگا۔ اب شہاب کا علاج آسان تھا۔ وہ رو رہا ہے شاید جدائی کا صدمہ ہو گا۔ خیر اب میں کچھ ایسا کروں گی
کہ یہ کبھی جدا نہ ہوں۔ پھر میرا شہاب کبھی نہیں روئے گا۔ میں نے اس کے آنسو پونچھ ڈالے۔ "ہاں شہاب! اسے تمہارا بہت خیال
ہے۔ وہ تمہارے تحفے بڑے سنبھال سنبھال کر رکھتی ہے۔ خاص خاص موقعوں پر پہنتی ہے۔ تمہارے ساتھ جانے پر کبھی انکار
نہیں کرتی اور ......"
"بس بس آپا یہ سب نہ کہو۔"
"پھر رو کیوں رہے ہو پگلے؟"
"اس لیے نہیں کہ مجھے اس سے محبت ہے۔ اس لیے نہیں کہ ہم جدا ہو رہے ہیں بلکہ اس لیے کہ مجھے اس سے کوئی
دلچسپی نہیں ہے آپا ——— قسم خدا کی آپا۔ یہ سب تحفے میں نے فریب دینے کے لیے دیے تھے۔ میں سب کو فریب دے رہا تھا
خاص کر راحی کو۔"
میرا دل دھک سے رہ گیا۔ ایسا لگا جیسے کسی نے میرے منہ پر طمانچہ مار کر مجھے اونچائی سے دھکیل دیا ہو۔ "کیا بکتے ہو
شہاب؟ کیا تمہیں نانی اچھی نہیں لگتی؟" میں نرمی سے بولی۔
"نہیں بالکل نہیں۔" وہ دھیرے سے بولا۔

میرا دل چاہا میں اس کے بال نوچ لوں، اس کا منہ نوچ لوں کہ معصوم ظالم رہا۔ مگر جب میں وہاں سے شاہی کی طرف گئی تو میں چیخ گئی اور صرف اتنا کہہ سکی۔

—شہاب! یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔ تم نے بہت برا کیا، بہت برا کیا۔ سوچو تو! اس بچاری بچی کو ــــــ تم نے اس کو نہیں ستانا، کر کبھی ... کر رہا ہے۔ نازی بیچاری کا کیا قصور، وہ نادان کھیلنے کی عمر ہے اس کی، کیا سمجھتی شہاب۔ آخر کچھ تو سوچو......"

بولا: تو پھر بلا کیا کرتا؟" یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر بچوں کی طرح رونے لگا۔

ٹھیک ہی تو کہتا تھا۔ میں اسے بچوں کی طرح سینے سے لگا کر پیار کرنے لگی۔ واقعی ٹھیک ہی تو کہتا تھا وہ، تو پھر اور کیا کرتا؟ پھر اور کیا کرتا؟" مجھے ایسا لگا شریر سی کوئی گڑیا ہنسے ہی کوئی گا رہا ہے۔ "یہ بہت کیسے رکھ ہوئے؟ کیا یہ شہاب گا رہا تھا، کیا یہ ساری گا رہی تھی، وہ کیا یہ نازی گا رہی تھی؟

آپا

محمد طفیل

میں ابھی شہر پہنچا ہی تھا کہ ایک تانگہ آ کر رکا۔ اس پر سے ایک نے باہر کو جھانکا، پوچھا: "طفیل صاحب ہیں؟"

دفتر کے چپراسی نے جواب دیا: "جی ہیں"

اس نے جا کر تانگے میں بیٹھی ہوئی خواتین سے کہا: "جی ہیں"

ان میں سے ایک صاحبہ نے کہا: "بلاؤ"

وہ ہنسنے لگا کہا: "بلایا جاتا ہے"

میں نے کہا: "عرض کر دیجئے خود ہی تشریف لائیں"

چنانچہ تانگے پر سے دو مستورات اتریں۔ ایک برقعہ میں تھیں اور ایک بغیر برقعہ کے۔ بے پردہ خاتون نے تعارف کرایا: "میں شکیلہ ہوں"

"آپا شاہ ـــــ اور بڑی حیرت سے ہاتھ بڑھا کر مصافحہ کیا۔ حالانکہ پردہ دار خاتون سے مصافحہ کرنا عجیب تھا۔ مگر میں نہ جانے یوں کرنے پر کیوں مجبور ہوا۔

شکیلہ نے تعارف کرایا: "یہ شملہ کی سیل رضیہ ہیں"

شکیلہ کون ہیں۔ پہلے یہ بتا دوں، پھر آگے چلوں ـــــ شکیلہ میری منہ بولی بہن ہیں اور مشہور افسانہ نویس۔ برسوں سے ہم تھے مگر آمنا سامنا پہلی بار ہوا۔

اب شکوے: "آپ وقت مقررہ پر پاکستان کیوں نہیں پہنچیں جو تاریخ آپ نے لکھی تھی۔ اس دن میں اسٹیشن پر گیا تھا تاکہ کسٹم وغیرہ کے چکر میں آپ کو زیادہ پریشان نہ ہونا پڑے۔ مگر آپ نہ آئیں۔ آج آئیں بھی تو بغیر اطلاع کے۔"

"میں چاہتی تھی کہ بغیر اطلاع کے پہنچوں۔"

"آخر کیوں؟"

"اچانک ملاقات پر زیادہ خوشی ہوتی ہے نا!"

"ہوتی ہوگی ـــــ" یہ تھا شکیلہ کی سادگی کا پہلا اور جو خطا گیا۔ میں نے سوچا اگر شکیلہ مجھے بتا کر آتیں، اسٹیشن پر ملتیں تو شاید بھائی اپنی بہن سے ملنے کا حق ادا کر سکتا۔ مگر اس وقت میں چپ ہی رہ گیا۔

رضیہ کہنے لگیں "ہم آپ کا مکان ڈھونڈ ڈھونڈ کے تھک گئی ہیں۔ بہت سے ڈھونڈ رہے ہیں لیکن کسی کو ٹھیک ٹھیک پتہ نہیں کہ آپ کہاں رہتے ہیں۔"

"ٹیلیفون کر دیا ہوتا۔"

"وہ بھی کیا تھا۔ کوئی صاحب بولے کہ جمیل صاحب بھی آئے ہی ہیں۔ رہتے تو یہیں ہیں جہاں سے آپ بول رہی ہیں۔ —— مجبوراً دفتر آئی ہیں۔"

"اچھا تو پھر چلیے گھر۔"

چنانچہ ہم تانگہ پر گھر کی طرف چلے۔ راستے میں شکیلہ نے بتایا۔ رضیہ کہتی تھیں۔ تمہارا بھائی خوب ہے گھر کا جو پتہ بتایا وہاں تو وہ رہتے نہیں۔ اس لیے واپس چلو۔"

میں نے ہنس کر کہا "یہ رضیہ کا اندازہ غلط نہیں۔"

گھر کے پاس آ کر میں نے تانگہ رکوایا تو رضیہ اور شکیلہ کے منہ سے مارے حیرت کے یک ساتھ نکلا "ارے۔"

"کیا بات ہے؟"

"یہیں گھر سے ہو کر ہم نے آپ کا پوچھا تھا۔ مگر کسی نے بتایا ہی نہیں۔ یہ جو آپ کے مکان کی بغل میں ڈاکٹر صاحب ہیں۔ یہ تو کہتے تھے یہ جمیل صاحب دوسرے دروازے میں رہتے ہیں۔"

"اچھا۔"

"جی ہاں۔"

"قصہ یہ ہے۔ میں کسی سے بولتا نہیں ہوں۔ شام آیا۔ صبح چلا گیا۔ یہ سب لوگ مجھے صورتاً جانتے ہیں مگر کسی کو یہ معلوم نہیں۔ میں کون ہوں۔ کیا کرتا ہوں۔ کیا نام ہے۔"

شکیلہ نے کہا "آپ نے اپنے نام کی تختی ہی لگائی ہوتی۔"

"یہ سمجھ کے نہیں لگائی۔ اس سے ذرا شان ٹپکتی ہے اور میں اسے پسند نہیں کرتا۔"

"شان ٹپکتی ہے تو ٹپکے۔ ہم ایسے لوگوں کا تو برا حال نہ ہو۔"

سامان اوپر آیا۔ شکیلہ نے ایک دم گھوم کر سارے کمرے دیکھ ڈالے۔ بڑی اترا کر رضیہ سے کہہ رہی تھیں۔ میرے بھائی کے پاس دو دو ڈیڑھ سیٹ ہیں۔ دو صوفہ سیٹ ہیں۔ یہ دیکھو الماری کتنی خوبصورت ہے۔ تصویریں دیکھو کتنی شاندار ہیں۔ غالباً یہ چغتائی کی ہے۔ غرض شکیلہ رضیہ سے بڑی شان میں باتیں کر رہی تھیں کہ میرا بھائی یہ ہے اور میرا بھائی وہ ہے اور رضیہ میں نہ مانوں۔ میں نہ مانوں کی تفسیر بنی شکیلہ کو چھیڑ رہی تھیں۔

میں نے اندازہ لگایا۔ شکیلہ میں اتنی معصومیت ہے کہ بالکل بچی معلوم ہوتی ہے۔

شکیلہ بڑی گپ باز ہیں۔ اتنی کہ میں نے اپنی زندگی میں اتنی گپ باز خاتون کوئی نہیں دیکھی۔ مردوں میں بھی کوئی نہ دیکھا۔ یہ گھنٹوں ہی بول سکتی ہیں۔ ایک بات ماننی پڑتی ہے کہ ان کی باتیں بور قسم کی نہیں ہوتیں۔ بلاوجہ ہی بولا کرتی ہیں۔ جس میں خلوص، معصومیت اور بیوقوفی سبھی کچھ شامل ہوتا ہے۔ اگر خلوص، معصومیت اور بیوقوفی (وہ آدمی شریف ہی نہیں جو بقدر ضرورت بیوقوف نہ ہو) میں سے ایک چیز

جو کچھ بھی تو شکیلہ کی باتوں میں تین دل کشی نہ ہوتی جو ہم سب چاہتے

اب بھی جب کبھی شکیلہ یہاں رہنے آتی ہیں، ان کی صحبت بہت اچھی لگتی ہے۔ جب ملتی ہیں، مجھ سے پیار سے پوچھتی ہیں
بھلا کر شکیلہ پوچھتیں "تم خوش تو ہو؟"

"ہاں ہوں"

"میں جانتی تھی۔ یہی تھی"

"بس یہی تو کہہ رہی تھی"

"میری باتیں جو سنتے ہو، وہ میرے پاس آ کر ہولے میں نہیں کہتے کہ یہ اتنی نصیحت کی باتیں ہیں تو کیوں وقت کو ضائع کرتے رہتے ہو۔ کیا میری باتیں تمہیں بری لگتی ہیں؟"

"نہیں تو، نہیں۔ بالکل نہیں"

ایک بار انھوں نے میری اس حرکت پر اپنی باتوں کا سلسلہ منقطع کر دیا اور میرے گال پر ہلکی سی چٹکی لے کر شکیلہ سے کہنے لگیں۔
"تم نے محسوس کیا۔ جیسے اس کی آنکھیں ایک ساتھ روشن ہو گئے ہوں۔"

ایک دن میں خود کو باغ میں اکیلی پاکر کچھ سوچ رہی تھی۔ کبھی کبھی باتیں سنیں۔ عجیب باتیں تھیں وہ، میری بیوی سے کہہ رہی تھیں۔ "تمھاری بھی بڑا مزا ہے"

"ہوگا۔ میں اس مزے سے ناآشنا ہوں"

"ارے اتنے بڑے مزے ہیں"

"اچھا"

"تو بھی چوری کیا کر"

"جب سب کچھ خود ہی مل جاتا ہے تو میں کیوں چوری کروں"

"مطلب ہزار روپیہ اپنے ہاتھ سے دے دے مگر اس کی ایک کمی چرانے میں ہزار روپوں سے زیادہ کا لطف ہے"

"یہ بات ہے تو میں بھی چرایا کروں گی"

"ہاں ہاں ضرور"

"اختر صاحب کو میری چوریوں کا سب علم ہے۔ وہ مجھ سے چھپا چھپا کے روپے رکھتے ہیں۔ تنخواہ لا کر تو مجھی کو دیتے ہیں۔ البتہ کتابوں کی رائلٹی یا امتحانوں کے پرچوں سے جتنا روپیہ آتا ہے۔ مجھ سے چھپا کر رکھتے ہیں۔ بسا اوقات ایسا ہوا۔ انھوں نے روپے رکھے ہم نے موقع پا کر چرا لیے۔ گھر میں شور مچ گیا۔ میرے روپے کس نے چرائے ہیں۔ میں انجان سی بن کر کہتی: پتہ نہیں کس کم بخت نے چرائے ہیں۔

ایک بار اختر صاحب کو پرچوں کی جانچ کا روپیہ آیا۔ فوراً ہی ان کے باہر جانے کا پروگرام بن گیا۔ انھوں نے نوٹ گن کر لفافے میں رکھ دیے اور لفافے کے اوپر لکھ دیا کہ اتنے روپے رکھے ہیں اور تالا بند کر کے چابی ساتھ لے گئے۔

میں نے ان کے جانے کے بعد تالے کو چابی لگوائی۔ دس دس کے تین نوٹ نکال مزے کرتی رہی۔ اختر صاحب واپس آئے

تو پھر شور مچ گیا۔ وہ پوچھ رہی تھیں کس نے چرائے ہیں۔ ہم نے حسبِ عادت کہہ دیا۔ ہمیں کیا خبر، آپ ہی بھول گئے ہوں گے۔" کہنے لگے "تو روز کہہ دیتی ہے کہ میں بھول جاتا ہوں۔ اب کے تو میں لفافے پہ لکھ کے گیا تھا کہ اتنے روپے ہیں۔ اب کے کیسے بھول گیا؟"

شامتِ اعمال میری بھی بھابھی آ نکلیں۔ اختر صاحب نے ان سے بھی پوچھا۔ میں کہتی تھی۔ یہ ذرا سی بچی ہے۔ اسے کیا خبر مگر صاحب! اُس نے توتلی زبان میں میری طرف اشارہ کرکے بتا ہی دیا چاچی نے چرائے ہیں۔"

اتنی ہی باتیں ہو پائی تھیں کہ میں شیو کرکے باتھ روم سے منہ میں گیا اور پوچھا: "کیا باتیں ہو رہی تھیں؟"

دونوں ہنس پڑیں اور ہنستی ہی چلی گئیں۔

شکیلہ کا بیٹا کوئی بچہ نہیں۔ اولاد کے غم نے بیچاری کو نڈھال کر رکھا ہے۔ بات بات پر رو دیتی ہیں۔ شکیلہ اپنی ذات میں اگر ایک طرف دلچسپیوں کا مرقع ہیں تو دوسری طرف غموں کی پوٹ بھی۔ آنسو ان کی خاطر کی کوئی ذرا سی بھی بات ہو جائے تو پھر گم ہی گم۔

شکیلہ اپنی زندگی سے بڑی بے زار ہیں اور ساتھ ہی اتنی بے احتیاط کہ مصیبتوں کو خود دعوت دیتی ہیں۔ دکھ بھی دکھ جو جیسے مالی نہیں، ذہنی دکھ۔ شادی کے فوراً بعد اختر صاحب بیمار ہو گئے تھے۔ بیماری بھی مہلک۔ اختر صاحب ہسپتال داخل ہوئے تو یہ بھی چوبیس گھنٹے وہاں موجود۔ ڈاکٹر منع کرتے تھے۔ مگر یہ نہ آتی تھیں۔ کہتی تھیں شوہر کے بعد خود جی کر کیا کروں گی۔ چنانچہ انھوں نے اپنی زندگی ختم کرنے کی ایک ترکیب سوچی وہ یہ کہ پاس کی چارپائی پر جو سب سے خطرناک مریضہ تھیں۔ ان کی تیمارداری میں دن رات جٹی رہتیں۔ اُس کے گلے میں بانہیں ڈال دیتیں، ساتھ لیٹ جاتیں۔ مریضہ حیران کہ لوگ مجھ سے دور بھاگتے ہیں۔ مگر یہ ہیں کہ یوں مجھ پہ قربان ہیں۔ بات ہی عجیب تھی۔ کہ موت کے کنارے سے لوٹنے والے لوگ صحت کو ترس رہے تھے اور جو صحت مند تھے۔ وہ موت چاہتے تھے۔

شکیلہ کو پھولوں کا بے حد شوق ہے۔ انھوں نے گھر پہ طرح طرح کے پھول لگا رکھے ہیں۔ دن رات ان کی دیکھ بھال کرتی رہتی ہیں اور خوش رہتی ہیں۔ انھیں اس حد تک پھول خبط ہو گیا ہے کہ اختر صاحب سے بھی بڑھ جاتی ہیں۔ وہ ضرور سوچتے ہوں گے کہ کسی بھی چیز سے اتنا پیار اچھا نہیں ہو سکتا۔

ایک دن ہم لارنس گارڈن گئے۔ بہار کے دن۔ پھول اپنے جوبن پر۔ شکیلہ انھیں دیکھ کر کھل اٹھیں۔ باغ کی اور پھولوں کی بے حد تعریف کرتی رہیں۔ گھومے جا رہی تھیں۔ ایک جگہ رک کر پوچھنے لگیں۔ "طفیل اس پھول کا نام بتاؤ!"

"مجھے کیا معلوم"

"اس کا یہ نام ہے"

"بھلا اس کا؟"

"بھئی مجھے کچھ پتہ نہیں"

"اچھا تو جناب نرے ایڈیٹر ہی ہیں"

جتنی دیر ہم باغ میں رہے۔ شکیلہ نے میرا ناک میں دم کر دیا۔ یہ پھول فلاں ہے۔ یہ پھول ہمارے ہاں بھی ہیں۔ ان پھولوں کی خوشبو بڑی اچھی ہوتی ہے۔ یہ پھول بڑا نازک ہوتا ہے۔ یہ پھول بہت کم ہوتے ہیں —— اخاہ یہ پھول کتنے خوبصورت

یہ بتایا تھا:

[illegible]

[illegible]

[illegible]

میں نے پوچھا: "آپ کو کوئی سی چیز پسند نہیں؟"

"ہے تو"

"کون سا؟"

"نیپے گڑیاں"

میں اتنے زور سے چلا کر ہنسی کہ پڑوسیوں کو سنائی بھی دی ہو گی۔

"بھئی ہنسے کیوں جا رہے ہو!"

"جیسے آپ چائے کہہ رہی ہیں۔ یہ دو تو ترکاریاں ہیں۔"

"اچھا"

اچھا سے ایک بات یاد آئی۔ شکیلہ آنٹی کو "کیا" اور "اچھا" سے بڑا لگاؤ ہے۔ "اچھا" کو یہ بات بات میں کھینچ کر بولتی ہیں اور بڑا کھینچ کے پڑھتے ہیں۔ بعض اوقات تو یہ شبہ ہوتا ہے جیسے یہ ترنم میں کچھ کہہ رہی ہوں۔

اب آپ ان کی گفتگو سنیں۔

"ہم جا رہے تھے ابھی ابھی تو طبیعت خراب تھی ہم جا۔ تھوڑی سی ہلکی پھلکی ہم جا۔ وہ پہیلی کا تا ابھی نہیں کھایا۔ ہم چا؟"

اب اس شعر کا دوسرا مصرعہ سنئے۔ جب یہ کسی کی گفتگو سنتی ہیں تو یوں سناتی ہیں: "اچھا" کے لفظ کو خوب کھینچ کے پڑھے گا۔

"اچھا" صرف ان کا ہے۔ باقی سب مخاطب کا۔

"میں صبح دفتر گیا۔ اوہ اچھا —— دیکھا تو فلاں دوست بیٹھا ہے۔ اوہ اچھا —— اس نے کہا بھئی ہمارا یہ کام جلدی کرادو۔ اوہ اچھا ——"

جب یہ خود بول رہی ہوں تو پھر کسی کی مجال نہیں کہ وہ بیچ میں بول سکے (کم از کم میری تو مجال نہیں) جب کوئی دوسرا بول رہا ہو۔ پھر بھی کسی کی مجال نہیں کہ وہ ہر فقرے کے بعد "اوہ اچھا" سنے بغیر آگے بڑھ سکے۔ انھیں باتیں سننے کا شوق ہے۔ باتیں کرنے کا شوق ہے۔ سنانے کا زیادہ، سننے کا کم، ادھر میں ایسا بد ذوق نہ سننے کا شوق نہ سنانے کا۔ میرا خیال ہے شکیلہ مجھ سے مل کر قطعاً خوش نہ ہوئی ہوں گی۔

ایک رات میرے چھوٹے بھائی کو یہ سوجھی کہ کل شکیلہ آپا چلی جائیں گی۔ اس لیے آج کی رات جاگ کر کاٹی جائے۔ پہلے بھی رات کو گیارہ بارہ بجے تک باتوں کا سلسلہ رہتا تھا۔ اس لیے میں نے ناک چڑھا دی۔

بھائی نے کہا: "تاش کا پروگرام رہے۔"

شکیلہ بولیں: "ہم جیا! طفیل آج تاش ہوگی"

"مجھے نہیں آتی (پھر شکیلہ ہی کے انداز میں ہنسنے کے ساتھ) ہم جی"

بہرحال دھر لیے گئے۔ بڑی بہن تھیں (شکیلہ مجھ سے سات برس بڑی ہیں) انکار نہ ہو سکا۔ بیٹھ گئے میں اور میاں بھائی پارٹنر، شکیلہ اور میری بھابی پارٹنر۔ خوب خوب ہاتھ ہوئے۔ شکیلہ کو یہ گھمنڈ تھا، میں عمدہ کھیلنے والی ہوں، اس لیے میرے مقابلے میں کوئی ٹک سکے گا۔ ادھر اپنی قسمت میں کسی بھی معاملے میں خدا نے ہار لکھی ہی نہیں۔ اس لیے مات ہوتی تو کیسے ہوتی۔

شکیلہ اور میری بھابی کا پیٹتے پیٹتے بُرا حال ہو گیا۔ بارہ بج گئے۔ ایک بج گیا۔ دو بج گئے۔ شکیلہ نے اپنی کارستانی دونوں پر شروع کر دی۔ میں جماہیوں پر جماہیاں لے رہا تھا۔ مگر ان بیٹھنے والی اللہ کی بندیوں نے مجھ پر ترس نہ کھایا۔ ہار کر میں نے بیگم کو آواز دی۔

"اے نیک بخت چائے بنا کر پلا دے"

"میں نہیں اٹھ سکتی"

"اری اٹھ جا جنت میں مکان ملے گا"

"مجھے نہیں چاہیے جنت میں مکان!"

"یہ دیکھ سو روپیہ انعام لے لے، اگر اس وقت اٹھ کر چائے بنا دے"

"مجھے نہیں چاہیے سو روپیہ"

شکیلہ بولیں۔ "اری کم بخت سو روپیہ مل رہا ہے۔ اٹھ کر جلدی سے چائے بنا دے۔ اگر طفیل مجھے دس روپے دینے کا وعدہ کریں تو ابھی اٹھ کر چائے بنا دوں"

خیر چائے دس روپے لینے والی نے بنائی، نہ سو روپیہ پانے والی نے، ہم کھیلتے رہے اور صبح تک کھیلتے رہے۔

شکیلہ کو کھانے پینے کی چیزوں سے قطعاً دلچسپی نہیں۔ ہزار نعمتیں ان کے سامنے رکھ دیجیے، قطعاً لطف اندوز نہ ہوں گی۔ کھائیں گی تو وہ بھی اتنا، جتنا کہ ایک برس کا بچہ، بغیر ڈکار لیے کھا لے۔

ایک دن یہ مجھ سے گویا ہوئیں: "طفیل آج بہت زیادہ کھا لیا ہے۔ کباب اچھے تھے۔ سالن مزے دار تھا"

"چلو اچھا ہوا آج آپ نے پیٹ بھر کے کھانا کھایا"

"بلکہ آج تو دو دن کا اکٹھا کھا لیا"

"آخر کتنا کھایا؟"

"بھئی ڈیڑھ چپاتی کھا گئی"

کھانے کا حال تو آپ نے سن لیا۔ اب ذرا چلنے پھرنے کا بھی حال سن لیں ــــ "آج ہم بہت پیدل چلے۔ بہت پیدل چلے۔ بس تھک گئے"

"آخر کے میل؟"

"بھئی ہم انارکلی کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک پیدل ہی تو چلتے چلے گئے"

[illegible] الگ رکھا جائے۔
[illegible]
[illegible] ہے۔ [illegible]
چاہتا ہے کہ [illegible] ہم سوچا ہی نہیں [illegible] کرے اس
میں [illegible] افسانہ نگاروں کے [illegible] ہے [illegible]
[illegible] عصمت [illegible]
[illegible] کسی کو بھی نصیب نہیں۔ مگر [illegible]
[illegible] عصمت، ہاجرہ اور خدیجہ۔"

میں نے پوچھا: "آپ نے جواب نہیں دیا۔"

"جی، پوچھئے کیا ہیں؟"

"نہ خواتین"

"ہاں وہ خواتین وہ تو ہیں۔ مگر افسانہ نگار نہیں ہیں۔"

"جس طرح آپ خاتون ہیں اور افسانہ نگار نہیں ہیں۔ اسی طرح باقی افسانہ نگار خواتین نے بھی نقادوں سے کہہ دیا ہے کہ ہم عورت ہیں، افسانہ نگار نہیں ہیں۔ اس لیے ہمارا تذکرہ افسانہ نگار خواتین کے ساتھ نہ کیا جائے۔"

"یہ بات ہے تو کیا عصمت، ہاجرہ اور خدیجہ نے نقادوں سے کہہ رکھا ہے کہ ہم افسانہ نگار ہیں؟"

"ہاں ہاں انھوں نے ضرور کہا ہوگا۔ ورنہ نقادوں کو پتہ ہی کیسے چلتا کہ خواتین بھی افسانہ نگار ہو سکتی ہیں۔ یہ لوگ کان سے دیکھتے ہیں۔ ذہن سے نہیں۔"

"اب دیکھیے جیلانی بانو کتنے اچھے افسانے لکھتی ہے۔ مگر نقاد چپ ہیں۔ بولیں گے تو اتنے کہ ایک نئی لکھنے والی جیلانی بانو بھی ہے ـــــ پگلی پگلی!"

میں نے پہلے ہی عرض کیا ہے۔ خواہ کوئی کتنا ہی باتونی کیوں نہ ہو۔ شکیلہ کو اس سے یہی شکوہ ہوگا کہ آپ بڑے چپ چپ رہتے ہیں ـــــ چنانچہ ایک دن مجھ سے ـــــ مجھے یہ پتہ نہ تھا کہ آپ بالکل چپ شاہ ہیں۔ آپ کی خاموشی نے تو مجھے بالکل بور کر کے رکھ دیا ہے۔ اب ایسے کیجیے کہ ہم گھڑی سامنے رکھ کر باتیں کریں۔ ایک گھنٹہ تم بولو۔ ایک گھنٹہ میں بولوں گی۔

میں نے سراسیمہ ہو کر اس کے جواب میں کہا تھا۔ آپا آپ ہی بولتی جائیں۔ مجھے حالات نے بولنا سکھایا ہی نہیں۔"

"اب تو آپ کے حالات بڑے اچھے ہیں۔"

"میں ماضی کی بات کرتا ہوں۔ بچپن ہی میں آدمی بولنا سیکھتا ہے۔"

"اب چھوڑو بھی ماضی کو۔"

"جس دن میں نے ماضی کو پیش نظر نہ رکھا۔ اس دن میری موت واقع ہو جائے گی۔"

"چلو ہٹو۔ بکواس نہ کرو۔"

"پھر ایسے حالات میں کون سے زیادہ اچھے ہیں؟"
مرشدے سے ایمان ہو تم۔"

اس طرح باتوں باتوں میں شکیلہ نے بتایا کہ اس سے ایمان تک کہ یقین ملتے ہیں۔ یہ سب باتیں ہیں کہ ہم بے حد خوش ہوں۔ اس لیے کہ ان میں بن کا پیار ہے۔ خلوص ہے۔ کوئی اور وجہ ہے کہ کر آ دیکھے میری طبیعت کیا کیا ہوتی ہے میں کہا۔

میں نے سنا تھا کہ شکیلہ نے اپنی شادی کے زمانہ میں اپنا سارا زیور یک مو سیقاروں میں تقسیم کر دیا تھا۔ یہ بات اپنی جگہ پر عجیب ہے۔ اس لیے کہ آج کل ایسے لوگ کہاں۔ یہ بات تو قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی تھی۔

میں نے باتوں باتوں میں شکیلہ سے پوچھا تھا کہ آج کل آپ کے من بھاتے مشاغل کون کون سے ہیں۔ جواب ملا۔ یوں تو کچھ نہیں ـــــ مگر گھر گھر جا کر چندہ ضرور اکٹھا کرتی ہوں۔
"کس لیے؟"

اس لیے تاکہ اُردو کے چند ایک اسکول چلائے جا سکیں۔ اگر ادھر توجہ نہ دی گئی تو پھر پندرہ بیس برس کے بعد بھارت میں اُردو جاننے والا کوئی نہ ہو گا۔

یہ بھی باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ ان کے ہاں قیمتی چیز کوئی نہیں۔ اس لیے کہ ضرورت مند لوگ میاں بیوی کو گھیرے رہتے ہیں۔ نقد روپیہ ایسے "معقول خرچ" لوگوں کے پاس رہتا کہاں ہے۔ جو ان کے پاس رہتا۔ اس لیے جتنا بھی قیمتی سامان تھا۔ وہ بھی سب کام آ گیا۔

اتنا درد مند دل، جو غریبوں اور محتاجوں کے لیے عملی ہمدردی رکھتا ہو، کسی اور کو کاہے کو نصیب ہوا ہو گا ـــ ایک دن اخبار سامنے آیا تو میں نے جلی جلی سرخیاں دیکھ کر چھوڑ دیا۔ انھوں نے پڑھا تو مجھ سے کہا "یہ بھی کچھ پڑھا؟"
"کیا؟"
"تو سنو:۔"

"ایک جوڈیشل مجسٹریٹ کے بارے میں خبر آئی ہے کہ انھوں نے شقاوت و بربریت کے سارے ریکارڈ توڑ دیئے۔ مجسٹریٹ صاحب ایک روز سو کر جو اٹھے تو ان کے ہاتھ کی گھڑی گم تھی۔ بہت تلاش کی گئی۔ لیکن گھڑی نہ ملی۔ مجسٹریٹ صاحب کو اپنے گھر کی ملازمہ پر چوری کا شبہ ہوا۔ چنانچہ انھوں نے اس کو اتنی بے دردی سے مارا کہ وہ اپنی جان بچانے کی خاطر، اپنے تین چھوٹے چھوٹے بچوں کو گھر ہی میں چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ مجسٹریٹ صاحب نے نوکرانی کے بھاگ جانے پر اس کے تینوں بچوں کو تختۂ مشق بنانا شروع کیا اور اس اقبالِ جرم کی مہم میں ایک مقامی تھانیدار کی امداد بھی حاصل کر لی۔ ان بچوں کی پٹائی سے بھی کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا تو ان کے اختراع پسند ذہن نے ایک انتہائی وحشیانہ سزا ایجاد کی کہ تینوں بچوں کے جسم میں کیلیں ٹھونکنی شروع کر دیں۔ بچوں کی عمریں علی الترتیب سات سال، پانچ سال اور تین سال تھیں۔ بچے اس سزا کی تاب نہ لا کر چیخیں مارتے

وہ تو ہو گئے [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] کے [illegible]

[illegible] گئی تھیں :

یہ خوش ہو کر [illegible] تو یہ غزل ختم ہو گئی :

[illegible] ہے ۔ [illegible]

" [illegible] بڑی [illegible]

سے برآمد ہوئی :

صبح وہ شکیلہ کو [illegible] شروع کر دیا [illegible] جلدی جلدی [illegible] اور پھر جلدی [illegible] جاؤں ۔ جانے پہنچنے کے بعد [illegible] پوچھ لیا : جاتے کیوں نہیں ؟

مجبوراً [illegible] کہ آج نہ جاؤں [illegible] شکیلہ کی [illegible] آئی : جاتے کیوں نہیں ؟ دھوپ تیز ہو رہی ہے :

مجبوراً دفتر چلا گیا ۔

[illegible] کی گاڑی دو ڈھائی بجے چھوٹتی تھی ۔ بارہ بجے گھر واپس آیا تو [illegible] پوچھا تھا اس قدر خوش کیوں ہیں ؟"

"تم بڑے سنگدل ہو :"

"وہ کیسے ؟"

"تمہیں علم تھا کہ میں آج جا رہی ہوں ۔ پھر بھی تم دفتر چلے گئے :"

"میں کہاں جاتا تھا ۔ آپ نے ہی تو دھکے مار کے نکالا تھا :"

"میں تو بار بار اس لیے کہتی تھی تاکہ تم جلدی سے یہ کہہ دو کہ میں آج نہیں جاتا ۔ مگر تم میرے دل کی بات سے بے خبر میری زبان پر ہی اعتبار کرکے چلے گئے :"

کھانا وانا کھانے کے بعد سامان تانگے میں رکھا جا رہا تھا ۔ بچے بہت سب حیران اور چپ تھے کہ شکیلہ آپا کیوں جا رہی ہیں ۔ ان کا ایک سوٹ کیس میں نے بھی سیڑھیوں سے اتارا ۔ یقین کیجئے وہ سوٹ کیس مجھے ایسے لگ رہا تھا جیسے میں اپنے کسی عزیز کی میت اٹھائے سیڑھیوں سے اتر رہا ہوں ۔

شکیلہ ہمارے ہاں [illegible] اور میرے گھر والوں کی مہمان بن کر آئی تھیں ۔ مگر شکیلہ کی باتوں نے اپنے خلوص سے، محبت سے سب کو

اپنا بنا لیا۔ اس میری بہ انفرادیت ختم ہو گئی کہ شکیلہ صرف میری بہن رہا۔ اب جسے دیکھو وہ شکیلہ ہی کی باتیں کرتا ہے۔ شکیلہ ہی کو یاد کرتا ہے۔ شکیلہ ہی کے غم میں گھلا جا رہا ہے۔ عجیب جادوگرنی ہیں یہ، جس نے سب کے دلوں کو موہ لیا۔ جیت لیا۔

یہ تو میں آپ کو پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ شکیلہ میری منہ بولی بہن ہیں۔ حالانکہ یہ جانتا ہوں کہ بہن تو بس بہن ہی ہوتی ہے۔ سگی، سوتیلی، منہ بولی، یہ سارے ہی اضافی اور فضول لفظ ہیں۔ جب کہ خون کے رشتے کی بات بھی، میرے نزدیک زیادہ اہمیت نہ رکھتی ہو۔

یہ سید ہیں۔ وہ بھی اصلی، براہ راست رسول صلعم کی چودھویں پشت میں، اس لیے فخر کرتا ہوں۔ توبہ استغفار کرتا ہوں۔

سمندر کی لہریں

جاویدہ اخلاق

اس کی پرسکون زندگی سب سے بڑے باعث تعجب تھی پڑوس [illegible] کے سامنے پڑا سا ہر ڈھلتے ہی [illegible]
وہ ایک چہرے سے جو شاید [illegible] خوبصورت [illegible] اور ایک نوکر کے ساتھ رہتی تھی۔ [illegible] صبح کے وقت وہ [illegible]
[illegible]
[illegible] ایک دن بھی فرق نہیں آیا تھا پاس پڑوس کے تمام لوگوں کے لیے وہ ایک معمہ تھی۔ ایک ایسی [illegible] جس کا حل مشکل تھا لیکن [illegible]
کراچی جیسے شہر میں پڑھی لکھی خاتون نہیں [illegible] اختیار کرے تو لوگوں کا تجسس ایک بیماری کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ وہ کون ہے
کہاں سے آئی ہے۔ اس کا ماضی [illegible] زندگی کے پیچھے کون سا افسانہ ہے۔ [illegible] کہانیاں [illegible] کے جواب [illegible]
وہ خاموش رہتی۔ شاید وہ کسی زمانے میں بے حد حسین ہوگی مگر اب ایک اندرونی مستقل اذیت سے چہرے پر [illegible] کے آثار تھے اور آنکھیں
ہمیشہ اوپر کو اٹھی رہتی تھیں جیسے زندگی نے تھکا دیا ہو۔

اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ وہ ایک مغرور خود پسند عورت ہے جو ازدواجی زندگی کی بندشوں کی قائل نہیں۔ وہ بڑی بے دردی سے ایک گھر بسانے کا وقار، کسی انسان کی محبت و الفت اور ایک بستے گھر کی خوشبوؤں کو رد کر کے اس کے احساس سے بھی [illegible] ہو چکی [illegible] احساس قابل نفرت تھا۔ [illegible] غلط بظاہر وہ ایک پرسکون زندگی گزار رہی تھی جس میں کوئی اضطراب نہ تھا کوئی الجھن نہ تھی۔ شاید [illegible] کی حدود سے بھی آگے نکل چکی تھی جہاں پہنچ کر ہر احساس خود بخود سکون پذیر ہو جاتا ہے اور کوئی اذیت باقی نہیں رہتی مگر گزشتہ پانچ مہینوں کی [illegible] شاید یہ پہلا دن تھا کہ آج شام وہ باہر نہیں جا سکی تھی۔ ایک مانوس سی تحریر ایک جانے پہچانے خط نے یادوں کے کتنے چراغ روشن کر دیے تھے کہ وہ محو ہو کر رہ گئی تھی۔

فضا شام ہی سے تیرہ و تاریک تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد دھند کا غبار سا پھیل کر تمام گھاٹی کو ڈھانپ لیتا اور بارش کی آواز تیز تر ہو جاتی۔ دور پہاڑیوں پر چند لمحوں کے لیے روشنی کی قطاریں مدھم جگمگاتی نظر آتیں اور پھر نظروں سے اوجھل ہو جاتیں۔ ان خیالات و واقعات کی طرح جو ماضی کی تاریکیوں سے ابھرتے اور چند لمحوں کے لیے اس کے دماغ میں جھلملا کر پھر سے غائب ہو جاتے۔ کتنے عرصے کی طویل خاموشی اور ڈس لینے والی بیگانگی کے بعد آج اسے اپنے خاوند کا خط موصول ہوا تھا۔ گزشتہ پانچ مہینوں میں یہ اس کا واحد خط تھا جس کے ایک ایک لفظ نے اس کے دل و دماغ پر اتنے چرکے لگائے تھے کہ اس کی روح بھی شدتِ درد سے چلا اٹھی تھی۔ اور گزشتہ

چند لمحوں میں اس پر کیا کیا عذاب نہیں بیتے تھے۔ کتنے تیکھے رنگ زائل اور کون کون سے بھرم بکھرے تھے۔ گرنا پڑا تھا اعصاب سب کچھ گزر جانے کے بعد ایک بے نام سا سناٹا سا اسے گھیر لیا تھا۔ وہ اپنے خیالوں میں یوں ہی بھٹکا گزشتہ زندگی کا بھولا ہوا بیتا ہوا تھا۔ اس وقت اس کو وہ باتیں یاد آ رہی تھیں جو کہ وہ قطعاً بھول چکی تھی اور سمجھی تھی کہ اب اس کی زندگی میں ان کا کوئی دخل نہیں ۔ کھڑکی سے چند گز کے فاصلے پر ایک پہاڑی نالہ جھاگ اڑاتا، پتھروں سے سر پٹختا تیزی سے بہہ رہا تھا۔ اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے سفید جھاگ کے بلبلوں پر ایک فلم ہو رہا ہے گزشتہ زندگی کا تماشا اور وہ اس میں گم ہے۔ اسی سے حالات و واقعات ابھر ابھر کر آتے اور جیتے جاگتے پانی کی سطح کے پردے پر رقص کرتے ہوئے رفتہ رفتہ نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔

آہستہ سے دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور وہ چونک کر پلٹی۔ کمرہ روشن ہو رہا تھا۔ درمیانی میز پر چند قالین سے ایک گلدستہ کھڑکی سے آنے والی ہوا سے آہستہ آہستہ لرز رہا تھا۔ فضا خاموش تھی۔ سامنے کے کمرے میں اس کے دونوں بچے سوتے نظر آ رہے تھے۔ ان کے چہروں پر فرشتوں کی سی معصومیت اور مسکراہٹ تھی۔ دروازے کے پاس اس کا پرانا ملازم بدھو رام کی حالت اور ایک بار پھر جیسے ان سے گزرے ہوئے واقعات یہ سب کچھ کسی خواب کے منظر کی طرح لگ رہا تھا۔

"وہ تیار ہے ——— بیگم صاحب!" وہ ادب سے جھک کر بولا۔

"شکریہ، رکھ دو" اس کی آواز عجیب سی تھی۔

"بیگم صاحب ——— سات بجے ٹیکسی آ جائے گی اور پھر دس بجے کی ٹرین پکڑ سکیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے پھر وہی مختصر سا جواب دیا۔

وہ چند لمحے اس کے مزید حکم کا انتظار کرتا رہا اور پھر خاموشی سے پردہ اٹھا کر باہر نکل گیا۔

بارش لگاتار جاری تھی نالے کا پانی اور شور تیز ہو گیا تھا۔ پانی اب بڑی بڑی چٹانوں سے ٹکراتا، شور مچاتا رواں دواں تھا۔ انسانی احساسات و جذبات، خوشیوں اور غموں سے بے نیاز۔ ایک دن اسی نالے کے کنارے اس کے پرانے ملازم نے ایک اشرفی پڑی پائی تھی جس پر ملکہ وکٹوریہ کی تصویر تھی۔ اسے ان سربلند چوٹیوں، چیڑ کے گھنے جنگلوں، پہاڑی نالوں سے شدید محبت تھی مگر ان سربلند ایک اور گنگناتے آبشاروں نے اسے کھوٹے سکوں، رنگین دھڑکنوں اور ناکامیوں کے سوا کچھ نہ دیا اور اب اسے ایسا معلوم ہوتا تھا اس کے چاروں طرف کھوٹے سکوں کے انبار لگے ہیں اور وہ ان کے بوجھ تلے پسی چلی جا رہی ہے۔ تمام احساسات، جذبات، یہ خوشی و غم، بے پایاں محبت اور ناقابل برداشت نفرت سب باتیں کھوکھلی، عارضی اور نقلی نظر آ رہی تھیں۔ کسی چیز پر اعتبار نہ رہا تھا۔ شاید تغیرات اور حوادث کا نام ہی زندگی ہے۔

کئی برس پیشتر جبکہ اس کا شعور بھی پوری طرح بیدار نہیں ہوا تھا اس کی منگنی کر دی گئی۔ وہ شرما سی گئی، کچھ بھی کچھ نہ سمجھی یا شاید اس نے سمجھنے کی کوشش ہی نہ کی۔ کہیں دور گہرائیوں میں تنہائی سی جاگ اٹھی اور اس کے خوابیدہ احساسات و جذبات جھنجھنا اٹھے۔ طبیعت میں یکایک سنجیدگی سی آ گئی۔ بچپن دور کھڑا اسے حیران نگاہوں سے تکا کرتا۔ ایک نئی زندگی، ایک نیا تجربہ، خوشی اور خوف کے ملے جلے احساسات میں وہ گم سم سی رہتی جیسے پرندہ اپنی پہلی اڑان سے پہلے دبک سا جاتا ہے۔ شادی کا دن نزدیک آ گیا۔ ایک دن اسے اکیلا پا کر اس کا بھائی آہستہ سے آ کر اس کے پاس کھڑا ہو گیا۔

"دیکھو ڈیئر! قریبی بستی [illegible] ہے مجھے بھی تمہاری صحت کا اتنا ہی خیال ہے جتنا کہ گھر کے باقی افراد کو۔ تم جن مشاغل کو اپنا رہی ہو وہ کوئی صحت [illegible] ہے۔ بہرحال میں آپ کی تشویش [illegible] خیال رکھوں گا [illegible] ایک [illegible] زندگی [illegible] کی طرف سے [illegible] دو۔ دنیا میں بچے [illegible] کی [illegible]" وہ [illegible] کر [illegible] اٹھا۔

وہ مسکرادی: "میرا مقصد [illegible] بھی [illegible] ہے"

"[illegible] وہ [illegible]" وہ ایک [illegible] عادت [illegible] جس [illegible] تک [illegible] میں [illegible]

[illegible] ایک دن اچانک [illegible] [illegible] کا [illegible] کر [illegible] گی"

"گھر کے شیشے کی [illegible] پیچھے [illegible] آپ [illegible] ہوتے [illegible] سے [illegible] سنبھالے [illegible] کر [illegible]۔

اقبال بھی وہاں [illegible] مسکرا [illegible] اور پیچھے سے چل دیا۔

شادی کے بعد اسے ایک [illegible] زندگی [illegible] ساتھی اور ایک [illegible] کا سامنا تھا۔ اس نے [illegible] کے سامنے [illegible] ایک [illegible] کے [illegible] پرورش پائی تھی جہاں نیلی جھیلیں [illegible] سیب کے درخت [illegible] کے پھولوں [illegible] اس نے [illegible] محبت [illegible] اور ایک [illegible] کھلا تھا [illegible] چاروں طرف سکون ہی سکون تھا اور یہی سکون اس کی فطرت بن چکا تھا۔ [illegible] بادلوں [illegible] شفق کے سائے میں [illegible] رنگ برنگی [illegible] والی تھا۔ یہاں سمندر [illegible] ہوائی جہازوں کا شور [illegible] سنبھال [illegible] چاروں طرف [illegible] بازاری [illegible] تھے۔

شروع شروع میں وہ گھبرا سی گئی مگر اس کے خاوند نے صرف اس سے محبت ہی نہیں کی بلکہ ایک [illegible] دوست کی طرح اس کا ساتھ دیا۔ اس کا [illegible] ہمیشہ [illegible] شفقت [illegible] رفتہ رفتہ اس کی توجہ اور کوشش سے وہ ان ہنگاموں [illegible] عادی ہو گئی جیسے [illegible] وہ دونوں [illegible] اس کی محبت میں ڈوب کر وہ [illegible] کی کمزوریوں [illegible] خامیوں کو بھی نظر انداز کر جاتی۔ کبھی کبھی [illegible] خوشی اور [illegible] جھگڑا [illegible] مگر ہر بار وہ [illegible] پیار سے [illegible] سب کچھ بدل جاتی۔ [illegible] دونوں کو زندگی میں ایک خلا سا محسوس ہوتا اور وہ [illegible] آہستہ آہستہ [illegible] کہتا۔ "ڈیئری! میرا خیال ہے اب گھر میں ایک ننھی منی بچی ہونی چاہیے [illegible] اس کی شکل و صورت بالکل تمہاری طرح ہو" وہ زیر لب مسکراتا۔

"لڑکی کیوں؟ لڑکا ہونا چاہیے" وہ چڑ جاتی۔

"مگر میں پہلے لڑکی چاہتا ہوں" وہ اپنی ضد پر قائم رہتا۔

دن گزرتے رہے اور وہ بچے صرف ان کے تصور میں ہی جھانکتے رہے۔ کوئی خواب بھی حقیقت نہ بن سکا اور خلا وسیع تر ہوتا چلا گیا۔

وہ حیرت انگیز طریقے سے بدل رہا تھا۔ رفتہ رفتہ اس نے شراب نوشی زیادہ کر دی۔ اب وہ زیادہ وقت گھر سے باہر گزارتا۔

گو عیش و آرام اور تفریحات میں کوئی خاص فرق نہ آیا تھا مگر زندگی بکھری بکھری سی لگتی۔ کچھ عجب سی بے اطمینانی تھی جس کے اظہار سے دونوں کتراتے۔

شاید اگر تو رومی اسے سچ کہتا ہے کہ انسان میں ایک جذبۂ تسلیم پسندی ہے جس کی وجہ سے وہ نئے عشق کی تلاش میں رہتا ہے لیکن اگر اس کو تسکین حاصل ہو جائے تو جہاں پہلے طبیعت میں ایک تشنگی تھی وہاں اب ایک سیری آجاتی ہے۔ طبیعت اکتا جاتی ہے۔ احساس مفلوج ہو جاتا ہے اور یہ مرض لاعلاج ہے۔"

وہ یہ سب کچھ کہتی۔ اس تبدیلی اس بیگانگی کو شدت سے محسوس کرتی مگر خاموش رہتی اور پھر اچانک اسے کچھ دنوں کے لیے اپنے وطن جانا پڑ گیا۔ جس دن وہ روانہ ہونے والی تھی وہ قدرے پریشان و متفکر سا نظر آتا تھا۔ ہوائی جہاز کے روانہ ہونے سے چند لمحے پیشتر اس نے اس کے چہرے پر ایک ایسی گہری اداسی کی جھلک دیکھی تھی کہ گھر پہنچنے تک اس کے دل سے تمام شکوک دور ہو گئے اور رنج کا نشان زائل ہو چکا تھیں وہ اس پرسکون ماحول میں واپس پہنچ کر پھر سے اس کے لیے مضطرب ہو گئی۔ اس نے کئی دفعہ جلد واپس جانے کا ارادہ کیا مگر کوئی نہ کوئی رکاوٹ حائل ہو جاتی اور پھر اس دن اس کی چھوٹی بہن کی شادی تھی۔ وہ بالکل اسی طرح کا دن تھا جس دن اس کی شادی ہوئی تھی۔ شام سے لڑکیاں ڈھولک کے ساتھ گاتی رہیں۔ صبح رخصتی کے ہنگاموں میں کسی نے ایک خط لا کر دیا۔ وہی جانی پہچانی تحریر۔ اس نے بے تابی سے لفافہ چاک کیا مگر چند لمحوں تک سمجھ میں نہ آسکی کہ اس میں کیا لکھا ہے۔ الفاظ بڑے بڑے دھبوں کی طرح آنکھوں کے سامنے ناچ رہے تھے

"فرخندہ! مجھے مجبوراً دوسری شادی کرنی پڑی ہے۔ وہ ایک انگریز عورت ہے۔ میں اسے کہہ چکا ہوں کہ میں نے تمہیں طلاق دے دی تھی۔ اب اس لیے اب تم واپس آنے کی کوشش نہ کرنا۔ مجھے افسوس ہے مگر میں مجبور تھا۔ امید ہے تم بھی مجھے جلد بھول جاؤ گی۔"

اور جب اسے ہوش آیا تو اس نے دیکھا کہ سہیلیوں کے شگوفے اور دامن کے ادھ جلے پھول جل کر خاکستر ہو چکے ہیں۔ نیلی جھیل پر لاوا ابل رہا ہے۔ دنیا کے ساحل ٹوٹ رہے ہیں۔ آگ لگ گئی ہے اور زندگی ایک کنارے کا مسافر، دوسرے کنارے نہیں جا سکتا۔ زعفران کے کھیت جھلسے پڑے ہیں اور چشمے سوکھ گئے ہیں۔ اسے یہ سب کچھ ایک خواب نظر آ رہا تھا۔

وہ گھر کے کسی فرد کو حقیقت سے آگاہ کیے بغیر اچانک تیاری کر کے روانہ ہو گئی۔ کار اور ریل کا سفر اس نے سوتے جاگتے کی سی حالت میں طے کیا اور پھر ہوائی جہاز اسے اٹھا کر آسمان کی بلندیوں میں گم ہو گیا۔ تمام رات وہ جگمگاتے شہروں پر برستے بادلوں کے درمیان چاندنی کی کرنوں میں پرواز کرتی رہی۔ وہ خوفزدہ تھی۔ صبح اسے لینے کوئی نہیں آئے گا۔ کسی کی منتظر نظریں آسمان کو نہیں تکیں گی اور کوئی ہاتھ بڑھا کر اس کے لیے کار کا دروازہ نہیں کھولے گا۔ اس نے کسی کو اطلاع ہی نہیں دی تھی۔ اس کا کوئی نہیں تھا، وہ کہاں اور کس کے پاس جا رہی ہے؟ یہ وہ انسان نہیں تھا جس نے آسمانی صحیفوں کے درمیان انتہائی محبت اور فخر کے ساتھ اسے قبول کیا تھا جس نے اسے محبت کرنا سکھا دیا تھا۔ یہ کوئی اور تھا جسے وہ ہرگز نہیں جانتی تھی۔ وہ پہلا انسان نہ جانے کہاں کھو گیا؟ انھوں نے اکٹھے کتنے سہانے خواب دیکھے تھے، کتنی دلفریب شامیں، رنگین راتیں اور مسکراتی صبحیں تھیں، کتنی خوشیاں اور قہقہے تھے۔ وہ ان سب کا بوجھ اٹھائے اس وسیع دنیا میں اسے کہاں ڈھونڈتی پھرے گی۔ چند معمولی الفاظ تمام گذشتہ زندگی کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیتے ہیں مگر وہ پہلی نظر، ایک لمس، ایک بوسہ۔ وہ ہلکی سی لرزش، ایک سسکی، چند آنسو، خنک چاندنی اور ادھ جلے پھول، دل کی گہرائیوں میں جاگزیں ہو کر غیر فانی ہو جاتے ہیں۔

اسے لینے کوئی نہیں آیا تھا مگر اسے اپنے گھر کا راستہ بخوبی معلوم تھا اور اب وہ اپنے خوشنما فلیٹ کے دروازے پر ایک اجنبی کی طرح کھڑی کسی خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرز رہی تھی۔ کسی نئے نوکر نے اسے پہچانے بغیر دروازہ کھول کر ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔ تمام ماحول اجنبی سا نظر آ رہا تھا۔ کارنس پر سے اس کی تصاویر اٹھا دی گئی تھیں۔ کمرے میں نقشہ بدلا ہوا تھا۔ وہ اپنے ہی گھر میں

سی جیسی کی طرح چاروں طرف میرا دم گھٹتا ہوں سے ہو۔ کمرہ [illegible] تھی۔

— جی، صاحب وہ بیگم صاحبہ کی دوسری منزل پر رہتے ہیں۔ آپ کس سے ملنا چاہتی ہیں؟ ویٹرس نے سامان دیکھ کر دوسری سوال کیا۔

وہ جھک گئی۔ ہاں وہ مجھے ہی [illegible] تھی۔ تم ان کو جا کہہ دینا: صاحب سے کہو ان سے کوئی ملنے آیا ہے اور چند لمحوں کے بعد [illegible] کے سامنے کھڑا تھا۔ [illegible]

— میں اپنے گھر آئی ہوں۔ [illegible]

— معلوم ہے تمہیں سب کچھ معلوم ہوں [illegible] سے تمہیں چھوڑ دیا [illegible]

— میں تم سے ملنے آئی ہوں [illegible]

— دیکھو تم چلی جاؤ۔ اس سے پہلے کہ [illegible] چلی جاؤ: وہ گڑگڑایا۔

— کہاں چلی جاؤں؟ [illegible] آسمان میں کہیں جگہ نہیں۔

— فی الحال تم ہوٹل میں چلی جاؤ۔ وہاں کئی کمرے ہیں [illegible] تعلقات ہیں۔ یا اپنی کسی سہیلی کے پاس ٹھہر جاؤ وہاں مفصل گفتگو ہو سکے گی۔ میں لباس تبدیل کر رہا ہوں [illegible] جلد از جلد چلی جاؤ۔

وہ خاموشی سے [illegible] آہستہ آہستہ سیڑھیاں اتر گئی اور وہ ریلنگ کے سہارے جھکا چپ چاپ اسے جاتے دیکھتا رہا۔ ایک موڑ — دوسرا موڑ — [illegible] اس کی ساری کا [illegible] میں لہرا کے غائب ہو جاتا۔ کتنی سیڑھیاں کتنے موڑ، ان گنت [illegible] کے اسے اپنی یاد دلاتے [illegible] سے اوجھل ہو گئے۔ وہ نیچے [illegible] کے سیلاب [illegible] گم ہو گیا تھا، نہ جانے کتنے لمحے جو ہمیشہ کے لیے ساکت ہو گئے۔

اور پھر بہت عرصہ بعد اس نے اپنے ایک دوست سے [illegible] کے انداز میں آہستہ سے کہا تھا: میری دوسری شادی جلد ہی ناکام ثابت ہوئی اور پھر اسی طرح تیسری بھی مگر مجھے قطعاً کوئی غم نہیں۔ میں اب ایک تنہا انسان ہوں۔ تمام احساسات و جذبات سے بے پروا مگر ایک احساس باقی ہے۔ ایک صبح میرے ذہن میں مستقل اذیت بن کر رہ گئی ہے۔ وہ لمحہ جب وہ میرے [illegible] ہلکے ہلکے قدموں سے اکیلی سیڑھیاں اترتی ہوئی سڑک کے بے پناہ ہجوم میں غائب ہو گئی تھی اسے فراموش نہیں کر سکتا۔ اکثر آرام سے بیٹھے بٹھائے وہ صبح اچانک میرے ذہن میں جاگ اٹھتی ہے اور پھر کہیں سکون باقی نہیں رہتا۔ شاید وہ نام ہو ——— زندگی بھر اسی طرح میرے ذہن میں سیڑھیاں اترتی رہے گی اور کبھی نہ اتر سکے گی ——— ایک لامتناہی سلسلہ ——— کتنی عجیب بات ہے ——— [illegible] اگرچہ سب کچھ سوچنے کا رہے کیونکہ اب وہ ایک دوسرے انسان کی بیوی ہے۔ مگر یہ سیڑھیاں؟ یہ مستقل اذیت ——— وہ آہستہ آہستہ عجب اذیت اور مایوسی کے بوجھ تلے [illegible] رہا تھا۔

اور وہ دوسرا آدمی ——— ایک پڑھا لکھا، خوبصورت اور معزز انسان ——— جس سے وہ اپنے خاوند کی [illegible] میں کئی [illegible]

جیسے وہ حسن سے متاثر ہو اور رعب سا کھا گیا۔ چونکہ وہ عمر میں اس سے بڑا تھا اور ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتا تھا اس لیے اس نے قبول کرلی تھی۔ سلطانہ ہنستی ہوئی اور جذبہ محبت کا حامل پوش و خوش گفتار انسان جو ہر ساعت اسے پسند کیا جاتا تھا خصوصاً خوش مزاجی سے کئی خوش مزاجی سے پیش آتی تھی مگر آنے والے حالات کا کسے علم تھا۔

زندگی کی اس منزل پر چلتے چلتے ایک وقت ایسا آیا جب وہ اسے مل گیا تھا۔ دونوں کو جہاں قدرت نے حالات سے انھیں یکایک اکٹھا کر دیا تھا۔ دونوں کو ایک دوسرے کو سمجھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ایک گزرے خوشگوار دنوں کی یاد کی وجہ سے دونوں کو ابھی تک دوستی و لطیف رفاقت کے احساس سے یا یہ ہمدردی بھی مگر آہستہ آہستہ دونوں ایک دوسرے کے نزدیک آگئے دونوں کی زندگیوں میں ایک خلا تھا جس کو عارضی طور پر ایک دوسرے کی قربت نے پر کر دیا۔ دل شکستہ ہے اس کی زندگی سہارے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی اور وہ بھی سادہ زندگی کے سبب دور رہ کر تنہا تھا۔ اگر وہ کوئی خوشی اور رومان کی راہ سے گزرا تھا تو کتنی بار وہ ان دونوں کی زندگی کا سہارا بھی بن چکا تھا۔ پُرخلوص محبت اور جب تک وہ اس کی راحت کے معنی جانتا تھا پھر زیست کی راہ پر وہ نظر دل کی اور طرف سے ہٹ کر یا شاید ہی سمجھے کہ وہ سمجھ جائے گی کہ دل چاہنے لگا۔

جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ اسے پسند کرتا ہے یا شاید محبت کرتا ہے تو آخر ایک دن اس نے اس کو شادی کر لی۔ وہ بھی اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتی تھی۔ اسے وہ پسند کرتی۔ اس کی موجودگی ہی اسے سکون و راحت بخش رہی تھی مگر پھر بھی وہ خوش و خرم کئی روز تک سخت تذبذب کی حالت میں اس کے متعلق سوچتی رہی۔ اس کی نسبت ٹوٹ کر خیرباد ہو چکی تھی اس کی زندگی بن گئی تھی۔ وہ اب محبت کے بغیر زندہ نہ رہ سکتی تھی۔ وہ بے پایاں محبت اس پر قربان ہونا چاہتی تھی تاکہ اس کی گزشتہ تلخیوں کا مداوا ہو جائے لیکن اگر یہ بھی خواب ثابت ہوا۔ زندگی کے بازار میں اگر یہ محبت بھی ہار گیا تو اس کے بعد کر دیکھتے ہوئے وہ اس کے کہنے پر ہی یقین کر سکتی تھی بلکہ شاید وہ بے حد قیمتی تھا۔ عجیب و غریب ہے وہ حسن پر قدیم مصری تہذیب اور کسی نازک فہم زبان میں عبارت کسے کوئی انسان وہ عجیب و غریب زبان سیکھے بغیر اس کی ماہیت کا اندازہ نہیں لگا سکتا تھا شاید وہ پہچان رہی تھی کہ عظیم الشان معبدوں میں پہنچا گیا تھا کسی حسین دیوی کے ماتھے پر جھلملا رہا تھا نیل کے کنارے قلوپطرہ کے دل کی دھڑکن بن چکا تھا۔ شاید ہاتھوں ہاتھ لیا تھا اور کبھی سیزر کبھی مارک انطونی نے اسے رشک سے دیکھا تھا۔ وہ اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کبھی ان جانے خوف سے لرز رہی تھی کانپ رہی تھی مگر اس کے مضبوط ہاتھوں کا سہارا پا کر سنبھل گئی اور شادی کے بعد تو تمام محبت و پرستش اس نے اس پر وقف کر دی تھی۔ کتنے شیریں لمحات سے وہ بھی اور اب ان کے دو بچے تھے۔ وہی بچے جو اس کی پہلی ناکام زندگی میں اکثر اس کے تصور میں جھانکا کرتے تھے۔

پھر زندگی بے حد پُرسکون تھی مگر یہ سکون بھی زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا اور کچھ عرصے کے بعد ہی وہ اس کی سطح کے نیچے ہر دن کا ہلکا ہلکا تلاطم محسوس کیا کرتی۔ رفتہ رفتہ وہ بھی بدل رہا تھا۔ بیزار اور چڑچڑا سا۔ وہی بے اطمینانی، وہی سکون کی آرزو، نت نئے جھگڑے، زندگی کا وہی پرانا تماشہ، صرف وقت، مقام اور کردار بدل گئے تھے۔ خلا کوئی نہ تھا مگر تشنگی مٹ جانے پر وہ اکتا گیا تھا اور دن بہ دن اس کی بیزاری اور جھنجھلاہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ اس کی بدلتی ہوئی عادات پر بھونچکا سی رہ جاتی۔ تمام خوش فہمیاں غلط ثابت ہوئی تھیں

[illegible]

[illegible] زندگی [illegible] احساسات و جذبات [illegible] مکمل [illegible]

مگر اسے سب سے زیادہ دکھ اس وقت ہوتا جب وہ اپنے [illegible] کی عادت اور اپنی کمزوری پر [illegible] کے پیچھے
[illegible] اسے [illegible] کا باعث [illegible] ۔ [illegible] جب چاپ [illegible] کوئی پیغام تک نہیں چھوڑا تھا۔ گھر واپس آ کر جب اس نے اس کا خالی کمرہ دیکھا تو حیران رہ گئی۔ [illegible]
اور ایک دفعہ پھر وہ بھرے بازار میں لاکھوں مسکراتی ہوئی نظروں کا نشانہ بنی کھڑی تھی۔ کیا اس کی تمام محبت و پرستش کا یہی صلہ تھا؟
حادثات کو کیوں اس کی زندگی سے اتنی دلچسپی ہے۔ اس کا کوئی بھی خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

زندگی کی یہ دوسری شکست سب کچھ جلا کر خاکستر کر گئی۔ کوئی احساس کوئی جذبہ باقی نہ رہا۔ خوشی نے [illegible] غم کے احساس سے بھی بیگانہ کر دیا۔ نفرت نہ کر سکی مگر محبت کو بھی بھول گئی جیسے وہ کبھی اس کی زندگی میں آئی ہی نہ تھی۔ سب کچھ فراموش کر بیٹھی کوئی اذیت باقی نہ رہی۔ [illegible] چند دنوں کے لیے یہاں آئے تھے مگر وہ اسے [illegible] کے کنارے [illegible] چھوڑ کر چل دیا جہاں وہ مجسمہ [illegible] ہو کر رہ گئی۔ سر سے پاؤں تک برف کی ایک سل۔ احساسات و جذبات سے عاری جیسے کسی کی طنز کسی کی ہنسی، کسی کی پر تجسس مشکوک نظریں [illegible] نہیں پہنچا سکتی تھیں۔ دوسروں کی [illegible] سے بالاتر وہ ایک ایسی [illegible] زندگی گزار رہی تھی جو لوگوں کے نزدیک قابلِ اعتراض تھی کہ آج اچانک چار مہینے بعد کاغذ کے ایک ٹکڑے نے تمام گذشتہ گھاؤ ہرے کر دیے تھے اور کتنی بھولی بسری یادیں سلگ اٹھی تھیں۔ ایک طویل خط میں اس نے حسب عادت اسے ختم کرتے ہوئے اس کے خلاف تمام زہر اگلنے کے بعد آخر میں اپنی

بلندی کا اظہار کرتے ہوئے کہ ممکن ہے کہ وہ اب بھی اسے اسی طرح چاہتا ہے اور [illegible] اس کا منتظر ہے۔ خط ملتے ہی وہ [illegible] اس کے پاس آنے کے لیے روانہ ہو جائے۔

اور خط ڈال چکا تھا۔ وہ [illegible] اس کا انتظار کر رہا ہوگا۔ اس کی بیماری بھی ختم ہو چکی تھی مگر وہ سوچ رہی تھی کہ اب وہ جا کر کیا کرے گی۔ کیا ہو سکے وہ زندگی، وہ لذت اور محبت وہ بے پناہ خلوص [illegible] واپس آ سکتے ہیں؟ وہ احساسات [illegible] جو کبھی اس کے تھے وہ واپس آ سکتا ہے؟ محبت بھی ایسی چیز تو نہیں کہ جب دل چاہا [illegible] کر بیدار ہو جائے۔ وہ [illegible] جنگلی [illegible] جیسے پھولوں سے لدی [illegible] کے کنارے [illegible] آہستگی سے بڑھتی ہے کہ کسی کو اس کا علم نہیں ہوتا [illegible] اپنی محبت کو کسی چیز کے کنارے کسی سبب کے درخت نے [illegible] کے حوالے کر دیں [illegible] راہ چلتے [illegible] پڑا رہتا ہے تو وہ [illegible] کی طرف پرواز کر جاتی ہے۔ [illegible] جلتے ہیں۔ [illegible] کی جگہ کانٹے اگے ہیں۔ محل ویران [illegible] ہو جاتی ہیں اور وہ انسان تمام زندگی اس محبت کی تلاش میں بھٹکتا پھرتا ہے مگر وہ کبھی لوٹ کر نہیں آتی۔

[illegible] کا تصور رہتے اس کا منتظر تھا مگر اب اس کے پاس ان [illegible] کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ وہ اب اسے کیا دے سکتی تھی۔ وہ خالی ہے [illegible] زندگی کا [illegible] اور مردہ احساسات و جذبات وہ اسے کسی وقت بھی تحفتہً پیش کر سکتی ہے ۔۔ اتنی جلدی کیا ہے اب!

وہ [illegible] جیسے [illegible] آئی۔ [illegible] کر کے [illegible] اور کار [illegible] ہوئے [illegible] کہ وہ صبح نہیں جا رہی اس لیے وہ اسے جلدی نہ جگائے۔ اور پھر اس [illegible] اطمینان و دلجمعی کے ساتھ جو لوگوں کے لیے باعث حیرت و لذت تھی، اپنے بیڈ روم کی طرف چلی گئی ۔۔۔ [illegible] ہو گئی۔

فیض احمد فیض

○

یہ جفائے غم کا چارہ، وہ نجاتِ دل کا عالم
ترا حسن دستِ عیسیٰ، تری یاد روئے مریم

دل و جاں فدائے راہے، کبھی آ کے دیکھ ہمدم
سرِ کوئے دلفگاراں شبِ آرزو کا عالم

تری دید سے سوا ہے تری یاد میں بہاراں
وہ چمن جہاں گری ہے ترے گیسوؤں کی شبنم

یہ عجب قیامتیں ہیں تری رہگزر میں گزراں
نہ ہوا کہ مر مٹیں ہم، نہ ہوا کہ جی اٹھیں ہم

لو سنی گئی ہماری، یوں پھرے ہیں دن کہ پھر سے
وہی گوشۂ قفس ہے، وہی فصلِ گل کا ماتم

حالی کی قطعہ نگاری

ڈاکٹر سید عبداللہ

فارسی قطعہ عرب سے لی ہوئی صنف ہے۔ اس کا مقصد کسی حقیقت کا مختصر غیر مسلسل بیان ہے اور غیر مسلسل بیان ہی کی کوشش ابتدا ہی سے فارسی شاعروں میں ملتی ہے یہ ہے اس کو دیکھ کر یہ اہل عالم نے ... شاعروں کے متعلق بعض لوگوں کے خیالات بگڑ جاتے ہیں دیکھنے کو ملتے کہ واقعی یہ کہ یہ لوگ سامنے تسلسل بیان پر قادر رہے۔ دراصل یہ ایک زمانہ ایسا بھی آیا تھا جب کہ یہ بحث کے منکر اور اس کے مخالف ہو گئے تھے۔ ہم نے جن توجہات کا ذکر کیا ہے ان میں سے ایک منکر یہ خیال یہ تھا کہ ہمارے کلاسیکل شاعر مضمون کے تسلسل کو نہ مانتے تھے اور نہ اس کو برقرار رکھ سکتے تھے۔ کلیم الدین احمد اس سلسلے میں اتنے نیک نام ہو چکے ہیں کہ اب ان کا ذکر کرنے ہوتے ان پر رحم آتا ہے لہٰذا ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیجئے کیونکہ وہ بچارے تو محض شوق کے دامن میں گم ہونے کے جرم میں مارے گئے اور بقصور معنی تعلیم کا نہیں اصل غلطی تو اس ذہن کی ہے جس نے آج سے ایک سو سال پہلے ہر مشرقی کو بے جرم مار پیٹنے کی رسم ڈال دی تھی۔

خیر یہ تو محض جملہ معترضہ تھا۔ کہنا صرف یہ ہے کہ قطعہ کی صنف ذوقِ تسلسل کی تشفی کے لیے وضع ہوئی اور آزادی (یعنی قصیدے کے عام رسوم و قیود سے آزادی) اس کی ایک بنیادی صفت قرار پائی چنانچہ مطلع کی قید سے آزاد قطعہ مسلسل مضمون کو ادا کرنے کے لیے وقف ہوا اور آج تک اس کی یہی صفت اس کی شناخت کی بنیادی علامت ہے۔ اس کے باقی اوصاف قطعی نہیں اور ان میں تغیر ہا ہر دور میں ردّ و بدل ہوتا رہا۔

قطعہ (ق طع) لغوی معانی کے اعتبار سے ٹکڑے یا کٹے ہوئے کسی جزو کو کہتے ہیں اور جب اس میں اصطلاح کا رنگ پیدا ہوا تو بھی یہ بنیادی معنی اس میں باقی رہا۔ میں کہہ چکا ہوں کہ مضمون کا تسلسل اور ربط و راس کی جزئیت اس کی بنیادی صفت ہے گویا قطعہ کسی وسیع تر اور طویل تر بیان کے لیے نہیں بلکہ حقیقت کی ایک جھلک دکھانے کے لیے وجود میں آیا تھا۔ اصل میں قصیدے کا ایک کٹا ہوا ٹکڑا ہے جس میں بعض صفات قصیدے کی پائی جاتی ہیں اگرچہ اس میں مطلع نہیں ہوتا مگر اس کا یہ تصور روایت ابتدائی زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ بعد میں ارتقا یافتہ قطعے کی قصیدے سے بجز اس کے کچھ مشابہت نہ رہی کہ قصیدے کی طرح یہ رباعی اور غزل سے مختلف چیز ہے اور یہ بھی کہ اس میں بھی قصیدے کی طرح ایک مرکزی مضمون موجود رہتا ہے۔

قطعہ کی ہیئت و ساخت کے متعلق مختلف زمانوں میں مختلف تجربے ہوئے ——— اور یہاں ہیئت سے میری مراد تعداد اشعار بھی ہے جو کم از کم دو اشعار اور زیادہ سے زیادہ دس بارہ اشعار تک پہنچتی ہے۔ (بعض اوقات شاید اس سے بھی زیادہ مگر متوازن قطعہ ہمیشہ مختصر

[illegible] قطعے کی [illegible] قصیدے [illegible] مطلع [illegible] قطعہ [illegible]

[illegible]

[illegible] ؎

[illegible]

اسی طرح [illegible] قطعے میں [illegible] حکایت کو لانے کا رواج ہے۔ مثلاً میر کا یہ قطعہ دیکھئے جو ایک غزل کے اندر ہے ؎

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آ گیا
یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا

کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر
میں بھی کبھو کسی کا سر پر غرور تھا

اس قطعے کے پہلے مصرعے میں ایک واقعہ ہے۔ تیسرے مصرعے میں مکالمہ ہے اور آخر میں ایک حقیقت کا انکشاف ہے۔ انھی اجزا سے یہ قطعہ مکمل ہوا ہے۔ [illegible] ایک دوسرے قطعے میں محض ایک قول پر بنا رکھی گئی ہے اس میں کوئی مکمل واقعہ تو نہیں مگر واقعہ کا ابتدائی ٹھاٹ ضرور ہے ؎

بلبلیں پائیز میں کہتی تھیں ہوتا کاش کہ
یک مژہ رنگ فراری اس چمن کا آشنا

گو گل و لالہ کہاں سنبل سمن ہم نسترن
خاک یکساں ہوتے ہیں کیسے کیا آشنا

میر کا یہ قطعہ ایک غزل کے اندر ہے اور یہ بھی میر کی ترجیحات میں سے ہے کہ انھوں نے قطعے کے ہیئت سے قاعدے کو بدل ڈالا یہاں تک کہ ان کے بعض قطعات میں قصیدے و رباعی کی طرح مطلع بھی ہے۔ بہرحال [illegible] واقعہ کا بیان قطعے کی داخلی خصوصیت ہے۔ اگرچہ بعض شاعروں کے یہاں محض بیان حقیقت ہی قطعے کا مقصد معلوم ہوتا ہے یعنی حقیقت کا کوئی رخ، اخلاقی فلسفیانہ اور دنیوی زیرکی کا کوئی نکتہ واقعہ بنائے بغیر بھی قطعے کا موضوع بن جاتا رہا۔ مثلاً سعدی کا یہ قطعہ ؎

ہم گر ز آں نابہ دل صاف شد　　　ناچیز رم صبح و چہ پرتو شعاع
اے شکر چیوہ نامے ساز　　　نارہ کز پشت مہ سنت وفا

بہر حال یہ سب اسباب اور تجربات ہیں جس طرح جدید دور کے قطعہ نگاروں نے (مثلاً اقبال، اختر شیرانی، احسان دانش وغیرہ) نے قطعے میں ہیئت و معنی کے کئی تجربے کیے ہیں اور قطعے کو پرانے آداب سے آزاد کرانے کی کوشش کی۔

قطعے میں ساخت اور روح کے ساتھ خصائص سے مانوس ہونا لازمی ہے ادراک بھی بہت ہے مطالعے میں اور تخیل کا امتزاج قطعے کی روح کے لیے ناگزیر ہے۔ قطعے میں اس سے معنی و بے ساختگی سے حرکت رہتی ہے۔ انداز بیان میں دل نشین ہو جاتے۔ قطعے کو جو چیز سب سے زیادہ نقصان پہنچاتی ہے وہ اس کا ... ہے بیان میں بھی بے ساختگی اور یکسانی کی ضرورت ہے۔

ماحصل کلام یہ ہے کہ قطعے کے لیے چند چیزیں ضروری ہیں۔ اول بیان کا تسلسل، دوم مناسب اختصار، سوم ... شوخی و ظرافت، چہارم کسی حقیقت یا فلسفے کا اظہار۔ ان صفات کے علاوہ واقعہ حکایت سے بھی استفادہ ہو سکتا ہے اگرچہ ... سے اس کا التزام نہیں کیا۔ میری دانست میں دو اشعار والے قطعے رباعی ہی ہوتے ہیں۔ ... دوسری اہم بات کہ رباعی میں حقیقت کو بیان حکایت کا رنگ اختیار نہیں کرتا مگر قطعے کی ایک مخصوص صنف ... کے لیے حکایت یا واقعہ کا ڈھانچہ تیار کرنے سے بات زیادہ موثر ہو جاتی ہے۔ اسی طرح رباعی کی روح نسبتاً سنجیدہ ہے ... کی چیزوں یا حقیقت کی ... مناسب ہے البتہ قطعات میں برجستگی ادا اور لطیف ... کی گنجائش ہے۔ اس سلسلے میں ایک بات بھی قابل غور ہے اور وہ یہ کہ جس چیز کو ہم قطعہ بند کہتے ہیں کیا وہ بھی قطعہ ہوتا ہے ... اس سے کوئی مختلف چیز ہے۔ غزل میں آئے ہوئے قطعہ بندوں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اصول تسلسل کے لحاظ سے وہ قطعہ ہی ہوتا ہے مگر اس میں مکمل قطعے کی صفات نہیں پائی جاتیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ غزل میں قطعہ بند لانے کی ضرورت کیا ہے؟ بظاہر اس سے مدعا ادا کرنا مقصود ہوتا ہے اور غزل کی پریشاں خیالی کے اندر مربوط مضمون کا پیوند لطف دیتا ہے۔ یہ قطعہ بند عموماً مختصر ہوتے ہیں مگر میر و غالب کی غزلیات میں قدرے طویل قطعے بھی ہیں بلکہ ایک غزل میں ایک سے زیادہ قطعے بھی ہیں مثلاً غالب کا مشہور قطعہ

اے تازہ واردان بساط ہوائے دل

پر غزل کا سے کی یہ خاص کوشش اردو میں میر و سودا کے یہاں کچھ زیادہ ہے جس کے سماجی و سیاسی اور نفسیاتی اسباب ہیں مگر ان کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

اس طویل تمہید کے بعد اب میں حالی کی قطعہ نگاری کا تجزیہ کرتا ہوں۔

حالی اور اکبر —— جدید زمانے کے دو ایسے شاعر ہیں جن کے یہاں قطعہ نگاری کا فنی شعور خاص طور سے نمایاں ہے جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں اکبر کو حالی کے مقابلے میں قطعے پر زیادہ قدرت ہے مگر حالی کے قطعے بھی بعض صفات کے مالک ہیں اور ان میں حالی کا رنگ طبیعت جھلکتا ہے۔

حالی کے [illegible] اس [illegible] حقیقت [illegible] حالی [illegible]

حالی کے ان قطعات [illegible] اصلاح بھی کرتا ہے۔

ان باتوں سے [illegible] ظاہر ہے کہ قطعہ کسی حقیقت [illegible] فلسفیانہ نکتے کے [illegible] حالی کے قطعات میں [illegible] آتا ہے۔

حالی نے مضمون کو مؤثر بنانے کے لیے [illegible] استقبال —— ان سب کا مقصد [illegible] حالی نے قطعہ نگاری کا ایک نیا تجربہ کیا ہے۔ [illegible] کامیابی ان کی یہ ہے کہ انھوں نے طویل نظموں کے قطعات کا تجزیہ کر کے [illegible] مختصر نظموں کے۔ جہاں تک ترقی رہی ہے —— میری رائے میں [illegible] قطعے کو نبھانا کوئی آسان کام نہیں۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہر بے ربط نظم قطعہ بن سکتی ہے مگر ان کا یہ خیال غلط ہے کیونکہ قطعے میں خیال آرائی کی مطلق گنجائش نہیں اس کے برعکس نظم کی بعض اقسام تخیل کے زور سے چلتی ہیں۔ اسی طرح رباعی [illegible] کہ اس کو قطعہ کہہ دینا بھی [illegible] بات ہے۔ قطعہ چار مصرعوں میں سمیٹا جا سکتا ہے مگر قطعے کی فطرت یہ چاہتی ہے کہ اس کا دامن رباعی سے وسیع ہو تاکہ بات زور سے کھل کر کہی جا سکے۔ قطعے کی دوسری سرحد اس سے بھی زیادہ صبر آزما ہے یعنی اگر تعدادِ اشعار میں [illegible] پیدا ہو جائے (یعنی شعر زیادہ ہو جائیں) تو مضمون پھیکا ہو جاتا ہے۔ —— حالی ان صبر آزما مراحل میں کہیں کامیاب ہوئے ہیں، اور کہیں پاؤں سنبھال نہیں سکے مگر ان حالات میں شاید کوئی مدعی بھی سنبھل نہ سکتا۔

مختصر یہ ہے کہ حالی روایتوں کے شناسا تھے اس لیے انھوں نے قطعے کی بنیادی شرائط سے اطلاع کا کل ثبوت بہم پہنچایا ہے اور قطعے کی تکنیک کا خاص خیال رکھا ہے اور اس نقاد شاعر سے یہی توقع تھی۔

ان سب باتوں کے باوجود حالی کے قطعات میں کچھ کمزوریاں بھی ہیں جن کا تعلق ان کے علم اور شعور سے نہیں ان کی طبیعت سے ہے۔ حالی کا یہ طبعی خاصہ معلوم ہوتا ہے کہ جہاں بات کو پھیلا کر بیان کرنا چاہیں وہاں ایک طرح کی بے لطفی پیدا ہو جاتی ہے —— اور اگر

نمک پیدا ہوا بھی ہے تو پھیکا پھیکا ——

ان کہانیوں میں سپاٹ پن ہے اور کہہ دینا چاہیے کہ حالی کی بھی ہوتی تاہم ان کے سب قطعات پر صادق نہیں۔ صاف زبان میں صاف صاف بات کہنے کی صورتیں پیدا ہوئیں اور بعض قطعے تو خود ان کے اپنے ہی قول کے مطابق حالی نے نمک ہی اور ان کے ایسے قطعے بے نمکی میں جو جب کے دو مناسب کے سبب اپنا اثر کھو بیٹھے ہیں۔

قطعات حالی کی ایک اور کمزوری یہ ہے کہ ان کا خطیبانہ طرز خطاب زیادہ صاف کھلا ہے۔ قطعہ کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ اس گفتگو کا نتیجہ شاعر کی زبان سے ادا نہ ہو بلکہ سامع از خود اپنا نقش مرتب کرنا چاہئے مگر حالی اکثر اپنی زبان سے نتیجہ یا اصلاحی سبق بتا دیتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس وضاحت و انکشاف والے بیان سے قطعے کی وہ بات نہیں رہتی جو کنایہ کی زبان میں کہہ دینا بھی تو ایک جان ڈالنا تھی۔

یہ کہ درست ہے کہ حالی اپنی عام عادت کے مطابق بیان میں اختصار کی جگہ بسط و تفصیل کے طالب رہے ہیں، شاید عادت کے زیر اثر انہوں نے چھوٹے قطعوں سے اکثر دامن بچایا ہے اور لمبے مکالموں یا حکایتوں کا سہارا ڈھونڈا ہے جو طویل بیان کا ایک ذریعہ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ قطعے میں واقعہ کا ہونا پسندیدہ ہے مگر قطعے کی حکایت اور عام حکایت میں یہ فرق ہے کہ عام حکایات میں اختصار ضروری نہیں سمجھا جاتا مگر قطعہ کی حکایت میں اختصار بنیادی چیز ہے۔ الا یہ کہ مورخین کے زمانے کے قطعات کی طرح قطعے کو تاریخی واقعہ نگاری کا وسیلہ بنانا مقصود ہو۔ خیر قطعے میں واقعہ نگاری تو ثانوی چیز ہے اصل چیز تو نکتہ کا محض احساس دلانا مقصود ہوتا ہے۔ مثنوی کے حکایتی قطعات پڑھ کر ایسے تو معلوم ہوگا کہ ان میں واقعہ نگاری کی طرف بہت کم توجہ ہے۔ ان کے یہاں واقعہ محض اس کا بہانہ ہے بہر حال حکایت میں واقعہ پر زیادہ زور نہیں دیا جاتا اور واقعہ مقصود بالذات نہیں ہوتا۔ صرف واقعہ کی رمز کا انکشاف تو مقصود ہوتا ہے اور یہی مولوی نے کیا ہے۔

حالی کے یہاں طول بیان و پھیلاؤ کا میلان کچھ زیادہ پایا جاتا ہے۔ اگرچہ وہ بھی واقعات سے کسی حقیقت ہی کا انکشاف کرتے ہیں مثلاً قطعہ (چیونٹیوں کا بلا بن جانا)، قطعہ (سبب ...)، پسر امیر زادہ کی تضحیک)، قطعہ (رحم کر کے ایک مالی کی ترقی رکھنی)، قطعہ (نوکروں پر سخت گیری کرنے کا انجام)، قطعہ (ماتمی ... نوکروں کا نرالا سا ...) وغیرہ وغیرہ ——— ان میں سے اکثر میں حالی نے زندگی یا کسی اصلاحی حقیقت ہی کا انکشاف کیا ہے مگر ان میں سے بعض قطعات بے ڈھنگے ہو گئے ہیں مثلاً "قوم کی پاسداری" اور "چندہ بازی کا انجام" اچھی حکایتیں ہو سکتی تھیں مگر ان میں آخر تک پہنچتے پہنچتے حکایت کا زور کم ہو گیا ہے یوں ان نظموں کا ڈھانچہ قطعاتی ہی ہے لیکن بیان کا زور کم ہے اور آخر میں تو عبارت کی لہر بہت کمزور پڑ جاتی ہے۔

حالی کے زوردار قطعے وہ ہیں جن کے آخر میں تضمین ہے۔ ایسے قطعے جیسی مرزا نصیب کے ... ہیں۔ ہر ایک قطعہ آخری شعر کی تضمین کی طرف بڑھتا گیا ہے اور آخر میں صورت تضمین پر پہنچ کر اثر کی انتہا ہو جاتی ہے مثلاً مشاعرہ کی طرح پر غزل نہ لکھنے کا عذر ... کر پڑھیے، اس قطعے میں ایک وحدت یا تاثر ہے جس کے ... مگر باقی اشعار پیچھے گئے ہیں اور قطعے کی تفصیل اثر کو کمزور کرنے کی بجائے اثر میں اضافہ کر رہی ہے۔ چیونٹیوں کا جن جانا بھی ایک تضمینی قطعہ ہے۔ اس میں واقعہ کی ترتیب بھی ہے اور بیان بھی اور تضمین نے تو خاص زور پیدا کر دیا ہے۔

میں کہہ آیا ہوں کہ قطعے میں دو چیزیں اہم ہیں حالی نے ... ہیں۔ ایک چیز تو ہے کسی حقیقت کا اظہار، یہ واقعہ و مکالمہ کی صورت میں ہو تو بہتر ہے اور دوسری اس کا برجستہ انداز بیان جس میں طنز کی نیش یا اثر آفرینی ہو۔ حالی بیان حقیقت اور واقعہ و مکالمہ کی حد تک تو ٹھیک

[illegible] قطعہ ملاحظہ کیجئے —

[illegible] | [illegible]
[illegible] | [illegible]
[illegible] | [illegible]

یہ قطعہ کتنا سپاٹ، کتنا خشک، کتنا بے نمک ہے۔ ہر قطعے کے آخری مصرعے میں [illegible] حالی [illegible] اس قسم کا ایک اور قطعہ ملاحظہ کیجئے —

[illegible] | اپنے اوزاروں کو وہ [illegible]
[illegible] | اچھے [illegible]

اس قطعے میں ایک [illegible] ہی ہوتی ہے مگر [illegible] اس سے کہ بات سپاٹ [illegible] کی گئی ہے اور سپاٹ انداز بیانی اطلاع یا طنز کی حد تک ٹھیک ہے [illegible] نہیں دے سکتا۔ [illegible] ظرافت کی جیسے [illegible] مثلاً تضاد نما حقیقت یا حقیقت نما تضاد، PARADOX ہے یا ترکی بہ ترکی جواب [illegible] لفظی نکتہ آفرینی ہے یا خود کلامی ہے یا تمثیل سے وغیرہ وغیرہ —— یہاں تک کہ انگریزی اصطلاح کی WIT سے بھی کام لیا ہے۔ اگرچہ انہوں نے یہ انداز بہت کم اختیار کیا ہے اور یہ اچھا ہی کیا ہے کیونکہ [illegible] دراصل حالی اس میدان کے مرد نہ تھے یہ میدان اکبر ہی کے اشہب قلم کے لیے مخصوص تھا۔ حالی نے اکبر کے رنگ میں جو قطعہ لکھا ہے وہ درج ذیل ہے —

جب تک نہ شاہزادہ اٹھارہ سال کا ہو | تخت پدر پہ اس کو ممنوع ہے بٹھانا
قانون ہے بنایا یہ ان مقننوں نے | عالم میں آج کل جو مانے ہوئے ہیں دانا
لیکن کریں نہ اس کی قبل از بلوغ شادی | کہتے ہیں وہ عبث ہے قانون یہ بنانا
نزدیک ان کے گویا عقل و دانش | ہے مملکت سے آساں [illegible] کو بس میں لانا

اس قطعے کے آخری مصرعے میں لفظی مزاح موجود ہے مگر اکبر کے اسی قسم کے قطعات کو اس کے برابر رکھ کر دیکھئے تو فرق خود بخود واضح ہو جائے گا۔

سطور بالا میں جو کچھ کہا گیا ہے اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ میں حالی کے قطعات پر خواہ مخواہ اعتراض کر رہا ہوں —

میں تو صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حالی کے قطعات بہاؤ کی طبیعت کا اثر ہے جس کی وجہ سے ان میں سے بعض کچھ خشک ہو گئے ہیں اور وہ ایسے کے پیسے ہوئے جسم میں بعض اوقات جان نہیں ڈال سکے ورنہ یہ امر واقعہ ہے کہ شعر و ادب میں حالی نے قطعہ نگاری کا ایک نیا معیار قائم کیا ہے ۔۔۔ اور قطعے کی اس روایت کو زندہ کیا ہے جس کا سلسلہ سعدی سے جا ملتا ہے۔ انھوں نے قطعات کی صنف اور اشعار کے سلسلے میں اپنے ذوق کو رہنما بنایا ہے اور اگر غور کیا جائے تو قطعے میں صنف اور اشعار کی جو آزادی ہے اس کے پیش نظر صنف اور اشعار موضوع و مضمون کی نوعیت کے مطابق ۔۔ زوں کی بہتائی ہی سے متعین ہو سکتی ہے۔ اس کے لیے کسی قاعدہ و قانون کی ضرورت نہیں۔

حالی کے دیوان میں کچھ لمبے قطعے بھی ہیں جو موزوں طول سے کچھ زیادہ ہی لمبے ہیں اور دیوان میں بھی ان کو قصائد ہی کے ساتھ رکھا گیا ہے۔ یہ قطعات بعض واقعات تاریخی یا موضوعات وقتی کے ساتھ وابستہ ہیں اور بعض کا رنگ کچھ مختلف ہے۔ ان سب میں مضمون کا تسلسل پایا جاتا ہے مگر یہ مثنوی قسم کی نظمیں ہیں ان میں ایک آدھ کے سوا کسی میں کوئی خاص بات نہیں پائی جاتی۔ ان کے اصل اور معیاری قطعات وہی ہیں جن کے ذکر میں کہہ آیا ہوں کہ حالی نے غور کر جہاں بھی سمیٹنے کی کوشش کی ہے وہاں ہی ان کے یہاں ایجاز سے اعجاز پیدا کیا ہے مثلاً حالی کی رباعیات اور غزل دونوں میں اختصار کی ضرورت نے جو حسن پیدا کیا ہے۔ حالی کی بعض رباعیوں میں بھی قطعات کا رنگ پایا جاتا ہے اور ان کی شوخی و برجستگی اور آخری مصرع کے زور نے ان میں بھی بڑی قوت پیدا کر دی ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ حالی کی رباعیات ان کے قطعات سے زیادہ موثر ہیں مگر قطعہ نگاری میں بھی وہ صرف اس سے نامت ہوتے ہیں ۔۔۔ ان کے قطعات واضح و مکالمی کی بنیاد پر کہے گئے ہیں اور ان میں ظرافت کا لطیف رنگ بھی پایا جاتا ہے مگر ان کے مزاج میں چونکہ عمومی طور پر ملائمت پائی جاتی ہے اس لیے طویل بیان کے بعد ملائم طنزیہ بیان نرم پڑ جاتا ہے۔ جہاں ایسا نہیں ہوا اور طنزیہ بیان مختصر ہے (مثلاً "دلی کی شاعری کا تنزل" میں) وہاں قطعہ خوب برجستہ بیٹھا ہے۔

بہر حال حالی کے قطعات ان مختصر نظموں کے پیش رو ہیں جن کی حسین ترین شکل شبلی، اقبال، اکبر اور ظفر علی خاں کی واقعاتی اور تاریخی نظموں میں ملتی ہے جو یقیناً حالی کے قطعات (اور دوسری نظموں) سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہوں گی۔

اردو ادب اور تحقیق

مظفر علی سید

نقاد اور محقق ہمارے زمانے کے دو ماہرین ہیں۔ نقاد یا ناقد عام طور پر ادب کی دنیا کے سب سے انصاف پسند منصف کو نیز نقاد کہا جاتا ہے اور محقق، حق جاننے والوں کو کہا جاتا ہے۔ ہمارے معمولی نقطۂ نظر سے کہ سلسلے میں پڑھنے والوں تک کے بعد لفظ ہر نوعیت کی ایک ایسی نفاست کے لیے ہیں کہ اس سے ظرافت زیادہ ہوتی ہے اور محسوس ہوتا ہے۔

بہرحال تقسیم کار کا زمانہ ہے۔ ایک صاحب ہیں وہ لکھنے کے ماہر ہیں گویا کہ ہر ایک کی طرف اگر آپ دو سے زیادہ کا مسئلہ ہے تو کسی اور ماہر خصوصی سے رجوع کرنا پڑے گا۔ صنعت و حرفت میں یہ تقسیم کار کے بعد گزرے میں مگر ادب میں یہ چیز کچھ اس طرح داخل ہو گئی ہے کہ ایک خوادیب کا ذہنی ہونا تو سمجھ میں آتا ہے ایک شاعر کا محقق ہونا سمجھ میں نہیں آتا۔

محمد حسین آزاد نے آب حیات لکھی تو اس بات پر غور کرنا پسند نہ کیا کہ یہ تنقید کی کتاب ہو گی یا تحقیق کا نمونہ یا تذکرہ یا مرقع۔ بعد کے لوگ اس الجھن میں پڑ گئے کہ یہ کیا ہے۔ کسی نے کہا تذکرہ نما مرقع ہے کسی نے کہا تنقید کی کتاب ہے اور اب جا کر یہ بھی ماننا شروع کر دیا ہے کہ اپنے وقت کا سب سے بڑا تحقیقی کارنامہ بھی ہے۔ آزاد نے ایک موضوع انتخاب کیا اس کے لئے جو کچھ موزوں سمجھا، ذہانت، ذوقِ ادب اور تخیل سب کی ضرورت تھی اور چونکہ ان میں سے کوئی چیز ان پر حرام نہ ہوئی تھی انھوں نے سب کو جمع کر کے ایک ایسی تحریر ہمارے سامنے پیش کی کہ اردو کا ایک عام پڑھنے والا اُسے شوق سے پڑھتا ہے اور ایک شائق مزاج عالم اس میں نت نئی باتیں دریافت کرتا رہتا ہے۔

غالب نے آتش کے بارے میں کہا ہے کہ اچھے شاعر تھے مگر یک فنے تھے۔ اس بلیغ فقرے میں ایک جہانِ معنی مضمر ہے۔ آتش اردو کے ان چند شاعروں میں سے ہیں جنھوں نے غزل کے سوا کچھ نہ کہا اور اس کے باوجود غزل میں کسی نئے انداز یا اسلوب کے حامل نہ بن سکے۔ جو ادیب یا شاعر اپنے آپ کو ایک ہی صنفِ کلام تک محدود کر لیتا ہے وہ اس میں بھی کوئی مجتہدانہ شان پیدا نہیں کر سکتا۔ ہمارا زمانہ اس کے برعکس سوچتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ سوچتا نہیں کہتا ہے۔ فلاں صاحب غزل بہت اچھی کہتے ہیں، فلاں رباعی کے استاد ہیں، فلاں نے قطعات اچھے لکھے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس۔ یہ بات بہت کم لوگ سمجھتے ہیں یا سمجھنا چاہتے ہیں کہ مختلف اصنافِ کلام، لفظوں کی مختلف ترتیب پیش کرتے ہیں اور ان میں سے کوئی ترتیب ایسی نہیں کہ ایک پر حرام ہو اور دوسرے پر حلال۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کسی کا ذہن ہی ایسا ہو کہ ایک خاص ترتیبِ الفاظ سے باہر نہ نکل سکے مگر یہ کہ سب ذہن ایک سے ہو جائیں یا ایک ایسی

خواہش ہے جو ہماری جمہوریت بھی پوری نہیں کر سکتی۔

ہمارے ہاں صرف جو خود کو تخلیقی فنکار سمجھتے ہیں، کم از کم نقادوں سے گلہ رکھتے ہیں۔ اس شکایت کی وجہ یہ بھی ہے کہ اگر ان کا نام کسی لمبی فہرست میں آ جائے تو خوش ہو جاتے ہیں مگر بعض حالات میں نقادوں سے بڑھ کر اس صنف کلام سے ملتے ہیں جسے تنقید کہا جاتا ہے۔ یہ بات اب عام طور سے مانی جاتی ہے کہ تنقید ایک معتبر صنف ادب ہے اور اس کے لکھنے والے ہیں سے بھی زیادہ حقارت کے مستحق نقاد لوگ اس حقارت کا مقابلہ اپنے تخلیقی ہم عصروں سے لینے کی بجائے ایک دوسرے طبقے سے لیتے ہیں جو بستے جاتے ہیں۔ وہ طبقہ جو محققین کرام کے نام نامی سے موسوم ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ تنقید حقیر ہے تو تحقیق حقیر تر۔ نقاد تو پھر بھی زندہ ادیبوں کے کسی کام آتے ہیں یا آ سکتے ہیں، یہ محقق لوگ گزرے ہوئے اکابر سے رجوع کرتے ہیں اور ان کتابوں یا مصنفوں پر اپنی توجہ صرف کرتے ہیں جن کو کوئی نہیں جانتا اور کوئی نہیں جاننا چاہتا۔

تخلیق، تنقید، اور تحقیق ہماری زبان میں باہم دست و گریباں ہیں۔ اگرچہ اس جنگ و جدل کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ بیسویں صدی کے آغاز میں انگریزی زبان کے چند ایک محقق حضرات نے سترھویں صدی کے شاعروں پر توجہ کی۔ ان کا کلام نئے سرے سے مرتب کیا، اس پر حواشی اور دیباچے لکھے جس ماحول اور تہذیبی پس منظر میں ان شاعروں نے بسر کی تھی اسے واضح کیا۔ یہ کلام ان کے ذریعے سب سے نوجوانوں میں رائج ہوا اور وہ نوجوان جو نئے زمانے میں نئی قسم کی شاعری کرنا چاہتے تھے ان کو اس پرانی شاعری میں کچھ ایک ایسی چیز نظر آئی جو انگریزی ادب میں فراموش کر دی گئی تھی اور جس کو ایک نیا موڑ دیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ ان محقق حضرات کے ذریعے انگریز شاعروں کا دور پہلی مرتبہ سامنے آیا، اس نے شاعری نے ایک نئے دور کو جنم دیا اور اس طرح روایت کا تجربے سے رشتہ بندھا۔

تجربہ اور روایت کی بحث ہمارے دور کی معرکے کی بحثوں میں سے ہے، اور ہم اپنے نقادوں کو اس بحث کی دونوں اطراف میں بڑی آسانی سے تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے ادب ہمیشہ روایت ہے۔ دوسرا کہتا ہے یہ چیز ہمیشہ نیا تجربہ ہے۔ ایک کہتا ہے کہ حال، ماضی کی کوکھ سے پیدا ہوتا ہے اور چاہے نہ چاہے اسے پیدا ہونا ہی پڑتا ہے۔ دوسرا کہتا ہے کہ ہم اپنے آپ کو خود جنم دیتے ہیں۔ تخلیق ادب کا ماضی سے کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ ایک گروہ غالب کا یہ شعر پڑھتے سنتا ہے ؎

ہرزہ مشتاب و پئے جادہ شناساں بردار
اے کہ در راہ سخن چوں تو ہزار آمد و رفت

اور دوسرا یہ شعر ؎

تو اے کہ محو سخن گسترانِ پیشینی — مباش منکر غالب کہ در زمانۂ تست

دونوں گروہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ یہ شعر ایک ہی آدمی نے کہے تھے اور محقق حضرات خصوصاً اس بات پر توجہ نہیں کرتے کہ غالب نے پہلا شعر کب کہا اور دوسرا کب۔ وہ اس بات کو جان سکتے تھے کہ پہلا شعر اس نے اس وقت کہا جب وہ اپنے نکالے ہوئے راستے کو ماضی کی شاہراہ سے مربوط کرنا چاہتا تھا اور دوسرا شعر اس وقت کہا تھا جب اس کا واسطہ ماضی پرستوں سے پڑا تھا جو باندھی ہوئی لیک پر چلنے پر فخر کرتے تھے اور ہر اس کو جو کوئی نیا راستہ نکالنا چاہتا تھا اس کو گمراہ سمجھتے تھے۔

[illegible] ہے جو غیر [illegible] کے بارے میں لکھے ہوئے ہیں [illegible]
[illegible] شاعری [illegible] کی بنا پر [illegible]
[illegible] حاصل [illegible] نہیں [illegible]
[illegible] کی دولت سے [illegible] طباعت و اشاعت [illegible]
[illegible] سرکاری [illegible] کے ہیں [illegible] کی کوشش کی [illegible]

آزادی کے فوراً بعد یہ محسوس کیا جانا چاہیے تھا کہ جس ادبی ورثے کو محفوظ اور شائع کرنے کے لیے کوئی [illegible] ہے۔ [illegible] زبان کے بیشتر [illegible] کی صورت میں [illegible] ہندوستان کے کتب خانوں میں رہ گئے تھے [illegible] پنجاب میں جس [illegible] بہت سے تھے جن کا رواج [illegible] تھا [illegible] دلی اور حیدر آباد [illegible] سے بھی بڑی [illegible] پر توجہ کی ضرورت تھی۔ [illegible] انڈیا آفس [illegible] اور یورپ کے عجائب گھروں اور کتب خانوں میں بے شمار قدیم تحریریں محفوظ تھیں۔ بقول اقبال ؎

مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو مغرب میں تو دل ہوتا ہے سیپارا

ہماری وزارت تعلیم اور یونیورسٹیاں اس قومی امانت کو واپس لینے یا اس کی عکسی نقلیں حاصل کرنے کے لیے بہت کچھ کر سکتی تھیں مگر اس کام کی اہمیت کا احساس ہی نہ کیا گیا۔ وجہ یہ کہ اہل علم کے دل سی پارہ ہوتے رہے اور علم ہماری دسترس سے دور ہوتا گیا۔

ہماری نت نئی حکومتوں کو یہ اندازہ تو دلایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے انڈیا آفس لائبریری کی تقسیم کے بٹوارے کا ذکر نہ کیا مگر وہ مختلف ادارے جو سرکاری امداد سے وجود میں آئے اس کی کسی حد تک تلافی کر سکتے تھے اگر ان کے اہل علم اس کام کے بارے میں صحیح نقطۂ نظر اور دیانت سے کام لیتے۔ ان کے مقابلے میں تو تجارتی اداروں نے بھی بہتر کام کرنے کی کوشش کی ہے۔ امداد یافتہ اداروں نے آج تک اردو کی کوئی ایسی پرانی کتاب شائع نہیں کی جو پہلے اُن سے بہتر حالت میں نہ چھپ چکی ہو۔ فغان دہلی، دیوان شیفتہ اور حیات جاوید ایک ادارے نے شائع کیں لیکن یہ تینوں کتابیں مطبوعہ ایڈیشنوں کی نقل ہیں، کتابت کی بے شمار غلطیوں کے اضافے کے ساتھ۔ ان کتابوں کو نئے انداز سے مرتب کیا گیا نہ ان میں نیا مسالہ شامل ہو سکا، یہاں تک کہ ان کی ظاہری صورت بھی پہلے سے بہتر نہ بن سکی۔ معلوم نہیں اس انداز کے کام کے لیے سرکاری امداد کی کیا ضرورت تھی۔ جبکہ اس سے بہتر کام تو بغیر امداد کے بھی ہوتے رہتے ہیں۔ یہی عالم کراچی کے ایک امدادی ادارے کا ہے جس نے بیش قرار امداد پانے کے بعد صرف 'باغ و بہار' کا ایک ایڈیشن شائع کیا اور وہ بھی ایک برطانوی ایڈیشن کی نقل۔ پاکستان کی کسی یونیورسٹی نے اردو ادب سے متعلق کوئی کتاب شائع نہ کی۔ حالانکہ آزادی سے پہلے پنجاب یونیورسٹی کبھی کبھار ایسی غلطی کر دیا کرتی تھی۔

بزم اقبال، اقبال اکیڈمی، مجلس ترقی ادب، ادارہ ثقافت اسلامیہ، اکادمی، اردو ٹرسٹ، اور انجمن ترقی اردو کی جدید مطبوعات میں اول تو صرف دس پانچ کتابیں ایسی نکلیں گی جو اردو ادب سے متعلق ہوں۔ پھر کئی برسوں کی امداد کے بعد بھی ہنوز روز اول کا سا معاملہ ہے ہمارا قومی ورثہ بدستور کیڑے مکوڑوں کی خوراک بن رہا ہے یا ان عجائب گھروں اور کتب خانوں کی زینت ہے جو ہماری دسترس سے باہر ہیں

ان اداروں کے مقابلے میں ہندوستان کے افراد، تجارتی فرموں اور ہم نے چھوٹے اداروں کا کام دیکھیں تو حیرت ہوتی ہے کہ جگہ جگہ ہماری جیسے مسلمان تو اداروں سے بغیر ہی ایسا کام کر گزریں اور ہم اداروں کے باوجود کچھ نہ کر سکیں، اس سے شرمناک بات کیا ہوگی۔

قومی ورثے کو محفوظ کرنے کا فریضہ ملک کے ادارہ حاصل کرنا ادارے کو کام دیگر میں ملانا، شاید اس سے بہتر کام ہمارے اپنے جھوٹے بس میں نہیں تھا۔ ایک صدی پہلے ایک ہندو تاجر نے تاجرانہ مصلحتوں سے کام لے کر اس قومی ورثے کو چھاپ کے بیچنے کا ارادہ کیا اور یوں نولکشور پریس وجود میں آیا۔ اس اکیلے آدمی نے اپنے تنخواہ دار ملازموں کی مدد سے وہ کام کیا کہ ہمارے امداد یافتہ ادارے اپنی عمر کی امداد سے بھی شاید ایک صدی تک نہ کر سکیں۔ منشی نولکشور تو خیر ایک لاجواب شخصیت تھے، ہمارے ادارے تو نظامی پریس کا بدایوں تک کا مقابلہ نہیں کر سکے جس نے اردو ادب کی کئی ایک کتابیں دیدہ زیب انداز میں چھاپ کے انھیں رواج دیا۔ اس ادارے کی پشت پر بھی اس زمانے کے دو ایک اہل علم تھے جو نام و نمود اور بیش قرار معاوضوں کی بجائے علمی کام میں دلچسپی رکھتے تھے۔

یہاں یہ سوال کرنا بالکل ٹھیک ہوگا کہ آخر اس قومی ورثے میں ایسے کیا لعل جڑے ہیں کہ اسے محفوظ کیا جائے یا دوسرے لفظوں میں عوام تک پہنچایا جائے۔ کیا ہمیں عصر اور جدید ادب کافی نہیں ہوتا؟ کیا اس کام پر ضرورت سے زیادہ توجہ دینے سے مردہ پرستی کا رجحان پیدا نہیں ہوتا؟ اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ ماضی سے بے تعلقی ماضی پرستی کو جنم دیتی ہے، ہم اپنے قومی ورثے سے جتنی گہری واقفیت پیدا کریں گے اسی قدر نئے کام کی طرف راغب ہوں گے۔ ہمارے دور میں بدترین قسم کی مردہ پرستی کا رواج ہے اور اس کا اصل باعث یہ ہے کہ ہم اپنے ماضی کے کارناموں اور شخصیتوں سے اچھی طرح واقفیت نہیں رکھتے۔ ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ ان میں کون واقعی قابلِ احترام ہے اور کیوں! جب ہم یہ جان لیں گے تو عزت و احترام کی بنیادیں بھی مضبوط ہو جائیں گی۔ اور ہمارا اپنا معیارِ نظر بھی بلند ہوگا۔

ہمارے تخلیقی فن کار اس قسم کے کام پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور اس حد تک وہ بالکل درست ہیں کہ جس انداز میں یہ کام ہمارے یہاں ہوتا ہے اس سے نہ ہونا ہی بہتر ہے مگر اس صورتِ حال سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ ماضی کا تمام ورثہ دریا برد کر دینا چاہیے۔ یہ غلط فہمی بھی عام طور پر پائی جاتی ہے کہ تخلیقی فن کار کو ایسے کاموں سے دور رہنا چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ علم اگر سچا ہے تو تخلیق کے لیے زہر کا حکم نہیں رکھتا، اکسیر کا کام دیتا ہے۔ شبلی، حالی اور آزاد کی تخلیقی صلاحیتوں نے علم و فضل کی دولت سے جلا پائی تھی اور آج بھی یوں ہونا ممکن ہے۔ ان سے ذرا چھوٹے پیمانے پر حسرت موہانی کی شخصیت ہے جنھوں نے ماضی کا ورثہ محفوظ کرنے کی انفرادی کوشش کی اور اس کوشش میں ان کی شاعری دبنے کی بجائے اور نمایاں ہوئی۔ "انتخابِ سخن" کی گیارہ جلدوں میں اردو غزل کی روایت کا بہترین حصہ محفوظ ہو گیا ہے اور ان میں ایسا ذخیرہ بہت سا ہے کہ حسرت موہانی اس طرف توجہ نہ کرتے تو اب تک تلف ہو چکا ہوتا۔ تیس ایک سال پہلے کئے گئے اس کام پر ہمارا زمانہ اب تک کوئی خاص اضافہ نہ کر سکا۔ شاہ حاتم، قائم، مصحفی، جرأت وغیرہ سے ہماری جو واقفیت ہے۔ آبِ حیات کے بعد حسرت موہانی ہی کے ذریعے پیدا ہوئی ہے۔ ہمارے زمانے نے ان ناموں کی قدر کرنا تو سیکھ لیا مگر اس قدر دانی کا جو حق تھا اُسے ادا نہ کیا۔

حسرت موہانی مرحوم کا یہ کام بحیثیت تحقیقی کام تو نہیں کہا جا سکتا مگر اُس قسم کے شاعروں کی نظریہ جہالت کے مقابلے میں یہ کام بھی علمی ہی کہلائے گا۔ تحقیقی کام اسے اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ ترتیب و تدوین کے جدید علمی اصول یہاں استعمال نہیں کئے گئے۔ یہ جدید علمی اصول یورپ کی درسگاہوں اور کتب خانوں میں متعین کئے گئے۔ ان میں سے بعض ہماری کلاسیکی زبانوں کے علماء کی نظروں سے بھی اوجھل

ہیں جو اگرچہ اردو ادب میں تحقیقی کام یورپ کے علماء نے ہی شروع کیا اور اردو زبان و شاعری کے کارنامے انہوں نے ہی پیش کیے تھے لیکن ہم تو جس طرح بالکل انفرادی طور پر اور دوسری زبانوں سے الگ رہ کر ان کا مطالعہ کیا اسی طرح اردو مباحث بھی ہوتی ہیں۔ بہرحال ان لکھنے والوں میں بعض اہلیت کے اعتبار سے متوازن اور بلکہ اچھی طرح سے اصلاح ہوئے۔ اگرچہ یہاں ان میں سے بعض کا مقام بہت بلند ہے مگر ان کی اہمیت کا ذکر یہاں بھی کیا جاسکتا ہے۔ گارساں دتاسی جس کا نام سب اردو خوانوں کے لیے نیا نہیں۔ اردو ادب کے محقق کے مقام کی حیثیت کا مالک ہے۔ وہ فرانسیسی عالم جس نے پیرس میں بیٹھ کر اردو زبان و ادب کی تعمیر سے کر عہد وسط کے اشاعات کیے۔ اردو ادب کی تاریخ میں یہ پہلا مستشرق ہے جو اس وسیع میدان میں ایک اہم حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے لیکچروں کا ابھی تک صحیح استفادہ نہیں کیا گیا۔ اس کی "تاریخ ادبیات ہندوستانی" اگرچہ پوری طرح اردو میں ترجمہ نہیں ہوئی مگر یہ بات بھی جانتے ہیں کہ جزوی غلطیوں اور مسامحات کے باوجود اردو کے اولین شاعروں کی اس سے معتبر کوئی بیاض اصل ذخیرہ کی بجائے نہیں ملتی۔ اس کے خطبات اردو میں چھپ کر اپنا علمی مقام حاصل کر چکے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی اس نے اردو ادب پر بہت سا کام کیا۔ فرانسیسی زبان میں کئی ایک اردو تحریروں کے ترجمے کیے اور اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ کہ اردو شاعری کے چند ایک اچھے انتخاب علمی اصولوں کی بنیاد پر مرتب کیے۔ چند کتب کی تصحیح کے علاوہ اس سلسلے میں اس کا سب سے بڑا معرکہ کلیات ولی کی ترتیب و تدوین تھا۔ جس سے ہمارے یہاں پورا فائدہ اٹھایا نہیں گیا اور اس کے طویل دیباچے سے جو اب تک اردو میں ترجمہ نہیں ہوا۔

دتاسی کے علاوہ دوسرا بڑا نام ڈنکن فوربس کا ہے جس نے ایک عمدہ ہندوستانی انگریزی لغت کے علاوہ "باغ و بہار" کا بہترین ایڈیشن بھی نئے سرے سے مرتب کرکے شائع کیا جس کی اہمیت کا یہاں سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اب سے طلباء اب تک اس کی نقل کئے چلے جاتے ہیں۔ افسوس کہ دتاسی اور فوربس کی طرح کے لوگ یورپ میں پیدا ہونے بند ہو گئے ورنہ یہ کام اس سے بہت آگے جاسکتا تھا۔ مشرقیات سے دلچسپی رکھنے والے یورپی علماء نے عربی، فارسی اور ترکی پر اپنی توجہ مرکوز کر دی اور اردو زبان کی وسعت اور معنویت کو فراموش کر دیا۔ ای۔ جی۔ براؤن، نکلسن، بروزن، اور ان کے بعد آربری نے اردو ادب کو کوئی خاص اہمیت نہ دی اور ان کے پڑھائے ہوئے ہندوستانی علماء نے بھی ان کی طرح فارسی عربی ادب پر ہی توجہ دینا پسند کی۔ مولوی محمد شفیع، پروفیسر اقبال مرحوم اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے خود اردو ادب پر کوئی خاص کام کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

جدید علمی خطوط پر اردو ادب کی دنیا میں تحقیق و تفتیش کا کام ہمارے علماء نے بڑی دیر میں شروع کیا اور اس کے دو ممتاز سرخیل ایک پرانی قسم کے عالم نے کی۔ مشہور شاعر اختر شیرانی کے والد حافظ محمود شیرانی مرحوم مستشرقین کے شاگرد نہ تھے مگر برٹش میوزیم کی ملازمت کے دوران میں جدید علمی اصولوں سے انھوں نے ضرور آگاہی پیدا کی ہوگی۔ "پنجاب میں اردو" اور "تنقید شعر العجم" ان کے مشہور کارنامے کہے جاتے ہیں۔ دوسری کتاب فارسی شاعروں پر نئی تحقیق پیش کرتی ہے مگر انہی کی ایک دوسری کتاب "فردوسی پر چار مقالے" کی طرح اردو میں لکھی گئی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے پرتھوی راج راسو پر کچھ تاریخی کام کیا اور محمد حسین آزاد کی تحقیق میں غلطیاں نکالیں۔ یہ مقالات شیرانی میں قصہ چہار درویش اور میر جعفر زٹلی پر ان کے مضامین کا بھی اسی سلسلے میں تذکرہ کیا جاسکتا ہے۔ ان کا مرغوب انداز تحقیق خوردہ گیری اور نکتہ چینی کا ہے۔ ان کی توجہ اس بات پر زیادہ مرکوز رہتی ہے کہ پچھلے لوگوں نے کیا کیا غلطیاں کیں اور کیا کیا حماقتیں ان سے سرزد ہوئیں۔ ان کا علم و فضل اس قابل تھا کہ اس سے کوئی مثبت قسم کا کام لیا جاتا۔ "پنجاب میں اردو" اس قسم کا ایک کام تھا اور قدرت اللہ قاسم کا تذکرہ

"مجموعہ نغز" بھی جو انھوں نے ایڈٹ کر کے پنجاب یونیورسٹی سے شائع کیا، پنجاب میں ان کا طویل قیام اور شاگردوں کے حلقے پیدا کرنا اس بات کا متقاضی تھا کہ اردو ادب میں تحقیق کا ایک نیا دور شروع ہوتا مگر ان کی ذات سے خود گیری اور تفاصیل پرستی کے رجحانات نے بعد ترجیحاتی اور تحقیقی کام میں مذہبی مناظرے کا سا انداز پیدا ہوا۔ ندوہ اور علیگڑھ سے ان کی لڑائیاں ساری عمر چلتی رہیں اور بہت سا وقت اور کاغذ ان پر برباد ہوا۔ انجمن ترقی اردو نے بھی جو ان کی مربی اور ممد و معاون تھی۔ ان سے کوئی اچھا کام نہ لیا۔ اور اس طرح ایک دقیق النظر عالم ذاتی اور گروہی منافقتوں کا شکار ہو کے رہ گیا۔ شیرانی مرحوم نہ پوری طرح پہلی قسم کے عادی تھے نہ پوری طرح دوسری قسم کے وہ درختوں کے پتوں اور ان کے رگ ریشوں پر بے حد توجہ کرتے تھے اور درخت کو بھول جاتے تھے۔

اسی زمانے میں انجمن ترقی اردو نے منشی نولکشور کے انداز پر مگر خالص علمی دعووں کے ساتھ قومی ورثے کو محفوظ کرنے کا پروگرام شروع کیا۔ ان دو اداروں میں کوئی فرق تھا تو یہ کہ منشی نولکشور کی توجہ قومی سرمائے کے تخلیقی حصے کو محفوظ کرنے پر مرکوز تھی اور انجمن نے اس کے علمی حصے کو اپنا مخصوص میدان بنایا۔ شاعروں کے دیوان، مثنویاں اور قصے کہانی کی کتابیں انجمن کے زیر اہتمام بھی طبع ہوئیں۔ مگر ان میں کوئی ایسی نہ تھی کہ بنیادی اہمیت کی مالک ہوتی یا کوئی بڑا کام سمجھی جاتی۔ زیادہ تر توجہ شعراء کے تذکروں پر کی گئی۔ مولوی عبدالحق معتمد انجمن نے بہت سے تذکرے مرتب کر کے انجمن کے زیر اہتمام طبع کرائے۔ میر، گردیزی اور قائم کے تذکرے، مصحفی کے تین تذکرے، مخزن شعرا، گلشن ہند اور چمنستان شعراء انھوں نے ایڈٹ کر کے چھاپے۔ اس کے علاوہ ذکر میر، سب رس، قطب مشتری، من لگن، دیوان تاباں دیوان اثر، مثنوی خواب و خیال، باغ و بہار، آرائش محفل (افسوس) اور رانی کیتکی کی داستان بھی ان کے دیباچوں کے ساتھ طبع ہوئیں۔ — ترتیب و تدوین کے ساتھ ساتھ انھوں نے چند ایک مضامین بھی لکھے اور بیجاپور کے "ملک الشعراء" نصرتی پر ایک پوری کتاب تصنیف کی۔ ملک کے اہل علم نے ان کے ساتھ تعاون کیا اور انجمن کے لیے کتابیں مرتب اور تصنیف کیں۔ شیخ چاند مرحوم کی تصنیف "سودا"، احسن مارہروی اور ان کے بعد نور الحسن ہاشمی کی مرتبہ "کلیات ولی"، مرزا فرحت اللہ بیگ کے مرتبہ "دیوان یقین" اور "دیوان نظیر"، نواب حبیب الرحمن خاں شیروانی کا مرتبہ "تذکرہ میر حسن" اور مسعود حسن رضوی کا مرتبہ "دیوان فائز" اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ آزادی کے بعد انجمن مہاجر ہوئی تو یہ کام جاری نہ رکھا جا سکا اور "دیوان فغاں" کے علاوہ کوئی نئی کتاب انجمن نے شائع نہ کی اور یہ دیوان بھی خود انجمن کے قائم کردہ معیار کو برقرار نہ رکھ سکا۔

ترجمہ اصطلاحات، انگریزی اردو لغت اور قواعد پر مولوی عبدالحق کے وقیع کام کا ان کتابوں میں اضافہ کیا جائے تو ایک بہت بڑی علمی شخصیت کی تصویر ابھرتی ہے مگر اس میں شک نہیں کہ انجمن کے وسائل بھی بہت وسیع تھے اور بہت سے اہل علم کا تعاون انھیں حاصل تھا۔ پھر بھی جدید علمی اصولوں پر مولوی عبدالحق کا انداز ترتیب اور ان کے دیباچے پورے نہیں اترتے۔ منشی نولکشور آنجہانی کی طرح ان کا مقصد بھی قومی ورثے کو محفوظ کرنا تھا، اور اس محدود مقصد کو سامنے رکھا جائے تو ان کے کام کی اہمیت نمودار ہوتی ہے۔ آزادی کے بعد یہ کام جاری نہ رہ سکا تو اس کی بڑی وجہ مولوی صاحب کا بڑھاپا ہے۔ اگرچہ بعض دوسرے اہم کاموں میں وہ اب بھی جوانوں کی طرح مستعد ہیں۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ وہ اپنے طویل تجربے اور اختیار سے کام لے کر نوجوان محققوں کی ایک جماعت تیار کر دیتے مگر شیخ چاند مرحوم کے بعد کوئی ایسا نوجوان انجمن نے پیش نہ کیا۔

لکھنؤ یونیورسٹی کے پروفیسر مسعود حسن رضوی اپنے ذاتی کتب خانے اور انفرادی کام کے لیے معروف ہیں اور ایک متانت طبیعت

[illegible] اور نقاد کی حیثیت سے [illegible]۔ سب سے زیادہ [illegible] غالب سے [illegible] کا پہلا [illegible] سے متعلق چند ایک تحقیقی مقالے اردو کے ادبی تحقیقی مضامین ہی لکھے ہیں۔ انھوں نے تحقیق کے [illegible] پر [illegible] [illegible] علامت ہی [illegible] [illegible] کے بارے کوئی دلچسپی رکھنے کا [illegible] ہے۔ [illegible] [illegible] کا تعلق تھا انھیں [illegible] سے [illegible] تحریر پیش کر دی جس سے [illegible] خود صاف ہو گیا۔ [illegible] ہندوستانی [illegible] ان کے مضامین [illegible] [illegible] کا ایک [illegible] بھی ہے۔ [illegible] [illegible] کے [illegible] میں انھوں نے [illegible] [illegible] سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ [illegible] ان کی [illegible] تصنیفات [illegible] فارسی [illegible] [illegible] کے دیباچے [illegible] کی مرتب [illegible] دیوان غالب اور [illegible] غالب کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ حال ہی میں ان کی دو کتابیں [illegible] شاہی [illegible] سے [illegible] ہے۔ ان کے تحقیقی مزاج [illegible] تصنیف "آب حیات کا تنقیدی مطالعہ" پیش کی جا سکتی ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے صرف [illegible] اعتراضات کرنے والوں کو [illegible] جواب دیتے ہیں بلکہ آب حیات [illegible] کو اردو تحقیق کی تاریخ میں پہلی مرتبہ وہ خراج تحسین ادا کیا ہے [illegible] سال سے [illegible] تھا۔ آب حیات [illegible] اردو زبان کی بہترین کتابوں میں سے نہیں بلکہ اس میں بڑی [illegible] سے بے شمار کتابوں کا [illegible] ہے۔ [illegible] اس کام کے حق میں [illegible] بلگرامی، مولوی عبدالحق [illegible]، مرزا فرحت اللہ بیگ، حافظ محمود شیرانی اور قاضی عبدالودود کے ہاتھوں ہو چکی [illegible] اس کتاب نے بڑی حد تک اس کی تلافی کر دی۔

ایک اور قابلِ احترام شخصیت جو اردو ادب کی تحقیق سے وابستہ ہے، مولوی امتیاز علی عرشی صاحب ہیں۔ رضا لائبریری رامپور کے مہتمم ہیں اور ان کے کام کی پشت پر والیِ ریاست کی علم دوستی اور ہندوستان بھر میں رامپور کی شہرت ہے۔ مگر انھوں نے اپنے بلند علمی معیار کی مدد سے ان ذرائع کو بہت اچھی طرح استعمال کیا ہے۔ شاہ عالم کی نادراتِ شاہی، انتخاب غالب کی دونوں نثری کہانیاں اور مکاتیب غالب کے جو ایڈیشن انھوں نے شائع کئے ہیں وہ کئی لحاظ سے بے مثل ہیں۔ حال ہی میں انجمن ترقی اردو (ہند) کے لیے انھوں نے جو "دیوانِ غالب" مرتب کیا ہے اُسے بڑی آسانی سے دیوان غالب کا بہترین علمی ایڈیشن کہا جا سکتا ہے۔ [illegible] کے تذکرہ "دستور الفصاحت" کو انھوں نے جس طرح ایڈٹ کیا ہے، وہ ان کے تحقیقی مزاج اور انداز کی بہترین مثال ہے۔ اس کتاب کا دیباچہ جو اردو شعرا کے تذکروں کی تاریخ ہے، اپنی جگہ ایک الگ تصنیف کا درجہ رکھتا ہے۔ جس طرح "مکاتیب غالب" کا دیباچہ غالب کی زندگی کا ایک عمدہ خاکہ بھی ہے۔ مسعود حسن رضوی کی طرح وہ تنقیدی نظر بھی رکھتے ہیں جو اس بات کا فیصلہ کرتی ہے کہ کونسا کام ان کی محنت کا مستحق ہے۔ اس کے بعد وہ دقتِ نظر اور وسعتِ مطالعہ دونوں سے کام لیتے ہیں اور اپنی تحقیق کے نتائج سنجیدگی آمیز سادگی کے ساتھ

واضح کر دیتے ہیں اور اس لیے ان کی تحقیق بھی ذاتی مناقشوں سے بہت دور ہے۔ ان کے کام کی رفتار بہت سست ہے اور بیزی بھی بعض معاملات میں وجدان کے کام کا انداز ہے مگر یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ وہ اردو کی ان بڑی کتابوں کو بھی نئے سرے سے مرتب کر دیں جو اب تک غلط چھپتی رہی ہیں مثلاً کلیات میر، کلیات سودا وغیرہ۔ اب تک ان کی توجہ زیادہ غالب و متعلقات پر رہی ہے اور اس کام میں مولوی مہیش پرشاد، غلام رسول مہر، مالک رام اور مختار الدین احمد سے ان پر بہت اضافہ کیا ہے مگر انھوں نے کوئی ایسا کام نہیں کیا جس کو کوئی دوسرا آسانی سے انجام نہ دے سکے۔

ادبی تحقیق کے میدان میں ایک شخصیت ایسی بھی ہے جس کے سر قد، ... تحقیقات ... بنے ہیں اور جو حافظ محمود شیرانی کے تحقیقی مزاج کو منطقی انتہا تک لے گئے ہیں۔ یہ قاضی عبدالودود ہیں جو رسالہ "معاصر" نکالنے کے علاوہ بہت سے ادبی اور تحقیقی جرائد میں مضامین لکھتے ہیں۔ خوردہ گیری اور تنقیص پر تو کا جو رجحان شیرانی مرحوم کے یہاں نظر آتا ہے وہ قاضی صاحب کی ہر تحریر کی ہر ہر سطر میں ملے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک آدھ مختصر سی کتاب کے علاوہ ان کی کوئی تصنیف یا تالیف دیکھنے میں نہیں آتی۔ اردو زبان کا شاید ہی کوئی عالم اور محقق ایسا ہو جو ان کی زد سے بچا ہو۔ محمد حسین آزاد، نواب نصیر حسین خیال، شاد عظیم آبادی، گارسیں دتاسی اور مولوی عبدالحق تو ان کے محبوب شکار ہیں۔ ان کے تحقیقی کارناموں میں قابل ذکر ان کا مضمون "غالب بحیثیت محقق" ہے جس میں انھوں نے غالب کو جاہل محض ثابت کرنے اور ساری دنیا سے اسے رد کرنے پر اپنی پوری علمی طاقت صرف کر دی ہے اور بیسیوں کتابوں، مضامین اور قلمی تحریروں کا حوالہ دیا ہے۔ انھوں نے زیادہ توجہ اس بات پر صرف کی کہ فارسی لغات نویسوں کے خلاف غالب کا جہاد کس پایہ کا تھا۔ یہ سوچنا انھوں نے گوارا نہیں کیا کہ اس جہاد کا باعث کیا تھا اور یہ بھی کہ غالب کے خلاف جو پرچم انھوں نے بلند کیا ہے اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ ان کے اس طرح کے مضامین سے غالب کی شہرت کو تو کوئی فرق نہیں پڑا۔ البتہ ان کا اپنا اور چند ایک نوجوان محققین کا مزاج اس سے مزید بگڑ گیا ہے۔ اس میں قطعاً کوئی شک نہیں کہ اردو زبان کو قاضی صاحب جیسا وسیع المطالعہ عالم آج تک نہیں ملا۔ مگر یہ بات بھی اردو زبان و ادب اور اس کے مختلف اداروں کی بدقسمتی کی ایک دلیل ہے کہ ان سے آج تک کوئی ایسا کام نہیں لیا گیا جو اردو ادب کے حسب شایان شان ہو اور ان کی علمی حیثیت سے بھی فرو تر نہ ہو۔ خود ان میں تنقیدی نظر کی اس حد تک کمی ہے کہ کام کرنے سے پہلے یہ غور نہیں کرتے کہ وہ ان کی توجہ کا مستحق بھی ہے یا نہیں۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ ان کے علمی دبدبے کے سامنے بڑی آسانی سے ماند پڑ جاتے ہیں مگر ان اساتذہ کے غلط کام پر توجہ کر کے مثبت کام سے اپنے آپ کو محروم رکھنا قابل معافی گناہ نہیں۔ اس سے تو بزعم خویش قسم کے علماء کو معاف کر دینا زیادہ آسان ہے۔ جو جتنا بڑا جوہر رکھتا ہے اس سے اتنی ہی بڑی توقعات وابستہ ہو جاتی ہیں۔

ڈاکٹر سید عبداللہ اب ایک نقاد کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں مگر ان کی پرانی تحریریں زیادہ تر تحقیق و تفتیش سے متعلق ہیں اور ان کی تنقید سے زیادہ محنت اور گہرائی کی حامل ہیں۔ "اردو شعراء کے تذکرے" ان کا ایک طویل مضمون ہے جو کتابی شکل میں بھی چھپ چکا ہے۔ اس کے علاوہ خان آرزو کی اردو فرہنگ "نوادر الالفاظ" کو انھوں نے عالمانہ انداز میں ایڈٹ کیا ہے۔ ان کی انگریزی تصنیف "اردو نثر۔ سرسید کے زیر اثر" تنقید سے زیادہ تحقیق کا کارنامہ ہے۔ ان کا تحقیقی مزاج بھی سنجیدگی اور متانت کا حامل ہے۔

[illegible] ڈاکٹر [illegible] کی تحریک [illegible]
[illegible] کی کتاب [illegible] تذکرہ [illegible]
[illegible] جب تک [illegible] کی سوانح عمری تحریر کی ہے۔ اسی کی تحریک [illegible] ناکہ کیا۔

محققین اردو کی تحقیقات کا موضوع نقاد اور ادب اور شاعر ہوتے ہیں جو کسی نہ کسی امتحان کے نصاب کا حصہ ہیں۔ جو خوش قسمت اس زمرے میں نہیں آتے اُن کو ہاتھ لگانا ان کے نزدیک گناہ کبیرہ جانا جاتا ہے۔ امدادی کتب کو ہمارے زمانے میں علمی اور ادبی کارنامے بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ یہاں تک بھی خیریت تھی اگر ان کتابوں میں کوئی نئی بات ہوتی یا کوئی تحقیقی کام ہوتا۔ ایسی تالیفات میں جلد بازی اور عبارت آرائی کے نمونے قدم قدم پر ملتے ہیں اور چونکہ مولفین کو اپنے موضوعات سے کوئی گہری واقفیت نہیں ہوتی اس لیے ان میں جا بجا ابہام رہ جاتے ہیں۔ ان مقامات نے محققین کے ایک نئے گروہ کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کیا ہے اور نوجوانوں کی تحریروں کا موضوع وہ نوزائیدہ تالیفات ہیں جو معلمین اردو نے اپنے طلباء کی رہبری کے لیے مرتب کی ہیں۔ ان نوجوانوں کی تحریروں میں نا آسودہ ذہن کی کارفرمائیاں بھی ہیں اور ان کی عیب جوئیاں اکثر اوقات "طبقاتی نزاع" کی یاد دلاتی ہیں مگر ان سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ یہی کام بہتر انداز میں بھی کیا جا سکتا تھا۔ ڈاکٹر ابو اللیث کی تالیف "لکھنؤ کا دبستان شاعری" اور "مصحفی" پر ڈاکٹر وحید قریشی کے مضامین [illegible] کا یہی عالم ہے۔ وحید قریشی ہمارے جانے پہچانے نقاد ہیں اور یہ بات بڑی حیران کن ہے کہ ڈاکٹر سید عبداللہ جیسے پرانے بزرگ تحقیق چھوڑ کے تنقید کی طرف راغب ہوئے ہیں اور نوجوان تنقید نگار تحقیق کی طرف لوٹتے ہیں۔ اصولاً اس میں کوئی خرابی نہیں اس لیے کہ مطالعہ رائے کو جنم دیتا ہے اور رائے کو صائب بنانے کے لیے مزید مطالعے کی ضرورت پڑتی ہے مگر ہمارے اکثر نوجوان اس چکر سے نکلتے ہی نہیں۔ حال ہی میں ہندوستان کے ذہین اور باخبر نقاد ڈاکٹر محمد حسن بھی تحقیق کی جانب مائل ہوئے ہیں اور مبتلا کا تذکرۂ شعراء مرتب کرنے میں مصروف ہیں۔ ہمارے نقاد جب تحقیق کی جانب لوٹتے ہیں تو اپنے تنقیدی پس منظر کو فراموش کر دیتے ہیں۔ پھر ان میں اور کسی پرانی طرز کے عالم میں

کا فرق نہیں رہ جاتا۔ وحید قریشی، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر ... اور نثار احمد فاروقی، گیان چند اور دوسرے محققین کے تحقیقی مزاج کا اثر بھی ہے اور یہ ... اور تفصیل پرستی کا رجحان ہمارے زمانے کا عام رجحان بنتا جا رہا ہے۔

پھر بھی محققین کے اس گروہ میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اس بات کی محنت اور شغف کے ساتھ کارآمد مقالے پیدا کر رہے ہیں۔ اردو کی نثری داستانوں پر ڈاکٹر گیان چند جین کی کتاب اور اردو مثنوی پر ڈاکٹر سید عبداللہ کے مضامین چند تحقیقی کے معیاری نمونے پیش کرتے ہیں۔ اسی طرح ایک خاتون نے نشاط النساء خان کی زندگی اور کلام پر بہت اچھا کام کیا ہے۔ ایک دوسرے نے بیگم کلب علی خان فائق رامپوری کا بھی اسی سلسلے میں لیا جاتا ہے۔ اردو کے بڑے شعرا پر انہوں نے جو تحقیقی مضامین لکھے ہیں انہیں پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی طبیعت کے توازن اور مطالعے کی وسعت اور گہرائی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ نگار کے "داغ نمبر" میں حیات داغ پر ان کا مضمون ... "حیات مومن" (اورنٹیل کالج میگزین) اور "میر دہلی میں" ہمارے تحقیقی ادب میں ایک نئی آواز کو پیش کرتے ہیں۔ ہمارے محققین نے آج تک اس اختصار کے ساتھ کسی بڑے شاعر کی زندگی کا ایک مکمل تصویر پیش کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ فائق صاحب نے ان مضامین میں دو خوبیاں ایسی ہیں جو ہمارے زمانے کے کسی ادبی محقق میں بیک وقت نہیں ملتیں۔ ایک تو یہ کہ وہ جس شاعر کو موضوع بناتے ہیں اس کو اس کے سماجی پس منظر میں دیکھتے ہیں (ہمارے محقق حضرات اس بات کے عادی ہیں کہ سماجی پس منظر کو الگ پیش کیا جائے اور شاعر کو الگ)، دوسرے وہ شاعر کے کلام کو اس قدر غور اور توجہ سے پڑھتے ہیں کہ وہی ان کا سب سے بڑا ماخذ بن جاتا ہے (یہ خوبی یوں بھی ہمارے محققین میں خال خال پائی جاتی ہے اور اکثر اوقات غلط نتائج بھی پیدا کرتی ہے)۔

اس جائزے کے بعد ہمیں دیکھنا ہے کہ ارباب تحقیق کی محنت اور شغف سے ہمیں کیا حاصل ہو سکتا تھا اور کیا واقعی حاصل ہوا ہے۔ جس قومی ورثے کے محفوظ کرنے اور نئے دور تک مناسب شکل میں اور تاریخی پس منظر کے ساتھ پہنچانے کا مقصد یہ تحقیق انجام دے سکتی تھی۔ اس میں سے محض ایک ابتدائی قسم کی کامیابی حاصل ہوئی ہے اور یہ کامیابی بھی زیادہ تر افراد کی مرہون منت ہے۔ ابھی تک اردو زبان و ادب کے بڑے بڑے کارنامے حشرات الارض کی خوراک بن رہے ہیں، بدیسی عجائب گھروں اور کتب خانوں کی زینت ہیں یا غلط ملط انداز میں طبع ہوتے ہیں۔ ان حالات میں عام پڑھنے والوں کے لیے تو کجا، اچھے خاصے نقادوں تک کے لیے ہمارا ادبی ماضی اچھی طرح واضح نہیں ہے۔ تنقیدی کام کرنے والا جب کسی موضوع پر کوئی کام کرنے بیٹھتا ہے تو یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ محقق اس کی کچھ زیادہ مدد نہیں کر سکتا اور اگر اسے یہ کام کرنا ہے تو تعبیر و تشریح اور تاویل وغیرہ کو ملتوی کر کے اسے خود تلاش اور تفحص سے کام لینا پڑے گا۔ اکثر اوقات وہ اپنے اصلی کام کو بھول کر یہ خدمت سر انجام دیتا ہے اور ماضی کی قدر و قیمت متعین کرنے کا فریضہ دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے۔

اردو ادب اور زبان کے بارے میں تحقیق کے کئی شعبے ایسے ہیں جن میں مزید کام کی بے حد گنجائش ہیں اور جن کے بغیر نہ اردو ادب اور زبان کے مختلف ادوار کا صحیح نقشہ سامنے آ سکتا ہے، نہ ہمارا ماضی ہمارے لیے کسی فیضان یا تخلیقی انگیخت کا باعث بن سکتا ہے۔

سب سے پہلے ماضی کے ادبا و شعرا کے کارناموں کی ترتیب و تدوین ہے۔ اب تک اردو کے کئی ایک اچھے شعرا مثلاً

[illegible] ہیں [illegible] کام کرنا آسان نہیں تھا۔

ہمارے [illegible] کے مطالعے کے لیے سخت ناکافی ہے۔

ہمارے قدیم [illegible] حالی نے [illegible] کی زندگی [illegible] غالب [illegible] میر کی سوانح عمریاں [illegible] لکھی گئیں [illegible] ہے۔

سوانحی کام کے سلسلے میں [illegible] ہمارے ہاں تحقیق [illegible] کسی کی تاریخ وفات متعین کرنے کے سلسلے میں [illegible] ابھی تک کوئی [illegible] دریافت شدہ مواد کو بھی سمیٹ سکے۔

ہمارے قدیم اردو شعراء کے بارے میں سوانحی [illegible] فارسی میں [illegible] بات کا رواج تو پچھلے زمانے میں انتہائی [illegible] محققین کرام کی خاص علمیوں کی بنا و فارسی سے اُن کی [illegible] تعجب ہے کہ اس کے باوجود ہمارے شعراء کے تذکرے [illegible] اردو میں ترجمہ نہیں ہوا۔ میر کی خود نوشت سوانح عمری [illegible] کی کتاب [illegible] کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ مگر پڑھنے والوں کو ان میں بھی خوب [illegible] ادب اور زبان کے بارے میں کچھ کام انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں بھی موجود ہے [illegible] اس کام کا غالب حصہ ابھی تک اردو میں منتقل نہیں ہوا۔

اردو زبان اور ادب نے برصغیر ہند و پاکستان کی تاریخ کے جس دور میں نشوونما پائی اس پر دیسی اور بدیسی مورخین نے بھی [illegible] طرح توجہ نہیں دی ہے۔ اورنگ زیب کے بعد کا عہد چھوٹی چھوٹی سلطنتوں اور بے شمار سیاسی آویزشوں سے بھرا پڑا ہے اور اس سے ایک پریشان کن موضوع کی حیثیت رکھتا ہے۔ جب بھی ہمارا کوئی محقق کسی ادیب یا شاعر پر قلم اٹھاتا ہے تو اپنے طور پر اس دور کی تاریخ لکھنے لگ جاتا ہے۔ نہ وہ اس کام کے شایاں محنت کرتا ہے نہ کسی معتبر تاریخی شعور کا مالک ہوتا ہے۔ چنانچہ تحقیقی کارناموں کے تاریخی حصے بے حد اُلجھے ہوئے اور اصل کام سے جُدا جدا لگتے ہیں۔ اردو ادب کا تاریخی پس منظر ایک ایسا موضوع ہے جو کسی ادب دوست مورخ کا منتظر ہے۔

اردو طباعت اور صحافت کی تاریخ بھی ہمارے کئی ایک تحقیقی مسائل کو حل کر سکتی ہے۔ اور ان کے ابتدائی ادوار کو اب تک کسی نے موضوع بنا کر مستقل کام نہیں کیا۔ کئی ایک اُلجھنیں اور غلط فہمیاں اس کام کے بغیر رفع نہیں ہو سکتیں۔

اُردو زبان کے صرف و نحو اور لغت پر بھی تاریخی اور تحقیقی کام اب تک ملتوی ہوتا رہا ہے۔ زیادہ تر کام جو اُردو زبان کی تاریخ

پڑتا ہے جو زبان و بیان کی صحت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ شیرانی مرحوم نے پنجاب میں اردو لکھی تو بہت سے لوگوں کی توجہ اس طرف گئی کہ زبان
جاننے والوں کی طرف مبذول ہوئی مگر شیرانی مرحوم کا ایک تو پنجاب سے کوئی ایسا گہرا تعلق نہ تھا دوسرے انھوں نے پنجابی زبان کے مواد
سے بھی اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کی مگر ان کے بعد آنے والے لوگ اس قسم کے خطروں سے نہ بچ سکے۔ پھر بھی لسانیات کے
میدان میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور، مسعود حسن رضوی، ڈاکٹر مسعود حسین خاں، احتشام حسین، اسماعیل پانی پتی، ڈاکٹر شوکت سبزواری کے کام کی
کچھ نہ کچھ اہمیت ضرور ہے۔ "دکنیات" کے علاوہ یہ دوسرا موضوع ہے جس میں ہمارے محققین نے کوئی خدمت انجام دی ہے
ایک تو اس خدمت کو وسیع ہونا چاہیے۔ دوسرے یہ کام اس انداز میں لکھے جانے کی ضرورت ہے کہ اردو زبان کو صحت کا نیا
راستہ ملے۔

بوڑھا اور رات

ابو سعید قریشی

شام ہو رہی تھی۔ دہقان نے پیلے شربت جیسا پانی مٹی کے [illegible] کھیت میں [illegible] مشرق میں [illegible] سب کچھ ایک [illegible] ہو گیا تھا جزئیات [illegible] جیسے [illegible] کے گھُٹنے [illegible]

بوڑھے دہقان کو گویا اسی لمحہ کا انتظار تھا۔

اس کے [illegible] ہاتھوں کی [illegible] جھریوں کی [illegible] سے [illegible] کھیت کے پھول [illegible] جا سکتے [illegible] کے [illegible] باقی [illegible] اس کی [illegible] رگوں میں خون اب بھی اسی [illegible] سے [illegible] تھا جیسے [illegible] کی [illegible] اور اس کو [illegible] کمر بند باندھنا اور زمین کا سینہ چیرنا تھا۔

اس کے خاندان میں سپاہی کا پیشہ مقدس پیشہ سمجھا جاتا تھا۔ ہر کنبے میں ایک جوان [illegible] اس کے کسی بزرگ کا قول تھا کہ [illegible] کب [illegible] پڑ جائے۔

فتح محمد خود بھی جنگ کے کئی میدان دیکھ چکا تھا اور اس کے بدن پر کئی جگہ گولیوں، سنگینوں اور گولیوں کے کئی نشان تھے۔

اور اس روز اپنے بیٹے فتح علی کو رخصت کرتے وقت بوڑھے [illegible] نام ہوگئے [illegible] اس نے علی [illegible] اٹھایا تھا۔ بیٹے کو سینے سے لگاتے وقت اس کو محسوس ہوا جیسے مجاہدوں کا ایک لشکر بھی وہی نعرے لگا رہا ہے:

"علی علی بہادر رو!

علی علی دلاور رو!"

"جب تک اس نعرے کی گونج باقی ہے بیٹا!" بوڑھے نے کہا: "تمہیں کوئی خوف نہیں ہونا چاہیے۔"

نوجوان نے اپنے باپ کے ہاتھ چومے، انھیں آنکھوں سے لگایا اور رخصت ہوتے ہوئے کہا: "بابا کر رات اندھیری باندھنا [illegible] کہ اس کی خوشبو آجاتی ہے اور کھیت میں [illegible] ایک [illegible] نہیں [illegible] تین چار دن سے [illegible] پرندوں کے پیچھے:"

"اللہ کے سپرد! اللہ کے سپرد [illegible] رکھوالا ہے سب کا ——!" بوڑھے نے آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے

کہا —" اب جاؤ! خدا تمھاری مرادیں پوری کرے۔"

شرما کر جانے والی پگڈنڈی چٹانوں کے نیچے چھپ گئی۔ بڈھے نے چشمے کے کنارے چیڑ کے پتوں پر شکرانے کے دو نفل پڑھے کہ اللہ نے آج میرے بیٹے کو بھی اس قابل کیا —— اور وہ پھر کام میں لگ گیا حتیٰ کہ سورج سفیدوں کے نیچے چھپ گیا اور چاند چوٹیوں کے پیچھے سے ابھرا۔

عشا کی نماز کے بعد اس نے اپنے بیٹے اور مجاہدوں کی سرخروئی کے لیے ہاتھ اٹھائے جو خدا کا دامنہ اپنے وطن کے اس حصے کی آزادی کے لیے لڑ رہے تھے جس پر غیر ہمسایے قبضہ جمانا چاہتے تھے۔ دعا کے بعد اس کو اپنی کامیابی کا یقین ہو گیا اور مصلے پر ہی اس کی آنکھ لگ گئی۔

لیکن یکایک ڈربے کی جانب سے مرغیوں کا شور بلند ہوا اور اس کے ساتھ ہی کتے کی گرج سنائی دی —— بڈھا سمجھ گیا کہ لومڑی آئی ہے۔

اس کا ہاتھ اپنی بندوق کی طرف بڑھا لیکن جب وہ باہر نکلا تو چاند اور الاؤ کی روشنی میں اس نے دیکھا کہ لومڑی کی گردن کتے کے منہ میں ہے۔

"فاحشہ —— اب کہاں جائے گی نکل کر!" —— اور دروازے میں کھڑا وہ لومڑی اور کتے کا تماشہ دیکھتا رہا حتیٰ کہ لومڑی کی جدوجہد ختم ہو گئی۔

"موتی!"

موتی نے لومڑی کو چھوڑ دیا اور دم ہلاتا ہوا اپنے مالک کی طرف بھاگا۔

"شاباش موتی شاباش!" بڈھے نے کتے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "جیتے رہو! جیتے رہو!"

ڈربے کے باہر لومڑی کی لاش کچی چاندی کی طرح چمک رہی تھی۔ بڈھے کو وہ میمیں یاد آگئیں جو عالمگیر جنگ ختم ہونے کے بعد اتحادی فوجیوں کے پیچھے پیچھے گھوما کرتی تھیں اور جن کے ہونٹ مرغ کھائی ہوئی لومڑیوں کی طرح لال تھے۔

"مکار! ایک رات تو تجھ کو بھی پھانسا دے گئی تھی فتّے! افوہ یہ ہے —— کیسی ظالم مہک آرہی تھی کافر کے کپڑوں سے —— بخشیو پاک پروردگار —— آہی چلا تھا شیطان کے پھسلانے میں پر اس وقت وہ یاد آ گئی تھی جنتی —— یوں لگ رہا تھا جیسے پاس کھڑی ہے اور کہہ رہی ہے" اپنے بیٹے کی ماں کو بھول گئے؟" —— اور پل بھر کو اس کی آنکھوں کے آگے پانی بھری دھند چھا گئی۔

مگر موتی غرایا جیسے پوچھ رہا ہو اب کیا حکم ہے۔ لومڑی کی خوبصورت چمکدار کھال پھر بڈھے کے سامنے ابھری۔ لومڑی کا چھوٹا سا خوبصورت منہ کھلا ہوا تھا۔

"گلوبند بنتا ہے کھال کا —— ولایت میں تو سالیاں اس طرح پہنے پھرتی تھیں جیسے انھی کی کھال ہو۔ اری سر تو اتار پھینکو جانور کا —— پر نہیں وہ بھی رہے گا۔ فیشن! فیشن! —— اور کبھی کبھی تو یہ بھی پتہ نہیں چلتا تھا کہ کون سا منہ کس کا ہے۔ یہ عورت ہے یا بھوکی لومڑی —— وہ تو سچ مچ بھوکی تھی اس جان والی —— کتنا تو کھانا کھا گئی تھی —— بھوکی نہ ہوتی تو کالے آدمی کے پیچھے کیوں آتی کم بخت! —— ایسی جنگ سے بچائیو مولا جس میں جیت نہ ہو —— فتے! فتے! اللہ نہ کرے جو آج تیرے وطن پر بھی کسی کا قبضہ ہو جائے تو تیری بیٹیاں

بتیجیوں ہی۔ — وہ اپنے تصور سے کانپ اٹھا — اس دن سے کیا ہو رہا — اس روز سے پہلے برت آملے!

اور اس کے ساتھ اس کے دل میں بیروں کے خلاف بغاوت کا جذبہ بیدار ہوتا تھا جو ہی نہیں ہوتا، وہ ملک سے خود دور کی کھال پر یوں ہاتھ پھیرنے لگا جیسے کوئی کسی ذلیل خوار کو سہارا دیتا ہے — سب نے کہا کہ جنگلی خونخوار ہیں — وہ سب کے سب بکاؤ — پھر کیا ہی سستا جیل کیاں ہے قصے — یا ہے وہ بیوی کی بربادی پھر دولت کی ایک ندی سے کے بہے، دوست کی، بد شادی کی ہوس کی! نرا نعرہ نہیں، جو کہ گھٹے ہیں جیسے کہ پھیکے کچھیں — وہ شیطان بھی لوگ ہی کا دوسرا نام ہے یہ اسے! یہ جو علاقوں کے سرپنچ کی جانیں ہیں، تو اپنے بت کھیلیں اور جھوٹ کی ٹھوکر۔

اچھا بھئی موتی! اب اس کو شانے لگا تیرے — وہ پھر اپنے خوابوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ کتا اس کی نہ باتیں سمجھتا — اپنے بیٹے — باقی سب تیرا — اس سے تو — صبح ہو گئی — کہ بے آدمی ہو کہ جانور پیٹ بھرنے کے لیے سب کو کام کرنا پڑتا ہے۔

روٹی کی کھال آ، سننے کے بعد اس نے اپنا سر ادھر ادھر، بچھڑے کے نیچے کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔

اچھا بھئی موتی! ذرا دھیان رکھنا۔

اپنا نام سن کر اس نے دم ہلائی اور غرّایا جیسے بوڑھے کی بات سمجھ گیا ہو۔

یہ تو جانوروں کی دنیا سے پرے حالت ہے بڑا — بس بڑھاپے کا کرم تھا، اب تو ان میں بھی اونگھ جاتا ہے اور تیسرے دو بھی جم گئی کہ ابھی ان رات کا پہرہ دیا اور پلک نہ جھپکی۔ نئے پیسے ہی تو نہیں مل جاتے۔ جس نے موتی کو تھپکا دیا اس کو جی بھیل — ارے بیت ہو گیا موتی!

وہ ہنسا، جماہی لی اور سو گیا جیسے وہ سو جاتا ہے اور خراٹے لینے لگا۔

دفعتاً کہیں دور سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آئیں۔ — بڑھا بڑبڑایا — کم بختوں نے شبہ حملہ کر دی لیکن کتوں کا کام ہی بھونکنا ہے — اور پھر وہ کروٹ بدل کے سو گیا۔

مگر کتوں کی آوازیں بلند ہوتی گئیں۔ اب کے ان میں موتی کی آواز بھی شامل تھی۔

شور قریب آگیا۔ موتی کی آواز میں غصہ تھا، وحشت تھی۔ — یکایک اس کے فاصلے بدلنے لگے۔

بوڑھا چونک پڑا۔

چاند کی روشنی میں ایک سیاہ ہیولا مکئی کے کھیت میں گھوم رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ مکئی کے ڈنٹھل ٹوٹنے کی آواز آ رہی تھی جیسے شریر جانوروں کی ٹولی کھیت میں گھس آئی تھی۔ موتی کبھی سائے کی ایک طرف دکھائی دیتا کبھی دوسری طرف جیسے وہ موقع تلاش کر رہا تھا کہ کب اور کہاں حملہ کروں — اور پھر ریچھ اور کتا آپس میں گتھ گئے۔ بوڑھے سپاہی کا ہاتھ بندوق کی لبلبی پر تھا لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کب فائر کروں۔ اس کو ڈر تھا کہ کہیں کتا گولی کی زد میں نہ آ جائے لیکن اتنے میں دونوں جانور ایک دم سے اوجھل ہو گئے اور پھر کھیت کے بیچ کرنے سے ایک وحشیانہ چیخ سنائی دی، بوڑھا سمجھ گیا کہ موتی کا پلہ بھاری ہے اور ریچھ کے بدن میں موتی کے گڑے ہوئے دانتوں کے تصور سے اس کے اپنے دانت بھی کچکچا اٹھے جیسے وہ بھی وحشی کے گوشت میں گڑے ہوئے تھے۔

ایک اور چیخ ——— سور کا داروغہ فتح محمد کے سامنے کھیت سے نکل کر پھوس کی جھاڑیوں کو روندتا ہوا بھاگا۔ بڑھئی کی بندوق سے ایک شعلہ لپکا، ایک اور دھماکہ ہوا، سور کا داروغہ رات کے سایوں کی طرف بڑھا، سوکھی ٹہنیاں ٹوٹنے کی آواز آئی اور پھر دوسری جھاڑی کا سرقائی پکر جاٹ رہا تھا۔

کیا ہو گیا بڑی بی! اِدھر آ ... اسے! ... بڑھئی کی ساری کی ساری چھاتی پر انگنت جھاڑیاں اُگ آئیں ——— داڑھی بھی گئی ٹوٹ جاتے جاتے۔ ذرہ ذرا سا کچھ تڑپنے دے بابا۔ تیرے بغیر تو میرا دل بھی نہیں لگ سکتا ——— ہونہہ! کوئی بات نہیں، ہم ہے، بچارہ بھگی بچہ ہی! ایسے ہی مار ہوتا ہے جن تو اصلی سنہ ہو جاتے گا ——— اس نے چٹکی بجائی ——— امی! رنیر کی مار کیا ہے؛

اس نے اپنی جیب سے ریشمی تلی کا ایک ٹکڑا نکالا جس کو وہ رومال کے طور پہ استعمال کرتا تھا اور اس کو ماچس دکھائی۔ ہے لے ——— کیسا ہی زخم ہو خون بند کرنے کے لیے اس سے بہتر دوائی کوئی بھی نہیں جانتا ——— تو رائفل کو رکھ اپنا ——— اور ابھی دو دن کے بعد ہی بیٹ لوں گا۔ اول تو ایل بی نے دن نکلنے سے پہلے ہی اس کا وہاں بند کر دیا ہوگا۔ اب تو نکل گیا ہے ناگر مگر۔

سیر ... ہو بیٹے دو دن ذرا، پھر دیکھیو تماشہ، بھالو بھار بنا گیدڑ کی نانا جانو بات ہی کیا ہوئی ———

اور اب اس بڑھیا کے منہ میں بھی کچھ ڈال دیں ——— اس نے بندوق سے خالی کارتوس نکال کر نیا کارتوس بھرتے ہوئے کہا۔

فتح علی کیا کہہ رہا تھا اس دن ——— ہاں! کہہ رہا تھا کہ بابا اب تو رائفل لے لو اور اس کو آرام دو۔ لیکن فتح محمد نے اسے یہ کہہ کر ٹال دیا تھا کہ بیٹا! اس کا میرا پرانا ساتھ ہے۔ اتنا پرانا کہ تیری ماں بھی اتنی نہیں ہو سکتی۔ تیرا چاچا فتح بھی پرانا ہو جائے گا۔ ماں تو ایک تو اس کے ساتھ کچھ انسیت ہو گئی ہے، دوسرے اصل بات یہ نہیں ہوتی کہ بندوق نئی ہے یا پرانی، اصل چیز تو نشانہ باندھنے والی آنکھ ہے اور انگلی جو پر جاتی ہے کہ لبلبی کب دبے گی ——— نہیں سمجھے! خیر کوئی بات نہیں، ایک روز آپ سے آپ سمجھ جاؤ گے، اس کا بھی وقت مقرر ہوتا ہے جیسے برفوں کے پگھلنے، انگوروں کی بیل پر بور اور رہٹ کے جھوٹ پڑنے کا وقت، فصلوں کی کٹائی اور اپنی جگہوں کے چھٹنے حملے کی تیاری اور حملہ کرنے کا وقت مقرر ہوتا ہے۔ جس نے یہ بھید پا لیا وہ زندگی میں کبھی دھوکا نہیں کھائے گا ——— رہی رائفل، تو فوج میں تو خیر ٹھیک ہے کہ جتنی دور سے مار کر سکو اتنا اچھا ——— وہ بھی یوں کہ آج کل کی جنگیں ہی ایسی ہیں، لیکن شکار پہ رکھنے کے لیے بارہ بور ہی اچھی۔ رائفل میں سو عیبوں کا ایک عیب تو یہی ہے کہ خدا نہ کرے نشانہ بال برابر بھی چوک گیا تو گولی کہاں سے کہاں نکل گئی اور کون جانے کہیں کوئی بچہ پھول ہی چن رہا ہو، یا کوئی مسافر ہی سستا رہا ہو پیڑ کی چھاؤں میں ——— نا بابا رائفل کو دور ہی رکھو گھر سے ——— اب تم کہو گے کہ بارہ بور بھی رکھنی ہے تو دو نالی کیوں نہ ہو ——— سو اس میں بھی بھید ہے۔ دو نالی ہوئی تو خطرہ کم ہو گیا نا کہ ایک نہیں تو دوسرا کارتوس تیار ہے ہی نا ——— لیکن جب خطرہ ختم ہو گیا تو بات ہی کیا رہ گئی پیچھے ——— نہیں سمجھے! کہا نا ہر بات کا ایک وقت ہوتا ہے۔

کارتوس بھرتے وقت اس کو یہ سب باتیں یاد آ گئیں ——— اور اب وہ وقت قریب آ رہا ہے بیٹا جب یہ ساری باتیں آپ سے آپ تیری سمجھ میں آ جائیں گی اور جنگل کو خطرے میں مزا آنے لگے گا ——— کیوں ہوتی؟ خطرہ نہ ہوتا تو آدمی جانور رہ جاتا ——— کھاتا پیتا اور جگالی کرتا ———

جگالی کے تصور سے اس کو اپنی گائے کی بچھیا کا دھیان آ گیا اور اس کی مونچھیں پھڑک اٹھیں ——— بچھیا یعنی گائے! ———

[illegible] سوچنے لگا کہ [illegible] چھوٹی [illegible] کے پیٹ میں [illegible] رات [illegible] ۔۔ [illegible] محسوس [illegible] ہی [illegible] کے [illegible] اس [illegible] اس کے [illegible] خواب میں [illegible] سے [illegible] تھا [illegible] کی [illegible] بھی [illegible] کے لئے [illegible] اللہ [illegible] جا [illegible] لگی [illegible] کی [illegible] کو [illegible] کے [illegible] ۔

[illegible] نے [illegible] کی [illegible] سے [illegible] کی [illegible] بھی [illegible] کی [illegible] سکتی [illegible] ۔

اور حلنے [illegible] تک [illegible] کی [illegible] رات [illegible] کہ [illegible] وہاں [illegible] ۔
اس کو [illegible] ۔

[illegible] رہا تھا [illegible] ڈکار رہی تھی [illegible] کی ایک [illegible] ہوئی [illegible] اور [illegible] رات کی تاریکی میں ڈوب گئی [illegible] ڈکارنے [illegible] سب آوازیں اس [illegible] کرب میں ڈوب گئیں [illegible] کے سب سے [illegible] جانور [illegible] اس نے اپنی بندوق [illegible] اور اپنی [illegible] ۔۔۔ [illegible] ایک [illegible] محمد! تو تو کل تک یہ سوچا کرتا تھا کہ یہ گائے [illegible] اس کا [illegible] رہی ہے ۔ [illegible] کہتا ہی رہ گیا کہ اللہ کے بندے یہ کوئی ٹھیک نہیں ہم اگر [illegible] کل ہی [illegible] بات ۔۔۔ اب [illegible] کے :

گائے پھر ڈکاری ۔ ۔ دراصل وہ بدستور ڈکار رہی تھی لیکن اپنے خیالات میں کھو کر وہ اس کی آواز سے بے خبر ہو گیا تھا، اس کی آواز سے سینہ پھٹا جا رہا تھا۔

اللہ تجھ کو صبر دے ——— اس نے گوری کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ——— اور پھر سوچنے لگا کہ اس بے زبان جانور نے آخر کیا قصور کیا تھا جس کی یہ سزا ہے ! ——— اور جیسے اپنے سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے اس نے رات کی طرف دیکھا۔
ڈھلتی رات کے اندھیروں نے اس کے ذہن کو اور بھی دھندلا دیا ——— دیو داروں کی پھیلی ہوئی باہیں دھند میں لپٹی ہوئی

پہاڑوں کی چوٹیاں اور جھینگروں کی متواتر چیخ بھی ابھی سوال کرتی ہوئی سنائی دے رہی تھی۔

رباب کے بھید بھرے بول سامنے تھے! — لڑکپن اس چکر میں پڑتا ہے — جو کام کچھ سوچا گیا ہے آدمی کو توڑ دینے کے بہت ہے۔

جانے کسی خاتون کی چیخ کا اور ادھر پہاڑوں کے سامنے پھیل رہے اور سامنے نظر پر رات کا جادو مرت ہو کر بکھر گیا۔

آنکھوں ہی آنکھوں میں بستی پھلانگی رات، ایسی ہی رات برسوں پہلے ایک عورت کو اٹھا کر لے گئی تھی اور اس کے زیور اور بچے ادھر ادھر بکھر گئے تھے۔ وہ رات چپ کر کے آئی تھی اور رو کر ہی کرتا بکھیر گئی تھی۔

بوڑھے سپاہی کا تیکھا ہوا ایسی جلد ہوا اور اس کے گلے سے ایسی آواز نکلی جس طرح برسوں سے سوئی ہوئی توپ کا دہانہ جاگ اٹھے۔

مجبوروں کا بچہ ہے! — اور پھر وہ بڑبڑانے لگا — جانوروں کی معصومیت کچھ یاد رہ کر بھی — یہ لا انصافی سمجھ میں نہیں آتا۔

پہاڑوں کے پیچھے ایک سفید لکیر سی پھیل گئی۔ — اور بوڑھا سوچنے لگا کہ سورج کے بہیں کہیں ہونے ہوتے ایسا کیوں ہو؟ مگر گائے بدستور بین کر رہی تھی اور بچھڑا اس کے ارد گرد گھوم رہا تھا اور بے چین ہو رہا تھا۔ کبھی وہ اس کی ٹانگیں چاٹنے لگتا اور کبھی اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو جاتا جیسے دلاسا دے رہا ہو۔

جانوروں کو بھی تو معلوم ہوتا ہے نا — بوڑھے نے کہا۔ یہ بھی باتیں کرتے ہیں — سمجھ کی بات اور ہے۔ وہ تو آدمی بھی کبھی کبھی آدمی کی بات نہیں سمجھتا۔

گائے کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو بہ رہے تھے۔

صبر کر بیٹی، صبر کر — بوڑھے نے کہا — آدمی بھی تو آخر صبر کرتا ہے! — پر آدمی آدمی ہے — ویسے یہ سب کہنے کی باتیں ہیں، درد ہو گا تو رونا ضرور آئے گا۔ آدمی ہو یا جانور — اور یہ بھی سچ ہے کہ رونے سے دل کی بھڑاس نکل جاتی ہے۔ میں بھی رویا تھا جب فتح علی کی ماں چلی گئی تھی، تو بھی رو — اس نے گائے کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا — او رباب ڈیوٹی!

اس نے اپنے ٹرنک کا ڈھکنا صاف کیا جس پر مٹے مٹے رنگوں میں اس کی پلٹن کا بسکوٹ، عقاب پر تول رہا تھا۔ صندوق سے اس نے گرم جرابوں کا جوڑا نکالا اور اپنی پنڈلیاں کسنے لگا جیسے برسوں گزرے پریڈ پر جاتے ہوئے کسا کرتا تھا۔ اس کے کانوں میں بگل کی آواز گونج اٹھی۔

مگر یہ رونے کی آواز کہاں سے آ رہی تھی؟ — وہ چلتے چلتے چونک پڑا، کوئی بڑھیا بین کر رہی ہو جیسے — مر گیا ہو جیسے کوئی کسی کا۔

اس کے قدم آپ سے آپ رک گئے۔ اپنے خیالات میں مگن وہ کالے جنگل کو بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا اور اب اس کے سامنے کالے بیروں کی جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ بھورے ریچھ بیر کھانے کے لیے اکثر ادھر آ نکلتے ہیں۔ فتح محمد کو یقین تھا کہ ایل جی کے سپاہی نے موذی کو ان جھاڑیوں سے ادھر نہیں جانے دیا ہوگا۔

اس نے ایک مدت ہوئی شبانہ کو محسوس کیا تھا اور جب سے اس کی سنگت کی طاقت سے یہ جو کچھ بھی بھلائیوں کی جانب سے بہکے بہکے سے اس کو جیسے ہوتا کہ وہ کچھ نزدیک ہی ہے۔

کی طرح کا وہ اس کے سارے بدن میں جنبش ہوئی اور ایک لمحہ بعد وہ اکڑا ہوا بوڑھے کی طرف جھکا جیسے کوئی ڈانٹ پڑی تھی۔

بوڑھا پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے کچھ دیر ساکت رہ کر سب سے پہلے آدمی کے چہرے پر غور کرنا ہے کہ جو کچھ اس کو خوف نہیں ہے سے لات ہے۔

مرنے والوں کی آنکھیں دیکھی ہیں
محسوس کرنے والے دیکھتے ہی کھیلتی آنکھوں پر کھڑے ہو گئے۔۔۔ یہ کچھ کریں محسوس ہوا جیسے کوئی جنگلی انسان اور دیوتا کھڑا ہے ———

بوڑھے سپاہی کی ساری عزت بندوق کی گولی سے پیچھے اس نے آدھی کھلی آنکھ میں چمک آئی اور غصہ بھی کر دیکھا۔

بس وہ شخص کی قوت کمی توڑ تا ہوا اس کی کمر پکڑ سے نکل گیا اور وہ بوڑھے سے چند گز کے فاصلے پر جھک گیا۔

مردود! بوڑھے نے مردہ لہجہ کر شور کر مارنے ہوئے کہا۔ تو سمجھتا ہے کہ میری نظروں میں بھگوڑا ناچ کر تو بچ نکلے گا ——— اور پھر ہرنی سے مخاطب ہو کر ——— تیرا بھی بدلہ لے لیا بیٹا ——— اور خوش ہے نا ——— یہ اب اس کو ٹھیک کر بیٹھنا ہے۔ میں دوڑ کے اس طرف جو پہاڑ ہے ادھر چلتا ہے۔ ——— یہ جو ادھر ہی سے آتے ہیں یہ خانہ خراب!

کتا چلتے چلتے رک گیا، زمین کو سونگھنے لگا اور اس کے کان کھڑے ہو گئے۔

کہیں ہرنی مل گئی کیا؟ شاباش، اب زیادہ دور نہیں جانا پڑے گا۔

دفعتاً ایک پہاڑی کے موڑ پر اسے آبشار کا شور سنائی دیا ——— بس یہ ہے نا حق۔ ——— یہیں آتا ہو گا وہ حرامی پانی پینے کے لیے ——— کمینہ، رذیل، چھپ کر حملہ کرتا ہے سفلہ ——— پر مجھ کو تو معلوم ہی ہے، تیری برادری سے تو اس کی پرانی دشمنی ہے ——— تیار رہنا اب!

یکایک اس کا چہرہ بھیگ گیا اور وہ سمجھ گیا کہ آبشار آ گیا۔

پگھلی چاندی کی ایک چادر پہاڑ کے اوپر پھیلی ہوئی تھی اور اس کے اوپر رنگوں کی پھوار اڑ رہی تھی۔ بوڑھے نے ہاتھ بڑھا کر روشنی کی اس پھوار کو پکڑنا چاہا اور اپنی اس حرکت پر کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ یہ پھوار سارے میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ بھی اسی کا جزو ہیں، میں بھی پھوار ہوں اور یہ ساری دنیا رنگوں کا کھیل ہے جس کی حقیقت صرف روشنی ہے۔

گڈریے اس آبشار کو پریوں کا جھرنا بھی کہتے تھے، اس کا پانی اوپر سے گرتا اور تھوڑی دور زمین کے متوازی بہتا ہوا یکایک غائب ہو رہا تھا۔ یہاں زمین کی سطح پر کچھ ایسے سوراخ تھے کہ پانی کے اوپر غبار سے تیرتے ہوئے نظر آتے اور چھوٹی بڑی گھنٹیاں [illegible] مشہور تھا کہ ان بلبلوں پر پریاں ناچتی ہیں۔ ان کی پازیبوں کی صدا بے خبر سیاحوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور جب وہ پاؤں دھرنے کے لیے پانی میں اترتے ہیں تو پریاں انہیں نیچے کھینچ لیتی ہیں۔

جل ترنگ کی آواز سے بڈھے کے بھی کان کھڑے ہو گئے۔

شاہد نے پوچھا: کتنے بج رہے ہیں؟ [illegible] بھاگ رہی ... اور یہ بھوارا ان کی روشنیوں کے رنگ ہیں — یہاں —
وہ دیکھا — یہ سب ڈھکوسلے ہیں — بار — [illegible] — روشن ہوا کرتا تھا جیسے۔

[illegible] کا مقابلہ [illegible] روشنی کی [illegible] بکھر گیا۔ شاہد جو ابھی پانی پینے کے لیے بڑھا تھا [illegible]
سے دیکھنے والے کہیں [illegible] سو گیا۔

پہلے [illegible] پھر پوچھا اور اب تو — کون جانے — بڈھے نے کہا — آج ہی ڈھلک ہی نکلے ہوں — خیر —
تو میرا یہیں تک کا ساتھ تھا — کیا سامان — جیسے فوج کے سپاہی کو اپنی کمان کا کمان کا — کام ختم اور پھر رخصت — پر ہر لمحہ ذرا بھی
باقی ہے فتح محمد — [illegible] وہ کہیں زندہ ہے مجھ کو چھٹی نہیں مل سکتی — پر مجھ سے اچھا نہیں کیا تو نے — آپ آدمی اب اکیلا
ہی دو دو ہاتھ کرے گا جیتے جی — ایک بار آ جائے سامنے — پھر دیکھنا — ایک ایک ہڈی نہ الگ کر دی تو میرا نام بڈھا نہیں۔

اس نے ماحول کا جائزہ لیا، کچھ عجیب منظر تھا۔ یہ جگہ نہیں تھی جس پر سورج کا نشان تک نہیں تھا اور ابھی ابھی وہ ایسے سیدھے
پتے نیچے دھرے جیسے کہ زمین نوٹ رہی ... تھی۔ یوں دکھائی دے رہا تھا کہ یہ کوئی دوسری ہی جگہ ہے اور یہاں کہیں کہیں برف کی چٹانیں
چمک رہی تھیں جیسے کسی نے انہیں خوب صورتی سے کاٹ کر وہاں لگا دیا تھا۔

ہر طرف ان طلسمات کا عالم تھا اور راہ کی کچھ بھی نہیں آ رہا تھا کہ کون سی دنیا ہے۔ سفید چٹانوں سے پانی کے جھرنے
ہو رہے تھے جیسے اس کی کالی کے تھنوں سے دودھ کی دھاریں بہا کرتی تھیں۔

گوتے نے تصور سے اس کو پہچانا یاد رکھی۔

سلی اشتی: تجھ کو اس معصوم پر بھی رحم نہ آیا — جڑوں سے ناخن نہ نکال دیے تیرے تو تفتے کا باپ نہ کہیو — جبڑا چیر کر
رکھ دوں گا خدا کی قسم — ایک ذرا سامنے آ جا۔

آگے چل کر پہاڑوں کے اندر ستون بنے ہوئے نظر آئے۔ کچھ نیچے سے اوپر جاتے ہوئے جیسے چھت کو اٹھانے کے لیے
کھڑے ہیں اور کچھ اوپر سے نیچے آتے ہوئے جیسے فرش کو سہارا دینے کے لیے — اور ان کے بیچ روشنیاں جھلملا رہی تھیں اور ایک
عجیب دھندلی سی چکی اور ہوا بانسری بجا رہی تھی۔

آج تک کس دنیا میں آ نکلا بندے؟ آنا ہی تھا اور تو چالیس برس پہلے آیا ہوتا۔ یہاں تو میں بھی مان لوں کہ پریاں رہتی ہیں اور
چالیس برس پہلے تو ہر جوان عورت پری لگتی پیارے — فتح محمد کی ماں ساتھ ہوتی اور یہیں کسی غار میں ڈیرہ ہو جاتا تو یہی پرستان تھا۔

یکایک اس کا پاؤں کسی چیز سے پھسلا۔

ہڈیوں کا ڈھیر اور کھال کا ایک ٹکڑا۔

کھال سفید تھی۔

بوڑھے کے چہرے پر درشتی چھا گئی جیسے ان حسین پہاڑوں اور غاروں کا سلسلہ ختم ہو گیا اور ان کے بجائے بنجر پہاڑ
پھیلے ہوئے تھے۔

جب چیتا پچھلے پنجوں کے بل کھڑا —— اس نے آہستہ سے اپنے جسم کو ساکت کر لیا تھا۔ —— پھر وہ ایک
پھلانگ کر بڈھے کا پیچھا کرنے لگا [illegible] کے اوپر۔

تھا اس کو معلوم تھا جنگل سے ہو کر [illegible] —— دوپہر کا [illegible]
[illegible] گزر گئی۔

قتل کر دو، تیرا اب موت کا وقت ہے۔

چیتوں کے سینے میں [illegible] لیکن اس نے [illegible] نہیں [illegible]

بڈھے نے ساری قوت سے پیچھے کو کی۔

چیتا اچھلا —— بڈھے کا ہاتھ بھی [illegible] —— لیکن [illegible]
تھا —— [illegible] آواز کے ساتھ جب چیتے [illegible]

پھر جانے کیا ہوا —— ایک جھٹکا سا لگا اور پھر ایک [illegible] دونوں ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔

یکایک بڈھے نے اپنا بازو چیتے کے منہ میں ٹھونس دیا —— اس کا دوسرا ہاتھ اپنے [illegible] کی طرف بڑھا اور
چاقو مارا۔ چیتے کے پیٹ میں اتر گیا

بڈھے کا خیال تھا کہ چیتے کے [illegible] کا سانس رک جائے گا لیکن چیتے کے دانت [illegible] اس کی
کہنی تک اتر گئے —— کسی کے پاس [illegible] تھا اور اس طرف [illegible] کی لہر۔

تھا اس کو اپنی حالت کا احساس ہوا اور [illegible] معلوم ہوا [illegible] اسے اپنے اندر ایک سرد سی لہر محسوس ہوئی اور اس کے جسم سے
چہرہ ہی [illegible] جنگل میں [illegible] طاری ہو جاتی تھی اور [illegible] بجلی بھر جاتی تھی

"یا علی ——!"

آسمان کے گنبدوں، پہاڑوں کی چوٹیوں، آبشاروں کی لہروں، غاروں کی گہرائیوں —— سمندروں، جنگلوں، وادیوں، میدانوں سے
گونجتی ہوئی، مڑ کے یہ پکار سارے میں پھیل گئی۔

نعرے کے ساتھ ہی اس نے چیتے کو جیسے پرے پھینک دیا اور جس طرح [illegible] پہلوان اکھاڑے میں غیر متوقع طور پر ہو جاتا
ہے، چیتا نیچے تھا اور بڈھا اوپر۔

اس کا چاقو والا ہاتھ پھر بلند ہوا۔

مردود!

لعین!

کمینے!

لیکن اس کا دوسرا ہاتھ اب تک چیتے کے منہ میں تھا —— چیتے نے ایک بار [illegible] کی جھرجھری لی اور ایک خوفناک گھس گھساہٹ
کے ساتھ اس کا منہ کھل گیا۔

برشٹ نے پاؤں کھینچنا چاہا لیکن درد کا ایک ریلا آیا اور وہ بے ہوش ہو گیا۔

اور بہت دنوں بعد جب کوہ پیماؤں کی ایک جماعت اُدھر سے گزری تو انھوں نے دیکھا کہ برف کے شیشے میں دو ڈھانچے پڑے ہیں ——!

ان میں سے ایک نے جو بے شمار جنگلی جانوروں کا شکار کر چکا تھا، کہا، کہ اتنا بڑا درندہ میں نے آج تک نہیں دیکھا۔

"اور اتنا بہادر انسان! —— اس کے دوسرے ساتھی نے کہا، جس کے بال برف کی طرح سفید تھے اور جو اس بات کی تحقیق کر رہا تھا کہ انسان کی قوتِ برداشت کی حد کیا ہے —— کائنات میں آدمی کا کیا مقام ہے۔"

